اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَةُ الْكَهْفِ) ...... تا ...... (سُوْرَةُ الْحَجِّ)

(جلد: ۷)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ الْکَھْفِ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ الْحَجِّ)

(جلد: ۷)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے،پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ نے اس کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کر لیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

109518
جلد نمبر 2

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب : تفسیر روح القرآن

مؤلف : ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ناشر : ادارہ هُدًى لِّلنَّاسِ

کمپوزنگ : زاہد حسین

پرنٹرز : محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور

تاریخ اشاعت دوئم : جنوری 2012ء

تعداد : 1000

قیمت : 700 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ 343- مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔فون 042-35426800

۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انارکلی لاہور۔

۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔

۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔

۵۔ ۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔فون: 042-37248676-37320961

ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074

۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

موبائل: 0300-8485030۔فون: 042-37225030

Marfat.com

Marfat.com

صاحبِ تالیف

نام: ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی ابن مولانا فضل کریم صدیقی
(بانی دارالعلوم ربانیہ)

ولادت: 4 اپریل 1940ء

تعلیم: ١......حافظِ قرآنِ مجید
٢......تکمیل درسِ نظامی، جامعہ اشرفیہ لاہور
٣......فاضل عربی، پنجاب بورڈ
٤......بی۔اے، پنجاب یونیورسٹی
٥......ایم۔اے، گولڈ میڈلسٹ، پنجاب یونیورسٹی
٦......پی۔ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی
٧......فاضل مدینہ یونیورسٹی

تدریس: ١......ادب، تفسیر اور حدیث کی تدریس، مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور
٢......وزیٹنگ پروفیسر ہیلی کالج، پنجاب یونیورسٹی
٣......وزیٹنگ پروفیسر انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
٤......وزیٹنگ پروفیسر شعبہ اسلامیات برائے ایم۔اے کلاسز
٥......وزیٹنگ پروفیسر اسلامک سنٹر برائے ایم فل

خطابت: ١......خطیب جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور (ایک مختصر وقت کے لیے)
٢......خطیب اسلام آباد یونیورسٹی، اسلام آباد
٣......خطیب جامع مسجد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Marfat.com

مناصب: ۱......چیئرمین شعبہ مساجد پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲......چیئرمین ادارہ ھدیً اللناس، لاہور

تالیفات: دروسِ قرآن

۱...... سورة الفاتحه

۲...... سورة البقره (جلد اول)

۳...... سورة البقره (جلد دوم)

۴...... سورة آلِ عمران

۵...... سورة النساء

۶...... سورة المائده

۷......سورة الانعام

۸...... سورة الاعراف

۹...... سورة الانفال، التوبه، یونس، هود

۱۰...... سورة یوسف، الرعد، ابراهیم، الحجر، النحل، بنی اسرائیل

۱۱...... (اَلْكَهْف، مَرْيَم، طٰهٰ، اَلْاَنْبِيَآءِ، الْحَجّ)

۱۱...... خطباتِ صدیقی (جلداول)

۱۲...... خطباتِ صدیقی (جلددوم)

۱۳...... خطباتِ صدیقی (جلدسوم)

۱۴...... معرفتِ حق کا سفر

Marfat.com

فہرست

(اَلْکَھْف، مَرْیَم، طٰہٰ، اَلْاَنْبِیَآءِ، اَلْحَجّ)

سُوْرَۃُ الْکَھْفِ

سورت کا نام 1
زمانۂ نزول 1
شانِ نزول 2
سورت کی خصوصیات 2
مضامین 3
سُوْرَۃُ الْکَھْفِ 5
انسان رہنمائی کا محتاج نہیں 6
رہنمائی کا سرچشمہ قرآن وسنت ہیں 7
قَیِّمًا کا معنی ومفہوم 8
نزول قرآن کا مقصد 8
اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد ثابت کرنا جہالت کی وجہ سے ہے 10
نہایت دلنواز انداز میں آنحضرت ﷺ کو تسلی 11
کفار کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب 12
اس دنیا کا انجام 13
مخاطب کون ہے؟ 13
رقیم سے کیا مراد ہے؟ 14
ایک اور تحقیق 16
واقعہ اصحابِ کہف میں تعجب خیز بات کیا ہے؟ 20
اجمال کے بعد تفصیل 22
فِتْیَۃٌ کا مفہوم 23
نوجوانوں کی یکسوئی 24

Marfat.com

ایمان کو بچانے کیلئے ہر ممکن تدبیر 25
غار میں اللہ تعالیٰ کے انعامات 26
حفاظت کے انتظامات 29
تشبیہ کی وضاحت 30
لِيَتَسَآءَلُوْا کے لام کی وضاحت 31
ایک اور کرم فرمائی 32
یادگار کے بارے میں اختلاف 33
جملہ معترضہ 35
فضول بحث سے گریز کی ہدایت 35
آیت کا شانِ نزول اور وعدہ سے متعلق ہدایت 38
آیت کا مفہوم میں اختلاف 39
9 نو سال کے اضافہ کا مفہوم 39
آیت کا ماسبق 40
ضمنی مباحث کے بعد اصل مضمون کا ذکر 41
دعوت کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کو ہدایات 42
غریب اور مخلص کارکن ہی دعوت کی قوت ہیں 42
متکبرین کیلئے کلمۂ حق 44
صاحبِ ایمان لوگوں کو صلہ 45
قریش کیلئے ایک تمثیل 48
تمثیل اور اہلِ عرب میں مطابقت 49
پسندیدہ باغ کی خصوصیات 49
ثمر کا مفہوم 50
کافر اور مومن کی ذہنیت کا فرق 51
کافر کا اصل مرض 53
محض اللہ تعالیٰ کا اعتراف ایمان کیلئے کافی نہیں 53
مومن کا اظہارِ حق 54
ایمان کا تقاضا 55

Marfat.com

آخر وہی ہوا جس سے مردِ مومن نے ڈرایا تھا 56
بعد از خرابی بسیار حقیقت کا ادراک 57
حیاتِ دنیا کی تمثیل 59
مال و اولاد اور اعمالِ صالحہ کا تقابل 61
آنے والے دن کی فکر کرو 62
دفترِ اعمال کی کیفیت 63
قصہ آدم و ابلیس کو یہاں لانے کا سبب 64
بدل کر دوسرا مفہوم 65
ابلیس جنات میں سے تھا 65
ابلیس کی اولاد بھی ہے 66
ایک دوسرے پہلو سے قریش کو عار دلائی جا رہی ہے 66
قیامت کی منظر کشی 67
مشرکین کی بے بسی 68
تصریف کا مفہوم 69
مثل سے مراد 70
انسان کی کج فکری 70
رسولوں کی بعثت کا مقصد 71
محرومی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون 72
مجرموں کو مہلت دینے کی حکمت 73
گزشتہ آیت پر تاریخی شہادت 74
آیت کا پس منظر 76
شانِ نزول 77
بائبل کی خاموشی، تلمود کی بے خبری 78
فتیٰ کا مفہوم اور مراد 78
مجمع البحرین سے مراد 79
حُقُب کا مفہوم 79
مستشرقین کی یاوہ گوئی اور اس کا رد 80

Marfat.com

نَسِیَا حُوْتَھُمَا کا مفہوم 81
خادم کی معذرت 82
عبد سے کیا مراد ہے؟ 83
حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں یا نہیں 83
حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق کس مخلوق سے ہے 84
حصولِ علم کیلئے ادب بہت ضروری ہے 85
حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے درمیان معاہدۂ رفاقت 85
کشتی کا واقعہ 88
ارھاق کا مفہوم 89
لڑکے کے قتل کا واقعہ 89
بستی والوں کا واقعہ 90
کشتی کے توڑنے کی حکمت 91
لڑکے کے قتل کی حکمت 91
دیوار کی مرمت کی حکمت 92
حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا ان کی وفات ہو چکی ہے 95
یہود کی انگیخت پر قریش کا سوال 100
ذوالقرنین کون ہے؟ 100
مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق 101
تین مہمات 102
یاجوج ماجوج کون ہیں؟ 103
سدِّ ذوالقرنین کا محلِ وقوع 104
سدِّ سے متعلق مزید وضاحت 104
ذوالقرنین پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر 105
اتباع کا مفہوم 106
ذوالقرنین کی مہم 106
قول کا مفہوم 107
قولِ ذوالقرنین کا مفہوم 108

Marfat.com

ذوالقرنین کا سلوک 108
ذوالقرنین مومن تھا 109
ذوالقرنین کی دوسری مہم 109
ذوالقرنین کی تیسری مہم 111
یاجوج ماجوج 111
سدِّ ذوالقرنین اس وقت تک موجود ہے اور قیامت تک رہے گی یا وہ ٹوٹ ہو چکی ہے؟ 114
آیات کے مختلف مفاہیم 116
خاتمۂ سورت کی آیات 118
بعض الفاظ کی تشریح 119
ایک غلط فہمی کا ازالہ 119
سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے 121
غلط فہمی 122
کامیابی ایمان وعمل میں ہے 123
ایک سوال کا جواب 124
نشانیاں طلب کرنے والوں کو جواب 125
ایک علمی قاعدہ 130
انسان سب سے بڑی نشانی ہے 131

☆☆☆☆

سُوْرَةُ مَرْيَمَ

سُوْرَةُ کا تعارف 133
نام 133
زمانۂ نزول 133
سورت کا پس منظر 133
نجاشی کا استفسار اور حضرت جعفرؓ کا جواب 136
سورت کے مطالب کا تجزیہ 137
سُوْرَةُ مَرْيَمَ 139

Marfat.com

حروف مقطعات 140
ذکر کا مفہوم 141
عبد کی وضاحت 142
حضرت زکریا علیہ السلام کا تعارف 142
دُعا کے آداب 143
دُعا کا ایک اور سبب 144
سَمِیًّ کا معنی 145
سوال کا صحیح محمل 145
نشانی کیلئے درخواست 147
محراب کا مفہوم 148
کتاب تھامنے کا حکم 148
حکم کا مفہوم 149
حنان کا مفہوم 150
جبّارًا اور عَصِیًّ کی وضاحت 150
انسان کیلئے مشکل اوقات 151
حضرت مریم کا ہیکل سے مشرقی جانب قیام 155
اس واقعہ کو حضرت زکریاؑ کے واقعہ کے بعد لانے کی حکمت 155
حضرت مریم کا امتحان 156
حضرت مریم کا کردار 156
ان آیات کا مفاد اور لوقا کی بے اصل روایت 157
حضرت مریم کے استبعاد کا ازالہ 157
حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک نشانی ہیں 158
دُور کی جگہ سے مراد بیت اللحم ہے 159
ایک تأثر اور استدلال 159
حضرت مریم کو بشارت 161
اللہ تعالیٰ کی عنایات 161
خاموشی کا روزہ 162

Marfat.com

حضرت مریم کو خاندان والوں کی ملامت	162
ہارون سے مراد؟	163
استدلال	163
نصرتِ خداوندی کا ظہور	164
دو قابلِ توجہ باتیں	165
گہوارے میں حضرت مسیح کے ارشادات	166
ولادت، موت اور بعث بعد الموت میں حضرت مسیح کا اعزاز	168
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل حقیقت	168
اللہ تعالیٰ کے اولاد سے پاک ہونے پر فطری دلیل	169
جملہ معترضہ کے بعد حضرت مسیح کے ارشادات کا آخری حصہ	169
عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کرو، کیوں؟	170
حقیقتِ مسیح سے عیسائیوں میں اختلافات	171
مشہد کا مفہوم	171
اللہ تعالیٰ کے کلام میں تعجب کا مفہوم	173
نصیحت کے انداز میں ایک تنبیہ	174
روئے سخن قریشِ مکہ کی طرف ہے	176
نبی کا معنی و مفہوم	177
صدیق کا مفہوم	177
اپنے والد کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر	179
اس تقریر کے چند اہم نکات	179
مَلِیًّا کا مفہوم	181
تقریر کا ردعمل	181
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب	182
اسلام کا مفہوم	182
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا استغفار کا وعدہ	183
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی غیرت و حمیت	184
ہجرت کا اس کی برکات	184

Marfat.com

ایک الجھن کا ازالہ 186
مخلص کا معنی ومفہوم 188
نبی اور رسول میں فرق 189
اَلْاَیْمَنِ کا مفہوم 190
نَجِیًّا کا مفہوم 191
حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک اور احسانِ عظیم 191
حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ 192
حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دوسری صفت 193
حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیسری صفت 194
حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر 194
وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کا مفہوم 196
تمام مذکورہ انبیاء کرام کا مشترک وصف 197
ناخلف جانشینوں کا تذکرہ 198
ضیاعِ صلوٰۃ کا مفہوم 198
غَیًّا کا مفہوم 199
جنت میں جانے کا ذریعہ ایمان وعمل 200
اہلِ جنت کا رزق 201
وسطِ کلام میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف سے ایک وضاحت 203
منکرینِ قیامت کے دلائل کی تردید 207
کفار کے انجام سے ترہیب 208
جِثِيًّا کا مفہوم 208
کفار کے لیڈروں پر ضرب 209
ایک غلط فہمی کا ازالہ 210
قیامت کے دن کی ہولناکی 211
مقام اور ندی کا مفہوم 212
کفار کی مغرورانہ ذہنیت 213
مغروروں کے معارضہ کا جواب 213

Marfat.com

اسلوب کی تبدیلی سے ایک حکمت کی طرف اشارہ 214
کفار کے بیہودہ دعاوی کا جواب 215
ایک اور سنت اللہ کا بیان 216
ایک اور خود فریبی کا رد 217
انسان کی بے بصیرتی 218
مشرکین کا معبودانِ باطل پر اعتماد 219
مشرکین کے زعمِ باطل کا رد 219
اَرْسَلْنَا کا مفہوم 221
اَزًّا یَؤُزُّ کا مفہوم 221
سنت اللہ 221
وَفْدًا کا معنی 223
وِرْدًا کا معنی 223
قیامت کے روز مومنوں اور کفار سے ہونے والا سلوک 223
عَهْدًا کا مفہوم 224
شفاعت کا مفہوم 225
انسان کی کمزوری 225
ولد کا معنی 226
اسلوبِ کلام کی تبدیلی 226
اللہ تعالیٰ کی غیرت کو چیلنج 227
ایک آسان دلیل 227
ایک نکتہ 228
اللہ تعالیٰ کی اولاد نہ ہونے کی ایک دلیل 228
بدگمانی کا ازالہ 229
آیت کی وضاحت دو حوالوں سے 229
تیسیر کا مفہوم 231
آنحضرت ﷺ کو تسلی 231
کافروں کے انجام پر سابقہ امتوں سے استشہاد 232

Marfat.com

سُوْرَۃُ طٰہٰ

سُوْرَۃُ کا تعارف 233
نام 233
زمانۂ نزول 233
اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے اہم اجزاء 235
چند حقائق 236
سُوْرَۃُ طٰہٰ 238
طٰہٰ کا مفہوم 240
اس آیت کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت 240
قرآنِ کریم کی عظمت 242
قرآنِ کریم رحمت کا اظہار اور اس کا انکار خطرناک ہے 242
اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کی وسعت 243
پروردگار کی وسعتِ علم 244
پروردگار کا تعارف 244
ھَلْ کا مفہوم 245
حضرت موسیٰ ؑ کو راستے میں پیش آنے والے واقعات 246
آگ کی جگہ کے قریب اللہ تعالیٰ کا حکم 246
حق تعالیٰ کا کلام لفظی بلا واسطہ سنا 247
پروردگار کا تعارف 248
حضرت موسیٰ ؑ پر آپ ؑ کی حیثیت کا انکشاف 248
حضرت موسیٰ ؑ کو دی جانے والی اولیں تعلیم 249
توحید اور نماز کے بعد قیامت کی تلقین 250
عَنْھَا اور بِھَا کی ضمیروں کا مرجع 251
حضرت موسیٰ ؑ سے سوال 252
حضرت موسیٰ ؑ کا جواب 253
عصائے موسیٰ ایک معجزہ 254

Marfat.com

ید بیضا، دوسرا معجزہ	255
مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ کا مفہوم	255
ایک سوال کا جواب	256
حضرت موسیٰ ؑ کو اداءِ رسالت کیلئے پہلا حکم	256
منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے دعا	260
زبان کی گرہ کھولنے کا مفہوم	261
تسبیح ذکر کا مفہوم	263
اجابتِ دعا	264
اضطراب دور کرنے کیلئے احسانات کا تذکرہ	264
دو احسانات کا ذکر	266
فتون کا مفہوم	268
حضرت موسیٰ ؑ کا مدین میں قیام	268
دونوں بھائیوں کو اداءِ رسالت کیلئے جانے کا حکم	270
طریق دعوت سے متعلق ہدایت	270
دونوں بھائیوں کی طرف سے اندیشے کا اظہار	271
نہایت محبت سے تسلی	272
حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت	273
حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے ساتھ فرعون کا مکالمہ	274
تکوینِ وجود کے چار مراتب	275
سامن مچھلی	276
ایل مچھلی	276
ہدایت کے مدارج	276
فرعون کا ایک شاطرانہ سوال	285
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب	285
پروردگار کی جانب سے چند توضیحی ہدایات	286
نظامِ ربوبیت سے قیامت پر استدلال	289
فرعون کا تمرد	290

Marfat.com

ایک خطرناک الزام 290
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برسرِ موقع نصیحت 292
آپؑ کی نصیحت کا اثر 293
مُثْلٰی کا مفہوم 293
ہر طرح کی تیاری کی تاکید 295
دونوں فریق آمنے سامنے 295
جادو کا اثر 296
معجزہ اور سحر میں فرق 297
جادوگروں کا اعترافِ حق 298
فرعون کا آخری حربہ 299
ایمان کا کرشمہ 300
ایک تضمین 301
مقابلے کے اثرات 304
واقعہ ہجرت اور اس کا پس منظر 305
دو عبرت انگیز مناظر 307
قائد اور رعایا کی ذمہ داری 308
احسانات یاد دلا کر بنی اسرائیل کو تنبیہ 310
آیت کا پس منظر 312
انبیائے کرام سے سرزد ہونے والی لغزشوں کا مفہوم 313
بنی اسرائیل کی آزمائش 313
سامری کا فتنہ 314
سامری کی حقیقت 314
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی اور قوم پر ان کا عتاب 316
قوم کے بزرگوں کی معذرت 316
زِیْنَةِ الْقَوْمِ سے مراد 317
اَلْقَی السَّامِرِیُّ کا مفہوم 318
سامری کی شعبدہ بازی 318

Marfat.com

لوگوں کی سادگی پر تعجب 319
حضرت ہارون علیہ السلام کی فتنہ سے بریت 321
اہلِ کلیسا کی ہٹ دھرمی 322
حضرت ہارون علیہ السلام سے پرسش اوران کا جواب 323
ایک غلط فہمی کا ازالہ 324
اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف 324
سامری کیلئے سزا 326
ایک اشکال کا جواب 327
عجل کا انجام 327
اِلٰہ صرف اللہ ہے، اس پر دلیل 327
سورت کے آغاز اور پیشِ نظر آیات میں ربط 328
قرآنِ کریم سے اعراض کا انجام 329
قیامت کا منظر 330
اعتراض کا جواب 332
خودسروں کا انجام 334
شفاعت کا صحیح تصور 334
شفاعت کے صحیح تصور پر دلیل 335
ایک غلط فہمی کا ازالہ 336
نجات پانے والے 337
قرآنِ عربی کا مفہوم 337
تصریفِ وعید کا مفہوم 338
آنحضرت ﷺ کو ہدایت 339
ربطِ کلام 339
ابلیس کی بات ماننے کا سبب 340
حضرت آدمؑ کی فروگزاشت اور ابلیس کی نافرمانی میں فرق 340
حضرت آدمؑ کو ابلیس کی دشمنی سے آگاہی 343
جنت کی تعریف 344

Marfat.com

ابلیس کی تزویر 344
ابلیس کے فریب کا اثر 346
عصٰی، غوٰی کا مفہوم 346
اجتباء کا مفہوم 347
ابلیس اور آدم میں اصل تعلق 348
ذکر سے اعراض کا نتیجہ 349
ایک غلط فہمی کا ازالہ 350
قیامت میں اعراض کا نتیجہ 351
احساسِ زیاں 352
عربوں کے مطالبے کا جواب 353
عذاب میں تاخیر کا سبب 355
آنحضرت ﷺ کو صبر کی تلقین اور نماز کی تاکید 356
اوقاتِ نماز کا تعین 357
آیت کی ترکیب 358
آیت کے مختلف مفاہیم 358
آنحضرت ﷺ کا بلند مرتبہ 359
امت کیلئے درس 360
تربیت کیلئے نماز کی اہمیت 361
اہل کا مفہوم 361
ایک قیمتی اشارہ 362
نشانی کا مطالبہ کرنے والوں کو جواب 363
آخری وارننگ 364

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْاَنْبِیَآءِ

سُوْرَۃ کا تعارف 366
نام 366
زمانۂ نزول 366

Marfat.com

قریش کے رویئے پر تنبیہ 370
محاسبے کا مفہوم 371
اعراض کی کیفیت 372
مشکل الفاظ کی تشریح 373
قریش کے اعراض کا سبب 373
آنحضرت ﷺ کی دعوت کی تاثیر کی مثالیں 374
ایک داعی کا اعتماد علی اللہ 376
مشرکین کے اشکالات کی تعبیر "اضغاثِ احلام" کا مفہوم 376
آنحضرت ﷺ پر شاعر ہونے کا الزام 377
ایک خلجان کا ازالہ 378
آنحضرت ﷺ کو تسلی 379
آپ ﷺ کے بشر ہونے میں حکمت 380
انبیائے کرام انسانی احتیاجات سے ماورا نہیں ہوتے 380
نبی حیاتِ جاوداں لے کر نہیں آتے 381
رسول کی تکذیب ہلاکت کا باعث ہے 382
آیت کے مختلف مفاہیم 383
تاریخ کا حوالہ 387
غلط فہمی کا ازالہ 387
عذاب سے کوئی پناہ نہیں 388
ایک طنزیہ اسلوب 388
بعد از وقت اعتراف کام نہیں آتا 389
ایک توجیہ، ایک تبصرہ 390
اللہ جیسی ذات سے کھیل اور کارِ عبث کا صدور ناممکن ہے 391
آیت کے دو مفہوم 392
شرک کی تردید 393
مشرکین کے ایک واہمہ کا رد 394
مشرکین کی ایک دلیل کا جواب اور توحید کا اثبات 394

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی عظمت 396
شرک کی تردید میں ایک نقلی دلیل 397
تاریخ نبوت سے استشہاد 397
اللہ تعالیٰ کے دربار میں فرشتوں کی حیثیت 398
شفاعت کون کرے گا 399
شرک اللہ تعالیٰ کے مقام سے جہالت کا نتیجہ ہے 400
توحید اور معاد پر آفاق اور مشاہدات کی شہادت 403
پہاڑوں کی نشانیوں کی طرف اشارہ 405
آسمان کی نشانیوں کی طرف اشارہ 406
رات اور دن کی عنایات کی طرف اشارہ 406
رسول کے بشر اور فانی ہونے پر اعتراض کرنے والوں کو جواب 408
گزشتہ اعتراض کا جواب ایک دوسرے پہلو سے 409
مخالفین کا شرافت سے گرا ہوا رویہ 410
مٹی کی مورتوں سے خدا سے بڑھ کر محبت بلکہ عصبیت 410
مشکل الفاظ کی تشریح 411
عذاب کیلئے جلد بازی کا جواب 411
مخالفین کے رویئے پر اظہارِ حسرت 412
آنحضرت ﷺ کو تسلی 413
عذاب کا مطالبہ کرنے والوں سے ایک سوال 415
ایک غلط فہمی کا ازالہ 416
مخالفین کے انکار کا اصل سبب 417
ایک وارننگ 418
ایک مزید تنبیہ 419
مشکل الفاظ کی تشریح 420
مَوَازِیْنَ کے جمع لانے کی وجہ 420
گزشتہ انبیائے کرام سے استشہاد 422
تورات کی تین خصوصیات 422

Marfat.com

حضرت داؤدؑ درویش بھی تھے اور شہسوار بھی 452
حضرت سلیمان علیہ السلام پر انعامات 453
آیت کی تشریح دوسری آیات کی روشنی میں 455
صبر کے حوالے سے حضرت ایوب علیہ السلام کا اسوہ 456
یہ تینوں انبیائے کرام صبر کی تصویر ہیں 461
حضرت یونس علیہ السلام کی سرگزشت 461
بعض جملوں کی تشریح 463
حضرت یونس علیہ السلام کی دُعا کی قبولیت 465
حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا کی قبولیت 466
حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا کا مقصد 466
حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ 467
خلاصۂ بحث 468
دین میں اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ 469
بہت بڑی بشارت 471
ایک وارننگ 472
یاجوج و ماجوج سے مراد 473
ایک تحقیق 474
یاجوج و ماجوج کا ظہور قریب قیامت کی علامت ہے 475
قیامت سر پر کھڑی ہے 475
انسان کی اصل کوتاہی 476
تمہارا اعتراف کام نہیں آئے گا 476
ایک واضح اور بے ساختہ دلیل 477
کفار کی چیخ و پکار 478
ایک اعتراض کا جواب 478
ایک حیرت انگیز اعزاز 479
فزعِ اکبر سے کیا مراد ہے 480
مشکل الفاظ کی تشریح 480

Marfat.com

روزِ قیامت کی ہولناکی 480
ذکر اور زبور کی وضاحت 482
الارض سے کیا مراد ہے 483
بلاغ کا مفہوم 487
رحمت کی وضاحت 488
رحمت کی بنیاد وحدتِ الوہیت ہے 489
فیصلہ کن تنبیہ 490
آنحضرت ﷺ کی دُعا 491

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْحَجِّ

سُوْرَةُ کا تعارف 493
نام 493
زمانۂ نزول 493
مضامین 494
سُوْرَةُ الْحَجِّ 497
نسخۂ اصلاح 499
قیامت کے زلزلے کی تصویر 500
قیامت کی ہولناکی کی مزید وضاحت 501
آنحضرت ﷺ کی دعوت کے جواب میں بغیر علم کے حجت بازی 502
شیطان کی پیروی 503
قیامت پر انسان کی اپنی ذات سے استشہاد 504
نطفہ سے انسان کی تخلیق بجائے خود حیرت انگیز ہے 504
سلسلۂ کلام کی طرف رجوع 506
بارش سے قیامت پر دلیل 507
خلاصۂ بحث 507
اللہ ہی حق ہے 508
وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے 509

Marfat.com

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے 509
قیامت آ کر رہے گی 509
مجادلین بے عقل اور امی محض تھے 510
آباء پرستی عصبیت اور تکبر پیدا کرتی ہے 511
استکبار کی سزا رسوائی اور عذاب نار ہے 511
آخرت کا عذاب کرتوتوں کا نتیجہ ہے 512
دشمنانِ دین کی دشمنی کا ایک رنگ اور ایمانی زندگی کا ایک پہلو 515
یہ کردار آج بھی موجود ہے 517
مشرکین کا رویہ اور دعا کا مفہوم 519
مشرکین کی حماقت 520
مخلصین کا انجام 521
ضمیر مفعول کا مرجع 521
مدّ سبب کا مفہوم 522
اللہ سے مایوسی و بدگمانی کا انجام 523
دلائل کب بے اثر ہوتے ہیں؟ 524
سنت اللہ کا بیان 525
اسلام کے مخالف گروہ 525
کائنات کی ہر چیز اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے 527
اسلام کے متحارب گروہوں کا انجام 529
اہلِ حق کا انجام 531
روئے سخن قریش کی طرف اور ان کے جرائم 532
مسجدِ حرام سے کیا مراد ہے؟ 534
اللہ کے گھر کی عظمت 536
حضرت ابراہیم اور بیت اللہ کی تاریخ 539
تعمیر بیت اللہ کے مقاصد 539
حضرت ابراہیم کو منادی کا حکم 540
حج کی دنیوی برکات 541

Marfat.com

حج کی مخفی برکات 542
جانوروں کی قربانی اظہار شکر ہے 542
مشرکین کی غلط فہمی کا ازالہ 543
حج کے آخری مناسک 543
نذر کا مفہوم 544
بیت عتیق 545
تمام حرمات الٰہی کے احترام کی ہدایت 546
شعائر کا مفہوم اور ان کے احترام کی شرط 547
ھدی سے متعلق ضروری ہدایات 548
قربانی کی قدامت اس کی اہمیت کی دلیل ہے 550
بُدْن کی تحقیق 552
اونٹوں کی قربانی کے بطور خاص ذکر کا سبب 552
قربانی کا ایک اصول 552
اونٹ کو ذبح کرنے کا طریقہ 553
ایک غلط فہمی کا ازالہ 554
یُدٰفِعُ کا مفہوم 555
مظلوم مسلمانوں کو بشارت 555
مسلمانوں کو جہاد کی اجازت 559
اجازت کا سبب 560
جہاد کی حکمت 562
الفاظ کی وضاحت 562
مسلمانوں کیلئے اقتدار کی پیش گوئی 564
آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی تاریخ کی روشنی میں 565
مشکل الفاظ کی تشریح 566
متذکرہ حقیقت کی تائید 567
عبرت پذیری سے گریز کا انجام 567
ایک مغالطے کا ازالہ 569

Marfat.com

قریش کو وارننگ 569
آنحضرت ﷺ کی حیثیت 571
ایک کوتاہ فہمی کا ازالہ 573
مغفرت اور رزقِ کریم کا مفہوم 573
معاندین کو مکمل انذار 574
سعی فی المعاجزۃ کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کو تسلی 575
تمنّی اور امنیۃ کا مفہوم 575
ایک سوال کا جواب 578
آنحضرت ﷺ کیلئے مزید تسلی 580
عقیم کا مفہوم 581
کفار کیلئے وعید اور مسلمانوں کو تسلی 581
راہِ ہجرت میں اول قدم بھی منزل کا حکم رکھتا ہے 583
رزقِ حسن سے مراد؟ 584
مہاجرین کیلئے عظیم بشارت 584
ایک اہم اعلان 585
ایک اسلوب 586
عفو غفور کے حوالے سے ایک اہم ہدایت 586
وعدۂ نصرت پر اللہ کی قدرت سے استشہاد 587
وعدۂ نصرت کی ایک اور دلیل 587
لطیف کا مفہوم 588
قریش کو تنبیہ 589
انسان کے کردار کی بنیادی خرابی 593
قریش اور یہود کے اعتراضات 594
تفویض کا حکم 595
قریش پر عتاب 596
مشرکین کے مصنوعی سہارے بیکار ثابت ہوں گے 597
اہلِ کفر کا کفر پر اصرار اور اسلام پر برہمی 598

Marfat.com

مشرکین کے شرکاء کی حقیقت 601
فرشتوں کی حیثیت 602
اللہ کے علم اور قدرت کی وسعت 603
امتِ مسلمہ کا منصب 603
مطلوبہ صفات کی تیاری کی ہدایت 603
نماز کا حکم 604
اللہ کی اطاعت 605
خلقِ خدا کی خدمت 605
جہاد کا مفہوم اور اس کی اقسام 606
جہاد کے حکم کا سبب 607
دین میں حرج نہ ہونے کا مفہوم 607
امتِ مسلمہ کے وجود کا مقصد 608

☆☆☆☆☆

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاس

سُوْرَۃُ الْکَھْفِ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْکَھْفِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورت کا نام:۔

اس سورت کا نام الکھف ہے۔اس کے پہلے رکوع کی نویں آیت میں الکھف کالفظ آیا ہے،یہ نام اسی سے ماخوذ ہے۔مقصد صرف یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس مین الکھف کالفظ آیا ہے اور اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔یہ مقصود نہیں کہ الکھف کی لغوی یا اصطلاحی تشریح پیشِ نظر ہے۔

زمانۂ نزول:۔

اس سورۃ کے مندرجات سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ ان سورتوں میں سے ہے جو مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب اہلِ مکہ نے مسلمانوں پر مصائب کی انتہا کردی تھی۔صاحب تفہیم القرآن کا خیال ہے کہ مکی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے،جن میں تیسرا دور 5 سنِ نبوی کے آغاز سے شروع ہو کر 10 سنِ نبوی تک چلتا ہے۔یہ دور وہ ہے جب مسلمانوں پر اذیت رسانی میں اس حد تک اضافہ کر دیا گیا تھا کہ بیشتر مسلمانوں کیلئے مکے کی سرزمین پر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔خاص طور پر مسلمانوں کا وہ طبقہ جو غرباء سے تعلق رکھتا تھا اور جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہ تھا ان کیلئے تو اس شہر کی فضا میں سانس لینا بھی مشکل بنا دیا گیا تھا۔اب ان کیلئے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دیں اور ایک ایسی جگہ ڈھونڈیں جہاں وہ آزادی سے اللہ تعالیٰ کا نام لے سکیں۔چنانچہ اس دور میں جو لوگ ہجرت کر سکتے تھے،انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور باقی لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ شعب ابی طالب میں انتہائی اذیت ناک دن گزارے۔چنانچہ ایسے حالات میں مسلمانوں کو حوصلہ دینے کیلئے اس سورت میں سب سے پہلے قرآنِ کریم کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی رہنمائی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔اور یہ بات واضح کی گئی ہے کہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا اگر کوئی راستہ ہے تو صرف وہ ہے جو اس کتاب نے تمہارے سامنے کھولا ہے۔اس لئے اس راستے کو چھوڑنا یا پسپائی اختیار کرنا اپنے آپ کو تباہ کر دینے کے مترادف ہے۔رہی یہ بات کہ لوگ اسے برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں،تو یہ دنیا کا پہلا واقعہ نہیں۔جب بھی دنیا میں حق آیا ہے تو اہلِ باطل نے حق کو قبول کرنے والوں کیلئے ہمیشہ جینا مشکل بنایا ہے۔لیکن حالات نے رفتہ رفتہ ثابت کر دیا کہ کامیابی و کامرانی حق کے راستے پر چلنے اور مصائب برداشت کرنے میں ہے۔باطل بالآخر سرنگوں ہوتا اور مٹ جاتا ہے کیونکہ اس کا مقدر مٹ جانا ہے۔اس کی دلیل کے طور پر اصحابِ کہف کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح چند نوجوانوں نے

Marfat.com

ظالم حکومت کے مقابلے میں اپنے دین پر قائم رہنے کی کوشش کی، لیکن جب دیکھا کہ حکومت نے ان کی زندگی کے راستے بند کر دیئے ہیں تو انہوں نے دین چھوڑنے کی بجائے شہر چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لے لی، پھر اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کی حفاظت کی بلکہ ان کی قربانی کی برکت سے پورا شہر تائب ہو کر توحید کی آغوش میں آ گیا۔ اور اصحابِ کہف کو قیامت تک کیلئے حق پر استقامت کی مثال کے طور پر زندہ جاوید بنا دیا گیا۔

شانِ نزول:۔

امام ابنِ جریر طبریؒ نے بروایت حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ جب مکہ معظمہ میں آہستہ آہستہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کے اثرات پھیلنے لگے تو قریشِ مکہ کو فکر مندی ہونے لگی، وہ باہم سر جوڑ کر بیٹھے کہ اس دعوت کے اثرات کو کس طرح روکا جائے۔ اس کیلئے انہوں نے مختلف طریقے اختیار کئے، جن میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ آپؐ سے ایسے سوالات کئے جائیں جو آپؐ کے حدودِ علم سے ماوراء ہوں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپؐ بھی باقی قریشِ مکہ کی طرح اُمی محض ہیں۔ آپؐ نے بھی کہیں لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ اس لئے آپؐ کسی کتاب سے استفادہ نہیں کر سکتے اور کسی نہ علمی شخصیت سے کبھی آپؐ کا تعلق رہا کہ آپؐ زبانی معلومات کا کوئی معتد بہ ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہوں۔ لیکن علمی سوال کرنے کیلئے بھی تو علم درکار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی بے بضاعتی کو دیکھتے ہوئے اہلِ کتاب سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اپنے دو آدمی نضر بن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کو مدینہ طیبہ کے علمائے یہود کے پاس بھیجا۔ ان دونوں نے علما سے گزارش کی کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے شہر میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپؐ ہمیں کچھ سوالات بتائیں، کیونکہ آپ سابقہ آسمانی کتابوں کے جاننے والے ہیں جو ہم اس نبوت کے دعویدار سے پوچھیں، اگر وہ ان کا جواب دے سکا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کا نبی ہے۔ اور اگر وہ جواب نہ دے سکا تو اس کا بھرم کھل جائے گا اور لوگ اس کی حقیقت سے واقف ہو جائیں گے۔ چنانچہ علمائے یہود نے انہیں تین سوالات بتائے اور کہا کہ اگر اس دعویٰ نبوت کرنے والے نے ان سوالوں کا صحیح جواب دے دیا تو سمجھ لو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نبی اور رسول ہے۔ ایک تو اس سے ان نوجوانوں کا حال دریافت کرو جو قدیم زمانے میں اپنے شہر سے نکل گئے تھے۔ اور دوسرا اس سے یہ پوچھو کہ اس شخص کا کیا حال ہے، جس نے دنیا کے مشرق و مغرب اور تمام زمین کا سفر کیا تھا؟ اور تیسرے اس سے روح کے متعلق سوال کرو، کہ وہ کیا چیز ہے؟

بعض اہلِ علم کا گمان ہے کہ تیسرا سوال روح سے متعلق نہیں بلکہ قصہ خضرؑ سے متعلق تھا اور ان کی دلیل یہ ہے کہ سورۃ کھف ان سوالوں کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس میں تیسرا سوال حضرت خضرؑ سے متعلق ہے، روح سے متعلق نہیں۔ روح سے متعلق سوال سورۃ بنی اسرائیل میں ذکر کیا گیا ہے اور وہیں اس کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ لیکن دیگر مفسرین محولہ بالا ابن جریر طبریؒ کی روایت کے مطابق تیسرا سوال روح ہی سے متعلق سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سوال کا جواب چونکہ نہایت اختصار سے دینا مقصود تھا، اس لئے اسے سورۃ بنی اسرائیل میں ذکر کر دیا گیا ہے اور اسی سبب سے سورۃ کھف کو سورۃ بنی اسرائیل کے بعد رکھا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

سورۃ کی خصوصیات:۔

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ جس شخص نے سورۃ کھف کی پہلی دس آیتیں حفظ کر لیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا اور یہی فضیلت حضرت ابوالدرداءؓ نے ایک دوسری روایت میں سورت کی آخری دس آیتوں کے متعلق بیان کی ہے۔

Marfat.com

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حافظ ضیا مقدسی نے اپنی کتاب "مختارہ" میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھ لے وہ 8 روز تک ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ اور اگر دجال نکل آئے تو یہ اس کے فتنہ سے بھی بچا رہے گا۔

روح المعانی نے دیلمی سے حضرت انسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورۂ کہف پوری کی پوری ایک وقت میں نازل ہوئی اور 70 ہزار فرشتے اس کے ساتھ آئے جس سے اس کی عظمتِ شان ظاہر ہوتی ہے۔

مضامین:۔

آپؐ کی دعوت اور تعلیم کا سرچشمہ چونکہ قرآنِ کریم ہے، اس لئے سب سے پہلے اس کے محکم الدلالت، واضح البیان، ہر کجی سے پاک اور ہر الجھن سے مبرا ہونے کا ذکر فرمایا پھر آنحضرت ﷺ کو قریشِ مکہ کے رویئے پر صبر کی تلقین کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ آپؐ کی ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے۔ اگر یہ بدبخت آپؐ پر ایمان نہیں لا رہے تو آپؐ کو اس پر اس حد تک دل گرفتہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپؐ کی زندگی کیلئے خطرات پیدا ہو جائیں اور آپؐ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل نہ رہیں۔ رہی یہ بات کہ قرآنِ کریم کے اعجاز اور آپؐ کی دلآویز شخصیت کے باوجود یہ ایمان نہیں لا رہے تو اس میں نہ آپؐ کی کسی کوتاہی کو دخل ہے، نہ قرآنِ کریم کی کسی کجی کو۔ بلکہ یہ لوگ زخارفِ دنیا کی محبت میں اس قدر اندھے ہو گئے ہیں کہ انہیں اس سے ہٹ کر کسی اور بات کی طرف توجہ دینا مشکل ہو گیا ہے۔ آپؐ انہیں دعوت دیتے رہئے، اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کرنا سراسر ان کی اپنی ذمہ داری ہے، آپؐ کو اس سے فکر مند نہیں ہونا چاہئے۔

اصحابِ کہف کے واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جس سے اس کے اندر مضمر حکمتیں اور نصیحتیں کھل کر سامنے آ گئی ہیں۔ اصحابِ کہف کے حالات کو دیکھتے ہوئے صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ اسی صورتحال سے گزر رہے تھے جو مسلمانوں کو درپیش تھی۔ وقت کی جابر قوتوں کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی۔ بجز اس کے کہ وہ صبر کرتے اور تبلیغ و دعوت کے کام میں لگے رہتے لیکن جب معاملہ حد سے بڑھتا ہوا دیکھا تو اس شہر سے ہجرت کر گئے۔ چاہے اس کیلئے انہیں کسی غار کی پناہ ہی کیوں نہ لینی پڑی۔ اس سے مسلمانوں کو یہ سبق دینا مقصود ہے کہ آپ کیلئے بھی یہی راستہ کھلا ہے۔ امکانی حد تک صبر کیجئے۔ اور اگر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگے یا زندگی کیلئے یقینی خطرات پیدا ہو جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے وطن سے ہجرت کر جائیے۔

قریش کو اس واقعہ کے آئینہ میں اپنی اصل شکل دیکھنے کا موقع دیا گیا ہے کہ غور سے دیکھو، تم اسی مسند پر بیٹھے ہو جس پر اس وقت کا بادشاہ بیٹھا تھا، تم اسی طرح ظلم توڑ رہے ہو جیسے وہ توڑتا تھا۔ اور تم بھی اہلِ حق کو ان کی حق پسندی کی انتہائی سزا دینا چاہتے ہو، جیسے وہ دے رہا تھا۔ لیکن پھر دیکھو اس کے ظلم کا انجام کیا ہوا اور اصحابِ کہف کے صبر کو کیسا پھل لگا۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ تم یہاں بھی اسی صورتحال کو پیدا ہوتا دیکھو گے، ناکامی تمہارا مقدر ہو گی اور کامیابیاں مسلمانوں کے قدم چومیں گی۔

نبی کریم ﷺ کو دولتِ دنیا کے متوالوں سے بے نیاز ہو کر اپنے ان غریب اور نادار ساتھیوں کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جو اگرچہ دولتِ دنیا سے محروم تھے، لیکن ایمان کی دولت سے مالا مال اور شب و روز اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے دین کی دعوت میں سرگرم تھے۔ اسی ذیل میں آپؐ کو منکروں کی حالت پر غم کھانے سے روک دیا گیا ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے، یہ سنتِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور سنتِ الٰہی کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

Marfat.com

قصۂ آدم وابلیس سے قریشِ مکہ کے سامنے یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ابلیس اولادِ آدم کا دشمن ہے اور اس نے پہلے دن ہی اپنی اس دشمنی کو پوری طرح واضح کر دیا تھا۔ اور حق و باطل کے ہر معرکے میں اس نے ہمیشہ اہلِ باطل کا ساتھ دیا، لیکن تم ایسے بدنصیب واقع ہوئے ہو کہ تم ہمیشہ ابلیس اور اس کے گروہ کا ساتھ دیتے ہو اور اس نے جو تمہاری گمراہی کے راستے کھول رکھے ہیں تم ان پر چلنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہو اور تمہاری بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری رسول اور آخری کتاب اتار کر تم پر جو احسانِ عظیم کیا ہے اس کی قدر کرنے کی بجائے تم قدم قدم پر اس کیلئے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہو اور بجائے اللہ تعالیٰ سے رحمت مانگنے کے اس سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ کا رسول تمہارے پاس رحمت کا پیغام لے کر آیا ہے، لیکن تم اس کی طرف سبقت کرنے کی بجائے عذاب کی طرف سبقت کرنا چاہتے ہو۔

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ کے ضمن میں بہت ساری حقیقتیں واشگاف فرمائی گئی ہیں۔ سب سے پہلی جو چیز نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب ارادۂ الٰہی سے ہوتا ہے اور ارادۂ الٰہی سرتاسر حکمت و برکت پر مبنی ہوتا ہے۔ ظاہری آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں ضروری نہیں کہ نتیجہ اس کے مطابق نکلے۔ اہلِ حق دیکھنے کو نہایت کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہیں اور اہلِ باطل داد عیش دیتے ہیں۔ جس شخص کو اس بات کا یقین نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک ابتلاء ہے، حقیقت وہ نہیں جو نظر آ رہی ہے۔ اب ارادۂ الٰہی کا ظہور ہوگا تو اصل حقیقت سامنے آئے گی، وہ کبھی بھی حق پر استقامت نہیں دکھا سکتا اور کافر اسی غلط فہمی کی وجہ سے حق کو پہچاننے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ میں بار بار صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ اور مختلف واقعات کے پردے میں دکھایا گیا ہے کہ جو نظر آتا تھا وہ کیا تھا اور جو حقیقت سامنے آئی تو وہ کیا تھی۔ قریش کو بتایا جا رہا ہے کہ حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو اور مسلمانوں کو تلقین کی جا رہی ہے کہ کبھی کسی سراب کو دیکھ کر فریبِ نظر کا شکار مت بنو۔

ایک سلطانِ عادل کا قصہ بیان کی گیا ہے جسے ذوالقرنین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے قریش کے سرکش لوگوں کو بتلانا مقصود ہے کہ تم اپنے جس مال و دولت اور کرّوفر پر اتراتے ہو، ذوالقرنین کی حکومت اور طاقت کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت ہے، لیکن وہ اتنا طاقتور حکمران ہونے اور اتنے عظیم الشان ذرائع کا مالک ہونے کے باوجود ہمیشہ اپنے خالق کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھتا تھا۔ وہ ہر کامیابی کو اللہ تعالیٰ کا انعام اور اس کا فضل سمجھتا تھا۔ اور ہر قدم اس کی مرضی کے مطابق اٹھاتا تھا۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم معمولی سا اقتدار پا کر جامہ میں پھولے نہیں سماتے اور اس کے نشے میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ اور آخرت کا مذاق اڑاتے ہو۔

سورت کے آخر میں ایک نئے اسلوب کے ساتھ ان تمام حقائق کو ذکر فرمایا گیا ہے جو مکی سورتوں کے بنیادی مضامین کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا ہے کہ معجزے اور نشانیاں دکھانا اللہ کا کام ہے، میں تو اللہ کا ایک بندہ ہوں، تمہیں وہی سناتا ہوں جس کی مجھے وحی کی جاتی ہے۔ اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ میں جس بات کی دعوت دے رہا ہوں، اسے قبول کرو اور اپنی دنیا و آخرت بنا لو۔

Marfat.com

اٰیَاتُهَا ۱۱۰	سُوْرَةُ الْکَهْفِ مَکِّیَّةٌ	رُکُوْعَاتُهَا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ
عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ
الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾ مَّاکِثِیْنَ فِیْهِ
اَبَدًا ﴿۳﴾ وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ
عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ
یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا ﴿۵﴾ فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ
یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً
لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا
صَعِیْدًا جُرُزًا ﴿۸﴾ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَهْفِ وَالرَّقِیْمِ
کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾ اِذْ اَوَی الْفِتْیَةُ اِلَی الْکَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ
اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾ فَضَرَبْنَا عَلٰۤی
اٰذَانِهِمْ فِی الْکَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ
الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ﴿۱۲﴾

Marfat.com

رکوع: ا۔ (ہر طرح کی تعریف اس اللہ کیلئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔ ۱) بالکل ہموار اور استوار تاکہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کردے اور بشارت دے دے ایمان لانے والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ ان کیلئے بہت اچھا بدلہ ہے۔ ۲) جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ۔ ۳) اور وہ خبردار کرے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد بنائی ہے۔ ۴) ان کے پاس اس باب میں کوئی علم نہیں اور نہ ان کے باپ دادا کو (اس بارے میں کوئی علم تھا) بڑی ہے وہ بات جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے، وہ صرف جھوٹ بول رہے ہیں۔ ۵) تو شاید آپ گھونٹ ڈالیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اس غم کی وجہ سے اگر وہ اس بات پر ایمان نہیں لاتے۔ ۶) (ہم نے بنایا ہے جو کچھ زمین پر ہے اس کیلئے سنگار تاکہ ہم لوگوں کا امتحان کریں کہ ان میں کون اچھا عمل کرتا ہے۔ ۷) اور ہم بالآخر کردینے والے ہیں جو کچھ اس زمین پر ہے سب کو چٹیل میدان۔ ۸) کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور رقیم والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں تھے۔ ۹) (جس وقت کچھ نوجوانوں نے غار میں پناہ لی اور انہوں نے دعا کی اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے اس معاملے میں ہمارے لئے رہنمائی کا سامان فرما۔ ۱۰) تو ہم نے غار میں کئی سالوں کیلئے انہیں تھپک کے سلادیا۔ ۱۱) پھر ہم نے ان کو بیدار کیا کہ دیکھیں دونوں گروہوں میں سے کون مدتِ قیام کو صحیح شمار کرتا ہے۔ ۱۲)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۟ۜ ① قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ② مّٰكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۙ③ وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۗ④

(ہر طرح کی تعریف اس اللہ کیلئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔ ۱) بالکل ہموار اور استوار تاکہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کردے اور بشارت دے دے ایمان لانے والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ ان کیلئے بہت اچھا بدلہ ہے۔ ۲) جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ۔ ۳) اور وہ خبردار کرے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد بنائی ہے۔ ۴)

انسان رہنمائی کا محتاج ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا تو اسے زندگی گزارنے کیلئے رہنمائی کے وسائل بھی مہیا کیے۔ محسوسات میں رہنمائی کیلئے حواسِ خمسہ عطا کیے اور معقولات میں عقل عطا فرمائی۔ لیکن زندگی کے وہ دائرے اور وہ شعبے جو حواس اور عقل کی حدود سے ماوراء ہیں جن کے بارے میں یا تو یہ دونوں فیصلہ نہیں کرسکتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو اپنی نارسائی کے باعث عموماً غلطی اور کوتاہی کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے دائروں اور شعبوں میں انسان کی رہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی سے انسان کو نوازا ہے۔ انسان اپنی جسمانی اور دماغی ضرورتوں کی تکمیل حواس اور عقل کی رہنمائی میں بروئے کار لاسکتا ہے۔ اس کیلئے یہ بات بہت آسان ہے کہ اپنی اشیائے خورد و نوش اور زندگی کی دوسری ضروریات کو ان دونوں کی مدد سے

Marfat.com

ایجاد کرے اور ترقی دے۔ چنانچہ ہم آج جو ماکولات، مشروبات اور ملبوسات میں تنوع دیکھتے ہیں یہ سب انسانی عقل کی کارفرمائی ہے۔ اس طرح زندگی میں ہم اپنے گردوپیش میں جو ہما ہمی اور زیب و زینت دیکھتے ہیں یہ سب انسانی عقل کے معجزے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی عقل سے یہ معلوم کرنا چاہے کہ میرا خالق کیسا ہے؟ وہ کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے اور کن باتوں سے راضی ہوتا ہے؟ میری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہے؟ عالمِ برزخ کیا ہے؟ عالمِ غیب کیا ہے؟ روح کیا چیز ہے؟ بعث بعد الموت کی حقیقت کیا ہے؟ اعمال کی جزا اور سزا کی نوعیت کیا ہوگی؟ جنت اور جہنم کیا ہے؟ عالمِ آخرت کی صفات کیا ہیں؟ انسان کی روحانیت کن باتوں سے توانا ہوتی ہے اور کن اسباب سے مردہ ہو جاتی ہے؟ ایسے بے شمار سوال ہیں جن کا جواب انسان کیلئے اپنی عقل کی مدد سے ممکن نہیں۔ جس طرح حواس اور عقل کی بخشش اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان حیوانوں سے بدتر ہے۔ جو چیز اسے حیوانوں سے الگ کرتی ہے وہ اس کا جوہرِ عقل ہے جس پر وہ جس قدر بھی اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرے تھوڑا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی وہ ہدایت اور رہنمائی ہے جو اس نے وحیِ الٰہی کے ذریعہ عطا فرمائی ہے کیونکہ حواس اور عقل سے آدمی اپنی دنیا تو بنا سکتا تھا، کھانے پینے اور اوڑھنے پہننے کے طریقے تو اختیار کر سکتا تھا لیکن انسانیت اور اقدارِ انسانیت، مکارمِ اخلاق، معرفتِ حق، ہمدردی و خیر خواہی، سچ اور اس پر استقامت، ایثار اور قربانی، عزتِ نفس اور خودداری جیسی کتنی صفات ہیں جنہیں انسان اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ غور فرمایئے وہ زندگی کیسی زندگی ہوتی جس میں ان صفات کا نہ کوئی عکس ہوتا نہ عمل دخل ہوتا۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ صفات ہیں جنہیں انسانیت کا حقیقی سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ انسان کی تخلیق اور تربیت کے بعد انسان پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ان بنیادی وسائل کا فراہم کرنا ہے جن سے یہ صفات وجود میں آتی اور جنم لیتی ہیں۔

رہنمائی کا سرچشمہ قرآن وسنت ہیں

پیشِ نظر آیت کریمہ میں ان دو بنیادی وسائل کا ذکر فرمایا گیا ہے جو انسانی ہدایت کا سرچشمہ ہیں اور جن کے ذریعے انسان کو انسانیت نصیب ہوتی ہے اور زندگی کا وہ طریقہ اور رویہ عطا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں انسان، انسان بنتا ہے، اس کی زندگی پاکیزہ ہوتی ہے اور آخرت میں اس کے سرخرو ہونے کا سامان ہوتا ہے۔ وہ دو بنیادی وسائل یا سورس اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کا رسول ؐ ہیں۔ اور پھر ان وسائل کی قدر افزائی اور ہمارے دلوں میں اس کی عظمت اتارنے کیلئے اپنی حمد اور اپنا شکر ادا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ ہر طرح کی حمد اس اللہ کیلئے ہے یا ہر طرح کا شکر اس اللہ کیلئے ہے۔ (کیونکہ حمد کے یہ دونوں ہی معنی کئے جا سکتے ہیں) جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری، بندے سے مراد یہاں رسول کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے اور کتاب سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ یہ دونوں ہمارے لئے رہنمائی اور ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ قرآن ہمیں اصول دیتا ہے اور رسول کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہمیں ان کے انطباق کی تعلیم دیتی ہے۔ قرآن متن ہے آنحضرت ﷺ اس کی شرح ہیں۔ قرآن قول ہے اور حضورؐ کی زندگی اس کا عمل ہے۔ قرآن ایک تھیوری ہے اور آنحضرتؐ کی ذات اس کا پریکٹیکل ورک ہے۔ قرآن کریم خاموش ہدایت ہے اور آنحضرتؐ کی زندگی بولتی ہوئی ہدایت اور قرآنِ ناطق ہے۔ دونوں مل کر وہ دستور اور قانون مہیا کرتے ہیں جسے ہم اسلامی شریعت اور اسلامی آداب کہتے ہیں۔ ان دونوں پر چونکہ انسانی زندگی کا دارومدار ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انسانوں کی دنیا اور آخرت کا دارومدار ہے۔ اس لئے ازبس ضروری ہے کہ اس کتاب میں کوئی کجی نہ ہو۔ کہیں بھی کسی غلط بات یا کسی باطل کی طرف میلان نہ ہو۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس کتاب کو ہر طرح کی کجی سے محفوظ رکھا۔ نہ اس کے الفاظ میں کجی ہے نہ معنی میں۔ نہ اس کے بیان میں لکنت

Marfat.com

ہے نہ اس کے ابلاغ میں نقص۔ اس کا ہر لفظ اس کے جملوں میں اس طرح روشن ہے جیسے انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے۔ اس کا ہر جملہ بلاغت کا شاہکار ہے۔ اس کا کوئی محاورہ مرورِ ایام کے ساتھ تغیر کا شکار نہیں ہوا۔ اس کا کوئی اسلوب آج تک متروک نہ ہوسکا۔ اس کا پیش کردہ نظام ہر اختلاف سے پاک، ہر نارسائی سے مبرا اور ہر ناکامی سے پاک ہے۔ جب بھی اسے روبہ عمل لایا گیا زندگیوں میں انقلاب آگیا، فضا میں بہار آگئی، ہر چیز کی پیداوار بڑھ گئی، زمین سونا اگلنے لگی، نفرتیں محبتوں میں بدل گئیں، حریص لوگ قناعت آشنا ہوگئے، دولت مند دولت کے امین بن گئے اور غریب لوگ بے نیاز اور خوددار ہوگئے۔ غرضیکہ لفظی، معنوی اور عملی تینوں اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے اور ہر الجھن سے محفوظ ہے۔

قَيِّمًا کا معنی و مفہوم

دوسری آیت کا پہلا لفظ قَيِّمًا پہلی آیت میں لَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا کی تاکید بھی ہے اور مثبت انداز میں وضاحت بھی۔ یعنی قرآنِ کریم میں کجی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قَيِّم ہے، قَيِّم کا ایک معنی ہوتا ہے، مستقیم۔ مستقیم وہ ہوتا ہے جس میں کوئی ادنیٰ کجی اور کسی جانب میلان نہ ہو بلکہ اس کی ہر بات حق کے ترازو پر تلنے والی فطرت کے پیمانوں میں پوری اترنے والی اور دلوں میں گھر کر جانے والی ہے۔ انکار کرنے والے اس کا انکار تو کرسکتے ہیں لیکن اس میں کوئی سقم تلاش نہیں کرسکتے۔

قیم کا دوسرا معنی نگران اور محافظ بھی ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآنِ کریم جس طرح اپنی ذات میں ہر قسم کی کجی اور افراط و تفریط سے پاک ہے، اسی طرح یہ دوسروں کو بھی ہر کجی اور افراط و تفریط سے بچانے والا اور بندوں کی تمام مصالح کی حفاظت کرنے والا ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ قرآنِ کریم اپنی ذات میں ہر لحاظ سے کامل اور مکمل ہے۔ اور اپنی رہنمائی میں ہر لحاظ سے نہایت جامع و مانع ہے جو اپنی پیروی کرنے والوں کو بھی کمال اور تکمیل سے نوازتا ہے۔

نزولِ قرآن کا مقصد

اس کے بعد اس کتاب کے نازل کرنے کا مقصد بیان فرمایا گیا ہے کہ پروردگار نے اس کتاب کو اس لئے نازل کیا ہے تاکہ وہ انکار کرنے والوں کو انذار کرے اور ایمان لانے والوں کو بشارت دے۔ اس جملے میں لِيُنْذِرَ کا فاعل اللہ بھی ہوسکتا ہے اور عبد یعنی رسول بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے سے انکار کرنے والوں کو انذار کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کو بشارت دیتا ہے۔ اور اگر اس کا فاعل رسول کو بنائیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اس لئے اتاری ہے تاکہ اس کے رسول کریمؐ انکار کرنے والوں کو انذار کریں اور ایمان لانے والوں کو بشارت دیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انذار کا ذکر پہلے ہے اور تبشیر کا ذکر بعد میں۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اور تبلیغ میں اپنے مخاطب کو پہلے ہر اس برے انجام سے خبردار کرنا چاہئے جو اس کے غلط رویئے کے نتیجے میں پیش آسکتا ہے اور اپنی اصلاح کی صورت میں جو بہتری پیدا ہوسکتی ہے اور اس کے جو فوائد نکل سکتے ہیں اس کی بشارت بعد میں دی جانی چاہئے، لیکن اگر تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی جب دنیا میں مبعوث ہوتے ہیں تو ان کے سامنے سب وہ لوگ ہوتے ہیں جو انہیں نبی اور رسول ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے یہ بات انتہائی معقول ہوگی کہ انہیں ان کے انکار کے خطرناک نتائج سے خبردار کیا جائے۔ اور اگر

Marfat.com

ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف کچھ میلان پیدا ہو تو پھر انہیں بہتر مستقبل کی بشارت دی جائے کیونکہ ایسے لوگ جو سرے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ؐ کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور وہ ان تمام باتوں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ؐ دعوت دے رہا ہے تو ایسے لوگوں کے سامنے اگر اسلام کی قبولیت کے نتیجے میں ملنے والی نعمتوں کا ذکر کیا جائے گا اور بہتر مستقبل کی خبر دی جائے گی تو بجائے اثر قبول کرنے کے وہ اس پر ہنسیں گے۔ اس لئے یہ بات کہ انذار پہلے ہونا چاہیے یا تبشیر، کفار کے حوالے سے تو بالکل واضح ہے۔ لیکن جہاں تک گنہگار مسلمانوں کا تعلق ہے اس کا دارومدار داعی کی اپنی فراست اور فہم وبصیرت پر ہے۔ وہ طبائع کا اندازہ کرنے کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ مجھے اس وقت کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم نبی کریم ﷺ کو دونوں ہی طریقوں پر عمل کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ آپؐ نے کبھی انذار سے کام لیا اور کبھی تبشیر سے۔ کیونکہ طبیعتیں کبھی خوفزدہ ہو کر راہِ راست کی طرف اور مائل بہ عمل ہوتی ہیں اور کبھی ترغیب اور تشویق ان کے اندر جذبہ عمل کو ابھارتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت قرآنِ کریم کی خبر کے مطابق بر و بحر میں فساد پھیل چکا تھا، یعنی دنیا کا کوئی گوشہ اس فساد سے محفوظ نہیں تھا۔ خود وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ کا گھر ایستادہ تھا اور جسے حرم ہونے کی حیثیت حاصل تھی، وہ 360 خداؤں کا مرکز بن چکا تھا اور یہ حرمِ خداوندی حرم کی بجائے تیرتھ معلوم ہوتا تھا۔ پورا جزیرۂ عرب اگرچہ اللہ تعالیٰ کے اس گھر سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا اور سال بہ سال اس کی زیارت کیلئے بھی لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بایں ہمہ ان کی زندگی کا بگاڑ باقی دنیا سے کم نہ تھا۔ فساد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو ان میں پائی نہ جاتی تھی اور اسی بگاڑ اور اللہ تعالیٰ سے دوری کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کو اس سورت کے نزول کے وقت تک کئی سال دعوت دیتے ہوئے گزر چکے تھے، لیکن ان کے بگاڑ میں کوئی قابلِ ذکر کمی نہ آئی تھی۔ ان کی حالت اور ان کے رویئے کو دیکھتے ہوئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے یہ کتاب اس لئے نازل کی ہے تاکہ ہمارا رسول ؐ براہِ راست اہلِ مکہ اور بالواسطہ دوسرے لوگوں کو اس سخت ترین عذاب سے ڈرائے جو انکار کرنے والی قوموں پر ہمیشہ آیا کرتا ہے اور جس کے آنے کے بعد وہ دھرتی بانجھ ہو جاتی ہے اور اس قوم کی جڑ اکھاڑ دی جاتی ہے۔

لِيُنْذِرَ کا فاعل (جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں) اگر اللہ تعالیٰ کو سمجھا جائے تو پھر مِنْ لَّدُنْهُ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو اپنے اہتمام اور خصوصی فضل وکرم سے نازل فرمایا ہے تاکہ اس کا رسول اس کا انکار کرنے والوں کو عذاب سے ڈرائے اور اگر اس کا فاعل آنحضرت ﷺ کو ٹھہرایا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ تعالیٰ کی کتاب کا انکار کرنے والوں کو اس عذاب سے ڈرائے جو معمولی عذاب نہیں ہوگا بلکہ بطورِ خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے گا جو اس کے قہر کا اظہار ہوگا۔

انذار کا ذکر کرنے کے بعد قرآنِ کریم نے اپنے اسلوب کے مطابق تبشیر کا ذکر فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول کی بعثت اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ وہ انکار کرنے والوں کو انذار کریں۔ اسی طرح اس کا یہ مقصد بھی ہے کہ وہ ایمان لانے والوں کو بشارت دیں اور ساتھ ہی اس کے یہ قید بھی لگا دی کہ وہ ایمان لانے والے ایسے ہوں جو نیک اعمال بھی کریں۔ اس پر ہمارے بعض اہلِ علم نے اپنے فہم کے مطابق قرآن وسنت سے استفادہ کر کے اعمالِ صالحہ کی ایک فہرست مرتب کی ہے، لیکن اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہر وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے اور اس کی شریعت کے احکام کے مطابق کیا جائے وہ عملِ صالح کہلاتا ہے۔ اس لئے ہر عمل کرنے والا خوب جانتا ہے کہ میں جو عمل کر رہا ہوں کس نیت سے کر رہا ہوں اور کیا اسلامی شریعت اس کی اجازت دیتی بھی ہے یا نہیں۔ اور میرا ایمان اس کا تقاضا کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ جب ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی گزاری جائے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم ایسے صاحبِ ایمان لوگوں کو بہترین اجر

Marfat.com

عطا فرماتے ہیں۔ دنیا میں اس کا اجر یہ ہے کہ ایک باعمل مومن حیاتِ طیبہ سے نوازا جاتا ہے اور آخرت میں اسے وہ جنت عطا کی جاتی ہے جس کی ایک ایک نعمت اپنا بدل نہیں رکھتی اور پھر یہ کہ نعمتوں بھرا عیش چند روزہ نہیں ہوگا بلکہ جو جنت میں داخل ہوگیا وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ اور اسے ہر وہ نعمت میسر آئے گی جس کی وہ چاہت کرے گا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی چاہتیں ختم ہوجائیں گی لیکن نعمتیں ختم نہیں ہوں گی۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول ان لوگوں کو بھی انذار کرتا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد بنا رکھی ہے۔ اس میں اس دور کے تینوں مشہور اور گمراہ فرقوں کا ذکر آگیا۔ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا ٹھہرا رکھا تھا۔ اور مشرکینِ مکہ کا دعویٰ یہ تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اس مختصر سی آیت میں تینوں کا ابطال فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ ولد کا معنی صرف بیٹا نہیں، اولاد بھی ہوتا ہے جس میں مذکر اور مونث دونوں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے اس سے تینوں گمراہ فرقوں کی تردید ہوجاتی ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا صرف دینی لحاظ سے غلط نہیں بلکہ کوئی معقول آدمی ایسی حرکت کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہیں وہ اس کا بیٹا کیسے قرار دے سکتے ہیں کیونکہ بیٹا اپنے باپ کا ہم جنس ہوتا ہے۔ جس طرح انسان کا بیٹا انسان اور حیوان کا بیٹا حیوان کہلاتا ہے۔ اسی طرح خدا کا بیٹا خدا کہلائے گا تو پھر خدا واحد کیسے رہ گیا۔ اور مزید یہ کہ بیٹے کی احتیاج تو اسے ہوتی ہے جسے بڑھاپے کا اندیشہ ہوتا کہ بیٹا بڑھاپے کی لاٹھی بنے، یا اس بات کی فکر ہو کہ مرنے کے بعد کوئی تو میرا نام لیوا ہونا چاہئے۔ تو جو شخص اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے تصورات رکھتا ہے اس نے صرف اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد ماننے کی حماقت نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا بھی انکار کردیا۔ علیٰ ھذا القیاس اس پر جتنا بھی غور کرتے جایئے یہ بات جہالت اور بے وقوفی کے سوا اور کچھ نہیں کہی جاسکتی۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

(ان کے پاس اس باب میں کوئی علم نہیں اور نہ ان کے باپ دادا کو (اس بارے میں کوئی علم تھا) بڑی ہے وہ بات جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے، وہ صرف جھوٹ بول رہے ہیں۔ ۵)

اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد ثابت کرنا جہالت کی وجہ سے ہے

دنیا بھر کے مشرکین نے جو اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد فرض کر رکھی ہے، حقیقی اولاد کی شکل میں یا متبنیٰ کی صورت میں، اس جسارت کی بنیاد علم نہیں بلکہ ان کا غلو اور جہالت ہے۔ معاصر مشرکین تو محض آباؤ اجداد کی تقلید میں ایسا کہہ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید ان کے آباؤ اجداد کے پاس اس کی کچھ سند ہوگی، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد بھی اس معاملے میں نرے جاہل تھے۔ انہوں نے بھی غلو کرتے ہوئے بعض اعتقادات فرض کرلئے تھے اور ان کی جہالت نے اس پر انہیں جامد کردیا تھا۔ آنحضرت ﷺ اس لئے تشریف لائے ہیں کہ آپ ان جاہلوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا حقیقی علم عطا فرمائیں اور انہیں اس بات سے خبردار کریں کہ تم نے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کے اعتقادات بنالئے ہیں، یہ ایک بہت بڑی گستاخی اور جسارت ہے جس کا تم ارتکاب کر رہے ہو۔ تم نے اسے معمولی بات سمجھا اور شاید

Marfat.com

اپنے تئیں اسے محبت کا اظہار سمجھتے ہو، جیسے کسی شخص کو یہ کہا جائے کہ سنا ہے کہ تمہارے گھر میں بیٹا ہوا ہے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے کہ اس کا جانشین آ گیا۔ مشرکین اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی شاید ایسا ہی بے ہودہ تصور رکھتے ہیں، لیکن یہ تصور اس قدر گستاخی پر مبنی ہے کہ اس پر جتنی بھی لعنت بھیجی جائے تھوڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اولاد تصور کرنا اپنے اندر جو مضمرات رکھتا ہے ان میں سے ایک ایک بات اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے متصادم ہے۔ اس کی شان صمد ہونا ہے لیکن ہم نے اسے محتاج تصور کر کے اس کی اولاد بنا ڈالی۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ اس کی شناخت ہے اور اس کی اولاد مان لینے سے نہ صرف شناخت ختم ہوتی ہے بلکہ اس کا مثیل وجود میں آ جاتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں فرماتا ہے کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ اور جنہیں اس کی اولاد بنایا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں کیونکہ:

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدِ مُرسل نہ رہے کون رہے گا

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ اس بے ہودہ تصور کے مضمرات بہت شنیع اور گھناؤنے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے بہت بڑی بات قرار دیا کہ جس کا زبانوں پر لانا بھی زبان کے کٹ جانے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اور مزید فرمایا کہ ایسا کہنے والے سراسر جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس کی کوئی سند نہیں۔ کوئی ایسا حوالہ نہیں جسے علم تسلیم کرتا ہو اور جن بڑوں کی طرف منسوب کر کے وہ ایسا کلمہ ناروا کہنے کی جسارت کرتے ہیں اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾

(تو شاید آپؐ گھونٹ ڈالیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اس غم کی وجہ سے اگر وہ اس بات پر ایمان نہیں لاتے۔ ۶)

نہایت دلنواز انداز میں آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے اور نہایت پیار کے ساتھ ایک ایسے غم پر آپؐ کی دلجوئی کی جا رہی ہے جس غم کی شدت کا عالم یہ ہے کہ اس سے اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ یہ کہیں آپؐ کی جان ہی نہ لے لے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپؐ کا یہ غم اس بات پر ہو گا کہ مخالفین کی مخالفت میں شدت آتی جا رہی ہے۔ اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کی زندگی اس شہر میں اتنی مشکل بنا دی گئی ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مخالفتوں کے ہجوم میں آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی روز بروز تنہا ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انسانی فطرت کے حوالے سے اگرچہ یہ غم بہت بڑا غم ہے لیکن آنحضرتؐ اس غم کو خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے ہیں۔ آپؐ جانتے ہیں کہ تکلیفوں کا آنا اور اذیت رسانی کا عمل دعوت الی اللہ کے راستے کی ایسی سنتیں ہیں جنہیں زندہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اس لئے آپؐ اسے نہایت شرح صدر کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں۔ آپؐ کا حقیقی غم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات جو عظمتوں کا سرچشمہ اور ہر طرح کی کبریائی کی مستحق ہے اس کی ذات اور صفات میں ان ظالم مشرکین نے نہ جانے کس کس کو شریک کر رکھا ہے۔ اور وہ ہر طرح کی افہام و تفہیم کے باوجود اپنی روش بدلنے کیلئے تیار نہیں۔ وہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی عظمت کو چیلنج کر رہے ہیں اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی بڑی بڑی باتیں کہتے ہیں جس کا تصور بھی کپکپا دینے کیلئے کافی ہے۔ کبھی اس کیلئے بیٹا

Marfat.com

ثابت کرتے ہیں، کبھی کسی کو متبنی ٹھہراتے ہیں اور کبھی فرشتوں کو اس کی بیٹیاں بتاتے ہیں جبکہ اپنے لئے بیٹیوں کو عار سمجھتے ہیں۔ اور اس پر بھی مزید جس بات سے حضورؐ کا دل پگھلتا ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ یقین سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ ظالم اگر اپنی روش سے باز نہ آئے تو یا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوں گے، ورنہ آخرت میں تو یقیناً جہنم میں جلیں گے۔ آپؐ انتہائی دل گرفتگی کے ساتھ ربِ کریم کے حضور ہاتھ اٹھاتے ہیں کہ الٰہی میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ کس قدر خطرناک راستے پر چل رہے ہیں جس کا انجام جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں، لیکن میں کیا کروں، میں اپنی ساری کوششوں کے باوجود انہیں بدلنے پر قادر نہیں ہو سکا۔ اور کبھی سننے والوں کے سامنے اپنے اس غم کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ میں نے تاریکی میں آگ جلائی روشنی کیلئے اور پروانے آکر اس میں گرنے لگے۔ میں چاروں طرف ہاتھ مار رہا ہوں کہ بچ جاؤ یہ آگ ہے، اس میں گرو گے تو جل جاؤ گے، لیکن پروانے ہیں کہ وہ اس پر گرنے سے باز نہیں آتے۔ جیسے جیسے کافروں کے رویئے میں شدت آتی جارہی ہے ویسے ویسے آپؐ کے غم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان قبول نہیں کرتے تو یہ آپؐ کی ذمہ داری نہیں، ان کی اپنی ذمہ داری ہے اور وہ خود اس کیلئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ آپؐ نے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوئی کمی نہیں کی۔ آپؐ نے بڑی سے بڑی صعوبت اٹھا کر بھی اپنا فرض انجام دیا اور ان کی تمام نفرتوں اور اذیتوں کے باوجود آپؐ نے ان سے ہمدردی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کے باوجود ان کا ایمان قبول نہ کرنا ان کیلئے فکرمندی کا باعث ہونا چاہئے، آپؐ کیلئے نہیں۔ اس لئے آپؐ ہرگز اس غم کو اپنے دل میں جگہ نہ دیجئے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝٧

(ہم نے بنایا ہے جو کچھ زمین پر ہے اس کیلئے سنگار تاکہ ہم لوگوں کا امتحان کریں کہ ان میں کون اچھا عمل کرتا ہے۔ ۷)

کفار کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب

اس آیتِ کریمہ میں کفار کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب بیان کیا گیا ہے۔ یہ سبب کہنے کو تو بہت معمولی ہے لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے بہت گہرا ہے۔ وہ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کیلئے نہیں بھیجا یا یوں کہہ لیجئے کہ صرف حیوانوں کی طرح شب و روز گزارنے کیلئے نہیں بھیجا بلکہ اس دنیا کو انسان کیلئے دارالامتحان بنایا ہے اور خود انسان کی زندگی اسی دنیا کے حوالے سے امتحان کا ایک پرچہ ہے جسے انسان نے سوچ سمجھ کر حل کرنا ہے اور اس پر مشکل یہ پیدا کردی گئی ہے کہ ایک طرف تو انسان کو عقل اور تمیز عطا کی گئی ہے تاکہ وہ اس سے کام لے کر خیر و شر میں تمیز کرے اور اس کا فیصلہ کرے کہ اسے اپنی خواہشوں کے اتباع میں زندگی گزارنا ہے یا اسے آخرت کا طالب بننا ہے۔ اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ دنیا پر حُسن و زیبائی کا ایک پُرفریب پردہ تان دیا گیا ہے۔ خواہشات میں ایک ایسا حُسن رکھا گیا ہے جس کی گرفت سے بچ نکلنا آسان نہیں۔ پھر دنیا اور آخرت میں ایک عجیب تقابل ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں ایک کشش اور ترغیب ہے۔ اور اس کا ہر نفع نفعِ عاجل ہے۔ انسان کے گرد و پیش میں اتنی نعمتیں ہیں، چاہے وہ مال و دولت کی صورت میں ہوں، چاہے زمین یا اس کی نباتات کی شکل میں اور چاہے وہ ترقیات اور مناصب کے نام سے ہوں۔ ان میں سے ہر چیز اپنے اندر ایک ترغیب رکھتی ہے۔ جو شخص اس کے جال میں پھنس جاتا ہے وہ نکلنا بھی چاہے تو آسانی سے نہیں نکل سکتا۔ اور دوسری طرف آخرت کے سفر میں قدم قدم پر امتحان ہے۔

Marfat.com

اوامر ونواہی ہیں، قواعد وضوابط ہیں۔ اس کے منافع اور اس کی کامرانیاں اور کامیابیاں نقد نہیں بلکہ ادھار ہیں۔ اس راستے پر چلنے کیلئے آخرت پر مضبوط یقین کی ضرورت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر بے پناہ توکل ہی راستے کا سرمایہ ہے۔ دنیا کے فریب کا اسیر شخص جو ہاتھوں پر سرسوں جمانا چاہتا ہے اس کیلئے ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا، اس راستے میں قربانیاں دینا ایک لگی بندھی زندگی گزارنا، نگاہوں کو پاکیزہ رکھنا، دل ودماغ کو آوارگی سے بچانا، خواہشات کی پیروی کی بجائے حقیقی مقاصد کو سامنے رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ کفار چونکہ دنیا کی آرام طلبیوں اور عیش وعشرت کے عادی ہو چکے ہیں اور ان کی نظر پیکرِ محسوس کی خوگر ہو چکی ہے تو ان کیلئے آخرت کا یقین اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنا چونکہ ایک فریب معلوم ہوتا ہے اس لئے وہ اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝۸

(اور ہم بالآخر کردینے والے ہیں جو کچھ اس زمین پر ہے سب کو چٹیل میدان۔ ۸)

اس دنیا کا انجام

"جُرُز" بے آب وگیاہ زمین کو کہتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اہلِ دنیا، دنیا کے جس زیب وزینت کے فریب میں مبتلا ہو کر ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ یہ دنیا ہی سب کچھ ہے، آخرت نام کی چیز ایک وہم اور بہلاوے کے سوا کچھ نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ اس زمین کی ہر چیز کو فنا کردے گا اور یہ زمین چٹیل میدان بن کر رہ جائے گی۔ ایسا شاید قیامت میں ہوگا۔ اس وقت انسان حیران ہو کر دیکھے گا کہ زمین کے جس زیب وزینت پر میں جان دیتا رہا ہوں، آج وہ کہاں ہے؟ تب اسے معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی حقیقت نہیں رکھتی تھی، ایک فریب نظر تھا جس میں سب لوگ مبتلا تھے۔ دنیا میں اگرچہ قدرت نے ہر طرف عبرت کے نمونے رکھے ہیں لیکن یہاں کا رنگ وبو انسان کو ایسا اندھا کرتا ہے کہ اسے ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف ہرا ہی ہرا یعنی دنیا ہی کی لذتیں نظر آتی ہیں۔ قیامت کو جب اس کی حقیقت کھلے گی تو انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا، لیکن اس وقت یہ احساس کام نہیں آئے گا۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝۹

(کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور رقیم والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں تھے۔ ۹)

مخاطب کون ہے؟

اس آیتِ کریمہ کا پہلا لفظ اَمْ حَسِبْتَ کا مخاطب کون ہے؟ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس کے مخاطب آنحضرتؐ ہیں۔ لیکن اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے نبوت کے بعد سے مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجیب وغریب نشانیاں دیکھیں اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ سورت سورۂ بنی اسرائیل کے بعد نازل ہوئی ہے جیسا کہ بعض اہلِ علم کا خیال ہے تو پھر تو آپؐ معراج شریف کے سفر میں جو کچھ دیکھ چکے ہیں اس کے بعد کسی نشانی کو عجیب سمجھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی قرآن کریم میں مختلف انبیائے کرام کے معجزات کا ذکر ہوا ہے اور مختلف قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ اصحابِ کہف کا واقعہ ان سے زیادہ عجیب تو نہیں ہے۔ اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس

Marfat.com

میں خطاب آنحضرتؐ کو نہیں بلکہ ہر شخص اس کا مخاطب ہے۔ خطاب کا یہ انداز اپنے اندر اس قدر عموم رکھتا ہے کہ جن لوگوں اور جس قوم سے خطاب ہو رہا ہے اس کا ایک ایک شخص مخاطب ہوتا ہے۔ یہ سوال بھی چونکہ قریش کی طرف سے آیا تھا اس لئے اسی عموم اور تاکید کے ساتھ انہیں متوجہ کرتے ہوئے جواب دیا جا رہا ہے۔

رقیم سے کیا مراد ہے؟

قریش نے اہلِ کتاب کی انگیخت پر آنحضرتؐ سے تین سوال کئے تھے جن میں سے ایک سوال اصحابِ کہف کے بارے میں تھا۔ چنانچہ یہ اسی کا جواب دیا گیا ہے۔ کہف عربی زبان میں وسیع غار کو کہتے ہیں اور غار تنگ کھوہ کو۔ لیکن اردو زبان میں یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ قرآنِ کریم اور دوسری تاریخی معلومات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف جس غار میں پناہ گزین ہوئے تھے وہ ایک وسیع غار تھا۔ اور تاریخ میں وہ غار والے (اصحابِ کہف) ہی کے نام سے مشہور ہوئے۔ لیکن یہاں قرآنِ کریم نے انہیں اَصْحٰبَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ کہا ہے۔ اہلِ علم میں اس بات پر اختلاف ہوا ہے کہ رقیم سے کیا مراد ہے؟ بعض صحابہ اور تابعین اس طرف گئے ہیں کہ یہ اس بستی کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا لیکن بعض قدیم مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ کتبہ ہے جو اصحابِ کہف کے دریافت ہونے کے بعد ان کی یادگار کے طور پر ان کی غار پر لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقام وہی ہے جسے بائبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸ آیت ۲۷) میں رقم یا راقم کہا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نبطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیٹرا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی کا خیال یہ ہے کہ کتاب یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور خود اسی کتاب کے بیان کی رو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اردن اور بحرِ لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیٹرا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے گئے ہیں اس کے اور بنی بن یمین کی میراث کے درمیان تو یہوداہ اور ادومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں۔ مولانا مودودی کا خیال اس تحقیق کی بنا پر یہ ہے کہ رقیم سے مراد کوئی بستی نہیں بلکہ کتبہ ہے جو ان کے غار پر لگایا گیا تھا۔

لیکن چند سال پہلے جو ایک نئی تحقیق سامنے آئی ہے اس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف کا غار اردن کے علاقے میں عمان کے قریب دریافت ہوا ہے اور اس غار کے قریب ایک بستی ہے جس کے بارے میں سینہ بہ سینہ روایات یہ ہیں کہ اصحابِ کہف وہاں کے رہنے والے تھے۔ اسے بدو لوگ اپنی زبان میں رجیب کہتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ رقیم کی بگڑی ہوئی شکل ہے کیونکہ یہاں کے بدو اکثر قاف کو جیم اور میم کو با سے بدل کر بولتے ہیں۔

مسیحی مصادر میں تقریباً جزم کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ ترکی کے شہر افسس کے قریب پیش آیا تھا جس کا اسلامی نام طرسوس ہے اور وہیں پر ایک غار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اصحابِ کہف کا غار ہے۔ شاید انہیں مسیحی روایات کے زیرِ اثر بہت سے مسلمان مفسرین اور مؤرخین نے بھی اصحابِ کہف کا محلِ وقوع افسس ہی کو بتایا ہے۔ اس سلسلے میں صاحب تفہیم القرآن نے ایک طویل نوٹ لکھا ہے، ہم اسے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

اس قصے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سُریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔

Marfat.com

یہ شخص اصحاب کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کئے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اس پورے واقعہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سُریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابن جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا، اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبن نے اپنی کتاب ''تاریخ زوال وسقوطِ دولتِ روم'' کے باب ۳۳ میں ''سات سونے والوں'' (   ) کے عنوان کے تحت ان مآخذ سے اس قصے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحابِ کہف غار میں پناہ گزین ہوئے تھے، ہمارے مفسرین اس کا نام دقینوس یا دقیانوس یا دقیوس بتاتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈیسیس (Decirs) تھا جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنت روم پر فرمانروائی کی ہے اور مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر ظلم وستم کرنے کے معاملہ میں جس کا عہد بہت بدنام ہے۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسرین افسس یا افسوس لکھتے ہیں، اور گبن اس کا نام افسس (Ephesus) بتاتا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج موجودہ ترکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰۔۲۵ میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲ صفحہ ۴۳)۔ پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحابِ کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسرین تیذوسیس لکھتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحابِ کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کیلئے شہر بھیجا تھا اس کا نام ہمارے مفسرین یملیخا بتاتے ہیں اور گبن اسے یملیخس (Jamblchus) لکھتا ہے۔ قصے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈیسیس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر سخت ظلم وستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے۔ پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال (یعنی تقریباً ۴۴۵ء یا ۴۴۶ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے جبکہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اس حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔

بعض مستشرقین نے اس قصے کو قصۂ اصحابِ کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن ان کے قیامِ غار کی مدت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے لیکن اس کا جواب ہم نے حاشیہ نمبر ۲۵ میں دے دیا ہے۔

اس سُریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گبن نے نبی کریم ﷺ پر ''جہالت'' کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے اس کے متعلق وہ خود مانتا ہے کہ وہ اس واقعہ کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے اور اتنی مدت کے اندر زبانی روایات کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جز میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے، صرف ان ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

Marfat.com

ایک اور تحقیق

مسیحی اور مسلمان مؤرخین کی اس تاریخی تحقیق کے پہلو بہ پہلو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ واقعہ کی تفصیل سے قطع نظر جس جگہ یہ واقعہ پیش آیا تھا اس کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت تفسیر ابن جریر میں مروی ہے، جس میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اصحاب کہف کا غار ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب یعنی اردن میں واقعہ ہے۔ اس روایت اور متعدد دوسرے قرائن کی بنیاد پر آخری دور کے بہت سے محققین نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ غار اردن میں واقع ہے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قصص القرآن میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور متعلقہ تاریخی اور جغرافیائی شواہد کی روشنی میں اسی کو درست قرار دیا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے اور مولانا سید سلمان ندویؒ نے بھی ارض القرآن میں اردن کے قدیم شہر پٹرا کو رقیم قرار دیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی تفسیر معارف القرآن میں مفصل بحث کے بعد اسی طرف رجحان ظاہر فرمایا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے بھی یہی تھی۔ ان تمام حضرات کی تحقیق کا حاصل بھی یہی ہے کہ اردن کے مشہور تاریخی شہر پٹرا کا اصل نام رقیم تھا جسے رومی حکومت نے بدل کر پٹرا کر دیا اور یہ غار اسی کے قریب واقع تھا۔ اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ مولانا مودودی کو اس سے اختلاف ہے کہ پٹرا اور رقیم ایک ہی چیز ہیں۔

مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے سفرنامہ ''جہانِ دیدہ'' میں اردن کے ایک مشہور محقق کی تحقیق کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے اور خود اپنے چشم دید واقعات بھی اسی حوالے سے سپر دِ قلم کیے ہیں۔ ہم ان کی تحریر کو یہاں نقل کر رہے ہیں۔

۱۹۵۳ء میں اردن کے محقق تیسیر ظبیان صاحب کو کسی طرح پتہ چلا کہ عمان کے قریب ایک پہاڑ پر ایک ایسا غار واقع ہے جس میں کچھ قبریں اور مردہ ڈھانچے موجود ہیں اور اس غار کے اوپر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس غار کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ یہ جگہ عام راستے سے ہٹ کر واقع تھی۔ اس لئے کئی کلومیٹر دشوار گزار راستہ طے کر کے وہ اس غار کے دہانے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تیسیر ظبیان صاحب کے الفاظ ہیں:۔

> ''ہم ایک اندھیرے غار کے سامنے کھڑے تھے جو ایک دور افتادہ جگہ اور ایک چٹیل پہاڑ پر واقع تھا، غار میں اس قدر اندھیرا تھا کہ ہمارا اندر داخل ہونا مشکل ہو گیا، ایک چرواہے نے ہمیں بتایا کہ غار کے اندر کچھ قبریں ہیں اور ان میں بوسیدہ ہڈیاں پڑی ہیں، غار کا دروازہ جنوب کی سمت تھا اور اس کے دونوں کناروں پر دو ستون تھے جو چٹان کو کھود کر بنائے گئے تھے۔ میری نظر اچانک ان ستونوں پر بنے ہوئے نقوش پر پڑی تو اس پر بیزنطی نقوش نظر آ رہے تھے، غار کو ہر طرف سے پتھروں کے ڈھیروں اور ملبے نے چھپایا ہوا تھا اور یہاں سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر ایک بستی تھی جس کا نام ''رجیب'' تھا۔''

تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی تحقیق جاری رکھی، محکمہ آثار قدیمہ کو متوجہ کیا بالآخر ایک ماہر اثریات رفیق رجائی صاحب نے ماہرانہ تحقیق کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے، چنانچہ ۱۹۶۱ء میں اس کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو اس رائے کی تائید میں بہت سے قرائن و شواہد ملتے چلے گئے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اس غار کا دہانہ جنوب کی طرف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پر قرآنِ کریم کی یہ آیت پوری طرح صادق ہے۔

Marfat.com

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ.

اور سورج جب طلوع ہوتا تو ان کے غار سے دائیں جانب جھکتا ہوا گزرتا اور جب غروب ہوتا تو ان کے بائیں جانب سے کترا کر گزرتا اور یہ لوگ اس غار کے کشادہ حصے میں تھے۔

اس غار میں صورتحال یہی ہے کہ دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی بلکہ طلوع وغروب کے وقت دائیں بائیں سے گزر جاتی ہے اور غار کے اندر ایک کشادہ خلا بھی ہے جس میں ہوا اور روشنی آرام سے پہنچتی ہے۔

۲۔ قرآن کریم نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ بستی کے لوگوں نے اس غار کے اوپر مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس غار کے ٹھیک اوپر کھدائی کرنے اور ملبہ ہٹانے کے بعد ایک مسجد بھی برآمد ہوئی ہے جو قدیم رومی طرز کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ماہرین آثارقدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ شروع میں بازنطینی طرز کا ایک معبد تھا اور عبدالملک بن مروان کے زمانے میں اسے مسجد بنا دیا گیا۔

۳۔ عصر حاضر کے بیشتر محققین کا کہنا یہ ہے کہ وہ مشرک بادشاہ جس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی تھی ٹراجان تھا جو ۹۸ء سے ۱۱۷ تک حکمران رہا ہے اور اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ بت پرستی سے انکار کرنے والوں پر سخت ظلم ڈھاتا تھا، تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ٹراجان نے ۱۰۶ء میں شرق اردن کا علاقہ فتح کر لیا تھا اور اسی نے عمان کا وہ سٹیڈیم تعمیر کیا تھا جس کا ذکر پیچھے آچکا ہے اور وہ بادشاہ جس کے عہد میں اصحابِ کہف بیدار ہوئے اس کا نام جدید محققین تھیوڈوسیس بتاتے ہیں جو پانچویں صدی کے آغاز میں گزرا ہے۔

دوسری طرف اس نئے دریافت شدہ غار کے اندر جو سکے پڑے ہوئے ملے ہیں ان میں سے کچھ ٹراجان کے زمانے کے ہیں (موقع اصحاب الکہف ص ۳۵) جس سے اس خیال کو بہت تقویت ملتی ہے کہ یہی اصحابِ کہف کا غار ہے۔

۴۔ قرآن کریم نے اصحابِ کہف کو ''اصحاب الکهف والرقیم'' (غار اور رقیم والے) کہا ہے، رقیم کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح میں مختلف آراء بیان کی جاتی ہیں لیکن بیشتر محققین کا خیال یہ ہے کہ رقیم اس بستی کا نام تھا جس میں ابتداً یہ حضرات آباد تھے۔ اب جس جگہ یہ غار واقع ہے وہاں سے نکل کر سو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ''رجیب'' کہلاتی ہے۔ رفیق الدجانی صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ ''رقیم'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے کیونکہ یہاں کے بدو اکثر قاف کو جیم اور میم کو با سے بدل کر بولتے ہیں (موقع اصحاب الکہف ص ۱۱۸) چنانچہ اب حکومت اردن نے اس بستی کا نام سرکاری طور پر ''رقیم'' ہی کر دیا ہے بعض قدیم علماء جغرافیہ نے بھی رقیم کی بستی کو عمان کے قریب بتایا ہے۔ چنانچہ معروف جغرافیہ نگار ابوعبداللہ البشاری المقدسی اپنی کتاب ''احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم'' میں لکھتے ہیں:۔

والرقيم بلد في شرق الأردن بالقرب من عمان، حيث وجدت مغارة فيها عدد من الجثث غير البالية.

(موقع اصحاب الكهف، ص ۴۹)

رقیم شرقِ اردن میں عمان کے قریب ایک شہر ہے جہاں ایک غار بھی پایا گیا ہے جس میں کچھ انسانی ڈھانچے بھی ہیں جو زیادہ بوسیدہ نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ علامہ یاقوت حمویؒ نے بھی رقیم کی تشریح کرتے ہوئے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ:

ان بالبلقاء بأرض العرب من نواحي دمشق موضعا يزعمون انه

Marfat.com

الکھف والرقیم قرب عمان.

دمشق کے مضافات میں جو عربی سرزمین بلقا کہلاتی ہے اس میں شہر عمان کے قریب ایک جگہ ہے جس کے بارے میں ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہی کہف اور رقیم ہے۔

۵۔ تیسیر ظبیان صاحب نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان اسی علاقے کے کسی غار کو اصحابِ کہف کا غار سمجھتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کے بارے میں مروی ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے انہیں بادشاہ روم کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا تو وہ راستے میں شام و حجاز کے راستے پر ایک پہاڑ سے گزرے جس کا نام جبل الرقیم تھا، اس میں ایک غار بھی تھا جس میں کچھ ڈھانچے تھے اور وہ بوسیدہ بھی نہیں ہوئے تھے۔ نیز تفسیر قرطبی میں حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ وہ اس غار سے گزرے تھے اور اسے اصحابِ کہف کا غار قرار دیا تھا۔ فتوح الشام میں واقدی نے بھی حضرت سعید بن عامرؓ کا ایک طویل قصہ لکھا ہے کہ وہ شام کی طرف جہاد کیلئے روانہ ہوئے اور راستہ بھول گئے، بالآخر بھٹکتے بھٹکتے جبل الرقیم کے پاس پہنچے تو اسے دیکھ کر پہچان گئے۔ اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ اصحابِ کہف کا غار ہے، چنانچہ وہاں نماز پڑھ کر عمان شہر میں داخل ہوئے۔ (موقع اصحاب الکہف ص ۴۶، ۴۷، ۱۰۳)

بہرکیف! اتنے پرانے واقعہ کے محل وقوع کے بارے میں حتمی طور پر سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ کہنا تو مشکل ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اب تک جتنے مقامات کے بارے میں مقام اصحابِ کہف ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے ان سب میں جتنے زیادہ قرائن و شواہد اس غار کے حق میں ہیں، کسی اور غار کے حق میں اتنے قرائن موجود نہیں ہیں۔ تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی کتاب میں افسس کے غار سے اس غار کا موازنہ بھی کیا ہے، اس موازنے سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔

یہ غار عمان شہر سے ۷ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے اور اردن کی مرکزی شاہراہ جو عقبہ سے عمان تک گئی ہے اس سے اس کا فاصلہ ۳ کلومیٹر ہے۔ ہم تقریباً ۹ بجے صبح یہاں پہنچے۔ اب کاروں کیلئے پہاڑ کے اوپر تک جانے کیلئے راستہ بنا دیا گیا ہے۔ کار سے اتر کر تھوڑا سا اوپر چڑھے تو ایک کشادہ صحن سا ہے جس میں قدیم طرز تعمیر کے کچھ ستون وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔ اس صحن کو عبور کر کے غار کا دہانہ ہے، دہانہ کے فرش پر ایک خاصی چوڑے پتھر کی بنی ہوئی ایک چوکھٹ سی ہے، اس سے غار کے اندر اترنے کیلئے تقریباً دو سیڑھیاں نیچے جانا پڑتا ہے۔ یہاں آ کر یہ غار تین حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک حصہ دہانے سے سیدھا شمال تک گیا ہے، دوسرا دائیں ہاتھ مشرق کی طرف مڑ گیا ہے اور تیسرا بائیں ہاتھ مغرب کی طرف۔ مشرقی اور مغربی حصوں میں ۸ تابوت نما قبریں بنی ہوئی ہیں۔ مشرقی حصے کی ایک قبر میں ایک چھوٹا سا سوراخ بھی ہے۔ اس سوراخ میں جھانک کر دیکھیں تو ایک انسانی ڈھانچہ صاف نظر آتا ہے۔ اگر اندھیرا ہو تو غار کا مجاور موم بتی جلا کر اندر کا منظر دکھا دیتا ہے۔

لیکن غار کا جو حصہ جنوب سے شمال کی طرف سیدھا گیا ہے، وہ تقریباً سپاٹ ہے اور اسی کے بارے میں تیسیر ظبیان صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہی وہ "فجوۃ" ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ جب ۱۹۶۱ء میں اس غار کی صفائی اور کھدائی کا کام شروع ہوا تو رفیق الدجانی کہتے ہیں کہ غار کی اسی درمیانی جگہ میں ایک جانور کا جبڑا پڑا ہوا ملا جس میں ایک نوکیلا دانت اور چار داڑھیں محفوظ تھیں۔ تیسیر ظبیان صاحب کا خیال ہے کہ یہ اصحابِ کہف کے کتے کا جبڑا تھا۔ اس کے علاوہ اسی جگہ پر رومی، اسلامی اور عثمانی دور کے بہت سے سکے ٹھیکری کے برتن، کوڑیوں کے ہار، پیتل کے کنگن اور انگوٹھیاں بھی پڑی ہوئی ملی تھیں۔ اب یہ ساری چیزیں ایک الماری میں جمع کر کے غار کی شمالی دیوار میں محفوظ کر دی گئی ہیں جو ہم نے بھی دیکھیں۔

Marfat.com

غار کے مشرقی حصے میں ایک اوپر کو بلند ہوتی ہوئی چھوٹی سے سرنگ ہے جو دھواں نکالنے والی چمنی کی شکل میں ہے، یہ سرنگ غار کی چھت پر جو مسجد بنی ہوئی ہے اس میں جا کر نکلی ہے لیکن جب یہ غار دریافت ہوا اس وقت اس سرنگ کے بالائی دھانے پر ایک پتھر رکھا ہوا ملا تھا۔
اتفاق سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے لشکر کے ایک جرنیل اسامہ بن منقذ نے اپنی کتاب ''الاعتبار'' میں بھی ذکر کیا ہے کہ میں ۳۰ شہسواروں کے ساتھ اس غار میں گیا اور وہاں نماز پڑھی لیکن وہاں ایک تنگ سرنگ تھی اس میں داخل نہیں ہوا۔تیسیر ظبیان صاحب کا خیال ہے کہ یہ وہی تنگ سرنگ ہے۔

(موقع اصحاب الکہف، ص ۴۹)

غار کو جب صاف کر کے دیکھا گیا تو اس کی دیواروں پر خط کوفی اور خط یونانی میں کچھ عبارتیں بھی لکھی ہوئی تھیں، جواب پڑھی نہیں جاتیں۔
غار سے باہر نکلے تو سامنے کے صحن میں ایک گول دائرہ بنا نظر آیا، مجاور نے بتایا کہ غار کی دریافت کے وقت یہاں ایک زیتون کے درخت کا تنا برآمد ہوا تھا۔رفیق الدجانی صاحب نے لکھا ہے کہ زیتون کا یہ درخت بدوی دور کا ہے اور اس کے قریب ایک مسقّف قبر بھی تھی اور جب ہم نے پہلے پہل یہاں کھدائی اور صفائی شروع کی تو آس پاس کے معمر لوگوں نے بتایا کہ زیتون کا یہ درخت ۲۰ سال پہلے تک تروتازہ تھا اور ہم اس کا پھل بھی کھایا کرتے تھے۔

غار کے ٹھیک اوپر ایک قدیم مسجد کی دیواریں ایک محراب سمیت چند فٹ تک ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔جب شروع میں تیسیر ظبیان اور رفیق الدجانی صاحب یہاں پہنچے تھے اس وقت یہ مسجد نظر نہ آتی تھی، کھدائی اور صفائی کے بعد مسجد برآمد ہوئی۔یہ مسجد دس میٹر لمبی اور دس میٹر چوڑی ہے اور کھدائی کے دوران اس کے بیچ میں چار گول ستون برآمد ہوئے جو رومی طرز کے ہیں یہاں سے رومی بادشاہ جسٹن کے عہد (۵۱۷ء۔۵۲۷ء) کے کچھ پیتل کے سکے بھی کھدائی کے دوران برآمد ہوئے، ڈیڑھ میٹر کے برابر ایک چھوٹا سا کمرہ بھی نکلا جس کی چھت کو شاید اذان کیلئے استعمال کیا جاتا تھا، اسی کے قریب کچھ مٹی کے لوٹے بھی پائے گئے جو وضو میں استعمال ہوتے ہوں گے۔یہیں سے ایک کتبہ بھی برآمد ہوا جس کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ کے زمانے (۸۹۵ عیسوی) میں اس مسجد کی مرمت کی گئی تھی۔
اس تمام مجموعے سے ماہرین نے جو نتائج نکالے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا میں یہاں رومیوں نے ایک عبادت گاہ بنائی تھی۔عہد اسلام میں (غالباً عبدالملک بن مروان کے زمانے میں) اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا لیکن مسلمانوں نے اس کے طول و عرض میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

اس وقت اردن کے محکمہ آثار قدیمہ اور محکمہ اوقاف نے اس غار کے تحفظ اور اس کی صفائی وغیرہ پر خاص توجہ صرف کی ہے۔اس کے قریب ایک نئی مسجد بھی تعمیر کر دی ہے۔زائرین کی سہولت کیلئے راستہ آسان بنا دیا ہے اور غار کے اندر کتبات لگا دیئے ہیں۔

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ۝١٠ فَضَرَبْنَا عَلَى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝١١ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَى لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا ۝١٢

(جس وقت کچھ نوجوانوں نے غار میں پناہ لی اور انہوں نے دعا کی اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا

Marfat.com

فرما اور ہمارے اس معاملے میں ہمارے لئے رہنمائی کا سامان فرما۔ ۱۰) تو ہم نے غار میں کئی سالوں کیلئے انہیں تھپک کے سلا دیا۔ ۱۱) پھر ہم نے ان کو بیدار کیا کہ دیکھیں دونوں گروہوں میں سے کون مدتِ قیام کو صحیح شمار کرتا ہے۔ ۱۲)

ان تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے واقعہ کا جو مرکزی مضمون ہے اسے بیان فرما دیا ہے اور اس کے بعد اسی کی نسبتاً تفصیل بیان فرمائی ہے۔ البتہ وہ باتیں جو کسی بات کو کہانی بنانے کیلئے ضروری ہوتی ہیں یا جنہیں زیبِ داستاں کہا جاتا ہے، قرآنِ کریم اس سے تعرض نہیں کرتا۔ وہ اپنے بیان کو صرف ان باتوں تک محدود رکھتا ہے جس کا تعلق واقعہ کے اصل مضمون نصیحت یا عبرت سے ہو۔

واقعہ اصحابِ کہف میں تعجب خیز بات کیا ہے؟

اصحابِ کہف کے واقعہ میں جو بات تعجب خیز ہے اور جسے دلچسپی سے سنا جاتا اور جاننے کی کوشش کی جاتی ہے وہ چند جوانوں کا ایک غار میں سالہا سال تک سوئے رہنا اور پھر زندہ حالت میں اٹھ کھڑے ہونا اور لوگوں سے ملاقات کرنا ہے، لیکن قرآنِ کریم اسے کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ایک بڑی آبادی والے شہر میں جبکہ آبادی کا بیشتر حصہ بُت پرستی میں مبتلا تھا اور اقتدار نہ صرف بُت پرستی کی پشت پناہی کر رہا تھا بلکہ زبردستی لوگوں سے اس کا اعتراف بھی کروا رہا تھا۔ ایسی صورتحال میں جبکہ لوگوں کا رجحان حالات کا رخ، تعلیم و تربیت کی نہج اور قانون اور اقتدار کا جبر باطل کے ساتھ ہو۔ کسی شخص کا حق کی طرف مائل ہونا اور پھر اس پر اس حد تک ثابت قدم رہنا کہ وہ اقتدار کی فہمائش کو بھی خاطر میں نہ لائے اور جب حالات کے تیوروں کو بگڑا ہوا دیکھے تو بستی چھوڑ کر غاروں کی پناہ ڈھونڈے، یقیناً ایک مشکل بات ہے۔ اس بڑے شہر کی تمام آبادی میں کسی نے اس مشکل کا ارتکاب نہیں کیا، بجز چند نوجوانوں کے۔ فتیۃ عربی زبان میں جمع قلت کا وزن ہے جس کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نوجوان بُت پرستی سے بغاوت کر کے توحید کا علم لے کر اٹھے، ان کی تعداد آٹھ نو سے زیادہ نہیں تھی۔ عام تاریخی روایات اور قرآنِ کریم کے اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سات نوجوان تھے۔ اس سے اشارہ شاید اس طرف ہے کہ حالات کتنے بھی بگڑ جائیں نوجوانوں کو حق کی طرف مائل کرنا بڑوں کی نسبت آسان ہوتا ہے کیونکہ ان کے ساتھ مفادات کے پتھر معلق نہیں ہوتے۔ بیوی بچوں کی کمزوریاں انہیں لاحق نہیں ہوتیں۔ وہ بڑی سے بڑی تکلیف اپنی جان پر برداشت کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں اور جب ایک دفعہ وہ حق کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو پھر بڑے سے بڑا خطرہ بھی ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتا۔ اس سے نوجوانوں کو یہ سبق ملتا ہے:

بنا کرتی ہے اس دنیا میں ملت نوجوانوں سے
سنبھلتی ہے ہمیشہ قوم ہمت نوجوانوں سے

اور امتِ مسلمہ کے اصحابِ اقتدار اور اربابِ علم و فضل کو شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر وہ اس امت کی تاریخ اور اس کے تسلسل کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں نوجوان نسل سے کبھی بھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔ جہاں جہاں سے ان کے دل و دماغ کے بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے ہیں ان کا سختی سے انسداد کرنا امت کے بڑے لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ ورنہ نوجوانوں کے بگڑنے سے قوم کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر وہ بطور قوم کے آبرومندی سے زندگی نہیں گزار سکتے۔

یہ نوجوان اگر ایک طرف جوانوں کا ولولہ رکھتے تھے کہ حالات سے ٹکرانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تو دوسری طرف ان کے اندر دینی

Marfat.com

شعور اس حد تک تھا کہ انہوں نے اس راستے پر چلنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے ہدایت کی دعا مانگی اور راستے کی مشکلات کی آسانی کیلئے اسی سے مدد چاہی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان یہ کیا کہ انہیں غار میں صرف رہنے کا موقع نہیں دیا بلکہ نہایت پیار اور محبت سے اس طرح سلایا جیسے ماں اپنے لاڈلے بچے کو تھپک تھپک کر سلاتی ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد انہیں اٹھایا جو اس سارے واقعہ سے اصل مقصود تھا کہ وہ آپس میں بحث کریں کہ ہم کتنی دیر تک سوئے رہے۔ کوئی کہے ایک پہر، کوئی کہے سارا دن، لیکن کسی ایک بات پر اتفاق نہ کرسکیں۔ اس سے انہیں یہ سمجھانا مقصود تھا کہ جس طرح تم چند سو سال کی نیند کے بارے میں جان نہیں سکے کہ کتنا عرصہ سوتے رہے ہو، اسی طرح برزخی زندگی کے اختتام پر بھی جب تمہیں قیامت کیلئے اٹھایا جائے گا تو تم یہ کہتے ہوئے اٹھو گے کہ ہماری نیند سے ہمیں کس نے اٹھا دیا، ہم ابھی تو سوئے تھے یعنی برزخ کی ہزاروں سال کی زندگی سونے والے کو چند گھنٹوں کی زندگی محسوس ہوگی، تو اللہ تعالیٰ کی جو ذات اس بات پر قادر ہے کہ دنیا کے فانی نظام میں سونے والوں کو صدیوں تک سلائے رکھے اور انہیں احساس بھی نہ ہونے پائے کہ ہم کتنا سوئے ہیں، اس کیلئے کیا مشکل ہے، وہ برزخ میں بھی مرنے والوں پر ایک لمبی نیند طاری کردے اور جب قیامت کیلئے انہیں اٹھائے تو وہ ایسے ہی احساس میں مبتلا ہوں، لیکن آج آخرت کا انکار کرنے والے چونکہ اس شعور سے بہرہ ور نہیں اس لئے وہ اس کے ادراک سے عاجز ہیں۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ
بِالْحَقِّ ط اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝۱۳ وَّرَبَطْنَا
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝۱۴ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا
اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ط لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ط
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۱۵ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ
وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ
رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝۱۶ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا
طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ
ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ط ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ط مَنْ

Marfat.com

يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

رکوع: ۲۔ (ہم آپؐ کو ان کی سرگزشت ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں، وہ (اصحابِ کہف) چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے، ہم نے ان کے ایمان میں برکت عطا فرمائی۔ ۱۳) اور ان کے دلوں کی گرہ مضبوطی سے باندھ دی، جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اس کے سوا کسی اور کو ہرگز معبود کے طور پر نہیں پکاریں گے، اگر ہم نے ایسا کیا تو تب ہم کہیں گے حق سے نہایت ہٹی ہوئی بات۔ ۱۴) یہ ہے ہماری قوم جنہوں نے اللہ کے سوا کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ یہ ان پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے، تو اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ ۱۵) اور اب جبکہ تم ان کو اور ان کے معبودوں کو جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں، چھوڑ کر الگ ہو گئے ہو تو غار میں پناہ لے لو تو پھیلائے گا تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت کا دامن اور مہیا کرے گا تمہارے لئے تمہاری ضرورت کا سامان۔ ۱۶) اور آپؐ سورج کو دیکھتے ہیں کہ جب طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب کو بچ کے نکل جاتا ہے، اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے اور وہ اس کی کشادہ جگہ میں ہیں، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو اللہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو آپؐ اس کیلئے کوئی دستگیری کرنے والا اور رہنمائی کرنے والا نہیں پا سکتے۔ ۱۷)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

(ہم آپؐ کو ان کی سرگزشت ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں، وہ (اصحابِ کہف) چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے، ہم نے ان کے ایمان میں برکت عطا فرمائی۔ ۱۳) اور ان کے دلوں کی گرہ مضبوطی سے باندھ دی، جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اس کے سوا کسی اور کو ہرگز معبود کے طور پر نہیں پکاریں گے، اگر ہم نے ایسا کیا تو تب ہم کہیں گے حق سے نہایت ہٹی ہوئی بات۔ ۱۴)

اجمال کے بعد تفصیل

اس سے پہلے چار آیتوں میں اصحابِ کہف کے واقعہ کو نہایت اختصار سے بیان فرمایا۔ اب اسے تفصیل سے بیان فرمایا جا رہا ہے، لیکن یہ تفصیل ایسی نہیں جس میں واقعات کی جزئیات پر زور دیا گیا ہو اور وہ باتیں بیان کی گئی ہوں جو زیبِ داستان کیلئے ضروری ہیں۔ بالحق

109518

Marfat.com

سے دو باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ بات کہ اس واقعہ کے بارے میں اصحاب کہف کے نام لیواؤں میں جو غلط باتیں مشہور ہو گئی ہیں انہیں نظر انداز کیا جائے یا کسی حد تک ان کی اصلاح کر دی جائے۔ اور دوسری یہ بات کہ داستان سرائی کی بجائے وہ باتیں بیان کی جائیں جن کا تعلق اصلی مقصود اور حکمت و موعظت سے ہے۔ اور جن باتوں سے قیامت تک صاحب ایمان لوگ اپنے ایمان کی سلامتی کیلئے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

فِتْيَةٌ کا مفہوم

اس آیت میں سب سے پہلا لفظ جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے، وہ فِتْيَةٌ کا لفظ ہے۔ یہ فتیٰ کی جمع ہے اور جمع قلت کا وزن ہے جس کا اطلاق دس سے کم عدد پر ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان نوجوانوں کی تعداد آٹھ نو سے زیادہ نہیں تھی اور یہ سب نوخیز نوجوان تھے جن کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں، جن کی اٹھتی جوانیاں ابھی شاید طوفانوں سے آشنا نہیں تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ پر ایمان نے انہیں ایسا جری بنا دیا کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ وقت کی حکومت انہیں برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں۔ وہ بُت پرستی کے مقابلے میں توحید کو اپنے لئے موت سمجھتے ہیں، لیکن جوان بچے چونکہ مفادات کے بوجھ تلے دبے ہوئے نہیں ہوتے اور مصلحت پرستی ابھی ان کا شعار نہیں بنا ہوتا۔ چنانچہ جب وہ کسی حقیقت کو حقیقت سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں تو اس کیلئے ہر قربانی دینے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے جب اس بات کو تسلیم کر لیا کہ شرک سراسر ایک واہمہ ہے اور توحید اس کائنات کی اصل حقیقت ہے تو پھر وہ ہر طرح کی مصلحتوں کا جال توڑ کر اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن وقت کے اقتدار نے جب دیکھا کہ ان لڑکوں نے ایک مختلف راستہ اختیار کر لیا ہے تو انہوں نے ہر ممکن جبر سے ان کو دبانا چاہا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا اور انہوں نے جب صاف صاف اپنے مؤقف کا اظہار کیا، توحید کی حمایت کی اور شرک کے باطل ہونے پر دلائل دیئے تو بادشاہ نہایت برہم ہوا اور اس نے انہیں وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ میں تمہیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں، تم اپنے قدیم مذہب پر واپس آ جاؤ ورنہ تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔ ان نوخیز نوجوانوں کیلئے یہ دھمکی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یقیناً اس دھمکی سے ان کا ریشہ ریشہ کانپ اٹھا ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب انہوں نے ہماری طرف آنے کا راستہ اختیار کر لیا تو ہم نے اس ہدایت میں پھر مزید اضافہ کر دیا اور ان کے دلوں کی گرہ کو باندھ دیا۔ یہ ایک محاورہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انہیں عزیمت کے راستے پر چلنے کا حوصلہ دیا اور ہر طرح کے خطرات سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھنے کی ہمت دی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس کے راستے پر اسباب سے بے نیاز ہو کر چل پڑتا ہے تو وہ اس کیلئے اسباب بھی خود فراہم کرتا ہے۔ وہ ترکِ اسباب کی تعلیم تو نہیں دیتا، لیکن جب ایمان کے راستے پر چلنے کیلئے اسباب کو چھوڑنا ضروری ہو جائے تو پھر وہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا اور جو شخص اللہ کا ہو جاتا ہے، اللہ اس کیلئے بندگلی میں سے راستہ نکال دیتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ زلیخا نے تمام دروازے مقفل کر دیئے اور وہ گناہ کی دعوت دے رہی ہے تو آپؑ نے اپنے ایمان اور حیا کو بچانے کیلئے صرف ایک ہی راستہ دیکھا کہ مجھے ہر دروازے تک دوڑ کر جانا چاہئے، ممکن ہے اللہ تعالیٰ دروازوں کے قفل کھول دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جس دروازے پر پہنچتے قفل ٹوٹ کے گر جاتا۔ یہ وہ ہدایت میں اضافہ اور برکت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بھروسہ کرنے والے بندوں کو عطا فرمایا کرتا ہے، لیکن اس راستے پر چلنے کیلئے چونکہ مضبوط حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور نوجوان اپنی ناتجربہ کاری کے باعث اس سے آگاہ نہیں

Marfat.com

ہوتے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ جب انہوں نے بادشاہ یا لوگوں کے سامنے صاف صاف یہ کہا کہ ہمارا رب صرف وہ ہے جو ارض وسما کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا اگر کسی اور کو معبود بنالیں تو اس سے زیادہ کوئی غلط اور حق سے ہٹی ہوئی بات نہیں ہوسکتی، کیونکہ نہ ہدایت یافتہ لوگ اسے تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی انسانی عقل، (اگر وہ بگڑ نہ چکی ہو) اس کائنات کے ایک رب کے سوا کسی دوسرے رب کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوسکتی ہے۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ ﴿١٥﴾

(یہ ہے ہماری قوم جنہوں نے اللہ کے سوا کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ یہ ان پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے، تو اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ ۱۵)

نوجوانوں کی یکسوئی

گزشتہ آیت اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف اپنے مؤقف اور اپنے رویئے میں بالکل یکسو تھے۔ وہ ایک لحہ کیلئے بھی سوچنے کو تیار نہ تھے کہ وہ اپنے مؤقف پر نظر ثانی کرلیں۔ وہ دل کے پورے یقین کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے معبود کو ماننا اور اس کی بندگی بجالانا بالخصوص بتوں کی پوجا کرنا ایک ایسی بے ہودہ حرکت ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ رہے یہ لوگ جو ہماری قوم میں سربرآوردہ ہیں یا وہ لوگ جو اقتدار پر فائز ہیں اور وہ زبردستی اور طاقت سے ہمیں بت پرستی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان سے بحث کی جائے۔ کیونکہ اگر ان کے پاس علم ہوتا تو یہ آج تک اپنے نقطۂ نگاہ پر کوئی واضح دلیل پیش کرتے۔ اس طرح کی باتیں کہنا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طریقے پر پایا ہے ان کے پاس یقیناً کوئی الٰہی سند موجود ہوگی۔ یہ محض جھوٹی عقیدت کے سہارے ہیں اور بلا دلیل اور بغیر کسی سند کے ایک خیالی بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے بڑی زیادتی کا ارتکاب کررہے ہیں کیونکہ کسی شخص کی طرف بھی کسی جھوٹی بات کو منسوب کرنا اور پھر اس سے دلیل پکڑنا بجائے خود اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔ لیکن اگر وہ ذات جس کی طرف کسی غلط بات کو منسوب کیا جارہا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہو تو پھر تو بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾

(اور اب جبکہ تم ان کو اور ان کے معبودوں کو جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں چھوڑ کر الگ ہوگئے ہو تو غار میں پناہ لے لو تو پھیلائے گا تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت کا دامن اور مہیا کرے گا تمہارے لئے تمہاری ضرورت کا سامان۔ ۱۶)

مِرْفَق...... ضرورت اور منفعت کی چیز کو کہتے ہیں۔

Marfat.com

ایمان کو بچانے کیلئے ہر ممکن تدبیر

گزشتہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف نے جب بُت پرستی اور شرک کو چھوڑ کر توحید اور بندگی رب کا راستہ اختیار کیا تو اسے انہوں نے صرف اپنی حد تک چھپا کے نہیں رکھا بلکہ لوگوں میں اسے پھیلانے کی کوشش بھی کی۔ دلائل سے اپنی بات کو مؤکد کیا اور مشرکین کے مؤقف کی کمزوری کو بھی واضح کیا، لیکن آہستہ آہستہ جب یہ بات بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے انہیں بلا کر وارننگ دی اور تین دن کی مہلت دے کر انہیں سوچنے کا موقع دیا، لیکن اصحابِ کہف چونکہ اپنے مؤقف کے سلسلے میں بالکل یکسو تھے اور انہیں اپنے برسرِ حق ہونے کا مکمل یقین تھا، تو انہوں نے حالات کے بگڑے ہوئے تیوروں کو دیکھتے ہوئے آپس میں مشورہ کیا کہ اب جب کہ تم توحید اور خدا پرستی کی وجہ سے ان مشرکین سے اپنا راستہ الگ کر چکے ہو اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمامِ اقتدار ہے وہ تمہارے اس رویئے کو کسی قیمت پر بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر کے گلی کوچے اور اس کے رہنے والے سب تمہارے دشمن ہیں۔ یہاں تمہارے لئے کوئی جائے امان نہیں۔ تو اب ایک ہی صورت ہے کہ زندگی بچانے اور بہتر حالات کا انتظار کرنے کیلئے کسی غار میں پناہ لے لو۔ کہف پر چونکہ الف لام آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غار وہ پہلے سے منتخب کر چکے تھے کہ اگر ہمیں اہلِ شہر نے برداشت کرنے سے انکار کر دیا تو ہم اس غار میں پناہ گزین ہو جائیں گے اور مصارف کیلئے کچھ سکے بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ساتھ ہی انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر ایمان بچانے کیلئے نکلنے والا ہم پہلا گروہ نہیں ہیں۔ ہر دور میں جب حالات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ ایمان اور جان میں سے صرف ایک ہی چیز بچ سکتی ہو تو ایسی صورت میں ہجرت کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہوتا اور اہلِ حق کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب بھی صاحبِ ایمان لوگوں نے اپنا ایمان بچانے کیلئے ہجرت کی ہے تو وہ کیسے بھی بے سروسامان ہوں، اللہ تعالیٰ کبھی انہیں بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ ہجرت کے بعد انہیں وہ آسانیاں دیتا اور وہ سامان مہیا کرتا ہے جو ہجرت سے پہلے انہیں میسر نہیں رہا ہوتا۔ نبی کریم ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کی ہجرت اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے آگاہی کی وجہ سے انہوں نے نہایت یقین کے ساتھ آپس میں یہ بات کہی کہ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اہلِ باطل کے مقابلے میں کوئی کمزوری دکھانے کی بجائے پہاڑوں کا راستہ اختیار کریں۔ اس کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ وہ ہم پر اپنی رحمت کی چادر تان دے اور ہمارے لئے ضرورت اور منفعت کا سامان مہیا کرے۔ قرآنِ کریم اس کی تائید کرتا ہوا اس بات کو بطور اصول کے بیان کرتا ہے جس کا حوالہ ہم اس سے پہلے بھی دے چکے ہیں۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط "اور جو شخص اللہ سے ڈرتا اور اسی کا ہو جاتا ہے، اللہ اس کیلئے (بند جگہ سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور اس کو وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے سان گمان بھی نہیں ہوتا۔"

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزاروں شجر سایہ دار راہ میں ہیں

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ط ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ط مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ج

Marfat.com

وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

(اور آپؐ سورج کو دیکھتے ہیں کہ جب طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب کو بچ کے نکل جاتا ہے، اور جب غروب ہوتا تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے اور وہ اس کی کشادہ جگہ میں ہیں، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو اللہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کردے تو آپؐ اس کیلئے کوئی دستگیری کرنے والا اور رہنمائی کرنے والا نہیں پاسکتے۔ ۱۷)

تَزٰوَرُ۔ اصل میں تَتَزٰوَرُ ہے، اس کا معنی ہے ہٹ جانا، کترا جانا، اوپر سے گزر جانا۔

تَّقْرِضُهُمْ۔ قرض کے معنی کاٹنے اور کترانے کے ہیں۔ اسی سے قرض المکان کا محاورہ پیدا ہوا، جس کے معنی ہیں اس جگہ سے ہٹ گیا، کترا گیا، گریز کر گیا۔

فَجْوَةٍ۔ کشادہ جگہ کو کہتے ہیں۔ اسی طرح گھر کے صحن پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

غار میں اللہ تعالیٰ کے انعامات

گزشتہ آیت میں اصحاب کہف نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر غیر معمولی بھروسہ کرتے ہوئے جن امیدوں کا اظہار کیا تھا، اس آیتِ کریمہ میں ان میں سے کچھ بیان کی گئی ہیں۔ اصحابِ کہف چونکہ شہر سے نکل کر غار میں پناہ گزین ہوگئے تھے تو سب سے پہلے اس پناہ گاہ میں اللہ تعالیٰ نے جو انہیں سہولتیں مہیا فرمائیں اور جس طرح ان کی حفاظت فرمائی اور جس طرح انہیں اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی بنا دیا، ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اے پیغمبرؐ اگر آپؐ اس غار کو دیکھتے تو سب سے پہلی جو چیز آپؐ کو حیران کر دیتی وہ یہ تھی کہ دھوپ ان کے جسموں پر نہیں پڑتی۔ روشنی بقدر ضرورت ان کے غار میں داخل ہوتی لیکن دھوپ سے انہیں محفوظ رکھا جاتا تھا تاکہ ان کے جسم دھوپ کی تمازت سے بچے رہیں اور طویل عرصہ نیند کی حالت میں رہنے کی وجہ سے دھوپ ان کے جسموں پر اثر انداز نہ ہوسکے۔ چنانچہ سورج جب طلوع ہوتا تو ان کے دائیں طرف سے بچتا ہوا گزر جاتا اور جب غروب ہوتا تو ان کے بائیں طرف سے کتراتا ہوا ڈوب جاتا اور معلوم ہوتا ہے کہ دائیں اور بائیں غار دو کمروں کی مانند تھی۔ اور درمیان میں اس کے کشادہ جگہ تھی۔ اسی کو قرآنِ کریم نے فجوه قرار دیا ہے۔ وہ اسی کشادہ جگہ میں آرام کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غار کا دہانہ شمال یا جنوب میں تھا جس کی وجہ سے آفتاب کی تمازت اور دھوپ اندر داخل نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے بعض مفسرین نے تو باقاعدہ اس غار کا حدود اربعہ اور نقشہ بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ سائنسی انداز میں واضح کیا جائے کہ اس میں سورج کی دھوپ کیوں نہیں آتی تھی۔ لیکن اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ دھوپ نہ آنے کے دو ہی سبب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غار کا محلِ وقوع ایسا ہو اور اس کا دہانہ شمال کی طرف ہو تو سورج طلوع اور غروب کے وقت یقیناً اس سے ہٹتا ہوا گزرے گا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا محلِ وقوع کیسا بھی ہو، سورج کو اس بات کا حکم دے دیا گیا ہو کہ تمہیں ہمارے ان صالح بندوں کو روشنی اور حرارت تو مہیا کرنی ہے لیکن اپنی تمازت سے انہیں محفوظ رکھنا ہے۔ یہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جس نے غار کی اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بنا دیا۔

مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جسے ہدایت دیتا ہے وہ ایسی ہی نشانیوں سے ہدایت حاصل کرتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اس کیلئے

Marfat.com

اس طرح کی نشانیاں بھی بیکار ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ اصل بات کسی بھی نشانی سے نصیحت قبول کرنے کی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قبولیت کا مادہ انسان کی طبیعت میں موجود نہ ہو۔ ایک کافر اور مشرک چونکہ اپنے کفر اور شرک کے باعث قبولیت کے مادہ سے محروم ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہزاروں نشانیاں پھیلی ہوئی دیکھتے ہیں لیکن انہیں ہدایت قبول کرنے کی توفیق نہیں ملتی، کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس سے محروم کر چکے ہوتے ہیں۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ ۚ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ
الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ
لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾
وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ كَمْ
لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا
لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ
أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ
بِكُمْ أَحَدًا ﴿١٩﴾ إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ
فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ﴿٢٠﴾ وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ
لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ
يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ ۖ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۖ رَبُّهُمْ
أَعْلَمُ بِهِمْ ۚ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ
مَسْجِدًا ﴿٢١﴾ سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ

Marfat.com

كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي
أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً
ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ﴿٢٢﴾

رکوع: ۳۔ (اور آپ گمان کرتے انہیں جاگتا ہوا حالانکہ وہ سو رہے تھے اور ہم انہیں کروٹیں دلاتے داہنے بائیں اور ان کا کتا دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے (سو رہا) تھا۔ اگر آپ ان کو ایک نظر دیکھ لیتے تو آپ وہاں سے الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور آپ کے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔ ۱۸) اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے ہو، وہ بولے کہ ہم ٹھہرے ہیں ایک دن یا ایک دن سے بھی کم، بولے تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے، جتنی دیر تم ٹھہرے ہو، پس بھیجو اپنے میں سے ایک کو شہر کی طرف یہ رقم دے کر، تو وہ اچھی طرح دیکھ لے کون سا کھانا ستھرا ہے، پھر وہ اس میں سے تمہارے لئے کچھ کھانا لائے اور چاہیئے کہ وہ دبے پاؤں جائے اور کسی کو تمہارے بارے میں جتا نہ دے۔ ۱۹) اگر وہ تمہاری خبر پا گئے تو تمہیں پتھروں سے مار ڈالیں گے یا تمہیں اپنے دین میں لوٹا دیں گے، پھر تم کبھی فلاح نہ پاسکو گے۔ ۲۰) اسی طرح ہم نے ان پر لوگوں کو مطلع کر دیا تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے، اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، وہ وقت بھی یاد کرو جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے ان کے معاملے میں، پھر کہنے لگے ان پر ایک عمارت بنا دو، ان کا رب انہیں خوب جانتا ہے، کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملے میں غالب آگئے کہ ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد بنائیں گے۔ ۲۱) اب یہ کہیں گے، وہ تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا، اور کہیں گے یہ پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا، بالکل اٹکل پچو اور کہیں گے یہ سات تھے، ان کا آٹھواں ان کا کتا تھا، کہہ دیجئے میرا رب ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے، ان کی خبر نہیں رکھتے مگر تھوڑے لوگ، آپ ان کے بارے میں بحث نہ کیجئے، مگر سرسری بحث، اور ان کے بارے میں کسی سے نہ پوچھیئے۔ ۲۲)

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ ۚ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ
ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾

(اور آپ گمان کرتے انہیں جاگتا ہوا حالانکہ وہ سو رہے تھے اور ہم انہیں کروٹیں دلاتے داہنے بائیں اور ان کا کتا دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے (سو رہا) تھا۔ اگر آپ ان کو ایک نظر دیکھ لیتے تو آپ وہاں سے الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور آپ کے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔ ۱۸)

Marfat.com

حفاظت کے انتظامات

اصحابِ کہف کا غار میں طویل مدت تک سونا اور پھر خرقِ عادت کے طور پر اٹھ کھڑا ہونا اور ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کے جسموں کا محفوظ رہنا یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نتیجہ تھا، لیکن بظاہر کچھ ایسے اسباب بھی مہیا تھے جن کی وجہ سے بھی ان کے جسم ہر طرح کی گزند سے محفوظ رہے اور یہ اسباب اور انتظامات بھی اسبابِ عادیہ کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور اور اس کی بے پایاں رحمت کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ ان اسباب کو یہاں پروردگار نے اس لئے ذکر فرمادیا ہے کہ وہ نظر جو پیکرِ محسوس کی خوگر ہے اس کی تشفی کا سامان بھی ہوسکے۔

سب سے پہلی بات یہ ذکر فرمائی گئی ہے کہ ہم نے انہیں غار میں اس طرح رکھا تھا کہ اے پیغمبرؐ آپ یا کوئی بھی دیکھنے والا اگر انہیں دیکھ پاتا تو وہ یہ سمجھتا کہ جس حال میں یہ لوگ لیٹے ہوئے ہیں اور جس طرح ہر طرف زندگی کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور ان کے لیٹنے کا انداز زندہ اور بیدار آدمیوں کے لیٹنے کی طرح ہے، تو یقیناً وہ خوابیدہ حالت میں نہیں بلکہ وہ بیدار ہیں، لیکن حقیقت میں وہ بیدار نہیں تھے بلکہ سو رہے تھے، ان کی ظاہری حالت اس لئے بیداری پر دلالت کررہی تھی تاکہ کوئی شخص انہیں مردہ یا سویا ہوا سمجھ کر اندر داخل ہونے کی جرأت نہ کرے۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اگرچہ وہ گہری نیند سو رہے تھے لیکن پروردگار کی جانب سے باقاعدہ ان کو کروٹیں بدلوائی جاتی تھیں تاکہ زیادہ دیر تک ایک ہی کروٹ پر لیٹے رہنے سے ان کے جسم کو نقصان نہ پہنچے۔ اعصاب میں تناؤ پیدا نہ ہو اور مسلسل زمین پر لیٹے رہنے کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ ہوسکتا تھا کہ زمین ان کے جسموں کو نقصان پہنچائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مٹی میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ ہر چیز کو کھا جاتی ہے۔ اگر یہ ایک ہی کروٹ پر لیٹے رہتے تو یقیناً مٹی ان کے جسم کو کھانے کی کوشش کرتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا طبعی اور تکوینی قانون برابر اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔ اس میں صرف انبیائے کرام اور شہداء کا استثنیٰ ہے۔

تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ غار کی دہلیز پر ان کا کتا ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے، یعنی جیسے کتے کے بیٹھنے کا انداز ہے کہ وہ اگلی دونوں ٹانگیں جنہیں کتے کے ہاتھ کہا جاتا ہے، پھیلا کے بیٹھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتا اس طرح بیٹھا تھا کہ سر بجائے اپنی ٹانگوں پر رکھنے کے اٹھائے ہوئے تھا۔ کتا نیند کی حالت میں سر بھی اپنی ٹانگوں پر یا زمین پر رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ بالکل اس طرح سویا ہوا تھا جیسے وہ بیدار حالت میں بیٹھا ہوا ہو۔ اس کے اس طرح بیٹھنے سے کسی جانور اور درندے کو بھی اتنے طویل عرصہ تک غار کے اندر جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ بعض اہلِ علم نے اس بحث کو چھیڑا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اُس گھر میں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا جس گھر میں کتا ہو۔ تو یہ نوجوان جو شریعت کی عملی تصویر تھے انہوں نے اپنے ساتھ کتا کیوں لیا۔ لیکن یہ بحث عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کتے کے بارے میں یہ حکم ہماری شریعت میں ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ پہلی شریعتوں میں اس کی اجازت رہی ہو۔ اور دوسری یہ بات کہ اسلامی شریعت میں بھی اپنی حفاظت اور کھیتی باڑی کی حفاظت کیلئے کتا رکھنے کی اجازت دی گئی ہے اور آنحضرت ﷺ کی بیان کردہ وعید سے اسے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یقیناً حفاظتی نقطۂ نگاہ سے ان کے خاندانوں نے گھروں میں کتے رکھے ہوں گے اور کتے کی یہ خصلت ہے کہ وہ اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے۔ یہ نوجوان جب اپنے گھروں سے نکلے ہیں تو یہ کتا وفاداری دکھاتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ انہوں نے ہر چند کوشش کی ہوگی کہ اسے واپس آبادی میں بھیج دیں لیکن کتے نے ان سے الگ ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ غار تک ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور غار کے دہانے پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ نے جب اپنی رحمت سے ان کی حفاظت کا انتظام کیا تو کتا اس رحمت

Marfat.com

سے محروم نہیں رکھا گیا۔

ان نوجوانوں کا اس طرح لیٹنا کہ جیسے وہ جاگ رہے ہوں اور پھر وقفے وقفے سے پہلو بدلنا اور کتے کا غار کے دہانے پر سر اٹھائے پہرہ دینا اس سے ایک ایسی فضا پیدا ہوئی اور ایک ایسے ماحول نے جنم لیا کہ اگر وہاں سے کسی کا گزر ہوا بھی تو اس نے آگے بڑھ کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے ان کو ڈاکو سمجھا اور خوف کی وجہ سے اندر جانے کی جرأت نہیں کی اور کسی نے انہیں تارک الدنیا راہب جانا تو بے ادبی کے خیال سے قدم آگے نہیں بڑھائے۔ اور کسی نے گمان کیا کہ یہ کسی اور جہان کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔ احساسات کچھ بھی ہوں یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کردہ تھے جس نے ان کی حفاظت کو ممکن بنایا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ قلعوں میں محفوظ لوگ موت سے محفوظ نہیں رہتے، مارے جاتے ہیں۔ حفاظتی دستے بعض دفعہ ناکام ہو جاتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو بچانے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو ایک کتے کو دہلیز پر بٹھا کر اور ایک ہیبت ناک ماحول طاری کر کے حفاظت کا ایسا سامان کر دیتا ہے جو بڑے سے بڑے قلعے سے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ غارِ ثور میں آنحضرت ﷺ کی حفاظت مکڑی کے جالے اور فاختہ کے انڈوں سے کی گئی۔ قریش کا تعاقب کرنے والا دستہ سر پر پہنچ کر مکڑی کے جالے کو عبور نہ کر سکا۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾
اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

(اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے ہو، وہ بولے کہ ہم ٹھہرے ہیں ایک دن یا ایک دن سے بھی کم، بولے تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے، جتنی دیر تم ٹھہرے ہو، پس بھیجو اپنے میں سے ایک کو شہر کی طرف یہ رقم دے کر، تو وہ اچھی طرح دیکھ لے کون سا کھانا ستھرا ہے، پھر وہ اس میں سے تمہارے لئے کچھ کھانا لائے اور چاہئے کہ وہ دبے پاؤں جائے اور کسی کو تمہارے بارے میں جتا نہ دے۔ ۱۹) اگر وہ تمہاری خبر پا گئے تو تمہیں پتھروں سے مار ڈالیں گے یا تمہیں اپنے دین میں لوٹا دیں گے، پھر تم کبھی فلاح نہ پا سکو گے۔ ۲۰)

تشبیہ کی وضاحت

کَذٰلِکَ یہ لفظ تشبیہ و تمثیل کیلئے آتا ہے، یہاں اس تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اصحابِ کہف کو صدیوں تک سُلائے رکھا اور پھر جس طرح ہم نے ان کے غار کو موسموں کے شدائد سے محفوظ رکھ کر ان کے جسموں کی حفاظت کی اور جس طرح آفتاب ان کے دائیں اور بائیں اپنی کرنیں سمیٹتے ہوئے گزرتا رہا اور جس طرح ہم نے طویل نیند میں ان کے جسموں کو بے حس ہونے سے بچانے کیلئے کروٹیں دیں اور مٹی کے اثرات سے بھی محفوظ رکھا اور اس طرح سے ہم نے قدم قدم پر اپنی کارسازی کی شانیں دکھائیں، اسی طرح ہم نے انہیں ایک طویل

Marfat.com

نیند کے بعد جگایا اور اٹھایا۔ معمول سے زیادہ نیند جسم کی بیماری یا موت کا باعث بن جاتی ہے کیونکہ کوئی بھی جسم چاہے وہ حالتِ بیداری میں ہو یا حالتِ خواب میں اسے بہر حال غذا ملنی چاہیئے۔ بغیر غذا کے تین سو سال گزار دینا، یہ ایک ایسی ناممکن بات ہے جو اس دنیا کے طبعی قوانین کے تحت ممکن نہیں، لیکن اس ناممکن کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے کمالِ قدرت سے بالکل اسی طرح ممکن بنایا جس طرح ان کی طویل نیند کو ممکن بنایا تھا۔

لِيَتَسَآءَلُوْا کے لام کی وضاحت

لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ''تا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں۔'' اس کے لام کے بارے میں اہلِ علم میں اختلاف ہوا، بعض کا خیال ہے کہ لام علت کیلئے نہیں، یعنی انہیں اس لئے نہیں اٹھایا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں بلکہ اٹھائے جانے کی علتیں اور مصلحتیں اور ہیں۔ اس لئے لام یہاں لامِ عاقبت یا لامِ صیرورت ہے، لامِ علت نہیں۔ دیگر اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہ لام علت کیلئے ہے کہ انہیں اس لئے اٹھایا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں کہ ہم یہاں کتنا عرصہ سوئے رہے اور جب وہ کسی نتیجہ تک نہ پہنچ سکیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ مرنے کے بعد برزخ کی زندگی کا بھی یہی حال ہوگا۔ قیامت کو جب لوگ اٹھیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس حالت میں وہ ایک دن یا اس سے بھی کم رہے۔

نیند سے بیدار ہونے کے بعد قرآنِ کریم نے ان کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ہم یہاں کتنا عرصہ ٹھہرے یعنی کب تک سوتے رہے ہیں۔ تو وہ بولے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک دن سوئے ہیں یا دن کا کچھ حصہ چونکہ ان کے پاس وقت کے ٹھیک تعین کا کوئی ذریعہ نہ تھا، تو آپس میں کہنے لگے کہ تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے کہ تم کتنی دیر تک سوئے ہو۔ نیند کی حالت میں یہ بے خبری اور وارفتگی ان لوگوں کو لاحق ہوئی ہے جو تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک سوئے رہے۔ اس سے یہ بات سمجھنا نہایت آسان ہو جاتا ہے کہ برزخی زندگی کیا ہوگی اور وہاں کس طرح لوگ قیامت تک سوئے رہیں گے حالانکہ یہی برزخی زندگی کا تصور قیامت کے منکرین کیلئے ہمیشہ ایک رکاوٹ بنا رہتا ہے۔

اس قدر طویل نیند سے طبعی طور پر تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ یا انہیں موت واقع ہو جاتی اور یا وہ بھوک اور پیاس کے احساس سے تہی دامن ہو جاتے، لیکن ان کے احساسات بالکل اسی طرح زندہ اور توانا تھے جیسے ایک صحت مند آدمی کے ہوتے ہیں۔ اس بحث میں الجھنے کی بجائے کہ ہم کتنی دیر سوئے رہے، انہوں نے بھوک کو محسوس کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنے میں سے کسی کو کھانا لانے کیلئے بھیجنا چاہیئے، لیکن ایسے شخص کو بھیجو جسے اس بات کا اندازہ ہو کہ حلال اور طیب کھانا کہاں سے مل سکتا ہے، کیونکہ جب وہ اپنے گھروں سے نکلے تھے تو یہ شہر بُت پرستوں کا شہر تھا اور بتوں کے نام پر جانور ذبح ہوتے تھے، لیکن اس بات کا امکان تھا کہ شہر میں کچھ اہلِ کتاب بھی ہوں تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے نام پر جانور ذبح کرتے ہوں گے، اس لئے انہیں خیال پیدا ہوا کہ ایسا کھانا تلاش کیا جائے جس میں حرام کی آمیزش نہ ہو اور یا اَزْكٰى کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحت کے اعتبار سے صاف ستھرا کھانا تلاش کر کے لایا جائے اور دوسری یہ بات کہ ہم میں سے جانے والا دبے پاؤں نہایت احتیاط سے دیکھ بھال کرتا ہوا جائے تاکہ اسے پہچان نہ لیا جائے اور اگر کسی کو اس پر شبہ ہو جائے تو وہ سادگی میں ہماری خبر نہ دے دے۔ کیونکہ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ ہم کون لوگ ہیں تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، ہمیں دوسروں کیلئے عبرت بنانے کیلئے مجمع عام میں ہمیں سنگسار کریں گے اور یا اذیتیں دے کر ہمیں مجبور کر دیں گے کہ ہم بھی ان کی طرح بت پرستی اختیار کر لیں۔

Marfat.com

وَ کَذٰلِکَ اَعْثَرْنَا عَلَیْھِمْ لِیَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَۃَ لَا رَیْبَ فِیْھَا ۚ اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَھُمْ اَمْرَھُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَیْھِمْ بُنْیَانًا ؕ رَبُّھُمْ اَعْلَمُ بِھِمْ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓی اَمْرِھِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْھِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

(اسی طرح ہم نے ان پر لوگوں کو مطلع کر دیا تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے، اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، وہ وقت بھی یاد کرو جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے ان کے معاملے میں، پھر کہنے لگے ان پر ایک عمارت بنا دو، ان کا رب انہیں خوب جانتا ہے، کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملے میں غالب آگئے کہ ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد بنائیں گے۔ ۲۱)

ایک اور کرم فرمائی

یہاں بھی کَذٰلِکَ کا لفظ لا کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس طرح اصحاب کہف کو طویل نیند سلانا اور پھر انہیں نیند سے بیدار کرنا اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت کا اظہار تھا، اسی طرح یہ بھی اس کے کمالِ قدرت کی ایک شان تھی کہ ہر چند جاگنے والوں نے اپنے تئیں ہر طرح کی احتیاط کی اور بازار جانے والے کو ہر طرح کی تاکید کر کے بھیجا کہ دیکھنا کہیں اپنا راز کھلنے نہ دینا، لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ ہم نے انہیں اٹھایا ہی اس لئے ہے تا کہ لوگوں کو ان کے بیدار ہونے اور لمبی نیند کے بعد جاگنے کا علم ہو اور اس سے آخرت اور قیامت پر استشہاد کیا جا سکے۔ یہاں پروردگار نے ان واقعات کو بیان نہیں فرمایا جو شہر جانے والے اصحابِ کہف کے ساتھی کو پیش آئے اور جس سے ان کا راز افشا ہوا، لیکن تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف جس شہر سے نکل کے گئے تھے وہ بت پرستوں کا شہر تھا اور بعض روایات کے مطابق اس کا نام افسس یا افسوس تھا اور بعض اہلِ علم کے نزدیک اس شہر کا نام رقیم تھا۔ اور اس میں جو حکمران تھا جس کے ظلم نے ان نوجوانوں کو نکلنے پر مجبور کیا تھا اس کا نام دقیانوس تھا، لیکن جب اصحاب کہف اپنی نیند سے بیدار کئے گئے تو اس وقت یہ شہر مسیحی دعوت کو قبول کر چکا تھا اور اس کی آبادی کا بیشتر حصہ دینِ توحید پر قائم تھا اور تفسیرِ مظہری کے مطابق اس وقت جو حکمران اس شہر پر حکومت کر رہا تھا وہ ایک صالح آدمی تھا، اس کا نام بیدوسیس تھا۔ اس کی حکومت میں اگرچہ توحید کو بالادستی حاصل تھی لیکن ابھی تک رومی شرک و بت پرستی اور یونانی فلسفہ کے اثرات کافی طاقتور تھے جن کی وجہ سے بہت سے لوگ آخرت سے انکار یا اس کے ہونے میں شک کا اظہار کرتے تھے، پھر شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی وہ یہ تھی کہ اس شہر میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی، ان میں سے ایک فرقہ جسے صدوقی کہا جاتا تھا آخرت کا کھلم کھلا منکر تھا۔ یہ فرقہ تورات سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا اور مسیحی علماء کے پاس اس کے مقابلے میں مضبوط دلائل موجود نہ تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر اس وقت کے نیک دل بادشاہ نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ روایات کے مطابق اس نے ٹاٹ کے کپڑے پہنے اور راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور الحاح وزاری کی کہ یا اللہ! آپ کی کوئی ایسی صورت پیدا فرما دیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ صحیح ہو جائے اور یہ لوگ راہِ راست پر آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا اس طرح قبول فرمائی کہ اصحابِ کہف کو بیدا کر دیا اور انہوں نے اپنا ایک آدمی جس کا نام تملیخا بتلایا جاتا ہے، اسے بازار میں کھانا خریدنے کیلئے بھیجا۔ جب وہ کسی دکان پر پہنچا اور تین سو برس پہلے بادشاہ دقیانوس کے زمانے کا سکہ کھانے کی قیمت میں پیش کیا تو دکاندار حیران

Marfat.com

رہ گیا کہ یہ سکہ کہاں سے آیا، اسے گمان ہوا کہ اس شخص کو کہیں سے کوئی خزانہ ہاتھ آیا ہے اور اس سے یہ سکہ نکال کے لایا ہے۔ اس نے دوسرے دکانداروں کو اکٹھا کرلیا۔ یہ نوجوان بیچارہ پریشان، ہرچند اس نے اپنی صفائی پیش کی لیکن لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ انہوں نے اسے گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ بادشاہ کو جب اصل صورتحال کا علم ہوا تو اسے چونکہ اس شہر سے چند نوجوانوں کے غائب ہوجانے کا علم تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان کے ناموں کی تختی خزانے میں محفوظ تھی جسے بادشاہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے ان کی بیداری کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھا اور وہ اس کے ساتھیوں سے ملاقات کیلئے غار پر گیا۔ بہت سے اہلِ شہر بھی اس کے ہمراہ تھے۔ جب وہ غار کے قریب آیا تو تملیخا نے کہا کہ آپ ذرا ٹھہریں، میں ذرا جا کے اپنے ساتھیوں کو حقیقتِ معاملہ سے باخبر کردوں کہ اب بادشاہ مسلمان موحد ہے اور قوم بھی مسلمان ہے، وہ ملنے کیلئے آئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اطلاع کے بغیر آپ پہنچیں تو وہ سمجھیں کہ ہمارا دشمن بادشاہ چڑھ آیا ہے۔ اس کے مطابق تملیخا نے پہلے جا کر ساتھیوں کو تمام حالات سنائے تو وہ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے۔ بادشاہ کا استقبال تعظیم کے ساتھ کیا، پھر وہ اجازت لے کر اپنے غار کی طرف لوٹ گئے اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ غار میں لیٹتے ہی ان کی وفات ہوگئی، لیکن اس واقعہ سے جو مقصود تھا وہ پورا ہوگیا۔ ان کا تین سو سال کے بعد زندہ حالت میں اٹھنا قیامت کے آنے اور انسانوں کے دوبارہ زندہ اٹھائے جانے کی ایسی دلیل تھی جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ کیونکہ منکرینِ قیامت کو انسانوں کے دوبارہ اٹھنے کا کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ اس واقعہ نے انہیں اس پر یقین لانے پر مجبور کردیا اور لوگ آخرت کے قائل ہوگئے۔

یادگار کے بارے میں اختلاف

اصحابِ کہف کے دوبارہ غار میں سو جانے یا موت کا شکار ہوجانے کے بعد جو لوگ ان کی زیارت کیلئے گئے تھے ان میں اختلاف پیدا ہوا کہ اب ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ ایک رائے یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کے مقام و مرتبہ سے واقف ہے، تم ان کا معاملہ خدا کے سپرد کرو۔ البتہ ان کی یادگار کیلئے غار کے سامنے ایک عمارت بنا دو تا کہ لوگوں کو معلوم ہوتا رہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے اور ان کا وجود قیامت کی بہت بڑی دلیل تھا۔ اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہم اس غار کے قریب ایک مسجد بنائیں گے۔ چنانچہ ان کی رائے غالب آئی تو انہوں نے غار پر ایک مسجد بنادی۔ اس سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ اولیاء و صلحاء کی قبور کے پاس نماز کیلئے مسجد بنا دینا کوئی گناہ نہیں اور جس حدیث میں قبورِ انبیاء کو مسجد بنانے والوں پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں اس سے مراد خود قبور کو سجدہ گاہ بنا دینا ہے جو بالاتفاق شرک اور حرام ہے، لیکن بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہاں جن لوگوں کے مسجد بنانے کا ذکر ہے اور ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ ان کے معاملے پر غالب تھے وہ اصل میں اربابِ اقتدار تھے اور انہوں نے مسجد بنا کر درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی پوجا پاٹ کا ایک انتظام کردیا تھا۔ اس خیال کی تائید میں صاحبِ تفہیم القرآن نے جو نوٹ لکھا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے، اس لئے ہم اسے یہاں نقل کئے دیتے ہیں۔

اس سے مراد رومی سلطنت کے اربابِ اقتدار اور مسیحی کلیسا کے مذہبی پیشوا ہیں جن کے مقابلے میں صالح العقیدہ عیسائیوں کی بات نہ چلتی تھی۔ پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہوچکا تھا۔ بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے اور مسیحؑ، مریمؑ اور حواریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسس کے مقام پر منعقد ہوئی تھی جس میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور حضرت مریمؑ کے "مادرِ خدا" ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے

Marfat.com

صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیح کے مقابلے میں اس وقت عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہ کار بنے ہوئے تھے اور مذہبی و سیاسی امور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں یہی لوگ دراصل شرک کے علم بردار تھے اور انہوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔

مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل الٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھہرا کر مقابرِ صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ یہاں قرآن ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کیلئے دکھائی تھی اسے انہوں نے ارتکابِ شرک کیلئے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور دلی پوجا پاٹ کیلئے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کیلئے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں:۔

لعن الله تعالىٰ زائرت القبور والمتخذين عليها المساجد والسرج. (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائي. ابن ماجه)

اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔

الاوان من كان قبلكم كانوا يتخذون قبور انبياء هم مساجد فاني انهكم عن ذلك (مسلم)

خبردار رہو، تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، میں تمہیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔

لعن الله تعالىٰ اليهود والنصارىٰ اتخذوا قبور انبيآء هم مساجدا. (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

اللہ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

ان اولئك اذا كان فيهم الرجل الصالح فمات بنوا على قبره مسجدا وصوروا فيه تلك الصور اولئك شرار الخلق يوم القيٰمة. (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مردِ صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے۔ قیامت کے روز بدترین مخلوقات ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایۃً ذکر کیا گیا ہے اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کیلئے دلیل و حجت ٹھہرائے؟

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۳۴ء میں ریورنڈ ٹی ارنڈیل (Arundell) نے "ایشیائے کوچک کے اکتشافات" (Discoveries ni Asia Minor) کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کئے تھے ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر افسس کے کھنڈرات سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریم اور "سات لڑکوں" (یعنی اصحابِ کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ

Marfat.com

وَيَقُولُونَ سَبۡعَةٌ وَّثَامِنُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ‌ ؕ قُلْ رَّبِّىۡۤ اَعۡلَمُ بِعِدَّتِهِمۡ مَّا يَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا قَلِيۡلٌ ۙ فَلَا تُمَارِ
فِيۡهِمۡ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا تَسۡتَفۡتِ فِيۡهِمۡ مِّنۡهُمۡ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

(اب یہ کہیں گے، وہ تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا، اور کہیں گے یہ پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا، بالکل اٹکل پچو اور کہیں گے یہ سات تھے، ان کا آٹھواں ان کا کتا تھا، کہہ دیجئے میرا رب ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے، ان کی خبر نہیں رکھتے مگر تھوڑے لوگ، آپ ان کے بارے میں بحث نہ کیجئے، مگر سرسری بحث، اور ان کے بارے میں کسی سے نہ پوچھیے۔ ۲۲)

جملہ معترضہ

یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔اس میں نبی کریم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ اصحابِ کہف کے بارے میں جو اصل حقیقت تھی وہ بتا دی گئی اور اس واقعہ کے ضمن میں جن حکمتوں کا جاننا ضروری تھا، وہ واضح کردی گئیں۔اس کے باوجود یہ لوگ آپ سے اس طرح کے سوالات کریں گے کہ یہ بتائیے کہ ان کی تعداد کتنی تھی اور خود ان کے بارے میں کسی حتمی بات سے آگاہ نہیں۔ان میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کی تعداد تین تھی اور چوتھا ان کا کتا تھا۔اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔فرمایا یہ سب باتیں محض اٹکل پچو ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ سات تھے، آٹھواں ان کا کتا تھا۔آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کی تعداد کو بہتر جانتا ہے۔اور ان کی اصل تعداد کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ پروردگار نے اس آیتِ کریمہ میں اصحابِ کہف کی تعداد کے سلسلے میں تین قول نقل کئے ہیں۔تین، پانچ اور سات۔تین اور پانچ کے حوالے سے تو فرمایا کہ وہ محض اٹکل پچو ہے، لیکن سات کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں فرمایا۔اس میں شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی تعداد سات تھی۔غالباً حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے اسی اشارے کو سمجھتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں ان لوگوں میں شامل ہوں جو ان کی تعداد کو جانتے ہیں۔میرے نزدیک ان کی تعداد سات تھی اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

فضول بحث سے گریز کی ہدایت

آنحضرت ﷺ کو ایک اصولی بات کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے، وہ یہ کہ انسانی ہدایت کیلئے جن جن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے پروردگار خود اسے واضح فرمادیتے ہیں اور یا آپ ﷺ پر وحیِ غیر متلو کے طور پر اس کا علم اتار دیا جاتا ہے اور جہاں خاموشی اختیار کی جاتی ہے اور لوگ اس کے بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں تو آپ کبھی اس بحث میں شرکت نہ فرمائیے۔وہ ضیاعِ وقت کے سوا کچھ نہیں۔درحقیقت جن لوگوں کو بحث و مناظرہ کا روگ لگ جاتا ہے انہیں اصل حقیقت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔انہیں صرف بحث سے سروکار ہوتا ہے۔وہ بحث کی خاطر مختلف وادیوں میں خود بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں گے اور بحث کے شرکاء کو بھی الجھائے رکھیں گے۔ایسے لوگوں کا ایک ہی علاج ہے کہ ان کو خوبصورتی سے ٹال دیا جائے۔یہاں بھی آپ کو اسی بات کی ہدایت کی جارہی ہے۔کہ وہ آپ سے بحث کرنا چاہیں گے، آپ اس بحث میں شریک ہونے سے اجتناب کریں اور اگر کچھ کہنا ضروری ہو تو سرسری انداز میں کچھ کہہ کر ٹالنے کی کوشش فرمائیں۔

Marfat.com

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ
فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ
عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ
ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ
غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ
كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ
يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ
فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ
فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ
يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَ
سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ
مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ
الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا

Marfat.com

خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ
الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ ع

رکوع: ۴۔ (اور آپؐ نہ کہیں کسی چیز کیلئے کہ میں یہ کل کردوں گا۔ ۲۳) مگر یہ کہ اللہ چاہے اور جب آپؐ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کریں اور کہیں کہ امید ہے کہ میرا رب اس سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف میری رہنمائی فرمادے۔ ۲۴) اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور نو سال مزید براں۔ ۲۵) (کہہ دیجئے اللہ ہی خوب جانتا ہے جتنی مدت وہ رہے ہیں) آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اسی کو معلوم ہیں، کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا، زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبر گیر اس کے سوا نہیں اور وہ اپنے اختیار میں کسی کو شریک نہیں کرتا) ۲۶) (آپؐ کے رب کی کتاب سے جو کچھ آپؐ پر وحی کیا گیا ہے اسے پڑھ کر سنایئے، اس کے کلمات کو کوئی نہیں بدل سکتا اور آپؐ اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں پاسکتے) ۲۷) اور آپؐ روکے رکھئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس کی رضا کے طلبگار ہیں اور آپؐ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں کیا آپؐ دنیوی زندگی کی زینت چاہتے ہیں آپؐ اس شخص کی بات کی طرف دھیان نہ دیں جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور وہ اپنی خواہش کا اتباع کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔ ۲۸) اور کہہ دیجئے یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے، پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے، ہم نے ظالموں کیلئے ایسی آگ تیار کررکھی ہے جس کی قناتوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اور اگر وہ (پانی کیلئے) فریاد کریں گے تو ان کی فریادرسی کی جائے گی ایسے پانی سے جو پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہوگا، چہروں کو بھون ڈالے گا، کیا ہی برا پانی ہوگا اور کیا ہی برا ٹھکانہ۔ ۲۹) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے تو ہم خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ ۳۰) یہی وہ خوش نصیب ہیں جن کیلئے ہیشگی کے جنت ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، وہ ان جنتوں میں سونے کے کنگنوں سے آراستہ کئے جائیں گے، وہ سبز باریک ریشمی کپڑوں اور موٹے ریشمی کپڑوں کی پوشاک پہنیں گے، وہ تختوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی خوب صلہ ہے اور کیا ہی خوب ٹھکانہ۔ ۳۱)

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ
اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

(اور آپؐ نہ کہیں کسی چیز کیلئے کہ میں یہ کل کردوں گا۔ ۲۳) مگر یہ کہ اللہ چاہے اور جب آپؐ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کریں اور کہیں کہ امید ہے کہ میرا رب اس سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف میری

Marfat.com

رہنمائی فرمادے۔ (۲۴)

آیت کا شانِ نزول اور وعدہ سے متعلق ہدایت

گزشتہ آیتِ کریمہ جس کی حیثیت ایک جملہ معترضہ کی ہے اس کے آخر میں نبی کریم ﷺ کو ایک ہدایت فرمائی کہ جو لوگ محض بحث و مناظرہ کیلئے سوالات کریں یا بات کو آگے بڑھائیں آپؐ ان کے ساتھ اس فضول مشق میں شریک نہ ہوں۔ اسی پر اضافہ کرتے ہوئے اس آیتِ کریمہ میں دوسری ہدایت جاری فرمائی۔ البتہ اس کا ایک شانِ نزول بھی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب قریش نے یہود کے اکسانے پر نبی کریم ﷺ سے چند سوالات کئے جن میں ایک سوال اصحاب کہف کے بارے میں تھا تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ میں کل اس کا جواب دوں گا۔ مقصد یہ تھا کہ چونکہ اشرافِ قریش آپؐ کی ذات اور آپؐ کی دعوت سے دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ مختلف سوالات کرنا یقیناً اسی ضمن میں تھا تو آپؐ نے یہ سوچا کہ ان کے سوالات کا جواب انہیں جلد از جلد ملنا چاہئے تا کہ ان کی دلچسپی میں کمی نہ آنے پائے اور وقت پر جواب جو اثر رکھتا ہے یقیناً تاخیر اس اثر کو کم کر دیتی ہے اور مزید یہ بات بھی کہ آپؐ کی طبیعت میں لوگوں کے ایمان کے بارے میں جو شدید حرص پائی جاتی تھی اس کا بھی تقاضا یہ تھا کہ آپؐ جواب دینے میں جلدی کریں۔ چنانچہ آپؐ کی اسی شدید خواہش کے باعث جو سراسر خیر ہی خیر تھی آپؐ کے ذہن سے یہ بات نظر انداز ہو گئی کہ میں جس بات کا جواب دین کی مصلحت کے لحاظ سے جلدی دینا چاہتا ہوں، عین ممکن ہے کہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا اس کے برعکس ہو۔ مشیتِ الٰہی کا فیصلہ یہ ہو کہ انہیں جواب بالکل نہ دیا جائے یا تاخیر سے دیا جائے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے نبی کیلئے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ وحی کے اعتماد پر کوئی غیر مشروط وعدہ کر بیٹھے بلکہ اس کے بلند مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا ہر وعدہ خدا کی مشیت کے ساتھ مشروط ہونا چاہئے۔ اس لئے آئندہ کیلئے یہ ہدایت کی گئی کہ آپؐ جب بھی کسی سے کوئی وعدہ فرمائیں تو ان شاء اللہ ضرور کہیں۔ یہ ان شاء اللہ کہنا نہ تو تعلیق کے معنی میں ہے اور نہ یہ فقہی معنی میں شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کیلئے ان شاء اللہ کہنا تو بسا اوقات حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہوتا ہے، لیکن عام امت کیلئے ایسا کہنا تبرک کیلئے ہے۔ اور اب چونکہ یہ مسلمانوں کی روایت بن چکا ہے اس لئے مسلمانوں کی ثقافت کا حصہ ہے۔ اس کے بعد مزید فرمایا کہ اگر آپ کبھی ان شاء اللہ کہنا بھول جائیں تو جب یاد آئے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں یعنی ان شاء اللہ کہیں اور پھر اس پر اس بات کا اضافہ فرمایا کہ آپؐ جس بات کا وعدہ فرما رہے ہیں تو یقیناً آپؐ کے ذہن میں یہ ہے کہ اس بات میں یقیناً خیر ہے۔ لیکن آپؐ کو حتمی طور پر یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں خیر ہے یا نہیں، کیونکہ مستقبل کے حالات سے تو صرف اللہ تعالیٰ باخبر ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے آپؐ یہ بھی کہا کریں کہ کیا عجب اللہ تعالیٰ مجھے اس معاملے میں اس سے بھی زیادہ صحیح بات یا صحیح طرزِ عمل کی رہنمائی فرمادے۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

Marfat.com

(اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور نو سال مزید براں۔ ۲۵) کہہ دیجئے اللہ ہی خوب جانتا ہے جتنی مدت وہ رہے ہیں، آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اسی کو معلوم ہیں، کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا، زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبر گیر اس کے سوا نہیں اور وہ اپنے اختیار میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ۲۶)

آیت کے مفہوم میں اختلاف

اس آیتِ کریمہ کے مفہوم کے تعین میں مفسرین میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ آیت ۲۲ سے جو جملہ معترضہ شروع ہوا تھا وہ آیت ۲۴ پر ختم ہوا۔ یہ آیت اسی جملہ معترضہ کا حصہ ہے یعنی سلسلۂ عبارت یوں ہے کہ کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا.........اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے ہیں۔ اور بعض لوگ اس مدت کے شمار میں نو سال اور بڑھ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تین سو نو سال کا قول انہیں لوگوں کے اقوال میں سے ہے جو اصحابِ کہف کی تعداد میں اختلاف کرتے تھے اور انہیں ان کی حتمی تعداد کا علم نہیں تھا۔ اسی طرح انہیں اس بات کا بھی علم نہیں کہ اصحابِ کہف غار میں کتنے سال رہے۔ اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے۔ اور یہاں بھی یہی فرمایا گیا کہ یہی لوگ غار میں قیام کی مدت کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں، آپ انہیں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدتِ قیام کو خوب جانتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے، اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر تین سو سال والا قول اللہ تعالیٰ کا ہوتا تو یہ کہنے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بھی اسی تاویل کے قائل تھے۔ دیگر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ تین سو نو سال والا قول اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ یہ مدت پروردگار نے بیان فرمائی ہے۔ نسقِ قرآن سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ابنِ کثیر نے اسی کو جمہور مفسرین سلف و خلف کا قول قرار دیا ہے۔ ابوحیان اور قرطبی وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ اگر یہ قول پروردگار کا ہے تو پھر یہ کہنے کا کیا موقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کی مدتِ قیام کو بہتر جانتا ہے۔ جمہور مفسرین اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ دونوں جملے حق تعالیٰ کا کلام ہیں۔ پہلے میں حقیقتِ واقعہ کا بیان ہے اور دوسرے میں اس سے اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ ہے۔

9 سال کے اضافہ کا مفہوم

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں پہلے اصحابِ کہف کی مدتِ قیام تین سو سال بیان کی اور پھر اس کے بعد نو کا اس پر اضافہ کر دیا۔ مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں چونکہ شمسی سال کا رواج تھا اس کے حساب سے تین سو سال ہی ہوتے ہیں۔ اور اسلام میں چونکہ رواج قمری سال کا ہے اور قمری حساب میں ہر سو سال پر تین سال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہو گئے۔ ان دونوں سالوں کا امتیاز واضح کرنے کیلئے قرآنِ کریم نے یہ تعبیر اختیار کی۔

مدتِ قیام کے بارے میں قرآنِ کریم کی وضاحت کو مؤکد کرنے کیلئے ارشاد فرمایا کہ دوسرے لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ تو الکل پچّو کے سوا کچھ بھی نہیں، لیکن قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جاننے والا ہے۔ دوسروں کو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا اس نے بتایا ہے، باقی سب رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے علم کی غائت درجہ تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کیا کہنے ہیں

Marfat.com

اس کے دیکھنے اور سننے کے۔ کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے احاطۂ سمع و بصر سے باہر ہو۔ جس طرح وہ اپنے سمع و بصر میں لاانتہا اور لامحدود ہے، اسی طرح اس کی قوتیں بھی بے مثال ہیں، چونکہ وہ ہر چیز سے واقف ہے اس لئے اسے اس بات کی احتیاج نہیں کہ کوئی دوسرا اس کے پاس شفاعت کرے۔ اسی طرح وہ اپنی قدرتوں میں بے پناہ ہے تو کسی کی مجال نہیں کہ اس کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد کر سکے اور وہ اس بات سے بالکل مستغنی ہے کہ کسی کو وہ اپنے اختیار میں شریک کرے۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

(آپؐ کے رب کی کتاب سے جو کچھ آپؐ پر وحی کیا گیا ہے اسے پڑھ کر سنایئے، اس کے کلمات کو کوئی نہیں بدل سکتا اور آپؐ اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں پا سکتے۔ ۲۷)

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورت کا آغاز اس بات پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے ہوا تھا کہ اس نے اپنے عظیم و جلیل بندے پر ایسی کتاب اتاری جو انسانی ہدایت و رہنمائی کیلئے ہر لحاظ سے تشفی بخش اور ہر کجی اور ہر کوتاہی سے پاک ہے۔ اس کا پیش کردہ نظامِ زندگی انسانی فطرت کا عکاس اور انسانی ضروریات کا کفیل ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کے نزول اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کے مقصد کی طرف توجہ دلائی گئی۔

آیت کا ماسبق

جب اس کتاب کا نزول ہو رہا تھا اور اس کی دعوت رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہی تھی تو ویسے ویسے قریش کی طرف سے مخالفت میں بھی شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک طرف آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والوں کو طاقت کے استعمال سے ہراساں کر دینا چاہتے تھے اور دوسری طرف اہلِ کتاب سے پوچھ پوچھ کر ایسے سوالات کرتے تھے جن کا جواب دینا ان کے خیال میں آنحضرت ﷺ کیلئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس پالیسی کے تحت آپؐ سے چند سوالات کئے جن میں اصحابِ کہف کا واقعہ بھی تھا۔ قرآنِ کریم نے اس کا جواب ایک تو اس وجہ سے دیا تاکہ انہیں یقین ہو جائے کہ آنحضرت ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ آپؐ اس واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے جبکہ عرب بھر میں اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ اور دوسری وجہ اس کا جواب دینے کی یہ بھی تھی کہ مسلمان قریش کی بڑھتی ہوئی اذیت رسانی کے باعث نہایت تکلیف میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی دنوں ہجرت حبشہ کا واقعہ بھی پیش آیا ہوگا۔ چنانچہ مسلمانوں کو تسلی دینے کیلئے اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں تکلیفوں کا پیش آنا یہ پہلا واقعہ نہیں بلکہ یہ اس راستے کی ایسی سنت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ کل اصحابِ کہف ایسی ہی اذیت رسانیوں سے تنگ آ کر اپنے شہر سے ہجرت کر کے ایک غار میں پناہ گزین ہوئے تھے اور آج اہلِ حق مکے میں اس دعوتِ حق کو قبول کرنے کے نتیجے میں حبشہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ سبب ایک ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے دین کے ماننے والوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس سے ہراساں نہیں ہونا چاہئے۔

Marfat.com

ضمنی مباحث کے بعد اصل مضمون کا ذکر

اصحاب کہف کے واقعہ کو مکمل کر دینے کے بعد پھر مضمون کے اسی پہلے رشتے کو پکڑ لیا گیا ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا اور چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ انسانی ہدایت کیلئے اصل نسخہ شفاوہ یہی قرآن کریم ہے۔ اسی کی قبولیت اور اسی سے وابستگی دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی کی ضمانت ہے۔ اسی کی دعوت پر پہلے بھی مخالفین مشتعل ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں، لیکن اہلِ حق کی استقامت کو دیکھ کر انہوں نے ہر دور میں کمپر ومائز کرنے کی کوشش کی ہے اور اہلِ حق کو مجبور کیا ہے کہ آپ اپنی دعوت میں کوئی نرمی پیدا کریں۔ کچھ باتیں ہماری مان لی جائیں، کچھ ہم آپ کی مان لیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی مطالبات نبی کریم ﷺ سے بھی کئے جا رہے تھے۔ مثال کے طور پر سورۂ یونس کی آیت نمبر 15 میں ارشاد فرمایا گیا وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ''جب ہماری آیات صاف صاف ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو کبھی ہمارے سامنے حاضر ہونے کی توقع نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کی بجائے کوئی اور قرآن لے آؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔'' قریش بھی آنحضرت ﷺ سے اس طرح کی توقعات رکھتے تھے، لیکن ایسی توقع اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بارے میں اس حد تک گری ہوئی تھی کہ پروردگار نے نفرت سے ان کی طرف سے منہ پھیر کر آنحضرت ﷺ سے خطاب فرمایا، لیکن روئے سخن انہیں کی طرف ہے کہ آپؐ پر کتاب کا جو حصہ بھی اتارا جارہا ہے، آپؐ انہیں جوں کا توں پڑھ کر سنا دیں اور اچھی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام ان تک پہنچا دیں۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے رسول کو بھی اس کا اختیار نہیں۔ آنحضرت ﷺ تو ظاہر ہے ایسی کسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ قریش کے سامنے اس جرم کی شناعت کو مبرہن کرنے کیلئے آپؐ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر آپؐ بھی ایسی کو تبدیلی کرنا چاہیں تو آپؐ بھی اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بھاگ کر کہیں جائے پناہ تلاش نہیں کر سکتے، تو قریش کو اس سے اندازہ ہو جانا چاہئے کہ جو وہ توقع باندھے بیٹھے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی گنجائش نہیں بلکہ وہ ایسا شدید جرم ہے جس کی سزا سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْهُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَکَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

(اور آپؐ روکے رکھئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس کی رضا کے طلبگار ہیں اور آپؐ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں کیا آپؐ دنیوی زندگی کی زینت چاہتے ہیں آپؐ اس شخص کی بات کی طرف دھیان نہ دیں جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کا اتباع کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔ ۲۸)

Marfat.com

دعوت کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کو ہدایات

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ امت مسلمہ کی نظریاتی بنیاد قرآن کریم ہے، اس سے ناقابل شکست وابستگی اور اس کی ہر طرح کے اضمحلال سے پاک اطاعت اور اس کے ناقابلِ تغیر اور ناقابلِ ترمیم ہونے کا یقین اس امت کے ایک ایک فرد کا حقیقی سرمایہ ہے۔ ایسی نظریاتی دعوت کو قبول کرنے والے آغاز میں ہمیشہ غریب اور نوجوان ہوتے ہیں۔ عمر رسیدہ لوگوں کو ان کے مفادات اور ان کے اندیشہ ہائے دور دراز کسی بڑے فیصلے کیلئے آمادہ نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح طبقۂ امراء کے لوگ اپنی عیش وعشرت سے معمور زندگی کو بدلنے پر کبھی تیار نہیں ہوتے۔ ہرقل شاہِ روم نے جناب ابوسفیانؓ سے پوچھا تھا کہ اس دعویٰ نبوت کرنے والے شخص پر ایمان لانے والے امیر ہیں یا غریب، تو انہوں نے جواب دیا کہ غریب لوگ ہیں۔ تو بعد میں ہرقل نے بتایا کہ ہر سچے نبی پر ایمان لانے والے آغاز میں ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ مصائب کا برداشت کرنا اور زندگی کی مکمل تبدیلی اور علائق دنیوی سے مکمل انقطاع اور صرف ایک تعلق کو باقی رکھنے کیلئے باقی ہر تعلق کی قربانی یہ نہ عمر رسیدہ لوگوں کیلئے ممکن ہوتی ہے اور نہ امیر لوگ اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ محلات میں رہنے والے چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا سکتے ہیں لیکن طوفانوں کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ولولوں کی دنیا ہمیشہ غریبوں کے جھونپڑوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہاں سے وہ طوفان اٹھتے ہیں جن میں محلات بہہ جایا کرتے ہیں۔ اس لئے ہم حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے احوال میں بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے ہمرکاب اور ان کے ہمنشین غریب لوگ تھے جن پر امراء طنز کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قریش بھی نبی کریم ﷺ سے یہ کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ اور عمارؓ اور خبابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے غریب لوگ جو آپؐ کی صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں، ہم ان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں آپؐ ہٹائیں تو ہم آپ کی مجلس میں آسکتے ہیں۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ عیینہ بن حصن الفزاری جو قبیلۂ مضر کا سردار تھا۔ اسلام لانے سے پہلے ایک دفعہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، وہاں حضرت سلمانِ فارسی، ابوذر اور دیگر فقراء صحابہؓ آنحضرت ﷺ کے فیض صحبت سے مستفیض ہو رہے تھے، گرمی کا موسم تھا، پسینے کی بو ان غریبوں کے اونی جبوں سے اٹھ رہی تھی۔ عیینہ کہنے لگا کیا یہ بدبو آپ کو تنگ نہیں کرتی۔ ہم قبیلۂ مضر کے سردار ہیں، ہم آپؐ کے پاس آنا چاہتے ہیں لیکن ان غریب اور بدبودار کپڑوں والوں کے ساتھ تو ہم نہیں بیٹھ سکتے، آپؐ انہیں ہٹائیں تو ہم آپؐ کے پاس بیٹھنے کو تیار ہیں۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور آنحضرت ﷺ کو تلقین کی گئی کہ آپؐ کی حقیقی قوت اور آپؐ کا اصل سرمایہ یہی آپؐ کے فداکار اور سرفروش ہیں۔ یہ ان امراء کی نگاہوں میں چاہے کیسے بھی حقیر ہوں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تو انہیں کا مقام ہے، کیونکہ یہی اس مجلس کے اصل چراغ ہیں۔ یہ انہیں حقیر سمجھ کر بجھا دینا چاہتے ہیں لیکن:

یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

غریب اور مخلص کارکن ہی دعوت کی قوت ہیں

چنانچہ ان غرباء کیلئے آنحضرت ﷺ سے جو کچھ کہا گیا، اس سے ایک طرف ان جاں نثاروں کے دلوں میں آپؐ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کتنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ رہے وہ طبقۂ امراء کے لوگ جو انہیں ہٹانے کے مطالبات کر رہے تھے ان کے بارے میں بھی فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کس حیثیت کے مالک ہیں۔ چنانچہ ہم اسی ترتیب سے

Marfat.com

ان تینوں باتوں کو واضح کرتے ہیں۔

1- آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ یہ لوگ غریب سہی ان کے پاس پہننے کو ڈھب کے کپڑے بھی نہیں ہیں، مجبوراً اونی کپڑے پہنتے ہیں کیونکہ ان سے زیادہ اور کوئی سستا کپڑا نہیں ہوتا اور پھر پھٹتے بھی جلدی نہیں، لیکن گرمیوں میں ان میں اتنا پسینہ جمع ہو جاتا ہے کہ جس مجلس میں بھی بیٹھیں اس سے سڑاند اٹھنے لگتی ہے۔ یہ تمام باتیں آپؐ کی ناگواری کیلئے کافی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو خوش مزاج بنایا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آپؐ انہیں اپنی مجلس سے دور نہ کیجئے، کیونکہ یہی آپؐ کی اصل قوت ہیں۔ اور مزید یہ کہ آپؐ اگر انہیں دور ہٹائیں گے تو ان کے دل پارہ پارہ ہو جائیں گے، وہ ساری دنیا سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور آپؐ کی ایک نگاہ کی طلب کیلئے آپؐ کی مجلس میں بیٹھے ہیں۔ آپؐ کی نگاہِ کرم ان کے غموں کا مداوا ہے۔ آپؐ کی محبت کی ایک نگاہ ان کے دلوں کا چراغ ہے۔ وہ پیٹ پر پتھر باندھ سکتے ہیں لیکن آپؐ کے تغافل کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ مخالفین کی اذیتوں کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب آپؐ ایک دفعہ انہیں مسکرا کے دیکھتے ہیں، اس لئے فرمایا لَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ "آپؐ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں۔" یہاں تعدو واحد مونث غائب کا صیغہ ہے اور تصرف کے معنی بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپؐ اپنی نگاہیں ان سے نہ پھیریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی نگاہیں ان سے پھرنی نہیں چاہئیں، کیونکہ جیسے ہی آپؐ کی نگاہ پھرے گی یا توجہ ہٹے گی، ان کی دنیا اجڑ جائے گی۔ وہ دنیا جس پر لوگ جان دیتے ہیں اسے تو وہ آپؐ کی خاطر آگ لگا کے آئے ہیں۔ اب اگر آپؐ کی توجہ ان سے ہٹ گئی تو ان کیلئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا۔

2- اسی سے غرباء کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ان کی باتیں پروردگار ارشاد فرما رہا ہے، گویا پروردگار ان کا وکیل ہے اور ان کی خوشی اس حد تک پروردگار کو عزیز ہے کہ جس بات سے ان کی خوشی مکدر ہو سکتی ہے اس سے بچنے کیلئے حضورؐ سے سفارش کی جا رہی ہے اور مزید یہ بات کہ زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر ضروری تو نہیں ہوتا کہ وہ دل کا ترجمان ہو۔ بعض دفعہ زبان ایک بات کو دہراتی ہے لیکن دل اس کی تصدیق سے خالی ہوتا ہے لیکن کیا مقام و مرتبہ ہے ان لوگوں کا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذکر، ان کی یاد اور ان کی دعاؤں کو حُسنِ قبول کی سند دیتے ہوئے فرما رہا ہے کہ ان کا اپنے رب کو پکارنا محض پکارنا نہیں بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی کا اور اعزاز کیا ہو سکتا ہے۔

3- رہی ان امراء کی بات جو آپؐ کی خدمت میں حاضری کیلئے غریبوں کا دور کیا جانا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے تئیں جو چاہیں سمجھیں لیکن اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کی قدر و قیمت اتنی نہیں کہ وہ آپؐ کی مجلس میں بیٹھنے کے قابل ہوں اور نہ وہ اس لائق ہیں کہ آپؐ انہیں منہ لگائیں۔ یہ لوگ دنیا کے خزف ریزوں کے پجاری ہیں، ان کی نگاہ میں دین کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور نہ انسانیت کا کوئی مقام ہے۔ ہر چیز کو درہم و دینار کے ترازو میں تولتے ہیں۔ ان کے دلوں کی دنیا مسمار ہو چکی ہے۔ ہم نے ان کے دلوں کو اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے کچھ مقاصد بھی ہیں، یہ صرف ہوائے نفس کی پیروی کرنا جانتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ جس طرح حیوان صرف اپنی ضروریات اور خواہشات کے پیچھے چلتا ہے اسے انسانی اقدار کا کچھ پتہ نہیں، یہی حال ان کا بھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا ہر کام اعتدال سے ہٹا ہوا اور افراط و تفریط پر مبنی ہے کیونکہ "فرط" کا معنی اسراف، ظلم اور حدود سے تجاوز کے ہیں۔ الامر الفرط اس معاملہ کو کہتے ہیں جو حدود سے بالکل متجاوز ہو گیا ہو۔

یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ نبی کریم ﷺ طبقۂ امراء کے لوگوں کو زیادہ پسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ آپؐ کی

Marfat.com

نشستیں ہوں۔ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دل میں ہر انسان کیلئے قبولیتِ ایمان کی جو شدید حرص پائی جاتی تھی اس کے پیشِ نظر آپؐ خیال فرماتے کہ اگر یہ بااثر لوگ کسی طرح مسلمان ہو جائیں تو ان کی وجہ سے دوسرے لوگ بڑی تیزی سے دائرۂ ایمان میں داخل ہو سکتے ہیں اور جب وہ امیر لوگ اس طرح کی خواہش کا اظہار کرتے کہ ہم ان غرباء کے ساتھ بیٹھنے کیلئے تیار نہیں ہیں، یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے یہاں کوئی بڑا زمیندار کسی کمین کے ساتھ بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دیہات میں غریب لوگوں کو کمی کمین کہا جاتا ہے، یعنی وہ انتہائی گرے ہوئے لوگ ہیں۔ یہی حال قریش کا بھی تھا۔ ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دل میں اشاعتِ اسلام کے جذبے کے تحت کبھی یہ خیال آتا ہو کہ میں اگر ان کیلئے الگ نشست کا اہتمام کروں تو شاید یہ لوگ متاثر ہوں اور حلقۂ ایمان میں آجائیں، لیکن اس سے غریب جاں نثاروں کے دل پر جو چوٹ لگ سکتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور آنحضرت ﷺ کو اس بات سے روک دیا گیا۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۗ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

(اور کہہ دیجئے یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے، پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے، ہم نے ظالموں کیلئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اور اگر وہ (پانی کیلئے) فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی سے جو پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہوگا، چہروں کو بھون ڈالے گا، کیا ہی برا پانی ہوگا اور کیا ہی برا ٹھکانہ۔ ۲۹)

سُرَادِقُهَا: سُرَادِق کے اصل معنی ہیں، قناتیں اور پردے، جو کسی خیمہ گاہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ بعض اہلِ لغت نے لکھا کہ سُرَادِق ہر وہ چیز ہے جو کسی کو اپنے گھیرے میں لے لے، جیسے دیوار اور خیمہ وغیرہ۔

ترمذی اور مسند احمد کی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے رسول کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد آگ کی چار دیواریں ہیں۔ ہر ایک اتنی موٹی ہوگی کہ اسے طے کرنے کیلئے چالیس سال درکار ہوں گے۔

مُهْل: مجاہد سے اس کا یہ معنی روایت کیا گیا ہے کہ مُهْل پیپ اور خون کو کہتے ہیں۔ اور حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ تیل کا سیاہ تلچھٹ ہے جو نیچے جم جاتا ہے۔ بعض حضرات نے اس لفظ کا معنی لاوے سے کیا ہے، یعنی زمین کے وہ مادے جو شدتِ حرارت سے پگھل گئے ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد پگھلی ہوئی دھات ہے۔ مثلاً پگھلا ہوا تانبا۔

متکبرین کیلئے کلمۂ حق

آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپؐ ان امراء کی ناز برداریاں چھوڑیے، آپؐ کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے، وہ وہ راستہ ہے جس پر اصحابِ کہف چلے۔ شاید اسی لئے ان کا تذکرہ پہلے کیا گیا ہے کہ ان کے اپنوں اور بیگانوں نے انہیں سمجھایا، بجھایا، بہلایا اور آخر دھمکایا لیکن انہوں نے صاف اعلان کیا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اس کے سوا کسی اور کو الٰہ ماننے کا تصور

Marfat.com

بھی نہیں کر سکتے۔ اور جب وہ اپنی طویل نیند سے بیدار ہوئے تو تب بھی انہیں فکر اسی بات کی تھی کہ اگر ہماری قوم کو پتہ چل گیا کہ ہم کون ہیں، تو وہ ہمیں یا تو رجم کر دیں گے اور یا دوبارہ ہمیں مشرک بنا دیں گے اور ہم کسی قیمت پر توحید سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کیلئے بھی یہی ایک راستہ ہے۔ اور آنحضرت ﷺ سے اعلان کرایا جا رہا ہے کہ آپ قریش سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ حق وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو گیا ہے اور جسے میں نے صاف صاف تم تک پہنچا دیا ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے چاہو اسے تسلیم کرو اور چاہے اپنے کفر پر قائم رہو، درمیان کا کوئی راستہ نہیں۔ اور یہ تمہاری اپنی ذمہ داری ہے کہ تم صحیح راستے پر چلو۔ یہ بہانے کہ ان غریبوں کو اٹھاؤ تو ہم آئیں گے یہ تمہیں تمہارے بُرے انجام سے نہیں بچا سکتے۔ ہاں! ایک بات یاد رکھو کہ اگر تم کفر کا راستہ اختیار کرتے ہو تو پھر ہم تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں کہ قیامت کے دن تمہارے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسے ظالموں کیلئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں انہیں اپنے گھیرے میں لے چکی ہیں۔ قیامت کا اعلان ہونے کی دیر ہے یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔ اس آگ سے نکلنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہوگی، یہ جلتے ہوئے جب پانی کی فریاد کریں گے تو انہیں پگھلے ہوئے تانبے کا پانی دیا جائے گا جو چہروں کو بھون دے گا۔ اندازہ کرو، وہ کیسا پانی ہوگا جس کا ایک گھونٹ سب کچھ جلا دینے کیلئے کافی ہوگا اور وہ کیسا ٹھکانہ ہوگا جس کی آگ کی لپٹیں قناتوں اور دیواروں کی طرح اپنے حصار میں لے لیں گی اور کبھی بھی اس سے جان نہیں چھوٹے گی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿٣٠﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ ۚ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾

(بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے تو ہم خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ ۳۰) یہی وہ خوش نصیب ہیں جن کیلئے ہیشگی کے جنت ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، وہ ان جنتوں میں سونے کے کنگنوں سے آراستہ کئے جائیں گے، وہ سبز باریک ریشمی کپڑوں اور موٹے ریشمی کپڑوں کی پوشاک پہنیں گے، وہ تختوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی خوب صلہ ہے اور کیا ہی خوب ٹھکانہ۔ ۳۱)

سُنْدُس : اس کا واحد سُنْدُسَہ ہے۔ وہ کپڑا جو باریک ریشم سے بنایا گیا ہو۔

اِسْتَبْرَق : اس کپڑے کو کہتے ہیں جو موٹے ریشم سے بنایا گیا ہو۔

اَرَآئِک : اس کا واحد ہے اَرِیْکَۃٌ مرصع پلنگ یا تخت کو کہتے ہیں۔

صاحبِ ایمان لوگوں کو صلہ

قرآنِ کریم نے اپنے اسلوب کے مطابق پہلے کافروں کے انجام کو بیان فرمایا، اب اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا اور ان پر انعامات کا ذکر ہے جو ایمان لائے اور مخالفین کی اذیتوں کا ہدف بنے۔ ان کے بارے میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ کسی بھی مومن کا اصل

Marfat.com

سرمایہ ایمان اور عملِ صالح ہے۔ جو شخص ان دونوں خوبیوں سے آراستہ ہے اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ ہم ایسے لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ یوں تو کسی نیکی کا اجر بھی ضائع نہیں ہوتا لیکن خاص طور پر وہ لوگ جنہوں نے اخلاصِ نیت سے بہترین اعمال کیے یعنی نہ تو نیت میں کوئی خلل ہو اور نہ عمل کرنے کے طریقے میں کسی طرح کی شریعت کی مخالفت ہو۔ ایسا عمل یقیناً احسن عمل کہلاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا اجر کبھی اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرماتے۔ ممکن ہے اس میں اشارہ ان صحابہ کرام کی طرف ہو جو اس وقت ایمان لا چکے تھے وہ نہ صرف ایمان اور عملِ صالح سے آراستہ ہیں بلکہ وہ ایمان کے تمام تقاضوں سے بہرہ ور ہیں۔ اور عمل کی تمام خوبیوں سے متصف ہیں۔ دوسری آیت میں فرمایا یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہم ایسی جنتیں عطا فرمائیں گے جنہیں کبھی زوال نہیں ہوگا۔ جن کے نیچے سے نہریں رواں ہوں گی۔ انہیں بادشاہوں کی طرح سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس سندس اور استبرق سے تیار ہوگا۔ سندس باریک ریشم کے کپڑے کو اور استبرق دبیز ریشم کے کپڑے کو کہتے ہیں اور بعض لوگوں نے استبرق مخمل کے معنی میں لیا ہے اور وہ ایسے پلنگوں اور تختوں پر خوشنما تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے جیسے دلہن آراستہ بستر پر بٹھائی جاتی ہے۔

اس میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اہلِ جنت کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنانے کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ سبز ریشمی کپڑوں کی قبائیں پہنیں گے اور ان کی مسندیں ایسی ہوں گی جیسے دلہنوں کی آراستہ مسندیں ہوتی ہیں۔ ان تمام باتوں میں نسوانیت کا احساس ہوتا ہے جبکہ مرد کیلئے نسوانیت باعث فخر نہیں۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اس کا حقیقی جواب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم کی تفصیلات اور ان کی کیفیات متشابہات سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ وہ عالمِ غیب کی باتیں ہیں، عقل جن کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اگر یہ بات قبول کر لی جائے تو پھر ان تعبیرات پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ مقصود نہ سونے کے کنگن ہیں، نہ ریشم کے کپڑے اور نہ دلہن کے پلنگ بلکہ مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ جنت میں داخل ہونے والا ہر شخص اس طرح جنت میں رہے گا جیسے بادشاہ اپنے محلات میں رہتے ہیں۔ وہ اس طرح لباس پہنے گا جس طرح کی پوشاک بادشاہ پہنتے ہیں اور اس کی آرام گاہ ایسے بیش قیمت سامان پر مشتمل ہوگی جیسے بادشاہوں کی ہوتی ہے۔ تو مقصود ان کے مقام و مرتبہ کا اظہار کرنا ہے لیکن اس کیلئے تعبیر وہ اختیار کی گئی ہے جس کو اہلِ عرب آسانی سے سمجھ سکتے تھے اور جس کا ان کے زمانے میں رواج بھی تھا کیونکہ اس زمانے کے بادشاہوں کا لباس بھی ایسا ہی تھا، مسند بھی ایسی تھی اور ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہننا مرغوب بھی تھا۔

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ حال ان لوگوں کا بیان کیا گیا ہے جو قریش کی نگاہوں میں انتہائی بے وقعت یعنی کمین لوگ تھے۔ جن کی غربت کا ہمیشہ مذاق اڑایا جاتا تھا۔ قریش اپنی امارت سے بہتر مستقبل کی امید لگائے بیٹھے تھے اور ان کی غربت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے تھے کہ جیسا حال تمہارا یہاں ہے اگر قیامت آئی تو ایسا ہی تمہارا حال وہاں بھی ہوگا۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ تمہارا ٹھاٹ باٹ تو جہنم کا سامان بننے والا ہے اور جنہیں تم ناداری کے طعنے دیتے ہو اور جن کی بے کسی کا مذاق اڑاتے ہو قیامت کے دن یہی مستقبل کے بادشاہ ہوں گے اور ان میں سے ایک ایک فرد ایسی نعمتوں سے متمتع ہوگا آج تم جن کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا

لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا

Marfat.com

بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ
فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ
اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ
قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ
لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ
وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ
ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿٣٧﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿٣٨﴾ وَلَوْلَاۤ
اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا
اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٣٩﴾ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ
وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿٤٠﴾ ۙ اَوْ
يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿٤١﴾ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ
يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ
يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿٤٢﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿٤٣﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ
ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿٤٤﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۵۔ (اور اے پیغمبر! ان کے سامنے دو آدمیوں کی مثال بیان کیجئے ان میں سے ایک کیلئے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ان دونوں باغوں کو کھجور کے درختوں کی باڑ سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی کے قطعات بھی رکھے۔ ۳۲) یہ دونوں باغ خوب اپنے اپنے پھل لائے، اس میں ذرا کمی نہیں کی، اور ان کے درمیان ہم نے نہر بھی جاری کر دی۔ ۳۳) اور اس شخص کے اور بھی اموال تھے تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ میں مال میں بھی تم سے زیادہ ہوں اور تعداد کے اعتبار سے بھی تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ ۳۴) اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر ظلم ڈھا رہا تھا، اس نے کہا کہ میں خیال نہیں کرتا کہ یہ (سرسبز وشاداب باغ) کبھی برباد ہوگا۔ ۳۵) اور میں یہ گمان بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا تو اس سے بھی بہتر مرجع پاؤں گا۔ ۳۶) اس کے ساتھی نے اس سے بحث کرتے ہوئے کہا، کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا، پھر پانی کی ایک بوند سے بنا سنوار کر تجھے ایک مرد بنا دیا۔ ۳۷) لیکن (میرے نزدیک) وہ اللہ میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ۳۸) اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے اس طرح کیوں نہ کہا، یہ جو کچھ ہے سب اللہ کا فضل ہے، اللہ کے سوا کسی کو کوئی قوت حاصل نہیں، اگر تم مال اور اولاد کے اعتبار سے مجھے اپنے سے کم دیکھتے ہو۔ ۳۹) تو امید ہے کہ میرا رب مجھے تمہارے باغ سے بہتر باغ عطا کر دے اور تمہارے باغ پر بھیج دے کوئی آسمانی آفت کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے۔ ۴۰) یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تم اسے کسی طرح تلاش نہ کر سکو۔ ۴۱) اور سمیٹ لیا گیا اس کا سارا پھل، پھر صبح کو وہ رہ گیا ہاتھ ملتا ہوا اس مال پر جو اس نے اس باغ پر خرچ کیا تھا اور وہ باغ اپنی چھتریوں پر گرا پڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا، اے کاش! میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔ ۴۲) اور اس کے پاس نہ کوئی جتھا تھا جو خدا کے مقابلے میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود ہی انتقام لینے والا بن سکا۔ ۴۳) تب اسے معلوم ہوا کہ سارا اختیار خدائے برحق ہی کا ہے اور وہ بہترین اجر اور بہترین انجام والا ہے۔ ۴۴)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾

(اور اے پیغمبر! ان کے سامنے دو آدمیوں کی مثال بیان کیجئے ان میں سے ایک کیلئے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ان دونوں باغوں کو کھجور کے درختوں کی باڑ سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی کے قطعات بھی رکھے۔ ۳۲)

قریش کیلئے ایک تمثیل

نبی کریم ﷺ باقی انبیاء و رسل کی طرح اہل دنیا کی اصلاح کیلئے تشریف لائے تھے۔ اصلاح کامل چونکہ خیالات کی تبدیلی اور قلب ودماغ کی درستی سے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ حتی المقدور اپنے مخاطب لوگوں کو مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے غا

Marfat.com

خیالات کو صحیح خیالات سے بدلتے ہیں، ان کے شبہات کا ازالہ کرتے ہیں اور اگر وہ سادہ انداز میں بات کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں تو اپنی دعوت کی تسہیل کیلئے مثالوں سے بھی کام لیتے ہیں اور ان پر جو کتاب اترتی ہے اس کے ذریعے پروردگار انہیں مختلف طریقوں سے رہنمائی دیتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے کی یہ آیات ہیں جن میں روئے سخن تو قریش ہی کی طرف ہے کیونکہ وہی آنحضرت ﷺ کی دعوت کے اولین اور براہِ راست مخاطب تھے۔ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے آج دنیا کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔ اس میں آنحضرت ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اہلِ مکہ کو دو آدمیوں کی مثال دے کر جن میں سے ایک مومن ہے اور دوسرا کافر یہ بات سمجھایئے کہ ایک کافر دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور ایک مومن کس نگاہ سے۔ اس طرح ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنی اصلاح پر آمادہ ہو سکیں۔

مثال میں جن دو شخصوں کا ذکر ہے ان میں جیسے عرض کیا ایک مومن ہے اور دوسرا کافر اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ کافر کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بیشتر نعمتوں سے نوازا ہے، لیکن مومن وہ اگرچہ ایمان کی دولت اور قلب کی آسودگی سے مالا مال ہے لیکن دنیوی نعمتوں کے اعتبار سے تہی دامن ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس کافر شخص کو جو نعمتیں دی گئی تھیں اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔

تمثیل اور اہلِ عرب میں مطابقت

سرزمینِ عرب چونکہ ایک بے آب و گیاہ اور بنجر زمین تھی جس میں روئیدگی اور سبزہ کی انتہائی کمیابی تھی۔ زمین سنگلاخ اور ہوا آتش افشانی کرتی تھی اور لوؤں کی لپٹ اور بادِ صرصر کے طوفانوں کا وہ زور کہ الامان والحفیظ۔ کہیں کہیں کھجوروں کے جھنڈ دکھائی دیتے تو لوگ اسے جنت سمجھتے۔ ایسے لوگوں کی نگاہوں میں باغ سب سے بڑی نعمت تھی۔ اس لئے قصداً پروردگار نے باغ کا ذکر فرمایا۔ تاثر یہ دینا مقصود ہے کہ اس شخص کو وہ نعمت دی گئی تھی جو اس ملک میں انتہائی بیش قیمت تھی اور پھر اپنی نعمت کی تکمیل کا ذکر فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہم نے اسے ایک نہیں دو باغ دیئے تھے۔ یہ قرآنِ کریم کا مخصوص اسلوب ہے کہ جب وہ کسی نعمت کی فراوانی کا ذکر کرتا ہے تو ایک کی بجائے دو کا ذکر کرتا ہے۔ اہلِ جنت کو بے پایاں نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ جہاں ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نعمت ملے گی وہیں ان کی قدر افزائی کا یہ عالم ہوگا وَمِنْ دُوْنِہِمَا جَنَّتَانِ یعنی ان کو دو باغ بھی عطا کیے جائیں گے، حالانکہ اہلِ جنت کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہر جنتی کو وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کرے گا، تو دو کا کیا ذکر، وہ اگر سینکڑوں باغ بھی مانگے تو وہ بھی دیئے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو کا عدد تکمیلِ نعمت کا اظہار ہے اس سے معدود کو متعین کرنا مقصود نہیں۔ اس کے بعد ان باغوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ نقشہ وہ ہے جو کسی بھی باغ کی بہترین تصویر ہے۔ عرب جس باغ کو نمونے کا باغ سمجھتے تھے اور حقیقت میں بھی ایسا باغ نمونے ہی کا باغ ہوتا تھا اس کی انہیں خوبیوں کا ذکر کیا جاتا تھا جس کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ ان میں تین خصوصیات کا ذکر تو اس آیتِ کریمہ میں ہے اور ایک کا ذکر دوسری آیت میں آ رہا ہے۔

پسندیدہ باغ کی خصوصیات

اس باغ کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں انگوروں کی البیلی شاخیں نگاہوں کو تراوت بخشتی تھیں۔ انگور کی بیل کا گھنا سایہ تو ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے پتوں کی گہری ہریالی بجائے خود اپنے اندر غیر معمولی حُسن رکھتی ہے۔ باغ میں داخل ہونے والا اس

Marfat.com

کے اس حُسن سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔

اس باغ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اردگرد کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی گئی تھی۔ اس کے دو فائدے تھے۔ ایک تو یہ کہ باغ باہر ہی سے انتہائی خوشنما معلوم ہوتا تھا کیونکہ قطاروں میں لگے ہوئے کھجور کے درخت خوبصورتی میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ جن لوگوں نے کھجور کے باغات دیکھے ہیں وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ کوئی درخت بھی اپنے قد وقامت، اپنے پتوں کے رنگ اور فضا میں لہراتی ہوئی شاخوں اور پھلوں کی خوش رنگی میں کھجور کے درخت کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اور دوسرا فائدہ اس کا یہ ہے کہ عرب کے موسمِ گرما میں چلنے والی بادِ صرصر نہ صرف انسانوں کیلئے بلکہ حیوانوں اور درختوں کیلئے بھی انتہائی مہلک اور اذیت ناک چیز ہے۔ انسان تو اپنے کپڑوں میں لپٹ کر اور کسی اوٹ کے پیچھے بیٹھ کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ زہریلی ہوا ان کے نتھنوں میں داخل ہو کر انہیں اندرونی طور پر زخمی نہ کر دے، لیکن درختوں، پودوں اور بیلوں کو بچانے کیلئے وہ یہ انتظام کرتے تھے کہ ان کے گرد کھجوروں کے درختوں کی باڑ لگاتے تھے۔ یہ درخت اتنا مضبوط اور اتنی قوتِ مدافعت کا مالک ہے کہ نہ صرف خود بادِ صرصر کا مقابلہ کرتا ہے بلکہ باغ کے اندرونی حصوں کو حتی الامکان محفوظ بھی رکھتا ہے۔

تیسری خصوصیت اس باغ کی یہ تھی کہ اس باغ میں صرف انگوروں کی بیلیں ہی پھیلی ہوئی نہیں ہوتی تھیں بلکہ کچھ قطعات خالی بھی چھوڑے جاتے تھے تاکہ حسبِ ضرورت اس میں دوسری چیزیں کاشت کی جا سکیں۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾

(یہ دونوں باغ خوب اپنے اپنے پھل لائے، اس میں ذرا کمی نہیں کی، اور ان کے درمیان ہم نے نہر بھی جاری کر دی۔ ۳۳)

باغ کی چوتھی خصوصیت اس آیت میں بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کی سیرابی اور شادابی کیلئے ہم نے اس میں ایک نہر بھی رواں کر رکھی تھی جس سے پورا باغ سینچا جاتا تھا۔ اور ہر طرف پانی کی نالیاں پھیلا دی گئی تھیں۔

ان خصوصیات کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ دونوں باغ خوب پھل لائے۔ کھجوروں نے اپنا پھل دینے میں اور انگوروں نے اپنی بہار دکھانے میں اور باقی باغ کے مختلف قطعات میں پھیلے ہوئے غلے کی فصلوں نے لہلہانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش نے اسی پر اکتفا نہیں فرمایا تھا بلکہ اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

(اور اس شخص کے اور بھی اموال تھے تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ میں مال میں بھی تم سے زیادہ ہوں اور تعداد کے اعتبار سے بھی تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ ۳۴)

ثمر کا مفہوم

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ...... اس کا ایک ترجمہ یہ کیا گیا ہے اور اس کے پھلوں کا موسم ہوا تو۔ اور دوسرا ترجمہ وہ ہے جو ہم نے کیا ہے۔ یہ دونوں ترجمے یقیناً صحیح ہیں۔ البتہ آیت کا دوسرا جملہ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا دوسرے ترجمے کو تقویت دے رہا ہے کہ اسے اپنے باغ کی

Marfat.com

سرسبزی اور شادابی پر تو بجا طور پر ناز تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس کا اظہار کئے بغیر بھی نہ رہ سکا کہ میرے پاس صرف یہی دولت نہیں بلکہ سونا چاندی کے ڈھیر بھی موجود ہیں۔ ان نعمتوں کی فراوانی کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا۔ شکر کے اظہار کیلئے اس کے احکام پر عمل کرتا اور زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے بندوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتا اور اس بات کا یقین رکھتا کہ یہ جو کچھ میرے پاس ہے یہ سب میرے اللہ تعالیٰ کی عطا ہے ورنہ کتنے لوگ ہیں جو مجھ سے زیادہ محنت کرتے اور تدبیر لڑاتے ہیں، لیکن وہ کبھی بھی رزق کی فراوانی سے بہرہ ور نہیں ہوتے، لیکن اس کے برعکس اس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ یہ تھا کہ جب اس کے ہمسائے نے جو ایک مردِ مومن تھا اس کے الجھے ہوئے خیالات اور بگڑے ہوئے اخلاق او تکلیف دہ طرزِ عمل کو دیکھ کر اسے نصیحت کرنے کی کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو کچھ تمہیں ملا ہے اس پر اس کا شکر بجالاؤ، تو اس نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اس مردِ مومن کی غربت پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ تم کون ہوتے ہو مجھے نصیحت کرنے والے، میں ہر لحاظ سے تم سے بہتر ہوں۔ میں مال و دولت کی کثرت سے بہرہ ور ہوں جبکہ تم نانِ شبینہ کے محتاج ہو۔ اور میرے پاس حامیوں کا جتھا ہے اور نوکر چاکر بھی کثرت سے ہیں اور تمہیں کوئی منہ لگانے کو تیار نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جس طرح زندگی گزار رہا ہوں اور جس طرح کے تصورات رکھتا ہوں وہ یقیناً تیرے عقائد اور تیرے طرزِ عمل سے بہتر ہیں، کیونکہ اگر میں غلط ہوتا تو مجھے یہ دولت کی فراوانی میسر نہ ہوتی اور تم اگر اپنے خیالات و عمل میں درست ہوتے تو اس طرح جوتے نہ چٹخاتے پھرتے۔ درحقیقت ہر وہ شخص جو دنیا اور دولتِ دنیا کے حصول ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہے وہ اسی دلیل سے اپنے آپ کو برحق ثابت کرتا ہے۔ خیالات کا یہی فساد ہے جس نے قریش کو بھی ہدایت سے دور رکھا اور اکثر دنیا کے پرستار اسی دلیل کے سہارے اپنی گمراہیوں کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دولت کی کمی بیشی ہدایت کا معیار نہیں بلکہ اس کا معیار صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی دونوں واسطوں سے ہمیشہ انسانوں کو اپنی رہنمائی سے نوازا ہے اور ان کے تصورات کی اصلاح کی ہے۔ چنانچہ ہر وہ تصور اور وہ خیال جو ان دونوں معیارات سے ہٹا ہوا ہو یعنی جس کے پیچھے وحیِ الٰہی کی سند نہ ہو وہ یقیناً گمراہی ہے لیکن طبقۂ امراء کا ہمیشہ یہ حال رہا ہے کہ وہ اپنی امارت کو اپنے برسرِ ہدایت ہونے اور دوسروں کی غربت کو ان کے گمراہ ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ محولہ بالا شخص بھی ایسی ہی گمراہیوں کا شکار تھا اس لئے اس مردِ مومن سے بات کرتے ہوئے اس نے اپنے مال و دولت کی کثرت اور افرادی قوت کی زیادتی پر نہ صرف فخر کیا بلکہ اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل بھی بنایا۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ
السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

(اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر ظلم ڈھا رہا تھا، اس نے کہا کہ میں خیال نہیں کرتا کہ یہ (سرسبز و شاداب باغ) کبھی برباد ہوگا۔ ۳۵ اور میں یہ گمان بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا تو اس سے بھی بہتر مرجع پاؤں گا۔ ۳۶)

کافر اور مومن کی ذہنیت کا فرق

ان آیات میں مومن اور کافر کی ذہنیت کے فرق کو نمایاں کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کافر اس دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور مومن

Marfat.com

دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ ایک کافر کے دنیا کے بارے میں تصورات اور خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اس کے نزدیک دنیا کا ٹھاٹ باٹ اور کروفر اور دولت کی فراوانی حاصلِ زندگی ہے۔ اسی کیلئے وہ جیتا اور مرتا ہے، اسی کو وہ عزت کا معیار سمجھتا ہے اور عنداللہ اور آخرت میں بھی وہ اسی کو کامیابی کی ضمانت گردانتا ہے اور اسی دنیا کو جنت قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ آج جو شخص خوشحال ہے وہ قیامت میں بھی خوشحال ہوگا اور جو آج بدحال ہے وہ قیامت میں بھی بدحال ہوگا۔ اور دوسری خصوصیت اس آیتِ کریمہ میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جس طرح دنیا کی محبت میں انسانیت سے تہی دامن ہو جاتا ہے اور انسانی اقدار کو انسان کیلئے ضروری سمجھنے کی بجائے دولتِ دنیا کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس طرح سے اس کی اپنی شخصیت دنیا میں گم ہو جاتی ہے۔ اور یہ فساد بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچتا ہے کہ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں، ہر بڑے اور چھوٹے آدمی کو موت آئے گی، لیکن اس کے فسادِ عقل وفکر کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی دولت اور اپنے باغات کے بارے میں یہ گمان رکھتا ہے کہ یہ کبھی ہلاک نہیں ہوں گے اور ان پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ اس کے اس فکری فساد کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ قیامت کبھی نہیں آئے گی۔ اس لئے زندگی کے بارے میں کبھی حساب کتاب نہیں ہوگا اور کبھی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ جس طرح یہاں ایک حیوان زندگی گزارتا ہے کہ جبلت اس کو جس طرف کھینچتی ہے وہ اس طرف چل دیتا ہے۔ اس کا نہ کوئی مقصدِ زندگی ہے اور نہ شعورِ زندگی۔ یہ بھی بالکل حیوان کی طرح زندگی کے عیش وعشرت کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھتا۔ وہ دنیا میں آنے کا مقصد صرف یہ سمجھتا ہے کہ اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا جائے، خواہشِ نفس کی پیروی کی جائے اور ہر وہ کام کیا جائے جو طبیعت چاہے۔ چاہے انسانیت اس کی اجازت دے یا نہ دے۔ اس اندازِ فکر سے بنیادی تبدیلی یہ آتی ہے کہ انسان بندۂ خدا بننے کی بجائے بندۂ درہم ودینار اور بندۂ شکم بن جاتا ہے۔ اب اس کا محور ومدار بلکہ مطاف معدہ ٹھہرتا ہے۔ وہ دماغ سے کم اور معدہ سے زیادہ سوچتا ہے، اس کے عزائم قلب کی گہرائیوں سے نہیں بلکہ معدہ سے پھوٹتے ہیں اور یہ فرق اس قدر خطرناک ہے کہ صرف زندگی کے تصورات ہی کو نہیں بدلتا بلکہ قسمت اور انجام کو بھی بدل دیتا ہے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

اسی غلط طرزِ فکر کی انتہا یہ ہے کہ اس کافر شخص نے یہ کہا کہ اولاً تو قیامت قائم نہیں ہوگی اور اگر بفرضِ محال قیامت آ ہی گئی تو تب بھی میرے لئے فکر کی کوئی بات نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہاں بھی مجھے بہتر مقام ومرتبہ ملے گا، بلکہ دنیا سے بھی زیادہ اعزاز واکرام سے نوازا جائے گا اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ گمراہ لوگوں کا سہارا یہی طرزِ فکر ہے بالخصوص طبقۂ امراء کیلئے یہ ایک ایسی دلیل ہے جو وہ ہمیشہ ہر اس صاحب ایمان شخص کے سامنے پیش کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے جو ایمان کی دولت تو رکھتا ہے لیکن ان کی طرح دولت کی فراوانی اس کے پاس نہیں۔ امیر لوگ ایسے غریبوں پر طنز کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کیلئے یہ کبھی نہیں چاہتا کہ وہ لوگوں میں دھکے کھائے اور دنیا کے ہاتھوں ذلیل ہو۔ اس لئے جسے اس نے دنیا میں عزت دی ہے وہ یقیناً اس کا محبوب ہے۔ اور جسے دنیا میں تہی دامن رکھا ہے وہ یقیناً اس کی نگاہوں سے گرا ہوا ہے۔

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ

Marfat.com

نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾

(اس کے ساتھی نے اس سے بحث کرتے ہوئے کہا، کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر بنا سنوار کر تجھے ایک مرد بنا دیا۔ ۳۷)

کافر کا اصل مرض

اس کے مومن دوست نے اس سے کہا جبکہ وہ دونوں آپس میں بحث کر رہے تھے کہ تیرا اصل مرض یہ ہے کہ تو اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھا ہے، تجھے یہ بھی خبر نہیں کہ تیرا وجود کسی کی عطا ہے، تیری زندگی کسی کی بخشش ہے۔ زندگی کے مختلف مدارج میں تیری تربیت اور تیری افزائش کسی کی رہینِ منت ہے۔ کیا تو اس ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے عدم سے ہست کیا، تیرے جدِ امجد کو اس نے مٹی سے بنایا اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے جسم کی تخلیق میں ان عناصر سے کام لیا گیا جن کی اصل مٹی ہے۔ پھر توالد وتناسل کے سلسلے میں تجھے گندے پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا، پھر تو ایک طویل عرصے تک ماں کے پیٹ میں پانی سے خون بنا، خون سے گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہوا، پھر تیری شکل و صورت بنائی گئی اور تیرا نک سک درست کر کے تجھے ایک خوبصورت مرد بنا دیا کہ مخلوق میں جس کی خوبصورتی کی مثال نہیں۔ اور مزید یہ کہ تو دنیا میں آیا تو تجھے کسی بات کی خبر نہ تھی۔ جس ذات کا تو انکار کرتا ہے اس نے تیرے ماں باپ کے دل میں محبت اور شفقت پیدا کی۔ اور انہوں نے تمہیں ہر دکھ سکھ اور ہر غم وراحت میں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھا۔ پھر تجھے حواس کی دولت عطا کی اور تجھے جوہرِ عقل سے نوازا اور تجھے ایک ایسا انسان بنا دیا گیا جو خلا پر کمندیں ڈالتا اور لوہے میں قوتِ پرواز پیدا کر دیتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ جس ذات کے تجھ پر اس قدر احسانات ہیں تو اس کا انکار کرتا ہے اور تیری اپنی ذات جو قدم قدم پر اس کی مرہونِ احسان ہے، اسے اس کے مقابلے میں لاتا ہے اور اس کے احکام کے مقابلے میں اپنی خواہشِ نفس کو ترجیح دیتا ہے۔

تری ہر ادا میں بل ہے، تری ہر نگہ میں الجھن
مری آرزو میں لیکن نہ پیچ ہے نہ خم ہے

محض اللہ تعالیٰ کا اعتراف ایمان کیلئے کافی نہیں

ایک بات جس کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اس آیت میں دیکھا ہے کہ مردِ مومن اس شخص کو کافر قرار دے رہا ہے اور یہ الزام دے رہا ہے کہ تو نے اس ذات سے کفر کیا ہے، جس نے تجھے مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر بنا سنوار کر ایک مرد بنا دیا جبکہ اس سے پہلے کی آیت میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ متذکرہ شخص نے یہ کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ قیامت قائم ہوگی، لیکن اگر قیامت واقعی برپا ہوئی اور مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو میں اس دنیا سے بھی بہتر مرجع پاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کافر نہیں بلکہ اس کا ماننے والا ہے۔ تو پھر مردِ مومن نے اسے کافر کیسے قرار دیا؟ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کے وجود کا اعتراف انسان کو مومن نہیں بنا دیتا بلکہ اس کے وجود کے اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ وہی میرا الٰہ ہے، وہی حقیقی حکمران ہے، اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا طریقہ دے۔ ان کیلئے ایک آئین اور قانون مقرر کرے جس کے مطابق وہ زندگی گزاریں اور اپنے

Marfat.com

رسولوں کی معرفت ان پر یہ بات واضح کردے کہ یہ میری شریعت ہے۔جس کے اوامر کی تعمیل اور جس کے نواہی سے اجتناب تمہارے لئے ضروری ہے اور ایک دن آئے گا جب میں تم سے اس حوالے سے باز پرس کروں گا۔جن لوگوں نے میرے احکام کے مطابق زندگی گزاری وہ نجات پائیں گے اور دوسرے جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔جب تک ان تمام باتوں پر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا اور اس کے مطابق عمل نہیں کرتا محض اللہ تعالیٰ کے مان لینے سے وہ مومن نہیں ہو جاتا۔یہ ایک ایسی غلط فہمی ہے جو ہمیشہ انسانوں میں پائی گئی ہے اور آج کا انسان بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو لبرل کہتے ہیں وہ بھی مومن کہلاتے ہیں اور جو لوگ اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں انہیں بھی اپنے مسلمان ہونے پر اصرار ہے۔کیونکہ وہ ایمان اور اسلام کا صرف یہی مفہوم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا اعتراف اور اللہ تعالیٰ کے نبی کا میلاد منا لینا ہمارے مسلمان ہونے کیلئے کافی ہے، چاہے ہماری زندگی اسلام سے کوسوں دور ہو۔اس آیتِ کریمہ نے واضح طور پر اس غلط فہمی کا ازالہ کردیا ہے۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

(لیکن (میرے نزدیک) وہ اللہ میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ۳۸)

لٰكِنَّا۠......اصل میں لٰكِنْ اَنَا ہے۔

مومن کا اظہارِ حق

مردِ مومن نے اسے فہمائش کرنے کے بعد واضح طور پر اپنا موقف بیان کیا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتے ہو لیکن اس کی حیثیت تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہو۔تمہارے نزدیک وہ ایسا وجود ہے جو مخلوقات کو خلق کرنے کے بعد کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے اور اس کا نظام کائنات کے چلنے میں کوئی عمل دخل نہیں، لیکن میں جس اللہ کو مانتا ہوں، وہ میرا رب ہے۔جس طرح وہ ظاہری طور پر میری تربیت کر رہا ہے اسی طرح اس کی ربوبیت معنوی طور پر بھی میری ضرورتیں پوری کر رہی ہے۔اس نے مجھے جس طرح حواس دیئے اور عقل کا چراغ بخشا، اسی طرح اس نے میری کردار سازی، میرے افکار کی پاکیزگی اور میری منزل کے تعین میں بھی میری رہنمائی فرمائی۔وہ میرا صرف خالق ہی نہیں بلکہ میرا معبود، میرا مسجود، میرا حاکم اور میرا محبوب بھی ہے۔میں نہ اس کی ذات میں کسی کو شریک ٹھہراتا ہوں، نہ اس کی صفات میں کسی کو شریک مانتا ہوں۔جس طرح وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اسی طرح اپنی صفات میں بھی وحدہ لاشریک ہے۔عبادت اور بندگی صرف اسی کی، غیر مشروط اطاعت بھی اسی کیلئے، زبان اور دل کی شہادت بھی صرف اس کی خاطر۔تم بھی اگر اسے مانتے ہو تو اس طرح مانو جس طرح میں مانتا ہوں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ

Marfat.com

السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

(اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے اس طرح کیوں نہ کہا، یہ جو کچھ ہے سب اللہ کا فضل ہے، اللہ کے سوا کسی کو کوئی قوت حاصل نہیں، اگر تم مال اور اولاد کے اعتبار سے مجھے اپنے سے کم دیکھتے ہو۔ ۳۹) تو امید ہے کہ میرا رب مجھے تمہارے باغ سے بہتر باغ عطا کردے اور تمہارے باغ پر بھیج دے کوئی آسمانی آفت کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے۔ ۴۰) یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تم اسے کسی طرح تلاش نہ کر سکو۔ ۴۱)

ایمان کا تقاضا

مردِ مومن نے مزید کہا کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ کو مانتے ہو تو تمہیں اپنے باغ میں داخل ہوتے ہوئے شیخی بگھارنے اور اپنی امارت پر اترانے کی بجائے یہ کہنا چاہئے تھا کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ محض اللہ کی عطا ہے۔ انسان اگرچہ حصولِ رزق کیلئے محنت کرتا اور دوڑ بھاگ کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ میں جن قوتوں سے کام لے رہا ہوں یہ کس نے پیدا کی ہیں اور میری محنتوں کو پھل کرنا کس کے ہاتھ میں ہے؟ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ذات نہیں جو دینے پر بھی قادر ہے اور چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ اگر تمہارے ذہن میں اپنے پروردگار کا صحیح تعارف ہوتا تو تم کبھی ایسی لغو بات نہ کہتے کہ میرا گمان یہ ہے کہ اس باغ پر کبھی ہلاکت اور تباہی نہیں آئے گی کیونکہ وجود و عدم کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح وہ چھین لینے اور کسی چیز کو تباہ و برباد کر دینے کی بھی طاقت رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ میں مال اور اولاد میں تم سے کم ہوں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں، دولت آنی جانی چیز ہے۔ آج وہ ایک کے پاس ہے کل دوسرے کے پاس ہوتی ہے۔ اسی طرح اولاد بھی ایک آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد نہ دے کر مجھے اس آزمائش سے محفوظ رکھا بلکہ میری آزمائش یہ ہے کہ میں مال اور اولاد کی کمی پر شکوہ سنج ہوتا ہوں یا صبر کرتا ہوں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سب کچھ اسی کے ہاتھوں میں ہے اور وہی ہر طرح کی قوت کا مالک ہے۔ آج اگر اس نے تمہیں باغ عطا فرمایا ہے اور مجھے اس سے محروم رکھا ہے تو میں بجائے شکوہ کرنے کے اسی سے امید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے تیرے باغ سے بہتر باغ عطا فرمائے گا لیکن میں جس طرح اس کے نہ دینے پر شکوہ کناں نہیں ہوں اسی طرح اس کے عطا کرنے پر متکبر اور مغرور نہیں ہوں گا۔ البتہ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ تمہارا یہ تکبر اور غرور اور تمہاری یہ سرکشی کہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سبب نہ بن جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بلائے آسمانی تمہارے اس باغ کو تباہ کردے۔ ایسی ژالہ باری ہو کہ کوئی چیز باقی نہ بچے یا ایسی ہوا چلے جو ہر چیز کو جلا کے رکھ دے اور تمہارا باغ چٹیل میدان ہو کے رہ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے باغ کو جو نہر سیراب کرتی ہے اس کا پانی خشک ہو جائے اور یا وہ اس قدر نیچے اتر جائے کہ تم ہزار کوشش سے بھی اس کا سراغ نہ پا سکو۔

حُسْبَان ...... حُسْبَانَةٌ کی جمع ہے، کڑک اور اولے کو کہتے ہیں اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بلائے آسمانی یا بلائے ناگہانی پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

زَلَقًا ...... اس زمین کو کہتے ہیں جو بالکل چٹیل اور سبزہ روئیدگی سے محروم ہو۔ غَوْرًا ...... زمین میں پانی کے اتر جانے کو کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ خشک ہو جانا بھی کیا گیا ہے، لیکن دونوں میں فرق کوئی نہیں، کیونکہ جب کسی نہر کا پانی زمین کے نیچے اتر جائے تو نہر یقیناً خشک ہو جاتی ہے۔

آیت 39 میں مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کا جملہ آیا ہے، اس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر

Marfat.com

کوئی چیز انسان کو اچھی لگے اور نظریں اس پر جم کے رہ جائیں تو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے اور اسے نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس لئے دیکھنے والا اگر یہ جملہ اپنی زبان سے کہہ دے تو اس کی پسندیدہ چیز نظر کے نقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ عام طور پر بچوں کو زیادہ نظر لگتی ہے کیونکہ زیادہ پیارے لگتے ہیں اور نظر بھی عموماً چاہنے والوں بالخصوص ماں باپ کی لگتی ہے، اس لئے ماں باپ اور دوسرے چاہنے والوں کو یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ جب بھی وہ بچے کو پیار سے دیکھیں تو اس جملے کی تلاوت کرلیں۔ ان شاءاللہ وہ بچہ نظر بد سے محفوظ رہے گا۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّىْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

(اور سمیٹ لیا گیا اس کا سارا پھل، پھر صبح کو وہ رہ گیا ہاتھ ملتا ہوا اس مال پر جو اس نے اس باغ پر خرچ کیا تھا اور وہ باغ اپنی چھتریوں پر گرا پڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا، اے کاش! میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔ ۴۲)

آخر وہی ہوا جس سے مردِ مومن نے ڈرایا تھا

معلوم ہوتا ہے کہ مردِ مومن کی نصیحت کا اس مغرور شخص پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ اپنے معمول کے مطابق شرک اور نافرمانی کی روش پر چلتا رہا، جس کے نتیجے میں روز بروز اس کے تکبر اور غرور میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آخر کار اس کی مہلتِ عمل ختم ہوگئی اور کسی آفتِ ارضی یا سماوی نے اس کے باغ کو آ گھیرا اور آناً فاناً تمام باغ تباہ کر کے رکھ دیا۔ جن چھتریوں اور چھپروں پر انگور کی بیلیں چڑھائی گئی تھیں وہ فرشِ زمین ہوگئیں۔ جس باغ کی کمائی پر وہ اس حد تک مغرور تھا کہ اس غرور نے اس کے دماغی توازن کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اب جبکہ اس نے دیکھا کہ پورا باغ ایک لاش کی طرح اس کی قدموں میں پڑا ہے اور وہ اس کے بارے میں یہ گمان رکھتا تھا کہ اس باغ پر کبھی زوال نہیں آئے گا اور کبھی خزاں طاری نہیں ہو گی۔ اب سوائے کفِ افسوس ملنے کے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جس باغ کو میں دولت کا ذریعہ سمجھ رہا تھا وہ تو میرے وہ اخراجات بھی لے کر بیٹھ گیا جو آج تک اس کے بنانے سنوارنے پر میں نے صرف کئے تھے۔ اب اسے اس مردِ مومن کی نصیحت یاد آئی کہ ساری طاقتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، تم غلط پندار میں مبتلا ہو گئے ہو۔ وہ جس طرح کسی کو نوازتا ہے اسی طرح تہی دامن بھی کرسکتا ہے۔ اس کی قدرت کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔ کائنات کی بڑی بڑی قوتیں اس کے سامنے پرِکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔ تم نے جو اپنی ذات اور اپنی قوتوں کو اس کے مقابل لا کھڑا کیا ہے یہ تمہاری وہ بھول ہے جس پر تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ اب جبکہ اس کی دماغی کاوشوں اور جسمانی محنتوں کا حاصل اس کے قدموں میں پڑا تھا تو تب اسے خیال آیا کہ اس مردِ مومن نے مجھ سے ٹھیک کہا تھا۔ کاش میں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کیا ہوتا۔ میں اسی کی ذات اور اس کے فیصلوں پر یقین رکھتا تو آج یہ بات میرے لئے تسلی کا باعث ہوتی کہ اگر اس نے مجھ سے یہ باغ چھین لیا ہے تو یقیناً اس میں میرے لئے آزمائش ہوگی، وہ ان شاءاللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ بھی ایسا ہی باغ عطا کرے گا۔

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

(اور اس کے پاس نہ کوئی جتھا تھا جو خدا کے مقابلے میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود ہی انتقام لینے والا بن سکا۔ ۴۳)

یعنی جب اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو جس طرح اس کی اپنی صلاحیتیں کسی کام نہ آئیں اور اس کے غرور اور گھمنڈ نے اس کا ساتھ نہ

Marfat.com

دیا، اسی طرح وہ اپنی جس افرادی قوت اور گروہی طاقت پر ناز کرتا تھا اور مردِ مومن سے یہ کہتا تھا کہ میں تم سے مال میں بھی بڑھ کر ہوں اور افراد کی تعداد کے اعتبار سے بھی زیادہ طاقتور ہوں، وہ اس کی افرادی قوت اور اس کی پارٹی اس کے کسی کام نہ آئی اور وہ سب مل کر بھی اس کو تباہی سے نہ بچاسکے۔ اور اس کے سارے غرور اور تکبر کے باوجود اس کے اندر بھی ایسا کس بل نہ تھا کہ وہ اپنے اللہ تعالیٰ سے انتقام لینے کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

(تب اسے معلوم ہوا کہ سارا اختیار خدائے برحق ہی کا ہے اور وہ بہترین اجر اور بہترین انجام والا ہے۔ ۴۴)

وَلَايَةُ ...... واؤ پر زبر کے ساتھ دوستی اور مدد کرنے کا معنی دیتا ہے۔ اور واؤ کے نیچے زیر کے ساتھ اس کا معنی ہے غلبہ۔ عَقْبُ اور عَاقِبَةٌ عموماً دونوں ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ اس کا معنی ہے انجام۔

بعد از خرابیِ بسیار حقیقت کا ادراک

جب اس مغرور شخص پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور دولت کے جس ذریعے پر وہ مغرور تھا جب اس کے سامنے تباہ و برباد ہوگیا اور وہ اس کے بچاؤ کیلئے کچھ نہ کرسکا تب اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ قطعی اختیار اور قوت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، باقی سب سہارے ہمارا وہم ہیں۔ جن قوتوں پر انسان تکیہ کرتا ہے اور یا اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر بعض دفعہ غلط اقدام کر گزرتا ہے خود اس کا انجام بتادیتا ہے کہ یہ اقدام کرنے والا اپنی ذات میں کس قدر کمزور ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہر طرح کے شخص کی حفاظت بھی کرتا ہے اور معاونت بھی، لیکن مہلتِ عمل بے پایاں نہیں رکھی گئی اس کی ایک انتہا ہے۔ جب کسی کی نافرمانیاں اور اس کا تمرد اس حد سے گزرنے لگتا ہے تو پھر عموماً گرفت شروع ہوجاتی ہے۔ کبھی تنبیہ کیلئے معمولی گرفت کی جاتی ہے اور کبھی سزا کیلئے گرفت آتی ہے تو تباہی وہلاکت انجام بن جاتی ہے، لیکن بہترین اجر اور بہترین انجام وہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، اس کے راستے پر چلنے والے یہاں بھی اس کے مستحق ہوتے ہیں اور آئندہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ہوں گے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ
اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا
تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ
زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا
وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ
حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ

Marfat.com

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ
لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا
فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا
كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ
اَحَدًا ﴿۴۹﴾

رکوع: ۶۔ (اور بیان کیجئے ان کے سامنے حیاتِ دنیا کی تمثیل جس طرح پانی کہ ہم نے اسے آسمان سے نازل کیا کہ گنجان ہو جاتی ہے اس سے زمین کی پود پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک بوسیدہ گھاس ہو جاتی ہے جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۵) مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ، باعتبارِ ثواب اور باعتبارِ امید تمہارے رب کے نزدیک بہتر ہیں۔ ۴۶) اس دن کا خیال کرو جس دن ہم پہاڑوں کو چلا دیں گے اور تو زمین کو دیکھے گا بالکل عریاں اور ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔ ۴۷) اور وہ سب تیرے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے صف بستہ، ہم ان سے کہیں گے کہ تم ہمارے پاس آئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا بلکہ تم نے گمان کیا تھا کہ ہرگز تمہارے لئے ہم کوئی یوم موعود مقرر نہیں کریں گے۔ ۴۸) اور رجسٹر رکھا جائے گا تو آپؐ مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ خوف زدہ ہیں اس سے جو کچھ اس کے اندر ہے اور وہ کہیں گے ہائے ہماری شامت، یہ رجسٹر عجیب ہے کہ نہ چھوٹا گناہ چھوڑتا ہے اور نہ بڑا، ہر ایک کو شمار کرتا ہے اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا تھا وہ سب اس رجسٹر میں موجود پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ ۴۹)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ
فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

(اور بیان کیجئے ان کے سامنے حیاتِ دنیا کی تمثیل جس طرح پانی کہ ہم نے اسے آسمان سے نازل کیا کہ گنجان ہو جاتی ہے اس سے زمین کی پود پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک بوسیدہ گھاس ہو جاتی ہے جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۵)

Marfat.com

حیاتِ دنیا کی تمثیل

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اشراف قریش اور دیگر قبیلوں کے سردار آنحضرت ﷺ سے تقاضا کرتے تھے کہ آپ کے اردگرد جو انتہائی نادار اور مفلس لوگ جمع رہتے ہیں جن کے پسینے کی بدبو پاس بیٹھنے والوں کو بیزار کر دیتی ہے، ہم ایسے غریب لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی دعوت پر غور کریں تو آپ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹائیے یا ہمارے لئے الگ نشست کا اہتمام کیجئے، کیونکہ ایسے گرے پڑے لوگ اس قابل نہیں کہ ایک نشست میں ہمارے برابر بیٹھیں۔ اس آیتِ کریمہ میں انہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ تم دنیوی زیب و زینت کی جس فراوانی کے باعث غریب لوگوں سے نفرت کرتے ہو، تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ یہ زیب و زینت ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ اور جن چیزوں پر تم اتراتے ہو ان کی حیثیت فریبِ نظر کے سوا کچھ بھی نہیں اور جن لوگوں کو تم حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو وہ اگرچہ ان چیزوں سے تہی دامن ہیں لیکن ان کے پاس سیرت و کردار کی وہ رعنائیاں ہیں جن سے تم محروم ہو۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کام آنے والی دولت وہ سیرت و کردار کی خوبیاں اور باقیات الصالحات ہیں۔ اور وہ اعمالِ حسنہ ہیں جو انسانیت کا زیور ہیں وہی انسان کے ساتھ باقی رہنے والا سامان ہے جو آخرت میں ہر اس شخص کے کام آئے گا جو اس سامان سے گراں بار ہوگا۔ قرآنِ کریم نے انہیں چیزوں کو حیاتِ دنیا قرار دیا ہے جن پر اہلِ دنیا فخر کرتے ہیں اور ان کی وضاحت بھی فرمائی۔ سورۂ حدید آیت نمبر 20 میں فرمایا گیا:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا "یاد رکھو کہ دنیا کی زندگی یعنی کھیل، کود، آرائش و زیبائش، باہمی تفاخر اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے مسابقت کی تمثیل اس طرح ہے کہ بارش ہو جس کی اپجائی ہوئی نباتات کافروں کے دلوں کو موہ لیں پھر وہ خشک ہو جائے اور تم دیکھو کہ وہ زرد پڑ گئی ہے۔"

ایک دنیا دار آدمی جن چیزوں پر فریفتہ ہوتا ہے ان میں سب سے پہلی چیز لہو و لعب ہے، کیونکہ دنیا دار زندگی کو سنجیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا، اس کے نزدیک یہ دنیا ایک کھیل تماشا ہے اور ہم یہاں کھیلنے کیلئے آئے ہیں۔ وہ ہر چیز میں دلچسپی کا سامان ڈھونڈتا ہے۔ اگر اس کی یہ دلچسپی کھانے پینے میں ہے تو مطعومات و مشروبات میں تنوع پیدا کرنا اور اس سے محظوظ ہونا اپنی زندگی کا مقصد بنالیتا ہے۔ اس کا کھانا پینا اس لئے نہیں کہ یہ زندگی کی ضرورت ہے بلکہ وہ زندہ اس لئے رہتا ہے تاکہ وہ بہتر سے بہتر غذا حاصل کر سکے۔ اور اگر اس کی دلچسپی سفلی جذبات کے تحت جنسی ضرورت بن جاتی ہے تو پھر وہ اسے زندگی کا مقصد بنا کر اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس میں اور کتے بلیوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ بہتر سے بہتر اور طاقتور سے طاقتور غذا کے بغیر زندگی بے کیف ہے اور نئے سے نئے جنسی تعلق کے بغیر زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص لطف و لذت سے ہٹ کر کسی سنجیدہ کام میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اس کے نزدیک حقوق و فرائض ایک بے معنی بات ہے۔ انسانی اقدار محض ایک مفروضہ ہیں۔ اخلاقی قدریں زندگی کو ویران کر دینے کا نام ہیں۔ آدمی کو زندگی ایک دفعہ ملتی ہے، اسے اس طرح گزارنا چاہئے جس سے زیادہ سے زیادہ خواہشِ نفس کی تکمیل ہو سکے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لطف و لذت کا حصول دولت و طاقت کے سوا ممکن نہیں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنا اور پھر اسے اپنی خواہشات کی تکمیل میں خرچ کرنا زندگی کی ضرورت بن جاتا ہے اور طاقت کے حصول کیلئے قبائلی زندگی میں اولاد کی کثرت سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اس لئے اس دور کا ہر بڑا آدمی نرینہ اولاد کی کثرت پر فخر کرتا

Marfat.com

تھا کیونکہ وہ اس کیلئے طاقت کا ذریعہ تھی۔ دوسرے لوگوں پر جوان بیٹوں کی قوت سے رعب بٹھانے کا کام لیا جاتا تھا اور پھر اسی پر بس نہیں مال اور اولاد کی کثرت پر دوسروں سے مقابلے ہوتے تھے اور شراب کے نشے میں دھت ہو کر ہر شرابی اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتا تھا کہ اَنَا اَکْثَرُ مِنْکَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا اور آج کے دور میں یہی چیزیں اور یہی خواہشیں نئی شکل اختیار کر گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوس نے نئے رنگ اختیار کیئے ہیں لیکن ہوس کی فراوانی وہی ہے۔ اب لہو ولعب نے ایسے کھیلوں کی شکل اختیار کی ہے جو کئی کئی روز تک ختم ہونے میں نہیں آتیں اور عیش و تنعم نے وہ لبادے اوڑھے ہیں کہ کسی سنجیدہ تحریر میں جن کا ذکر بھی باعثِ شرم ہے۔ اور تفریح نے سینما اور تھیٹر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب تو ذرائع ابلاغ تفریح کے نام پر سفلی جذبات کے ابھارنے کا وہ کاروبار کر رہے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ اور مال و دولت نے پرانے وقتوں کی سادگی کو لپیٹ کر کار کوٹھی، مال و جائیداد، بینک بیلنس، عہدے اور مناصب اور نہ جانے کن کن ناموں سے اپنے آپ کو متعارف کرایا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو ایک دنیادار کے اہداف ہیں، یہی وہ سرمایہ ہے جو اس کیلئے باعثِ افتخار ہے اور زندگی کا یہی وہ رنگ ہے جس پر وہ فریفتہ ہے۔ قرآنِ کریم ان کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو واضح کرنے کیلئے مثال دیتا ہے کہ جب بنجر اور خشک زمین پر بارش برستی ہے تو اس کے نتیجہ میں زمین کی قوتِ روئیدگی کو بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین جہاں دھول اڑتی تھی مخملی لباس میں ملبوس ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے بارشیں ہوتی ہیں ویسے ویسے سبزہ گھنا ہوتا چلا جاتا ہے، فصلیں لہلہانے لگتی ہیں، لیکن پھر عرصہ کے بعد وہی خوش رنگ لہلہاتی ہوئی گھاس مرجھانے لگتی ہے اور بالآخر بوسیدہ ہو کر بھس بن کر رہ جاتی ہے اور ہوائیں اسے اڑا کر ادھر ادھر بکھیر دیتی ہیں۔ یہی حال انسانی زندگی کا بھی ہے کہ انسان جن چیزوں پر فریفتہ ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ان پر کبھی خزاں نہیں آئے گی وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر چیز زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ نہ زندگی کا کوئی بھروسہ ہے اور نہ زندگی کی رعنائی کا۔ سانس کی آمد و رفت زندگی کی ضامن ہے اور اس کا رک جانا زندگی کا خاتمہ ہے اور بعض دفعہ اس کے رکنے پر اتنا وقت بھی صرف نہیں ہوتا جتنا حباب کے ٹوٹنے پر۔ لہو ولعب کے مزے جوانی اور صحت کے زمانے کی چیزیں ہیں اور صحت بیماری میں فاصلہ ہی کتنا ہے؟ اسی طرح مال و دولت اور بچوں کی کثرت کس حد تک بھروسے کے لائق ہے۔ لہو ولعب پر فریفتہ شخص تو شاید اس کا اندازہ نہ کر سکے لیکن جسے اللہ تعالیٰ نے عقلِ سلیم سے نوازا ہے وہ اس کی حقیقت کو خوب سمجھتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

دنیا کی ہر چیز ناپائیدار اور بے ثبات ہے، زندگی جس کیلئے ہر چیز وجود میں آتی ہے اور جس سے ہر چیز جنم لیتی ہے خود اس کی بے ثباتی اور ناپائیداری اظہر من الشمس ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حقیقت صرف ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمیشہ رہنے والا اور وہی حقیقت میں قدرت والا ہے۔

دھن دولت آنی جانی ہے، یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم، عالم فانی ہے، باقی ہے ذاتِ خدا بابا

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

Marfat.com

(مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ، باعتبارِ ثواب اور باعتبارِ امید تمہارے رب کے نزدیک بہتر ہیں۔ ۴۶)

مال واولاد اور اعمالِ صالحہ کا تقابل

عرب میں جیسے پہلے عرض کر چکا ہوں چونکہ قبائلی زندگی تھی اس لئے ان کی تمام تر قوت کا دارومدار مال کی کثرت اور اولاد کی کثرت پر تھا۔ قحط کے زمانے میں قبیلے کا سردار اپنے جانوروں کے ریوڑ اپنے قبیلے کے لوگوں کیلئے ذبح کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا اور اس طرح سے ان کی بھوک کا علاج کرتا اور اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیتا۔ اور دوسروں پر اپنا رعب اور دبدبہ جمانے کیلئے اولاد میں کثرت کا خواہش مند ہوتا کیونکہ قبائل کی زندگی میں طاقت کی زبان ہی اصل زبان ہوتی ہے اور طاقت جس طرح دولت سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح قبائلی زندگی میں بیٹوں کی کثرت بھی اس کا اہم سبب تھا۔ اس لئے وہ لوگ مال اور اولاد کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور ان پر فخر بھی کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے دونوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تمہاری دنیوی زندگی کی زینت ہیں لیکن تم جانتے ہو کہ نہ تمہاری زندگی کو دوام حاصل ہے اور نہ ان چیزوں کو۔ دوام اگر میسر ہے تو ان پاکیزہ اعمال کو ہے جن کی یاد ہمیشہ باقی رہتی ہے اور جن کے اثرات سے انسانیت توانا ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اگرچہ بعض مواقع پر تسبیح وتہلیل اور بعض اذکار کو باقیات الصالحات قرار دیا اور کبھی بعض اعمال کو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ عمل جو شریعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کیا جائے وہ باقیات الصالحات میں شامل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کبھی اسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔ ہمدردی وغمخواری، رحم دلی ومروت، جود وسخاوت، قربانی وایثار اور اطاعت وعبادت یہ تمام اعمال حُسنِ نیت کے ساتھ باقیات الصالحات میں شامل ہیں اور اپنے اصل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے یہاں تو یقیناً ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، دنیا میں بھی اس کے اثرات تادیر قائم رہتے ہیں۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے یہاں بہترین اجر چاہتے ہو تو وہ بھی تمہیں اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں ملے گا اور اگر تم انسانیت کیلئے بہترین امید کے خواہاں ہو یا اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے اچھے انجام کی امید رکھنا چاہتے ہو تو اس کی ضمانت بھی ایمان کے بعد اعمالِ صالحہ کے سوا کسی اور چیز سے نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے اہلِ دنیا کو اگر انسانیت کی بھلائی مقصود ہے تو وہ ان چیزوں میں نہیں جو حیاتِ دنیا کی زینت ہیں بلکہ ان اعمال میں ہے جو حیاتِ دنیا کی بقاء کا ذریعہ اور اس کی پائیداری کا سبب ہیں۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰـهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ؕ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

(اس دن کا خیال کرو جس دن ہم پہاڑوں کو چلا دیں گے اور تو زمین کو دیکھے گا بالکل عریاں اور ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔ ۴۷) اور وہ سب تیرے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے صف بستہ، ہم ان سے کہیں گے کہ تم ہمارے پاس آئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا بلکہ تم نے گمان کیا تھا کہ ہرگز تمہارے لئے ہم کوئی یومِ موعود مقرر نہیں کریں گے۔ ۴۸)

Marfat.com

آنے والے دن کی فکر کرو

دنیا کی ہر چیز جب موت کا شکار ہو جاتی ہے تو پھر دوبارہ اسے زندگی نہیں ملتی، لیکن جن وانس کا معاملہ اس سے مختلف ہے، انہیں صرف اس بات کو یاد نہیں رکھنا چاہئے کہ ایک نہ ایک دن انہیں موت آنے والی ہے بلکہ ان کی اصل یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ موت کے بعد ایک مدت تک وہ عالمِ برزخ میں رہیں گے۔ وہ بظاہر فنا ہو جائیں گے لیکن حقیقت میں جب قیامت برپا ہوگی تو انہیں زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ انہیں درحقیقت اس دن کو یاد رکھنا چاہئے، کیونکہ یہی وہ دن ہے جس دن ہر شخص اپنے اعمال کا حساب دے گا۔ اس لئے کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ تم دنیا کی زیب وزینت پر مرتے ہو اور تمہارا جینا مرنا اسی دنیا کے حوالے سے ہے۔ اسی کی خوشیاں تمہاری خوشیاں ہیں اور اسی کے غم تمہارے لئے اصل غم ہیں۔ لیکن تمہیں کبھی بھی اس بات کا خیال نہیں آتا کہ ہمیں اس دن کی فکر کرنی چاہئے جس دن کی ہولنا کی کا عالم یہ ہوگا کہ اس دن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پہاڑ چلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ قرآن میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ''تم پہاڑوں کو دیکھتے اور گمان کرتے ہو انہیں زمین پر جما ہوا اور وہ (قیامت کے دن) اس طرح چلیں گے جیسے بادل چلتے ہیں۔'' اور سورۃ القارعہ میں کہا گیا کہ قیامت کے دن پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ ہر چیز تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس کے بعد قیامت کے دوسرے مرحلے میں نئی زمین وجود میں آئے گی، نئی کائنات ہوگی۔ ایک بہت بڑے میدان میں سب انسانوں کو جمع کیا جائے گا اور اس میدان میں اللہ تعالیٰ اس طرح سب کو جمع کرے گا کہ کسی کو پیچھے رہ جانے کی مجال نہیں ہوگی۔ اور اس روز زمین بالکل برہنہ ہو جائے گی یعنی آج جبکہ زمین پر پہاڑ گڑے ہوئے ہیں، سربفلک محلات کھڑے ہیں، نہایت مضبوط قلعے ایستادہ ہیں، باغوں اور چمنوں سے آراستہ ہے لیکن قیامت کے دن ہر چیز اکھاڑ پھینکی جائے گی اور زمین صفاچٹ میدان بن جائے گی جس میں لوگوں کو قطار در قطار صف بستہ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ جس طرح تم دنیا میں خالی ہاتھ گئے تھے، اسی طرح آج ہمارے پاس خالی ہاتھ آگئے ہو۔ جس دولت اور جن اشیاء پر تمہیں ناز تھا ان میں سے کچھ بھی تمہارے پاس نہیں۔ آج نہ تمہارے ساتھ خدم و حشم ہیں اور نہ وہ مال و اسباب جن پر تم اتراتے تھے۔ اب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے ہو جبکہ دنیا میں اپنے پٹھوں پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے تھے۔ تمہارا گمان تو یہ تھا کہ ہمیں دنیا میں اللہ تعالیٰ نے خودرو پودوں کی طرح اٹھایا ہے جن کا کوئی مقصدِ زندگی نہیں۔ جن کیلئے کوئی قیامت برپا نہیں ہوگی جہاں انہیں حساب کتاب کیلئے بلایا جائے لیکن آج تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے جو کچھ فرمایا تھا وہ سب صحیح اور حق تھا۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾

(اور رجسٹر رکھا جائے گا تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ خوف زدہ ہیں اس سے جو کچھ اس کے اندر ہے اور وہ کہیں گے ہائے ہماری شامت، یہ رجسٹر عجیب ہے کہ نہ چھوٹا گناہ چھوڑتا ہے اور نہ بڑا، ہر ایک کو شمار کرتا ہے اور جو کچھ انہوں نے دنیا

Marfat.com

میں کیا تھا وہ سب اس رجسٹر میں موجود پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ (۴۹)

دفتر اعمال کی کیفیت

جب لوگ میدانِ حشر میں صف بستہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے فیصلے کے انتظار میں کھڑے ہوں گے تو ان کے سامنے ایک رجسٹر لایا جائے گا جس میں ساری دنیا کے اعمال لکھے گئے ہوں گے۔ اس کی شکل کیا ہوگی، وہ کتنا بڑا ہوگا یہ سب عالمِ غیب کی باتیں ہیں اور متشابہات میں سے ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن اس کی تفصیل سے ہم واقف نہیں، لیکن اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ اس رجسٹر یا دفترِ عمل کی ساخت ایسی ہوگی کہ دیکھنے والے فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ ہمارا زندگی بھر کا روزنامچہ ہے جس میں ہمارے ہر عمل کی تفصیل درج ہے، پھر جب ہر ایک کا نامۂ عمل اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ اسے دیکھتے ہی چیخ اٹھے گا کہ ہائے میری بدنصیبی کہ یہ کیسا نامۂ عمل ہے جس میں میرا کوئی عمل درج کرنے سے نہیں چھوڑا گیا۔ انتہائی تنہائی اور تاریکی میں کئے ہوئے اعمال بھی اس میں پوری تفصیل سے مندرج ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر ایک کے اعمال کی تفصیل گواہوں سمیت اس لئے ہر شخص کے سامنے پیش کی جائے گی تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ میرے ساتھ کچھ زیادتی ہوئی ہے۔ نہ کسی کی نیکیوں میں کمی کی جائے گی نہ کسی کی برائیوں میں اضافہ ہوگا۔ جس شخص کے ساتھ جو سلوک بھی ہوگا وہ خود کہے گا کہ یہ عین انصاف کا تقاضا تھا۔ کیونکہ تمہارا رب اپنے بندوں پر ظالم نہیں منصف ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ رحیم و کریم بھی ہے۔

جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ
كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ
خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ
الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ
فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ
النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

Marfat.com

رکوع: ۷۔ (اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جن قوم میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، (اے اولادِ آدم) کیا تم بناتے ہو اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا اپنا کارساز حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں، ظالموں کیلئے بہت برا بدلہ ہے۔ ۵۰) میں نے نہیں بلایا تھا آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے وقت اور نہ خود انہیں کو پیدا کرتے وقت بلایا تھا، اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنایا نہیں کرتا۔ ۵۱) اور یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ کفار کو فرمائے گا کہ بلاؤ میرے ان شریکوں کو جن کو تم نے میرا شریک گمان کر رکھا تھا، تو وہ ان کو بلائیں گے لیکن وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک آڑ حائل کر دیں گے۔ ۵۲) اور مجرم جہنم کی آگ کو دیکھیں گے تو وہ گمان کریں گے کہ وہ اسی میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے کوئی مفر نہیں پائیں گے۔ ۵۳)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّیَّتَهٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَهُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۝۵۰

(اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جن قوم میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، (اے اولادِ آدم) کیا تم بناتے ہو اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا اپنا کارساز حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں، ظالموں کیلئے بہت برا بدلہ ہے۔ ۵۰)

قصہ آدم و ابلیس کو یہاں لانے کا سبب

اس سے پہلے مختلف مقامات بالخصوص سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف میں قصۂ آدم و ابلیس کی تفصیل گزر چکی ہے اور ہم اس پر مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ سیاقِ کلام کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہاں اس واقعہ کو اس لئے لایا جارہا ہے تاکہ قریش کو اس بات پر متنبہ کیا جائے کہ تم اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی دعوت کو رد کر کے اور اس پر ایمان لانے سے انکار کر کے دراصل اس راستے پر چل رہے ہو جو ابلیس کا راستہ ہے۔ اس نے اس وقت جب حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے زمین کی مخلوقات پر ان کی برتری ظاہر کرنے اور ان کی خلافت تسلیم کرانے کیلئے فرشتوں اور بالتبع زمینی مخلوقات کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو سب نے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی اور زمین پر اس کے نمائندوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کی ابتدا ابلیس نے کی۔ اور پھر اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مہلتِ عمل کی درخواست کرتے ہوئے صاف صاف کہا کہ میں چونکہ آدم کی وجہ سے ایک بڑی آزمائش میں ڈالا گیا ہوں اس لئے میں اولادِ آدم سے جہاں تک بس چلے گا انتقام لوں گا۔ میں زندگی کے ہر میدان میں انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ وہ اپنے اس چیلنج کو اُس وقت سے لے کر آج تک پوری قوت سے نبھاتا چلا آرہا ہے، تو قریش سے کہا جارہا ہے کہ تم درحقیقت ایسے بدنصیب ہو کہ اولادِ آدم ہوتے ہوئے اپنے جدِ امجد کا راستہ چھوڑ کر تم ان کے اور اپنے کھلے دشمن کی پیروی کر رہے ہو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ تمہیں اس کا احساس بھی نہیں کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے اور اس کے رسولؐ کی رہنمائی کو قبول کرنے کی بجائے شیطانی

Marfat.com

قوتوں کی رہنمائی کو قبول کرتے ہو، عقائد اور زندگی کے دوسرے معاملات میں وہ جس طرح تمہیں رہنمائی دیتا ہے تم وہی عقیدہ اپناتے ہو اور وہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ابلیس اور اس کی ذرّیت کو اپنا کارساز بنالیا ہے، حالانکہ ہر پیغمبر اور ہر مذہب نے اپنے اپنے دور میں لوگوں کو بتایا کہ ابلیس اور اس کی ذرّیت تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ غور کرو تم نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جو تمہارا حقیقی کارساز ہے ابلیس کو اپنا کارساز بنا کر کس قدر بُرا بدل تلاش کیا ہے۔

بدل کا دوسرا مفہوم

آیت کے آخری جملے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہر طرح سزاوار ہے کہ اسے اپنا کارساز، اپنا دوست اور اپنا آقا و مالک سمجھا جائے، کیونکہ جس طرح اس نے انسان کو تخلیق کیا ہے، اسی طرح اس کی تربیت کے بھی جملہ انتظامات کئے ہیں۔ زندگی کے ہر دور میں اس کی ضروریات مہیا کی ہیں اور اس کو رہنمائی دی ہے۔ جب وہ بالکل بے بس بچہ تھا تو اسے ماں باپ کی نعمت عطا کی گئی۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اسے حواس عطا کئے گئے، جب اس کی عمر اور آگے بڑھی تو اسے جوہرِ عقل سے نوازا گیا اور جب بلوغ کے بعد اسے اپنا راستہ خود طے کرنے اور زندگی کے فیصلے کرنے کا موقع آیا تو وحیِ الٰہی سے اسے رہنمائی دی گئی۔ اس طرح زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں جب وہ اللہ تعالیٰ کی کارسازی سے بیگانہ رہا ہو۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہیں کہ وہی حقیقت میں تمام مخلوقات کا کارساز ہے، لیکن جب انسان اس کی بجائے دوسرے کو اپنا ولی اور اپنا کارساز بناتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ یعنی اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ظلم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کی کارسازی میں کوئی اور شریک نہیں اور یہ دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ اس کی ذات اور اس کی صفات میں کوئی اس کا ہمسر نہیں اور یہ اس کے مقابلے میں دوسرے سہارے تلاش کرتا ہے۔ وہی ایک ذات ہے جو ہر طرح کے حالات میں رہنمائی دینے کے قابل ہے کیونکہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے مخفی نہیں۔ وہ حُسن و قبح کی حقیقت سے واقف ہے۔ اس کی نگاہ ہر فاصلے کو ناپتی اور ہر تاریکی میں دیکھتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم اس کے یہاں کوئی تقسیم نہیں۔ ہر چیز اس کے سامنے عیاں ہے۔ ایسی ذات کو رہنما بنانے کی بجائے کسی اور کو رہنما بنانا ایک ایسا غلط فیصلہ ہے جسے ظلم کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ ایسے ظالموں کے بارے میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن انہیں اپنے کرتوتوں کا بہت بُرا بدلہ ملے گا، یعنی ایسی سزا ان لوگوں کو دی جائے گی کہ آج اس کا تصور بھی کپکپا دینے کیلئے کافی ہے۔

ابلیس جنات میں سے تھا

اس آیتِ کریمہ میں ایک نئی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ابلیس فرشتہ نہیں، جن تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن کے نام سے جو الگ مخلوق پیدا کی ہے اور جسے نار سے بنایا گیا ہے، یہ اس کا ایک فرد تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ چونکہ جنوں کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے اور اس کی فطرت میں تمرد اور سرکشی ہے اس لئے اس نے اپنی فطرت کے مطابق جب یہ دیکھا کہ میں ایک ایسے عنصر سے پیدا ہوا ہوں جس کی فطرت رفعت ہے اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں جس کی فطرت پستی ہے، تو رفعت پستی کے سامنے کیسے جھک سکتی ہے، اس سوچ نے اس میں تمرد اور سرکشی پیدا کی۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ یہاں درحقیقت ایک غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے۔ لوگوں میں یہ بات نہ جانے کیسے مشہور ہوگئی ہے کہ ابلیس معلم الملکوت تھا، اور وہ فرشتہ تھا۔ جب تمام فرشتوں نے حضرت آدم

Marfat.com

علیہ السلام کو سجدہ کیا تو اس کے سجدہ نہ کرنے کا آخر سبب کیا تھا۔ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ فرشتہ نہیں، جن تھا۔ فرشتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ یعنی ان کی فطرت اور سرشت اس طرح کی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ''وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، انہیں جیسا حکم دیا جاتا ہے، وہ ویسا ہی کرتے ہیں''۔ لیکن ابلیس چونکہ جن تھا اور جنوں میں انسانوں کی طرح جس طرح اطاعت کا مادہ رکھا گیا ہے اسی طرح انکار اور نافرمانی کی سرشت بھی رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اسی آزادی سے کام لے کر حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ یہ انکار چونکہ اس کی اپنی مرضی اور اختیار کا نتیجہ تھا، اس لئے اسے اس کی سزا بھی دی گئی اور مزید قیامت کے دن دی جائے گی۔

ابلیس کی اولاد بھی ہے

اس سے ایک اور بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابلیس کی بھی ذُرِّیت یعنی اولاد ہے، جس طرح انسانوں کے یہاں اولاد ہوتی ہے، اسی طرح جنوں کے یہاں بھی اولاد ہوتی ہے اور ابلیس بھی چونکہ جن ہے، اس لئے اس کی بھی اولاد ہونا کوئی مستبعد بات نہیں۔ امام قرطبی نے حمیدی کی کتاب الجمع بین الصحیحین سے ایک صحیح حدیث نقل کی ہے۔ حضرت سلمانِ فارسیؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ تم ان لوگوں میں سے نہ بنو جو سب سے پہلے بازار میں داخل ہوجاتے ہیں یا وہ لوگ جو سب سے آخر میں بازار سے نکلتے ہیں کیونکہ بازار ایسی جگہ ہے جہاں شیطان نے انڈے بچے دے رکھے ہیں۔

بعض اہلِ علم نے ذُرِّیت سے مراد مددگار اور پیروکار لئے ہیں اور یہ بات قطعی دلائل سے ثابت ہے کہ شیطان کے مددگار جو اس کی شیطنت کی نشرواشاعت میں اس کی مدد کرتے ہیں وہ جنوں میں سے بھی ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿٥١﴾

(میں نے نہیں بلایا تھا انہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے وقت اور نہ خود انہیں کو پیدا کرتے وقت بلایا تھا، اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنایا نہیں کرتا۔ ۵۱)

ایک دوسرے پہلو سے قریش کو عار دلائی جارہی ہے

اس آیت میں بھی روئے سخن قریش ہی کی طرف ہے، انہیں شرم دلاتے ہوئے یہ فرمایا جارہا ہے کہ جن قوتوں کو تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا کر اپنا معبود اور کارساز بنالیا ہے ذرا سوچو تو سہی ان کی اوقات کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو تخلیق فرمایا ہے تو کیا تمہارے ان معبودانِ باطل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد کیلئے بلایا تھا بلکہ ان کی بے بسی کا عالم تو یہ ہے کہ یہ خود مخلوق ہیں۔ انہیں خود نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کس طرح پیدا فرمایا۔ اپنے مخلوق ہونے کا انہیں علم ضرور ہے اور تخلیق کا وہ عمل جو ان کے اندر رائج ہے، اس کا علم بھی انہیں سماع سے ہے لیکن اس سے زیادہ وہ خود اپنی ابتدا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم نے ہر پہاڑ کے الگ الگ جن اور بھوت بنا

Marfat.com

رکھے ہیں اوران کے عتاب سے بچنے کیلئے ان کی جے پکارتے ہواوران کونذرانے اور چڑھاوے پیش کرتے ہواور بعض معبودانِ باطل کو راضی رکھنے کیلئے تم اپنی اولاد تک کی قربانی پیش کردیتے ہو، حالانکہ ان کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ وہ تخلیق کے عمل میں شریک تو کیا ہوتے، اس کی حقیقت سے بھی واقف نہیں۔ اور پھر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور سرکش ہیں اور اپنی مرضی سے جو چاہتے ہیں سو کرتے ہیں لیکن ذرا عقل سے سوچو کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات میں اپنے نافرمانوں اور سرکشوں کو مددگار بنائے گا۔ مختصر یہ کہ تمہاری ہر بات خلافِ عقل بھی ہے اور خلافِ واقعہ بھی۔ اس پر تمہیں شرم بھی آنی چاہئے اور ندامت بھی محسوس کرنی چاہئے۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِىَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾

(اور یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ کفار کو فرمائے گا کہ بلاؤ میرے ان شریکوں کو جن کو تم نے میرا شریک گمان کر رکھا تھا، تو وہ ان کو بلائیں گے لیکن وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک آڑ حائل کردیں گے۔ ۵۲)

قیامت کی منظر کشی

مشرکین کو شرم دلانے کیلئے ان کے سامنے قیامت کے دن کی منظر کشی کی جارہی ہے کہ تم جن قوتوں کو یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے کام آسکتی ہیں، وہ دنیا میں بھی تمہارا سہارا ہیں اور اگر قیامت آئی تو وہاں بھی تمہارا سہارا ہوں گی۔ ان کا حال قیامت کے دن یہ ہوگا کہ ان مشرکین اور پکارنے والوں کو کہا جائے گا کہ دنیا میں جنہیں تم اپنی مدد کیلئے پکارتے اور اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے رہے ہو، آج انہیں اپنی مدد کیلئے پکارو۔ چنانچہ یہ ان کو پکاریں گے، وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ اگر وہ بت ہیں تو وہ جہنم میں ایندھن کے طور پر جل رہے ہوں گے اور اگر وہ انسان اور جن ہیں جو طاغوتی قوت بن کر اپنے ماننے والوں سے اپنی پوجا کراتے رہے تو وہ بھی اپنی سزا میں گرفتار ہوں گے۔ انہیں اپنی پڑی ہوگی وہ اپنے پکارنے والوں کو کیا جواب دیں گے اور ان کی کیا مدد کرسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کے درمیان ''موبق'' حائل کردیں گے۔ موبق ہلاکت کا کھڈ یا تباہی کے گڑھے کو کہتے ہیں۔ امام قرطبی کہتے ہیں اور انہوں نے ابن اعرابی کا قول نقل کیا ہے كُلُّ شَيْءٍ حَاجِزٌ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ فَهُوَ مُوْبِقٌ ہر وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان آڑ اور رکاوٹ ہو، اسے موبق کہتے ہیں۔ حضرت انسؓ کا قول ہے کہ جہنم کی ایک وادی کا نام موبق ہے جو پیپ اور خون سے بھری ہوگی۔ ایسی کوئی بھی رکاوٹ اور اوٹ ان کے درمیان حائل کردی جائے گی جس سے وہ ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکیں گے اور بعض اہلِ علم نے اس کا معنی دشمنی کیا ہے کہ جب پکارنے والے دیکھیں گے کہ جنہیں ہم زندگی میں پکارتے رہے ہیں آج وہ ہمیں کوئی جواب نہیں دیتے تو ان کے دلوں میں نفرت کا ایک طوفان اٹھے گا۔ اور جب وہ لوگ دیکھیں گے کہ ان کی وجہ سے ہمارے عذاب میں اضافہ ہورہا ہے تو وہ ان پر لعنت بھیجیں گے۔ اس طرح سے دونوں ایک دوسرے کی دشمنی میں جلیں مریں گے۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

(اور مجرم جہنم کی آگ کو دیکھیں گے تو وہ گمان کریں گے کہ وہ اسی میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے کوئی مفر نہیں پائیں گے۔ ۵۳)

Marfat.com

مشرکین کی بے بسی

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے کفر اور شرک کا جرم کرنے والے جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کو دیکھ رہے ہوں گے اور وہ خیال کر رہے ہوں گے کہ اس آگ میں یقیناً انہیں کو ڈالا جائے گا اور اب ہمارا انجام اس آگ میں جلنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس وقت ان کی جو کیفیت ہوگی آج اس کا تصور بھی انسان کیلئے ممکن نہیں کیونکہ دنیا میں بڑے سے بڑا ہولناک تصور بھی قیامت کے تصور کی مثل نہیں ہو سکتا۔ تو اپنی آنکھوں سے اپنا انجام دیکھ کر بھی اس بات پر قادر نہیں ہوں گے کہ وہ یہاں سے بھاگ نکلیں۔ کوئی پناہ گاہ انہیں اپنی پناہ میں لے لے۔ ان کی بے بسی ایسی ہوگی کہ جس کا دنیا میں تصور کرنا محال ہے۔ کس قدر بے بس ہے وہ شخص جو اپنے سامنے اپنے انجام کو دیکھ رہا ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن اس سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا، بلکہ اس کی بے بسی اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔

وَلَقَدْ

صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ
شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا
رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾
وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ
كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ ۖ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنْذِرُوا
هُزُوًا ﴿٥٦﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ
مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۚ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي
آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ﴿٥٧﴾
وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ
الْعَذَابَ ۚ بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ لَنْ يَجِدُوا مِنْ دُونِهِ مَوْئِلًا ﴿٥٨﴾ وَتِلْكَ

Marfat.com

الْقُرٰىٓ اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

رکوع: ۸۔ (اور بیشک ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کیلئے ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں، لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ ۵۴) اور لوگوں کو ایمان لانے سے نہیں روکا جبکہ ان کے پاس ہدایت آ گئی اور مغفرت طلب کرنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ (وہ منتظر ہیں) کہ آ جائے ان کے پاس اگلوں کا دستور یا آ جائے ان کے پاس طرح طرح کا عذاب۔ ۵۵) اور ہم رسولوں کو صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کے بھیجتے ہیں اور کافر باطل کی مدد سے کٹ حجتیاں کرتے ہیں تا کہ وہ اس سے حق کو مٹا دیں اور انہوں نے مری آیات کو اور اس چیز کو جس سے وہ ڈرائے گئے تھے مذاق بنا لیا ہے۔ ۵۶) (اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سے نصیحت کی گئی تو اس نے اس سے روگردانی کی اور فراموش کر دیا اس نے ان اعمالِ بد کو جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجے تھے، ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے تا کہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی (تا کہ وہ قرآن کو نہ سنیں) اور اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تب بھی ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ ۵۷) (اور آپ کا رب بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے، اگر وہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے فوراً پکڑنا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا لیکن ان کیلئے ایک مقررہ وقت ہے اور وہ اس کے مقابل میں کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے۔ ۵۸) اور یہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا جبکہ ان کے لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور ہم نے ان کی ہلاکت کیلئے ایک وقت مقرر کیا۔ ۵۹)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

(اور بیشک ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کیلئے ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں، لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ ۵۴)

تصریف کا مفہوم

صَرَّفْنَا ...... تصریف اس کا مصدر ہے۔ تصریفِ آیات قرآنِ کریم کا ایک مخصوص انداز ہے اور مختلف مواقع پر قرآنِ کریم نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ تصریف سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کسی بات کی تفہیم کیلئے جتنے ممکن طریقے ہو سکتے اور جتنے اسالیب اختیار کئے جا سکتے ہیں ان تمام سے کام لیا جائے۔ موقعہ کی مناسبت سے جو طریقہ مؤثر ہو سکتا ہو اسے اختیار کیا جائے۔ انسان کی طبیعت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ کبھی وہ عقلی دلائل سے بات کو سمجھتا ہے اور کبھی جذباتی اپیل اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کبھی ترغیب کا انداز اسے متاثر کرتا ہے اور کبھی ترہیب اس کے احساسات کو حرکت میں لاتی ہے۔ قرآنِ کریم ان تمام طریقوں کو ضرورت کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انسانی ذوق بھی یکساں نہیں ہے، کسی کا ذوق ادب سے لگاؤ رکھتا ہے تو وہ اس بات سے متاثر ہوتا ہے جس کی تفہیم کیلئے ادبی انداز اختیار کیا گیا ہو اور کبھی انسان رواں

Marfat.com

دواں انداز کو زیادہ پسند کرتا ہے تو ایسے لوگوں کیلئے قرآنِ کریم خطابی انداز اختیار کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ مقصد صرف تفہیم ہوتا ہے اس کیلئے مختلف طریقوں کو اختیار کرنا اور مختلف اسالیب اپنانا سامع کی ایک ضرورت ہے جسے متکلم اپنی فراست سے سمجھتا اور اپنی گفتگو کو اسی انداز میں ڈھال دیتا ہے۔

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یہی وہ چیز ہے جسے قرآنِ کریم نے تصریف کے نام سے یاد فرمایا ہے اور دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ اسی ذریعہ سے قوموں پر اتمامِ حجت ہوا ہے۔

مَثَل سے مراد

مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ...... مثل، مثال یا ملتی ہوئی بات کو کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے دیگر آسمانی کتابوں کی طرح اس صنفِ سخن سے بھی کئی مقامات پر کام لیا ہے۔ کبھی تو اس سے مراد عالمِ غیب اور آخرت کے حقائق ہوتے ہیں جسے صاف اور سپاٹ زبان میں ادا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان حقائق کیلئے ہماری زبان میں مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ ہر زبان میں الفاظ کا ذخیرہ، اس زبان کے بولنے والوں کے حالات، ضروریات اور ماحول کے مطابق وجود میں آتا اور پروان چڑھتا ہے لیکن جو حقائق اس دنیا میں انسان کی ضرورت نہ ہوں اور ان کا تعلق عالمِ آخرت سے ہو تو انہیں کسی حد تک فہم کے قریب لانے کیلئے مثال اور تشبیہ کا انداز اختیار کیا جاتا ہے اور کبھی مشکل بات کو آسان کرنے کیلئے ایسی مثال دی جاتی ہے جس سے اس مشکل بات کا اشکال دور ہو جاتا ہے اور وہ آسانی سے دماغ کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اظہارِ بیان کے ہر طریقے کو آزمایا اور مشکل بات کو آسان کرنے کیلئے ہر قسم کی مثال دے کر بات کو سمجھایا۔ اس کے باوجود انسان کا حال یہ ہے کہ وہ انتہائی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ وہ اپنی خواہشِ نفس پر پہرا بٹھانے کی بجائے اور اپنے مفادات کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف آنے کی بجائے ہر بات میں مین میخ نکالتا ہے۔ بات کو الجھا کر خوش ہوتا ہے اور سنجیدہ سے سنجیدہ باتوں کا مذاق اڑاتا ہے اور بعض دفعہ یہ کہنے سے بھی دریغ نہیں کرتا کہ تمہاری باتیں ہمارے دماغوں میں داخل نہیں ہوتیں۔ وہ بات کو سمجھتا ہے لیکن اپنی بات کو چھوڑنا اسے منظور نہیں۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾

(اور لوگوں کو ایمان لانے سے نہیں روکا جبکہ ان کے پاس ہدایت آگئی اور مغفرت طلب کرنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ (وہ منتظر ہیں) کہ آجائے ان کے پاس اگلوں کا دستور یا آجائے ان کے پاس طرح طرح کا عذاب۔ ۵۵)

انسان کی کج فکری

نبی کریم ﷺ کی بعثتِ مبارکہ اور قرآنِ کریم کے نزول کے بعد ہدایت کا ہر راستہ روشن ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کی تبلیغ و دعوت اور قرآنِ کریم کے اعجاز نے ہر مشکل آسان کر دی۔ کوئی ایسا اشکال باقی نہ رہا جو ہدایت قبول کرنے سے مانع ہو، مگر قریش کا عجیب حال ہے کہ ان

Marfat.com

کی اکثریت برابر اپنے کفر پر جمی ہوئی ہے اور اپنی ڈگر سے ہٹنے کیلئے بالکل تیار نہیں۔ اظہار بیان کے تمام طریقے اور دلائل کے تمام انداز اختیار کر لئے گئے مگر وہ کسی بات کو قبول کر کے دینے کیلئے تیار نہیں۔ ان کی جسارت کا عالم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے کافرانہ رویئے کی وجہ سے جب انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے اور پہلی معذب قوموں سے عبرت پکڑنے کیلئے کہتے تو بجائے متاثر یا خوفزدہ ہونے کے منہ پھاڑ کر کہتے کہ لے آیئے ہم پر وہ عذاب جو عاد و ثمود پر آچکا ہے۔ اور یا وہ یہ کہتے کہ ہم تو اس وقت آپؐ کی بات پر غور کریں گے جب ہم عذاب کو اپنے سامنے دیکھیں گے (کیونکہ "قُبُل" کا معنی سامنے اور روبرو کے ہیں) اس کے بغیر ہم اس آیت پر ایمان لانے اور توبہ واستغفار کرنے کیلئے تیار نہیں۔ عجیب بات ہے کہ انسان بعض دفعہ ضد میں آ کر معمولی عقل سے بھی تہی دامن ہو جاتا ہے۔ ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ تم جس قہر الٰہی کو دعوت دے رہے ہو، اس کے نمودار ہو جانے یا اس کے واقع ہو جانے کے بعد کیا تم بچے رہو گے۔ عذاب کے آجانے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر چیز تباہ و برباد ہو جائے۔ اسی طرح جب عذاب سامنے آجاتا اور دکھائی دیتا ہے تو پھر وہ ٹلا نہیں کرتا اور یہ ظالم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا دیدار کرا کے واپس چلا جائے گا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے سوا کسی قوم سے عذاب آجانے کے بعد ٹلا نہیں بلکہ ان کی جڑ اکھاڑ دی گئی اور بعض قوموں کی دھرتی تک الٹ دی گئی۔

امامِ قرطبی کے نزدیک قُبُل، قبیل کی جمع ہے، جس طرح سُبُل، سبیل کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے، طرح طرح کا عذاب۔ امام فراء نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ اس کا معنی ہے مُتَفَرِّقًا یَتْلُوْ بَعْضُہٗ بَعْضًا یعنی ایک عذاب کے بعد دوسرا عذاب۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۚ وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْۤا اٰیٰتِیْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

(اور ہم رسولوں کو صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کے بھیجتے ہیں اور کافر باطل کی مدد سے کٹ حجتیاں کرتے ہیں تا کہ وہ اس سے حق کو مٹا دیں اور انہوں نے میری آیات کو اور اس چیز کو جس سے وہ ڈرائے گئے تھے مذاق بنا لیا ہے۔ ۵۶)

رسولوں کی بعثت کا مقصد

اس آیتِ کریمہ میں سابقہ آیت کے مضمون کی مزید وضاحت فرمائی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تبلیغ و دعوت سے کافروں پر ہدایت پوری طرح واضح ہو چکی۔ کوئی اشتباہ ایسا نہیں جسے کھولا نہ گیا ہو، اور کوئی سوال ایسا نہیں جس کا جواب نہ دیا گیا ہو۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ یہ لوگ ہدایت قبول کرتے اور اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں اس پر اپنے رب سے معافی چاہتے۔ لیکن انہوں نے بجائے اس کے عذاب کا مطالبہ شروع کر دیا اور ایسی بے تکی باتیں بھی کہیں کہ ہمیں عذاب آتا ہوا دکھا دو تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم اپنے رسولوں کو ان لوگوں کیلئے جو حق کو قبول کرتے ہیں خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتے ہیں، اور ان لوگوں کیلئے جو حق کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں ان کے برے انجام اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں۔ ان کا کام لوگوں کو سمجھا بجھا کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانا اور اس کی ناراضی سے محفوظ کرنا ہے۔ ان کا یہ کام ہرگز نہیں کہ وہ قوم پر عذاب لائیں۔ عذاب دینا یا نہ دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، رسول کا کام تو ہر ممکن طریقے سے اپنی قوم کو عذاب سے بچانا ہے۔ لیکن کافروں کا رویہ یہ ہے کہ وہ باطل یعنی بے سروپا دلائل سے اللہ تعالیٰ کے دین کو مٹانے، اسے

Marfat.com

پسپا کرنے اور بے اثر کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں اور جب وہ انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے ہیں یا آخرت کے ہولناک انجام سے آگاہ کرتے ہیں، تو یہ ان باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ ان باتوں کو حقیقت سمجھنے کی بجائے محض ڈراوے کی باتیں سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا رسولؐ اپنی بات کو منوانے کیلئے اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر قوم کے سامنے بیان کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت ان پر اس وقت کھلے گی جب دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے سامنا ہوگا اور آخرت میں جہنم ان کے سامنے دہک رہا ہوگا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

(اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سے نصیحت کی گئی تو اس نے اس سے روگردانی کی اور فراموش کر دیا اس نے ان اعمالِ بد کو جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجے تھے، ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی (تاکہ وہ قرآن کو نہ سنیں) اور اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تب بھی ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ ۵۷)

محرومی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون

روئے سخن معلوم ہوتا ہے ان بڑے بڑے کفار کی طرف ہے جن کی سرکشی اور تمرد حد سے بڑھ چکے تھے۔ لیکن بات اس طرح کہی جا رہی ہے جس میں ہر وہ شخص شامل ہو جاتا ہے جس کی زندگی کا رویہ وہ ہو جس پر یہاں افسوس کیا جا رہا ہے۔

جس شخص یا جس قوم کے سامنے ایک ایسی نصیحت آئے جس سے زندگی کی فلاح و کامرانی کا رشتہ بندھا ہوا ہو اور جس کے قبول کرنے پر نجات کا دار و مدار اور جس کے رد کر دینے پر ہلاکت یقینی ہو اور پھر اس نصیحت کی یاددہانی کیلئے وہ شخصیت آئے جس کی دلآویزی، جس کی سچائی، جس کا حسنِ کردار اور جس کی بے عیب زندگی اپنی مثال نہ رکھتی ہو اور وہ ایسی کتاب پیش کرے جس کے سامنے اہلِ دنیا کی فصاحت و بلاغت جھک جائے، علم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے اور جس کی حقانیت اور صداقت کی منکرین کے دل بھی تصدیق کئے بغیر نہ رہ سکیں تو ایسی نصیحت کو رد کر دینا اور اس کی پرواہ نہ کرنا بدنصیبی کے سوا اور کیا ہے اور جو شخص یا قوم یہ رویہ اختیار کرے ایسے شخص یا ایسی قوم کی بدنصیبی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اور مزید براں ان کا حال یہ ہو کہ نصیحت کو صرف رد ہی نہ کریں بلکہ اس سے پوری طرح رخ پھیر لیں، اس پر کان دھرنے کو بھی تیار نہ ہوں۔ اور اپنی ذات اور اپنے اعمال جن کا استحضار انسان کیلئے ضروری ہے اور کوئی بھی ہوش و خرد کا مالک انسان اپنے اعمال سے ناواقف نہیں رہ سکتا، انہیں تو یکسر بھلا دیا جائے اور کبھی بھول کر بھی اس کا خیال نہ کیا جائے کہ مجھے جو ہاتھ بھلائی جمع کرنے کیلئے دیئے گئے تھے میں نے ان سے کیسے کیسے گناہ کمائے اور اپنی بداعمالیوں کا کتنا بڑا ذخیرہ اپنے آگے بھیج چکا ہوں اور جب انہیں اس کی طرف توجہ دلائی جائے تو بجائے اپنی بداعمالیوں کو یاد کرنے کے کہنے والے کا منہ نوچنے کیلئے تیار ہو جائیں تو ایسے لوگ یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں انہیں نصیحت کو سننے اور سمجھنے کیلئے عطا کی تھیں دینے والے کی ناشکری ہے بلکہ انسانی عقل و خرد کی توہین بھی ہے وہ ان سے چھین لی جائیں۔ چنانچہ اس

Marfat.com

آیتِ کریمہ میں یہی فرمایا گیا کہ ان لوگوں نے چونکہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح استعمال کرنے کی بجائے غلط استعمال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھنے اور سننے سے محروم کر دیا۔ یہ دو ہی راستے ہیں جس سے انسان کسی بات کو قبول کر سکتا ہے کہ وہ کسی نصیحت کو سنے اور پھر غور و فکر کے بعد عقل سے کام لے کر اسے قبول کرے یا رد کر دے۔ لیکن جو شخص سننے سے محروم ہو تو اس کیلئے نصیحت کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی نصیحت کو سنتا ہے لیکن اس پر غور و فکر کی صلاحیت سے محروم یا صحیح بات سمجھنے سے عاجز ہے تو ایسے شخص کی بیچارگی پر رحم تو ضرور آئے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ خیال بھی آئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی، لیکن اگر ذہن میں یہ بات رہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جس قوت کو استعمال نہ کیا جائے اور یا اسے غلط استعمال کیا جائے تو وہ ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ کے قانون کی گرفت میں آ کر مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی حال ایمان وکفر کا ہے۔ ایمان تب نصیب ہوتا ہے جب ان قوتوں کو صحیح استعمال کیا جائے۔ غلط استعمال سے آدمی صحیح راستے پر چلنے کی بجائے غلط راستے پر چلے گا جسے کفر کہا جاتا ہے اور اگر وہ اس سے پلٹنے کا کبھی نام نہ لے تو پھر آخر وہ صلاحیت اس سے چھین لی جاتی ہے۔ اب اس کی حالت ہی نہیں بگڑتی، قسمت بھی بگڑ جاتی ہے اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جس کا اس آیت کے آخر میں ذکر فرمایا گیا کہ اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ، تب بھی وہ کبھی ہدایت کی طرف نہیں آ سکیں گے کیونکہ وہ صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ محرومی کا یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ جلدی نہیں فرماتا۔ مہلت پہ مہلت دی جاتی ہے، لیکن جب مہلت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تو پھر اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آتا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾

(اور آپ کا رب بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے، اگر وہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے فوراً پکڑنا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا لیکن ان کیلئے ایک مقررہ وقت ہے اور وہ اس کے مقابل میں کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے۔ ۵۸)

مَوْئِل...... آلَ یَئُوْلُ سے ظرف ہے، پناہ کی جگہ۔

مجرموں کو مہلت دینے کی حکمت

گزشتہ آیت سے یہ معلوم ہوا کہ افراد اور قوموں کو ایک خاص حد تک مہلت دی جاتی ہے لیکن جب وہ اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ تمرد اور سرکشی میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور نصیحت کی کسی بات کو سننے کے روادار نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کی محرومی کا فیصلہ کر دیتا ہے اور ان کے دلوں پر مہر کر دی جاتی ہے۔ نہ وہ کسی بات کو سنتے ہیں اور نہ کسی بات کو سمجھتے ہیں۔ قریش کے بیشتر لوگوں کا ایسا ہی حال ہو گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی تمام تر مساعی جمیلہ ان کیلئے ایک بے کار کوشش کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ ایک عام آدمی جب اس صورتحال کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال آئے بغیر نہیں رہتا کہ ایسے لوگوں کو بارِ زمین بنائے رکھنے کا آخر کیا فائدہ؟ ان کیلئے زمین کا پیٹ زمین کی سطح سے بہتر تھا اور پھر جبکہ وہ خود بار بار عذاب کا تقاضا کر رہے تھے تو انہیں یقیناً عذاب کی نذر کر دینا چاہیے تھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ درحقیقت تمہارا رب بہت بخشنے والا اور بہت رحمت والا ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں کہ وہ لوگوں کو ان کی غلطیوں پر فوراً پکڑے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً وہ عذاب بھیجنے میں جلدی کرتا۔ لیکن اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مہلت دی جائے تاکہ وہ اگر سنبھلنا

Marfat.com

چاہیں تو سنبھل جائیں۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ بعض دفعہ ایک ہی دفعہ نصیحت کو قبول کر لیتا ہے اور بعض دفعہ کئی دفعہ کی کوشش کے بعد اس کا ذہن نصیحت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور بعض دلوں کی زمینیں ایسی سنگلاخ ہوتی ہیں کہ ان پر برسوں محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا معاملہ دودھ بلونے والے کی طرح ہے کہ جب تک دودھ سے آخری پھٹکی بھی مکھن کی نہیں نکل آتی بلونے والا اسے بلوتا رہتا ہے۔ اسی طرح پروردگار بھی اس وقت تک ان کو مہلت دیتا رہتا ہے جب تک کسی ایک کے بھی ایمان لانے کی امید ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ سوتے بالکل خشک ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ان پر عذاب بھیجتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جسے موعد کہا گیا ہے اور کبھی اسے اجلِ مسمّٰی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ موعد یا اجل انسانی علم کی گرفت میں آنے والی چیز نہیں۔ اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کسی قوم کی قبولیت کی استعداد کب اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عذاب دینے میں بھی رحمت کا معاملہ کرتی ہے کیونکہ اگر وہ ایمان سے انکار، سرکشی یا بدعملی پر فوراً پکڑنے لگتی تو پھر شاید کوئی شخص بھی اس عذاب سے نہ بچ سکتا۔ دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ ''اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے کرتوتوں پر پکڑنے لگتا تو زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ قریش کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلد سزا نہ دینا بلکہ ان کی سزا کو مؤخر کرتے چلے جانا، یہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے مطابق ہے جسے قانونِ رحمت کہنا چاہیے۔ اگر اس کا یہ قانون اس زمین پر کارفرما نہ ہوتا بلکہ وہ ہر بدعملی اور بے ایمانی پر پکڑنے لگتا تو پھر اس کا عذاب تاخیر نہ کرتا بلکہ پہلے ہی موقع پر آ دھمکتا، لیکن ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کو یہاں موعد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب وہ وقتِ مقرر آ جائے گا تو پھر یہ کہیں پناہ نہیں پا سکیں گے۔ نہ کوئی جگہ ان کو پناہ دے سکے گی اور نہ کوئی شخص ان کو پناہ دے سکے گا۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

(اور یہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا جبکہ ان کے لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور ہم نے ان کی ہلاکت کیلئے ایک وقت مقرر کیا۔ ۵۹)

گزشتہ آیت پر تاریخی شہادت

گزشتہ آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ آیتِ کریمہ اس پر دلیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو اس قوم کا امتحان شروع ہو جاتا ہے کہ وہ اس رسول کی دعوت کو قبول کر کے کامیابی اور نجات کا راستہ اختیار کرتی ہے یا اس دعوت کو رد کر کے اپنے لئے تباہی اختیار کرتی ہے۔ رسول اپنی قوم کی اصلاح کیلئے شب و روز محنت کرتا ہے۔ ہر طریقے سے ان کے خیالات کو بدل کر انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے پر ڈالنے کا جتن کرتا ہے۔ لیکن جب وہ قوم اللہ تعالیٰ کی طرف آنے سے انکار کر دیتی ہے اور اپنی سرکشی میں بڑھتی چلی جاتی ہے اور پیغمبر کی ساری کاوشیں ناکام ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے ایک وقت مقرر کر دیتا ہے، اس وقت کے آنے تک اسے ڈھیل ملتی رہتی ہے کہ وہ اگر چاہیں تو اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر لیں، لیکن جب یہ ڈھیل کا وقت گزر جاتا ہے اور قوم اپنی اصلاح کی ہر کوشش کو جھٹک دیتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب انہیں تباہ کر دیتا ہے۔ وہ بستیاں جن پر قریش اپنے تجارتی سفروں میں گزرا کرتے تھے مراد اس سے قومِ عاد اور قوم ثمود اور قومِ لوط کی بستیاں ہیں جن کے کھنڈرات یا ان کے کچھ آثار ابھی تک قائم ہیں جنہیں ہر دیکھنے والا دیکھ کر اندازہ کر سکتا تھا کہ کسی زمانے میں ان بستیوں کے رہنے والے لوگ نہایت ترقی یافتہ تھے۔ دنیا کی ہر نعمت انہیں میسر تھی، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا جس

Marfat.com

کے نتیجے میں انسانیت کی ایک ایک قدر کو انہوں نے پامال کر ڈالا۔ ان کی اصلاح کیلئے رسول بھیجے گئے لیکن انہوں نے ان کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے ان کی دشمنی اور اذیت رسانی پر کمر باندھ لی۔ حتیٰ کہ ان کے قتل کے منصوبے بنانے لگے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول بار بار انہیں تنبیہ کرتا رہا کہ تم اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرو، میں تمہارا خیر خواہ بن کے آیا ہوں، لیکن اگر تم نے میری خیر خواہی سے فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ کی گرفت آ سکتی ہے۔ قدرت کی طرف سے تمہاری تباہی کا ایک وقت مقرر ہو چکا ہے اس سے پہلے پہلے تم اپنی اصلاح کر لو اور اللہ تعالیٰ کے آستانے پر جھک جاؤ لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی خیر خواہی سے فائدہ اٹھانے کی بجائے سرکشی اور تمرد کی انتہا کر دی تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا۔ ان بستیوں کے کھنڈرات ان کی تباہی کی داستان سنانے کیلئے کافی ہیں۔ قریش کے لوگ وہاں سے گزرتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے ان کھنڈرات کو دیکھ بھی سکتے ہیں اور ان کی زبانِ حال سے وہ داستان سن بھی سکتے ہیں۔ اب بالکل وہی صورتحال قریش کو بھی درپیش ہے۔ اگر انہوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کیا اور اپنے کافرانہ اور مشرکانہ رویئے کو نہ چھوڑا تو یہاں بھی انہیں بستیوں کی تاریخ دہرائی جائے گی کیونکہ انہیں کی طرح ان کیلئے بھی ایک وقت مقرر ہو چکا ہے اور یہ آہستہ آہستہ اس وقت کے اختتام کی طرف بڑھ رہے ہیں جب وہ ہلاکت کا وقت آ جائے گا تو پھر ان کو کہیں پناہ نہیں مل سکے گی اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔

وَاِذْ قَالَ

مُوْسٰی لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾
فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَیْنِهِمَا نَسِیَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ
سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ؗ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا
هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اَرَءَیْتَ اِذْ اَوَیْنَآ اِلَی الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ؗ
وَمَآ اَنْسٰىنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ ۖ
عَجَبًا ﴿٦٣﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾
فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا
عِلْمًا ﴿٦٥﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰی هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ
رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا

Marfat.com

لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾ قَالَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤی اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾

رکوع: ۹۔ (اور اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا تھا میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں یا میں مدتوں چلتا رہوں گا۔ ٦٠) پھر جب وہ دونوں دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچے تو دونوں اپنی مچھلی بھول گئے اور اس نے اپنا راستہ سرنگ کی طرح دریا میں بنالیا۔ ٦١) جب وہ آگے بڑھ گئے تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے شاگرد سے کہا ہمارا کھانا لاؤ، بیشک ہمیں اپنے سفر میں بڑی مشقت برداشت کرنا پڑی ہے۔ ٦٢) خادم نے کہا، کیا عرض کروں، جب ہم چٹان کے پاس (سستانے کیلئے) ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی، مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں اور اس نے بنالیا تھا اپنا راستہ دریا میں عجیب طرح۔ ٦٣) حضرت موسیٰ نے فرمایا یہی تو وہ ہے جس کی ہم جستجو کر رہے تھے، پس وہ اپنے نقوشِ قدم دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔ ٦٤) تو انہوں نے پایا ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو، جس کو ہم نے اپنے خاص فضل سے نوازا تھا اور جس کو خاص اپنے پاس سے علم عطا فرمایا تھا۔ ٦٥) حضرت موسیٰ نے حضرت خضر سے کہا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، اس شرط کے ساتھ کہ جو علم آپ کو عطا ہوا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیں۔ ٦٦) حضرت خضر نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ٦٧) اور آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جس کی آپ کو پوری طرح خبر نہیں۔ ٦٨) آپ نے کہا ان شاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے، میں کسی معاملے میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ ٦٩) حضرت خضر نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو کسی چیز کے متعلق مجھ سے اس وقت تک کچھ نہ پوچھئے جب تک میں خود ہی اس کا ذکر نہ چھیڑوں۔ ٧٠)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰۤی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾

(اور اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا تھا میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں یا میں مدتوں چلتا رہوں گا۔ ٦٠)

آیت کا پس منظر

یہاں سے ان واقعات کا بیان شروع ہو رہا ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے درمیان پیش آئے جنہیں مسلسل قرآن کریم نے دو رکوعوں میں پیش فرمایا ہے۔ عوام میں ان واقعات کو قصہ موسیٰ وخضر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

سابقہ آیات کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت اس دور میں داخل ہوچکی تھی جبکہ اہل مکہ کی جانب سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی مخالفت دشمنی کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔ اذیتوں کی بھٹی پوری طرح گرم ہوچکی تھی۔ آنحضرت ﷺ جیسے جیسے دعوت وتبلیغ میں تیزی پیدا کرتے جارہے تھے ویسے ویسے مشرکین کی جانب سے انکار اور اذیت رسانی کے عمل میں بھی تیزی آتی جارہی تھی حتی کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کو یہ وارننگ دینا ضروری سمجھا کہ تم لوگوں نے اگر اپنے رویئے میں تبدیلی نہ کی اور تمہاری مخالفتیں اسی طرح جاری رہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں حق کی قبولیت سے محروم نہ کردیا جائے، یعنی تمہارے دلوں پر محرومی کی مہر نہ لگادی جائے۔ اسی صورت میں پھر یہ خطرہ یقین کی صورت اختیار کرجاتا ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کا عذاب دور نہیں، وہ کسی وقت بھی تم پر نازل ہوسکتا ہے اور اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ بات یاد دلانا ضروری تھا کہ تمہیں کفار کی اذیت رسانیوں کے مقابلے میں صبر اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ بظاہر تم دیکھ رہے ہو کہ مخالفتوں کے ہجوم میں حوصلے ٹوٹنے لگتے ہیں اور کفار کی اذیت رسانیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کفار جب دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کیلئے کوئی جائے پناہ نہیں اور کوئی ذات ہمارا ہاتھ روکنے والی نہیں تو وہ اپنے کافرانہ رویئے میں اور دلیر ہوجاتے ہیں اور مسلمان جب دیکھتے ہیں کہ ہماری مظلومیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے تو وہ اسلام کے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ ایسے نازک وقت میں اس سے پہلے کہ کوئی غلط فیصلہ حالات کی رفتار پر اثر انداز ہو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی رہنمائی ملنی چاہئے جس سے جانبین کو صحیح بات سمجھنے اور صحیح رائے اختیار کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ ایسے ہی حالات میں یہ واقعات مسلمانوں کو سنائے گئے کہ تم بظاہر دیکھ رہے ہو کہ مسلمانوں کی مظلومیت گہری ہوتی جارہی ہے اور انہیں کہیں سے کسی مدد ملنے کی امید دکھائی نہیں دیتی۔ اور دوسری طرف کافروں کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اندھیر نگری ہے جس میں کسی چوپٹ راجے کی حکومت ہے، جس میں طاقت کی بات چلتی ہے اور مظلومیت زخم چاٹتی رہ جاتی ہے۔ کوئی حق، حق نہیں۔ اور کوئی باطل، باطل نہیں۔ اگر حق کمزور ہے تو اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں اور باطل طاقتور ہے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ انہیں ان واقعات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تم ظاہر بین نگاہ سے جو کچھ دیکھ رہے ہو وہ دراصل حقیقت نہیں اور جو حقیقت ہے وہ تمہاری نگاہوں سے مخفی ہے۔ اس قصے میں پروردگار نے اپنی مشیت کے گوشے سے پردہ اٹھا کر یہ دکھایا ہے کہ تم جو کچھ ظاہر میں دیکھتے ہو ضروری نہیں کہ حقیقت بھی وہی ہو، ان واقعات کے آئینہ میں دیکھو کہ بظاہر واقعہ کیا پیش آیا ہے اور بعد میں اس کی تعبیر کیسی سامنے آئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ انسان جو کچھ بظاہر دیکھتا ہے ضروری نہیں کہ انجام کے اعتبار سے بھی وہی ہو۔

شانِ نزول

ہماری اس گزارش سے تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ آیات سے ان واقعات کا یہ ربط ہے اور اس پس منظر میں ان واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر کا فوری سبب کیا ہوا تو بعض اہل علم نے ایسے ہی پس منظر کو اس کا سبب قرار دیا ہے اور جو سبب صراحتاً حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے اس کا نہ صرف انکار کیا ہے بلکہ کسی حد تک استخفاف بھی کیا ہے۔ یہ ایک بڑی جسارت ہے، اللہ تعالیٰ اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اس کے فوری سبب کی تفصیل صحیح بخاری ومسلم باب التفسیر میں حضرت اُبی بن کعبؓ کی روایت میں بیان کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے آپؑ سے یہ سوال کیا کہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں سب سے زیادہ علم والا ہوں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ اپنی مقرب بارگاہ بندوں بالخصوص انبیائے کرام کو ایسی تربیت سے نوازتے ہیں جس سے وہ پوری دنیا کیلئے منارۂ نور بن جاتے ہیں۔ اس لئے یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی کیونکہ ادب کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالے کرتے یعنی یہ کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ساری مخلوق میں سب سے بڑا عالم کون ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ فرمایا اور آپؑ پر وحی نازل کی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین پر ہے، وہ آپؑ سے بڑا عالم ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ان کا اتہ پتہ معلوم کیا اور پھر ان سے استفادہ کیلئے ایک طویل سفر کیا جس کی تفصیل ان دو رکوعوں میں بیان کی گئی ہے۔

بائبل کی خاموشی، تلمود کی بے خبری

بائبل چونکہ اس واقعہ کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ البتہ تلمود میں اس کا ذکر ہے، مگر وہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بجائے، ربی یہوحانان بن لاوی کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس کا بیان یہ ہے کہ ربی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاس علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی تفصیل پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تلمود نے ان واقعات کو محفوظ نہیں رکھا بلکہ اس کی کڑیاں کہیں سے کہیں جا کر جوڑ دی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل اور تلمود وغیرہ صرف شرعی احکام کے بارے میں ہی غیر معتبر نہیں بلکہ تاریخی واقعات کے بارے میں بھی ان پر اعتماد کرنا مشکل ہے، لیکن تلمود کی اس روایت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ قرآن میں اس مقام پر موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ کوئی اور موسیٰ ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ قرآنِ کریم نے بیسیوں دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیل سے ذکر فرمایا۔ ان کی زندگی کی ضروری تفصیلات تک قرآنِ کریم میں موجود ہیں، تو کیا صرف یہی ایک واقعہ ایسا تھا کہ جسے کسی مجہول الحال موسیٰ کی طرف منسوب کر کے اس طرح بیان کیا جاتا کہ جس میں کوئی اشارہ بھی اس بات کا نہ ہوتا کہ یہ صاحب کوئی اور موسیٰ ہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم کا اپنا انداز قطعی طور پر اس کی تردید کیلئے کافی ہے، لیکن مزید اطمینان کیلئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ صحیحین میں حضرت سعید بن جبیرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اس موسیٰ کے بارے میں دریافت کیا اور انہیں بتایا کہ نوفل بکالی کا خیال ہے کہ اس واقعہ میں جس موسیٰ کا ذکر ہے وہ موسیٰ بنی اسرائیل نہیں بلکہ یہ موسیٰ بن افرائیم بن یوسف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے دشمن نے جھوٹ بکا، ہمیں حضرت اُبی ابن کعبؓ نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا اور اس کے بعد وہ پوری روایت بیان فرمائی جس کا ہم اس سے پہلے صحیحین کے حوالے سے ذکر کر چکے ہیں۔

فتیٰ کا مفہوم اور مراد

اس آیت کریمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمسفر کو فتیٰ کے لفظ سے یاد فرمایا گیا ہے۔ فتیٰ کا لفظی معنی نوجوان ہوتا ہے۔ جب یہ لفظ کسی خاص شخص کی طرف منسوب کر کے استعمال کیا جائے تو پھر اس سے مراد عام طور پر اس کا خادم یا شاگرد ہوتا ہے اور اس کو فتیٰ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ خادم یا نوکرا کثر قوی جوان کو دیکھ کر ہی رکھا جاتا ہے جو ہر طرح کے کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فتیٰ سے مراد یوشع بن نون ہیں۔ یہ وہ نوجوان ہیں جو سفر و حضر میں حضرت کلیم اللہ کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھتیجا قرار دیا ہے، لیکن اس پر کوئی ثقہ روایت موجود نہیں۔ یہی نوجوان ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام

Marfat.com

کی وفات کے بعد نبوت سے سرفراز کیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے 110 سال کی عمر میں وفات پائی اور اردن میں مدفون ہوئے۔ آج بھی ان کی قبر محفوظ سمجھی جاتی ہے۔

مجمع البحرین سے مراد

اس آیتِ کریمہ میں مجمع البحرین کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے دو دریاؤں کا سنگم۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہاں پہنچ کر اپنے ایک بندے سے ملنے کا حکم دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ مجمع البحرین کون سی جگہ ہے؟ دنیا میں ایسی جگہ بیشمار ہیں جہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں چونکہ اس کا تعین نہیں فرمایا گیا اس لئے مفسرین کے اس میں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ بحرِ فارس و روم کے ملنے کی جگہ مراد ہے۔ ابن عطیہؒ نے آذربائیجان کے قریب ایک جگہ کو کہا۔ بعض نے بحرِ اردن اور بحرِ قلزم کے ملنے کی جگہ بتلائی ہے۔ بعض نے کہا یہ مقام طنجہ میں واقع ہے۔ حضرت اُبی ابن کعبؓ سے منقول ہے کہ یہ افریقہ میں ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ یہ خلیج عقبہ اور سویز کا وہ مقامِ اتصال ہے جہاں سے بعد کے مراحل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ گزرے۔ مولانا مودودیؒ کا گمان یہ ہے کہ غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحر الابیض اور البحر الازرق آ کر ملتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی جن علاقوں میں گزاری ہے ان میں یا تو یہ جگہ مجمع البحرین سے مراد لی جا سکتی ہے اور یا اس سے خلیج عقبہ اور سویز کا مقامِ اتصال مراد لیا جا سکتا ہے، لیکن زیادہ قرینِ قیاس مولانا مودودی کی رائے معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

حُقُب کا مفہوم

حُقُب کے معنی زمانہ، سال، 80 سال یا اس سے بھی زیادہ مدت کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اس سفر کی ہدایت چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعے کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگاہ میں اس کی تعمیل نہ صرف ضروری تھی بلکہ ذوق و شوق کی حامل بھی تھی۔ اس لئے آپؑ نے نہایت عزم و جزم کے ساتھ اپنے خادم سے کہا کہ یا تو میں مجمع البحرین میں اس مقام تک پہنچ جاؤں گا جہاں مجھے جانے کا حکم دیا گیا ہے اور وہاں میں اس اللہ تعالیٰ کے عظیم بندے سے استفادہ کروں گا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے خاص علم عنایت فرمایا ہے اور یا پھر میں مدت العمر چلتا رہوں گا اور یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ برسوں چلتا رہوں گا۔ اس میں ذوق و شوق کا اظہار بھی ہے اور عزمِ صمیم کا بھی۔

اس سے پیشتر کہ ہم اگلی آیات کی مدد سے اس واقعہ کی تفصیلات عرض کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقینِ مغرب نے اس قصے کے مآخذ کا کھوج لگاتے ہوئے اپنے جس خبثِ باطن کا اظہار کیا ہے اور جس سے ان کی نام نہاد علمی تحقیق کا پول کھلتا ہے اس کا کسی حد تک ذکر کر دیں۔ تفہیم القرآن میں مولانا مودودی رقم طراز ہیں۔

Marfat.com

مستشرقین کی یاوہ گوئی اور اس کا رد

مستشرقینِ مغرب نے اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کے اس قصے کے بھی مآخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور تین قصوں پر انگلی رکھ دی ہے کہ یہ ہیں وہ مقامات جہاں سے محمد (ﷺ) نے نقل کر کے یہ قصہ بنالیا ہے اور پھر دعویٰ کر دیا کہ یہ تو میرے اوپر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔ ایک داستانِ گلگامیش، دوسرے سکندر نامۂ سریانی اور تیسرے وہ یہودی روایت جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے لیکن یہ بدطینت لوگ علم کے نام سے جو تحقیقات کرتے ہیں اس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہرحال منزل من اللہ تو نہیں ماننا ہے اب کہیں نہ کہیں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد (ﷺ) نے اس میں پیش کیا ہے۔ یہ فلاں فلاں مقامات سے چرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اپنی طرزِ تحقیق میں یہ لوگ اس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گھن آنے لگتی ہے اور آدمی کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اس علم پر اور اس تحقیق پر۔ ان کی اس متعصبانہ افترا پردازی کا پردہ بالکل چاک ہو جائے اگر کوئی طالب علم ان سے صرف چار باتوں کا جواب طلب کر لے:

اول یہ کہ آپ کے پاس وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر آپ دو چار قدیم کتابوں میں قرآن کے کسی بیان سے ملتا جلتا مضمون پا کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ قرآن کا بیان لازماً انہی کتابوں سے مآخوذ ہے؟

دوسرے یہ کہ مختلف زبانوں کی جتنی کتابیں آپ لوگوں نے قرآنِ مجید کے قصوں اور دوسرے بیانات کی ماخذ قرار دی ہیں اگر ان کی فہرست بنائی جائے تو اچھے خاصے ایک کتب خانے کی فہرست بن جائے۔ کیا ایسا کوئی کتب خانہ مکے میں اس وقت موجود تھا اور مختلف زبانوں کے مترجمین بیٹھے ہوئے محمد (ﷺ) کیلئے مواد فراہم کر رہے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کا سارا انحصار ان دو تین سفروں پر ہے جو نبی کریم ﷺ نے نبوت سے کئی سال پہلے عرب سے باہر کیے تھے، تو سوال یہ ہے کہ آخر ان تجارتی سفروں میں آنحضرت ﷺ کتنے کتب خانے نقل یا حفظ کر لائے تھے؟ اور اعلانِ نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی آنحضرت ﷺ کی ایسی معلومات کا کوئی نشان آپؐ کی بات چیت میں نہ پائے جانے کی کیا معقول وجہ ہے؟

تیسرے یہ کہ کفارِ مکہ اور یہودی اور نصرانی، سب آپ ہی لوگوں کی طرح اس تلاش میں تھے کہ محمد (ﷺ) یہ مضامین کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے معاصرین کو اس سرقے کا پتہ نہ چلنے کی کیا وجہ ہے؟ انہیں تو بار بار تحدی کی جا رہی تھی کہ یہ قرآن منزل من اللہ ہے، وحی کے سوا اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اگر تم اسے بشر کا کلام کہتے ہو تو ثابت کرو کہ بشر ایسا کلام کہہ سکتا ہے۔ اس چیلنج نے آنحضرت ﷺ کے معاصر دشمنانِ اسلام کی کمر توڑ کر رکھ دی مگر وہ ایک ماخذ کی بھی نشاندہی نہ کر سکے جس سے قرآن کے ماخوذ ہونے کا کوئی معقول آدمی یقین تو درکنار شک ہی کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ معاصرین اس سراغ رسانی میں ناکام کیوں ہوئے اور ہزار بارہ سو برس کے بعد آج معاندین کو اس میں کیسے کامیابی نصیب ہو رہی ہے؟

آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بات کا امکان تو بہرحال ہے نا کہ قرآن منزل من اللہ ہو اور وہ پچھلی تاریخ کے انہی واقعات کی صحیح خبریں دے رہا ہو جو دوسرے لوگوں تک صدیوں کے دوران میں زبانی روایت سے مسخ ہوتی ہوئی پہنچی ہوں اور افسانوں میں جگہ پا گئی ہوں۔ اس امکان کو کس معقول دلیل کی بنا پر بالکل ہی خارج از بحث کر دیا گیا اور کیوں صرف اسی ایک امکان کو بنائے بحث و تحقیق بنا لیا گیا

Marfat.com

کہ قرآن ان قصوں ہی سے ماخوذ ہو جو لوگوں کے پاس زبانی روایات اور افسانوں کی شکل میں موجود تھے؟ کیا مذہبی تعصب اور عناد کے سوا اس ترجیح کی کوئی دوسری وجہ بیان کی جاسکتی ہے؟

ان سوالات پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مستشرقین نے "علم" کے نام سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ درحقیقت کسی سنجیدہ طالب علم کیلئے قابلِ التفات نہیں ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

(پھر جب وہ دونوں دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچے تو دونوں اپنی مچھلی بھول گئے اور اس نے اپنا راستہ سرنگ کی طرح دریا میں بنالیا۔ ٦١)

گزشتہ آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عازمِ سفر ہوتے ہوئے اپنے خادم سے فرمایا تھا کہ چاہئے کتنا عرصہ لگ جائے مجھے بہر صورت مجمع البحرین پہنچنا ہے۔ یعنی جہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ کو پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی منزل کی طرف عازمِ سفر ہو گئے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر تک آپ چلے، بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار نے آپ کو اپنے ساتھ زنبیل میں ایک مچھلی رکھنے کا حکم دیا تھا، لیکن اس روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مچھلی بھنی ہوئی تھی یا اپنی اصلی حالت میں تھی۔ وہی آپ کا زادِ سفر تھی یا سفر کا کھانا اس کے علاوہ آپ کے ہمراہ تھا، بہر حال اتنی بات تو واضح ہے کہ وہ مچھلی زندہ نہیں تھی کیونکہ مچھلی جب پانی سے باہر آتی ہے تو کچھ دیر کے بعد مر جاتی ہے اور پھر اسے تو ایک زنبیل میں ڈال کر ایک عرصہ کیلئے سفر میں ساتھ رکھا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ہمسفر کے ساتھ مجمع البحرین پہنچے تو آپ نے کچھ تھکاوٹ محسوس کی تو وہاں کسی چٹان کے سائے میں آرام کیلئے لیٹ گئے۔ آپ کی آنکھ لگ گئی لیکن آپ کے خادم جاگ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ زنبیل سے مچھلی نکلی اور یہ دونوں چونکہ دریا کے کنارے پر تھے وہ باہر نکلتے ہیں پانی میں کود گئی۔ ایک تو مچھلی کا زندہ ہو کر پانی میں کود جانا نہایت تعجب کی بات ہے اور اس پر مزید تعجب یہ ہوا کہ آپ کے خادم نے دیکھا کہ مچھلی پانی میں ڈوبتی ہوئی اس طرح گزری کہ پانی میں سرنگ کا نشان بن گیا م۔ سرنگ کہتے ہیں پہاڑوں میں کھودے ہوئے راستے کو۔ مچھلی کے گزرنے سے بھی پانی میں ایک راستہ سا بن گیا، یعنی جہاں سے وہ گزری وہاں چاروں طرف سے پانی منجمد ہو کے رہ گیا اور درمیان میں ایک گزرگاہ سی بنتی گئی۔

نَسِيَا حُوتَهُمَا کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں نَسِيَا حُوتَهُمَا کے الفاظ آئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ معنی تو اس کا یہ ہے کہ وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے۔ اگر تو اس سے مراد یہ ہے کہ مچھلی جس طرح زندہ ہو کر پانی میں داخل ہوئی اور غائب ہو گئی اور اسے صرف آپ کے خادم نے دیکھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت سو رہے تھے تو ایسی تعجب خیز بات ضروری تھا کہ آپ کا خادم آپ کو بتاتا، لیکن وہ آپ کو بتلانا بھول گیا۔ اس صورت میں تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ خادم مچھلی کا ذکر کرنا بھول گیا، لیکن یہاں فرمایا گیا ہے کہ وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے۔ اس کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ بعض دفعہ ایک چیز کی نسبت علی سبیل التغلیب دو کی طرف کردی جاتی ہے جبکہ اس کا تعلق دو سے نہیں ایک سے ہوتا ہے، جس طرح قرآنِ کریم میں سورہ الرحمٰن میں فرمایا گیا يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ان دونوں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں،

Marfat.com

حالانکہ موتی دریائے شیریں سے نہیں دریائے شور سے نکلتے ہیں، لیکن نسبت دونوں کی طرف کی گئی۔ اسی طرح یہاں بھی بجائے خادم کی طرف نسبت کرنے کے دونوں کی طرف نسبت کردی گئی۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ جس زنبیل میں مچھلی ڈالی گئی تھی اسے دونوں حضرات آگے سفر پہ روانہ ہوتے ہوئے اُس چٹان کے پاس بھول گئے جہاں انہوں نے آرام کیا تھا۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾

(جب وہ آگے بڑھ گئے تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے شاگرد سے کہا ہمارا کھانا لاؤ، بیشک ہمیں برداشت کرنا پڑی ہے اپنے سفر میں بڑی مشقت۔ ۶۲)

آرام کرنے کے بعد پھر سفر شروع کیا۔ بعض اسرائیلی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن اور ایک رات چلتے رہے، اب تک تو آپؑ کو تکان محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اس لمبے سفر کے بعد آپؑ رکے اور اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا کھانا لاؤ، اس سفر نے ہمیں بہت تھکا دیا ہے۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ
اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ
ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ
عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

(خادم نے کہا، کیا عرض کروں، جب ہم چٹان کے پاس (سستانے کیلئے) ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی، مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں اور اس نے بنالیا تھا اپنا راستہ دریا میں عجیب طرح۔ ۶۳) حضرت موسیٰ نے فرمایا یہی تو وہ ہے جس کی ہم جستجو کر رہے تھے، پس وہ اپنے نقوشِ قدم دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔ ۶۴) تو انہوں نے پایا ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو، جس کو ہم نے اپنے خاص فضل سے نوازا تھا اور جس کو خاص اپنے پاس سے علم عطا فرمایا تھا۔ ۶۵)

خادم کی معذرت

خادم نے کہا کہ حضرت میں کیا عرض کروں، میں شرمندہ ہوں حالانکہ بات ایسی اہم تھی کہ مجھے فوری طور پر آپؑ سے کہنی چاہئے تھی، لیکن میں بھول گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے مجھے بھلایا تھا کہ میں آپؑ سے ذکر نہ کرسکوں۔ وہ بات یہ تھی کہ جب آپؑ اس چٹان کے پاس آرام کررہے تھے اور میں جاگ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ مردہ مچھلی زندہ ہوکر دریا میں کود گئی اور گئی بھی ایسے عجیب طریقے سے کہ جہاں سے وہ گزری بجائے پانی کے آپس کے ملنے کے سرنگ کی طرح راستہ بنتا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چونک کر کہا، ارے وہی تو ہماری منزلِ مراد تھی، ہمیں اسی جگہ پہنچنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار نے آپؑ کو یہی علامت بتائی تھی، کیونکہ مجمع البحرین کوئی ایسی چھوٹی سی جگہ تو نہیں ہوتی کہ وہاں آدمی کسی شخص کو ڈھونڈ سکے۔ تو علامت یہ طے ہوئی تھی کہ جہاں تمہاری زنبیل میں رکھی ہوئی مچھلی یا

Marfat.com

تمہارے کھانے کی مچھلی زندہ ہو کر پانی میں داخل ہو جائے تو سمجھ لینا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے اس عظیم بندے سے ملاقات ہو گی جس کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اتنا لمبا سفر کیا۔ چنانچہ آپؑ اپنے ہی نقوشِ قدم کو پہچانتے ہوئے واپس لوٹے تا کہ ہم اس جگہ کی بجائے کسی اور جگہ نہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ اس جگہ پہنچے تو آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندے کو وہاں پایا۔ اس بندے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اس لئے فرمائی ہے تا کہ اس کی فضیلت کا اظہار ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کو بعض امورِ خاص کی بجا آوری پر متعین کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم اسے عطا کر رکھا ہے جو کتابی نہیں بلکہ سراسر اللہ تعالیٰ کی دین ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا معاملہ ان کے ساتھ خصوصی ہے۔ اس لئے یہاں پروردگار نے ان پر اپنی رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب وہاں پہنچے تو آپؑ نے دیکھا کہ ایک صاحب سفید چادر اوڑھے لیٹے ہوئے ہیں۔ آپؑ نے انہیں سلام کہا، انہوں نے چادر منہ سے ہٹائی، سلام کا جواب دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بتایا کہ میں موسیٰ ہوں۔ اس اللہ تعالیٰ کے بندے نے کہا، موسیٰ بنی اسرائیل۔ آپؑ نے کہا، ہاں۔ پھر پوچھا آپؑ نے کیسے جان لیا کہ میں موسیٰ بنی اسرائیل ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے بندے نے کہا کہ جس نے آپؑ کو میرے پاس بھیجا ہے اسی نے مجھے آپؑ کے متعلق بتایا ہے۔

عبد سے کیا مراد ہے؟

قرآن کریم نے یہاں اپنے جس بندے کا ذکر فرمایا ہے، اس بندے سے کیا مراد ہے؟ ہم نے اس رکوع کے آغاز میں حضرت اُبی ابن کعبؓ کی جو روایت اس واقعہ کے بارے میں جو نقل کی ہے اس میں واضح طور پر آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس بندے کو خضر کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی بات میں کوئی وزن نہیں جو اس سے حضرت الیاسؑ کو مراد لیتے ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ حدیث جو صحیح طور سے ہم تک پہنچی ہے، اس کی موجودگی میں کسی اور نام کو متعین کرنا سراسر بے دینی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت الیاسؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کئی سو سال بعد ہوئے ہیں۔ اولاً تو یہ بات محلِ نظر ہے کہ وہ زندہ ہیں اور اگر اسے مان بھی لیا جائے تو وہ اپنے پیدا ہونے سے پہلے تو زندہ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات بے معنی بات ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں یا نہیں

حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ آیا وہ نبی ہیں یا نہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ وہ نبی ہیں، رسول نہیں؟ ان پر وحی آتی ہے لیکن ان پر کوئی شریعت نازل نہیں ہوئی اور انسانوں کے کسی گروہ کی طرف ان کی بعثت نہیں ہوئی۔ جہاں تک ان کی نبوت کا تعلق ہے اس کی دلیل ان واقعات میں موجود ہے جس میں حضرت خضر علیہ السلام نے صاف طور پر فرمایا کہ میں نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا۔ جن میں بظاہر دو واقعات ایسے ہیں جو تمام مذاہب اور تمام شریعتوں کی اساس کے خلاف ہیں کیونکہ کسی شریعت میں کسی متنفس کی بغیر شرعی سبب کے جان نہیں لی جا سکتی اور کسی کی ملکیت میں کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔ آپؑ کا ایسے امور کو سرانجام دینا جس کا جواز کسی شریعت میں نہ ہو اور پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپؑ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔

Marfat.com

حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق کس مخلوق سے ہے

ایک بحث یہ بھی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام انسان ہیں یا آپ کا تعلق کسی اور مخلوق سے ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آپؑ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں یا کسی ایسی مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں جو تکلیفِ شرعی کی مکلف نہیں تو پھر وہ کوئی سا کام بھی کریں چاہے وہ شریعت کے مطابق ہو یا خلاف ان پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہیں اور کسی شریعت کے پابند نہیں۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے سفر کے واقعہ کو جب ہم دیکھتے ہیں تو نہ صرف یہ بات کہ قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ دو انسان ایک سفر پر اکٹھے جا رہے ہیں بلکہ بعض واقعات بھی ایسے پیش آئے ہیں جن سے ان کے انسان ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً جب وہ ایک گاؤں میں پہنچے اور گاؤں والوں سے کھانا مانگا تو انہوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس آیتِ کریمہ میں کھانا مانگنے کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے۔ اور اہلِ دہ کا مہمانی سے انکار دونوں سے متعلق ہے اور سب جانتے ہیں کہ فرشتے کھانے پینے سے مبرا ہیں، انہیں بھوک پیاس نہیں لگتی۔ لیکن حضرت خضر علیہ السلام کا کھانے کو مانگنا یہ واضح اشارہ ہے کہ آپؑ انسان تھے اور انسانی ضرورتیں رکھتے تھے۔ البتہ اس پر ایک سوال وارد ہوتا ہے کہ اگر وہ انسان ہیں تو وہ پھر وہ انسانوں کی طرف آنے والی شریعتوں کے بھی مکلف ہیں۔ ان کی زندگی اللہ تعالیٰ نے بہت طویل رکھی ہے تو یقیناً انہیں بہت سی شریعتوں سے واسطہ پڑا ہوگا اور اگر اب بھی وہ زندہ ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے تو آج وہ نبی کریم ﷺ کی شریعت کے پابند ہوں گے، لیکن ان کا کشتی کو داغدار کرنا اور ایک معصوم لڑکے کو قتل کر دینا یہ دونوں ایسے افعال ہیں جو کسی شریعت میں بھی جائز نہیں ہیں، تو آپؑ نے ان کا ارتکاب کیسے کیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ انسان تو ہیں لیکن انسانوں میں آپؑ کی ایک خاص حیثیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض تکوینی امور کی انجام دہی پر آپؑ کو لگا رکھا ہے۔ کسی کو ناحق مار دینا، کسی کو بیمار کر دینا، کسی کی کشتی خراب کر دینا یا کسی کو فائدہ پہنچانا، یہ تکوینی امور ہیں۔ ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ فرشتے بھی ایسے امور کو انجام دیتے ہیں تو وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اس لئے تکوینی امور سے متعلق ان پر وحی اترتی ہے اور وہ وحی کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق انسانوں کی اصلاح اور تشریعی معاملات سے ہے۔ آپؑ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں، آپؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے، اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو بہت سی خصوصیات سے نوازا۔ آپؑ رسول ہونے کی حیثیت سے حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہیں کیونکہ علمِ تشریع کو علمِ تکوین پر فضیلت حاصل ہے۔ البتہ آپؑ کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجنا اس مقصد کیلئے تھا کہ علم کی کئی شاخیں ہیں۔ ایک انسانی اصلاح اور بھلائی کا علم ہے جسے علمِ شریعت کہتے ہیں۔ اور ایک علمِ تکوین ہے جس کے مطابق دنیا کا نظام چلتا ہے۔ آپؑ کو اللہ تعالیٰ نے علمِ شریعت تو دیا ہے اور یہ سب سے افضل ہے لیکن آپؑ کو تکوینی معاملات کا علم نہیں بخشا، کیونکہ آپؑ کو اس کی ضرورت نہیں۔ اس کی ایک جھلک آپؑ کو اس لئے دکھائی گئی تاکہ آپؑ کو علم کی وسعت کا اندازہ ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ بعض دفعہ ظاہری حالات سے نتائج کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ہر طرح کے حالات میں صبر کا دامن تھامے رکھنا اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہنا اور ہر حال میں اسی کی رضا کا حصول ایک مومن کے ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝٦٦

Marfat.com

(حضرت موسیٰ نے حضرت خضر سے کہا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، اس شرط کے ساتھ کہ جو علم آپ کو عطا ہوا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیں۔ ٦٦)

حصولِ علم کیلئے ادب بہت ضروری ہے

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی بات جس پر توجہ دینا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی جلالتِ شان کے باوجود کس قدر ادب واحترام کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام سے علم کے حصول کی درخواست کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حصولِ علم اور استفادہ کیلئے ادب اور احترام بہت ضروری ہے۔ بالخصوص ایسا علم جس کا تعلق انسانی اصلاح سے ہو آدمی اس کی حقیقی معرفت سے کوسوں دور رہتا ہے جب تک کہ علم اور معلم کی قدر و منزلت کا حق نہ پہچانے اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی ایسا کمال جو اپنا احترام رکھتا ہو وہ اگر کسی اپنے سے کم درجہ شخص کے پاس بھی ہو اس کے حصول کی بھی کوشش کرنی چاہئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یقیناً حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہیں لیکن آپ ان سے اس علم کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر ان کو عطا فرمایا ہے۔

قَالَ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَکَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾
قَالَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا
تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓی اُحْدِثَ لَکَ مِنْهُ ذِکْرًا ﴿٧٠﴾

(حضرت خضر نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ٦٧) اور آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جس کی آپ کو پوری طرح خبر نہیں۔ ٦٨) آپ نے کہا ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے، میں کسی معاملے میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ ٦٩) حضرت خضر نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو کسی چیز کے متعلق مجھ سے اس وقت تک کچھ نہ پوچھئے جب تک میں خود ہی اس کا ذکر نہ چھیڑوں۔ ٧٠)

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے درمیان معاہدۂ رفاقت

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ مجھے آپ کو اپنے ساتھ رکھنے میں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ رہ نہیں سکیں گے اور پھر اس کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ آپ ان باتوں پر کیسے صبر کر سکیں گے جن کے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک صاحبِ شریعت رسول ہیں۔ میں جب کوئی ایسا کام کروں گا جو علمِ تکوین کے مطابق تو صحیح ہو لیکن علمِ شریعت کے خلاف ہو تو آپ رسول ہونے کی حیثیت سے یقیناً اسے برداشت نہیں کر پائیں گے اور ضرور مجھ پر اعتراض کریں گے اور جب معاملہ اعتراض تک پہنچ جائے یعنی شاگرد استاد پر اعتراض کرنے لگے تو پھر افادہ واستفادہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے تفسیر مظہری میں صوفیائے کرام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے اِنَّهٗ یَجِبُ عَلَی الْمُرِیْدِ تَرْکُ الْاِعْتِرَاضِ عَلَی الشَّیْخِ "مرید پر لازم ہے کہ اپنے شیخ پر اعتراض نہ کرے۔"

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ آپؑ مجھے ہر مرحلہ پر ان شاء اللہ صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپؑ کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اس وعدے پر ایک شرط کا اضافہ کیا اور آپؑ کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ شرط یہ تھی کہ میں جو کچھ بھی کروں وہ چاہے آپؑ کے نزدیک صحیح ہو یا غلط، آپؑ مجھ سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کریں جب تک کہ میں خود اس کا ذکر نہ چھیڑوں اور اس کی وضاحت نہ کروں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعدہ اس اعتماد پر کر لیا ہوگا کہ حضرت خضر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں وہ یقیناً کوئی ایسا کام تو نہیں کریں گے جو شریعت کی نگاہ میں حلال یا جائز نہ ہو، لیکن ان کا دھیان شاید اس طرف نہیں گیا کہ حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق تکوینی معاملات سے ہے جن کیلئے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام آتے ہیں، اس لئے شریعت سے ان کا استثنیٰ ہو جاتا ہے اور وہ مخصوص واقعات شرعی احکام سے مستثنیٰ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بے گناہ کا قتل ہر شریعت میں حرام ہے، لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے (جیسے آگے آ رہا ہے) ایک لڑکے کو قتل کر ڈالا تو شریعت کی نگاہ میں ان کا یہ فعلِ حرام کا ارتکاب تھا، لیکن چونکہ انہوں نے ایسا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا تھا تو یہ کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم نے اس لڑکے کے قتل کو قتلِ نفس کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ
اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ
اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ وَ
لَا تُرْهِقْنِىْ مِنْ اَمْرِىْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ
قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ
سَاَلْتُكَ عَنْ شَىْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِىْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ
لَّدُنِّىْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ
اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ
يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾ قَالَ

Marfat.com

هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ
عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ
فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ
غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا
طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ ﴿٨٠﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ
اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ
وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ
يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا
فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾ ع ط

رکوع: ۱۰۔ (پس وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو حضرت خضر نے اس کشتی میں شگاف کردیا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے شگاف کیا ہے کہ اہلِ کشتی کو غرق کردیں، یقیناً آپ نے بہت بُرا کام کیا ہے۔ ۷۱) حضرت خضر نے کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کرسکیں گے۔ ۷۲) موسیٰ علیہ السلام نے کہا میری بھول چوک پر مواخذہ نہ کیجئے اور میرے معاملہ میں زیادہ سخت گیری نہ فرمائیے۔ ۷۳) پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی تو حضرت خضر علیہ السلام نے اسے قتل ڈالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بول پڑے، آپؑ نے ایک معصوم جان کو کسی نفس کے بدلے کے بغیر قتل کرڈالا، یہ تو آپؑ نے بڑی ہی منکر بات کی۔ ۷۴) حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے آپؑ سے نہیں کہا تھا کہ آپؑ میرے ساتھ صبر نہیں کرسکیں گے۔ ۷۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اب اگر میں آپؑ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو آپؑ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا۔ آپؑ میری جانب سے حدِ عذر کو پہنچ گئے۔ ۷۶) پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب پہنچے ایک بستی والوں کے پاس تو ان سے کھانا کھلانے کی درخواست کی تو انہوں نے ان کی میزبانی سے صاف انکار کردیا، پھر ان دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی، تو حضرت خضر نے وہ دیوار کھڑی کردی،

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام نے کہا اگر آپ چاہتے اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ ۷۷) حضرت خضر نے کہا بس اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے، اب میں آپؑ کو ان باتوں کی حقیقت بتاؤں گا جن پر آپؑ صبر نہ کر سکے۔ ۷۸) رہی کشتی تو وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں (ملاحی کا) کام کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کردوں اور ان کے آگے ایک (جابر) بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی ضبط کر رہا تھا۔ ۷۹) اور رہا لڑکا تو اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بڑا ہو کر سرکشی اور ناشکری سے ان پر تعدی نہ کرے۔ ۸۰) پس ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کی جگہ بہتر بدلہ (اولاد) عطا فرمائے پاکیزہ نفسی میں اور وہ بڑھ کر ہو مروت و دردمندی میں۔ ۸۱) اور رہا دیوار کا معاملہ سو وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، آپ کے رب نے یہ چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکالیں، یہ تیرے رب کی عنایت سے ہوا اور یہ جو کچھ میں نے کیا اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت ان چیزوں کی جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔ ۸۲)

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾

(پس وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو حضرت خضر نے اس کشتی میں شگاف کر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے شگاف کیا ہے کہ اہلِ کشتی کو غرق کر دیں، یقیناً آپ نے بہت بُرا کام کیا ہے۔ ۷۱)

اِمْرًا ...... عجیب اور منکر کام کو کہتے ہیں۔ جب کوئی بُرا کام ہو جائے تو عرب کہتے ہیں اَمِرَ الْاَمْرُ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ عربی لغت میں اِمْرٌ کا معنی داھیۃ (خوفناک) ہے۔

کشتی کا واقعہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان جب قول و قرار ہو گیا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کر لیا کہ میں آپؑ کے کسی معاملے پر اعتراض نہیں کروں گا تو پھر دونوں ترتیبی سفر پر روانہ ہوئے چونکہ دونوں ساحلِ دریا پر تھے تو دریا کے پار جانے کے ارادے سے ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ کچھ آگے چل کر دریا ہی میں حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ توڑ ڈالا۔ شریعت کے اعتبار سے حضرت خضر علیہ السلام نے ایک ایسا کام کیا جو نہ صرف گناہ تھا بلکہ بدتر گناہ یا دہرا گناہ، ایک تو گناہ اس بات کا کہ کسی شخص کی مملوکہ کشتی کو بغیر کسی وجہ کے توڑ ڈالا جو کہ ایک جرم اور ظلم ہے اور دوسری یہ بات کہ اس سے سواریوں کے ڈوب جانے کا امکان پیدا کر دیا کیونکہ اگر اس شگاف سے پانی کشتی میں بھر گیا اور کشتی ڈوب گئی تو سواریاں بھی ساتھ ڈوبیں گی۔ اتنے بڑے گناہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا صاحب جلال پیغمبر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ آپؑ بھڑک اٹھے اور کہا یہ آپؑ نے کیا ظلم کیا؟ ایک تو آپؑ نے کشتی کو عیب دار بنایا اور دوسرا لوگوں کے ڈوبنے کا انتظام کر دیا حالانکہ انسان وہ ہے جو انسان کو بچاتا ہے اور اگر انسان انسانوں کو ڈبونے لگیں تو یہ دنیا تو درندوں کا بھٹ بن کر رہ جائے۔ ''جگر'' نے کیسی بات کہی:

Marfat.com

جب تک کہ غمِ انساں سے جگر انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دنیا لیکن جنت سے جہنم دور نہیں

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بولنا احقاقِ حق تھا جو آپؑ کی ذمہ داری تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ حال تھا کہ آپؑ حضرت خضر علیہ السلام سے وعدہ کر چکے تھے کہ میں آپؑ کے کسی کام پر اعتراض نہیں کروں گا۔ اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے کہا:

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾

(حضرت خضر نے کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ ۷۲) موسیٰ علیہ السلام نے کہا میری بھول چوک پر مواخذہ نہ کیجئے اور میرے معاملہ میں زیادہ سخت گیری نہ فرمایئے۔ ۷۳)

ارھاق کا مفہوم

ارھاق ...... کے معنی، کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا، کسی کو مبتلائے آفت کرنا۔ لَا تُرْهِقْنِيْ، قِيْلَ مَعْنَاهُ لَا تُكَلِّفْنِيْ مَشَقَّةً.

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کا جواب دینے کی بجائے صرف انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا اور اپنی بات یاد دلائی کہ میں نے پہلے ہی آپؑ سے کہا تھا کہ آپؑ میرے ساتھ سفر نہیں کر سکیں گے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معذرت چاہی اور آئندہ کیلئے محتاط ہونے کا یقین دلایا۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ آپؑ میرے معاملے میں سخت گیری سے کام نہ لیجئے بلکہ نرمی اختیار فرمایئے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰىٓ اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾

(پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی تو حضرت خضر علیہ السلام نے اسے قتل ڈالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بول پڑے، آپؑ نے ایک معصوم جان کو کسی نفس کے بدلے کے بغیر قتل کر ڈالا، یہ تو آپؑ نے بڑی ہی منکر بات کی۔ ۷۴)

لڑکے کے قتل کا واقعہ

گزشتہ واقعہ پر معافی تلافی کے بعد پھر دونوں بزرگ روانہ ہوئے تو راستے میں ایک لڑکا ملا، حضرت خضر علیہ السلام نے بغیر کسی وجہ کے اسے قتل کر ڈالا۔ ایک نابالغ اور بے گناہ کے قتل پر ایک پیغمبر کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھڑک اٹھے۔ کہنے لگے یہ آپؑ نے کیا کر ڈالا؟ ایک نابالغ اور معصوم بچے کو جس نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا آپؑ نے کس جرم میں قتل کر دیا، یہ تو آپؑ نے بہت نازیبا حرکت کی۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٥﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ

Marfat.com

بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾

(حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ ۷۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اب اگر میں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیئے گا۔ آپ میری جانب سے حدِ عذر کو پہنچ گئے۔ ۷۶)

حضرت خضر علیہ السلام نے ان کو پھر اپنی بات یاد دلائی کہ کیا میں نے آپ سے پہلے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔ حضرت موسیٰ نے پھر معافی مانگی اور کہا کہ اب اگر اس کے بعد میں آپ سے کوئی سوال کروں تو آپ کو حق ہوگا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ پھر آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾

(پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب پہنچے ایک بستی والوں کے پاس تو ان سے کھانا کھلانے کی درخواست کی تو انہوں نے ان کی میزبانی سے صاف انکار کر دیا، پھر ان دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی، تو حضرت خضر نے وہ دیوار کھڑی کر دی، موسیٰ علیہ السلام نے کہا اگر آپ چاہتے اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ ۷۷)

بستی والوں کا واقعہ

پھر وہ آگے چلے، چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچے، بھوک لگی ہوئی تھی، بستی والوں سے کچھ کھلانے کیلئے کہا۔ اچھے لوگ تو ہمیشہ مہمانوں کے کہے بغیر کھانا پیش کرنے کو سعادت سمجھتے ہیں لیکن وہ ایسے خسیس لوگ تھے کہ انہوں نے ان دونوں بزرگوں کے کھانا مانگنے پر بھی کھانا دینے سے انکار کر دیا۔ بجائے اس کے کہ یہ دونوں بزرگ اس بستی والوں پر برہمی کا اظہار کرتے بستی میں انہوں نے ایک دیوار کو دیکھا کہ جو گرا چاہتی ہے تو حضرت خضر نے محنت کے ساتھ بغیر اجرت لئے اس دیوار کو سیدھا کر دیا اور اس بات کی قطعاً پرواہ نہ کی کہ بستی والوں نے ہم سے کیا سلوک کیا تھا اور میں ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت میں چونکہ جلال تھا ان سے نہ رہا گیا، انہوں نے کہا کہ آپ بھی خوب آدمی ہیں کہ انہوں نے تو ہمیں کھانا تک دینا گوارا نہ کیا اور آپ نے ان کی دیوار بغیر کسی مزدوری لئے مرمت کر دی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ ان سے اس محنت کی مزدوری طے کر لیتے تا کہ ہم خرید کر کھانا تو کھا سکتے۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

(حضرت خضر نے کہا بس اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے، اب میں آپ کو ان باتوں کی حقیقت بتاؤں گا جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔ ۷۸)

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سنی تو کہا کہ جناب حجت تمام ہو چکی۔ آپ نے مجھے حق دیا تھا کہ اگر آپ میری کسی بات پر اب کوئی سوال کریں تو میں اپنی مصاحبت سے الگ کر دوں۔ چنانچہ اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اب ہماری

Marfat.com

جدائی کا وقت آ گیا ہے اور اب میں آپؑ کو ان اسرارِ تکوینیہ سے آگاہ کرتا ہوں جن پر آپؑ سکوت اختیار نہ کر سکے، پھر آپؑ نے یکے بعد دیگرے تمام واقعات کی حقیقت آپؑ کے سامنے کھول دی۔

اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ یَّاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

(رہی کشتی تو وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں (ملاحی کا) کام کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں اور ان کے آگے ایک (جابر) بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی ضبط کر رہا تھا۔ ۷۹)

کشتی کے توڑنے کی حکمت

یعنی میں نے اس کشتی کو اس لئے توڑا تا کہ وہ ہر دیکھنے والے کی نظر میں ایک نا کارہ کشتی معلوم ہو اور یہ میں نے اس لئے کیا کہ آگے جا کے انہیں ایک ایسے ظالم حکمران سے واسطہ پڑنے والا تھا جو ہر کارآمد کشتی کو زبردستی چھین رہا تھا۔ میں نے اس لئے اسے عیب دار بنایا کہ جب وہ اسے دیکھے گا تو نا کارہ سمجھ کر چھوڑ دے گا، تو بظاہر میرا یہ فعل ظلم اور حق تلفی تھی لیکن حقیقت میں ایک بڑے ظلم سے بچانے کی کوشش تھی۔

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَیْنِ فَخَشِیْنَاۤ اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾

(اور رہا لڑکا تو اس کے ماں باپ صاحبِ ایمان تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بڑا ہو کر سرکشی اور ناشکری سے ان پر تعدی نہ کرے۔ ۸۰) پس ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کی جگہ بہتر بدلہ (اولاد) عطا فرمائے پاکیزہ نفسی میں اور وہ بڑھ کر ہو مروت و دردمندی میں۔ ۸۱)

زَكٰوة ...... کا معنی ہے طبیعت اور اخلاق کی پاکیزگی یعنی پاکیزہ نفسی۔

رُحْم ...... کا معنی ہے رقتِ قلب، ہمدردی اور محبت و شفقت۔

لڑکے کے قتل کی حکمت

حضرت خضر علیہ السلام نے ایک لڑکا قتل کر دیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر برہم ہو گئے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لڑکے کے قتل کی حکمت یہ تھی کہ اس کے ماں باپ مومن تھے، یعنی ایسے صاحبِ ایمان جن کی زندگی ایمان کا پیکر تھی اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر سرکشی اور ناشکری سے اپنے ماں باپ کو مبتلائے اذیت کرے گا اور ایک فتنہ بن جائے گا اور اس کی محبت ماں باپ کیلئے ایک آزمائش بن جائے گی۔ ہم نے ارادہ کیا کہ اسے واپس لے لیں یعنی اس کی زندگی ہماری دین ہے، اسے

Marfat.com

واپس لے کر ہم اس کے بدلے میں ایک ایسی بہتر اولاد دیں جو اعمال و اخلاق میں بھی پاکیزہ ہو اور ماں باپ کے حقوق بھی احسن طریقہ سے ادا کرے۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر سرکش نکلے گا تو پھر اس کو بڑا نہ ہونے دینا یہ تو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے علم کو ناتمام کرنے کی ایک کوشش ہے، لیکن یہ محض غلط فہمی ہے اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ اگر یہ بڑا ہو گا تو سرکش ہو گا لیکن ماں باپ کی فرمانبرداری اور سعادت مندی نے اللہ تعالیٰ سے یہ انعام حاصل کر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بیٹے کو ان کیلئے آزمائش بننے سے پہلے اٹھالیا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ والدین کو چونکہ اس بچے سے محبت تھی اس لئے اس کا قتل کیا جانا یقیناً ان کیلئے ایک بڑے صدمے کی بات تھی تو کیا ان کے ایمان کا یہ صلہ تھا کہ انہیں ایسا سخت صدمہ پہنچایا جاتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ اہلِ ایمان کو کسی تکلیف میں اس لئے مبتلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ اس پر صبر کر کے اپنے لئے جنت میں کوئی بڑا مقام پیدا کر لیں۔ ان کیلئے اس سے بڑا مقام اور کیا ہو گا کہ انہیں اس کے بدلے میں بہتر اولاد بھی دی گئی اور قیامت تک کیلئے ان کے ذکر کو دوام بھی بخش دیا گیا جس کا نتیجہ یقیناً یہ ہو گا کہ وہ قیامت کے دن کسی بڑے مقام سے نوازے جائیں گے۔

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے بروایت عطیہ نقل کیا ہے کہ مقتول لڑکے کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں ایک لڑکی عطا فرمائی جس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوا۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت یہ ہے کہ اس کے بطن سے دو نبی پیدا ہوئے اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی امت کو ہدایت فرمائی۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۸۲

(اور رہا دیوار کا معاملہ سو وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، آپ کے رب نے یہ چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکالیں، یہ تیرے رب کی عنایت سے ہوا اور یہ جو کچھ میں نے کیا اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت ان چیزوں کی جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔ ۸۲)

دیوار کی مرمت کی حکمت

وہ خسیس لوگ جنہوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی میزبانی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور حضرت خضر علیہ السلام نے بجائے ناراض ہونے کے اس بستی کی ایک گرتی ہوئی دیوار کو مرمت کر کے سیدھا کر دیا تھا تو اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ آپ ان سے اجرت طے کر لیتے تو ہمارے کام آتی۔ اب اس کی حقیقت بیان کی جا رہی ہے۔ یہ دیوار دراصل دو یتیموں کی تھی ان کے باپ نے جو ایک صالح آدمی تھے اس کے نیچے ان کیلئے ڈھیروں مال یا سونے کا کوئی حصہ جسے خزانہ کہا گیا ہے دفن کر رکھا تھا تاکہ اس کی موت کی صورت میں یہ یتیمی کے دھکے نہ کھاتے پھریں بلکہ بڑے ہو کر یہ خزانہ نکالیں اور اطمینان کی زندگی گزاریں۔

بچے ابھی چھوٹے تھے کہ دیوار گرنے کے قریب ہو گئی۔ اب اگر گر جاتی تو وہ خسیس لوگ جو دو بزرگوں کو کھانا دینے کے روادار

Marfat.com

نہ تھے یقیناً یہ خزانہ ہڑپ کر جاتے اور وہ یتیم اس سے محروم ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے صالح باپ کی نیکی کی لاج رکھی اور ان کا خزانہ تباہ ہونے سے محفوظ کر دیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا سراسر فضل و کرم تھا جو اس صالح آدمی کی نیکی کی وجہ سے تھا اس بستی والوں کی وجہ سے نہیں تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس پر نصیحت کے مندرجہ ذیل کلمات لکھے ہوئے تھے۔ یہ روایت حضرت عثمان ابن عفان نے مرفوعاً نبی کریم ﷺ سے نقل فرمائی ہے۔ (قرطبی)

1- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2- تعجب ہے اس شخص پر جو اس پر ایمان رکھتا ہے کہ رزق کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے پھر ضرورت سے زیادہ مشقت اور فضول قسم کی کوشش میں کیوں لگتا ہے۔

3- تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے، پھر غمگین کیونکر ہوتا ہے۔

4- تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر ایمان رکھتا ہے پھر خوش و خرم کیسے رہتا ہے؟

5- تعجب ہے اس شخص پر جو حساب آخرت پر ایمان رکھتا ہے پھر غفلت کیسے برتتا ہے؟

6- تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا کو اور اس کے انقلابات کو جانتا ہے پھر کیسے اس پر مطمئن ہو کر بیٹھتا ہے؟

7- لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض دفعہ والدین کی نیکی کا فائدہ اولاد کو پہنچاتے ہیں بلکہ بعض واقعات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی نیک بندے اور ولی اللہ کا وجود پورے علاقے اور شہر کیلئے رحمت کا باعث ہوتا ہے۔ قرطبی میں ہے کہ حضرت شبلی فرمایا کرتے تھے کہ میں اس شہر اور پورے علاقے کیلئے امان ہوں۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو ان کے دفن ہوتے ہی کفار ویلم نے دریائے دجلہ کو عبور کر کے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت لوگوں کی زبان پر یہ تھا کہ ہم پر دوہری مصیبت آئی ہے یعنی شبلی کی وفات اور ویلم کا قبضہ۔ (قرطبی ص ۲۹، ج ۱۱)

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک اشکال کا حل کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں تین واقعات سے متعلق حضرت خضر علیہ السلام نے جو حکمتیں بیان فرمائی ہیں ان میں اسلوب بیان کا ایک اشکال ذہن کو پریشان کرتا ہے، وہ یہ کہ حضرت خضر علیہ السلام نے اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا۔ آپ کی اس وضاحت سے مطابقت رکھنے والا اسلوب صرف ایک ہی ہوسکتا ہے کہ آپ نے جو بھی ان واقعات میں کیا اس کی نسبت پروردگار کی طرف کی جائے، جس طرح ایک واقعہ میں آپ نے یہ کہا فَاَرَادَ رَبُّکَ "یعنی تیرے رب نے یہ چاہا" لیکن ہم ان واقعات کی حکمتوں کے ضمن میں حضرت خضر علیہ السلام کو اس اسلوب کی پابندی کرتا ہوا نہیں دیکھتے۔ مثلاً انہوں نے جب کشتی کو عیب دار کرنے کا ذکر کیا تو فرمایا فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَھَا "میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں" اس میں آپؑ نے کشتی توڑنے کی نسبت اپنی طرف کی، لیکن جب آپؑ نے لڑکے کو قتل کرنے کا ذکر کیا اور اس کی حکمت بیان فرمائی تو آپؑ نے فرمایا فَخَشِیْنَا یعنی ہمیں اندیشہ ہوا اور مزید فرمایا فَاَرَدْنَا پس ہم نے ارادہ کیا اور جب حضرت خضر علیہ السلام نے دیوار کو سیدھا کرنے کی حکمت بیان فرمائی تو کہا فَاَرَادَ رَبُّکَ پس تیرے رب نے ارادہ کیا۔ اسلوب بیان کا یہ تفاوت یقیناً ذہنوں میں خلجان پیدا کرتا ہے کہ آخر اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟

اس خلجان کو دور کرنے کے سلسلے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں بالخصوص نبیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے

Marfat.com

ارادوں اور اللہ تعالیٰ کے ارادوں میں کامل یکسانی ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کی نفی کر کے اور اپنی خواہشات اور ارادوں کو مٹا کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ارادوں میں فنا کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں ان کا ہر کام اللہ تعالیٰ کا کام ہوتا ہے کیونکہ اس کا حکم اور اس کی رضا اس کے پس منظر میں ہوتی ہے۔ اس میں دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کے بندے کے ہاتھ سے وجود پذیر ہے آیا اس کا تعلق خیر سے ہے یا شر سے، نفع سے ہے یا ضرر سے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان سب کا خالق حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، لیکن شر اور ضرر میں چونکہ تکدر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے بندے چونکہ سرتاپا ادب اور عرفان ہوتے ہیں وہ کبھی شر یا ضرر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کرتے۔ بجز اس کے کہ کوئی شرعی مصلحت اس کا تقاضا کر رہی ہو۔ جس طرح ہم جانتے ہیں کہ مرض اور صحت دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ شفا بھی وہی دیتا ہے اور بیمار بھی وہی کرتا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ نے جب ان کا ذکر فرمایا تو یہ کہا وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔'' بیماری میں چونکہ ایک بدنمائی ہے اس لئے اس کی نسبت اپنی طرف کی اور شفا میں خوبصورتی اور خوشی ہے تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی۔ اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے جب کشتی کی شکست کا ذکر کیا تو چونکہ اس میں ایک بدنمائی تھی اس لئے اس کی نسبت اپنی طرف کی حالانکہ اسے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؑ نے انجام دیا تھا۔ لیکن جب آپؑ نے دیوار کو یتیموں کا دفینہ بچانے کیلئے سیدھا کیا تو چونکہ یہ کام ہر لحاظ سے خوشنما اور احسن تھا اس لئے اس کی نسبت پروردگار کی طرف کی۔ لیکن جب لڑکے کے قتل کا ذکر ہوا تو اس کے دو پہلو تھے وہ اس پہلو سے تو خیر تھا کہ اس کے قتل کے نتیجہ میں والدین کے ایمان کی سلامتی تھی اور اس کے بدلے میں ان کو ایسی اولاد ملنے والی تھی جن سے بہت بڑا خیر ظہور پذیر ہونے والا تھا لیکن قتلِ غلام فی نفسہ شر تھا تو اس میں پہلی بات تو یہ فرمائی کہ ہمیں اندیشہ ہوا حالانکہ اندیشہ حضرت خضر کو تو ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کو اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کا کوئی کام بھی یقین سے خالی نہیں ہوتا۔ اندیشہ ہونا سراسر اجتہادی صفت ہے۔ لیکن اس کے پس منظر میں چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو وحی کے ذریعہ آپؑ تک پہنچا ہے اور آپؑ کا اندیشہ اسی حکم کی مصلحت کو سلجھانے کی ایک کوشش ہے اس لئے اس میں جمع کا صیغہ استعمال کیا تا کہ حکم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف رہے اور اندیشہ کی نسبت اپنی طرف اور پھر اَرَدْنَا کا لفظ استعمال فرمایا کہ قتلِ غلام کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والا خیر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ایک معصوم بچے کی جان لینا بظاہر ایک شر ہے۔ اس لئے اس کی نسبت حضرت خضر علیہ السلام نے اپنی طرف کرتے ہوئے اَرَدْنَا کا لفظ استعمال کیا۔ اگر ان گزارشات کی طرف توجہ دی جائے تو امید ہے کہ اسلوب کا خلجان دور ہو جائے گا۔ علامہ بدرالدین الزرکشی نے قریب قریب اسی توجیہ کو پسند فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

لما اراد ذکر العیب للسفینة نسبه لنفسه ادبا مع الربوبية فقال اردت ولما كان قتل الغلام مشترك الحكم بين المحمود والمذموم استتبع نفسه مع الحق فقال في الاخبار بنون الاستتباع ليكون المحمود من الفعل وهو راحة ابويه المومنين من كفره، عائدا على الحق سبحنه والمذموم ظاهرا وهو قتل الغلام بغير حق، عائدا اليه، وفي اقامة الجدار كان خيرا محضا فنسبه للحق.

(البرهان في علوم القرآن الزركشي جلد ۴ ص ۶۰)

اہل علم میں حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اور موت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ صاحب معارف القرآن نے اس پر جو لکھا ہے ہم اسے نقل کرتے ہیں۔

Marfat.com

حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا ان کی وفات ہو چکی ہے

قرآن کریم میں جو واقعہ حضرت خضر علیہ السلام کا مذکور ہے اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اس واقعہ کے بعد وفات پا گئے یا زندہ رہے، اسی لئے قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی صریح بات مذکور نہیں۔ بعض روایات و آثار سے ان کا اب تک زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ بعض روایات سے اس کے خلاف مستفاد ہوتا ہے، اسی لئے اس معاملے میں ہمیشہ سے علماء کی رائیں مختلف رہی ہیں، جو حضرات ان کی حیات کے قائل ہیں ان کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو ایک شخص سیاہ سفید داڑھی والے داخل ہوئے اور لوگوں کے مجمع کو چیرتے پھاڑتے اندر پہنچے اور رونے لگے، پھر صحابہ کرامؓ کی طرف متوجہ ہو کر یہ کلمات کہے:۔

اِنَّ فِی اللّٰهِ عَزَاءً مِّنْ كُلِّ مُصِيْبَةٍ وَعِوَضًا مِّنْ كُلِّ فَائِتٍ وَخَلَفًا مِّنْ كُلِّ هَالِكٍ فَاِلَى اللّٰهِ فَاَنِيْبُوْا وَاِلَيْهِ فَارْغَبُوْا فَاِنَّمَا الْمَحْرُوْمُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ،

"اللہ کی بارگاہ میں صبر ہے ہر مصیبت سے اور بدلا ہے ہر فوت ہونے والی چیز کا، اور وہی قائم مقام ہے ہر ہلاک ہونے والے کا اس لئے اسی کی طرف رجوع کرو اسی کی طرف رغبت کرو کیونکہ محروم وہ شخص ہے جو مصیبت کے ثواب سے محروم ہو جائے۔"

یہ آنے والے کلمات مذکورہ کہہ کر رخصت ہو گئے تو حضرت ابوبکر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے، اس روایت کو جزریؒ نے حصن حصین میں بھی نقل کیا ہے جن کی شرط یہ ہے کہ صرف صحیح السند روایات اس میں درج کرتے ہیں،

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ دجال مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ تک پہنچے گا تو مدینہ سے ایک شخص اس کے مقابلہ کیلئے نکلے گا، جو اس زمانے کے سب انسانوں میں بہتر ہوگا، یا بہتر لوگوں میں سے ہوگا، ابو اسحاق نے فرمایا کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔ (قرطبی)

اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الہواتف میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تو حضرت خضر علیہ السلام نے ان کو ایک دعا بتلائی کہ جو اس کو ہر نماز کے بعد پڑھا کرے اس کیلئے ثواب عظیم اور مغفرت ورحمت ہے۔ وہ دعا یہ ہے:۔

يَا مَنْ لَا يَشْغَلُهٗ سَمْعٌ عَنْ سَمْعٍ وَيَا مَنْ لَا تُغْلِطُهُ الْمَسَائِلُ وَيَا مَنْ لَا يَتَبَرَّمُ مِنْ اِلْحَاحِ الْمُلِحِّيْنَ اَذِقْنِيْ بَرْدَ عَفْوِكَ وَحَلَاوَةَ مَغْفِرَتِكَ،

(قرطبی)

"اے وہ ذات جس کو ایک کلام کا سننا دوسرے کلام کے سننے سے مانع نہیں ہوتا اور اے وہ ذات جس کو بیک وقت ہونے والے (لاکھوں کروڑوں) سوالات میں کوئی مغالطہ نہیں لگتا اور وہ ذات جو دعا میں الحاح واصرار کرنے اور بار بار کہنے سے

Marfat.com

ملول نہیں ہوتا، مجھے اپنے عفو وکرم کا ذائقہ چکھا دیجئے اور اپنی مغفرت کی حلاوت نصیب فرمائیے۔"

اور پھر اسی کتاب میں بعینہٖ یہی واقعہ اور یہی دعا اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا واقعہ حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ (قرطبی)

اسی طرح اولیاء امت میں حضرت خضر علیہ السلام کے بے شمار واقعات منقول ہیں،

اور جو حضرات خضر علیہ السلام کی حیات کو تسلیم نہیں کرتے ان کا بڑا استدلال اس حدیث سے ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے ہمیں عشاء کی نماز اپنی آخرِ حیات میں پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپ کھڑے ہوگئے اور یہ کلمات ارشاد فرمائے:۔

اَرَاَیْتَکُمْ لَیْلَتَکُمْ هٰذِهٖ فَاِنَّ عَلٰی رَاْسِ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا یَبْقٰی مِمَّنْ هُوَ اَعَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ اَحَدٌ، "کیا تم اپنی آج کی رات کو دیکھ رہے ہو، اس رات سے سو سال گزرنے پر کوئی شخص ان میں سے زندہ نہ ہوگا جو آج زمین کے اوپر ہے۔"

حضرت ابن عمرؓ نے یہ روایت نقل کرکے فرمایا کہ اس روایت کے بارے میں لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں مگر رسول اللہ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ سو سال پر یہ قرن ختم ہوجائے گا،

یہ روایت مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے بھی تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ منقول ہے، لیکن علامہ قرطبیؒ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کیلئے کوئی حجت نہیں جو حیاتِ حضرت خضر علیہ السلام کو باطل کہتے ہیں کیونکہ اس روایت میں اگرچہ تمام بنی آدم کیلئے عموم کے الفاظ ہیں اور عموم بھی مؤکد کرکے لایا گیا ہے، مگر پھر بھی اس میں نص نہیں کہ یہ عموم تمام اولادِ آدم علیہ السلام کو شامل ہی ہو کیونکہ اولادِ آدم میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں جن کی نہ وفات ہوئی اور نہ قتل کیے گئے، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ عَلَی الْاَرْضِ میں الف لام عہد کا ہے اور مراد ارض سے ارضِ عرب ہے، پوری زمین جس میں ارض یاجوج وماجوج اور بلاد شرق اور جزائر جن کا نام بھی عربوں نے نہیں سنا اس میں شامل نہیں، یہ علامہ قرطبی کی تحقیق ہے۔

اسی طرح بعض حضرات نے مسئلہ ختم نبوت کو حیاتِ خضر کے منافی سمجھا ہے، اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ختمِ نبوت کے منافی نہیں حضرت خضر علیہ السلام کی حیات بھی ایسی ہی ہوسکتی ہے۔

بعض حضرات نے حیاتِ خضر پر یہ شبہ کیا ہے کہ اگر وہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں موجود ہوتے تو ان پر لازم تھا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپؐ کے تابع ہوکر اسلامی خدمات میں مشغول ہوتے،

کیونکہ حدیث میں ارشاد ہے: لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ "یعنی اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا (کیونکہ میرے آنے سے دین موسوی منسوخ ہوچکا ہے)۔ لیکن یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اور ان کی نبوت عام انبیاء شریعت سے مختلف ہو، ان کو چونکہ تکوینی خدمات منجانب اللہ سپرد ہیں وہ ان کیلئے مخلوق سے الگ تھلگ اپنے کام پر مامور ہیں، رہا اتباع شریعت محمدیہ تو اس میں کوئی بعد نہیں کہ

Marfat.com

حضور نبی کریم ﷺ کی نبوت کے بعد سے انہوں نے اپنا عمل شریعتِ محمدیہؐ پر شروع کر دیا ہو، واللہ اعلم۔

ابوحیان نے تفسیر بحرِ محیط میں متعدد بزرگوں کے واقعات حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بھی نقل کئے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ:۔

وَالْجُمْهُوْرُ عَلٰى اَنَّهٗ مَاتَ ،

(بحر محیط، ص ۱۴۷ ج ۶)

''جمہور علماء اس پر ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی وفات ہوگئی۔''

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ تمام اشکالات کا حل اس میں ہے جو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکاشفہ سے فرمایا وہ یہ کہ میں نے خود حضرت خضر علیہ السلام سے اس معاملہ کو عالمِ کشف میں دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ میں اور حضرت الیاس علیہ السلام ہم دونوں زندہ نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی موت وحیات سے ہمارا کوئی اعتقادی یا عملی مسئلہ متعلق نہیں، اسی لئے قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت ووضاحت نہیں کی گئی، اس لئے اس میں زیادہ بحث وتحیص کی بھی ضرورت نہیں، نہ کسی ایک جانب کا یقین رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ مسئلہ عوام میں چلا ہوا ہے اس لئے مذکورہ صدر تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ ۸۳
اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ۸۴ فَاَتْبَعَ
سَبَبًا ۸۵ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِىْ
عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ
اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۸۶ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ
فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۸۷ وَاَمَّا
مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ

Marfat.com

مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ
وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾
كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى
اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ
يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ
مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ
تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ
بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى
اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ
قَالَ اٰتُوْنِىْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ
مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ ۚ فَاِذَا جَآءَ
وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا ﴿۹۸﴾ وَتَرَكْنَا
بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِىْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ
جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ
كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِىْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِىْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

Marfat.com

رکوع: ۱۱۔ (وہ آپؐ سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپؐ کہہ دیجئے میں ابھی تمہارے سامنے اس کا حال بیان کروں گا۔ ۸۳) ہم نے اس کو زمین میں بڑا اقتدار بخشا تھا اور ہم نے اسے ہر چیز (تک رسائی حاصل کرنے) کا ساز و سامان دیا تھا۔ ۸۴) پس وہ درپے ہوا اسباب و وسائل کے۔ ۸۵) یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کے مقام تک پہنچا تو اس نے سورج کو پایا کہ گویا وہ ایک سیاہ چشمے میں ڈوب رہا ہے اور وہاں اس نے ایک قوم پائی، ہم نے کہا اے ذوالقرنین چاہو ان کو سزا دو، چاہو ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو۔ ۸۶) ذوالقرنین نے کہا جو ان میں سے ظلم کا مرتکب ہوگا ہم اس کو سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے سخت ترین عذاب دے گا۔ ۸۷) اور جو ان میں سے ایمان لائے گا اور عملِ صالح اختیار کرے گا تو اس کیلئے اللہ کے پاس بھی اچھا بدلہ ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔ ۸۸) پھر اس نے ایک اور مہم کی تیاری کی۔ ۸۹) یہاں تک کہ جب وہ طلوعِ آفتاب کے مقام پر پہنچا تو اس نے سورج کو پایا ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے ہوئے جس کیلئے دھوپ سے بچنے کیلئے کوئی آڑ ہم نے نہیں بنائی تھی۔ ۹۰) ایسا ہی ہم نے کیا اور ہم اس کے احوال سے خوب باخبر تھے۔ ۹۱) پھر وہ ایک اور راہ پر روانہ ہوا۔ ۹۲) یہاں تک کہ دو پہاڑوں کے درمیان کے درے تک جا پہنچا تو اس نے دونوں پہاڑوں کے پیچھے ایک ایسی قوم کو پایا جو کوئی بات سمجھ نہیں سکتے تھے۔ ۹۳) انہوں نے درخواست کی کہ اے ذوالقرنین یاجوج و ماجوج ہمارے ملک میں فساد مچاتے رہتے ہیں تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم مقرر کردیں آپ کیلئے کچھ خراج تاکہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردیں۔ ۹۴) اس نے جواب دیا وہ دولت جس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہتر (کافی) ہے، پس تم جسمانی مشقت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک اوٹ کھڑی کیئے دیتا ہوں۔ ۹۵) میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ، یہاں تک کہ بیچ کے خلاء کو بھر دیا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا تو اس نے حکم دیا کہ اس کو خوب دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو آگ کردیا تو اس نے کہا کہ اب تانبا لاؤ اور اس پر انڈیل دو۔ ۹۶) سو یاجوج ماجوج بڑی کوشش کے باوجود اسے سر نہ کرسکے اور نہ ہی اس میں سوراخ کرسکے۔ ۹۷) اس نے کہا یہ میرے رب کا فضل ہے اور جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا وہ اسے ریزہ ریزہ کردے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہوا کرتا ہے۔ ۹۸) اور ہم واگزار کردیں گے بعض کو اس دن وہ تند موجوں کی طرح دوسروں سے ٹکرائیں گے اور صور پھونکا جائے گا پس ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے۔ ۹۹) ہم اس دن جہنم کو کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔ ۱۰۰) جن کی آنکھوں پر میری یاد سے پردہ پڑا رہا اور وہ کلمۂ حق سننے کی تاب نہیں لاتے تھے۔ ۱۰۱)

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ط قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾

(وہ آپؐ سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے میں ابھی تمہارے سامنے اس کا حال بیان کروں

Marfat.com

گا۔ ۸۳)

یہود کی انگیخت پر قریش کا سوال

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ قریش نے یہود کی انگیخت پر آنحضرت ﷺ سے کچھ سوالات کئے تھے، وہ سوالات ایسے تھے جن کا عرب دنیا سے دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ یہود نے قریش کی معرفت یہ چاہا تھا کہ چونکہ ان سوالات کا جواب محمد (ﷺ) دے نہیں پائیں گے تو قریش کو یقین ہو جائے گا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے نبی نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی آپؐ پر ایمان لانے میں متردد ہیں۔ اس سے ان کا تردد یقینی انکار میں بدل جائے گا۔ اس طرح سے آنحضرت ﷺ کی دعوت اپنا اثر کھو بیٹھے گی۔ آپؐ نے نہ صرف ان کے سوالوں کو سنا بلکہ ان کے ایک ایک سوال کا جواب دیا۔ یہ آخری سوال ہے جس کا نہایت حتمی انداز میں قرآنِ کریم نے جواب دینے کا آغاز فرمایا ہے اور قرآن چونکہ آپؐ کی زبان سے ادا ہوتا تھا تو یوں کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ قریش کے سامنے یہ واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔

ذوالقرنین کون ہے؟

اس واقعہ کا مرکزی کردار چونکہ ذوالقرنین ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ ذوالقرنین کون تھے؟ ہمارے مفسرین نے ان کے شخصی تعین میں اختلاف کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے تاریخی اور شخصی لحاظ سے ان کا تعین نہیں فرمایا اور یہود نے بھی قریش کے واسطے سے اس تعین پر اصرار نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اسے جانتے تھے بلکہ جس طرح ہم واقعہ معراج کے تاریخی حقائق کے ضمن میں یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ ایک بادشاہ نے بخت نصر کے مظالم سے یہود کو نجات دی تھی۔ دوبارہ انہیں یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت دی تھی، پھر اسی کی اجازت سے ہیکلِ سلیمانی از سرِ نو تعمیر ہوا تھا اور حضرت عزیر علیہ السلام کی پیغمبرانہ کاوش سے از سرِ نو تورات کو مدوّن کیا گیا تھا۔ وہ اس بادشاہ کو سائرس کے نام سے جانتے اور اس کو اپنا محسن سمجھتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جب اس کی علامتیں بیان کر دیں اور تاریخی کارناموں کی طرف اشارے کر دیئے تو وہ اس سے مطمئن ہو گئے اور مزید سوال کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔

ہمارے گمان میں یہود کو تو اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن مؤرخین نے اور انہیں کے زیر اثر بعض مفسرین نے ذوالقرنین کے مصداق کے حوالے سے مختلف حکمرانوں کے نام دیئے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سکندر رومی ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم کی صراحتوں کو دیکھتے ہوئے سکندر کا تو وہم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قرآنِ کریم ذوالقرنین کے حوالے سے جس حکمران کا ذکر کر رہا ہے وہ سچا مومن، عادل اور رعایا پرور ہے۔ اور سکندر میں تو ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ وہ یونان کا باشندہ تھا اور باقی اہلِ یونان کی طرح وہ بھی بُت پرست تھا۔ اور جہاں تک عدل اور رعایا پروری کا تعلق ہے اس کا اندازہ تو اس سے ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے معصوم سوتیلے بھائی کا قاتل تھا اور بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اپنے باپ کے قتل میں بھی وہ شریک تھا اور رعایا پر اس کے مظالم کی داستانیں تو کوئی چھپی ہوئی باتیں نہیں ہیں۔ اس لئے اسے ذوالقرنین قرار دینا تو بہت بڑی جسارت ہے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ سکندر کی فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا جتنا وسیع قرآن نے ذوالقرنین کی فتوحات کا بیان کیا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ تاریخ سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے ذوالقرنین کے نام سے یاد کیا جاتا ہو۔ بعض لوگوں نے ذوالقرنین سے دارا مراد لیا ہے اور اس کی بعض مشرقی اور مغربی مہمات کو دلیل کے طور پر پیش کیا حالانکہ اس راہ میں اس کی حیثیت پیشرو کی نہیں

Marfat.com

بلکہ وہ درحقیقت سائرس کی ہی قائم کردہ ریاست کو مستحکم کرنے والا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق

ذوالقرنین کے حوالے سے جس عظیم حکمران کی طرف تاریخ واضح اشارہ کرتی ہے وہ کیخسرو ہے جسے خورس یا سائرس بھی کہا جاتا ہے۔ اس پر ہم کچھ کہنے کی بجائے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق، ان کی تفسیر ترجمان القرآن سے بحوالہ ضیاء القرآن نقل کر رہے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا قدیم کتابوں میں ذوالقرنین کا لفظ کہیں استعمال ہوا ہے اور اگر ہوا ہے تو ان کے نزدیک اس سے مراد کون ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہے کہ اس ذوالقرنین میں وہ صفات پائی جاتی ہیں جو قرآنِ کریم نے ذکر کی ہیں اور کیا وہ کارنامے اس سے صادر ہوئے جنہیں قرآن نے اس کی طرف منسوب کیا ہے جیسے کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہ سوال یہود کی طرف سے اہل مکہ کو سکھایا گیا تھا کہ وہ حضورؐ سے پوچھیں کہ ذوالقرنین کون ہے؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص یہود کے نزدیک اس لقب سے معروف تھا۔ اس کے متعلق ہمیں حضرت دانیال علیہ السلام کی کتاب کے آٹھویں باب میں یہ آیتیں ملتی ہیں۔ حضرت دانیال علیہ السلام اپنا خواب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”تب میں نے آنکھ اٹھا کر نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ اسی باب کی بیسویں آیت میں اس کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔
>
> جو مینڈھا میں نے دیکھا اس کے دونوں سینگ مادی (میڈیا) اور فارس کے بادشاہ ہیں اور وہ جسیم بکرا یونان کا بادشاہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مادی (میڈیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور ان دونوں کے فرمانروا کو مینڈھے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب بخت نصر نے ہیکل کو برباد کیا تھا۔ بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور بنی اسرائیل کو قیدی بنا کر بابل لے آیا تھا اور ان کی جمعیت ختم کرنے کیلئے بھیڑ بکریوں کی طرح انہیں لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ حضرت دانیال علیہ السلام نبی بھی اسیروں میں تھے۔ آپؑ کو خواب میں بنی اسرائیل کی رہائی کی خوشخبری دی گئی تھی کہ دو سینگوں والا مینڈھا کھڑا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد سائرس (SERUS) فارس کا حکمران بنا اور اس نے کچھ عرصہ بعد میڈیا کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اسی کے حکم سے بنی اسرائیل کو آزادی نصیب ہوئی اور اسی کی کوشش اور حکم سے ہیکل کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ جس طرح سورۂ بنی اسرائیل میں گزر چکا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ پہلے تو یہ صرف گمان تھا کہ اس خواب کی وجہ سے یہود سائرس کو ذوالقرنین (سینگوں والا) کے لقب سے ذکر کرتے ہیں لیکن ۱۹۳۸ء کے ایک انکشاف نے اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا اور باشندگانِ فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔ یہ سائرس کی ایک سنگی تمثال ہے جو اصطخر کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی۔ اس میں سائرس کے دونوں طرف عقاب کے پر بھی ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ میڈیا اور فارس کا شہنشاہ ہونے کے باعث سائرس ذوالقرنین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

اور ہو سکتا ہے کہ حضرت دانیال علیہ السلام کے خواب سے ہی سائرس کو یہ لقب اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو کیونکہ فارس کے بادشاہوں کو بنی اسرائیل کے انبیاء سے بڑی عقیدت تھی۔ سائرس نے بابل کو فتح کیا تو بنی اسرائیل کی اسیری اور جلاوطنی کے دن ختم ہوئے اور

Marfat.com

اس نے ان کو فلسطین واپس جانے اور ہیکل کو از سرِ نو تعمیر کرنے کی اجازت دی اور ہیکل کے سونے چاندی کے جو برتن بخت نصر لوٹ کر لایا تھا اور انہیں اپنے خزانے کی زینت بنایا تھا سائرس نے حکم دیا کہ وہ بھی بنی اسرائیل کو واپس دیئے جائیں اور پہلے کی طرح ہیکل میں داخل کئے جائیں۔ سائرس کا بچپن بڑی گمنامی کی حالت میں گزرا۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں سارا وقت بسر ہوا۔ قدرت نے گوشۂ گمنامی سے اٹھایا اور فارس کا تاجدار بنادیا۔ تھوڑے عرصہ میں ہی اس نے سب سے بڑی اور مضبوط حکومت میڈیا کو مغلوب کرلیا۔ بابل کو اپنی قلمرو میں داخل کرلیا جس سے اس کی شہرت بام عروج پر پہنچی اور اس کی عظمت سے دل تھرانے لگے۔ یہ ہی وہ چیز ہے جسے قرآن نے انا مکنالہ فی الارض کے جامع الفاظ سے بیان فرمایا۔

تین مہمات

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ذوالقرنین کی جن تین مہموں کا قرآن نے ذکر کیا ہے کیا ان کی رہنمائی سائرس نے کی۔ اس کی ایک مہم مغرب الشمس کی طرف، دوسری مطلع الشمس کی طرف، تیسری ایک ایسے مقام کی طرف جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی اور یاجوج وماجوج آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

سائرس کے مؤرخین بتاتے ہیں کہ جب اس نے میڈیا کو فتح کرکے اپنی سابقہ مملکت فارس کے ساتھ ملایا تو اس کے فوراً بعد ایشیائے کوچک کی ایک ریاست جو لیڈیا کے نام سے مشہور تھی اس کے بادشاہ کروئیس نے اس پر حملہ کردیا اور صلح کے ان تمام ان معاہدات کو بالائے طاق رکھ دیا جو کروئیس اور سائرس کے باپ کے درمیان ہوئے تھے۔ سائرس مقابلہ پر مجبور ہوگیا اور اپنے حریف کو جنگ میں شرمناک شکست دی اور لیڈیا کی ساری حکومت پر قابض ہوگیا۔ اب تمام ایشیائے کوچک بحرِ شام سے لے کر بحرِ اسود تک اس کے زیرِ نگین تھا۔ وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل پر پہنچ گیا۔ اس نے فارس سے لے کر لیڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کرلیا لیکن سمندر نے اس کی پیش قدمی روک دی۔ اس نے بصد حسرت نگاہ اٹھا کر دیکھا تو حدِ نظر تک پانی ہی پانی تھا اور سورج اس کی لہروں میں ڈوب رہا تھا۔ ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل چھوٹی چھوٹی خلیجوں کا مجموعہ ہے اور سمندر کم گہرا ہونے کی وجہ سے پانی گدلا ہے۔ اسی کو قرآن نے ان الفاظ سے بیان فرمایا وجدھا تغرب فی عین حمئۃ اگرچہ سورج تو اپنے آسمانی مدار میں متحرک رہتا ہے اور کہیں ڈوبتا نہیں لیکن سمندر کے کنارے کھڑے ہوکر غروب آفتاب کا نظارہ کرنے والے کو کیا یہ دکھائی نہیں دیتا کہ سورج آہستہ آہستہ پانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگانے کیلئے نیچے اتر رہا ہے۔ جس قوم سے سائرس کو وہاں واسطہ پڑا تھا وہ قوم تھی جنہوں نے کروئیس کی سرکردگی میں اس پر حملہ کیا تھا اور اس کا تاج وتخت چھیننے کی کوشش کی تھی۔ وہ لوگ اس کے قبضہ میں تھے جس طرح چاہتا ان کے ساتھ برتاؤ کرسکتا تھا لیکن سائرس کے مؤرخین یک زبان ہوکر کہتے ہیں کہ اس نے قطعاً کسی پر زیادتی نہیں کی بلکہ اس نے اپنی حملہ آور فوج کو تاکیدی حکم دیا تھا کہ دشمن کے سپاہی کے سوا کسی پر ہاتھ نہ اٹھانا اور اگر وہ بھی نیزہ جھکادے تو اس سے بھی تعرض نہ کرنا۔ قرآن کے بیان سے بھی مؤرخین کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے واما من امن لہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ خود مومن تھا اور نیک اعمال کا قدردان تھا۔

اس کی دوسری مہم مشرق کی جانب تھی جبکہ مملکت کے مشرقی اطراف میں بعض خانہ بدوش قبائل نے فتنہ وفساد کی آگ بھڑکادی تو اس کو فرو کرنے کیلئے اسے مشرق کا رخ کرنا پڑا اور وہ بلخ اور باختر کے قبائل کی سرکوبی کیلئے بڑھا۔ سب کو مطیع بنایا۔ آگے پہاڑوں کا طویل اور انچا

Marfat.com

سلسلہ تھا۔اس کے باعث آگے بڑھنے کیلئے کوئی راستہ نہ تھا۔ لم نجعل لهم من دونهم سترا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ باغی قبیلہ صحرا نورد تھا۔قلعوں اور محلات کا تو ذکر ہی کیا وہاں کوئی باقاعدہ بستی ہی نہ تھی جہاں مکانات تعمیر کئے جاتے اور ان میں رہائش کی جاتی۔کبھی درختوں کے کسی جھنڈ کی آڑ میں وقت بسر کر لیا۔کبھی کوئی معمولی سا خیمہ تان لیا۔دھوپ وغیرہ سے بچنے کیلئے ان کے پاس کوئی معقول انتظام نہ تھا۔

تیسری مہم:۔ اس مہم کے متعلق قرآن نے بتایا کہ ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیانی درہ تک پہنچا تو وہاں اسے ایک قوم ملی جو ان کی بولی سمجھنے سے قاصر تھی۔اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سدین سے مقصود کا کیشیا کا پہاڑی درہ ہے۔اس کے دائیں طرف بحر خزر ہے جس نے شمال اور مشرق کی راہ روکی ہوئی ہے۔بائیں جانب بحر اسود ہے جو شمال مغرب کیلئے قدرتی رکاوٹ ہے۔درمیانی علاقہ میں اس کا سر بفلک سلسلۂ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے۔اس درمیانی درے کے علاوہ شمالی قبائل کیلئے ادھر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور یقیناً یہیں سے یاجوج و ماجوج آ کر ان پر حملہ کرتے اور ان کے علاقہ کو تاخت و تاراج کیا کرتے۔یہی وہ جگہ ہے جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک سد (بند) تعمیر کر کے ان کا راستہ بند کر دیا گیا۔جو لوگ اس علاقہ میں آباد تھے اور آئے دن یاجوج ماجوج کے حملوں سے ان کا امن برباد ہوتا رہتا تھا انہوں نے ہی سائرس سے التجا کی ہوگی کہ وہ انہیں اس بلائے بے درماں سے نجات دلائے۔

قرآن کریم کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف مومن ہی نہ تھا بلکہ بڑا فیاض اور رعایا کا ہمدرد اور خیر خواہ بادشاہ بھی تھا۔ہمیں اس کے ایمان کے متعلق مطمئن ہونے کیلئے کسی بڑی کدوکاوش کی ضرورت نہیں بلکہ انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیاں ہی اس امر کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ وہ مومن تھا۔حضرت دانیال علیہ السلام کی پیشگوئی تو آپ پڑھ آئے ہیں اب حضرت یسعیاہ علیہ السلام نبی کی پیشگوئی سنئے۔

جو خورس (سائرس) کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور میری مرضی بالکل پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ تعمیر کیا جائے گا اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔(یسعیاہ باب ۴۴: آیت ۲۸) اسی کتاب کے باب ۴۵ کی پہلی آیت بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دروازوں کو اس کیلئے کھول دوں اور پھاٹک بند نہ کئے جائیں گے۔

یاجوج ماجوج کون تھے؟

یاجوج اور ماجوج کا ذکر قرآن کریم میں دو بار آیا ہے۔ایک یہاں اور دوسرا سورۃ الانبیاء میں۔یورپ کی زبانوں میں انہیں (GOG AND MAGOG) کہا جاتا ہے۔یہ کون سی قوم تھی،تمام تاریخی قرآئن متفقہ طور پر شہادت دیتے ہیں کہ اس سے مقصود صرف ایک ہی قوم ہو سکتی ہے یعنی شمال مشرقی میدانوں کے وہ وحشی اور طاقتور قبائل جن کے مشرقی حملوں کی روک تھام کیلئے چین کے شہنشاہ شین ہوانگ ٹی کو وہ عظیم الشان دیوار بنانی پڑی جو پندرہ سو میل تک چلی گئی ہے اور جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے۔اس کی تعمیر ۲۱۴ ق۔م میں شروع ہوئی اور دس برس میں ختم ہوئی۔اس نے شمال اور مغرب کی طرف منگولین قبائل کے حملوں کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔اس لئے ان کے حملوں کا رخ پھر وسط ایشیا کی طرف مڑ گیا۔انہیں کے حملوں کو روکنے کیلئے سائرس نے سد تعمیر کی۔شمال مشرق کے اس علاقہ کا بڑا حصہ اب منگولیا کہلاتا ہے لیکن چینی ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اصلی قدیم نام "موگ" ہے جو چھ سو برس ق۔م یونانیوں میں میگ اور میگاگ پکارا

Marfat.com

جاتا تھا اور یہی لفظ عبرانی میں ماجوج ہو گیا۔

سدِّ ذوالقرنین کا محلِ وقوع

آخر میں ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ سائرس نے جو سد تعمیر کی تھی اس کا محلِ وقوع کہاں ہے۔ بحرِ خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے۔ یہ ٹھیک اس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلۂ کوہ ختم ہوتا ہے اور بحرِ خزر سے مل جاتا ہے۔ یہاں ایک دیوار ہے جس کا طول پچاس میل اور اونچائی انتیس فٹ اور موٹائی دس فٹ ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا)

اس مقام سے مغرب کی طرف درہ دانیال جو دو بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار ہے اور اسے آہنی دروازہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خیال کے مطابق آخری دیوار وہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(یہ تفصیلات بیشتر مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن سے ماخوذ ہیں)

آخری پیرے میں اگرچہ سدِ ذوالقرنین کی کافی وضاحت آچکی ہے تاہم مزید توضیح و تسہیل کیلئے صاحب تفہیم القرآن کا مندرجہ ذیل نوٹ بھی ملاحظہ کر لینا فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔

سد سے متعلق مزید وضاحت

ذوالقرنین کی تعمیر کردہ دیوار کے متعلق بعض لوگوں میں یہ غلط خیال پایا جاتا ہے کہ اس سے مراد مشہور دیوارِ چین ہے حالانکہ دراصل یہ دیوار قفقاز (Caucasus) کے علاقہ داغستان میں دربند اور داریال (Darial) کے درمیان بنائی گئی تھی۔ قفقاز اس ملک کو کہتے ہیں جو بحیرۂ اسود (Black Sea) اور بحیرۂ خزر (Caspian) کے درمیان واقع ہے۔ اس ملک میں بحیرۂ اسود سے داریال تک تو نہایت بلند پہاڑ ہیں اور ان کے درمیان اتنے تنگ درے ہیں کہ ان سے کوئی بڑی حملہ آور فوج نہیں گزر سکتی۔ البتہ دربند اور داریال کے درمیان جو علاقہ ہے اس میں پہاڑ بھی زیادہ بلند نہیں ہیں اور ان میں کوہستانی راستے بھی خاصے وسیع ہیں۔ قدیم زمانے میں شمال کی وحشی قومیں اسی طرف سے جنوب کی طرف غارت گرانہ حملے کرتی تھیں اور ایرانی فرمانرواؤں کو اسی طرف سے اپنی مملکت پر شمالی حملوں کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ انہی حملوں کو روکنے کیلئے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی گئی تھی جو ۵۰ میل لمبی ۲۹۰ فیٹ بلند اور ۱۰ فیٹ چوڑی تھی۔ ابھی تک تاریخی طور پر یہ تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ یہ دیوار ابتداً کب اور کس نے بنائی تھی۔ مگر مسلمان مؤرخین اور جغرافیہ نویس اسی کو سدِ ذوالقرنین قرار دیتے ہیں اور اس کی تعمیر کی جو کیفیت قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے اس کے آثار اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔

ابنُ جریر طبری اور ابن کثیر نے اپنی تاریخوں میں یہ واقعہ لکھا ہے اور یاقوت نے بھی معجم البلدان میں اس کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے آذربائیجان کی فتح کے بعد ۲۲ ہجری میں سراقہ بن عمرو کو باب الابواب (دربند) کی مہم پر روانہ کیا اور سراقہ نے عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو اپنے مقدمۃ الجیش کا افسر بنا کر آگے بھیجا۔ عبدالرحمٰن جب ارمینیہ کے علاقے میں داخل ہوئے تو وہاں کے فرمانروا شہر براز نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے باب الابواب کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر شہر براز نے ان سے کہا کہ میں نے اپنے ایک آدمی کو سد ذوالقرنین کا مشاہدہ اور اس علاقے کے حالات کا مطالعہ کرنے کیلئے بھیجا تھا، وہ آپ کو تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ

Marfat.com

اس نے عبدالرحمٰن کے سامنے اس شخص کو پیش کر دیا۔ (طبری، ج ۳، ص ۲۳۵ تا ۲۳۹ البدایۃ والنہایہ ج ۷، ص ۱۲۲ تا ۱۲۵۔ معجم البلدان، ذکر باب الابواب)۔

اس واقعہ کے دوسو برس بعد عباسی خلیفہ واثق (۲۲۷۔۲۳۳ ہجری) نے سد ذوالقرنین کا مشاہدہ کرنے کیلئے سلام الترجمان کی قیادت میں ۵۰ آدمیوں کی ایک مہم روانہ کی جس کے حالات یاقوت نے معجم البلدان میں اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ یہ وفد سامرہ (سُرَّ مَنْ رَأیٰ) سے تفلیس، وہاں سے السریر، وہاں سے علی الاعلان ہوتا ہوا فیلان شاہ کے علاقے میں پہنچا، پھر خزر کے ملک میں داخل ہوا اور اس کے بعد دربند پہنچ کر اس نے سد کا مشاہدہ کیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۱۱۱۔ ج ۷، ص ۱۲۲ تا ۱۲۵۔ معجم البلدان، باب الابواب) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی مسلمان عام طور پر قفقاز کی اس دیوار ہی کو سد ذوالقرنین سمجھتے تھے۔

یاقوت نے معجم البلدان میں متعدد دوسرے مقامات پر بھی اسی امر کی تصریح کی ہے۔ خزر کے زیر عنوان وہ لکھتا ہے کہ ھی بلاد الترک خلف باب الابواب المعروف بالدربند قریب من سد ذی القرنین "یہ ترکوں کا علاقہ ہے جو سد ذوالقرنین کے قریب باب الابواب کے پیچھے واقع ہے جسے دربند بھی کہتے ہیں۔" اسی سلسلہ میں وہ خلیفہ المقتدر باللہ کے سفیر احمد بن فضلان کی ایک رپورٹ نقل کرتا ہے جس میں مملکت خزر کی تفصیلی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خزر ایک مملکت کا نام ہے جس کا صدر مقام اتل ہے۔ دریائے اتل اس شہر کے درمیان سے گزرتا ہے اور یہ دریا روس اور بلغار سے آ کر بحر خزر میں گرتا ہے۔

باب الابواب کے زیر عنوان لکھتا ہے کہ اس کو الباب اور دربند بھی کہتے ہیں۔ یہ بحر خزر کے کنارے واقع ہے۔ بلاد کفر سے بلاد مسلمین کی طرف آنے والوں کیلئے یہ راستہ انتہائی دشوار گزار ہے۔ ایک زمانہ میں یہ نوشیروان کی مملکت میں شامل تھا اور شاہان ایران اس سرحد کی حفاظت کو غایت درجہ اہمیت دیتے تھے۔

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾

(ہم نے اس کو زمین میں بڑا اقتدار بخشا تھا اور ہم نے اسے ہر چیز (تک رسائی حاصل کرنے) کا ساز و سامان دیا تھا۔
۸۴) پس وہ درپے ہوا اسباب و وسائل کے۔ ۸۵)

سَبَبٌ ...... کا معنی تفسیر مظہری کے مطابق مَايُوَصَلُ إِلَيْهِ مِنَ الْعِلْمِ وَالْقُدْرَةِ وَالْآلَاتِ اور کبھی یہ لفظ راستہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ذوالقرنین پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین پر اپنے احسانات کا ذکر فرمایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ایک معمولی حیثیت سے اٹھا اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس وقت کی معلوم دنیا کا سب سے بڑا حکمران بن گیا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ذوالقرنین جسے کیخسرو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کا اصل نام کورش تھا۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں اپنے والد کمبوجیہ کی چھوٹی سی ریاست انشان کا والی مقرر ہوا۔ اپنی طبعی ذہانت اور بیدار مغزی سے حالات کا جائزہ لیا۔ سرحدوں کی حفاظت کیلئے جو بن پڑا اس میں کوتاہی نہیں کی۔ پڑوس کے

Marfat.com

حکمرانوں نے اس ابھرتی ہوئی طاقت سے خوف محسوس کیا۔ چنانچہ مادہ کے حکمران نے اس پر حملہ کردیا۔ اس نے نہایت مستعدی سے حملہ آور کا مقابلہ کیا اور فتح پائی۔ یہ فتح اس کی آئندہ فتوحات کیلئے تمہید ثابت ہوئی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے چند ہی سالوں میں تمام بڑی ریاستوں کو زیر کرلیا اور بلخ اور مکران سے لے کر بحیرۂ روم تک اس کی حکمرانی کا پھریرا لہرانے لگا۔ اس دور میں اور اس سے پہلے بھی اس سے زیادہ وسیع اور پرشکوہ سلطنت کوئی اور قائم نہیں ہوئی۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ...... "پس وہ درپے ہوا اسباب ووسائل کے۔"

اتباع کا مفہوم

اتبع ،اتباع اس کا مصدر ہے۔ اس کا معنی ہوتا ہے، تعاقب کرنا، درپے ہونا اور پیچھے لگنا۔ اَتْبَعَ سَبَبًا کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ فتوحات کیلئے اسباب ووسائل کی فراہمی میں لگ گیا۔ اور یا اس کا یہ مفہوم ہے کہ اس نے اپنے پاس وسائل وذرائع کا جائزہ لیا اور اس کا اہتمام کیا۔ پھر یہیں سے ترقی کرکے یہ محاورے کے طور پر استعمال ہونے لگا اور اسے کسی مہم کی تیاری کے معنی میں بولا جانے لگا۔ یہاں یہ تمام معانی مراد ہوسکتے ہیں کہ اس نے ارادہ کرلیا کہ جہاں تک میرے وسائل اجازت دیں افرادی قوت اور جنگی استعداد جہاں تک ساتھ دے سکے میں فتوحات کا پھریرا لہراتا ہوا آگے بڑھتا جاؤں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو تمام ممالک کو مسخر کرلوں۔ چنانچہ اس نے مغرب، مشرق اور شمال کی طرف باری باری مہمات کا آغاز کیا۔

حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾

(یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کے مقام تک پہنچا تو اس نے سورج کو پایا کہ گویا وہ ایک سیاہ چشمے میں ڈوب رہا ہے اور وہاں اس نے ایک قوم پائی، ہم نے کہا اے ذوالقرنین چاہو ان کو سزا دو، چاہو ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو۔ ۸۶)

ذوالقرنین کی مہم

اس آیت کریمہ میں ذوالقرنین کی پہلی مہم کی طرف اشارہ ہے جو اس کے دارالسلطنت ہک متانہ (موجودہ ہمدان) سے مغرب کی طرف ہوئی۔ وہ اپنے دارالسلطنت سے نکلا اور مغربی ملکوں کا رخ کرتے ہوئے سب سے پہلے اس نے مادا (موجودہ عراق وشام) اور لیڈیا (موجودہ ترکی) کو زیرنگیں کیا۔ لیڈیا کا اس وقت حکمران کراسس تھا۔ اس کے اگرچہ اس کے والد کے ساتھ معاہدات تھے تاہم اس نے معاہدوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ذوالقرنین پر حملہ کردیا، تو مجبوراً ذوالقرنین کو اس کے مقابلے کیلئے نکلنا پڑا۔ لیڈیا کے دارالحکومت سارڈیس (نزد سمرنا) میں اس نے کراسس کو شکست دی حالانکہ اسے بابل، مصر اور اسپارٹا کے حکمرانوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ چنانچہ ان علاقوں کی فتوحات کے بعد ذوالقرنین آگے بڑھتا گیا۔ اب کوئی بڑی رکاوٹ اس کے راستے میں نہ تھی، حتیٰ کہ وہ بحیرۂ روم کے ساحل پر پہنچ گیا اور سمندر حائل ہونے کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔

Marfat.com

مغرب الشمس سے مراد سورج کے غروب ہونے کی جگہ نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ملک پر ملک فتح کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں خشکی ختم ہو جاتی ہے اور آگے سمندر ہی سمندر دکھائی دیتا ہے اور سمندر کے کنارے کے کھڑے ہو کر دیکھنے سے غروب آفتاب کے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آفتاب سمندر میں اتر رہا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل ہوگا جہاں بحرِ ایجین چھوٹی چھوٹی خلیجوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں سمندر زیادہ گہرا نہیں اور پانی کی کمی کے باعث گدلا اور سیاہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے فِیْ عَیْنٍ حَمِئَۃٍ کے الفاظ استعمال کیے ہیں جس کا معنی ہے سیاہ چشمہ۔ یعنی پانی گدلا ہونے کی وجہ سے سیاہ دکھائی دے رہا تھا اور چونکہ یہاں سمندر خلیجوں میں تقسیم ہو گیا تھا اس لئے سمندر نہیں ایک چشمہ محسوس ہو رہا تھا۔

قول کا مفہوم

اس علاقے میں ذوالقرنین نے ایک قوم کو دیکھا، ہوسکتا ہے یہ قوم کروس کی قوم ہو جس کو ذوالقرنین نے شکست دی تھی۔ اس کے بارے میں پروردگار نے ذوالقرنین کو اختیار دیا کہ چاہے تم انہیں سزا دو اور چاہے ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو۔ یہاں چونکہ پروردگار نے ذوالقرنین سے خطاب فرمایا ہے اس لئے بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ ذوالقرنین نبی تھے یا محدَّث تھے۔ اسی لئے پروردگار نے براہِ راست ان سے خطاب کیا حالانکہ یہ محاوراتی یا اشاراتی زبان ہے اور یہ اسلوب قرآنِ کریم میں جا بجا استعمال ہوا ہے۔ مراد اس سے یہ نہیں کہ ہم نے ذوالقرنین سے یہ کہا بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم نے اسے ایسی شاندار فتح سے نوازا اور اس کے دشمن کو اس کے سامنے ایسا بے بس کر دیا کہ حالات زبانِ حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ ذوالقرنین یہ قوم اب تیرے رحم و کرم پر ہے۔ تم اگر ان پر ظلم کرنا چاہو تو یہ مدافعت نہیں کر سکتے۔ اور اگر حُسنِ سلوک کرو تو یہ تمہاری عالی ظرفی ہے۔ بصورتِ دیگر اگر یہ مراد لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اس بات کا اختیار دیا تھا کہ تم ظلم کرو یا حُسنِ سلوک کرو، ہر طرح تمہیں اجازت ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے جو مذہب کی تعلیم سے یکسر بیگانہ ہے کیونکہ مذہب کسی کو ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ جب کسی کو طاقت اور اختیار دیتا ہے تو اسے عدل اور حُسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب کر کے پروردگار نے فرمایا:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ.

(ص . ۲۶)

اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جائیں گے، ان کیلئے سخت عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ روزِ حساب کو بھول بیٹھے۔

اسی طرح کا خطاب سورہ صٓ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سے بھی ہے۔ ھٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ "یہ ہماری تمہارے اوپر بے حساب بخشش ہے تو چاہے تم لوگوں پر احسان کرو چاہے روک رکھو۔"

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکمرانی دی لیکن ساتھ ہی لوگوں میں عدل کرنے کا حکم دیا اور دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کو ایک آزادی حاصل ہے کہ چاہے وہ ایمان لائے اور چاہے کفر کی راہ اختیار کرے

Marfat.com

اسی طرح اس کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پا کر چاہے تو جود و کرم اور احسان اور انفاق کی راہ اختیار کرے اور چاہے خست اور بخالت کی، لیکن اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ان دونوں میں سے ایک پسندیدہ ہے اور اسی کا اپنے بندوں سے وہ مطالبہ کرتا ہے۔ ذوالقرنین سے بھی یہی کہا گیا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کن قوت سے نوازا ہے۔ یہ لوگ تمہارے سامنے بول نہیں سکتے لیکن اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ تم ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سے اجر پاؤ۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ِ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾

(ذوالقرنین نے کہا جو ان میں سے ظلم کا مرتکب ہوگا ہم اس کو سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے سخت ترین عذاب دے گا۔ ۸۷) اور جو ان میں سے ایمان لائے گا اور عملِ صالح اختیار کرے گا تو اس کیلئے اللہ کے پاس بھی اچھا بدلہ ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔ ۸۸)

قولِ ذوالقرنین کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں قَالَ کا فاعل ذوالقرنین ہے۔ بظاہر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قُلْنَا کا جواب ہے کہ پروردگار نے سابقہ آیت میں ذوالقرنین سے جو کچھ فرمایا تھا اس کے جواب میں ذوالقرنین نے یہ بات کہی، لیکن ہم اس سے پہلے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قول ہمیشہ کہنے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ بعض دفعہ رویئے کے اظہار کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی قول سے مراد قول بلسانِ حال ہے۔ ذوالقرنین نے اس مفتوح قوم کے سامنے جو ہر طرح اس کے اختیار میں تھی اپنا رویہ یہ اختیار کیا اور یہ پالیسی بنائی کہ ہم فاتح ہونے کی حیثیت سے ظلم کا دروازہ نہیں کھولیں گے جیسا کہ عموماً فاتحین کیا کرتے ہیں، بلکہ ہم مفتوح قوم کے ساتھ نہ صرف عادلانہ رویہ اختیار کریں گے بلکہ فاتح اور مفتوح کا فرق مٹاتے ہوئے نہایت مساویانہ رویہ قائم کریں گے کہ جو شخص ان میں ظلم و زیادتی کرے گا اسے ہم سزا دیں گے۔ اور ساتھ ہی اسے تربیت کے انداز میں سمجھانے کی کوشش بھی کریں گے کہ اسے اسی دنیا میں ہمیشہ نہیں رہنا بلکہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے روبرو بھی حاضر ہونا ہے۔ ہماری سزائیں اس عذاب کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں جس سے اسے وہاں سابقہ پیش آنے والا ہے۔ البتہ جس شخص نے نیک چلنی کا رویہ اختیار کیا یعنی وہ ایمان لایا اور اعمالِ صالحہ کو اپنا توشہ بنایا اس کیلئے ہمارے پاس بہترین بدلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی وہ شخص اچھے انجام سے سرفراز ہوگا اور ہم اس کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کریں گے جس کی وجہ سے اسے زندگی گزارنے میں آسانی پیدا ہو۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم ایسے لوگوں کیلئے نرم پالیسی اختیار کریں گے۔ ایسی پالیسی جو ایک طرف عدل اور مساوات اور دوسری طرف رحم اور مروت پر مبنی ہوگی۔

ذوالقرنین کا سلوک

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کا اپنی مفتوحہ قوموں کے ساتھ ایسا ہی رویہ تھا۔ اس کی فوج کے کسی سپاہی کی مجال نہ تھی کہ وہ مفتوح قوم کے کسی فرد پر ظلم کر سکتا۔ اس نے جن علاقوں کو بھی فتح کیا وہاں لوگوں کے ساتھ شفقت سے پیش آیا۔ جو پہلے سے ان پر بھاری ٹیکس

Marfat.com

عائد کئے گئے تھے وہ اس نے سب معاف کر دیئے حتیٰ کہ خراج بھی لینا پسند نہ کیا جو ہر فاتح لیا کرتا ہے۔ اس کے بدترین دشمن بھی جب گرفتار کر کے اس کے سامنے لائے گئے تو اس نے انہیں معاف کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو علاقے اس نے فتح کئے وہاں کے رہنے والے لوگ اس کے سلوک سے متاثر ہو کر دل کی گہرائیوں سے اس کے وفادار ثابت ہوئے اور کہیں بھی اسے بغاوت سے سابقہ پیش نہیں آیا۔ اس سفر میں اس نے جس بادشاہ کو شکست دی تھی اس کے ساتھ اس کا رویہ حیرت انگیز حد تک فیاضانہ تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ذوالقرنین نے اس بادشاہ کو اس کی موت تک اپنے محل میں رکھا اور اسے دس ہزار پیادے اور پانچ ہزار سوار عطا کئے تا کہ اس کی حیثیتِ عرفی کو گزند نہ پہنچے۔

ذوالقرنین مومن تھا

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ایک مومن اور آخرت پر یقین رکھنے والا شخص تھا۔ اسی لئے وہ ایمان و عمل کی بات کرتا ہے اور آخرت کا حوالہ دیتا ہے۔ جن لوگوں نے ذوالقرنین سے سکندر مراد لیا ہے ان کی تردید کیلئے یہی بات کافی ہے کہ سکندر میں نہ ایمان تھا نہ عملِ صالح اور نہ اس کا رویہ اپنے دشمنوں کے ساتھ فیاضانہ تھا۔ بلکہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار جلد 1، ص 567 میں لکھتا ہے کہ سکندر نے اپنے باپ فلپ کے مرنے کے بعد اپنے معصوم ننھے سوتیلے بھائی کو جو قلوپطرا کے بطن سے تھا قتل کرا دیا اور اسی طرح اپنے چچازاد بھائی متاس کو بھی اس نے مروا ڈالا۔ نیز اس کے متعلق یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ اس کے باپ کے قتل میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔ ایسے شخص کی اس بلند کردار شخص سے کیا نسبت ہوسکتی ہے جس طرح کا نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے۔

ذوالقرنین زردشت کا ہمعصر اور اس کا پیرو تھا اور زردشت کی اصل تعلیمات میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا صحیح تصور موجود تھا۔ اگرچہ بعد میں نہ اس سے منسوب کتاب محفوظ رہی اور اس کا مذہب حقیقی صورت میں باقی رہا۔ حتیٰ کہ آج وہ ایک آتش پرست مذہب کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ ذوالقرنین کا جانشیں دارا ظاہر ہے جو اپنے پیشرو کے طریقے پر چلنے والا ہوگا اس کے بارے میں دستیاب ہونے والے بعض کتبوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ اہورمزدا کی عبادت کیا کرتا تھا اور اپنی سلطنت کو اس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا تھا اور اس سے راہِ راست پر قائم رہنے کی توفیق مانگتا تھا۔ اس کی یہ دینداری یقیناً ذوالقرنین کے اثرات کا نتیجہ تھی۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

(پھر اس نے ایک اور مہم کی تیاری کی۔٨٩) یہاں تک کہ جب وہ طلوعِ آفتاب کے مقام پر پہنچا تو اس نے سورج کو پایا ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے ہوئے جس کیلئے دھوپ سے بچنے کیلئے کوئی آڑ ہم نے نہیں بنائی تھی۔٩٠) ایسا ہی ہم نے کیا اور ہم اس کے احوال سے خوب باخبر تھے۔ 91)

ذوالقرنین کی دوسری مہم

اس آیتِ کریمہ میں ذوالقرنین کی دوسری مہم کا ذکر ہے۔ پہلا سفر اس کا مغرب کی جانب تھا۔ یہ سفر اس کا مشرقی سمت میں تھا۔ اس

Marfat.com

سمت میں وہ فتح کا پھریرا لہراتا ہوا متمدن اور مہذب دنیا کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ایسی قوم کو دیکھا جو انتہائی وحشی اور غیر متمدن لوگ تھے۔ انہیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ موسم کی شدت سے بچنے کیلئے گھر بنانا بھی ضروری ہیں۔ وہ تعمیر وتمدن کی ہر ضرورت سے نا آشنا، حیوانوں کی طرح وحشت کی زندگی گزار رہے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح چلتے پھرتے ان کی زندگی گزرتی تھی۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ ذوالقرنین کے اس سفر کا سبب مکران، قندھار اور بلخ کے وحشی اور صحرا گرد قبائل کی سرکشی تھی۔ انہوں نے مشرقی سرحد پر ایسی بدامنی پھیلا رکھی تھی کہ جس کا سدباب کرنے کیلئے ذوالقرنین کو یہ سفر کرنا پڑا۔ چنانچہ اپنی مشرقی سرحدوں کو محفوظ کرنے کیلئے ذوالقرنین نے اس پورے علاقے کو فتح کیا تاکہ ان وحشی قبائل کی دست برد سے محفوظ رہا جاسکے۔ اس کے بعد یہ جو فرمایا گیا کہ ہم اس کے احوال سے خوب باخبر تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین کی یہ فتوحات سکندر اور چنگیز کی فتوحات کی طرح نہیں تھیں جس میں ظلم وتعدی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان فتوحات کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید کام کر رہی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے تھے کہ ذوالقرنین کی صلاحیتوں اور اس کی سیرت وکردار کا کیا عالم ہے۔ چنانچہ جب اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ ثابت کیا اور اس نے اپنی قوت وطاقت کو ظلم کا ذریعہ بنانے کی بجائے خدمتِ خلق اور نظامِ عدل کے قیام کا ذریعہ بنایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے فتوحات کے دروازے کھول دیئے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا یَکَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ
قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَکَ
خَرْجًا عَلٰٓی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَکَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ
اَجْعَلْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰٓی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ
انْفُخُوْا ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ
وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَکَّآءَ ۚ
وَکَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

(پھر وہ ایک اور راہ پر روانہ ہوا۔ ۹۲) یہاں تک کہ دو پہاڑوں کے درمیان کے درے تک جا پہنچا تو اس نے
دونوں پہاڑوں کے پیچھے ایک ایسی قوم کو پایا جو کوئی بات سمجھ نہیں سکتے تھے۔ ۹۳) انہوں نے درخواست کی کہ اے
ذوالقرنین یاجوج وماجوج ہمارے ملک میں فساد مچاتے رہتے ہیں تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم مقرر کردیں آپ کیلئے
کچھ خراج تاکہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردیں۔ ۹۴) اس نے جواب دیا وہ دولت
جس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہتر (کافی) ہے، پس تم جسمانی مشقت سے میری مدد کرو، میں
تمہارے اور ان کے درمیان ایک اوٹ کھڑی کیے دیتا ہوں۔ ۹۵) میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ، یہاں
تک کہ بیچ کے خلاء کو بھر دیا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا تو اس نے حکم دیا کہ اس کو خوب دھونکو یہاں تک کہ جب
اس کو آگ کردیا تو اس نے کہا کہ اب تانبا لاؤ اس پر انڈیل دوں۔ ۹۶) سو یاجوج ماجوج بڑی کوشش کے باوجود

Marfat.com

اسے سرنہ کرسکے اور نہ ہی اس میں سوراخ کر سکے۔ ۹۷) اس نے کہا یہ میرے رب کا فضل ہے اور جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا وہ اسے ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہوا کرتا ہے۔ ۹۸)

ذوالقرنین کی تیسری مہم

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ خَرج اور خراج ہم معنی ہیں۔ رَدْمًا مضبوط دیوار کو کہتے ہیں۔ صَدَف کا معنی ہے بلند اور مضبوط عمارت۔ اَلصَّدَفُ كُلُّ بِنَاءٍ عَظِيْمٍ مُرْتَفِعٌ (قرطبی) قِطْرٌ کا معنی ہے پگھلا ہوا تانبا۔ والقطر عند اکثر المفسرین النحاس المذاب وقیل الحدید المذاب وقیل الرصاص المذاب (قرطبی)

یہاں ذوالقرنین کی تیسری مہم کا ذکر ہے۔ مؤرخین نے اس مہم کا کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ اتنا ضرور بتاتے ہیں کہ ذوالقرنین بابل کی فتح کے بعد شمال مشرق کی سمت میں ایک سفر پر روانہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی منزل بحرِ خزر کے مشرق میں ترکستان کی جانب تھی۔ جب وہ دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان پہنچا۔ چونکہ ان دونوں پہاڑی سلسلوں کے اس طرف یاجوج ماجوج کا علاقہ تھا، اس لئے لامحالہ ان پہاڑوں سے مراد کاکیشیا کے وہ پہاڑی سلسلے ہی ہو سکتے ہیں جو بحرِ خزر (کیسپین) اور بحرِ اسود کے درمیان واقع ہیں تو وہاں اس نے ایسے لوگوں کو پایا جو متمدن دنیا سے بالکل الگ تھلگ زندگی گزارنے کی وجہ سے کوئی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح سے ذوالقرنین کو اپنی مصیبت سنائی کہ ان پہاڑوں کے پیچھے یاجوج ماجوج رہتے ہیں۔ انہیں جب موقع ملتا ہے وہ ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ہمیں بے پناہ نقصان پہنچاتے ہیں، آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دیجئے جو ہمیں ان کی دست برد سے محفوظ کر دے۔

یاجوج ماجوج

یاجوج ماجوج سے مراد جیسا کہ اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ ایشیا کے شمالی مشرقی علاقے کی وہ قومیں ہیں جو قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر غارت گرانہ حملے کرتے رہی ہیں اور جن کے سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھ کر ایشیا اور یورپ دونوں طرف رخ کرتے رہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ یاجوج ماجوج حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی وہ اولاد ہے جو ایشیا کے شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔ بائبل کی کتاب پیدائش (باب:۱۰) ان کو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے اور یہی بیان مسلمان مؤرخین کا بھی ہے۔ حزقی ایل کے صحیفے (باب:۳۹۔۳۸) میں ان کا علاقہ روس اور توبل اور مسک بتایا گیا ہے۔ حزقی ایل فرماتے ہیں "اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش، مسک اور توبل کا فرمانروا ہے، متوجہ ہو اور اس کے خلاف نبوت کر۔"

اور کہہ خداوند یوں فرماتا ہے "دیکھ اے جوج روش، مسک اور توبل کے فرمانروا میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور تجھے لئے پھروں گا اور شمال کے دور اطراف سے چڑھا لاؤں گا۔" (حزقی ایل ۳۹، ۱۔۲)

روش، مسک اور توبل کے نام اب تک رشیا، ماسکو اور توبالسک کی صورت میں موجود ہیں اور یہ علاقے فلسطین سے شمال کے بعید اطراف میں ہیں۔ یاجوج و ماجوج کے قبائل بحرِ خزر کے شمال کی جانب اور وسطی ایشیا میں منگولیا کے علاقے میں آباد تھے۔ اسرائیلی مؤرخ یوسیفوس ان سے مراد سیتھین قوم لیتا ہے جس کا علاقہ بحرِ اسود کے شمال اور مشرق میں واقع تھا۔ جیروم کے بیان کے مطابق ماجوج کاکیشیا کے شمال

Marfat.com

میں بحرِ خزر کے قریب آباد تھے۔ ایران پران کی تاخت ترکستان کے رستے سے بھی ہوتی تھی اور کوہ قفقاز کے درے کی راہ سے بھی۔ کوہ قفقاز ذوالقرنین کے دارالحکومت سے ٹھیک شمال کو ہے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ بادشاہ نے درے کو بند کر کے اس خطرے کاسدِ باب کردینا چاہا ہو۔ لیکن اس کا فوری سبب اس قوم کی اپیل بنی جو براہ راست یاجوج ماجوج کے حملوں کی زد میں تھی۔ ذوالقرنین نے ان کی درخواست کو قبول کرلیا تو انہوں نے پیشکش کی کہ ہم اس دیوار کی تعمیر کے اخراجات کیلئے ٹیکس یا خراج دینے کیلئے تیار ہیں تاکہ اس کے مصارف کا بار آپ پر نہ پڑے۔ ذوالقرنین چونکہ عادل اور رحم دل بادشاہ تھا اس نے اس پیشکش کو رد کردیا کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اب چونکہ یہ علاقے میری قلمرو میں شامل ہیں اور یہاں کے رہنے والے میری رعایا ہیں تو اپنی رعایا کی حفاظت کرنا میری قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہے، اس کیلئے ان سے ٹیکس لینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ چنانچہ اس نے ان کی پیشکش کو رد کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے دے رکھا ہے وہ تمہارے ٹیکس سے بہتر بھی ہے اور کافی بھی، کیونکہ "خیر" کا معنی، بہتر بھی ہوتا ہے اور کافی بھی، یعنی مجھے جو اللہ تعالیٰ نے مالی استحکام دے رکھا ہے تو میرے خزانے اس کام کیلئے کافی ہیں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ یا ممکن ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ تم جو ٹیکس مجھے دو گے نہ جانے تمہارے وسائل اور ذرائع کیسے ہیں جن سے حاصل کر کے تم مصارف پورے کرنے کی کوشش کرو گے، ان میں بیشتر وسائل ناجائز نہیں تو مشکوک ضرور ہوں گے (کیونکہ وہ ایک غیر مہذب اور مذہب سے بیگانہ قوم تھی)۔ البتہ تم جسمانی مشقت اور افرادی قوت کی فراہمی سے میری مدد کرو، یعنی لیبر تم مہیا کرو باقی تمام مصارف اور ٹیکنیکل گائیڈنس میں مہیا کروں گا۔ دیوار کی تعمیر کیلئے جو خام مال درکار تھا وہ تو یقیناً اسی علاقے سے ہی فراہم ہونا تھا، اس لئے ذوالقرنین نے کہا کہ سب سے پہلے تم مجھے لوہے کے ٹکڑے مہیا کرو "زُبر" "زُبرۃ" کی جمع ہے، چادروں کو بھی کہتے ہیں اور لوہے کے ٹکڑوں کو بھی۔ میں ان آہن پاروں سے دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلاء کو بھر دوں گا۔ چنانچہ جب یہ خلاء بھر دیا گیا تو پھر ذوالقرنین نے اسے دھونکنے کا حکم دیا یعنی اس پر اتنی آگ جلاؤ کہ لوہا آگ بن جائے۔ اس کے بعد اس پر تانبا پگھلا کر ڈالا گیا۔ اس طرح لوہے اور تانبے کی ایک ایسی دیوار بن گئی جس کو گرانا یا پھاندنا یا اس میں نقب لگانا ناممکن تھا۔ اس دور میں تخریب اور تباہی کے جتنے ذرائع انسانوں نے دریافت کیے تھے اس دیوار کا ان سے ٹوٹنا ممکن نہ تھا۔ اور پھر یاجوج ماجوج جسمانی قوت اور اینٹ پتھر اور بھالوں کے سوا اپنے پاس کوئی جدید ہتھیار نہیں رکھتے تھے، اس لئے ان کیلئے تو اب اس علاقے کو عبور کرنا ناممکن ہو گیا اور یہ اتنا بڑا کارنامہ اور ان لوگوں کیلئے اتنا بڑا احسان تھا کہ اس پر ذوالقرنین کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، لیکن وہ چونکہ ایک مومن قانت تھا اس لئے اس کارنامے کو تفاخر کا ذریعہ بنانے کی بجائے اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف منسوب کیا اور یہ کہا کہ اب یاجوج ماجوج تم پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے۔ لیکن یہ مت سمجھو کہ یہ دیوار ہمیشہ کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ ہمیشہ کا تحفظ صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ممکن ہے زمانہ چند کروٹوں کے بعد اتنی ترقی کر جائے کہ ایسی رکاوٹیں ان کیلئے کوئی رکاوٹیں نہ ہوں اور یا اس سے اشارہ قیامت کی طرف ہے کہ میرے رب کا وعدہ ہے کہ وہ ایک دن ایسا لائے گا جب ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی، تو ظاہر ہے کہ یہ دیوار بھی کھڑی نہیں رہے گی۔ تمہیں فکر اس دن کی ہونی چاہئے۔ اس دن تمہیں پروردگار کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا۔

ہم نے سدِ ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کے بارے میں قرآن کریم اور تاریخ کی روشنی میں بقدرِ کفایت عرض کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ بعض احادیث میں بڑی تفصیل سے یاجوج ماجوج اور اس کے ضمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق وضاحت فرمائی گئی ہے۔ معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع صاحب نے بڑی تفصیل سے احادیث کا ذکر کیا ہے اور آخر میں علامہ سید انور شاہ صاحب کے حوالے سے کچھ باتیں نقل کی ہیں جو ان مباحث کے سلسلے میں بحث کے بعض نئے گوشوں کو وا کرتی ہیں۔ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم یہاں اسے نقل کر رہے ہیں۔

Marfat.com

حضرت الاستاذ حجۃ الاسلام سیدی حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے اپنی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں یاجوج ماجوج اور سدِ ذوالقرنین کا حال اگرچہ ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے مگر جو کچھ بیان کیا ہے وہ تحقیق وروایت کے اعلیٰ معیار پر ہے، آپ نے فرمایا کہ مفسد اور وحشی انسانوں کی تاخت وتاراج سے حفاظت کیلئے زمین پر ایک نہیں بہت سی جگہوں میں سدّیں (دیواریں) بنائی گئی ہیں جو مختلف بادشاہوں نے مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں بنائی ہیں، ان میں سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوارِ چین ہے، جس کا طول ابوحیان اندلسی (دربارِ ایران کے شاہی مؤرخ) نے بارہ سو میل بتلایا ہے اور یہ کہ اس کا بانی فغفور بادشاہِ چین ہے اور اس کی بنا کی تاریخ ہبوطِ حضرت آدم علیہ السلام سے تین ہزار چار سو ساٹھ سال بعد بتلائی ہے اور یہ کہ اس دیوارِ چین کو مغل لوگ اتکُو وۃ اور ترک لوگ بُورقُورقہ کہتے ہیں، اور فرمایا کہ اسی طرح کی اور بھی متعدد دیواریں (سدّیں) مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔

ہمارے خواجہ تاش مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اپنی کتاب قصص القرآن میں حضرت شیخ ؒ کے اس بیان کی تاریخی توضیح بڑی تفصیل وتحقیق سے لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

یاجوج ماجوج کی تاخت وتاراج اور شر وفساد کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم وستم کا شکار تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ہر وقت ان کی زد میں تھے، انہی یاجوج ماجوج کے شر وفساد سے بچنے کیلئے مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر متعدد سدّیں تعمیر کی گئیں، ان میں سب سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوارِ چین ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

دوسری سدّ وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے، اور اس کے محلِ وقوع کا نام دربند ہے۔ یہ سدّ مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانے میں موجود تھی اور شاہ روم کے خاص ہمنشین سیلا برجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلاویجو نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس جگہ سے گزرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی سدّ موصل کے اس راستہ پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان ہے۔ (از تفسیر جواہر القرآن طنطاوی ج ۹، ص ۱۹۸)

تیسری سدّ روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے، یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں، ادریسی نے جغرافیہ میں اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے، یہ شہر بحرِ خزر (کاسپین) کے غربی کنارے پر واقع ہے، اس کا عرض البلد ۳-۴۳ شمالاً اور طول البلد ۱۵-۴۸ شرقاً ہے اور اس کو دربند نوشیرواں بھی کہتے ہیں اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے۔"

چوتھی سدّ اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے بہت بلند حصوں میں ہے، جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک درہ، درہ داریال کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ یہ چوتھی سدّ جو قفقاز یا جبل قوقایا کوہ قاف کی سدّ کہلاتی ہے، بستانی نے اس کے متعلق لکھا ہے:-

Marfat.com

"اور اسی کے (یعنی سدِ باب الابواب کے) قریب ایک اور سد ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے، غالباً اس کو اہلِ فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہوسکا، بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کردی ہے اور بعض نے کسریٰ ونوشیرواں کی طرف اور یاقوت کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلا کر اس سے تعمیر کی گئی ہے۔ (دائرۃ المعارف جلد ۷، ص ۶۵۱ معجم البلدان جلد ۸ ص ۹)۔"

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں ہیں اور تقریباً ایک ہی ضرورت کیلئے بنائی گئی ہیں، اس لئے ان میں سے سدّ ذوالقرنین کونسی ہے، اس کے متعین کرنے میں اشکالات پیش آئے ہیں اور بڑا اختلاط ان آخری دو سدّوں کے معاملہ میں پیش آیا کیونکہ دونوں مقامات کا نام بھی دربند ہے اور دونوں جگہ سدّ بھی موجود ہے، مذکور الصدر چار سدّوں میں سے دیوارِ چین جو سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ قدیم ہے اس کے متعلق تو سدّ ذوالقرنین ہونے کا کوئی قائل نہیں اور وہ بجائے شمال کے مشرق اقصیٰ میں ہے اور قرآن کریم کے اشارے سے اس کا شمال میں ہونا ظاہر ہے۔

اب معاملہ باقی تین دیواروں کا رہ گیا جو شمال ہی میں ہیں، ان میں سے عام طور پر مؤرخین مسعودی، اصطخری، حموی وغیرہ اس دیوار کو سدّ ذوالقرنین بتاتے ہیں جو داغستان یا کا کیشیا کے علاقہ باب الابواب کے دربند میں بحرِ خزر پر واقع ہے، بخارا و ترمذ کے دربند اور اس کی دیوار کو جن مؤرخین نے سدّ ذوالقرنین کہا ہے وہ غالباً لفظ دربند کے اشتراک کی وجہ سے ان کو اختلاط ہوا ہے، اب تقریباً اس کا محلِ وقوع متعین ہوگیا کہ علاقہ داغستان کا کیشیا کے دربند باب الابواب میں یا اس سے بھی اوپر جبل قفقاز یا کوہ قاف کی بلندی پر ہے اور ان دونوں جگہوں پر سدّ کا ہونا مؤرخین کے نزدیک ثابت ہے۔

ان دونوں میں سے حضرت الاستاذ مولانا سیّد محمد انور شاہ قدس سرہ نے عقیدۃ الاسلام میں کوہ قاف قفقاز کی سدّ کو ترجیح دی ہے کہ یہ سدّ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی ہے۔ (عقیدۃ الاسلام ص ۲۹۷)۔

سدّ ذوالقرنین اس وقت تک موجود ہے اور قیامت تک رہے گی یا وہ ٹوٹ چکی ہے؟

آج کل تاریخ وجغرافیہ کے ماہرین اہلِ یورپ اس وقت ان شمالی دیواروں میں سے کسی کا موجود ہونا تسلیم نہیں کرتے اور نہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اب بھی یاجوج ماجوج کا راستہ بند ہے، اس بنا پر بعض اہلِ اسلام مؤرخین نے بھی یہ کہنا اور لکھنا شروع کردیا ہے کہ یاجوج ماجوج جن کے خروج کا قرآن وحدیث میں ذکر ہے وہ ہوچکا ہے، بعض نے چھٹی صدی ہجری میں طوفان بن کر اٹھنے والی قوم تاتاری کو اس کا مصداق قرار دے دیا ہے، بعض نے اس زمانے میں دنیا پر غالب آجانے والی قوموں روس اور چین اور اہلِ یورپ کو یاجوج ماجوج کہہ کر اس معاملہ کو ختم کردیا ہے مگر جیسا کہ اوپر بحوالہ روح المعانی بیان ہوچکا ہے کہ یہ سراسر غلط ہے، احادیث صحیحہ کے انکار کے بغیر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس خروج یاجوج ماجوج کو قرآن کریم نے بطور علامتِ قیامت بیان کیا اور جس کے متعلق صحیح مسلم کی حدیث نواس بن سمعان وغیرہ میں اس کی تصریح ہے کہ یہ واقعہ خروجِ دجال اور نزولِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور قتلِ دجال کے بعد پیش آئے گا۔ وہ واقعہ ہوچکا، کیونکہ خروجِ دجال اور نزولِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اب تک نہیں ہوا۔

البتہ یہ بات بھی قرآن وسنت کی کسی نصِ صریح کے خلاف نہیں ہے کہ سدِ ذوالقرنین اس وقت ٹوٹ چکی ہو اور

Marfat.com

یاجوج ماجوج کی بعض قومیں اس طرف آ چکی ہوں بشرطیکہ اس کو تسلیم کیا جائے کہ ان کا آخری اور بڑا ہلہ جو پوری انسانی آبادی کو تباہ کرنے والا ثابت ہوگا وہ ابھی نہیں ہوا، بلکہ قیامت کی ان بڑی علامات کے بعد ہوگا جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے یعنی خروج دجال اور نزولِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ۔

حضرت الاستاذ حجۃ الاسلام علامہ کشمیری" کی تحقیق اس معاملہ میں یہ ہے کہ اہلِ یورپ کا یہ کہنا تو کوئی وزن نہیں رکھتا کہ ہم نے ساری دنیا چھان ماری ہے ہمیں اس دیوار کا پتہ نہیں لگا کیونکہ اول تو خود انہی لوگوں کی یہ تصریحات موجود ہیں کہ سیاحت اور تحقیق کے انتہائی معراج پر پہنچنے کے باوجود آج بھی بہت سے جنگل اور دریا اور جزیرے ایسے باقی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہو سکا۔ دوسرے یہ بھی احتمال بعید نہیں کہ اب وہ دیوار موجود ہونے کے باوجود پہاڑوں کے گرنے اور باہم مل جانے کے سبب ایک پہاڑ ہی کی صورت اختیار کر چکی ہو لیکن کوئی نص قطعی اس کے بھی منافی نہیں کہ قیامت سے پہلے یہ سدّ ٹوٹ جائے یا کسی دور دراز کے طویل راستہ سے یاجوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آ سکیں۔

اس سدّ ذوالقرنین کے تا قیامت باقی رہنے پر بڑا استدلال تو قرآن کریم کے اس لفظ سے کیا جاتا ہے کہ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ یعنی ذوالقرنین کا یہ قول کہ جب میرے رب کا وعدہ آ پہنچے گا (یعنی خروج یاجوج ماجوج کا وقت آ جائے گا) تو اللہ تعالیٰ اس آہنی دیوار کو ریزہ ریزہ کر کے زمین کے برابر کر دیں گے۔ اس آیت میں وَعْدُ رَبِّیْ کا مفہوم ان حضرات نے قیامت کو قرار دیا ہے حالانکہ الفاظِ قرآن اس بارے میں قطعی نہیں کیونکہ وَعْدُ رَبِّیْ کا صریح مفہوم تو یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا راستہ روکنے کا جو انتظام ذوالقرنین نے کیا ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ اسی طرح رہے، جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے کہ ان کا راستہ کھل جائے تو یہ دیوار منہدم و مسمار ہو جائے گی، اس کیلئے ضروری نہیں کہ وہ بالکل قیامت کے متصل ہو۔ چنانچہ تمام حضرات مفسرین نے وَعْدُ رَبِّیْ کے مفہوم میں دونوں احتمال ذکر کئے ہیں۔ تفسیر بحر محیط میں ہے **والوعد یحتمل ان یراد به یوم القیمة و ان یراد به وقت خروج یاجوج وماجوج۔**

اس کا تحقق یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار منہدم ہو کر راستہ ابھی کھل گیا ہو اور یاجوج ماجوج کے حملوں کی ابتداء ہو چکی ہو، خواہ اس کی ابتداء چھٹی صدی ہجری کے فتنۂ تاتار سے قرار دی جائے یا اہلِ یورپ اور روس و چین کے غلبہ سے، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان متمدن قوموں کے خروج اور فساد کو جو آئینی اور قانونی رنگ میں ہو رہا ہے وہ فساد نہیں قرار دیا جا سکتا جس کا پتہ قرآن و حدیث دے رہے ہیں کہ خالص قتل و غارت گری اور ایسی خونریزی کے ساتھ ہوگا کہ تمام انسانی آبادی کو تباہ و برباد کر دے گا بلکہ اس کا حاصل پھر یہ ہوگا کہ انہی مفسد یاجوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آ کر متمدن بن گئیں۔ اسلامی ممالک کیلئے بلاشبہ وہ فساد عظیم اور فتنۂ عظیمہ ثابت ہوئیں مگر ابھی ان کی وحشی قومیں جو قتل و خونریزی کے سوا کچھ نہیں جانتیں وہ تقدیری طور پر اس طرف نہیں آئیں اور بڑی تعداد ان کی ایسی ہی ہے کہ ان کا خروج قیامت کے بالکل قریب میں ہوگا۔

دوسرا استدلال ترمذی اور مسند احمد کی اس حدیث سے کیا جاتا ہے جس میں مذکور ہے کہ یاجوج ماجوج اس دیوار کو روزانہ کھودتے رہتے ہیں مگر اول تو اس حدیث کو ابن کثیر نے معلول قرار دیا ہے، دوسرے اس میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں کہ جس روز یاجوج ماجوج ان شاء اللہ کہنے کی برکت سے اس کو پار کر لیں گے وہ قیامت کے متصل ہی ہوگا اور اس کی بھی اس حدیث میں کوئی

Marfat.com

دلیل نہیں کہ سارے یاجوج ماجوج اسی دیوار کے پیچھے رکے ہوئے رہیں گے، اگر ان کی کچھ جماعتیں یا قومیں کسی دور دراز کے راستہ سے اس طرف آجائیں جیسا کہ آج کل کے طاقتور بحری جہازوں کے ذریعے ایسا ہو جانا کچھ مستبعد نہیں اور بعض مؤرخین نے لکھا بھی ہے کہ یاجوج ماجوج کو طویل بحری سفر کر کے اس طرف آنے کا راستہ مل گیا ہے تو اس حدیث سے اس کی بھی نفی نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن وسنت میں کوئی ایسی دلیل صریح اور قطعی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ سدّ ذوالقرنین قیامت تک باقی رہے گی یا ان کے ابتدائی اور معمولی حملے قیامت سے پہلے اس طرف کے انسانوں پر نہیں ہوسکیں گے۔ البتہ! وہ انتہائی خوفناک اور تباہ کن حملہ جو پوری انسانی آبادی کو برباد کر دے گا اس کا وقت بالکل قیامت کے متصل ہی ہوگا جس کا ذکر بار بار آچکا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن وسنت کی نصوص کی بنا پر نہ یہ قطعی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ سدّ یاجوج ماجوج ٹوٹ چکی ہے اور راستہ کھل گیا ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ازروئے قرآن وسنت اس کا قیامت تک قائم رہنا ضروری ہے۔ احتمال دونوں ہی ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾
وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ
ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

(اور ہم واگزار کر دیں گے بعض کو اس دن وہ تند موجوں کی طرح دوسروں سے ٹکرائیں گے اور صور پھونکا جائے گا پس ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے۔ ۹۹) ہم اس دن جہنم کو کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔ ۱۰۰) جن کی آنکھوں پر میری یاد سے پردہ پڑا رہا اور وہ کلمۂ حق سننے کی تاب نہیں لاتے تھے۔ ۱۰۱)

آیات کے مختلف مفاہیم

ان آیات کا حقیقی مفہوم تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں لیکن مفسرین نے ان آیات کی وضاحت میں جو مختلف احتمالات بیان فرمائے ہیں انہیں سامنے رکھتے ہوئے چند باتیں بالکل واضح ہیں۔ پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ذوالقرنین کی گفتگو کا تسلسل ہے جسے پروردگار نے پورا فرمایا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ جو میں نے سد تمہارے لئے یاجوج ماجوج سے بچاؤ کیلئے کھڑی کی ہے اس وقت تک یاجوج ماجوج اس سد کو عبور نہیں کر پائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں ہوگا۔ لیکن جب وہ وقت جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تباہی کیلئے مقرر کر رکھا ہے، آجائے گا تو پھر یہ دیوار ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور ریزہ ریزہ ہو کر ہموار ہو جائے گی۔ اس کے بعد یاجوج ماجوج اس طرح دنیا پر حملہ آور ہوں گے کہ اپنی کثرتِ تعداد کے باعث ایک دوسرے سے الجھتے اور ٹکراتے ہوئے اس طرح آگے بڑھیں گے جیسے موج موج میں گھس جاتی ہے اور پھر طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اہلِ دنیا سائنسی طور پر اس قدر ترقی کر جائیں گے اور ایسے سریع السیر اور تباہ کن ہتھیار تیار کر لیں گے کہ کوئی رکاوٹ راستے میں باقی نہیں رہے گی، دریاؤں اور پہاڑوں کی رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی، ملکوں کی باہم دوریاں سمٹ کر رہ جائیں گی اور قومیں ایک دوسرے میں گھستی چلی جائیں گی اور ایسا معلوم ہوگا کہ ہر قوم ایک موج کی طرح دوسرے سے ٹکرا جانا چاہتی

Marfat.com

ہے۔ جس طرح آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ طاقتور ملکوں کو کوئی اخلاقی قوت اپنی حدود میں رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی، وہ جب اپنا مفاد دیکھتے ہیں تو تیل کی قوت پر قبضہ کرنے اور دوسروں کو زیر کرنے کیلئے اس ملک پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ انسانی خون ان کے منہ کو ایسا لگا ہے کہ اس کی لذت ان کے ظلم کے نشے کو روز بروز بڑھاتی چلی جارہی ہے۔ وہ ملک جن کے وجود کی کبھی دنیا کو خبر تک نہ تھی آج وہ ہر ملک کی تباہی کے درپے ہیں۔ ہر ملک کی تجارت، سیاست، معیشت حتی کہ ان کی آزادی ان کے رحم وکرم پر ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ جب یافث کی اولاد یعنی یاجوج ماجوج کا ظہور ہوگا تو جس طرح قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ "یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں گے۔" اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جب یاجوج وماجوج ایک طوفان کی طرح ہر پست وبلند سے دنیا پر حملہ آور ہوں گے تو اسی طوفان کے اندر سے قیامت نمودار ہوجائے گی اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ کوئی رکاوٹ اپنی جگہ باقی نہیں رہے گی، ہر چیز کو تباہ کردیا جائے گا۔ اس قیامت کے بعد اللہ تعالیٰ سب کو میدانِ حشر میں جمع فرمائیں گے اور جو لوگ آج تک جہنم کا مذاق اڑاتے رہے اور جہنم کے وجود کو محض ایک وہم قرار دیتے رہے، جہنم ان کے سامنے پوری ہولناکی کے ساتھ ظاہر کردی جائے گی تاکہ ان عقل کے اندھوں کو چشم سر سے دیکھنے کا موقع ملے اور اپنی قسمت کو روئیں کہ جسے ہم ایک وہم سمجھتے تھے وہ تو اب ہمارے سامنے ہے۔ ایسے عقل کے اندھوں کے بارے میں مزید فرمایا گیا کہ یہ وہ لوگ تھے کہ ہمارے پیغمبر ہماری تنبیہات کو ان تک پہنچاتے تھے لیکن انہیں ہماری ہر بات ناگوار گزرتی تھی۔ ان کے تکبر کا عالم یہ تھا کہ یہ ہمارے پیغمبر کی باتوں اور ہماری کتاب کی آیات کو سننے کے بھی روادار نہ تھے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ
دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿١٠٢﴾ قُلْ هَلْ
نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ اُولٰۗىِٕكَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ
لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا
وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ
عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ

Marfat.com

قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

رکوع: ۱۲۔ (کیا ان کافروں نے گمان کیا کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو کارساز بنالیں گے، ہم نے ایسے کافروں کیلئے جہنم بطورِ ضیافت تیار کر رکھی ہے۔ ۱۰۲) اے پیغمبرؐ کہہ دیجئے! کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ ناکام ونامراد کون لوگ ہیں۔ ۱۰۳) وہ تمام لوگ کہ بھٹکی رہی جن کی تمام سعی دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ ۱۰۴) یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، سو برباد گیا ان کا کیا ہوا تو ہم ان کے اعمال (تولنے) کیلئے کوئی ترازو نصب نہیں کریں گے۔ ۱۰۵) یہی جہنم ان کا بدلہ ہے، بسبب اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ ۱۰۶) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کیلئے فردوس کے باغوں کی ضیافت ہے۔ ۱۰۷) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، وہ اس جگہ کو بدلنا نہیں چاہیں گے۔ ۱۰۸) اے پیغمبرؐ کہہ دیجئے! کہ اگر سمندر سیاہی بن جائے میرے رب کے کلمات کو لکھنے کیلئے تو سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں۔ ۱۰۹) کہہ دیجئے! کہ میں تو بس تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے، اور جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہے اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ ۱۱۰)

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

(کیا ان کافروں نے گمان کیا کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو کارساز بنالیں گے، ہم نے ایسے کافروں کیلئے جہنم بطورِ ضیافت تیار کر رکھی ہے۔ ۱۰۲)

خاتمۂ سورت کی آیات

یہاں سے سورۃ کے اختتام تک کی آیات خاتمۂ سورۃ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کا ربط ذوالقرنین کے واقعہ میں تلاش کرنے کی بجائے پوری سورت کے مجموعی مضامین میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ وہ جس مضمون سے سورت

Marfat.com

کا آغاز کرتا ہے انسانی زندگی کی رہنمائی کیلئے مختلف ضرورتوں کو پورا کرتا ہوا خاتمہ سورۃ میں اسی مضمون پر کلام کا اختتام کرتا ہے۔ جب اس سورۃ کے آغاز کے مضمون کو ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا یوں تو ہمہ گیر اور متنوع گمراہیوں کا شکار تھی، لیکن جس گمراہی کو تمام گمراہیوں کی بنیاد کہنا چاہئے وہ یہ تھی کہ انسان دنیا کی زیب وزینت اور رنگ وبو میں گم ہو کر آخرت کو بھول چکا تھا اور اس کے نتیجے میں اس کی زندگی خواہشات اور مفادات کی اسیر ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر شخص اور ہر قوم اپنے مفادات اور اپنی خواہشات اور اپنے قومی تعصبات کے دائرے میں گم ہو کر اس طرح زندگی گزار رہی تھی کہ اب اس کیلئے اس سے باہر دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ کوئی شخص اس سے ہٹ کر اخلاقی حوالے سے یا انسان کی حقیقت کے حوالے سے بات کرتا تھا تو وہ انہیں نہایت اجنبی بلکہ خطرناک محسوس ہوتی تھی اور وہ بات کہنے والے کا منہ نوچنے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ اہلِ مکہ بھی اسی صورتحال سے دوچار تھے۔ اس سورت کے آغاز میں پروردگار نے نبی کریم ﷺ کی بعثت اور قرآنِ کریم کے نزول کا سبب بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا ہے کہ ہم نے انہیں صرف تمہاری زندگی کے نتائج سے باخبر کرنے اور غلط انجام سے انذار کیلئے بھیجا ہے۔ تم دنیا کی زیب وزینت کے اسیر ہو کر جس طرح آخرت فراموشی اور خدا فراموشی کا شکار ہوئے ہو اس سے تمہاری دنیا تو تباہ ہوئی ہے آخرت بھی تباہ ہو جائے گی۔ تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ، آخرت کا یقین پیدا کرو اور دنیا کی حقیقت کو سمجھو، یہی وہ مضمون ہے جسے لپیٹتے ہوئے سورۃ کے آخر میں بیان کیا جا رہا ہے۔

پوری سورۃ میں مختلف طریقوں سے مشرکین کے شرک کی تردید اور ان کے رویئے کے خطرناک انجام پر بار بار تنبیہ کے بعد ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ ان کافروں کا اب بھی یہ گمان ہے کہ وہ میرے بندوں کو میرے سوا اپنا کارساز بنا لیں گے اگر بالفرض قیامت آ بھی گئی تو وہ انہیں قیامت کے عذاب اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچا لیں گے۔ ان بدبختوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ قیامت میں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ وہاں ایمان وعمل اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے سوا کوئی سہارا کارآمد نہیں ہوگا۔ رہے یہ لوگ جو ابھی تک سہاروں پر یقین لگائے ہوئے ہیں ہم نے ان کی مہمانی کیلئے جہنم تیار کر رکھا ہے۔

بعض الفاظ کی تشریح

آیتِ کریمہ کے بعض الفاظ غور طلب ہیں۔ مثلاً اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا سے کون مراد ہیں؟ عبادی کا مفہوم کیا ہے؟ اولیاء کا کیا معنی ہے؟

عبادی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے مراد ہیں۔ مثلاً مشرکینِ عرب نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا، یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا۔ اس صورت میں الذین کفروا سے مراد یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ عرب مراد ہوں گے۔ ایک صورت یہ ہے کہ عبادی سے مراد وہ تمام قوتیں ہوں جن کی دنیا میں پوجا کی گئی ہے۔ اس صورت میں الذین کفروا سے مراد تمام کفار ہیں جو جنات اور شیاطین کی پرستش کرتے اور طاغوتی قوتوں کے سامنے جھکتے ہیں اور اسی طرح وہ تمام لوگ بھی مراد ہوں گے جو معبوداتِ باطلہ مثلاً بُت، آگ اور ستاروں وغیرہ کی پوجا کرتے رہے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ آج کا انسان چونکہ فکری طور پر بہت ترقی کر گیا ہے اور اس نے علم کے تقریباً ہر گوشے

Marfat.com

میں نام پیدا کیا ہے۔اس لئے اب اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آج بھی انسان اس شرک میں مبتلا ہوگا جس کی تردید قرآنِ کریم نے بار بار کی ہے۔لیکن جب ہم انسانوں کے حالات دیکھتے ہیں تو یہ بات خوش فہمی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی، کیونکہ آج بھی دنیا میں ہر سطح کے انسان پائے جاتے ہیں۔البتہ وہ ملک اور معاشرے جہاں انسانوں نے بظاہر ترقی کی ہے اور ٹیکنالوجی کے فروغ نے ان کے ذہنی افق کو بہت روشن کردیا ہے اور زندگی کے بارے میں ان کے تصورات بھی بہت حد تک تبدیل ہوگئے ہیں۔یقیناً ان میں ہمیں وہ پرانی بُت پرستی نظر نہیں آتی اور بہت ساری وہ باتیں بھی ختم ہوگئی ہیں جن کی بنیاد صرف توہمات پر تھی۔لیکن یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان پتھروں کے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے نہیں جھکتا لیکن کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ جن بڑے شخصیتوں کے تصورات اور رہنمائی کو قبول کرلیا جاتا ہے چاہے وہ رہنمائی کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوان شخصیتوں کے مجسمے جابجا استادہ کئے جاتے ہیں۔بت پرست تو اپنے بتوں کے سامنے عبادت کے وقت جھکتے تھے لیکن آج انسان اپنے پسندیدہ رہنماؤں کی تصویروں کو اپنی خواب گاہوں میں بھی آویزاں کرتا ہے۔جن شخصیتوں کو وہ اپنا ہیرو قرار دے لیتا ہے ان کی ایک ایک بات پر دوسروں سے لڑائی مول لیتا ہے۔پارٹی لیڈرز کو وہ مقام دے دیا جاتا ہے جو کسی پیغمبر کو بھی حاصل نہیں۔ان کی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھ کر پیروی کی جاتی ہے۔حتیٰ کہ پارٹی لیڈر کا خاندان ایک ایسا مقدس حوالہ بن جاتا ہے کہ پارٹی لیڈر اگر دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو اس کی نالائق اولاد کو بھی لوگ اپنے سروں پر بٹھاتے اور رہنمائی کے منصب پر فائز کردیتے ہیں۔کتنے ایسے رہنما گزرے ہیں جنہیں بہت سے لوگ مسترد کرچکے ہیں لیکن آج بھی ان کے مجسموں کے سامنے سر جھکائے جاتے ہیں۔ان کی برسی کے دن ان کے اقوال کو دہرایا جاتا ہے اور ان سے وفاداری کیلئے تجدیدِ عہد کیا جاتا ہے۔بعض ایسے ممالک بھی ہیں جو صدیوں پیشتر جاہلیتِ قدیمہ کے سرغنوں کو اپنا جدِ امجد قرار دے کر لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔اسلام جس نے حسب ونسب اور دولت کے بت توڑے ہیں اور صرف کردار کی عظمت کو اجالا ہے اس کے نام لیواؤں میں ایسے ملک موجود ہیں جہاں نیشنلزم کو بتوں کی طرح پوجا جاتا ہے۔نسلی انتسابات کو فروغ دیا جارہا ہے۔کمیونزم، کیپٹل ازم، لبرل ازم اور نیشنلزم یہ دنیا کے نئے خدا ہیں جن کی وجہ سے انسانیت تقسیم ہوگئی ہے اور ان میں اتنا بُعد پیدا ہوگیا ہے کہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوگئے ہیں۔ان تازہ خداؤں میں اقبال کی فکر کے مطابق وطن سب سے بڑا خدا ہے جس کی محبت کو غلط طور پر ایمان کا جز قرار دے کر دوسروں کے ساتھ دشمنی کا ذریعہ بنایا گیا ہے اور اسے مذہب پر فوقیت دے کر مذہب کی بنیاد اکھاڑی گئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس روشنی علم وہنر کے زمانے میں جس قدر بت تراشے گئے ہیں اور جتنے نئے خدا بنائے گئے ہیں نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت بت پرستی کی ہمہ گیری کا یہ عالم نہیں تھا۔اس لئے اقبال نے بالکل ٹھیک کہا تھا اور ہمیں اس کا ادراک ہونا چاہیے:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

اولیاء ولی کی جمع ہے جو متعدد معانی پر بولا جاتا ہے۔اس آیت میں اس سے مراد کارساز اور حاجت روا ہے جو معبودِ برحق کی خاص صفت ہے۔نُزُلاً ...... عام طور پر مہمانی کو کہتے ہیں بلکہ عرب اس مہمانی کو نزل کہتے ہیں جو مہمان کے گھر میں داخل ہونے کے بعد ابتدائی طور پر پیش کی جاتی ہے۔اس لحاظ سے اس آیت میں کافروں پر تعریض کی گئی ہے کہ تم جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش کئے جاؤ گے تم چونکہ ایک نو وارد اور مہمان کی طرح اس نئی دنیا میں اترو گے تو تمہاری مہمانی جہنم سے ہوگی۔لیکن بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ رہائش کیا ہے کہ قیامت ایک دوسری دنیا ہے، پہلی دنیا کے خاتمے پر دوسری دنیا میں ہر شخص کو نئی رہائش کی ضرورت ہوگی۔تمہارے لئے پہلے سے رہائش تیار کر

Marfat.com

دی گئی ہے اور وہ جہنم ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۱۰۳ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ
يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۱۰۴ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ
فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۱۰۵

(اے پیغمبرؐ کہہ دیجئے! کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون لوگ ہیں۔
۱۰۳) وہ تمام لوگ کہ بھٹکی رہی جن کی تمام سعی دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔
۱۰۴) یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، سو برباد گیا ان کا کیا ہوا تو ہم ان کے اعمال (تولنے) کیلئے کوئی ترازو نصب نہیں کریں گے۔ ۱۰۵)

سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے

دنیا میں ہر شخص اپنی جو ترجیحات مقرر کر چکا ہے اس کے مطابق وہ درجہ بدرجہ وقت صرف کرتا اور محنت کرتا ہے اور جس کام پر اس کی سب سے زیادہ توجہ رہتی ہے۔ اسی میں کامیابی کو حقیقی کامیابی سمجھتا ہے اور ناکامی کو حقیقی ناکامی گردانتا ہے۔ اس کی تمام تر خوشیاں اسی کامیابی سے وابستہ ہوتی ہیں اور اس کے تمام غم اسی ناکامی میں پنہاں ہوتے ہیں۔ دنیا کا ہر شخص اور دنیا کی ہر قوم اسی طلسمِ ہوشربا کا شکار ہے۔ اشرافِ مکہ بھی اسی فریب نظر کے اسیر تھے۔ وہ تمام غلط انسانوں کی طرح یہی سمجھتے تھے کہ انسانی ضروریات کا بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ حصول انسان کا سب سے اہم مقصد ہے۔ وہ اسی لئے زندہ ہے کہ اس کی غذا دوسروں سے بہتر ہو، اس کا معاشرتی مقام دوسروں سے بلند ہو، اس کے مکان کے کنگرے سب سے اونچے ہوں، اس کے پاس دولت کی ریل پیل ہو، اس کے پاس سواریوں کی فراوانی ہو، اس کا قبیلہ سب سے بڑا ہو، اس کی ذات قوت و وجاہت کا پیکر سمجھی جائے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی اخلاقی حالت کیسی ہو۔ اس کے محلات بلند ہونے چاہئیں، چاہے وہ دوسروں کے کھنڈرات پر تعمیر ہوں، اس کی دولت بڑھنی چاہئے، چاہے اس میں اضافے کیلئے کیسے ہی غلط طریقے اختیار کئے جائیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی پوری زندگی پر اس کا معدہ حکمران ہے۔ یہ ایک ایسا کعبہ ہے جس کا طواف کرتے ہوئے اس کی ساری زندگی گزر جاتی ہے۔ چند خواہشات ہیں جن کا حصول ایسا ہدف بن جاتا ہے کہ اس کیلئے انسانیت کی بھی قربانی دینا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں ہوتا۔ اشرافِ قریش کی زندگی کا یہ ڈھب ہے جس پر انہیں ناز ہے۔ ان کی زندگی کے اس رویے پر چوٹ لگاتے ہوئے قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ اپنے جن کاموں پر فخر کرتے ہیں انہیں اندازہ نہیں کہ یہی ان کی زندگی کی سب سے بڑی ناکامیاں ہیں۔ آپ تصور کریں کہ ایک انسان زندگی بھر محنت کر کے ایک خوبصورت مکان بناتا ہے، پھر وہ شادی کرتا ہے، بچے پیدا ہوتے ہیں تو ان کی تعلیم، ان تعلیمی اداروں میں دلانے کی کوشش کرتا ہے جو زندگی کے حیوانی تصور پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف یہ ہے کہ ایسا نوجوان تیار کیا جائے جو فر فر انگریزی بولتا ہو، جو مغربی تہذیب کا دلدادہ ہو، جس کے آدابِ زندگی پر مغرب کی چھاپ لگی ہو۔ قطع نظر اس کے کہ انسانی رشتوں کو وہ کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر صرف یہ بات ہو کہ مجھے ایک ایسی زندگی گزارنی ہے جس میں لذت اور عزت دو سب سے بڑے معبود ہوں۔ میری اپنی

Marfat.com

ذات میرا مبدا و معاد ہو کہ میری سوچ کی ابتدا بھی اسی سے ہے اور انتہا بھی اسی پر، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسی زندگی میں خواہشات کا حصول تو ہے چاہے اس کی کوئی سی قیمت ادا کرنی پڑے لیکن اس میں ایثار اور قربانی کا کوئی دخل نہیں۔ ایسا نوجوان جب تعلیم سے فارغ ہو کر گھر میں پہنچتا ہے تو وہ نہ اپنے ماں باپ کے حقوق کو پہچانتا ہے اور نہ ان کے احترام کو۔ وہ گھر کو صرف ایک شب باشی کی جگہ سمجھتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک عارضی پڑاؤ۔ اس کے تقدس اور احترام سے اسے دور کا بھی تعارف نہیں۔ اس گھر میں دوسرے اہلِ قرابت کا آنا جانا اس کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے اور ماں باپ کے حوالے سے جو رشتے اس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں وہ محض انہیں جہالت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ ہمسائیگی کے حقوق، انسانوں کا احترام، انسانی اقدار کی اہمیت، ملک و ملت کے حقوق، مذہب اور اس کے دیئے ہوئے عقائد یہ سب کچھ اس کے نزدیک وہ زنجیریں ہیں جنہیں توڑے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔ ایسا نوجوان جب شادی کرے گا تو وہ ایک ایسا معاہدہ ہوگا جس کی کوئی اخلاقی قیمت نہیں بلکہ محض جنسی ضرورت ہے، جس میں وقت کے ساتھ ساتھ کمی بھی آتی ہے اور خیانت کے راستے بھی کھلتے ہیں۔ اگر اسے اللہ تعالیٰ نے اولاد دی تو وہ اپنی اولاد کو بھی انہیں راستوں پر چلائے گا۔ چنانچہ اولاد بڑی ہو کر اسی کی طرح ہر اخلاق پابندی سے آزاد اور اللہ تعالیٰ اور رسولؐ سے بے نیاز ہوگی۔ یہ ایک عجیب گھر ہوگا جس میں باپ کے دل میں وہ شفقت نہیں ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے تعلق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کے دل میں وہ احترام نہیں ہوگا جو مذہب پیدا کرتا ہے اور میاں بیوی کے تعلق اور نگاہوں میں وہ پاکیزگی نہیں ہوگی جو تقویٰ عطا کرتا ہے تو ایسا گھر ایک چھت ضرور مہیا کرسکتا ہے لیکن سکون مہیا نہیں کرسکتا۔ اولاد ماں باپ سے بیگانہ، ماں باپ اولاد سے شاکی، میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے بیزار۔ یہ گھر بظاہر خوشیاں جمع کرنے کیلئے بنایا گیا تھا لیکن نفرتوں، الجھنوں اور محرومیوں کا مخزن بن کر رہ جائے گا۔ اسی پر آپ باقی معاشرے اور ریاست کو قیاس کر لیجئے۔ ان افکار، ان خواہشات اور ان اہداف کو آپ کیا کریں گے جس کے نتیجہ میں ایک گھر بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ اور ایسے گھروں سے جو معاشرہ بنتا ہے اس میں سوائے جرائم اور نفرتیں پلنے کے اور کسی چیز کی توقع نہیں ہوسکتی۔ اس لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ جو لوگ خدا بیزار زندگی گزارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے فرار میں کامیابی سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بظاہر دنیا میں کیسے بھی اعمال بروئے کار لائیں اس کے نتیجے میں جو فصل تیار ہوگی وہ کانٹے بکھیرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔

غلط فہمی

تیسری آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اس طرح کی زندگی گزارنے والے لوگ دراصل وہ لوگ ہیں کہ جنہیں غلط فہمی یہ ہے کہ ہم دنیا میں خود بخود پیدا ہوگئے ہیں۔ نہ اس کائنات کا کوئی بنانے والا ہے اور نہ ہمیں کسی نے پیدا کیا ہے۔ خدا کا تصور محض جہالت کا نتیجہ ہے یا محض اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ اس کے سوا تخلیقِ کائنات کی گتھی کو سلجھانے کی اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ انہیں اس بات سے شدید انکار ہے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری بھی ہوگی یعنی قیامت آئے گی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اسے قبول کر لینے سے زندگی کی وہ آزادیاں ختم ہوجاتی ہیں جو حیوانوں کی طرح من مرضی کی زندگی گزارنے کی اجازت دیتی ہیں اور اگر کچھ لوگ خدا کا اقرار کرتے بھی ہیں تو محض یہ سمجھ کر کہ اس کا اقرار کرنا ہماری ایک ضرورت ہے، لیکن اس بات کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں کہ وہی ہمارا آقا، ہمارا معبود اور ہمارا الٰہ بھی ہے جس نے زندگی گزارنے کیلئے ہمیں ایک شریعت دے رکھی ہے اور اس کے احکام کے ہم پابند ہیں۔ دونوں صورتوں کا نتیجہ ایک ہی رہتا ہے کہ ایسی زندگیاں اللہ تعالیٰ کی شریعت سے آزاد رہتی ہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنی مرضی سے اور اپنی ترجیحات کے مطابق کرتے ہیں۔ بظاہر وہ دنیا میں

Marfat.com

بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیتے ہیں۔ محلات بناتے ہیں، یونیورسٹیاں تعمیر کرتے ہیں، لائبریریاں، کارخانے، سڑکیں، ریلیں، مختلف صنعتیں اور علوم وفنون کا جال بچھا دیتے ہیں اور پھران پر فخر بھی کرتے ہیں، لیکن چونکہ ان کی تعمیر میں ایک خرابی کی صورت مضمر ہے۔ اس لئے یہ سب کچھ انسان کو اس کے دکھوں میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں دیتے۔ آخر ایک دن ایسا آئے گا جب یہ سب کچھ تباہ کر دیا جائے گا اور انسان کا کیا دھرا سب اکارت ہو کر رہ جائے گا اور وہ لوگ جو اپنے کارناموں پر فخر کرتے تھے اور اپنی عظمتوں کے گن گاتے تھے، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے کسی کام کو وزن دینے کیلئے تیار نہیں ہوں گے۔ اور دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں اس قابل بھی نہیں سمجھا جائے گا کہ ان کے اعمال کو تولنے کیلئے ترازو نصب کیا جائے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز ایک آدمی قد آور اور فربہ آئے گا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے برابر بھی وزن دار نہ ہوگا۔

اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز ایسے ایسے اعمال لائے جائیں گے جو جسامت کے اعتبار سے تہامہ کے پہاڑوں کے برابر ہوں گے، مگر میزانِ عدل میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

(یہی جہنم ان کا بدلہ ہے، بسبب اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ ۱۰۶)

یہ اشرافِ قریش اور دیگر اہلِ مکہ آج جس جہنم کا انکار کر رہے ہیں قیامت کے دن یہی جہنم ان کے اعمال کا بدلہ ہوگی۔ آج یہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا مذاق اڑاتے ہیں کل یہی تمسخر اور استہزاء ان کی تباہی کا باعث بنے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

(بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کیلئے فردوس کے باغوں کی ضیافت ہے۔ ۱۰۷) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، وہ اس جگہ کو بدلنا نہیں چاہیں گے۔ ۱۰۸)

کامیابی ایمان وعمل میں ہے

جن لوگوں کی تمام تگ ودو اور تمام مساعی دنیا اور اسباب دنیا ہی کے حصول ہی میں گم ہو کر رہ گئیں انہوں نے جب بھی کسی چھوٹے یا بڑے کام کا آغاز کیا تو پیشِ نظر صرف یہ رہا کہ اس سے ہمیں دنیوی طور پر کیا فائدہ پہنچے گا اور اس سے ہمارے اسباب دنیا میں کیا اضافہ ہوگا۔ ہماری عزت اور شہرت کو کیسے چاند لگیں گے اور کس طرح ہمارے لئے اقتدار کی راہ آسان ہوگی۔ ان کی محنتوں کا ہدف صرف وہ چیزیں ٹھہریں جن کا تعلق انسان کی غذا، لباس یا آرام وراحت سے ہے۔ اور انہوں نے اپنی دماغی کاوشوں کو اگر صرف کیا تو مطعومات، مشروبات، ملبوسات اور تعیشات میں تنوع پیدا کرنے میں یا ان علوم وفنون کو آگے بڑھانے میں جن کا تعلق انسان کے سفلی جذبات کے تقاضوں، شہرت کی طلب یا ذکرِ دوام کی ہوس سے ہے۔ رہے وہ علوم وفنون جن کا تعلق انسانی قدروں سے ہے یا انسانی اخلاق سے ہے یا انسان کے اندر مکارم اخلاق اور ملکاتِ عالیہ سے یا ان راہوں سے جن پر چل کر انسانیت سربلند ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی گواہی کا حق ادا ہوتا اور پیغمبر کریم ﷺ کے نقوشِ زندگی کو

Marfat.com

توانائی ملتی ہے تو اس کا ان کی سوچ، اس کی فکر اور ان کے عمل سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ گزشتہ آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے اعمال دنیا ہی میں رہ جائیں گے، آخرت میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی بلکہ وہ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔ لیکن جن لوگوں نے ان بنیادی حقائق اور صداقتوں پر یقین پیدا کیا جنہیں پیغمبر لے کر مبعوث ہوئے ہیں اور جو انسانیت کا حقیقی سرمایہ ہیں اور پھر انہوں نے اپنی زندگی نفسانیت اور خواہشات کی پیروی میں گزارنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزاری، ان کیلئے رہنما صرف اللہ کی کتاب رہی اور ان کا آئیڈیل صرف اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی زندگی رہی۔ دنیا کی زیب و زینت نے نہ ان کی نگاہوں کو خیرہ کیا اور نہ ان کی عملی قوت صراطِ مستقیم کے سوا کسی اور راستے پر صرف ہوئی۔ ان کا یقین ان کیلئے قیامت کے دن مشعل بنے گا اور ان کا ایک ایک عمل قیامت کے دن اتنا وزنی ہوگا کہ میزانِ عدل میں اس کا پلڑا سب سے جھکا رہے گا۔ جس طرح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی کمزور اور پتلی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر صحابہ اپنی ہنسی نہ روک سکے، لیکن آنحضرت ﷺ کو اس سے ناگواری ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم کیا جانو، اللہ تعالیٰ کے ترازو میں ان پنڈلیوں کا وزن کیا ہے۔ قیامت کے دن یہ پنڈلیاں کوہ احد سے بھی بھاری ہوں گی۔ گزشتہ آیت میں کافروں کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جہنم ان کی مہمانی کیلئے تیار ہوگا اور اس آیت میں ان مومنوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے باغات ان کیلئے بطور ضیافت تیار ہوں گے۔ ہر ایسی نعمت جس کے وجود یا جس کی لذت کا تصور بھی ممکن نہ ہو وہ بھی وہاں موجود ہوگی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ "نزل" کا معنی جس طرح مہمانی ہے اسی طرح منزل بھی ہے۔ اس سورت میں معنی یہ ہوگا کہ جنت الفردوس ایسے مومنوں کی منزل اور رہائش گاہ ہوگی۔ یہ جنت الفردوس عام جنت نہیں۔ ویسے تو عام جنت بھی نعمتوں کے اعتبار سے بے مثال اور بینظیر ہے۔ لیکن جنت الفردوس خصوصی مقام و مرتبہ کی حامل اور بعض روایات کے مطابق سب سے بالا قدر جنت ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب بھی مانگو جنت الفردوس مانگو کیونکہ ایک مومن کی دعا کا ہدف بھی جنت ہی کی طرح سب سے بلند ہونا چاہئے۔

ایک سوال کا جواب

انسانی فطرت کے حوالے سے عام طور پر ایک سوال کیا جاتا ہے کہ انسان کو جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اس کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ کیلئے یکرنگی اور یکسانی کو پسند نہیں کرتا۔ انسان تلون پسند اور تغیر پسند واقع ہوا ہے۔ اسے کبھی میٹھا اچھا لگتا ہے اور کبھی نمکین۔ وہ کبھی دھوپ پسند کرتا ہے اور کبھی سایہ، کبھی میدانی علاقے میں رہنا چاہتا ہے اور کبھی پہاڑوں کے زیر و بم اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ہر روز گوشت کھانے پر بھی انسان اکتفا نہیں کر سکتا۔ وہ مختلف چیزیں کھانے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس کی طبیعت کے اس تقاضے کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنت کی یکرنگی اور یکسانی پر کیسے صبر کر سکے گا۔ وہ جنت کی نعمتوں سے اکتا کر کبھی جنت سے باہر کی دنیا کو دیکھنا بھی پسند کرے گا بلکہ ہمارے شاعر نے تو کہا کہ ابدی زندگی بھی ایک مجبوری بن جائے تو اس میں کیا لذت باقی رہ جاتی ہے۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا کہ جنت ایک ایسا مقام ہے جس میں داخل ہونے والا کبھی اس سے اکتا نہیں سکتا۔ وہ کبھی اس سے مختلف منزل تلاش نہیں کرے گا۔ جس طرح جنت کی مثال بلکہ اس کی ہر نعمت کی مثال اس دنیا میں ممکن نہیں، وہ دنیا اس دنیا سے

Marfat.com

بالکل مختلف ہوگی۔ وہاں کے احساسات بھی یہاں کے احساسات سے مختلف ہوں گے۔ ہمارے تاثیر وتاثر کے پیمانے وہاں بدل جائیں گے، وہاں سوچ کا انداز مختلف ہوگا، غم، پریشانی اور اکتاہٹ جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔ وہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی، یہاں ہر خوشی کی ایک انتہا ہے وہاں کسی خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی، یہاں خوشی کی انتہا تک پہنچنا بعض دفعہ انسان کیلئے ناممکن ہوجاتا ہے وہاں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوگی۔ یہاں کی خوشیاں بھی محدود ہیں اور اس کے متعلقات بھی محدود ہیں، وہاں جس طرح زندگی ابدی ہے اسی طرح ہر چیز ابدی ہوگی۔ اس لئے یہاں کی زندگی پر قیاس کرکے وہاں کی زندگی پر حکم لگانا قیاس مع الفارق کی بدترین قسم ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے! کہ اگر سمندر سیاہی بن جائے میرے رب کے کلمات کو لکھنے کیلئے تو سمندر ختم ہوجائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملادیں۔ ۱۰۹)

نشانیاں طلب کرنے والوں کو جواب

تمام گمراہ امتوں کی طرح مشرکینِ مکہ کی بھی سب سے بڑی گمراہی یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے اور نبی کریم ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کیلئے عجیب وغریب معجزات اور نشانیاں طلب کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی ایسی نشانی دکھادی جائے جس کا ظہور انسان کی قدرت میں نہ ہو تو پھر یہ سمجھ لیا جائے گا کہ واقعی اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود بھی ہے اور وہ ہر طرح کی باتوں پر قادر ہے اور چونکہ یہ محیر العقول نشانی نبی کریم ﷺ کے کہنے پر دکھائی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہیں۔ ان کی کوتاہی عقل پر توجہ دلاتے ہوئے یہ فرمایا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کی کوئی ایک نشانی مانگتے ہو حالانکہ تمہارا اپنا وجود اور اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کی قدرت وحکمت کی نشانیوں سے بھرپور ہے۔ اس کی قدرتوں اور حکمتوں کو اگر کوئی شخص شمار کرنا چاہے تو بطور مثال فرمایا کہ انہیں لکھنے کیلئے اگر سمندر کو سیاہی بنادیا جائے اور اس سیاہی میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھنا شروع کیا جائے تو لکھنے والی نسلیں تو ختم ہوں گی خود یہ سمندر بھی ختم ہوجائے گا اور ایک سمندر کا کیا کہنا اگر اور سمندر بھی اس کے ساتھ ملادیئے جائیں تو ان کی سیاہی بھی اللہ تعالیٰ کے کلمات یعنی اس کی قدرتوں اور حکمتوں اور اس کی قدرت کے عجائبات کو شمار کرنے سے عاجز ہے۔ خود سمندروں سے اگر یہ کہا جائے کہ قدرت نے تمہارے اندر جو بے شمار مخلوقات اور حیرت انگیز چیزوں کے خزینے دفن کررکھے ہیں تم ان کو ہی شمار کرکے دکھادو تو وہ انہیں شمار کرنے سے بھی عاجز ہیں۔ ہم خشکی پر جس قدر مخلوقات کو دیکھتے ہیں جو حد وشمار سے باہر ہیں تو کہا جاتا ہے کہ سمندر کی مخلوقات اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ تو پھر جس طرح زمین کی مخلوقات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے اس زمین پر بے شمار نعمتیں پیدا کی گئی ہیں۔ قسم قسم کے جانور، رنگارنگ نباتات، ہر آن بدلتے ہوئے موسم، اٹھتی ہوئی گھٹائیں، بے شمار رنگوں کے بادل، آسمان پر بننے والی قوسِ قزح، زمین پر اچھلنے والے چشمے، پارے کی طرح گرتی ہوئی آبشاریں، چاندی کی طرح بہتا ہوا پانی، تازہ بہ تازہ نکلتے ہوئے شگوفے، زمین پر پھیلی ہوئی بیلیں، لہلہاتی ہوئی فصلیں، پھولتی ہوئی سرسوں، مسکراتا ہوا زعفران زار، سونا اچھالتی ہوئی گندم کی فصل، مہکتے ہوئے گلستان، اودے اودے نیلے نیلے اور پیلے پیلے پیراہن پہنے ہوئے پھول اور

Marfat.com

پھر ہر پھول کا حیران کر دینے والا رنگ اور ہر پنکھڑی پر کھلا ہوا دفترِ کردگار، درختوں کی خوشنما چھتریاں اور گھنے سائے اور پھلدار پودوں کے رسیلے پھل، اس کی قدرت کی کس کس نشانی کا ذکر کیا جائے۔ جن لوگوں نے خود انسان کو موضوع بنایا ہے انہوں نے انسان کی آنکھ کی تخلیق کو قدرت کا شاہکار لکھتے ہوئے ضخیم کتابیں لکھیں۔ اس کے چند انچ پر پھیلے ہوئے انگوٹھے کے حیرت انگیز خطوط کو ایسا عجوبہ قرار دیا ہے کہ ساری دنیا مل کر جس کی نظیر لانے سے قاصر ہے۔ انسان کے اندر کا پیچیدہ نظام آج تک اس کی ساری گتھیاں سلجھائی نہیں جا سکیں۔ حیوانوں میں سب سے بے ڈول جانور اونٹ کہا جاتا ہے۔ اس کے جبڑے پر مصر میں تحقیق ہوئی ہے اور ابھی نامکمل تحقیق پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیبارٹری نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مکھی کے دونوں پَروں میں قدرت نے حیرت انگیز طور پر زہر بھی رکھا ہے اور تریاق بھی۔ ایک پَر میں زہر ہے اور ایک میں تریاق۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مکھی پڑ جانے کے بعد مشروب پینا پڑے تو اس کو پورا ڈبو کر نکالو، کیونکہ وہ زہر والا پَر ڈبوتی ہے اور تریاق والا پَر اوپر رکھتی ہے۔ اس کا پورا جسم ڈوبنے سے زہر کا تریاق ہو جاتا ہے، بلکہ ماہرین کا خیال یہ ہے کہ اگر اس کے زہر کی پڑیا کو پوری طرح کھول دیا جائے تو اس سے ۲۰۰ انسانوں کی موت واقع ہو سکتی ہے، لیکن قدرت نے اس کے دوسرے پَر میں اس زہر کا مکمل تریاق رکھا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کی قدرتوں اور حکمتوں کی نشانیوں کا کوئی شمار نہیں، لیکن انسان کی بے بصیری کا کیا کہنا کہ اس کا اپنا جسم، اپنی روح اور اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی دنیا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے معمور ہے، لیکن وہ انہیں دیکھنے کی بجائے اور نشانی دیکھنا چاہتا ہے۔

دور نہ جائیے خود اس زمین کو دیکھ لیجئے جس پر انسان چلتا پھرتا اٹھتا بیٹھتا اور زندگی کے معمولات انجام دیتا ہے اور بالآخر اسی میں دفن ہوتا ہے۔ انسان بہت کم اس زمین کی حقیقت پر غور کرنے کی فرصت نکالتا ہے حالانکہ بے شمار نشانیوں میں سے زمین بجائے خود ایک بڑی نشانی ہے۔ سائنسدان ہمیں بتاتے ہیں کہ آغازِ تخلیق میں جب زمین آفتاب سے الگ ہوئی تھی تو اس کا درجۂ حرارت وہی تھا جو سورج کا ہے یعنی 12000 فارن ہائیٹ۔ جب یہ حرارت کم ہوتے ہوتے 4000 فارن ہائیٹ ہو گئی تو آکسیجن کی ایک خاص مقدار ہائیڈروجن کی طرف بھاگی اور پانی تیار ہو گیا۔ ان گیسوں کی مختلف مقادیر سے کروڑوں مرکبات تیار ہو سکتے ہیں۔ لیکن پانی ان کی صرف ایک ترکیب تقریباً دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن سے بنتا ہے اور باقی تمام مرکبات زہر ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اوزان و مقادیر کا یہ تعین خود بخود ہو گیا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کیمسٹ کی دکان میں مفردادویہ از خود ایک دوسرے سے مل کر مرکب بن جائیں یا لکڑی کے تختے کشتی کی صورت اختیار کر لیں؟

زمین کے سلسلہ میں اس پر غور فرمائیں کہ یہ زمین کہاں سے آئی؟ ماہرینِ ارض نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ آج سے ہزارہا صدیاں پہلے ایک بہت بڑا استارہ سورج کے قریب سے گزرا۔ زورِ کشش سے سورج کے چند ٹکڑے کٹ کر خلا میں گھومنے لگے۔ ان میں سے ایک زمین تھی۔ ان ٹکڑوں کو قریب کے ستاروں نے کھینچ کر متوازن کر دیا۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں ایک اپنے گرد جو 24 گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری آفتاب کے گرد جو 365 دن لیتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق زمین کو آفتاب سے جدا ہوئے آج 2 ارب صدیاں گزر چکی ہیں لیکن ان گردشوں میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا ورنہ علمائے ہیئت کے تمام حساب غلط ہو جاتے۔ اپنے گرد زمین ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اور آفتاب کے گرد 68000 میل فی گھنٹہ کے حساب سے۔ اگر اس کی پہلی رفتار کو 10 گنا کم کر دیا جائے تو شب و روز 10 گنا لمبے ہو جائیں گے۔ جون میں 140 گھنٹے کا گرم دن زمین کو جھلس کر رکھ دے گا اور جنوری کی اتنی ہی طویل رات ہر شے کو منجمد کر دے گی اور اگر اسے بڑھا دیا جائے تو ہر شے کا وزن کم ہوتا جائے گا اور جب یہ رفتار 16200 میل فی گھنٹہ تک پہنچے گی تو کسی چیز میں کوئی وزن نہیں رہے گا ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا درختوں اور مکانوں کو گرا دے گا اور ہاکی کا بال ہٹ ہونے کے بعد ہوا میں اڑ جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔

Marfat.com

زمین کا وزن 5 ارب بلین ٹن ہے۔ اگر آدھا ہوتا تو کشش ثقل نصف رہ جاتی اور اشیاء کا وزن آدھا ہو جاتا۔ اگر یہ وزن دوگنا ہوتا تو ہر چیز کا وزن ڈبل ہو جاتا۔

زمین سورج سے تقریباً 9 کروڑ 29 لاکھ میل دور ہے۔ اگر یہ فاصلہ کم ہوتا تو ہم گرمی سے مر جاتے اور زیادہ ہوتا تو سردی سے مر جاتے۔ کرۂ زمین کا رخ آفتاب کی طرح بالکل سیدھا نہیں بلکہ 23 درجہ کے قریب ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ یہی جھکاؤ موسموں کا سبب ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر دن پچھلے دن جیسا ہوتا اور ہم سردی، گرمی، بہار اور برسات کے مناظر، غذاؤں اور پھلوں سے محروم رہ جاتے۔

آغازِ آفرینش میں جب زمین ٹھنڈی ہوئی تو دو گیسیں یعنی نائٹروجن اور آکسیجن باہم مل کر ہوا میں تبدیل ہو گئیں۔ نائٹروجن کی مقدار 78.3 تھی اور آکسیجن کی 20.99۔ آکسیجن ایک آتش پذیر گیس ہے۔ اگر فضا میں اس کی مقدار زیادہ ہوتی تو آسمانی بجلی کے ایک شرر سے آگ بھڑک اٹھتی اور سب کچھ جل جاتا اور اگر موجودہ مقدار سے نصف ہوتی تو نہ چولہوں میں آگ جلتی اور نہ حیوانی زندگی باقی رہتی۔ کرۂ ہوا میں ذراتِ گرد آبی بخارات اور گیسوں کی وجہ سے کچھ کثافت ہو جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو لاتعداد شہاب جو کثیف ہوا کی رگڑ سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں ہم پر اتنے شرر اور پتھر برساتے کہ زندگی ختم ہو جاتی۔

زمین کا بیشتر حصہ سمندر نے گھیر رکھا ہے۔ ممکن ہے زمین کا بستر سمندر پر ہی بچھایا گیا ہو۔ اگرچہ یہ حقائق متشابہات میں سے ہیں تاہم سمندر ایک حقیقت ہے جس سے انسان کا شب و روز کا واسطہ ہے۔ جس طرح زمین کے مخفی حقائق اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیوں پر مشتمل ہیں اسی طرح سمندر بھی اس کی نشانیوں کا مرقع ہے۔ اس وقت ان نشانیوں کو پیش کرنا مقصود نہیں کہنا صرف یہ ہے کہ سمندر کے قریب پہنچتے ہی جاننے والے اس کے عجیب و غریب حقائق کا انکشاف کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سمندر کے پاس ہوا کا دباؤ 15 پونڈ فی انچ ہوتا ہے اور ہزار فٹ کی بلندی پر تقریباً ساڑھے 14 پونڈ فی انچ۔ انسان کے کندھے اندازاً 10 مربع انچ گھیرتے ہیں۔ ان پر ہوا کا دباؤ 1160 پونڈ یعنی ساڑھے 14 من ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان اس بوجھ کے نیچے پس کیوں نہیں جاتا۔ کاش ساحلِ سمندر پر رہنے والے اللہ تعالیٰ کی اس رحمت اور اس کی نشانی کا ادراک کر سکتے۔

زمین پر بسنے والوں کی سب سے بنیادی ضرورت غذا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انسان لطف و لذت سے بھرپور مختلف اور متنوع غذاؤں سے شب و روز متمتع ہوتا ہے لیکن وہ ان نعمتوں سے شادکام ہوتا ہوا کبھی نہیں سوچتا کہ یہ نعمتیں آئیں کہاں سے۔ نعمتیں تو بے شمار ہیں لیکن غذا کا بنیادی عنصر گندم پر مشتمل ہے۔ انسان کو بہت کم اس پر غور کرنے کی فرصت ملتی ہے کہ آخر یہ گندم کہاں سے آئی۔ انسان گندم کے حصول کیلئے خود گندم زمین میں کاشت کرتا ہے۔ کاشت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گندم کا ایک ایک دانہ زمین میں دفن کرتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ دانہ مر جائے مگر بجائے مرنے کے اس میں زندگی کی سوئی پھوٹتی ہے جو بڑھتے بڑھتے تنا بنتی ہے، پھر اسے خوشے لگتے ہیں، خوشوں میں دانوں کے موتی بھر دیئے جاتے ہیں، سورج کی کرنیں پانی کے ڈول بھر بھر کر فضا میں ابر کی چادریں پھیلا دیتی ہیں۔ ابر پانی برسا کر کھیتی کی آبیاری کا سامان کرتا ہے، سورج اسے گرمی پہنچاتا ہے، چاند اسے حلاوت دیتا ہے۔ ہوا اسے لوریاں دیتی ہے، زمین اپنی قوت نمو بروئے کار لاتی ہے اور پھر قدرت نہ جانے کیسی کیسی قوتوں کو کام میں لا کر انسان کیلئے غذا فراہم کرتی ہے۔ سائنسدان کہتا ہے کہ نائٹروجن حیوانی و نباتاتی حیات کا لازمی جزو ہے۔ یہ دو طریقوں سے زمین میں داخل ہوتی ہے۔ اول خوردبینی اجرام یا بیکٹیریا کے ذریعے جو زمین کی بالائی تہہ میں رہتے ہیں اور کھاد وغیرہ کھا کر ایک ایسا رس خارج کرتے ہیں جن میں نائیٹروجن بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نصف چھٹانک زمین میں ان کی تعداد

Marfat.com

ایک کھرب، 35 ارب کے قریب ہوتی ہے اور زمین کے ہر ایکڑ میں ان کا کام بارہ آدمیوں کے برابر ہوتا ہے۔ اگر 100 ایکڑ کھیت میں 10 کسان ہل چلا رہے ہیں تو 1200 مزدوروں کا ایک مخفی لشکر بھی وہاں کام کر رہا ہوتا ہے۔ غور فرمائیے! اس غذا کو مہیا کرنے اور اسے پروان چڑھانے میں انسان کا حصہ کتنا ہے اور اللہ کا کتنا؟ پروردگار فرماتے ہیں:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَـهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ

(کیا تم نے اپنی کھیتی پر کبھی غور کیا زراعت کون کرتا ہے تم یا ہم)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ

(انسان ذرا اپنی غذا پر نظر ڈالے (کہ کہاں سے آئی) ہم نے مینہ برسا کر زمین کا سینہ چیرا، اس سے غلے، انگور، ترکاری، زیتون، کھجوریں، گھنے باغ، میوے اور چارہ پیدا کیا، یہ سب تمہارا اور تمہارے مویشیوں کا متاع حیات ہے۔)

اسے اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں نظم کیا ۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب

انسان کی دوسری فوری اور ناگزیر ضرورت پانی ہے۔ آدمی پانی کی حقیقت پر غور کرے اور پھر اس کے فوائد کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت نمایاں نظر آتی ہے جس کے آئینے میں انسان اپنے پروردگار کی نشانیوں کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس قدر فراخی اور وسعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے پانی کے خزانے پیدا فرمائے اور زمین کی تخلیق کے ساتھ جب پانی کو پیدا فرمایا گیا تو کس طرح قیامت تک کی مخلوقات کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا' نہ جانے کتنے زمانے گزر گئے لیکن آج تک پانی کے خزانوں میں کبھی کمی نہیں آئی اور پھر چونکہ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس سے انسان کبھی صرف نظر نہیں کر سکتا اس لئے ہوا کے بعد اس کے ناپیدا کنار سمندر پیدا فرمائے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں پانی کا پہنچنا آسان نہیں کیا گیا۔ کہیں سمندروں کو پیدا کیا گیا، کہیں چشمے جاری کر دیئے گئے اور پھر ساتھ ساتھ یہ انتظام فرمایا کہ سردیوں میں پہاڑوں پر برف جما کر گرمیوں میں اسے پگھلا کر زمین کی آبیاری کا سامان کیا گیا اور پھر ایک ایسا حیرت انگیز انتظام دیکھنے میں آتا ہے کہ سمندر سے بھاپ اٹھا کر بادلوں کی چادریں بچھائی جاتی ہیں اور انہیں اس طرح برسایا جاتا ہے کہ زمین کا ایک ایک گوشہ اس سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر ایسا نہیں ہوتا کہ سارا پانی زمین میں جذب ہو جائے اور زمین دلدل بن جائے اور نہ ایسا ہوتا ہے کہ سارا پانی بہہ جائے اور ندی نالوں

Marfat.com

میں پہنچ جائے اور زمین مناسب آبیاری سے محروم رہ جائے بلکہ قرآن کہتا ہے کہ ضرورت کے مطابق ہم پانی زمین میں جذب کرتے ہیں جہاں مزید ضرورت ہوتی ہے اس کو روک دیتے ہیں اور باقی پانی ہم ندی نالوں اور جدولوں کی شکل میں واپس دریاؤں سمندروں میں لے جاتے ہیں اور پھر پانی کے اوصاف کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے اور بے ساختہ اپنے رب کی یاد آنے لگتی ہے۔ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

1۔ پانی کو سیال پیدا کیا گیا اگر ایسا نہ ہوتا تو اس سے پیاس بجھتی نہ کپڑے صاف ہوتے اور نہ کھیتیاں سیراب ہوتیں۔

2۔ جب پانی جمنے لگتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں حرارت خارج کرتا ہے جس سے نیچے کا پانی متاثر ہوتا اور غیر منجمد رہتا ہے۔اگر سردیوں میں سارا پانی جم جاتا تو تمام مچھلیاں اور پانی کے دیگر جانور مر جاتے۔

3۔ برف پانی سے ہلکی ہوتی ہے یہ پانی کی سطح پر رہ کر نیچے کے پانی کو انجماد سے بچاتی ہے۔

4۔ اگر سمندر منجمد ہوتے تو دنیا سردی سے ہلاک ہو جاتی۔اگر ابل رہے ہوتے تو گرمی سے مر جاتی۔اس کا اعتدال ہی بقائے حیات کا باعث ہے۔

اسی طرح جب ہم اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نباتات کی چاروں طرف پھیلی ہوئی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے۔ درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔سبزے کی چادریں بچھی ہوئی ہیں،فصلیں لہلہا رہی ہیں۔لیکن کبھی ہم نے نباتات کے اعجاز پر غور نہیں کیا کہ یہ نباتات صرف کائنات کا حسن ہی نہیں یہ ہمارے لئے مدارِ حیات بھی ہیں۔یہ غلہ اور پھل جو ہم کھاتے ہیں، یہ کپڑے جو ہم پہنتے ہیں، یہ چائے، کافی اور شربت جو ہم پیتے ہیں، سب نباتات سے حاصل ہوتے ہیں۔یہ ربڑ، یہ کاغذ، یہ کوئلہ، یہ تیل، یہ صابن، سب نباتات کا کرشمہ ہے۔ہماری یہ الماری میں سجی ہوئی کتابیں وہ جنگل ہیں جنہیں مزدور کاٹ کر کاغذ کے کارخانوں تک لے گئے تھے۔ پھولوں کے ننھے پودے سے لے کر چنار کے درخت تک آپ کو نباتات کی کروڑوں اقسام نظر آئیں گی۔ان میں سے کچھ باغوں کی آرائش ہیں، کچھ ہماری غذا ہیں اور کچھ متاعِ حیات۔یہ سب ایک ہی زمین سے اگتی ہیں اور ایک ہی پانی سے نشوونما پاتی ہیں۔لیکن کمال تخلیق دیکھئے کہ سب کی حیثیت، رنگ، قامت، تاثیر، بو اور ذائقہ الگ ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ

(زمین میں پاس پاس ایسے قطعات ہیں جن میں کہیں کھیتی، کہیں انگور اور کہیں کھجور کے درخت ہیں، ان میں سے کچھ ایک جڑ سے نکلتے ہیں اور کچھ الگ جڑوں سے، ان سب کی پرورش ایک ہی پانی سے ہوتی ہے' لیکن ان کے ذائقے الگ الگ ہیں، ان باتوں میں اربابِ دانش کیلئے کتنے ہی اسباب وشواہد موجود ہیں۔)

درخت اپنے پتوں کا دامن ہوا اور سورج کے سامنے پھیلا کر ان سے زندگی کی بھیک مانگتے ہیں۔ان کی جڑیں بطنِ زمین سے پانی اور غذا لے کر بلند شاخوں تک پہنچاتی ہیں اور پھلوں میں رس، مٹھاس اور خوشبو بھرتی ہیں۔کیا یہ حیرت انگیز نظام اور نتائج وعلل کا ایک مربوط سلسلہ اس سے بڑھ کر کوئی اور نشانی بھی ہو سکتی ہے۔

Marfat.com

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات یعنی اس کی قدرت وحکمت کی نشانیاں اس قدر بے شمار ہیں انہیں لکھنے کیلئے نہ سمندروں کی سیاہی کفایت کرسکتی ہے اور نہ انسانوں کی زندگیاں اس کیلئے کافی ہوسکتی ہیں۔ شیخ شیراز نے اس بات کو اپنے عجز کے اعتراف پر ختم کرتے ہوئے کہا:

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں دراولِ وصفِ تو ماندہ ایم

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝١١٠

(کہہ دیجئے! کہ میں تو بس تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے، اور جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہے اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ ۱۱۰)

ایک علمی قاعدہ

اللہ تعالیٰ کے کلمات یعنی اس کی قدرت وحکمت کی نشانیوں کی کوئی انتہا نہیں، کسی میں یہ قوت نہیں کہ وہ انہیں شمار کرسکے اور یہ بے شمار نشانیاں اس نے اس لئے جابجا ظاہر فرمائی ہیں تاکہ ان نشانیوں کے واسطے سے انسان ان نشانیوں کو پیدا کرنے والے اور اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان سکے۔ انسانی علم نے حصولِ علم کے جو قواعد مقرر کیے ہیں ان میں سے ایک قاعدہ یا اصول یہ ہے کہ جو حقیقتیں حواس یا عقل کے ذریعے ادراک نہیں کی جاسکتیں ان کے جاننے کا طریقہ یہ ہرگز نہیں کہ انہیں محسوس کرنے یا سمجھنے پر اصرار کیا جائے کیونکہ حواس اور عقل دونوں کا دائرہ محسوسات کی حد تک ہے۔ اس کے ماوراء جو کچھ ہے اس کا ادراک ان دونوں کے ذریعے نہیں ہوسکتا حالانکہ محسوسات کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے جسے جاننا انسان کی ضرورت ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ خود محسوسات میں بھی ایسی اشیاء اور ایسے حقائق موجود ہیں جنہیں حواس اور عقل سے جاننا بہت مشکل ہے۔ مثلاً ہوا دیکھی نہیں جاسکتی، بال کس طرح بڑھتے ہیں، آسانی سے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ خود عقل کی حقیقت کیا ہے؟ حالانکہ ہم ہر وقت اس کی گردان کرتے رہتے ہیں تو جو چیزیں مابعدالطبعیات عالمِ ملکوت اور عالمِ آخرت سے متعلق ہیں، ان کا جاننا تو حواس اور عقل کے بس کی بات نہیں باوجود اس کے کہ یہ تمام اشیاء اور حقائق مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات مخلوق نہیں تو مخلوق کی گرفت میں کیسے آسکتی ہیں اور ادھر مشکل یہ ہے کہ ایمان کے اولین تقاضے کے طور پر اللہ تعالیٰ کا جاننا اور اس کی صفات کا پہچاننا ضروری ہے۔ اس لئے انسانی علم نے یہ قاعدہ ٹھہرایا کہ ایسے حقائق کو جاننے کیلئے صفات کا سہارا لینا پڑتا ہے اور یا نشانیوں کے ذریعے نشانیوں کے خالق کا فی الجملہ ادراک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس طرح روح کا ادراک سانس کی آمد ورفت اور جسم کی حرکت سے ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کا ادراک ان نشانیوں سے ہوتا ہے جو ہمارے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ہیں اور اگر ہم انہیں معرفتِ حق کا ذریعہ بنائیں تو اس لاینحل گتھی کو سلجھانا ممکن ہوجاتا ہے۔ جو مخلوقات کو دیکھتا ہے اس کیلئے خالق کا انکار ایک بے عقلی کی بات ہے۔ جس طرح عمارت کو دیکھ کر معمار، نظم کو دیکھ کر ناظم، شعر کو پڑھ کر شاعر اور قیادت کو دیکھ کر قائد کا یقین کرنا

Marfat.com

پڑتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی علامات سے بھی اس کا یقین پیدا ہونا عقل کا تقاضا ہے۔

انسان سب سے بڑی نشانی ہے

یوں تو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بے شمار ہیں لیکن شاید اس کی سب سے معتبر اور شاہکار نشانی خود انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے احساسات اور عقل کی دولت اور جستجو کی لگن دے کر کائنات کا کلِ سر سبد بنا دیا ہے۔ اس کی عقل نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ دنیا کو ایجادات سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس کے شوقِ تجسس اور جستجو نے کائنات کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ خود چند فٹ کا منحنی سا جسم رکھتا ہے لیکن اس نے پہاڑوں میں سرنگیں نکالیں اور ڈائنامیٹ سے پہاڑوں کو اڑا کر سپاٹ جگہوں میں تبدیل کر دیا ہے، دریاؤں کے رخ موڑے ہیں، سمندر کو پیچھے دھکیل کر اپنی ضرورت کیلئے زمین نکالی ہے، لوہے میں قوتِ پرواز پیدا کر دی ہے۔ ایسے کیمرے ایجاد کئے ہیں جو سمندر کی نچلی دنیا کی تصویریں لے کر آتے ہیں۔ کمپیوٹر کے نام سے ایسی حیرت انگیز مشین ایجاد کی ہے جو انسانی دماغ کے متبادل کے طور پر کام کرتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ انسان جو ستاروں پر کمندیں ڈال سکتا اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتا ہے اپنی شب تاریک کو سحر نہیں کر سکتا۔ جو سمندر کے نیچے اتر سکتا ہے لیکن اپنے باطن میں جھانکنا اس کیلئے آسان نہیں ہے۔ اس کی اس کمزوری کو دور کرنے بلکہ اسے صحیح معنی میں مکمل انسان بنانے کیلئے اللہ تعالیٰ کے نبی دنیا میں تشریف لاتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہنا چاہئے کہ نبی اور رسول اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا سب سے بڑا مظہر ہیں اور پھر ان میں بھی جسے خالق کا شاہکار ہونے کا شرف حاصل ہے وہ سید الرسل محمد ﷺ ہیں۔ چنانچہ کلمات کے غیر متناہی ہونے کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ تم اگر قدرت کے شاہکار کو دیکھنا چاہتے ہو تو وہ تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کے رسول کے طور پر موجود ہیں۔ لیکن تم نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ وہ ایک ایسا محبوب ہیں جو اندھوں میں گھر گیا ہے۔ ان کے پاس ایسا مصحف ہے جسے زندیقوں سے واسطہ پڑا ہے۔ پہلی امتوں نے بھی کور نگاہی کا ثبوت دیا کہ یا تو اللہ تعالیٰ کے رسول کا انکار کر دیا اور جب اس کے کمالات کو دیکھا تو خدا یا خدا کا بیٹا بنا دیا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر آنحضرت ﷺ کو شاید دونوں پہلوؤں سے پیش فرمایا گیا ہے کہ آپؐ اپنے کمالات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس اور اس کی عنایات کا مورد ہیں اور وہ ایک ایسے انسان ہیں جو انسانیت کی معراج ہیں۔ وہ صرف بشر ہی نہیں بلکہ خیر البشر ہیں لیکن سابقہ امتوں کی گمراہی اور کوتاہ فکری کو دیکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ میں کمالات کے اعتبار سے جو کچھ بھی ہوں لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے تم جیسا ایک بشر ہوں۔ تمہاری طرح میرے بھی ماں باپ ہیں، میں بھی اسی زمین پر رہتا ہوں، میں بھی تمہاری ہی طرح اسی فضا میں پلا بڑھا ہوں، میں نے بھی ذریعہ معاش کے طور پر تمہاری طرح تجارت کو اختیار کیا ہے اور میں بھی وہی کھاتا پیتا ہوں جو تم کھاتے پیتے ہو، جس طرح ہیرا اپنی چمک دمک کے اعتبار سے پتھروں سے الگ ہوتا ہے لیکن پہاڑ کی اولاد ہونے کے اعتبار سے وہ پتھروں میں شامل ہوتا ہے، میں بھی انسانی خصوصیات کے اعتبار سے تمہاری طرح ایک بشر ہوں لیکن کمالات کے اعتبار سے انسانیت کا جوہر اور انسانیت کیلئے باعث فخر ہوں۔ میرا اختصاص یہ ہے کہ مجھ پر وحی اترتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرنا یا شرفِ ہمکلامی حاصل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس شرف سے نوازا ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ بزرگی بخشی ہے کہ میں اس کا بندہ بھی ہوں اور ایلچی بھی۔ انسانوں کی ہدایت کیلئے پیغامات مجھ پر اترتے ہیں۔ میں تمہاری ہدایت کیلئے مبعوث ہوا ہوں۔ رہے معجزات اور نشانیاں وہ میری قدرت میں نہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ اس لئے مجھ سے نشانیوں کی طلب نہ کرو، میں تمہیں وہ سناتا ہوں جو مجھ پر وحی کی گئی ہے۔ اس کی بنیادی بات یہ ہے کہ تم اس بات کا یقین پیدا کرو کہ تم یہاں نہ تو

Marfat.com

ہمیشہ رہو گے اور نہ موت کی ایک پھونک تمہیں ہمیشہ کیلئے ختم کردے گی۔ موت دراصل یہاں سے دوسری دنیا میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ اس دنیا کا عالمِ برزخ کہتے ہیں۔ وہاں انسان اس وقت تک رہیں گے جب تک قیامت کا صور نہیں پھونک دیا جاتا۔ قیامت آنے کے بعد سب کو زندہ کیا جائے گا اور سب کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اپنے ایک ایک پل اور ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ تو جس شخص کو قیامت کے آنے کا یقین ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس دن کیلئے تیاری کرے اور وہ تیاری یہ ہے کہ وہ نیک عمل کرے یعنی اس طریقے پر زندگی گزارے جسے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل کیا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کا اپنا الٰہ سمجھے اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاس

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔

اس سورت کا نام مریم اس لئے رکھا گیا ہے کہ ایک تو دوسرے رکوع کی پہلی آیت میں حضرت مریم علیہا السلام کا نام آیا ہے اور دوسری وجہ بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ ہے کہ اس سورت میں حضرت مریم علیہا السلام کے تفصیلی حالات بیان کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سے جو عظیم خدمت لی ہے اس کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔

زمانۂ نزول:۔

جو صحابہؓ حالات سے مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ کی اجازت سے حبشہ ہجرت کر گئے تھے، انہیں جب نجاشی شاہِ حبشہ کے دربار میں پیش ہونا پڑا تو انہوں نے نجاشی کے استفسار پر سورۂ مریم کی ابتدائی آیات پڑھ کر سنائی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجرتِ حبشہ سے پہلے یہ سورت نازل ہو چکی تھی۔

سورت کا پس منظر:۔

زمانۂ نزول متعین ہو جانے کے بعد یہ قیاس کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی ہے اس وقت حالات کیا تھے اور وہ کیا پس منظر تھا جسے سامنے رکھتے ہوئے اس سورت میں مسلمانوں کو ہدایات دی گئی ہیں۔

ہجرت حبشہ بجائے خود یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ مسلمانوں پر قریش کی اذیت رسانی کا عمل اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ باوجود اس کے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے حکم سے صبر کی تصویر بنے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہر آنے والی تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے تھے، تاہم صبر اور برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تکلیفیں برداشت کی حد سے بڑھ گئی تھیں۔ مسلمانوں میں جو غریب اور کمزور اور زیردست لوگ تھے ان کیلئے تو جان و تن کا رشتہ باقی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت خبابؓ جیسے لوگوں کو مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا جاتا۔ بعض دفعہ دھوپ میں تپتی ہوئی سل ان کے سینے پر رکھ کر تڑپنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا اور یہ کہا جاتا کہ تم اس اذیت میں اس وقت تک مبتلا رہو گے جب تک تم اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے بارے میں نازیبا کلمات نہیں کہو گے اور یا اسلام سے انحراف کا اعلان نہیں کرو گے۔ حضرت عمارؓ اور ان کے والد کو تو باقاعدہ آگ کی دھونکنی دی جاتی۔ ان کی والدہ پر اس حد تک ظلم کیا گیا کہ ان کی ایک ٹانگ ایک اونٹ سے اور دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے باندھ کر اونٹوں کو ہانک دیا گیا اور اس طرح ان کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے گئے لیکن وہ اس حال میں بھی اللہ تعالیٰ کے

Marfat.com

دین پر قائم رہیں۔

مسلمانوں میں جو عزت دار اور بارسوخ لوگ تھے، طریقے طریقے سے ان کی عزت پامال کرنے کی کوشش کی جاتی۔ سرعام ان کی توہین کی جاتی اور بعض دفعہ مارکٹائی سے بھی گریز نہ کیا جاتا اور جو لوگ تجارت پیشہ تھے مختلف طریقوں سے ان کے تجارتی کاروبار کو تباہ کیا گیا۔ لوگوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کی گئی اور عملاً ان کے کاروبار کا بائیکاٹ کر دیا گیا اور اس طرح سے بیروزگاری اور معاشی پریشانیوں کے عذاب میں انہیں مبتلا کیا گیا۔

صحابہؓ میں کچھ لوگ اپنی محنت اور ہنرمندی سے روزی کماتے تھے، ان کے ساتھ اشراف قریش کا سلوک یہ تھا کہ ان سے کام لے لیتے اور اجرت دینے سے انکار کر دیتے۔ صحیحین میں حضرت خبابؓ روایت کرتے ہیں کہ میں مکے میں لوہار کا کام کرتا تھا، مجھ سے عاص بن وائل نے کام لیا اور جب میں اس سے اجرت لینے گیا تو اس نے کہا کہ میں اس وقت تک تیری اجرت نہیں دوں گا جب تک تو محمد (ﷺ) کا انکار نہ کر دے۔

مسلمان بعض دفعہ اس ناقابلِ برداشت تعذیب سے تنگ آ کر آنحضرت ﷺ سے شکایت کرتے تو آپؐ کبھی تو انہیں حوصلہ دیتے اور کبھی سابقہ امتوں کے حوالے سے بتاتے کہ پہلی امتوں کے اہلِ ایمان پر اس سے زیادہ سخت وقت گزرا ہے۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آرے چلائے جاتے تھے لیکن انہوں نے کبھی شکایت نہ کی اور کبھی اپنے دین سے نہ پھرے۔ یقین جانو! اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کر کے رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا کہ ایک آدمی صنعاء سے حضرموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہو گا مگر تم لوگ جلدی مچاتے ہو۔ (بخاری)

ایسے ہی حالات تھے جب نبی کریم ﷺ نے ۵ نبوی میں اپنے صحابہؓ سے فرمایا، لَوْ خَرَجْتُمْ اِلٰی اَرْضِ الْحَبْشَةِ فَاِنَّ بِهَا مَلِكًا لَا يُظْلَمُ عِنْدَهٗ اَحَدٌ وَهِيَ اَرْضُ صِدْقٍ حَتّٰى يَجْعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ فَرَجًا مِمَّا اَنْتُمْ فِيْهِ ''اگر تم لوگ حبشہ کی سرزمین میں چلے جاؤ تو بہتر ہے، اس سرزمین میں ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے۔'' آنحضرت ﷺ کے اس حکم پر صحابہ کرامؓ نے دو دفعہ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پہلی دفعہ گیارہ مرد اور چار خواتین حبشہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ مکہ سے قریبی بندرگاہ شعتیبہ میں ان کو بروقت کشتی میسر آ گئی اور وہ حبشہ چلے گئے۔ جب قریش کو پتہ چلا تو انہوں نے پیچھے آدمی دوڑائے، لیکن ان کی کشتی نکل چکی تھی۔ اس طرح سے وہ گرفتاری سے بچ گئے۔ پھر چند مہینوں کے بعد ایک بڑی تعداد میں مسلمانوں نے ہجرت کی۔ اس طرح سے حبش میں ۸۳ مرد ۱۱ عورتیں اور ۷ غیر قریشی مسلمان جمع ہو گئے اور مکے میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ صرف ۴۰ مسلمان باقی رہ گئے۔

اس ہجرت سے مکے کے گھر گھر میں ایک کہرام مچ گیا کیونکہ قریش کے اکثر خاندانوں کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل تھے۔ عام حالات میں انہیں اندازہ نہ تھا کہ اسلام کا اثر اکثر گھروں تک پہنچ گیا ہے۔ اب جبکہ کسی کا بیٹا، کسی کا بھتیجا، کسی کا داماد، کسی کی بیٹی، کسی کی بہن اور کسی کا بھائی گھر سے دور ہو گئے تو انہیں خطرے کا صحیح احساس ہوا۔ ابوجہل کے بھائی سلمہ بن ہشامؓ، اس کے چچازاد بھائی ہشام بن ابی حذیفہؓ اور عیاشؓ بن ربیعہ اور اس کی چچازاد بہن حضرت ام سلمہؓ، ابوسفیان کی بیٹی امِ حبیبہؓ، عتبہ کے بیٹے ابوحذیفہؓ سہیل بن عمرو کی بیٹی سہلہؓ اور اسی طرح دوسرے سردارانِ قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے جگر گوشے گھر بار چھوڑ کر دین کی خاطر نکل کھڑے ہوئے تو قریش نے اس صورتحال کو

Marfat.com

اپنے لئے ایک چیلنج سمجھا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں بعض لوگ پہلے سے زیادہ مسلمانوں کو ستانے لگے۔ لیکن بعض لوگوں کے دل پر چوٹ لگی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی بات تو ہے کہ ہمارے اپنے ہمارا ساتھ چھوڑ کر بے وطنی اور مسافرت کی اذیتیں برداشت کر رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے دل پر پہلی چوٹ اسی واقعہ سے لگی چونکہ مضبوط اعصاب کے آدمی تھے اس لئے ان کے تبدیل ہونے میں وقت لگا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کی ایک قریبی رشتہ دار لیلیٰ بنتِ حشمہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کیلئے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے شوہر عامر بن ربیعہؓ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ عمر گھر میں داخل ہوئے اور کھڑے ہو کر میری مشغولیت کو دیکھتے رہے، کچھ دیر کے بعد کہنے لگے عبداللہ کی ماں جا رہی ہو؟'' میں نے کہا، ہاں۔ خدا کی قسم تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا۔ خدا کی زمین کھلی پڑی ہے، اب ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں ہمیں خدا چین دے گا۔'' یہ سن کر حضرت عمرؓ کے چہرے پر رقت کے ایسے آثار طاری ہوئے جو میں نے پہلے کبھی ان پر نہ دیکھے تھے۔ وہ بس یہ کہہ کر نکل گئے کہ ''خدا تمہارے ساتھ ہو۔''

اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے قریش سر جوڑ کر بیٹھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ دو ذہین سیاست کار قیمتی تحائف دے کر حبش بھیجے جائیں، وہ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے ان تحائف کی مدد سے اہلِ دربار کے ضمیر خرید یں اور اس کے بعد بادشاہ کی خدمت میں تحائف پیش کر کے مسلمانوں کو وہاں سے واپس لانے کی درخواست کریں۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عمرو بن عاص کو اپنا نمائندہ بنا کر اور قیمتی تحائف دے کر روانہ کیا گیا۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے (جو خود مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں) یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہرِ سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انہوں نے نجاشی کے اعیانِ سلطنت میں خوب ہدیئے تقسیم کر کے سب کو اپنے حق میں ہموار کیا، پھر نجاشی سے ملے اور اس کی خدمت میں بیش قیمت نذرانہ پیش کرنے کے بعد کہا:

> ''ہمارے شہر کے چند نادان لڑکے بھاگ کر آپ کے یہاں آگئے ہیں اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کیلئے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے، آپ انہیں ہمارے ساتھ واپس بھیج دیجئے۔''

اہلِ دربار نے پروگرام کے مطابق ان کی بات کی تائید میں آوازیں بلند کیں کہ ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہئے، ان کی قوم کے لوگ ہی جانتے ہیں کہ یہ کس قماش کے لوگ ہیں، مگر نجاشی نے کہا:

> ''اس طرح تو میں انہیں حوالے نہیں کروں گا جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ لینے کیلئے آئے ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں انہیں بلا کر تحقیق کروں گا کہ معاملے کی اصل حقیقت کیا ہے۔''

چنانچہ نجاشی نے صحابہ کرامؓ کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔

Marfat.com

نجاشی کا استفسار اور حضرت جعفرؓ کا جواب

نجاشی کا پیغام ملا تو سب مہاجرین مشاورت کیلئے جمع ہوئے کہ ہمیں بادشاہ کے سامنے کیا کہنا چاہئے۔ سب نے کہا کہ معاملہ اگرچہ نازک ہے لیکن ہمیں اس سے متاثر ہو کر کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہئے جو حقیقت کے خلاف ہو۔ قطع نظر اس سے کہ اس کے نتیجہ میں ہمیں اس ملک سے نکلنا پڑے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے، بادشاہ نے چھوٹتے ہی پوچھا کہ تم میرے ملک میں کیوں آئے ہو؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنا اصل دین چھوڑ دیا ہے اور پھر نہ میرے دین میں داخل ہوئے ہو اور نہ کسی اور دین میں بلکہ تم نے ایک نیا دین نکالا ہے، آخر یہ تمہارا نیا دین کیا ہے؟ اس پر مہاجرین کی طرف سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے بادشاہ کے سامنے ایک برجستہ تقریر کی جس میں پہلے یہ بتایا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے ہم عرب لوگ کس حال میں تھے اور پھر عہد جاہلیت کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا۔ پھر آنحضرت ﷺ کے بارے میں بتایا کہ ان کا خاندان کیسا ہے، ان کی زندگی کیسی ہے، وہ کس طرح کے پاکیزہ اخلاق کے مالک ہیں۔ پھر آپؐ کی تعلیمات کا ذکر کیا۔ خاص طور پر آپؐ جن مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اس کا ذکر کیا اور آخر میں بتایا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اس نبی کی دعوت کو قبول کیا تو ہمارے خاندان اور شہر کے لوگ ہمارے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے اس حد تک ہمیں ستایا کہ ہمارے لئے اپنے آبائی وطن میں رہنا مشکل ہو گیا تو ہم آپ کے وطن میں یہ سوچ کر آئے ہیں کہ یہاں ہم پر ظلم نہیں ہوگا اور ہم آزادی سے اپنے دین پر عمل کر سکیں گے۔ نجاشی نے کہا کہ مجھے ذرا وہ کلام تو سناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمہارے نبی پر نازل ہوا ہے۔ حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ نجاشی کلامِ خداوندی کو سن کر اس حد تک متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ حضرت جعفرؓ نے جب تلاوت ختم کی تو نجاشی نے کہا کہ یقیناً یہ کلام اور جو کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں۔ خدا کی قسم میں تم لوگوں کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ کہہ کر قریش کے قاصدوں کو وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔

قریش کے قاصد بھی آرام سے ہار ماننے والے لوگ نہ تھے، انہوں نے غور و فکر کے بعد ایک نہایت خطرناک اقدام کیا۔ دوسرے روز بادشاہ سے ملے اور کہا کہ آپ ان لوگوں سے پوچھئے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ وہ ایک ایسی بڑی بات ہے جسے آپ بھی سننا پسند نہیں فرمائیں گے۔ نجاشی نے پھر مسلمانوں کو بلا بھیجا۔ یہ بڑا نازک موقع تھا لیکن مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو ہم وہی کچھ کہیں گے جو ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے سکھایا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں پہنچے تو نجاشی نے عرب قاصدوں کا سوال دہرایا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے اٹھ کر بلا تامل کہا هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَ رُوْحُهٗ وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ الْعَذْرَاءِ الْبَتُوْلِ ”وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسولؑ ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے کنواری مریم پر القاء کیا ہے۔“ اور دوسری روایت کے مطابق حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کا دوسرا رکوع پڑھا جس میں حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ نجاشی نے یہ سن کر زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے عیسیٰ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں۔ اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تمام ہدیئے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ میں رشوت نہیں لیتا۔ اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔

Marfat.com

سورت کے مطالب کا تجزیہ

پہلے رکوع میں حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے جو انہوں نے بڑھاپے میں اولاد کیلئے کی ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو مشرکینِ عرب کو توجہ دلانا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے ہو حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ دیکھو کس طرح حضرت زکریا علیہ السلام بڑھاپے تک اولاد کو ترستے رہے، لیکن اولاد نہ ہوئی۔ پھر بڑھاپے میں کس عاجزی سے اپنے اللہ ہی سے درخواست کی اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اس نے نہایت باکمال بیٹا عطا فرمایا اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ واقعہ درحقیقت حضرت مریم کے اس واقعہ کی تمہید ہے جو دوسرے رکوع میں آرہا ہے۔ یہ سورت اگرچہ مکی۔ ہے، جس طرح سورۂ بنی اسرائیل مکی ہے، لیکن اُس میں تفصیل سے بنی اسرائیل پر تنقید کی گئی ہے اور ان کا اصل چہرہ قریش کو دکھایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے رفتہ رفتہ اس پرخاش میں اپنے آپ کو شریک کرلیا تھا جو قریش اور آنحضرت ﷺ کے درمیان چل رہی تھی اور آنحضرت ﷺ کو پریشان کرنے کیلئے قریش کو مختلف سوالات سکھاتے اور پڑھاتے تھے۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ نصاریٰ بھی قریش کی پشت پناہی کرنے لگے تھے، تو یہود کا اصل چہرہ دکھانے کے بعد اب نصاریٰ کی رونمائی کی جارہی ہے اور قریش کو بتایا جارہا ہے کہ جو اہلِ کتاب خود گمراہی کی دلدل میں اتر چکے ہیں تم ان سے کیا امید رکھتے ہو۔ چنانچہ دوسرے رکوع میں ان کی گمراہیوں کو واضح کرنے کیلئے حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے اور پھر بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کس طرح ہوئی اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ان کی اپنی حقیقت کا اظہار کرایا گیا تاکہ ان کی ذات کے بارے میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے اور پہلے رکوع میں حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ کے واقعہ کو بیان فرما کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا، اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ایسے ماں باپ کے گھر پیدا کیا جو اولاد پیدا کرنے کے اہل نہ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو محض اپنی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا کیا گیا۔ اس طرح یحییٰ علیہ السلام کو دونوں کے بغیر محض اپنی قدرت سے پیدا کیا گیا کیونکہ باپ کی عمر بعض اسرائیلی روایات کے مطابق سو سال سے بھی تجاوز کرچکی تھی اور والدہ ان کی عرصہ سے بانجھ چلی آرہی تھیں لیکن اس کے باوجود حضرت یحییٰ کو کسی نے اللہ تعالیٰ کا بیٹا نہیں کہا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیونکر خدا کے بیٹے ہوگئے جبکہ یہ بات بھی اسرائیلی روایات میں کہی گئی ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت مسیح کو مسح کیا اور آپ کو بپتسمہ دیا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا گیا کہ کس طرح انہوں نے اپنے باپ کو توحید کی دعوت دی اور اس کے نتیجے میں کس طرح انہیں ہجرت کرنا پڑی۔ پھر ہجرت کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑھاپے میں اولاد عطا فرمائی اور ان کو مختلف مراتب سے نوازا۔ قریش کو یہ بتانا ہے کہ آج نبی کریم ﷺ کی حیثیت وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیثیت اپنے باپ اور قوم کے سامنے تھی اور تم وہ کردار ادا کررہے ہو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد، خاندان اور حکومت کا تھا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہم السلام کا اجمالی حوالہ دیا گیا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے اور انہوں نے ہمیشہ اپنی قوم کے سامنے وہی دعوت پیش کی جو آج نبی کریم ﷺ پیش کررہے ہیں۔ پھر ان کی اولاد میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ ضائع کردی اور اپنی خواہشوں کے پیرو بن گئے۔ یہ لوگ اپنی اس گمراہی کے انجام

Marfat.com

سے عنقریب دوچار ہوں گے۔ان کے اندر سے نجات پانے والے وہی بنیں گے جو توبہ اور اصلاح کر لیں گے۔اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زبان سے صبر و انتظار کی ہدایت اور عجلت سے احتراز کرنے کی تلقین کی گئی ہے، پھر چند آیات میں قیامت کی تکذیب کرنے والوں کو زجر و تنبیہ کی گئی ہے اور ان کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آخری دو رکوعوں میں کفارِ مکہ کی گمراہیوں پر سخت تنقید کی گئی ہے اور کلام ختم کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو مژدہ سنایا گیا ہے کہ دشمنانِ دین کی ساری کوششوں کے باوجود بالآخر تم محبوبِ خلائق ہو کر رہو گے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٩٨	سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿١﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿٢﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ
نِدَآءً خَفِيًّا ﴿٣﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ
شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿٤﴾ وَاِنِّىْ خِفْتُ الْمَوَالِىَ
مِنْ وَّرَآءِىْ وَكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا فَهَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴿٥﴾
يَّرِثُنِىْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿٦﴾ يٰزَكَرِيَّآ
اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿٧﴾
قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ
مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿٨﴾ قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ
خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ﴿٩﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً
قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿١٠﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ
مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿١١﴾ يٰيَحْيٰى
خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿١٢﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا
وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾
وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾

Marfat.com

رکوع: ا۔ (کاف ھا یا عین ص. ا) یہ ذکر ہے آپؐ کے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی۔ ۲) جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ ۳) عرض کی اے میرے رب! میری ہڈیاں کمزور اور بوسیدہ ہوگئی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا (بالکل سفید ہوگیا ہے) اور اے میرے رب میں تجھے پکار کے کبھی محروم نہیں رہا۔ ۴) اور میں ڈرتا ہوں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اور میری بیوی بانجھ ہے پس بخش دے مجھے اپنی طرف سے ایک وارث۔ ۵) جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوب کی روایات کا بھی اور اے رب، اس کو پسندیدہ سیرت والا بنائیو۔ ۶) اے زکریا! ہم تمہیں ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا، ہم نے اس سے پہلے کوئی اس کا ہم نام نہیں بنایا۔ ۷) حضرت زکریا نے کہا اے میرے رب! کیسے ہوگا میرے ہاں لڑکا، میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔ ۸) فرمایا ایسا ہی ہوگا، تیرے رب نے فرمایا ہے کہ یہ میرے لئے آسان بات ہے، میں نے تمہیں بھی تو اس سے پہلے پیدا کیا تھا اور تم کچھ بھی نہ تھے۔ ۹) حضرت زکریا نے عرض کی، اے میرے رب! میرے لئے کوئی نشانی ٹھہرا دیجئے۔ جواب ملا تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم بات نہیں کرسکو گے لوگوں سے، تین رات تک۔ درآنحالیکہ تم بالکل تندرست ہوگے۔ ۱۰) پس وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے اشارے سے کہا کہ تم صبح وشام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔ ۱۱) اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے پکڑو، ہم نے اس کو بچپن ہی میں قوت فیصلہ عطا فرمائی تھی۔ ۱۲) اور سوز وگداز اور پاکیزگی بخشی تھی اپنی جناب سے اور وہ نہایت پرہیزگار تھا۔ ۱۳) اور وہ والدین کا فرمانبردار تھا اور وہ سرکش اور نافرمان نہ تھا۔ ۱۴) اور سلامتی ہے اس پر جس روز وہ پیدا ہوا اور جس روز وہ مرے گا اور جس روز وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ ۱۵)

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿١﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿٢﴾

(کاف ھا یا عین ص. ا) یہ ذکر ہے آپؐ کے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی۔ ۲)

حروف مقطعات

كٓهٰيٰعٓصٓ ...... یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ حروف مقطعات کی وضاحت ہم سورۃ البقرہ کے آغاز میں کر چکے ہیں۔ اس پر اگرچہ مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں تاہم قشیری نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے اس کا ایک مفہوم نقل کیا ہے۔ ہم بھی دلچسپی کیلئے اسے نقل کر رہے ہیں۔ ''کاف'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کیلئے کافی ہے۔ اور ''ھا'' سے مراد ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ہدایت دینے والا ہے۔ ''یا'' سے مراد اس کا ید یعنی ہاتھ ہے جو ساری کائنات پر غالب ہے۔ ''عین'' سے مراد عالم ہے کہ وہ سب کو جاننے

Marfat.com

والا ہے۔اور ''ص'' سے مراد صادق ہے یعنی اپنے وعدے کا سچا ہے۔

قرطبی اور روح المعانی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہے کہ آپؓ دعا مانگتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے یا کھیعص اغفرلی '' اے کاف ہا یا عین ص مجھے بخش دے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے۔بعض علماء نے اس کو اسمِ اعظم کہا ہے۔

ذکر کا مفہوم

ذکر ...... بعض اہلِ علم کے نزدیک اسی طرح اُذْکُرْ کے معنی میں ہے۔جس طرح حضرت مریم علیہا السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک تمام انبیاء کرام کا ذکر بصیغہ اُذْکُرْ ہوا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے یہ کہا جارہا ہے کہ غافل انسانوں نے انبیاء کرام کے ذکر کو بھلا دیا اور ان سے جو حکمتیں اور نصیحتیں حاصل کی جاسکتی تھیں ان سے روگردانی کی۔آپؐ از سر نو لوگوں کو اس کی یاددہانی کیجئے تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

بعض دیگر اہلِ علم کے نزدیک ذکر سے پہلے ہٰذا محذوف ہے۔اس سورت میں ہٰذا مبتدا ہوگا اور بعد کا فقرہ اس کی خبر ہوگی۔اس جملے میں تمام انسانوں کو عموماً اور مشرکینِ مکہ کو خصوصاً توجہ دلائی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے تمام بندوں پر برسنے کیلئے تیار رہتی ہے۔جب کوئی بندہ اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے تو وہ اس کی رحمت سے محروم نہیں رہتا۔اور اسی ضمن میں اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی جارہی ہے کہ اس کی رحمت کا محتاج جس طرح ہر انسان ہے اسی طرح اس کے مقرب بندے بھی اس کی رحمت کے محتاج ہیں۔وہ بھی رات کی تنہائیوں میں اپنے رب ہی کو پکارتے ہیں اور پھر جس عاجزی، فروتنی اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہوئے پکارتے ہیں اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بچہ ہمیشہ دودھ اپنی ماں کے سینے میں ڈھونڈتا ہے کسی اور طرف توجہ نہیں کرتا اسی طرح بندوں کو بھی اپنے رب کے آستانے سے ہٹ کر کسی اور آستانے پر نہیں جانا چاہئے کیونکہ یہ آستانہ ان کے رب کا آستانہ ہے۔ رب نے اپنے ذمے یہ کام لے رکھا ہے کہ میں تمام مخلوقات کو عموماً اور اپنے بندوں کو خصوصاً ضروریات زندگی فراہم کروں گا۔ان کی ہر طرح کی ضرورتیں جو ان کی ظاہری اور معنوی تربیت کی ضرورت ہیں، مہیا کروں گا کیونکہ یہ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ انہیں مہیا کی جائیں۔ بچہ جب تک بچپن میں ہے تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اس کے بچپنے کی ضروریات مہیا کرتی ہے۔پھر وہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا ہے تو اس کی ضروریات بھی بڑھتی چلی جاتی اور تبدیل ہوتی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت بھی ساتھ ساتھ ان تمام تبدیلیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں ادا کرتی ہے کیونکہ ربوبیت کا مفہوم ہے اِنْشَاءُ الشَّيْءِ حَالاً فَحَالاً اِلٰی حَدِّ التَّمَام۔

دوسری بات یہ بھی جارہی ہے کہ یوں تو پروردگار کی عنایات اور ربوبیت کا فیضان سب کیلئے ہے حتیٰ کہ جو اس کا انکار کرنے والے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں وہ بھی اس سے محروم نہیں رہتے۔جو اسے ماننے سے انکار کرتا ہے، انکار کیلئے زبان بھی اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے اور اس کے انکار پر کبھی اس کی روزی بند نہیں کی جاتی۔لیکن وہ خصوصی عنایات جو اللہ تعالیٰ کی اپنے بعض بندوں پہ ہوتی ہیں ان کے حصول کیلئے ضروری ہے کہ عبدیت کے تقاضے پیشِ نظر رہیں۔چنانچہ یہاں حضرت زکریا علیہ السلام کیلئے عبدہ کا لفظ لاکر ایک تو ان کے خصوصی مرتبہ ومقام کا اظہار ہے اور دوسرا یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ایسی خصوصی عنایات کیلئے عبدیت کے وہ تقاضے ملحوظ رکھے جانے چاہئیں جو

Marfat.com

حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی دعا میں ملحوظ رکھے تھے۔

عبد کی وضاحت

عبد ایک ایسا لفظ ہے جس کا اطلاق تمام ذی روح اور ذی شعور مخلوقات پر ہوتا ہے۔ جن بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، فرشتے بھی اور انسان بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں حتیٰ کہ اس کو ماننے والے بھی اس کے بندے ہیں اور انکار کرنے والے بھی اس کے بندے ہیں، لیکن عَبْدُہٗ کا اعزاز اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی بندوں کو عطا کرتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا:

؎ عبد دیگر عبدہ چیزے دگر

''عبد ہونا اور بات ہے اور عَبْدُہٗ ہونا اور بات ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کیلئے بھی خصوصی طور پر عَبْدُہٗ کا اعزاز پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ یہاں حضرت زکریا علیہ السلام کیلئے یہ اعزاز دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہوں گے، لیکن بعض مفسرین کی رائے اس سے مختلف ہے۔ بائبل بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ چنانچہ بائبل کی وضاحتوں کو دیکھتے ہوئے صاحب تفہیم القرآن نے حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں ایک نوٹ لکھا ہے ہم اسے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا تعارف

یہ حضرت زکریا علیہ السلام جن کا ذکر یہاں ہو رہا ہے حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان سے تھے۔ ان کی پوزیشن ٹھیک ٹھیک سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے نظامِ کہانت (Priesthood) کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ فلسطین پر قابض ہونے کے بعد بنی اسرائیل نے ملک کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے ۱۲ قبیلوں میں تو سارا ملک تقسیم کر دیا گیا اور تیرہواں قبیلہ (یعنی لاوی بن یعقوب کا گھر) مذہبی خدمات کیلئے مخصوص رہا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی اصل وہ خاندان جو ''مقدس میں خداوند کے آگے بخور جلانے کی خدمت'' اور ''پاک ترین چیزوں کی تقدیس کا کام'' کرتا تھا، حضرت ہارون علیہ السلام کا خاندان تھا۔ باقی دوسرے بنی لاوی مقدس کے اندر نہیں جاسکتے تھے بلکہ خداوند کے گھر کی خدمت کے وقت صحنوں اور کوٹھڑیوں میں کام کرتے تھے۔ سبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے اور مقدس کی نگرانی میں بنی ہارون کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

بنی ہارون کے چوبیس خاندان تھے جو باری باری سے مقدس کی خدمت کیلئے حاضر ہوتے تھے۔ انہی خاندانوں میں سے ایک اَبیاہ کا خاندان تھا جس کے سردار حضرت زکریا علیہ السلام تھے۔ اپنے خاندان کی باری کے دنوں میں یہی مقدس میں جاتے اور خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو بائبل کی کتاب تواریخ اول۔ باب ۲۳، ۲۴)

اِذْنَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ

Marfat.com

شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝

(جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ ۳) عرض کی اے میرے رب! میری ہڈیاں کمزور اور بوسیدہ ہوگئی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے (بالکل سفید ہوگیا ہے) اور اے میرے رب میں تجھے پکار کے کبھی محروم نہیں رہا۔ ۴)

دُعا کے آداب

یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو آپؑ نے فرزند کی ولادت کیلئے کی ہے۔ ہم سورۂ ال عمران میں اس کی کسی حد تک وضاحت کر چکے ہیں۔ اسرائیلی روایات کے مطابق اس وقت آپؑ کی عمر ۷۰ سال اور بعض روایات کے مطابق ۱۲۰ سال تھی۔ اور آپؑ کی اہلیہ محترمہ کی عمر ۹۸ سال ہوگئی تھی اور ابھی تک آپؑ کے ہاں کوئی فرزند تولد نہ ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ دعا آپؑ نے ہیکلِ سلیمانی میں اعتکاف کی حالت میں کی۔ اس کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ دعا جو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتی ہے اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ دعا کے حقیقی آداب کیا ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؑ نے یہ دعا نہایت خاموشی سے کی ہے۔ رات کے ایسے حصے میں جبکہ دیکھنے اور سننے والا کوئی نہ تھا اور ہر سو ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ سونے والے گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے اور حضرت زکریا علیہ السلام ایسی گھمبیر تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلائے اظہارِ مدعا کر رہے تھے۔ قرآنِ کریم نے بھی ہمیں جو دعا کے آداب سکھائے ہیں اس میں یہی فرمایا گیا ہے کہ اپنے رب کو عاجزی اور نہایت خاموشی سے پکارو اور جو مانگنا چاہو اسی سے مانگو کیونکہ تنہائی اور خلوت کی دعائیں عموماً ریا اور دکھاوے سے پاک ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ سینوں کے بھید جانتا ہے اس لئے اس کے سامنے ایسی دعائیں جس میں ریا کا شائبہ بھی ہو کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

دوسری خوبی دعا کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؑ نے عرضِ مدعا سے پہلے تمہید میں ایسی باتیں عرض کی ہیں جس میں اگر ایک طرف انہوں نے اپنا سینہ چیر کے رکھ دیا ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے درِ رحمت پر اس طرح دستک دی ہے کہ رحمت کو بھی پیار آنے لگا ہوگا۔ اپنی جسمانی کمزوری اور ناتوانی کو سفارش کے طور پر پیش کیا ہے کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمزور اور ناتوان بندوں پر ہمیشہ مہربان رہتا ہے اور جب کمزوری اور ناتوانی بھی اس انتہا کو پہنچ جائے کہ اس کے بعد مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا ہو تو اللہ تعالیٰ کے طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں ہونے دیتا اور پھر اپنی دعا میں مزید اپیل پیدا کرنے کیلئے ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ میں تو ہمیشہ سے اسی گھر کا گدا رہا ہوں اور یہی وہ دروازہ ہے جہاں سے میری امیدیں پوری ہوتی رہی ہیں۔ میں اس کے علاوہ کسی اور دروازے کو نہیں جانتا۔ اب جبکہ ضرورت ایسی آپڑی ہے کہ تیرے سوا کوئی پوری بھی نہیں کرسکتا تو میں تیرا دروازہ چھوڑ کر کہاں جاؤں۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝

(اور میں ڈرتا ہوں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اور میری بیوی بانجھ ہے پس بخش دے مجھے اپنی طرف سے ایک وارث۔ ۵) جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوب کی روایات کا بھی اور اے رب، اس کو پسندیدہ سیرت والا بنائیو۔ ۶)

Marfat.com

دُعا کا ایک اور سبب

اس آیتِ کریمہ میں تیسری بات یہ عرض کی کہ یا اللہ میں اس بڑھاپے میں یہ دعا اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے اپنے قریبی عزیزوں اور بھائی بندوں کے بارے میں فکرمندی ہے کہ وہ اپنی بے دینی یا دین سے لاپرواہی کی وجہ سے کہیں اس ذمہ داری پر جو میرے اٹھ جانے سے خالی ہوگی فائز ہو کر اس کے تقاضوں کو پامال نہ کر دیں۔ میں ازاول تا آخر تیرے دین کا خدمت گزار ہوں اور تیرے گھر کا جاکر ہوں۔ اگر میرے ہی خاندان اور میرے عزیزوں میں سے کچھ ایسے لوگ میری جگہ لینے میں کامیاب ہوگئے جو اس منصب کے اہل نہیں اور ان کے اس منصب پر فائز ہو جانے کا اندیشہ اس لئے بھی ہے کہ میرا کوئی وارث نہیں، تو ایسی صورت میں میرے قریبی عزیزوں میں کسی شخص کو بھی یہ جگہ مل سکتی ہے لیکن کسی میں بھی اس کی اہلیت موجود نہیں۔ تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ آلِ یعقوب کی روایات کا احترام نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے گھر کی تولیت کو ایک کھیل بنا کے رکھ دیں گے اور بطورِ کاہنِ اعظم کے جو خدمات میں انجام دیتا رہا ہوں انہیں خطرناک حد تک نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اپنی ناتوانی کا ذکر حضرت زکریا علیہ السلام پہلے ہی کر چکے تھے اب اپنی بیوی کے حوالے سے گزارش کر رہے ہیں کہ میری بیوی بانجھ ہے۔ آج تک اس کے گھر میں کوئی اولاد نہیں ہوئی اور اب تو وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی ہے جہاں اولاد کی امید ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے میں نے تیرے سامنے جھولی پھیلائی ہے کیونکہ ایسی حالت میں جبکہ اسباب کام کرنا چھوڑ دیں اور بظاہر کوئی سہارا نظر نہ آتا ہو تو پھر تیری ذات کے سوا کوئی ایسا نہیں جس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے تو الٰہی یہ بوڑھا جس کی ہڈیوں میں گودا بھی نہیں رہا جس کا سر بڑھاپے سے ہلنے لگا ہے، جس کی بیوی بانجھ ہو چکی ہے لیکن تیرے دین کے تقاضے میرے بعد ایک صحیح وارث اور جانشین کا تقاضا کر رہے ہیں۔ میں اپنی اس ضرورت کو لے کر تیرے سوا کس آستانے پر جاؤں۔ میں نے پہلے بھی ہمیشہ تیرے ہی دروازے پر دستک دی ہے اب بھی تیرے آستانے پر بیٹھا ہوں اور اس وقت تک بیٹھا رہوں گا جب تک میری دعا کو قبولیت کا شرف نہیں مل جاتا۔

قسم آستاں کی نہ اٹھیں گے ہرگز
یہیں دن چڑھے گا یہیں رات ہوگی

فرزند کیلئے دعا صرف اس لئے نہیں کی جا رہی کہ آپؑ کو ایک بیٹے کی خواہش ہے بلکہ اس لئے کی جا رہی ہے کہ فکر اس بات کی ہے کہ آلِ یعقوبؑ کی وراثت کو کوئی گزند نہ پہنچے اور اللہ تعالیٰ کے گھر کی خدمت کسی نااہل کے سپرد نہ ہو جائے۔ اس لئے عرض کی کہ یا اللہ! بیٹا وہ عطا فرما جو پسندیدہ سیرت والا ہو۔ ایسا بیٹا جو صحیح معنی میں میرا جانشین ہو، جو تیرے دین کی خدمت کرنے کا اہل ہو۔ آلِ یعقوبؑ کی وراثت کو اس سے کوئی نقصان پہنچنے کی بجائے عزت و افتخار ملے۔

جو دعا صحیح وقت پر صحیح مقصد کیلئے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے صحیح جذبے کے ساتھ مانگی جائے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے رد نہیں کی جاتی۔ حضرت زکریاؑ نے جس طرح دعا مانگی اور جس وقت مانگی اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا اور پھر جس طرح اپنی بے بسی اور ناتوانی کو دعا کی تمہید کے طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش فرمایا اس نے قبولیتِ دعا کو اور قریب کر دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اولاد کی خواہش فطری تقاضا ہے لیکن حضرت زکریاؑ نے اپنی کسی خواہش کے تحت نہیں بلکہ اس عظیم مقصد کے حوالے سے دعا مانگی جو آپؑ کی زندگی کا سرمایہ اور آپؑ کیلئے ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے اور آپؑ کے اٹھ جانے سے نااہلوں کے آجانے کے خطرے کے پیشِ نظر اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ ان تمام مبارک عوامل نے مل کر درِ قبولیت پر دستک دی تو وہاں سے قبولیت بشارت بن کر نازل ہوئی۔

Marfat.com

یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ ۣ اسْمُهٗ یَحْیٰی ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ۝۷

(اے زکریا! ہم تمہیں ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا، ہم نے اس سے پہلے کوئی اس کا ہم نام نہیں بنایا۔ ۷)

سَمِیٌّ کا معنی

سَمِیٌّ ......کا معنی ہے، ہم نام۔ یہ اس کا متداول معنی ہے، لیکن کبھی نظیر اور مثال کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ ہم آپؑ کو جو بیٹا دے رہے ہیں اور اس کا نام بھی تجویز کر رہے ہیں۔ اس نام کا لڑکا اس سے پہلے ہم نے کسی کو عطا نہیں کیا یعنی یہ ایک ایسا نادر نام ہے یا پہلا نام ہے جو کسی بچے کا رکھا جا رہا ہے اور دوسری صورت میں مفہوم یہ ہے کہ باپ بڈھا کھوسٹ ہو اور ماں بانجھ ہو اور عمر سو سال سے تجاوز کر جائے تو ایسے جوڑے کے ہاں اولاد کی کوئی نظیر اس سے پہلے موجود نہیں، لیکن اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپؑ کے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود آپؑ کو فرزند عطا فرما کر ایک مثال اور نظیر بنا دیں۔

حضرت زکریاؑ کی پُرخلوص دعا دراجابت سے بشارت بن کر اتری تو ہاتفِ غیب نے حضرت زکریاؑ کو پکار کر خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ آپؑ کو خوشخبری دیتے ہیں ایک ایسے سعادت مند بیٹے کی جس کا نام یحییٰ ہوگا، اور یہ ایسا بے نظیر بچہ ہوگا کہ جس کا ہم نام ہم نے اس سے پہلے پیدا نہیں فرمایا اور یہ ان تمام صفات سے متصف ہوگا جو آلِ یعقوبؑ کے وارث کیلئے ضروری ہیں اور یہ صحیح معنی میں ویسا ہی ہوگا جیسا آپ اپنے جانشین کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا ۝۸

(حضرت زکریا نے کہا اے میرے رب! کیسے ہوگا میرے ہاں لڑکا، میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔ ۸)

سوال کا صحیح محمل

حضرت زکریا علیہ السلام کے اس سوال کو کہ میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا؟ مفسرین نے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ جو لوگ سطحی فکر کے مالک ہیں اور نفسیاتی گہرائیوں کو نہیں سمجھتے انہوں نے ایمان کی بحث چھیڑی ہے۔ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی بشارت یا کسی فیصلے پر تعجب کا اظہار یا اطمینان کیلئے کوئی سوال یہ ایک طرح کا تردد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پوچھنے والا اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اطمینان اور یقین نہیں رکھتا جبکہ ایمان تو نام ہی یقین کا ہے اور پیغمبر تو یقین کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ اعتراض ہی غیر متعلق ہے کیونکہ سوال یہاں اس بات کا نہیں ہے کہ مجھے اس پر ایمان یا یقین نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے حالات میں اولاد پیدا کر سکتے ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ جب کوئی بشارت اس طرح کی ہو جس کیلئے حالات انتہائی نامساعد ہوں اور بظاہر اسباب اس کا کوئی امکان نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ مانگنے والا اس کا انتہائی شوق اور تڑپ رکھتا ہو تو ایسی صورت میں اچانک بشارت کے ملنے سے جو بے انتہا خوشی اور مسرت ہوتی ہے اس کی وجہ سے بعض دفعہ زبان پر ایسے کلمات آ جاتے ہیں جس سے مقصود بشارت کا انکار یا اس میں شک نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک فطرت کی آواز ہے جو انتہائی وارفتگی کے عالم

Marfat.com

میں انسان کے منہ سے نکلتی ہے۔اور آدمی اگر اپنے گردوپیش واقعات کا تجسس کرے تو اسے ایسی مثالیں مل جائیں گی کہ بے انتہا خوشی میں بعض دفعہ لوگ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں اور سننے والے اسے محض خوشی کا اظہار سمجھتے ہیں۔

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یقین کے درجات اور مراتب ہیں۔آدمی ایک بات پر یقین رکھتا ہے لیکن جب وہی بات اس سے ایسے حالات میں کہی جائے جن میں اس کا دور دور تک امکان نہ ہو تو وہ پلٹ کر ضرور پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے امکان یا وقوع میں اسے شبہ ہے بلکہ وہ اپنے یقین میں مزید افزونی چاہتا ہے۔یوں تو ہر اہلِ یقین کے یہاں یقین ترقی کرتا رہتا ہے اور انبیائے کرام کے یہاں چونکہ مراتب کی کوئی انتہا نہیں اس لئے وہاں ترقی کا سفر زیادہ شائع وذائع ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب پروردگار سے دعا کی کہ الٰہی مجھے یہ دکھایا جائے کہ مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں تو پروردگار نے فرمایا کہ کیا تمہیں اس بات کا یقین نہیں کہ ہم مردے کو زندہ کرسکتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی کہ میرے یقین میں کوئی کمی نہیں، البتہ میں دل کا مزید اطمینان چاہتا ہوں۔ ایسی ہی کچھ کیفیت حضرت زکریاؑ کے یہاں بھی معلوم ہوتی ہے۔

محبت کی دنیا کے اپنے طور اطوار ہیں۔بیٹے کی خواہش جس طرح ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اسی طرح محبت کا معاملہ بھی ہے۔ بڑھاپا اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے اور تا حال یہ خواب تشنۂ تعبیر ہے۔عمر بھر کی خواہش کو جب اچانک تعبیر ملی اور بشارتِ خداوندی نے آپؑ کو نہال کردیا تو زندگی بھر کی محرومی نے اگر تعجب کے اظہار کا راستہ اختیار کیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور ایمان کی کیا بحث ہے؟

بعض مفسرین نے اس کا ایک دوسرا مفہوم مراد لیا ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ نے اظہارِ تعجب نہیں فرمایا تھا بلکہ وضاحت کیلئے درخواست کی تھی کہ یہ بتادیا جائے کہ میرے یہاں بیٹا کیسے ہوگا؟ کیا ہم میاں بیوی جوان بنادیئے جائیں گے؟ یا اور کوئی ایسا حیرت انگیز طریقہ اختیار کیا جائے گا جو سراسر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہوگا۔ظاہر ہے کہ اگر اس سے مراد وضاحت کی طلب ہے تو پھر تو اعتراض کی کوئی بات باقی نہیں رہ جاتی۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ نے بیٹے کی بشارت ہاتفِ غیب سے سنی تھی۔انہوں نے احتیاط کے طور پر مزید اطمینان کرنا چاہا۔اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ یہ میرا واہمہ ہو یا اپنے ہی گنبدِ دل کی صدا ہو جو میرے کانوں نے سنی ہے۔اگرچہ ہمیں اس بات کو ماننے میں قدرے تامل ہے کیونکہ اگر حضرت زکریاؑ کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر مانا جائے تو پیغمبر پر ایسی کیفیت کبھی نہیں طاری ہوتی کہ وہ اس طرح کے معاملات میں تردد کا شکار ہو۔ہاں البتہ! اگر انہیں پیغمبر کی بجائے کاہنِ اعظم کا درجہ دیا جائے جیسا کہ تورات دیتی ہے تو پھر اس بات کا امکان ہے۔

عِتِيًّا ...... اس بوڑھے کو کہتے ہیں جس کی ہڈیاں بھی خشک ہوگئی ہوں۔علامہ راغب اصفہانی نے اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ای حالة لاسبیل الی اصلاحها ومداواتها ''یعنی بڑھاپے کی وہ حالت جب نقاہت انتہا کو پہنچ جائے اور اس کے دور ہونے کی کوئی صورت نہ ہو۔''

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ﴿٩﴾

(فرمایا ایسا ہی ہوگا، تیرے رب نے فرمایا ہے کہ یہ میرے لئے آسان بات ہے، میں نے تمہیں بھی تو اس سے پہلے پیدا کیا تھا اور تم کچھ بھی نہ تھے۔ ۹)

Marfat.com

کَـذٰلِکَ ......کی خبر محذوف ہے۔اس حذف نے کلام میں زور پیدا کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپؑ کو تعجب ہے کہ اس عمر میں بیٹا کیسے پیدا ہوگا؟ کیونکہ اسباب اس کی اجازت نہیں دیتے تو خبر دینے والے نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہا گیا ہے، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس حال میں پیدا کیا کہ تمہارا کوئی وجود نہ تھا۔ جو ذات عدمِ محض سے انسان کو وجود دے سکتی ہے اس کیلئے بوڑھے ماں باپ سے اولاد پیدا کر دینا کیا مشکل بات ہے؟

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ﴿۱۰﴾

(حضرت زکریا نے عرض کی، اے میرے رب! میرے لئے کوئی نشانی ٹھہرا دیجئے۔ جواب ملا تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم بات نہیں کر سکو گے لوگوں سے، تین رات تک۔ درآنحالیکہ تم بالکل تندرست ہو گے۔ ۱۰)

نشانی کیلئے درخواست

معلوم ہوتا ہے کہ اس خوشی سے حضرت زکریاؑ پر ایک وارفتگی کی کیفیت طاری ہے۔ ایک تو زندگی بھر کی آرزو پوری ہو رہی ہے اور دوسری یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی عنایات مسلسل متوجہ ہیں۔ اس وارفتگی میں پروردگار سے عرض کی کہ یہ کرم نوازی کس وقت ہوگی؟ کب میرے گھر میں رحمت اترے گی؟ مجھے اس کا وقت بتا دیجئے، کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے جس سے اندازہ ہو جائے کہ دل کی بند کلی کے کھلنے کا وقت آ گیا ہے۔ پروردگار نے اس عرض کو قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ آپ کیلئے نشانی یہ ہے کہ آپؑ تین راتوں تک لوگوں سے بات نہ کر سکیں گے اور تین راتوں سے مراد صرف راتیں نہیں بلکہ شب و روز مراد ہیں۔ اور یہ باتیں نہ کرنا کسی بیماری کے سبب سے نہیں ہوگا بلکہ یہ علامت ہوگی کہ اب آپؑ کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ سَوِیًّا ...... کا معنی ہے ایسا شخص جو مرض اور عیب سے بری ہو۔ اس لفظ لانے کا مفہوم یہ ہے کہ آپؑ پر جو تین راتوں تک بات چیت نہ کر سکنے کی کیفیت طاری رہے گی یہ کسی بیماری کا نتیجہ نہیں ہوگی بلکہ یہ محض علامت ہوگی کہ حضرت یحیٰؑ کی ولادت کا وقت آ گیا ہے۔

بعض لوگوں نے اس کا مفہوم یہ مراد لیا ہے کہ آپؑ تین راتوں تک مسلسل کسی سے بات نہ کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؑ کو بات نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ان حضرات نے اس بات پر توجہ نہیں فرمائی کہ حضرت زکریاؑ نے نشانی مانگی تھی تو اگر حکم دے کر حضرت زکریا کو تین راتوں تک خاموش رکھا گیا تو اس میں نشانی کی کیا بات ہے۔ نشانی تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ آپؑ بولنے پر قادر نہ رہیں اور قادر نہ رہنا بظاہر مرض معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آپؑ بھلے چنگے اور صحت مند ہوں گے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا دیا گیا۔ یہ آپؑ کی نبوت کی نشانی تھی۔ اس لئے ساتھ ہی اس کی تردید بھی فرمائی کہ یہ کسی بیماری کے سبب سے نہ تھا بلکہ نشانی کے طور پر تھا۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَةً وَّعَشِیًّا ﴿۱۱﴾

(پس وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے اشارے سے کہا کہ تم صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔ ۱۱)

Marfat.com

محراب کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں ایک لفظ محراب استعمال ہوا ہے۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا ہے کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی محراب ہوگا جیسے ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑا ہونے کیلئے بنایا جاتا ہے۔ حضرت زکریاؑ ایسے ہی کسی محراب میں تھے کہ ان پر بشارت نازل ہوئی اور پھر ان کی درخواست پر علامت کے طور پر تین راتوں تک ان سے تکلم کی صلاحیت واپس لے لی گئی۔ چنانچہ اس محراب سے نکل کر آپؑ لوگوں کی طرف آئے تو محراب سے یہ محراب مراد نہیں ہے جیسا کہ گمان کیا گیا ہے بلکہ اہلِ کتاب کی عبادت گاہوں کی عمارت سے متصل سطح زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے تھے انہیں محراب کہا جاتا تھا۔ ان میں عبادت گاہ کے مجاور اور خدام رہتے تھے اور انہیں کمروں میں لوگ اعتکاف بھی کرتے تھے۔ ممکن ہے ایسے ہی کسی کمرے میں حضرت زکریاؑ بھی معتکف ہوں جب انہیں یہ بشارت دی گئی۔ چنانچہ آپؑ وہاں سے نکلے چونکہ آپؑ بول نہیں سکتے تھے اور طریقہ یہ تھا کہ جب کاہنِ اعظم اندر عبادت گاہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں مصروف ہوں تو دوسرے لوگ اندر نہیں جا سکتے تھے۔ چنانچہ آپؑ جب باہر نکلے تو لوگ آپؑ کی طرف متوجہ ہوئے لیکن آپؑ نے انہیں حمد و تسبیح میں مشغول رہ کر انتظار کرنے کا اشارہ کیا جس کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑا راز ان پر منکشف ہونے والا ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ تسبیح و تحلیل میں مشغول رہ کر اس کا انتظار کریں۔ اس کے بعد یہاں کچھ محذوفات ہیں جو غور کرنے سے سمجھ میں آتے ہیں کہ ان تین راتوں کے ختم ہونے سے پہلے یا اس کے فوراً بعد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ وہ اپنے عظیم باپ کی نگرانی میں پلے بڑھے۔ ایک خاص عمر کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے نوازا۔ کہا جاتا ہے کہ نبوت انہیں بچپن میں دے دی گئی لیکن لوگوں کی اصلاح کا کام اور نبوت کا اعلان آپؑ نے کم و بیش تیس سال کی عمر میں شروع کیا۔ چنانچہ آپ پر اللہ تعالیٰ کے جو خصوصی احسانات ہوئے ان میں سے چند ایک کا ذکر اگلی آیت میں کیا جا رہا ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ
وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾

(اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے پکڑو، ہم نے اس کو بچپن ہی میں قوت فیصلہ عطا فرمائی تھی۔ ۱۲) اور سوز و گداز اور پاکیزگی بخشی تھی اپنی جناب سے اور وہ نہایت پرہیزگار تھا۔ ۱۳) اور وہ والدین کا فرمانبردار تھا اور وہ سرکش اور نافرمان نہ تھا۔ ۱۴)

کتاب تھامنے کا حکم

حضرت یحییٰ علیہ السلام جب سنِ رُشد کو پہنچے تو آپؑ کو حکم دیا گیا کہ آپؑ مضبوطی سے کتاب کو تھامیں۔ کتاب سے مراد تورات ہے کیونکہ یہی کتاب انجیل کے نزول تک اہلِ کتاب کیلئے رہنمائی کا فرض انجام دیتی رہی ہے۔ خود حضرت یحییٰ پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی۔ مضبوطی سے تھامنے کا مطلب یہ تھا کہ شیطان اور اس کے اولیاء آپؑ کو اس کتاب سے برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ آپؑ اس کتاب پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے تو قدم قدم پر آپؑ کیلئے مشکلات پیدا کی جائیں گی۔ آپؑ کی طبیعت کو اس طرف سے ہٹانے کی تدبیریں کی

Marfat.com

جائیں گی لیکن آپؑ کا کام یہ ہے کہ آپ ان تمام موانع کے باوجود اس کتاب سے اپنا رشتہ مضبوط رکھیں۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ جب آپ پر لوگوں کی اصلاح کا فریضہ عائد کیا جائے اور اس کتاب کی تبلیغ و دعوت آپ کی ذمہ داری ٹھہرے تو آپ اس کو نہایت مضبوطی اور توانائی کے ساتھ انجام دیں۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو نبوت عطا فرمائی تو آپؑ نے کتاب اللہ کا حق ادا کرتے ہوئے ملک کے گوشے گوشے اور دور افتادہ صحراؤں اور دشوار گزار پہاڑوں میں جا جا کر لوگوں کو پیغام حق سنایا۔ خود درویش منش ہوتے ہوئے قوم کے ہر چھوٹے بڑے طبقے کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ بڑے سے بڑے آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ بدکردار لوگوں کو بڑی سختی سے جھنجوڑا، بگڑے ہوئے علماء کو درشت لہجے میں خطاب کیا۔ فرمایا ''کہ اے سانپ کے بچو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو، پس توبہ کے موافق پھل لاؤ اور اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ان پتھروں سے ابراہام کیلئے اولاد پیدا کر سکتا ہے اور اب درخت کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے۔ پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ (متی باب ۳، آیت ۷ تا ۱۰)

آپؑ کی دعوت صرف عوام تک محدود نہ تھی بلکہ شاہی دربار بھی آپؑ کی حق گوئی اور نعرۂ حق سے لرزہ براندام تھے۔ بادشاہِ وقت ہیرودیس نے اپنے بھائی فلپ کی منکوحہ بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ آپؑ نے اس کو برملا جا کر کہا کہ اپنے بھائی کی بیوی کو رکھنا تیرے لئے روا نہیں۔ انجیل مرقس کی چند آیات ہم یہاں نقل کر رہے ہیں اسے ملاحظہ فرمائیں۔

''پس ہیرودیاس اس سے دشمنی رکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ اسے قتل کرائے مگر نہ ہو سکا کیونکہ ہیرودیس یوحنا کو راستباز اور مقدس آدمی جان کر اس سے ڈرتا اور اسے بچائے رکھتا تھا اور اس کی باتیں سن کر بہت حیران ہو جاتا تھا مگر سنتا خوشی سے تھا اور موقعہ کے دن جب ہیرودیس نے اپنی سالگرہ میں اپنے امیروں اور فوجی سرداروں اور گلیل کے رئیسوں کی ضیافت کی۔

اور اسی ہیرودیاس کی بیٹی اندر آئی اور ناچ کر ہیرودیس اور اس کے مہمانوں کو خوش کیا تو بادشاہ نے اس لڑکی سے کہا جو چاہے مجھ سے مانگ، میں تجھے دوں گا اور اس سے قسم کھائی کہ جو تو مجھ سے مانگے گی اپنی آدھی سلطنت تک تجھے دوں گا اور اس نے باہر جا کر اپنی ماں سے کہا کہ میں کیا مانگوں؟ اس نے کہا: یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر۔ وہ فی الفور بادشاہ کے پاس جلدی سے اندر آئی اور اس سے عرض کی میں چاہتی ہوں کہ تو یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں ابھی مجھے منگوا دے۔ بادشاہ بہت غمگین ہوا اور اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب سے اس سے انکار کرنا نہ چاہا۔ پس بادشاہ نے فی الفور ایک سپاہی کو حکم دے کر بھیجا کہ اس کا سر لائے۔ اس نے جا کر قید خانہ میں ان کا سر کاٹا اور ایک تھال میں لا کر لڑکی کو دیا اور لڑکی نے اپنی ماں کو دیا۔ (مرقس باب ۶، آیت ۱۹ تا ۲۸)

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کتاب کو مضبوطی سے تھامنے اور اس کی تبلیغ و دعوت کا حق ادا کرنے کے فرض کی انجام دہی میں اپنا سر کٹوا دیا، لیکن اپنی ذمہ داری پر آنچ نہیں آنے دی۔

حکم کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام جو پر خصوصی عنایات فرمائی ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے اور بعض عنایات کا ذکر یہاں فرمایا جا رہا ہے۔ ان میں سے پہلی عنایت یہ ہے کہ آپؑ کو حکم سے نوازا گیا۔ حکم سے مراد وہ قوت و صلاحیت ہے جس

Marfat.com

سے آدمی حق و باطل، خیر وشر اور حُسن وقبح میں فرق کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور وہ قوت فیصلہ ہے جس سے وجہ سے جب آدمی کسی چیز کے بارے اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ صحیح یہ ہے تو پھر اس کے فیصلہ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور کوئی بہکاوا اور کوئی دباؤ اسے فیصلہ کرنے سے مانع نہیں ہوتا۔

حنان کا مفہوم

دوسری اللہ تعالیٰ کی عنایت آپؑ پر یہ ہوئی کہ آپؑ کو حنان عطا فرمایا گیا۔ حنان اس سوز وگداز اور قلب وروح کی اس رقت کو کہتے ہیں جس سے حیوانی صفات پر قابو پانے اور انسانی صفات کو توانائی دینے میں مدد ملتی ہے۔ یہی درحقیقت انسانیت کا سرمایہ ہے۔ جو شخص قلب کے سوز وگداز سے محروم ہے وہ انسان ہوتے ہوئے بھی کبھی حیوان ہوتا ہے اور کبھی درندہ بن جاتا ہے اور مزید آپؑ کو دل ودماغ کی پاکیزگی عطا فرمائی۔ یہ پاکیزگی دراصل قلب ودماغ کے سوز کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ وہ پاکیزگی ہے جس کے بعد عقل، عقلِ سلیم بن جاتی ہے اور قلب، قلبِ منیب ہو جاتا ہے۔ اور خواہشات کے جھاڑ جھنکار کو ایسی آگ لگتی ہے کہ ہر غلط چیز جل کے بھسم ہو جاتی ہے اور آدمی اپنے پروردگار سے یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

راہِ خدا کے سالکوں کو یہ صفات اور فضائل پیدا کرنے کیلئے نہ جانے کیسی کیسی محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام اس عظیم سرمایہ کے پیدائشی طور پر وارث ٹھہرائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ انہیں اپنی جناب سے عطا فرمایا۔ چنانچہ ان صفات کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے ظاہری اعمال اور اخلاق وکردار میں بھی نہایت پرہیزگار اور متقی تھے۔ ان کا باطن تو مجلا تھا ہی، ان کا ظاہر بھی دنیوی آرائشوں سے پاک تھا۔

ان کے اتقاء اور دنیوی خواہشوں سے دور رہنے کا حال یہ تھا کہ انہوں نے زندگی بھر دنیا کی کسی چیز سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ ایسے عقاب تھے جنہوں نے اپنا آشیانہ تک نہیں بنایا۔ جنگل میں چلے جاتے اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں سے اپنی بھوک مٹاتے۔ وہ اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنتے اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے۔ اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ منادی کرتے پھرتے تھے کہ "توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی قریب آگئی ہے۔" (متی: ۲۔۳)

وہ اپنے والدین کے نہایت فرمانبردار تھے۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنے والدین پر کوئی بار نہیں ڈالا۔ مائیں اپنے بچوں کی تخلیق کیلئے نو مہینوں تک کیسی جانکاہی سے گزرتی ہیں لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام کی وجہ سے ان کی والدہ محترمہ کو یہ تکلیف بھی اٹھانا نہ پڑی اور پھر ماں باپ دونوں بچے کی تربیت کیلئے کیسی کیسی صعوبتیں اٹھاتے ہیں لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے ان فرائض سے بھی گراں بار نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے وہ خوبیاں ان کے اندر پیدا کر دیں جو تربیت کے مسلسل عمل سے بھی شاید پیدا نہ ہوں۔

جَبَّارٌ اور عَصِیٌّ کی وضاحت

ان کی زندگی ایسے اوصاف کا مجموعہ تھی جن میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے اور انہیں جمع کرنے کیلئے انتہا کا ضبطِ نفس درکار ہے مثلاً

Marfat.com

ایک طرف w تو وہ بادشاہوں کے درباروں میں پہنچ کر انہیں ان کی فاسقانہ حرکتوں پر آزادانہ ٹوکتے تھے اور بڑے سے بڑے آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے لیکن دوسری طرف حال یہ تھا کہ نہایت مسکینی اور درویشی کی زندگی گزارتے تھے جس میں نہ اچھی غذا کا دخل تھا اور نہ کسی اچھے لباس کا۔ ایسے متضاد اوصاف کا جمع کر لینا ان کیلئے اس لئے ممکن تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرتے تھے۔ شریعتِ خداوندی کے سامنے اپنی ذات کی نفی کر چکے تھے۔ اس لئے کسی قسم کے گناہ اور نافرمانی کا سایہ بھی ان کی زندگی پر نہیں پڑا تھا۔ ایسے اوصاف کا حامل شخص صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اہلِ دنیا کے نام نہاد عہدہ و منصب سے وہ کبھی خوف نہیں کھاتا۔ ایسی طبیعت کا لازمی اقتضاء یہ ہونا چاہئے کہ وہ عام انسانوں کیلئے سخت گیر اور جابر ثابت ہو کیونکہ جو طاقتور کو خاطر میں نہیں لاتا وہ ضرور کمزوروں پر جبر کرتا ہے لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام کا حال یہ تھا کہ وہ مسکینوں کے سامنے انتہائی مسکین اور ظالموں کے سامنے انتہائی طاقتور تھے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ نہ وہ جبار تھے اور نہ وہ نافرمان تھے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾

(اور سلامتی ہے اس پر جس روز وہ پیدا ہوا اور جس روز وہ مرے گا اور جس روز وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ ۱۵)

انسان کیلئے مشکل اوقات

انسان دنیا میں آنے کے بعد جب عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو کامیابیوں سے بھی سرفراز ہوتا ہے اور ناکامیاں بھی دامن گیر ہوتی ہیں اور ان کے دیکھنے اور جاننے والے سینکڑوں لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں زندگی گزارنے والے کی محنت کا بھی دخل ہوتا ہے اور تقدیر کے فیصلے بھی شامل ہوتے ہیں لیکن انسان سے متعلق تین وقت ایسے ہیں جن میں کامیابی یا ناکامی سراسر انسان کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عدلِ خداوندی بھی اپنا کام کرتا ہے لیکن اہلِ دنیا اس بارے میں نہیں جانتے کہ ان تین وقتوں میں کسی شخص کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ تین وقت انسان کی پیدائش، اس کی موت اور اس کے دوبارہ اٹھائے جانے سے متعلق ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ اسلام نے جس طرح زندگی گزاری ان کے جاننے والے معترف ہیں کہ وہ نہایت پاکیزہ زندگی تھی۔ ان کی زندگی میں آرام و راحت اور خوش عیشی کا کوئی لمحہ نہیں تھا۔ ایک مقصدی زندگی تھی جس میں ہر وقت مقصد کی ادائیگی کی فکر تھی اور اسی فکر کے نتیجے میں آخر شہادت کی موت کو پہنچے۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا آپ کی موت کو مظلومانہ موت قرار دے، لیکن درحقیقت ان کی زندگی اور موت نہایت کامیاب اور قابلِ رشک تھیں کیونکہ یہ تین اوقات جو انسان کیلئے سب سے زیادہ سخت اور گراں ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کیلئے یہی اوقات اللہ تعالیٰ کی عنایات کا مورد بنے۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ جب وہ پیدا ہوئے تو سلامتی نے ان کا استقبال کیا، فرشتوں نے خوشی کے ترانے گائے اور جس دن وہ اس دنیا سے سفر کریں گے تو فرشتے ان کے استقبال کیلئے موجود ہوں گے اور وہ مبارک اور سلامت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں گے اور جب انہیں قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو اس روز بھی تحیت کے نعروں کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا جائے گا۔ دنیا نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اہلِ دنیا کیا جانیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے بدلے میں کس قدر اجر و ثواب اور انعامات سے وہ نوازے گئے۔ لیکن وہ تین اوقات جو انسانوں کیلئے انتہائی سخت ہیں ان میں تو عزت و تکریم اور مسرت و شادمانی بارش کی طرح ان پر برستی رہی۔

Marfat.com

وَاذْكُرْ

فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ
مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا
سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ إِنَّمَا
أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ
وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ
عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا
مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَأَجَاءَهَا
الْمَخَاضُ إِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا
وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ
رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ
رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ
الْبَشَرِ أَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْ إِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ
الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۚ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ
شَيْئًا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يٰأُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ أَبُوْكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ
أُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ

Marfat.com

صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ﴿٣٠﴾
وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا
دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلَامُ
عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾ ذَٰلِكَ عِيسَى
ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلَّهِ أَن
يَتَّخِذَ مِن وَلَدٍ ۖ سُبْحَانَهُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن
فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾ وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٣٦﴾
فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ
يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٣٧﴾ أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا ۖ لَٰكِنِ الظَّالِمُونَ
الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ
الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ
الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾ ع

رکوع: ٢۔ (اور اے پیغمبر کتاب میں مریم کی سرگزشت بیان کیجئے جب وہ الگ ہوگئیں اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا۔ ١٦) پس اس نے اپنے آپ کو لوگوں سے پردے میں کر لیا تو ہم نے اس کی طرف اپنے جبرائیل کو بھیجا جو اس کے سامنے ایک کامل بشر کی صورت میں نمودار ہوا۔ ١٧) حضرت مریم نے کہا کہ اگر تم کوئی خدا ترس آدمی ہو تو میں تم سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ ١٨) حضرت جبرائیل نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ ١٩) مریم نے کہا میرے لڑکا کیسے ہوگا؟ حالانکہ نہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ میں بدچلن ہوں۔ ٢٠) فرشتے نے کہا یونہی ہوگا، تیرے رب کا ارشاد ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے اور ہم یہ اس لئے کریں گے تاکہ لوگوں کیلئے اپنے قدرت کی نشانی اور اپنی جانب سے ایک رحمت بنائیں اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ٢١) پس حضرت مریم نے اس بچہ کا حمل اٹھا لیا اور وہ اس کو لے کر ایک دور کے مقام

Marfat.com

کو چلی گئیں۔ ۲۲) پس لے آیا اس کو دردِزہ کھجور کے تنے کے پاس، اس وقت اس نے کہا کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میں بھولی بسری ہو چکی ہوتی۔ ۲۳) پس کھجور کے نیچے سے فرشتے نے اس کو آواز دی کہ غمزدہ نہ ہو تمہارے پائیں سے تمہارے پروردگار نے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ ۲۴) اور اپنی طرف کھجور کے تنے کو ہلاؤ، تم پر تروتازہ خرمے گرنے لگیں گے۔ ۲۵) پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم کسی آدمی کو دیکھو تو اسے اشارے سے کہو کہ میں نے خدائے رحمٰن کے روزے کی منت مان رکھی ہے تو آج میں کسی انسان سے بات نہیں کروں گی۔ ۲۶) پس وہ اس کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی، لوگوں نے کہا، اے مریم! تم نے بہت ہی برا کام کیا ہے۔ ۲۷) اے ہارون کی بہن نہ تمہارا باپ ہی کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی۔ ۲۸) (مریم نے اس (بچہ) کی طرف اشارہ کیا، لوگ کہنے لگے ہم اس سے کس طرح بات کریں جو ابھی گود میں (کمسن) بچہ ہے۔ ۲۹) بچے نے جواب دیا، میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ ۳۰) اور اس نے مجھے سرچشمۂ خیر و برکت ٹھہرایا ہے، میں جہاں کہیں بھی ہوں، اور اس نے مجھے نماز ادا کرنے کا حکم دیا اور زکوٰۃ دینے کا، میں جب تک زندہ رہوں۔ ۳۱) اور مجھے اپنی ماں کا فرمانبردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے۔ ۳۲) اور سلامتی ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔ ۳۳) یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم، (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ ۳۴) اللہ کے شایاں نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے، وہ پاک ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ کہتا ہے، ہو جا۔ پس وہ ہو جاتا ہے۔ ۳۵) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، سو اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ ۳۶) پھر ان کے اندر سے مختلف فرقوں نے باہم اختلاف کیا، پس ہلاکت ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے کفر کیا، اس دن کی حاضری سے جو بہت بڑا ہے۔ ۳۷) کیسے سنتے ہوں گے اور کیسے دیکھتے ہوں گے جس دن وہ ہمارے سامنے پیش ہوں گے، لیکن ظالم آج کے دن کھلی گمراہی میں ہیں۔ ۳۸) اور ان کو ڈرائیے حسرت کے دن سے جبکہ معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے۔ ۳۹) بیشک زمین اور روئے زمین پر بسنے والوں کے وارث ہم ہوں گے اور سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۴۰)

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۛ فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾

(اور اے پیغمبر کتاب میں مریم کی سرگزشت بیان کیجئے جب وہ الگ ہو گئیں اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا۔ ۱۶) پس اس نے اپنے آپ کو لوگوں سے پردے میں کر لیا تو ہم نے اس کی طرف اپنے جبرائیل کو بھیجا جو اس کے سامنے ایک کامل بشر کی صورت میں نمودار ہوا۔ ۱۷)

Marfat.com

حضرت مریم کا ہیکل سے مشرقی جانب قیام

سورۂ آل عمران میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش سے پہلے ان کی والدہ نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اولاد دے گا تو میں اسے بیت المقدس کی خدمت کیلئے نذر کردوں گی۔ چنانچہ حضرت مریم پیدا ہوئیں تو بچپن گزرنے کے بعد ان کی والدہ انہیں ہیکل میں لے کر آئیں اور وہاں کے ذمہ داروں سے درخواست کی کہ آپ انہیں اللہ تعالیٰ کے گھر کی خدمت کیلئے قبول کر لیجئے۔ حضرت مریم چونکہ ابھی بچی تھیں اس لئے سوال پیدا ہوا کہ انہیں کس کی کفالت میں دیا جائے۔ سورۂ آل عمران میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے خادموں میں اس مسئلے پر آپس میں اختلاف ہوا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ یہ ذمہ داری اسے دی جائے۔ مریم کے والد چونکہ اس گھر کی ایک بڑی شخصیت رہ چکے تھے تو ان کی بیٹی کی کفالت کرنا ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔ بڑے تردد کے بعد حضرت مریم کو حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں دیا گیا۔ آپؑ نے ان کو ایک محراب میں رکھا، یعنی ان حجروں میں سے ایک حجرے میں جو بیت المقدس کے خدام اور معتکفین کیلئے بنائے گئے تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ حضرت مریم جس محراب میں رہائش پذیر تھیں وہ بیت المقدس کے مشرقی حصے میں واقع تھا اور مزید یہ بات کہ انہوں نے معتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ حضرت مریم کے بیت المقدس کے مشرقی کونے میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہیکل کا جو حصہ عورتوں کے اعتکاف و عبادت کیلئے خاص تھا وہ مشرقی سمت ہی میں تھا۔ اس میں حضرت مریم کے حجرے کی خصوصیت نہیں۔ اس عہد کے بیت المقدس کے نقشوں میں عورتوں کی جائے عبادت کو مشرق ہی جانب دکھایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے مکاناً شرقیاً کا یہ سیدھا سادھا مطلب لینے کی بجائے یہ مطلب لیا ہے کہ اس سے مراد ناصرہ کی وہ بستی ہے جس میں مسیحی روایات کے مطابق آپ پیدا ہوئے تھے۔ وہ چونکہ یروشلم سے مشرق کی جانب تھی اس لئے اس سے مراد ناصرہ ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ناصرہ یروشلم کے مشرق میں نہیں بلکہ شمال میں ہے۔

اس واقعہ کو حضرت زکریاؑ کے واقعہ کے بعد لانے کی حکمت

حضرت مریم کے اس واقعہ کو حضرت زکریاؑ کے واقعہ کے بعد ذکر کرنے سے شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ تم نے حضرت زکریاؑ کے واقعہ میں پڑھا ہے کہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اولاد کیلئے دعا کی ہے تو وہ کہولت کی انتہائی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ ان کی ہڈیاں تک جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر رہی تھیں اور ان کی بیوی مدت سے بانجھ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں تخلیقِ انسانی کے عام ضابطے کے مطابق ماں باپ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی عاجزی اور اخلاص کو قبول فرمایا اور ان کی زندگی کو ایسا ثمر دیا جس کے ثمر آور ہونے کا موسم گزر چکا تھا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کا اتصال اولاد کی تخلیق کا حقیقی سبب نہیں کیونکہ کتنے ایسے لوگ ہیں جو جسمانی اعتبار سے صحت مند اور توانا ہوتے ہیں لیکن اولاد سے محروم رہتے ہیں۔ حقیقی سبب اولاد کی پیدائش کا وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا حکم ہے۔ وہ چاہے تو سوکھے ہوئے درختوں کو ثمر آور کر دے اور چاہے تو بھلے چنگے درختوں کو بے ثمر کر دے۔ حضرت یحییٰ کا پیدا ہونا سراسر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار اور اس کی قدرت کی نشانی تھی۔ بایں ہمہ کسی نے حضرت یحییٰ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار نہیں دیا تو کس قدر ستم ظریفی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس لئے اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا جائے کہ ان کا باپ کوئی نہیں تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام حقیقت میں بغیر ماں باپ کے پیدا

Marfat.com

ہوئے اس کے باوجود انسان ہیں۔اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے ماں سے پیدا ہوتے ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا جاتا ہے۔اس کم عقلی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پہلے حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا کا واقعہ بیان کیا اور اب حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔

حضرت مریم کا امتحان

حضرت مریم بیت المقدس کے مشرقی کونے میں اپنے محراب میں معتکف تھیں،اب وہ عمر کی اس منزل کو پہنچ چکی تھیں جب بچیوں کی شادیاں ہوتی ہیں اور ان پر اولاد کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے کہ اچانک ان کی طرف ایک شخص آیا جو نہایت خوبرو اور نہایت صحت مند نوجوان تھا۔حضرت مریم کی جیسے ہی اس پر نظر پڑی تو عفت اور پاکدامنی کے احساس سے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور ساتھ ہی حیرانی نے بھی آ پکڑا کہ آج تک میرے حجرے میں کبھی کوئی شخص حضرت زکریا کے علاوہ داخل نہیں ہوسکا (اور ممکن ہے ان کا کمرہ مقفل بھی ہو) تو یہ شخص اندر کیسے آ گیا؟ ایسے موقعوں پر عفت مآب لڑکیاں عموماً چیخ و پکار کرنے لگتی ہیں،لیکن حضرت مریم نے ایسی کوئی کمزوری دکھانے کی بجائے نہایت جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

قَالَتْ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا ﴿۱۸﴾

(حضرت مریم نے کہا کہ اگر تم کوئی خدا ترس آدمی ہو تو میں تم سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ ۱۸)

حضرت مریم کا کردار

یعنی آپ نے چیخنے اور گھبرانے کی بجائے کہ میں تمہیں نہیں جانتی کہ تم کون ہو؟ صرف یہ کہا کہ اگر تم کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے آدمی ہو تو میں تم سے خدائے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں۔یہ آنے والا نوجوان حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تھے جو بشری صورت میں ان کی خواب گاہ میں داخل ہوئے تھے۔انہیں دیکھ کر حضرت مریم نے جو کچھ کہا اور جو طرز عمل اختیار کیا وہ یہ گواہی دینے کیلئے کافی ہے کہ آپ نہ تو کوئی شادی شدہ خاتون تھیں اور نہ کردار میں کسی کمزوری کو برداشت کرنے والی تھیں۔ایک مضبوط کردار عفیفہ جو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو اور اس کا اعتماد سراسر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو اس کا طرزِ عمل اس سے مختلف نہیں ہوسکتا۔یہ ایک طرح سے حضرت مریم کا امتحان بھی تھا جس میں وہ پوری طرح کامیاب ثابت ہوئیں۔اور شاید اسی لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو خوبصورت انسانی شکل میں بھیجا گیا ورنہ صرف فرشتے کی آواز بھی سنائی جاسکتی تھی۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖۗ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ﴿۱۹﴾

(حضرت جبرائیل نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ ۱۹)

حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے سب سے پہلے ان کی یہ پریشانی دور کی کہ میں کوئی عام انسان ہوں جو کسی بری نیت سے آپ کے کمرے میں چلا آیا ہوں۔میں ایک فرشتہ ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے معصوم پیدا کیا ہے۔میں تو اپنے بھیجنے والے کی طرف سے صرف ایک قاصد

Marfat.com

کا فرض انجام دیتے ہوئے آپ کو ایک خوبصورت بیٹا عطا کرنے کیلئے آیا ہوں یعنی ایک ایسا بیٹا جو سراسر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پیدا ہوگا، میں تو اس کی خبر دینے کیلئے آیا ہوں۔

قَالَتْ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِیًّا ﴿۲۰﴾

(مریم نے کہا میرے لڑکا کیسے ہوگا؟ حالانکہ نہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ میں بدچلن ہوں۔ ۲۰)

ان آیات کا مفاد اور لوقا کی بے اصل روایت

آنے والے شخص کی طرف سے اطمینان ہوا تو اس کی بات نے مزید پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ جب اس نے یہ کہا کہ میں تجھے فرزند دینے کیلئے آیا ہوں تو عفت مآب مریم نے اسے ایک اجنبی کی طرف سے ایک خطرناک اقدام کی دھمکی سمجھا۔ آپ نے نہایت پریشان ہو کر کہا کہ بھلے آدمی یہ کیا کہہ رہے ہو میں ایک کنواری لڑکی ہوں جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی اور نہ میں بدکار ہوں کہ بغیر شادی کے ایسے ویسے کاموں میں دلچسپی رکھوں۔ بچے کا پیدا ہونا تو مرد و عورت کے اتصال کا نتیجہ ہوتا ہے اور مجھے کبھی کسی مرد نے چھوا تک نہیں تو میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارے بعض اہلِ مغرب سے مرعوب ذہنوں نے لوقا کی روایت کا سہارا لیتے ہوئے یہ لکھ دیا کہ حضرت مریم کا نکاح یوسف نجار نام کے ایک شخص سے ہو چکا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ اس روایت کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ یہ سراسر یہودی سازش سے پال کی مہربانیوں سے انجیل میں داخل کی گئی ہے۔ اس آیت کے الفاظ پر بھی غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ ایک شادی شدہ خاتون ہوتیں اور آپ نے جب اپنے کانوں سے سن لیا کہ فرشتہ مجھے ایک پاکیزہ بچے کی ولادت کی اطلاع دے رہا ہے تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتیں کیونکہ ایسا بچہ یقیناً خوشی اور افتخار کا باعث ہوتا۔ اس کے بالکل برعکس حضرت مریم کا یہ کہنا کہ میرے یہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں اور میں کوئی بدکار عورت بھی نہیں۔ تو پھر فطرت کے عام اصول کے مطابق میرے یہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں فرشتے نے کہا:

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا ﴿۲۱﴾

(فرشتے نے کہا یونہی ہوگا، تیرے رب کا ارشاد ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے اور ہم یہ اس لئے کریں گے تاکہ لوگوں کیلئے اپنے قدرت کی نشانی اور اپنی جانب سے ایک رحمت بنائیں اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ۲۱)

حضرت مریم کے استبعاد کا ازالہ

سیاق و سباق اور فحوائے کلام کو دیکھتے ہوئے "کَذٰلِکِ" کا مطلب اور مفہوم اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ مقصود یہ کہنا ہے کہ بیٹے کی ولادت میں ایک کنواری لڑکی کو کتنا بھی استبعاد معلوم ہو لیکن ویسا ہی ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو اطلاع دی گئی ہے۔ رہی یہ بات کہ مرد و زن کے اختلاط کے بغیر بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ تو یہ بات فطری قانون دیکھتے ہوئے تو صحیح ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کو

Marfat.com

دیکھتے ہوئے اس کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ انسانوں کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ماں باپ کے اتصال کا نتیجہ نہیں بلکہ سراسر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار تھا۔ کائنات کی نہ جانے کتنی چیزیں ہیں جو نر اور مادہ کے اختلاط کے بغیر پیدا ہوئی ہیں۔ انہیں صرف کلمۂ کن سے اس وقت پیدا کیا گیا جبکہ ان کی کوئی مثال اس سے پہلے موجود نہ تھی۔ اب جبکہ قدم قدم پر مثالیں بھی موجود ہیں اور ماں بھی بفضلہ تعالیٰ اپنا وجود رکھتی ہے تو ایسی تخلیق اس کیلئے کیا مشکل ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے مغرب زدہ متجددین نے اس کا مطلب یہ مراد لیا ہے کہ فرشتے نے حضرت مریم کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں آپ کی جب شادی ہوگی تو رخصتی کے بعد اللہ تعالیٰ آپ کو بیٹا عطا فرمائے گا۔ ایسی صورت میں کَذٰلِکَ کے لفظ کے بعد کی آیت کا کیا مفہوم باقی رہ جائے گا جبکہ اس میں دلیل پیش کی گئی ہے کہ اے مریم! تم یہ سمجھتی ہو کہ اولاد ماں باپ کے اتصال کا نتیجہ ہے اور تم تو ابھی تک کنواری ہو تو تمہارے یہاں اولاد کیسی ہو سکتی ہے حالانکہ اولاد اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوتی ہے اور اس کی قدرت کا حال یہ ہے کہ وہ تمہیں اس سے پہلے پیدا کر چکا ہے جبکہ تم سراسر عدم تھے اور اس نے تمہیں معدوم سے وجود بخشا تو جس کی قدرت اس سے پہلے یہ سب کچھ کر چکی ہے تو اب اس کیلئے بغیر باپ کے بیٹا عطا کرنا کیسے مشکل ہو سکتا ہے؟

یہ بھی ذہن میں رہے کہ قرآنِ کریم نے اور بھی بعض جگہ اسی طرح کَذٰلِکَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً گزشتہ رکوع میں جب حضرت زکریاؑ نے یہ کہا کہ میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو میرے یہاں لڑکا کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ تو جواب میں کہا گیا کہ تم اسباب کو چھوڑو، ہم نے جس طرح کہا ہے ویسا ہی ہو کے رہے گا۔ اسی طرح حضرت سارہؓ کو بڑھاپے اور بانجھ پن میں بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے بھی تعجب کا اظہار کیا۔ تو فرشتے نے جواب میں یہی لفظ استعمال کیا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کا تعجب اپنی جگہ لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو اسی بڑھاپے میں بیٹا عطا فرمائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک نشانی ہیں

اس آیت میں مزید یہ فرمایا کہ ہم بغیر باپ کے بیٹے کو جو پیدا کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو یہ اس لئے ہے کہ ہم اسے ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح نشانی سے نامعلوم چیزوں کا سراغ ملتا اور شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور عقل کے بند دریچے کھلتے ہیں اسی طرح جو لوگ قیامت کے آنے میں شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں اس بات کا یقین پیدا نہیں ہوتا کہ بغیر اسباب کے ازسرنو انسانوں کو کیسے پیدا کر دیا جائے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خارق عادت ولادت ان کیلئے قیامت کے آنے کی ایک نشانی ہوگی اور اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ تخلیق میں اسباب کا محتاج نہیں جس طرح وہ آدم کو بغیر ماں باپ کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے کلمۂ کن سے تخلیق کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ کلمۂ کن سے قیامت برپا کر سکتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ انجیل اور قرآن دونوں میں آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾

(پس حضرت مریم نے اس بچہ کا حمل اٹھا لیا اور وہ اس کو لے کر ایک دور کے مقام کو چلی گئیں۔ ۲۲)

Marfat.com

دُور کی جگہ سے مراد بیت اللحم ہے

حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حاملہ ہو گئیں، جب وہ پیٹ میں حمل کو محسوس کرنے لگیں تو اس خیال نے انہیں پریشان کر دیا کہ آہستہ آہستہ یہ راز دوسروں پر بھی آشکارا ہونے لگے گا تو میں اس حجرے میں اعتکاف کی حالت میں محصور ہونے کے باوجود لوگوں کو کیسے مطمئن کر سکوں گی کہ یہ ایک رازِ الٰہی ہے اور اگر انہیں بتا بھی دوں تو اسے تسلیم کون کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ میرے اپنے اور پرائے مجھ پر حملہ آور ہوں گے، طرح طرح کی الزام تراشیاں ہوں گی، لوگ میرا جینا دوبھر کر دیں گے، میرے خاندان کیلئے میرا وجود ایک تہمت بن کر رہ جائے گا، لوگ کہیں گے کہ ایک نیک نام خاندان کی لڑکی جو بظاہر اعتکاف میں رہتی تھی لیکن اس کی سیرت ایسی گھناؤنی تھی کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ ان باتوں کو سوچ کر حضرت مریم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ یہاں سے نکل کر کسی دور دراز گوشے میں چلی جائے۔ قرآنِ کریم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ دور کا گوشہ کون سا تھا؟ لیکن انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیت اللحم چلی گئی تھیں۔ یہاں ایک لحہ رک کر اپنے ذہن سے پوچھیے کہ جب کوئی شادی شدہ لڑکی حاملہ ہوتی ہے اور وہ بھی شادی کے بعد پہلی دفعہ تو کیا وہ خوش ہونے کی بجائے اس طرح کی پریشانیوں میں گھر جاتی ہے اور وہ اندیشہ ہائے دور دراز کو محسوس کر کے اپنا گھر چھوڑ دیتی ہے، نہ اپنے میکے رہتی ہے اور نہ اپنے سسرال جاتی ہے۔ لیکن حضرت مریم کا یہ طرزِ عمل جس کی قرآن کریم تصویب کر رہا ہے، کیا بتانے کیلئے کافی نہیں کہ آپ شادی شدہ نہ تھیں۔ یہ سب کچھ کنوار پن میں ہو رہا تھا اور اسی لئے آپ اپنی اس حالت کو چھپانا چاہتی تھیں۔

قَصِيًّا ...... دور کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں مکان کی صفت واقع ہوا ہے اس لئے اس کا معنی دور جگہ ہوگا، یعنی ایسی جگہ جو حضرت مریم کا مامن بن سکے۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾

(پس لے آیا اس کو دردِ زہ کھجور کے تنے کے پاس، اس وقت اس نے کہا کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میں بھولی بسری ہو چکی ہوتی۔ ۲۳)

اَجَاءَ، جَاءَ پر ہمزہ کا اضافہ کر کے متعدی بنا دیا گیا ہے۔ اب اس کا معنی "آیا" کی بجائے "لایا" ہوگا۔

مَخَاضٌ ...... مصدر ہے وَجْعُ الْوِلَادَةِ دردِ زہ کو کہتے ہیں۔ جب بچہ باہر نکلنے کیلئے شکم میں حرکت کرنے لگے تو عرب کہتے ہیں مَخَضَتِ الْمَرْءَةُ (مظہری)

جب حمل کا وقت پورا ہو گیا اور وضع کا درد شروع ہو گیا تو آپ ایک کھجور کے تنے کی اوٹ میں آ گئیں۔ النَّخْلَةِ پر الف لام سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کھجور کا یہ درخت کوئی خاص درخت تھا جس سے حضرت مریم پہلے سے آگاہ تھیں۔ ممکن ہے خواب میں آپ کو بتا دیا گیا ہو کہ جب آپ کو دردِ زہ شروع ہو تو آپ اس کھجور کی اوٹ میں آ جائیے گا۔

ایک تأثر اور استدلال

ان الفاظ کو دیکھتے ہوئے عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ ایک نہایت نیک نام خاندان کی عزت مآب عفیفہ ایک عجیب امتحان میں مبتلا ہو

Marfat.com

گئی ہے۔ کنوار پن میں اس پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ ایک بچہ جنے جو آگے چل کر اللہ تعالیٰ کا رسول ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں پر حجت بھی ہو، اور اسے قیامت کے وقوع کیلئے نشانی بھی قرار دیا جائے اور یونانی فلسفے کے پیروکار جو علت اور معلول کے رشتے پر ناقابلِ تغیر یقین رکھتے ہیں، اس کی پیدائش انہیں یہ بتائے کہ اللہ تعالیٰ کسی نتیجہ کو اخذ کرنے یا کسی کو پیدا کرنے کیلئے علت اور معلول کے ضابطے کا پابند نہیں۔ وہ اگر چاہے تو بغیر باپ کے بھی بیٹے کو پیدا کر سکتا ہے۔ دنیا کو یہ سبق دینے اور اس عظیم ذمہ داری کی بجا آوری کیلئے حضرت مریم کو چنا گیا۔ انہوں نے اس ذمہ داری کی ادائیگی کا بوجھ تو اٹھا لیا لیکن اس تصور سے ان کا دل خون ہونے لگا کہ اگر میرے عزیزوں اور بیگانوں کو معلوم ہوا کہ میں کنوار پن میں حاملہ ہوگئی ہوں تو ان کی عزت پر کیا گزرے گی اور وہ میرے ساتھ کیا قیامت برپا کریں گے۔ اس لئے اپنی اس امانت کو لے کر دور مقام پر چلی گئیں اور پھر جب بچے کی پیدائش کا وقت آیا تو جس بدنامی پر آج تک وہ پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں اب اس کے افشا ہونے کا وقت آ گیا۔ تو حضرت مریم کی پریشانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ دردِ زہ شروع ہوتے ہی اپنا گھر چھوڑ کر ایک ویرانے میں آ گئیں جس میں کھجور کا ایک سوکھا درخت کھڑا تھا اس کی اوٹ میں بیٹھ گئیں لیکن دل مسلسل اس تصور سے کٹا جا رہا تھا کہ وضع حمل کے بعد میں اپنے بچے کو لوگوں کی نگاہوں سے کیسے مخفی رکھوں گی۔ چنانچہ شدتِ احساس سے ان کی زبان پر یہ حسرت بھرے الفاظ آ گئے کہ اے کاش اس فضیحتے سے پہلے میں مرگئی ہوتی اور صرف مر ہی نہیں گئی ہوتی بلکہ لوگوں کے حافظہ سے میری یاد بھی محو ہو چکی ہوتی۔ اندازہ فرمایئے کہ اگر یہ حمل شادی کا ہوتا تو وہ اپنے گھر میں آرام سے کسی پلنگ پر لیٹی ہوتیں، ممکن ہے ایک آدھ دایا خبر گیری کیلئے بھی پاس ہوتی اور وہ بجائے اس طرح کے الفاظ کہنے کے بچے کا تصور کرتے ہوئے خوش ہو رہی ہوتیں، لیکن حضرت مریم اس تصور کی شدت سے بیچارگی اور درماندگی کا شکار ہو رہی ہیں کہ میں اس بچے کو لے کر اپنی قوم میں کیسے جاؤں گی کیونکہ نہ میں شادی شدہ ہوں اور نہ ہیں آوارہ ہوں۔ دنیا میری عفت مآبی کی گواہی دیتی ہے اور میرے خاندان کی نیک نامی کے گن گائے جاتے ہیں۔ اس لئے آپ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے دردِ زہ کی شدت کے باوجود جنگل میں نکل آئی ہیں اور ایک کھجور کے تنے کی اوٹ میں بیٹھی اپنی بیچارگی پر آنسو بہا رہی ہیں۔

یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ...... حضرت مریم کے اس قول سے بعض لوگوں نے یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ ایک مومن کیلئے موت کی تمنا کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ حضرت مریم ایک مومنہ خاتون تھیں تو آپ نے موت کی تمنا کیونکر کی؟ آیت کے سیاق و سباق اور پس منظر کو دیکھتے ہوئے اسے موت کی تمنا قرار دینا آیت کے مفہوم میں ایک نئی بات داخل کرنے کے مترادف ہے۔ جب کوئی شخص ایسی صورتحال سے دوچار ہوتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو اور نتیجے میں اس کا نقصان بھی یقینی ہو، وہ اس صورتحال کو حق کا نتیجہ سمجھتے ہوئے بھی اس طرح کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس طرح کی باتیں اس کی زبان پر آ جاتی ہیں۔ آپ اس کو غلبۂ حال قرار دے لیں یا اختیاری طور پر حالات کا نوحہ۔ لیکن تمنائے موت کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد فرشتے کی ندا نے انہیں تسلی تو دی ہے لیکن اس بات پر انہیں سرزنش نہیں کی کہ آپ ایک ایسی بات کیوں کہہ رہی ہیں جو ایک مومنہ کی زبان پر نہیں آنی چاہیے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ﴿۲۴﴾

(پس کھجور کے نیچے سے فرشتے نے اس کو آواز دی کہ غمزدہ نہ ہو تمہارے پائیں سے تمہارے پروردگار نے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ ۲۴)

Marfat.com

حضرت مریم کو بشارت

حضرت مریم کی پریشانی اور بیچارگی نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حرکت دی۔ فرشتے نے اس کھجور کے درخت کے نیچے سے آواز دی کہ اے مریم تو بہت بڑے امتحان میں ڈال دی گئی ہے لیکن غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، یہ دیکھ کہ تیرے رب کی عنایات کس طرح تیری طرف متوجہ ہیں۔ اس نے تیرے پائیں اور تیرے قریب ایک چشمہ جاری کر دیا ہے تا کہ اس کے ٹھنڈے پانی سے تو اپنی پیاس بجھائے۔

سَرِیًّا ...... چھوٹی نہر یا چشمہ پر بولا جاتا ہے۔ اگر چہ لغت میں اس کا استعمال دوسرے معنوں میں بھی ہے لیکن اس آیت کریمہ میں جمہور علماء کے نزدیک اسی معنی کیلئے بولا گیا ہے۔

وَهُزِّيٓ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِىۡ وَاشۡرَبِىۡ وَقَرِّىۡ عَيۡنًا‌ ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوۡلِىۡۤ اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا‌ ۚ ﴿۲۶﴾

(اور اپنی طرف کھجور کے تنے کو ہلاؤ، تم پر تر و تازہ خرمے گرنے لگیں گے۔ ۲۵) پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم کسی آدمی کو دیکھو تو اسے اشارے سے کہو کہ میں نے خدائے رحمٰن کے روزے کی منت مان رکھی ہے تو آج میں کسی انسان سے بات نہیں کروں گی۔ ۲۶)

اللہ تعالیٰ کی عنایات

کھجور کے تنے کو اپنی طرف کھینچو یعنی اسے حرکت دو۔ حضرت مریم جیسی نوخیز اور پریشانیوں میں ڈوبی ہوئی لڑکی اس تنے کو کیا حرکت دے سکتی تھی۔ مقصد صرف یہ ہے کہ تم اسے اس طرح ہاتھ لگاؤ جیسے اسے حرکت دے رہی ہو۔ تم پر عمدہ پکی ہوئی کھجوریں گرنے لگیں گی۔ کھجور حضرت مریم کیلئے کوئی نئی بات نہ تھی، ان کی خوراک کا حصہ تھی جس سے روزانہ سابقہ پڑتا تھا، لیکن یہ کھجور معلوم ہوتا ہے لطف ولذت میں غیر معمولی ہوگی کیونکہ یہ خشک تنے سے بغیر موسم کے حضرت مریم کے جھنجوڑنے سے محض اللہ تعالیٰ کی قدرت سے برسنے لگی تھیں۔ تو ویسے بھی تمام انواع کی کھجوریں مٹھاس اور مزے میں ایک جیسی نہیں ہوتیں اور پھر خصوصی طور پر اس چشمے کے پانی اور کھجور کی یہ تاثیر ہوگی کہ وہ آپ کی پریشانیوں کا مداوا بنے۔ اطباء کا خیال ہے کہ ایام زچگی میں عورت کیلئے بہترین خوراک تازہ اور شیریں کھجور ہے اور یہ کھجوریں تو پیدا ہی اس لئے کی گئی تھیں کہ آپ کے دل کی تقویت کا باعث بنیں اور آپ کیلئے سکون کا باعث ہوں، تو یقیناً ان میں صرف لطف ولذت ہی نہیں اور نہ جانے کیا کیا فوائد رکھے گئے ہوں گے۔ فرشتے نے ان کھجوروں کو کھانے اور پانی کو پینے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ آنکھوں کو ٹھنڈا رکھنے کی بھی ہدایت کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ذرا اپنے نومولود لال کی طرف تو دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس کے چہرے میں تیرے لئے کیا ٹھنڈک کا سامان رکھا ہے تو اس کو دیکھتے ہی تم اپنا غم بھول جاؤ گی۔ چنانچہ اس سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرو اور مزید یہ کہا کہ اگر راستے میں کوئی شخص ملے اور وہ گود میں بچہ دیکھ کر پوچھنے کی کوشش کرے کہ ایک کنواری لڑکی کی گود میں بچہ کہاں سے آ گیا تو اسے اشارے سے کہہ دیجئے کہ

Marfat.com

میں نے خدائے رحمٰن کے روزے کی نذر مان رکھی ہے، اس لئے میں کسی انسان سے گفتگو نہیں کرسکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مریم کو سب سے زیادہ جس بات کا اندیشہ تھا وہ یہ تھی کہ جب میں اپنے بچے کو لے کر اپنے گھر جاؤں گی تو چونکہ میں ایک بڑے پاکیزہ اور نیک نام گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، لوگ میرے خاندان کو جانتے پہچانتے ہیں تو جس شخص کو بھی معلوم ہوگا کہ اس خاندان کی ایک کنواری لڑکی بغیر شادی کے ایک بچے کی ماں بن گئی ہے تو وہ یقیناً میرے گھر کا رخ کرے گا اور میرے اہلِ خانہ بھی اجنبیوں سمیت پریشانی کی حالت میں مجھ سے پوچھیں گے کہ مریم تم نے یہ کیا کیا۔ اس آیت میں مریم سے کہا جا رہا ہے کہ جب بھی اس بچے کے بارے میں کوئی تم سے سوال کرے تو تمہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں، تم کہہ دینا کہ میں خاموشی کے روزے سے ہوں اس لئے کسی انسان سے بات نہیں کرسکتی۔

خاموشی کا روزہ

یہاں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ حضرت مریم ایامِ زچگی میں روزہ نہیں رکھ سکتی تھیں تو پھر انہوں نے روزہ کیسے رکھ لیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روزہ خاموشی کا روزہ تھا اور یہود کے یہاں مجرد خاموشی کے روزے کا رواج بھی تھا اور ان کی شریعت میں اس کی اجازت بھی تھی۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

(پس وہ اس کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی، لوگوں نے کہا، اے مریم! تم نے بہت ہی برا کام کیا ہے۔ ۲۷) اے ہارون کی بہن نہ تمہارا باپ ہی کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی۔ ۲۸)

حضرت مریم کو خاندان والوں کی ملامت

حضرت مریم جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو اپنے بچے کو لے کر اپنے گھر لوٹیں۔ اہلِ خانہ دیکھتے ہی ہک دھک رہ گئے۔ ان کیلئے یہ تصور بھی ناقابلِ برداشت تھا کہ ان کے خاندان کی کوئی لڑکی اور وہ بھی مریم جیسی زاہدہ و عابدہ بھی اس حرکت کا ارتکاب کرسکتی ہے۔ خاندان کے دوسرے لوگوں کو علم ہوا تو سب مرد و زن دوڑے ہوئے آئے اور مریم پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ ان میں سے ہر ایک نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مریم تم نے بہت بری حرکت کی ہے۔ تم ہارون کی بہن ہو، یعنی تمہارا اس قبیلے سے تعلق ہے جو قبیلہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف منسوب ہے تم اس پیغمبر کی اولاد ہو۔ (عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی شخص کو کسی قبیلے سے منسوب کر کے پکارنا چاہتے تھے تو وہ اسے اس قبیلے کا بھائی کہتے تھے۔ مثلاً قبیلۂ معزر کے آدمی کو یا اخا معزر کہہ کر پکاریں گے "اے معزر کے بھائی"، یعنی معزر قبیلے سے منسوب شخص۔ اس طرح کوئی قبیلۂ ہمدان سے تعلق رکھتا ہے تو اسے کہیں گے یا اخا ہمدان "اے ہمدان کے بھائی"، یعنی اے وہ شخص جو ہمدان قبیلے سے منسوب ہے۔) قبیلے کی عزت و حرمت کو تم نے پامال کردیا ہے، اور تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمہارا باپ کس قدر صالح اور نیک نام آدمی تھا اور تیری ماں کیسی عفیفہ تھی۔ تم نے تو ایسی حرکت کی ہے جیسے بدنام، بدکردار اور بدکار مرد و زن کی اولاد حرکتیں کرتی ہے۔

Marfat.com

ہارون سے مراد؟

مفسرین نے یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ پر بحث کرتے ہوئے دونوں معنی مراد لئے ہیں۔ایک تو یہ کہ حضرت مریم کے ایک بھائی کا نام ہارون تھا اور وہ بھی نہایت صالح اور نیک نام نوجوان تھے۔اس لئے اس کا حوالہ دے کر مریم کو ملامت کی گئی اور اس پر ایک حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے جسے صحیح مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ جب نجران گئے تو وہاں کے عیسائیوں نے ان سے پوچھا کہ قرآن میں مریم کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے حالانکہ ہارون مریم سے صدہا سال پہلے گزرے ہیں۔حضرت مغیرہؓ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔جب واپس آئے تو بارگاہِ رسالتؐ میں اس واقعہ کو بیان کیا۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں ان کو یہ جواب دینا چاہئے تھا کہ بنی اسرائیل کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام اور پہلے بزرگوں کے ناموں پر رکھا کرتے تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کے ایک بھائی تھے جن کا نام حسب دستور حصولِ برکت کیلئے ہارون کے نام پر رکھا گیا تھا۔

بعض دیگر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت مریم کے نسبی بھائی نہیں ہیں بلکہ حضرت ہارون علیہ السلام ہیں جن کی طرف ان کا خاندان منسوب تھا اور کسی کو کسی قبیلے کی طرف منسوب کرنے کیلئے قبیلے کا بھائی بھی کہہ دیا جاتا تھا۔جیسے کہ میں اس سے پہلے وضاحت کر چکا ہوں، تو ممکن ہے یہاں بھی اُخت ہارون سے مراہ ہارون خاندان کی ایک لڑکی مراد ہو۔دونوں باتیں ہی اپنی جگہ وزن رکھتی ہیں۔یہ ممکن ہے کہ حضرت مریم کے بھائی کا نام ہارون ہو، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے تصریح فرمائی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قبیلہ کی نسبت سے مریم کو پکارا گیا ہو، لیکن جو بات اس آیت میں زور دے کر کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اے مریم، تم اتنی پاکیزہ نسبتیں رکھتے ہوئے ایسے گناہ کا ارتکاب کیونکر کر بیٹھی۔

استدلال

یہاں رک کر ذرا غور فرمائیے کہ کیا کسی شادی شدہ لڑکی کی گود میں پہلوٹی کے بچے کو دیکھ کر بھی لوگوں نے یہ رویہ اختیار کیا ہے۔کیا ماں اپنے پہلوٹی کے بچے کو دیکھ کر باغ باغ ہوتی ہے یا وہ اسے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ سمجھتی ہے اور اہلِ خانہ اس بچے کو اپنی عزت اور خوشی کا باعث سمجھتے ہیں یا اپنے لئے عار بنا لیتے ہیں۔کیا یہ رویہ دلالت نہیں کرتا کہ حضرت مریم کنواری لڑکی تھیں۔

اس آیت سے پہلی آیت کے آخر میں فَرِيًّا کا لفظ آیا ہے۔جوہری نے اس کے دو معنی کئے ہیں۔''ایک گھڑا ہوا بناوٹی'' اور دوسرا ''العظیم'' یعنی ''بہت بڑا''۔امام راغب نے اس کا معنی ''حیران کن'' کیا ہے، لیکن علامہ ابنِ حیان اندلسی نے اس کا معنی کیا ہے ''بہت قبیح فعل'' (بحر)۔علامہ آلوسی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر بڑے کام کیلئے خواہ وہ برا ہو یا اچھا، قول ہو یا فعل، یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔یہ وضاحت مذکورہ بالا سب معانی پر حاوی ہے اور موقع کے بھی مناسب ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾

(مریم نے اس (بچہ) کی طرف اشارہ کیا، لوگ کہنے لگے ہم اس سے کس طرح بات کریں جو ابھی گود میں (کمسن) بچہ ہے۔ ۲۹)

Marfat.com

نصرتِ خداوندی کا ظہور

لوگوں کے مسلسل نفرت سے بھرپور سوالات پر حضرت مریم نے کچھ کہنے کی بجائے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کیا مقصد یہ تھا کہ میں چونکہ خاموشی کا روزہ رکھ چکی ہوں، میں کوئی جواب نہیں دے سکتی، اس بچے سے پوچھو۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے فرزند بخشا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نشانی بن کر آیا ہے۔ اس لئے اپنے اندر غیر معمولی صفات رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ کام سونپا ہے کہ مجھ پر جس طرح تہمتیں باندھی جارہی ہیں وہی اس کا جواب دے گا۔ لیکن لوگوں نے حضرت مریم کے اس اشارے کو ایک مذاق سمجھا اور نہایت برہم ہوکر کہنے لگے کہ تم ہمارے ساتھ مذاق کر رہی ہو، خود خاموشی کی تصویر بنی بیٹھی ہو اور ہمیں اس شیر خوار بچے سے گفتگو کرنے کیلئے کہہ رہی ہو جو ابھی جھولے میں جھول رہا ہے۔

پیشِ نظر آیت کا وہ مفہوم جو الفاظ سے واضح ہورہا ہے اور حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات کے تسلسل میں نہایت فطری معلوم ہوتا اسے ہم نے بیان کردیا لیکن بعض لوگوں نے ''کان'' پر بحث چھیڑ کر اپنے غلط عقیدے کے حق میں دلیل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے ہم یہاں ''ضیاء القرآن'' سے اس بحث کو نقل کررہے ہیں۔

کان فعل ناقص ہے اور ماضی کا صیغہ ہے جو گزشتہ زمانہ پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح آیت کا معنی یوں ہوگا کہ ہم اس سے کیسے بات کریں جو گزشتہ زمانے میں پنگھوڑے میں بچہ تھا۔ یہ معنی کسی طرح پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے علماء اسلام طاب اللہ ثراھم نے اس آیت کے ضمن میں کان پر بڑی مفید بحث کی ہے۔

ابوعبیدہ (امام نحو وادب) نے کہا ہے کہ یہاں کان زائدہ ہے اور محض تاکید کا فائدہ دیتا ہے اور کسی زمانہ پر دلالت نہیں کرتا۔ کان زائدة لمجرد التاكيد من غير دلالة على الزمان۔ (روح المعانی)

بعض نے کہا ہے کہ یہ تامہ ہے۔ ان دونوں صورتوں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر کان زائدہ ہوتا تو ''صَبِيًّا'' خبر کو کیسے نصب دیتا اور اگر کان تامہ تھا تو اسے خبر کی ضرورت ہی نہ تھی حالانکہ یہاں ''صَبِيًّا'' خبر مذکور ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ''صَبِيًّا'' خبر نہیں بلکہ حال ہے اور اسی وجہ سے منصوب ہے۔

علامہ ابنِ حیان اندلسی یہ لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ کان ناقصہ ہے اور 'صَبِيًّا' اس کی خبر ہے اور کان زمانہ ماضی پر دلالت کرنے کے ساتھ زمانہ حال میں اس فعل کے پائے جانے کی نفی نہیں کرتا بلکہ یہ بتاتا ہے کہ زمانہ ماضی میں پائے جانے کے ساتھ ساتھ وہ فعل زمانہ حال میں بھی بدستور پایا جارہا ہے جیسے كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا کہ پہلے بھی اللہ تعالیٰ غفور ورحیم تھا اور اب بھی ہے یا جیسے ولاتقربوا الزنی انه كان فاحشه زنا کے قریب تک بھی نہ جاؤ۔ یہ پہلے بھی بے حیائی کا کام تھا اور اب بھی ہے۔ یہ نہیں کہ گزشتہ زمانہ میں تو زنا فحش وقبیح تھا اور اب نہیں ہے۔ والظاهر انها قصة فتكون بمعنى صار اوتبقى على مدلولها من اقتران مضمون الجملة بالزمان الماضى ولايدل ذلك على الانقطاع كمالم يدل فى قوله وكان الله غوراً رحيمًا وفى قوله ولاتقربوا الزنى انه كان فاحشة. والمعنى كان وهو الان على ماكان ولذلك عبر بعض اصحابنا ان كان هذه بانها ترادف لم يزل. (البحر المحیط)

Marfat.com

دو قابلِ توجہ باتیں

اس کے بعد اگلی آیتِ کریمہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جھولے میں جھولتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قدرت سے قوم کے سامنے اپنا تعارف رکھا ہے جس سے حضرت مریم پر کیے جانے والے ایک ایک سوال کا جواب دے دیا گیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اسے پڑھیں ہمیں دو باتوں پر توجہ دینی چاہئے۔ ایک تو یہ بات کہ یہ غیر معمولی واقعہ کیوں پیش آیا اور دوسری یہ بات کہ پنگھوڑے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں بلوایا گیا جبکہ حضرت مریم ہی سے اس طرح جواب دلوایا جاسکتا تھا جس سے کسی حد تک قوم مطمئن ہو جاتی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا ایک خاص حد تک امتحان لیتا ہے۔ ان کی بندگی اور وفاداری کو آزماتا ہے۔ لیکن جب وہ ہر مرحلہ میں سو فیصد کامیاب ثابت ہوتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ حضرت مریم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ انہیں ایک خاص امانت حوالے کی گئی، لیکن اس امانت کا حق ادا کرنے کے راستے میں قدم قدم پر بے پناہ رکاوٹیں تھیں، تہمتوں کے اندیشے تھے اور خاندانی رسوائی کا سامان تھا۔ لیکن حضرت مریم نے نہایت صبر کے ساتھ اس امانت کا بوجھ اٹھایا۔ پھر جب اسے ادا کرنے کا وقت آیا تو اگرچہ ان کی ہمت چٹخنے لگی لیکن ان کی زبان پر شکوہ کبھی نہیں آیا۔ گھر چھوڑ کر ویرانے میں جا بیٹھیں۔ نہ جانے وہاں تنہائی میں کیسے وقت گزرا اور کیسے اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئیں۔ جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو نہایت استقامت کے ساتھ اپنے اہل خانہ میں واپس آئیں۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے ہر قدم پر کامیابی سے ہر آزمائش سے گزر کر دکھا دیا اور ہر حال میں صابر و شاکر رہیں تو تب اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا دروازہ کھلا تو آپ پر لگنے والی تہمتوں اور رسوائیوں کا جواب دلوانے کیلئے اس نوزائیدہ بچے کو مکلف بنایا اور ہمت عطا کی اور حضرت مریم اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخرو ٹھہریں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف حالات سے گزرتے ہوئے اب مکمل طور پر اپنے آپ کو نااہل ثابت کر چکے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی محرومی کو مکمل کرنے اور انہیں سزا دینے کے فیصلے کو نافذ کرنے سے پہلے پسند فرمایا کہ ایک پیغمبر ان کی طرف ایسا بھیجا جائے جو اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہو۔ وہ اپنی ولادت ہی سے پہچانا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نشانی بن کر آیا ہے۔ اس کا بچپن، اس کیلئے مزید گواہی کا باعث بنے، پھر اس کی نبوت کی زندگی ایسے معجزات کے ظہور سے روشن ہو جو کسی پیغمبر کے ہاتھ ہی سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اس طرح سے بنی اسرائیل پر پوری طرح سے حجت تمام کر دی گئی، پھر جب وہ اپنی کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر اور کھلے کانوں سے سب کچھ سن کر بھی بجائے ایمان لانے کے اللہ تعالیٰ کی اس مقرب ترین ہستی کے اس حد تک دشمن بن کر اٹھے کہ اپنے تئیں انہیں صلیب دینے میں کامیاب ہو گئے تو تب اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دیتے ہوئے تاریخ میں عبرت بنا دیا۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾ ۖ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ۫ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾

(بچے نے جواب دیا، میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ ۳۰) اور اس

Marfat.com

نے مجھے سرچشمۂ خیر و برکت ٹھہرایا ہے، میں جہاں کہیں بھی ہوں، اور اس نے مجھے نماز ادا کرنے کا حکم دیا اور زکوٰۃ دینے کا، میں جب تک زندہ رہوں۔ ۳۱) اور مجھے اپنی ماں کا فرمانبردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے۔ ۳۲)

گہوارے میں حضرت مسیح کے ارشادات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دودھ پی رہے تھے۔ لوگوں کی باتیں اور ملامت سن کر دودھ چھوڑ دیا اور اپنی بائیں کروٹ پر سہارا لے کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہم اسے چار پر تقسیم کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس ارشاد کی ضرورت شاید اس لئے محسوس کی گئی کہ میری غیر معمولی ولادت کو دیکھ کر اور جھولے میں میری حیران کن باتوں کو سن کر کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ میں شاید انسان نہیں کچھ اور ہوں اور میرے اندر خدائی کے اوصاف پائے جاتے ہیں اور میں کوئی مافوق البشر ہستی ہوں۔ میں صرف ایک اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ نہ خدا ہوں اور نہ خدا کا بیٹا۔ عبرانی زبان میں ابن کا لفظ بندے اور بیٹے دونوں کیلئے آتا ہے۔ موقع محل سے اس کا تعین کیا جاتا ہے۔ عبرانی زبان میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ جملہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہوں ان کی واضح تعلیمات کی روشنی میں اس کا یہ مطلب لینے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ میرا اللہ تعالیٰ سے وہ رشتہ ہے جو بیٹے کا باپ سے ہوتا ہے بلکہ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں کیونکہ ابن کا معنی جیسا کہ عرض کیا عبرانی میں جیسے بیٹا ہے اس طرح بندہ بھی ہے۔ پروردگار کو تو معلوم تھا کہ آگے چل کر پال کی کوششوں سے عیسائیوں میں تثلیث کا فتنہ اٹھایا جائے گا اور جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے کر خدائی میں حصہ دار بنا دیا جائے گا۔ اس لئے اس کا صحیح مفہوم بیان کرتے ہوئے پہلی بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، میں اللہ تعالیٰ کی خدائی میں شریک نہیں ہوں بلکہ اس کی بندگی کا پابند ہوں۔

دوسری یہ بات ارشاد فرمائی کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ یعنی اس شیر خوارگی کی عمر میں نبوت اور کتاب مجھے عطا فرما دی گئی ہے حالانکہ کسی پیغمبر کو چالیس سال کی عمر سے پہلے نبوت اور کتاب نہیں ملتی۔ مفسرین نے اس کی وضاحت میں مختلف باتیں کہی ہیں۔

1- بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ بات صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں انہیں نبوت اور کتاب سے سرفراز فرما دیا تھا، لیکن علامہ قرطبی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

2- علامہ قرطبی اور اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ جو چیز علم الٰہی میں مقدر ہو چکی ہو وہ اگرچہ وقوع پذیر نہ ہو پھر بھی اس کو زمانہ ماضی سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے واقعہ ہونے میں کسی قسم کا شائبہ نہیں۔ ویسے بھی عربی زبان میں یہ قاعدہ ہے اور قرآن کریم نے بھی کئی مقامات پر اسے اپنے اسلوب میں جگہ دی ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں یہ کہنا ہو کہ یہ یقیناً ہو کے رہے گی تو اسے ماضی کی صورت میں بیان کرتے ہیں یعنی یوں کہیں گے کہ یہ کام ہو گیا ہے، یہ بات ہو گئی ہے، یہ چیز ہو گئی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کا ہونا یقینی ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے نبوت اس وقت عطا کر دی گئی تھی جبکہ آدم علیہ السلام ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کیلئے عطائے نبوت کا وعدہ قطعی اور یقینی تھا۔ یہاں بھی اسی یقینی نبوت اور کتاب کو ماضی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

اس سے حضرت مریم کے دامنِ عفت پر لگے ہوئے تہمت کے داغوں کو دور کرنا بھی مقصود ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ بچہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی نشانی بنایا اور جھولے میں جس نے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا اور یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ مجھے کتاب بھی عطا کرے گا اور یہ دونوں باتیں اس قدر یقینی ہیں گویا کہ وہ وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو بچہ اللہ تعالیٰ سے اتنا قرب رکھتا ہے اور ایسے کمالات کا حامل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے سرچشمۂ خیر و برکت بنایا ہے کیا وہ کسی فاحشہ عورت کا بیٹا ہوگا، ہرگز نہیں۔ اس کی ماں تو یقیناً ایک عفیفہ زاہدہ، صدیقہ اور قانتہ ہوگی۔

تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے زندگی بھر کیلئے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کی ہدایت فرمائی ہے۔ قرآنِ کریم کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وصیت کا لفظ زیادہ تاکید کیلئے آتا ہے۔ یہاں بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہی بتلانا مقصود ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کی خصوصی طور پر تاکید کی ہے کیونکہ نماز اور زکوٰۃ ایسی عبادتیں ہیں جو تمام دین و شریعت کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے تمام آسمانی شرائع میں ان کا ذکر آتا ہے۔ ان کی ظاہری شکلیں مختلف ادیان میں مختلف رہی ہیں لیکن بندگی رب اور ہمدردیِ خلق کی روح ان کی ہر شکل میں محفوظ رہی ہے۔ نماز آدمی کو اس کے رب سے صحیح طور پر جوڑتی ہے اور زکوٰۃ سے اس کا تعلق خلق کے ساتھ استوار ہوتا ہے۔ انہیں دونوں چیزوں کی استواری پر تمام دین کے قیام کا انحصار ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو کبھی مالدار ہی نہیں ہوئے۔ نہ گھر بنایا اور نہ کچھ جمع کیا، تو پھر زکوٰۃ کا ان کو حکم دینا کس بنا پر ہے؟ تو اس کا مقصد واضح ہے کیونکہ شریعت میں قانون یہ بنا دیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس مال ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس کے مخاطب ہیں کہ جب کبھی مال بقدرِ نصاب جمع ہو جائے تو زکوٰۃ ادا کریں تو پھر اگر عمر بھر میں کبھی مال جمع ہی نہ ہو تو یہ اس کے منافی نہیں۔ (روح المعانی)

مَادُمْتُ حَيًّا...... ''میں جب تک زندہ رہوں۔'' اس میں یہ کہنا مقصود ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت مدت العمر تک ہے۔ جب تک آدمی زندہ ہے یہ فرائض اس سے کبھی ساقط نہیں ہوتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی یہ دونوں فرض تھے۔ لیکن اس میں شرط زندگی کی ہے۔ جب تک آپؑ دنیا میں رہے تو آپؑ دونوں کے پابند تھے اور جب آپؑ کو آسمانوں پر اٹھا لیا گیا تو وہ زمانہ رخصت کا ہے، پھر جب دوبارہ آپؑ دنیا میں آئیں گے تو پھر ان فرائض کی پابندی کرنا ہوگی۔

چوتھی بات یہ فرمائی کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی والدہ کا فرمانبردار بنایا ہے اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے والدین کی اطاعت نہیں کرتا اور ان کے سامنے عاجزی اختیار نہیں کرتا بلکہ سرکشی دکھاتا ہے وہ جبار اور شقی ہے۔ مزید یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے والدین کا فرمانبردار بنایا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی والدہ کا فرمانبردار بنایا ہے حالانکہ فرمانبرداری تو دونوں کی فرض ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف والدہ سے پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کی فرمانبرداری آپؑ پر فرض تھی۔ اگر آپؑ کے والد ہوتے تو یقیناً ان کا بھی ذکر کیا جاتا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے جب بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے تو عیسیٰ ابن مریم کہا ہے، باپ کا نام کبھی نہیں لیا، حالانکہ شریعت میں ہمیشہ نسب باپ سے چلتا ہے اور نسبت بھی باپ سے ہوتی ہے۔ عرب میں آج بھی بیٹے کے ساتھ باپ کا نام لگتا ہے، ماں کا نام کبھی نہیں لگتا اور اگر کسی شخص کو ماں کی طرف منسوب کیا جائے اور اسی حوالے سے اسے پکارا جائے اور وہی حوالہ اس کی شناخت کا ذریعہ بنے تو سننے والے سمجھ جاتے ہیں کہ اس شخص کا نسب ثابت نہیں اور کچھ خبر نہیں کہ اس کا باپ کون تھا۔ اور یہ بات کسی بھی شریف شخص کیلئے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اتنی بڑی واضح شہادت کے بعد بھی

Marfat.com

اگر کچھ الجھے ہوئے دماغ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یوسف نجار کا بیٹا قرار دیتے ہیں تو انہیں اپنی عقل پر رونا چاہئے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾

(اور سلامتی ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔ ۳۳)

ولادت، موت اور بعث بعد الموت میں حضرت مسیح کا اعزاز

گزشتہ رکوع کے آخر میں آیت نمبر ۱۵ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام سے متعلق بھی اسی قسم کی بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ وہ بھی ہر حال میں سلام وتحیت کے مستحق تھے اور اسی طرح حضرت مسیح بھی اپنی ولادت، موت اور بعث بعد الموت کے ہر مرحلے میں سلام اور تحیت کے مستحق ہیں۔ جب وہ پیدا ہوئے تو فرشتوں نے ایک دوسرے کو سلام تحیت کہا یعنی مبارکباد دی۔ اور جب ان کا انتقال ہوگا تو ایسے ہی اعزاز کے ساتھ ان کی روح کو قبول کیا جائے گا۔ اور جب وہ قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے تو تب بھی انہیں نہایت اعزاز اور احترام کے ساتھ لے جایا جائے گا۔ دنیا نے ان کے ساتھ جو سلوک بھی کیا ہو وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں میں نہایت اعزاز واکرام کے مستحق سمجھے گئے ہیں۔ وہ آسمانوں پر اپنے عارضی قیام کے بعد جب زمین پر آئیں گے تو دجال سے ایک فیصلہ کن معرکے کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں مسلمانوں کی حکومت عطا فرمائے گا۔ جن یہودیوں نے انہیں صلیب تک پہنچانے کی کوشش کی تھی ان کے نام لیوا ایک ایک کر کے قتل کر دیئے جائیں گے اور نصاریٰ پر حجت تمام ہو جانے کی وجہ سے ان پر اسلام کا راستہ کھل جائے گا۔ آپؑ ایک عادلانہ حکومت قائم کریں گے پھر اسی طرح موت کے مرحلے سے گزریں گے جس طرح دنیا میں آنے والا ہر انسان گزرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن کئے جائیں گے۔ اور حاکمیت کے اس دور میں آپؑ یقیناً ہر طرح کے اعزاز اور سطوت اور اقبال سے نوازے جائیں گے۔

ذٰلِکَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا کَانَ لِلّٰهِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ
سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴿۳۵﴾

(یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم، (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ ۳۴) اللہ کے شایاں نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے، وہ پاک ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ کہتا ہے، ہو جا۔ پس وہ ہو جاتا ہے۔ ۳۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل حقیقت

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ان کی اصل حقیقت واضح فرمائی ہے، جس سے ایک تو حضرت مریم کا پاک دامن ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خارقِ عادت ولادت سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں ان کا تدارک ہو جاتا ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باوجود اس کے کہ آپؑ کا باپ کوئی نہ تھا لیکن آپؑ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہوتے ہوئے بھی انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہایت جلالتِ قدر سے نوازا تھا اور

Marfat.com

آپ کو وہ کمالات عطا فرمائے تھے جن سے آپ کا اللہ تعالیٰ کا انتہائی مقرب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کتاب عطا فرمائی تھی اور آپ کو پیدائش اور موت اور بعث بعد الموت ہر حال میں مبارک بنایا تھا اور سلامتی کو آپ کا حصار بنادیا تھا لیکن یہ آپ کی تمام صفات عظیم اور نادر ہونے کے باوجود ایک عظیم انسان کی صفات ہی تھیں جس میں خدائی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں انہیں باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تھی اصل حقیقت عیسیٰ ابن مریم کی۔ لیکن لوگوں نے اس میں جو کٹ حجتی اور کج بحثی کے راستے نکالے ہیں۔ وہ ان کی اپنی گمراہی کے نتائج تھے۔

اِمْتِرَاء ...... جو یَمْتَرُوْن کا مصدر ہے۔ اس کا معنی ہوتا ہے ''بکری کے تھن کو اچھی طرح نچوڑنا''۔ یہیں سے یہ لفظ کٹ حجتی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ عیسائیوں نے سینٹ پال کی پیروی کرتے ہوئے جس طرح سیدھی سادی حقیقت کو ایک گورکھ دھندا بنا کے رکھ دیا ہے وہ اسی کٹ حجتی اور بات کو بتنگڑ بنانے کا نتیجہ ہے۔ سورۃ المائدہ میں تفصیل سے یہ بحث گزر چکی ہے کہ کس طرح عبرانی کے لفظ ''اب'' کو باپ کے معنی میں مخصوص کر کے ایک چیستان تخلیق کی گئی ہے اور کس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے کر الٰہیات کے تصورات میں پیچیدگی پیدا کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اولاد سے پاک ہونے پر فطری دلیل

دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے پر بہت اصرار ہے۔ اگر وہ اپنے علمِ کلام کے وضعی پیمانوں سے نکل کر سیدھے سادے طریقے سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو یقیناً وہ یہ بات سمجھ سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے یہ بات ہرگز زیبا نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ علماء نے منطقی انداز میں اس پر بہت سے اعتراضات وارد کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں بالکل سادہ انداز میں یہ بات سمجھائی کہ اولاد کی خواہش ہر شخص کو اس لئے ہوتی ہے تاکہ وہ بڑھاپے میں باپ کی لاٹھی بنے اور اس کی بیچارگی اور کمزوری میں اس کے کام آئے۔ اور پھر دنیا سے اس کے چلے جانے کے بعد اس کے نام کو زندہ رکھے لیکن اللہ تعالیٰ کو بیٹے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ وہ اس حد تک قدرت کا مالک ہے کہ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے بروئے کار لانے کیلئے اسے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ کُن کہتا ہے اور وہ کام ہوجاتا ہے۔ اور کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو کُن کہنے سے وہ چیز پیدا ہوجاتی ہے اور اسے چونکہ زوال نہیں وہ ازلی اور ابدی ہے تو اسے اپنے نام کی بقا کیلئے بیٹے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا سبحانہ کہ اللہ تعالیٰ ایسی ہر احتیاج سے پاک ہے۔ احتیاج کو پورا کرنے کیلئے بیٹے کی ضرورت پڑتی ہے تو جب وہ احتیاج سے پاک ہے تو وہ اولاد سے بھی پاک ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٣٦﴾

(اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، سو اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ ۳۶)

جملہ معترضہ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کا آخری حصہ

اس آیتِ کریمہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں بعض اہلِ علم کو یہ اشکال پیش آیا ہے کہ یہ کلام کس کا ہے، پروردگار کا یا حضرت عیسیٰ

Marfat.com

علیہ السلام کا، حالانکہ یہاں اس اشکال کا کوئی محل نہیں، کیونکہ گزشتہ دو آیتیں دراصل جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان آیتوں سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات جاری تھے۔ ان کے درمیان میں پروردگار نے عیسائیوں کو متوجہ کرنے اور ان کے شرک کی تردید کیلئے ان دو آیتوں کو لانا ضروری سمجھا۔ اب جملہ معترضہ کے ختم ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کا آخری ٹکڑا نقل کیا جارہا ہے کہ انہوں نے مذکورہ ارشادات کے علاوہ آخر میں یہ بات بھی فرمائی تھی اور یہی ان کا اصل پیغام بھی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، پس اسی کی عبادت کرو کیونکہ اس کے قرب اور نجات کے حصول کیلئے یہی سیدھا راستہ ہے، اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔
اس آیتِ کریمہ میں عیسائیوں کی گمراہیوں کے اصل سبب پر انگلی رکھی گئی ہے وہ سبب یہ ہے کہ انجیلوں میں آج تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ بات نقل چلی ہوتی چلی آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی باپ ہے اور تمہارا بھی باپ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ کہنے سے کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی باپ ہے، عیسائیوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنالیا، لیکن اسی قول [illegible] حصہ کہ وہ تمہارا بھی باپ ہے، اسے نظرانداز کردیا حالانکہ اس کے حوالے سے یہ ہونا چاہتے تھا کہ ساری خدائی اللہ تعالیٰ کی [illegible] ہوتی اور ہر شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتا۔
قرآنِ کریم میں اس غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ عبرانی زبان میں چونکہ ''اب'' باپ اور رب دونوں معنوں میں بولا جاتا ہے، البتہ ان کے صحیح مفہوم کا تعین اس کے محلِ استعمال سے ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ''اب'' کا لفظ ''رب'' کے معنی میں استعمال کیا تھا، لیکن عیسائیوں نے اسے باپ کے معنی میں لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا۔ اس آیت میں قرآنِ کریم نے واضح کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل قول یہ تھا جو اس آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے۔ عیسائیوں نے اس میں معنوی ترمیم کرکے کچھ سے کچھ بنادیا۔

عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کرو، کیوں؟

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ تم عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کرو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمہارا رب ہے۔ یعنی تمہیں اس نے پیدا کیا اور تمہاری نمود و پرداخت کے تمام امکانات پیدا کیے، تمہیں تمام ضروریاتِ زندگی فراہم کیں، تمہاری بقاء کیلئے جس چیز کی بھی ضرورت تھی اسے مہیا کیا، تمہیں حواس اور عقل دے کر زندگی کا راستہ آسان بنایا، جس ذات کے یہ احسانات ہوں اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کی عبادت اور بندگی کی جائے۔ لیکن مشرکین نے ان لوگوں اور ان قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے جو انسانوں کے کسی کام نہیں آتیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو سمجھاتے ہوئے یہی بات فرمائی تھی کہ آپ ان بتوں کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ آپ کے کسی کام آتے ہیں۔ یہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات پر ایک ایسی دلیل ہے جس میں سادگی بھی ہے اور پُرکاری بھی، جو انسانی عقل کو بھی اپیل کرتی ہے اور انسانی فطرت پر بھی دستک دیتی ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿٣٧﴾

(پھر ان کے اندر سے مختلف فرقوں نے باہم اختلاف کیا، پس ہلاکت ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے کفر کیا، اس دن کی حاضری سے جو بہت بڑا ہے۔ ٣٧)

Marfat.com

حقیقتِ مسیح سے عیسائیوں میں اختلافات

گزشتہ آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو کچھ بیان ہوا وہی حضرت مسیح کی اصل حقیقت ہے اور اس بیان کو دیکھ لینے کے بعد کوئی الجھن باقی نہیں رہ جاتی۔ ہر بات اپنے تئیں بالکل واضح ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کیسے ہوئی، آپ کی والدہ کی اصل حیثیت کیا ہے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے کیوں پیدا فرمایا، پھر آپؑ کو کیا ذمہ داریاں سپرد کی گئیں اور اس دنیا اور دوسری دنیا میں آپؑ کی کیسی عزت افزائی ہوگی اور آپؑ کا تعلق اپنی والدہ سے کیسا رہے گا، ان میں سے ہر بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن جن کو اختلاف کی راہ پر چلنا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح اپنی راہ نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد یہود نے جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا وہ تو اپنی جگہ ہے لیکن خود عیسائیوں میں حقیقتِ مسیح کے بارے میں اس قدر اختلاف پیدا ہوا کہ اس کے نتیجے میں ان میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا تھے جو انسان بن کر دنیا میں آئے۔ ان لوگوں کو یعقوبیہ کہا جاتا ہے۔ اور کچھ لوگوں نے کہا وہ خدا نہیں، خدا کے بیٹے تھے۔ ان کے پیروکار نسطوریہ کہلاتے تھے۔ کچھ اور لوگوں نے کہا کہ مسیح تین میں کا تیسرا تھے جنہیں اقانیمِ ثلاثہ کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اسرائیلیہ کہا گیا۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے کہا کہ وہ نہ خدا تھے، نہ خدا کے بیٹے نہ تین میں ایک بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا کلمہ تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شمعون کے پیرو تھے اور یہی لوگ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے اور ان ہی کی قرآن نے تعریف کی۔ پھر یہی اختلاف آگے بڑھتا رہا حتیٰ کہ مستقل صورت اختیار کر گیا۔ آج کیتھولک، پروٹسٹنٹ، آرتھوڈیکس، ان کے علاوہ بھی چھوٹے بڑے فرقے بھی موجود ہیں۔ تفصیل کیلئے دیکھئے (الجامع لاحکام القرآن، جز ۱۱، ص ۳۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

شمعون کے پیروکار اگرچہ قلیل تعداد میں تھے اس لئے اہلِ کتاب میں سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والے بہت تھوڑے لوگ ہوئے۔ لیکن انیسویں صدی سے یورپ کے جید علماء کا رجحان حضرت مسیح کے اللہ تعالیٰ کا رسول، اس کا کلمہ اور اس کی روح کے عقیدے کی طرف ہے۔

ڈی ایف سٹراس (DAVID FRIEDRICH STRAUSS) کی کتاب حیات مسیح (LIFE OF JESUS) مطبوعہ ۱۸۳۵ء اور ای۔ رینان (ERNEST RENAN) کی کتاب حیات مسیح مطبوعہ ۱۸۶۳ء کے بعد عیسائی حلقوں میں اس نظریہ کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ مختصر الفاظ میں نظریہ، یہ تھا کہ مسیح دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان تھے لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی قوت وشہود کی معرفت اوروں سے زیادہ حاصل تھی۔

THIS IMPLIED THAT JESUS WAS A MAN LIKE OTHER MEN, BUT WITH A HEIGHTENED AWARNESS OF THE PRESENCE AND POWER OF GOD. (ENCY OF BRI VOL.13-PAGE 25)

مشہد کا مفہوم

حقیقتِ مسیح اور دینِ مسیح میں اختلاف کرنے والوں اور نبی کریم ﷺ کے ہمعصر کفار کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ ان کیلئے

Marfat.com

ہلاکت ہے، عظیم دن کے مشہد سے۔ عظیم دن سے تو ظاہر ہے کہ قیامت کا دن مراد ہے۔ لیکن مشہد کا مفہوم کیا ہے اس کے بارے میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ کیونکہ مشہد کا معنی پیش ہونا اور حاضر ہونا بھی ہوتا ہے۔ اور مشہد حاضری کی جگہ کو بھی کہتے ہیں اور مشہد گواہی پر بھی بولا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں معنے ہی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ یعنی ان کفار کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج تو انہیں کفر کرتے ہوئے کسی چیز کی پروا نہیں اور مسلمات میں اختلاف کیلئے راہیں نکالتے ہوئے بھی کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن قیامت کا دن کیسا ہولناک ہوگا اور وہاں کی حاضری کس قدر پتا پانی کردینے والی ہوگی اور لوگ کس طرح نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے اور کس طرح خونی رشتے ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کردیں گے۔ اس عظیم اور ہولناک دن میں دہلا دینے والی حاضری کا انہیں اگر ہلکا سے تاثر بھی نصیب ہوجائے تو ان کی زبانیں گنگ ہوکر رہ جائیں اور یہ چوکڑیاں بھرنا بھول جائیں۔

اسی طرح مشہد کا معنی گواہی بھی لیا جاسکتا ہے اور بعض اہلِ علم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام انبیائے کرام سے ان کی امتوں کے بارے میں شہادت طلب کرے گا۔ چنانچہ ان کی امتوں نے جو کچھ ان کے ساتھ اور ان کی دعوت کے ساتھ سلوک کیا تھا وہ کھول کر بیان کریں گے۔ اس کے بعد ان امتوں پر جس طرح گھڑوں پانی پڑ جائے گا اس کا تصور کرنا مشکل نہیں۔ اسی طرح عیسائی امت کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے گواہی طلب کی جائے گی۔ سورۃ المائدہ میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت کا ضروری حصہ یہاں نقل کررہے ہیں جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ وہاں حقیقتِ مسیح اور دینِ مسیح میں اختلاف کرنے والوں پر کیا گزرے گی۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَ اُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِىْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(المائدۃ: ۱۱۶، ۱۱۷)

جبکہ اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو معبود بناؤ؟ وہ کہیں گے تو پاک ہے میرے لئے یہ کس طرح زیبا تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے کہی ہوگی تو تو اسے جانتا ہے۔ جو کچھ میرے جی میں ہے اس کو تو جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے جی میں ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ بیشک غیب کا راز دان تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے صرف وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ میں جب تک ان کے اندر رہا ان پر گواہ رہا، پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو ان کا نگرانِ حال تو تھا اور تو ہر چیز سے باخبر ہے۔ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخشے تو تو غالب اور حکیم ہے۔

Marfat.com

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

(کیسے سنتے ہوں گے اور کیسے دیکھتے ہوں گے جس دن وہ ہمارے سامنے پیش ہوں گے،
لیکن ظالم آج کے دن کھلی گمراہی میں ہیں۔ ۳۸)

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ...... یہ دونوں فعلِ تعجب کے صیغے ہیں کہ قیامت کے دن جب یہ کفار اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہوں گے تو جو حقیقتیں ان کو آج دکھائی نہیں دیتیں اور جو باتیں ان کو سنائی نہیں دیتیں وہ کس قدر زیادہ سنتے ہوں گے اور کس قدر زیادہ دیکھتے ہوں گے یا کس تیزی سے سنتے اور دیکھتے ہوں گے کہ دیکھنے اور سننے والا تعجب کا اظہار کرنے لگے گا۔

اللہ تعالیٰ کے کلام میں تعجب کا مفہوم

ہم بھی اپنی زبان میں جب کسی شخص کی کسی حرکت یا کسی حالت کو معمول سے بڑھا ہوا دیکھتے ہیں تو اس پر اظہارِ تعجب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ واہ، کیا تیزی ہے؟ ایک کمزور شخص جو مشکل سے چلتا ہو اور وہ تیز تیز چلنے لگے تو دیکھنے والے تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک لاابالی آدمی امتحان میں اعلیٰ نمبر حاصل کرلے تو تعجب کا اظہار کرتے ہوئے داد دی جاتی ہے تو عموماً ایسا اس وقت ہوتا ہے جبکہ تعجب کا سبب مخفی ہو یا تعجب کے سبب سے ناواقفیت ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کلام میں اظہارِ تعجب بظاہر نا قابلِ فہم بات معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر فعل کے پس منظر اور اس کے تہہ منظر کو بھی جانتا ہے۔ پھر اس کا کفار کے سننے اور دیکھنے کے حوالے سے تعجب کا اظہار کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ چنانچہ بعض لوگوں نے اس اشکال کو محسوس کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اس آیت میں سرے سے یہ فعلِ تعجب کے صیغے نہیں بلکہ فعلِ امر کے صیغے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ انہیں خوب سنایئے اور دکھایئے اور جن لوگوں نے اسے واقعی فعلِ تعجب کے صیغے سمجھا ہے انہوں نے اس کی کوئی نہ کوئی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآنِ کریم انسانوں کی زبان اور انہیں کے اسالیب کے مطابق نازل ہوا ہے۔ یہاں تعجب کا اظہار پروردگار کی جانب سے نہیں بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ تم آج ان کی حالت دیکھ رہے ہو کہ یہ ظالم لوگ کھلی گمراہی میں زندگی گزار رہے ہیں اور اس گمراہی سے نکالنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا عظیم پیغمبر انہیں جو کچھ سمجھاتا ہے اور جو کچھ انہیں سناتا ہے ان کے سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ یہ کسی بات کو سن کے نہیں دیتے، قبول کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں واقعی ان کو نہ سنائی دیتی ہیں اور نہ دکھائی دیتی ہیں لیکن یہی لوگ جب اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہوں گے تو وہاں چونکہ دنیا کے پردے اٹھ چکے ہوں گے ہر چیز کھل کر سامنے آچکی ہوگی اور یہ اپنا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے تو پھر کل تک جو بات انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی اب اس کو خوب سمجھیں گے اور اپنے انجام پر روئیں گے اور ان کو جاننے والا حیران ہو کر دیکھے گا کہ کیا یہی لوگ ہیں جو کل یہ کہتے تھے کہ ہمارے دل تو غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، ان میں باہر سے کوئی چیز داخل نہیں ہوسکتی، لیکن آج ان کی قوتِ مشاہدہ اور قوتِ سماعت کس قدر تیزی سے کام کررہی ہے، یہ درحقیقت تفہیم کا ایک اسلوب ہے جو انسانوں میں شائع وذائع ہے اور قرآنِ کریم نے اسی بات کی اہمیت اور عظمت کو واضح کرنے کیلئے متعدد مواقع پر یہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ لیکن اب ان کے سننے اور دیکھنے سے حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے اگلی آیت میں فرمایا:

Marfat.com

وَاَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۳۹

(اور ان کو ڈرایئے حسرت کے دن سے جبکہ معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے۔ ۳۹)

اے پیغمبر! ان کفار کو آگاہ کیجئے کہ قیامت کے دن جب ہر چیز کی حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی تو اس روز یہ تمنا کریں گے کہ کاش! ہمیں دوبارہ دنیا میں جانے کا موقع ملے تو ہم ایمان اور تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے جنت کے مستحق ہو جائیں، لیکن یہ خیال ان کیلئے اس وقت حسرت کا سبب بن جائے گا جب ان کے زندگی بھر کے معاملات کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ مہلتِ عمل جو ہمیں دنیا میں ملی تھی، اب نہیں ملے گی۔ یہ تو یوم الجزاء ہے یہاں ہمارے دنیا میں کئے ہوئے اعمال کا حساب ہوگا اور ان کا بدلہ دیا جائے گا جن لوگوں نے غفلت میں زندگی گزاری تھی۔ آج ان کی غفلت ان کیلئے عذاب کا باعث بنے گی۔ اب ازسرِ نو زندگی گزارنے کا کوئی موقع نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ جو باتیں قیامت کو پیش آنے والی ہیں ان میں سے ایک ایک بات پہلے بتا دی گئی ہے تا کہ انسان ان کو سمجھیں اور دنیا میں آخرت کی تیاری کریں۔

جس طرح ہر شخص کے اعمال کا حساب ہو جانے کے بعد اس کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا جائے گا پھر وہ ہمیشہ کیلئے جنت میں ہوگا یا جہنم میں۔ اسی طرح حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی فیصلہ کر دیا جائے گا کہ پہلی زندگی ہمیشہ کیلئے ختم کر دی گئی، اب نئی زندگی اور نئی دنیا کا آغاز ہو رہا ہے اور اسے کبھی زوال نہیں آئے گا۔ دوام اس کا مقدر ہے۔ اس دنیا کی جنت بھی ہمیشہ رہنے والی ہے اور جہنم بھی ہمیشہ کیلئے ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ موت کو سرمئی مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا پھر ایک منادی یہ ندا کرے گا، اے اہلِ جنت! تو وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ کہے گا، تم اس کو پہچانتے ہو۔ وہ کہیں گے ہاں، یہ موت ہے۔ اور وہ سب اس کو دیکھ لیں گے۔ پھر اس مینڈھے کو ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر وہ منادی کہے گا، اے اہلِ جنت! اب دوام ہے، موت نہیں ہے۔ اور کہے گا، اے اہلِ دوزخ! اب دوام ہے، اور موت نہیں ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے زیرِ بحث آیتِ کریمہ پڑھی۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث ۴۷۳۰، صحیح مسلم رقم الحدیث ۲۸۴۹، سنن الترمذی رقم الحدیث ۳۱۵۶)

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَیْهَا وَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ ۴۰

(بیشک زمین اور روئے زمین پر بسنے والوں کے وارث ہم ہوں گے اور سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۴۰)

نصیحت کے انداز میں ایک تنبیہ

انسان کو جو چیزیں حق اور صواب کی طرف آنے نہیں دیتیں ان میں سے ایک چیز عہدہ و منصب اور مال و دولت کا وہ پندار ہے جو انسان کے اندر مخصوص قسم کا کردار پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میری اپنی ذات اور تمام وہ چیزیں جو میری ملکیت میں شامل ہیں ان میں سے کوئی بھی باقی رہنے والی نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے پندار سے نکلنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اسے ہمیشہ اپنی طاقت اپنے اختیار اور اپنی خوشحالی پر

Marfat.com

ایسا ناز رہتا ہے کہ اسے یہ کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ آخر ایک نہ ایک دن مجھے اس دنیا سے جانا ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے یہ میری ملکیت نہیں بلکہ اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ میرے پاس چند روزہ امانت ہے، لیکن اس کا طرزِ عمل کبھی اس تصور کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ ہر قول وفعل کے پیچھے اس کی یہ رعونت کارفرما ہوتی ہے کہ میں ایک بہت بڑی حیثیت کا مالک ہوں۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا جارہا ہے کہ یوں تو آج بھی ہم زمین اور اہلِ زمین کے مالک ہیں اور تمام کائنات ہماری ملکیت ہے لیکن ہم نے عارضی طور پر بہت ساری چیزیں انسانوں کی تحویل میں دی رکھی ہیں تاکہ انسان ان سے فائدہ اٹھائیں، لیکن انسانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں کہ وہ ان تمام چیزوں کے مالک ہیں لیکن قیامت کے دن وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ زمین اور زمین پر بسنے والوں کے ہم ہی وارث اور مالک ہیں۔ اور زمین پر بسنے والا ہر شخص کشاں کشاں ہماری طرف آرہا ہے۔ ہر ایک کو اپنی زندگی کے پل پل کا حساب دینا ہے، تب انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کا اور ان کی زیرتصرف چیزوں کا اصل مالک کون ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے کہ قیامت کے دن یہ ندا گونجتی ہوئی سنائی دے گی (لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ) ”بتاؤ آج کس کی حکومت ہے (ہر طرف سناٹا ہوگا پھر پروردگار خود ہی جواب دے گا) کہ آج اس ایک اللہ کی حکومت ہے جو قہار ہے۔“

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ

إِبْرٰهِيْمَ ۬ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ يٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ
مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿٤٢﴾ يٰٓأَبَتِ إِنِّيْ قَدْ
جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ أَهْدِكَ صِرٰطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾
يٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿٤٤﴾
يٰٓأَبَتِ إِنِّيْٓ أَخَافُ أَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ
لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓإِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ
لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَأَسْتَغْفِرُ
لَكَ رَبِّيْ ؕ إِنَّهُ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَأَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰٓى أَلَّآ أَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿٤٨﴾

Marfat.com

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع

رکوع: ۳۔ (اور کتاب میں حضرت ابراہیم کی سرگزشت کو ذکر کیجئے، بیشک وہ راست باز اور نبی تھے۔ ۴۱) یاد کرو! جب حضرت ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ کیوں پرستش کرتے ہیں ایسی چیزوں کی جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ ۴۲) اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، سو آپ میری پیروی کریں، مَیں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ ۴۳) اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کیجئے، بیشک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ۴۴) اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں آپ کو رحمٰن کا کوئی عذاب نہ آ پکڑے، پھر آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں۔ ۴۵) آذر نے کہا اے ابراہیم، کیا تو میرے خداؤں سے اعراض کرنے والا ہے، اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا، تو مجھ سے ہمیشہ کیلئے دور ہوجا۔ ۴۶) حضرت ابراہیم نے کہا آپ کی سلامتی رہے، میں آپ کیلئے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا بیشک وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ ۴۷) اور میں چھوڑ کے الگ ہورہا ہوں تمہیں اور ان کو جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، میں صرف اپنے رب ہی کی بندگی کروں گا، امید ہے کہ اپنے رب کی بندگی کر کے میں محروم نہیں رہوں گا۔ ۴۸) پس جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو اور ان چیزوں کو جن کو وہ خدا کے ماسوا پوجتے تھے چھوڑ کر الگ ہوگئے تو ہم نے انہیں اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کئے، اور ہم نے ہر ایک کو نبی بنایا۔ ۴۹) اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ہم نے ان کو نہایت پائیدار شہرت عطا فرمائی۔ ۵۰)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾

(اور کتاب میں حضرت ابراہیم کی سرگزشت کو ذکر کیجئے، بیشک وہ راست باز اور نبی تھے۔ ۴۱)

روئے سخن قریشِ مکہ کی طرف ہے

گزشتہ دو رکوعوں میں خطاب اگرچہ مشرکینِ مکہ سے تھا لیکن درحقیقت روئے سخن نصاریٰ کی طرف تھا کیونکہ جس طرح یہود نبی کریم ﷺ کی مخالفت میں قریشِ مکہ کی مدد کررہے ہیں اور مختلف سوالات کی صورت میں نبی کریم ﷺ کو زچ کرنے کی کوشش کررہے تھے اسی طرح

Marfat.com

نصاریٰ بھی ان کاوشوں میں شریک ہو چکے تھے۔انہیں بھی جب موقع ملتا وہ قریشِ مکہ کی پیٹ ٹھونکتے اور آنحضرت ﷺ کی مخالفت کے مختلف طریقے انہیں سمجھاتے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام کا تفصیلی واقعہ حقیقتِ مسیح اور پیغامِ مسیح کو واضح طور پر بیان کرنے کے بعد اب روئے سخن قریشِ مکہ کی طرف پھر رہا ہے اور براہ راست ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کریں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قریشِ مکہ کو یہ زعم تھا کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واسطے سے اولاد ہیں۔اس لحاظ سے ہم حسب ونسب کے اعتبار سے دوسروں سے بلند ہیں اور ہماری عظمت کی مزید دلیل یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے گھر کے متولی ہیں اور جب انہیں کہا جاتا کہ اگر تم واقعی ان نسبتوں کو عزیز رکھتے ہو تو پھر تم بتوں کی پوجا کیوں کرتے ہو۔تو وہ جواب میں سب سے بڑی دلیل یہ دیتے تھے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا ہے اور وہ یقیناً حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے طریقے پر ہوں گے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا طریقہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ہمیں دین انہیں سے ملا ہے۔ہمارے آباؤ اجداد نے انہیں سے بت پرستی کی تعلیم پائی ہے۔ان کے اس رویئے کا ابطال کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان کے سامنے حضرت ابراہیم کی سرگزشت بیان کریں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جو تصورات قائم کر رکھے ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت کو شروع کرنے سے پہلے ان کی حیثیت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صدیق اور نبی تھے۔صدیق کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ صدیق وہ ہوتا ہے جس نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور دوسرا قول یہ ہے کہ صدیق وہ ہے جس کے عقیدے اور قول وعمل میں کوئی تضاد نہ ہو، یعنی جس بات پر وہ دل میں یقین رکھتا اور اس کی سچائی کا معترف ہے وہی بات اس کی زبان پر بھی ہو اور اس کا ہر فعل اسی اعتقاد کا ترجمان ہو۔

نبی کا معنی و مفہوم

نبی کے معنی میں بھی اہلِ لغت نے اختلاف کیا ہے۔بعض اس کو لفظ نبأ سے مشتق قرار دیتے ہیں۔نبا کا معنی ہوتا ہے، خبر۔اس لحاظ سے نبی کا معنی ہوگا، خبر دینے والا۔اللہ تعالیٰ جس کو نبوت عطا فرماتے ہیں، اس کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ دنیا کی حقیقت کی خبر دے، آخرت کی حقیقت واضح کرے، انسانی زندگی کی بھلائی کس میں ہے اور تباہی کس میں، اس کا عقدہ کھولے۔زندگی کے وہ حقائق جن کا تعلق عالمِ غیب، عالمِ آخرت اور اخلاق سے ہے ان کے بارے میں یہ بتائے کہ اس بارے میں پروردگار کے احکام کیا ہیں۔غرضیکہ وہ اس بات کی خبر دے کہ اللہ تعالیٰ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں میں ناراض ہوتا ہے اور تمہاری کامیابی کے راستے کیا ہیں اور ناکامی کے کیا ہیں۔

بعض اہلِ لغت کا خیال ہے کہ نبی کا مادہ نَبْوٌ ہے، یعنی رفعت اور بلندی۔اس معنی کے لحاظ سے نبی کا مطلب ہوگا، بلند مرتبہ اور عالی مقام۔ازہری نے کسائی سے ایک تیسرا قول بھی نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل نبیء ہے، جس کا معنی طریق اور راستے کے ہیں اور انبیاء کو نبی اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ ہیں۔

صدیق کا مفہوم

صدیق اور نبی کو ایک ساتھ جب کسی عظیم شخصیت کی صفت کے طور پر ذکر کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے نبی ہونے کی

Marfat.com

حیثیت سے زندگی اور آخرت کے بارے میں جو عقائد، احکام اور آداب وحی کیے گئے ہیں جن کے مجموعے کو دین کہتے ہیں اس کی ساری زندگی اس کی تصویر ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین اور شریعت کو جس طرح اپنے دل میں سچ اور حق سمجھتا ہے اسی طرح اس کا مصداق بن کر زندگی گزارتا ہے۔ اس کا ہر عمل اس کے اعتقاد کی تائید ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل تعارف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت عطا فرمائی اور ان پر صحیفے نازل فرمائے۔ آپؑ کو جو بنیادی اعتقادات اور شریعت دی گئی آپؑ نے ساری زندگی ۱۳۱ کا مصداق بن کر گزاری اور اس راستے میں جو بھی امتحان دینا پڑا اس میں کامیاب ہوئے اور جو بھی تکلیف اٹھانا پڑی اسے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ تبلیغ و دعوت کے آغاز ہی میں گھر در اور وطن چھوڑنا پڑا اور قوم چھوڑنا پڑی۔ آپؑ نے نہایت استقامت سے یہ قربانی دی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے دین کو عام کرنے کیلئے کبھی ملک شام میں نظر آئے، کبھی فلسطین کی خاک چھانی، کبھی مصر میں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کی۔ وطن سے بے وطن ہو کر نہ جانے کیسی کیسی صعوبتیں اٹھائیں، لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کے قریب بیوی اور نوزائیدہ فرزند کو چھوڑنے کا حکم دیا، تو آپؑ نے اس کی تعمیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ بچہ بڑا ہوا تو اس کی قربانی مانگ لی گئی تو اس کے پیش کرنے میں ذرا تامل سے کام نہیں لیا اور زندگی کے اس مشکل ترین امتحان سے سرخرو ہو کر گزرے۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو صدیق کا خطاب دیا۔ کیونکہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو سچا کر دکھایا اور دنیا پر یہ بات واضح کر دی کہ بندگی رب کا حق کس طرح ادا کیا جاتا ہے۔ قریشِ مکہ کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا عنوان اللہ تعالیٰ کے احکام کو سچا ثابت کرنا اور اس کا مصداق بن کر جینا ہے اور اس راستے میں آنے والے ہر امتحان سے خندہ پیشانی سے گزرنا ہے۔ تمہیں اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کا دعویٰ ہے بلکہ تم اپنے آپ کو ان کی وراثت اور ان کے ساتھ نسبت کا حقدار سمجھتے ہو تو پھر تمہیں اس عہد کو پورا کر کے دکھانا ہوگا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ باندھا تھا۔ وہ عہد توکامل توحید اور بندگی رب کا تھا جس میں کسی شرک اور بت پرستی کا گزر بھی ممکن نہ تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نسبت کا دعویٰ بھی رکھتے ہو اور بت پرستی پر فخر بھی کرتے ہو۔ تم اگر واقعی اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہو تو تمہارے اصل جدِ امجد تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور ان کی زندگی خدا پرستی کا پیغام ہے اس میں بت پرستی کا تو شائبہ تک نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعارف کے بعد ان کے پیغام کا ذکر کیا جارہا ہے اور اس میں خاص طور پر یہ بات نمایاں کی جارہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام وہی تھا جس کی دعوت نبی کریم ﷺ دے رہے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے باپ اور ان کی قوم نے وہی کچھ کیا تھا جو تم آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے ہو۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

(یاد کرو جب حضرت ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ کیوں پرستش کرتے ہیں ایسی چیزوں کی جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ ۴۲) اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے

Marfat.com

جو آپ کے پاس نہیں آیا، سو آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ ۴۳) اے میرے باپ!
شیطان کی بندگی نہ کیجئے، بیشک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ۴۴) اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں آپ کو رحمٰن
کا کوئی عذاب نہ آ پکڑے، پھر آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں۔ ۴۵)

اپنے والد کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر

ان چار آیتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ تقریر ہے جو آپؑ نے اپنے والد کے سامنے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب آپؑ کو نبوت عطا کی تو انبیائے کرام کے طریقے کے مطابق یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو دعوت کا آغاز اپنے اہلِ خانہ اور قریبی عزیزوں سے کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ چنانچہ آپؑ نے اس حکم کے مطابق مناسب موقع دیکھ کر اپنے والد کے سامنے اپنی دعوت رکھی۔ اس دعوتی تقریر میں اصل پیغام سمجھنے سے پہلے چند مزید باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بار بار اپنے والد کو باپ کہہ کر خطاب کر رہے ہیں۔ اگر آذر آپؑ کے باپ نہیں بلکہ چچا تھے تو قرآنِ کریم نے بار بار باپ کے لفظ کا تکرار کیوں کیا۔ باپ نے آپؑ کی دعوت کے جواب میں جو سخت رویہ اختیار کیا اگر آذر آپؑ کے حقیقی باپ نہ تھے تو قرآنِ کریم انہیں چچا کا خطاب دے کر یہ بات واضح کر سکتا تھا کہ ان کی سختی کی وجہ جہاں بت پرستی سے شدید محبت تھی، وہاں یہ بھی تھی کہ وہ آپؑ کے حقیقی باپ نہ تھے۔ اس لفظ کے تکرار سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آذر آپؑ کے باپ تھے۔ تو رہی یہ بات کہ تورات نے انہیں چچا قرار دیا ہے تو، تورات کی ہر بات کو قبول کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ تورات میں جابجا تحریف ہو چکی ہے اور ایک سے زیادہ مرتبہ تورات کو مکمل جلائے جانے کے بعد اسے از سر نو لکھوایا گیا ہے جس میں تورات بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک حصہ بن کے رہ گئی ہے اور نہ جانے اس کے کتنے باب گم ہو چکے اور کتنے مقامات پر ترمیم اور تحریف ہو چکی ہے۔

دوسری بات جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جتنی باتیں اپنے والد سے ارشاد فرمائی ہیں ان میں ہر بات سے پہلے یٰٓاَبَتِ کہہ کر خطاب کیا ہے۔ یہ لفظ عربی لغت کے اعتبار سے باپ کی تعظیم و محبت کا خطاب ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں، اے میرے باپ! بلکہ اس میں ادب کے تقاضے بھی شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ اگرچہ بت پرست اور کافر تھے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی نہ آنے دی اور پھر اس لفظ کا تکرار آپؑ کی دلسوزی، دردمندی اور استمالت کی دلیل ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ اپنے باپ کی گمراہی سے سخت آزردہ ہیں۔ آپؑ کی دلی تمنا ہے کہ کسی طرح وہ ایمان لا کر آخرت میں سرخروئی کا سامان کر لیں اور آپؑ کا یہ رویہ اسلام کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ اسلام نے کافر اور فاسق ماں باپ کے بھی احترام کا حکم دیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو جس طرح اپنے باپ کی تعظیم کرنی چاہئے اس سے کہیں بڑھ کر اس کی ہدایت کیلئے نہایت دردمندی اور حکمت سے کوشش بھی کرنی چاہئے۔

اس تقریر کے چند اہم نکات

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی تقریر میں چار باتیں ارشاد فرمائیں۔ ان میں سب سے پہلی بات جو پہلی آیت میں فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ابا جان! آپ ان بتوں کو معبود مانتے اور ان کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ آپ کے کسی کام آتے

Marfat.com

ہیں۔ کسی کو معبود ماننے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنی عظمت اور بڑائی کے حوالے سے اس لائق ہے کہ اس کے سامنے سجدہ کیا جائے اور اس کی پوجا کی جائے اور وہ اپنی قدرت کے لحاظ سے یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی ناتوانیوں اور ضرورتوں میں اس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے اور وہ اپنے بے پناہ علم اور وسعت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اپنی تنہائیوں میں اسے پکارا جائے اور اس سے اس وقت مدد مانگی جائے جبکہ ہر سہارا جواب دے دے کیونکہ محض کسی کو معبود بنالینا کوئی کھیل نہیں، یہ تو انسانی ضرورت ہے۔ جب ہر سہارا ٹوٹنے لگتا ہے اور تنہائیاں ڈسنے لگتی ہیں اور ناتوانی عذاب بن جاتی ہے تو پھر آدمی خواہی نخواہی کسی کو پکارتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کو تو اس لئے پکارتا اور اس کی بندگی کرتا ہے کہ اس نے اسے پیدا کیا ہے، اس کی زندگی کی ہر ضرورت مہیا کی ہے اور اسے احساس اور عقل کی دولت عطا کی ہے اور پھر اس کی فریادوں کو سنتا، اس کے دکھ درد کو دیکھتا اور ہر مشکل وقت میں اس کی دستگیری کرتا ہے۔ لیکن آپ جن بتوں کو پکارتے ہیں وہ آپ کے ہاتھوں کی گھڑی ہوئی مورتیاں ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں اور جن اَن دیکھی قوتوں کو آپ نے معبود بنا رکھا ہے ان کی حیثیت بھی وہم وگمان سے زیادہ نہیں۔ تو پھر یہ آپ کے نام نہاد معبود آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ یہ ایک ایسی بدیہی دلیل ہے، عقلِ سلیم جس کا جواب نہیں دے سکتی۔

دوسری آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ عبادت اور بندگی کس کی ہونی چاہئے؟ پرستش کے کون لائق ہے؟ وہ کون سی ذات ہے جسے مطاعِ مطلق مانا جاسکتا ہے؟ وہ کون ہے جس کی ذات نارسائیوں سے پاک ہے؟ جو ہر طرح کی خواہش، غرض، جانبداری اور عصبیت سے بلند ہے، جو انسانی فطرت کو سمجھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتی، جس کا فرمایا ہوا ہر خطا ونسیان سے پاک ہے۔ ان باتوں کے جواب کیلئے علم چاہئے۔ ایسا علم جو بجائے خود ہر غلطی سے مبرا ہو۔ عقلِ سلیم اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ ایسا علمِ حقیقی صرف خدا کی طرف سے آسکتا ہے اور اس کا ذریعہ وحیِ الٰہی ہے اور یہ محض مفروضہ نہیں بلکہ قوموں اور مذاہب کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسانوں کی ہدایت کیلئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے نبی مبعوث ہوئے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی اتری جس نے آکر ان کی زندگی کے مقاصد اور زندگی گزارنے کے طریقے کو واضح کیا اور ان انبیاء کی بے عیب زندگی اور ان کا بے عیب کردار اور انسانوں کے ساتھ ان کی گہری ہمدردی اور غمخواری اور بغیر کسی لالچ اور معاوضے کے زندگی بھر ان کی ہدایت کیلئے کوشاں رہنا، یہ وہ دلائل ہیں جس نے نبوت اور وحیِ الٰہی کی تصدیق کی ہے۔ ابا جان! اللہ تعالیٰ نے اس دور میں مجھے وہ علم عطا فرمایا ہے جو نبوت کے ذریعے ملتا ہے۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے، میں زندگی کے حقائق کو وحیِ الٰہی کی روشنی میں دیکھتا ہوں۔ آپ چونکہ اس علم سے بے بہرہ ہیں، آپ کا احترام سر آنکھوں پر، لیکن ہدایت کیلئے آپ کو میری پیروی کرنا ہوگی۔ میں اس صراطِ مستقیم اور سیدھے راستے کی آپ کو خبر دوں گا جو اس دنیا میں کامیابی کی ضمانت اور آخرت میں سرخروئی کا ذریعہ ہے۔

تیسری آیت میں یہ حقیقت واضح فرمائی کہ آپ اگر میری پیروی نہ کرکے صحیح علم سے اِبا کریں گے تو آپ درحقیقت شیطان کی بندگی کریں گے اور شیطان اللہ تعالیٰ کے راستے کا دشمن ہے، اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرکے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگتے ہوئے صاف صاف اعلان کیا کہ میں آدم علیہ السلام کی اولاد کو گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ آپ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا انکار کرکے شیطان کی بندگی کررہے ہیں جبکہ آپ جانتے ہیں کہ شیطان اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ تو جو شخص اس کی بندگی کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں میں شامل ہوجائے گا۔

اس آیتِ کریمہ میں لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ فرمایا گیا ہے۔ جس کا معنی عام طور پر کیا جاتا ہے شیطان کی پرستش اور اس کی پوجا پاٹ نہ کرو حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ شیطان کی پرستش کبھی کسی نے نہیں کی۔ ہر وہ شخص جو شیطان کی حقیقت کو جانتا ہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب

Marfat.com

سے ہو وہ ہمیشہ شیطان پر لعنت بھیجتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شیطان گمراہی کا ذریعہ ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں عبادت پرستش کے معنی میں نہیں بلکہ اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ سب فاسق وفاجر اور گمراہ لوگ شیطان کو گالیاں بھی دیتے ہیں اور اس کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ عبادت اطاعت کے معنی میں بھی آتا ہے اور قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہاں اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ آپ پرستش تو بتوں کی کرتے ہیں لیکن زندگی کا رویہ شیطان کی اطاعت پر مبنی ہے۔ تو آپ ان دونوں سے توبہ کریں ورنہ آپ شیطان کے پیروکاروں میں شامل ہوجائیں گے۔

چوتھی آیتِ کریمہ میں یہ حقیقت واضح فرمائی کہ جب تک کسی شخص کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت نہیں آتی تو اس کے پاس عذر ہوتا ہے، بے علمی اور بے خبری کا اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے تو کسی نے نہیں بتایا تھا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے کیونکہ ہمارے پاس نہ کوئی نبی آیا اور نہ کوئی نبی کے راستے پر چلنے والا۔ چنانچہ آج تک ابا جان آپ کے پاس بھی یہ عذر موجود تھا۔ لیکن اب جبکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوت دی ہے اور میں علمِ الٰہی لے کر آپ کے پاس آیا ہوں تو اب اگر آپ اس علم کی پیروی سے انکار کریں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ پر کہیں اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ ٹوٹ پڑے اور آپ کو شیطان کا ساتھی قرار دے کر اس انجام سے دوچار نہ کردیا جائے جو شیطان کی پیروی کرنے والوں کا مقدر ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾

(آذر نے کہا اے ابراہیم، کیا تو میرے خداؤں سے اعراض کرنے والا ہے، اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا، تو مجھ سے ہمیشہ کیلئے دور ہو جا۔ ۴۶)

مَلِیًّا کا مفہوم

مَلِیًّا ...... زمانہ طویل کے معنی میں آتا ہے۔ تقدیرِ کلام یوں ہوسکتی ہے وَاهْجُرْنِیْ هَجْرًا مَلِیًّا اس کا ایک معنی تو یہ ہوسکتا ہے کہ تم مجھے لمبی مدت تک کیلئے چھوڑ دو۔ یعنی زندگی بھر کیلئے چھوڑ دو اور دوسرا معنی ہے، میرے سامنے سے دفعہ ہو جاؤ، کبھی اپنی شکل مجھے نہ دکھائیو۔

تقریر کا ردِّ عمل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سن کر ان کا باپ بھڑک اٹھا اور غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا کہ تمہاری اس تقریر کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم بت پرستی چھوڑ کر تمہارے ایک خدا کی پرستش شروع کردیں۔ اس طرح سے تم خود بھی ہمارے خداؤں کا انکار کر رہے ہو اور مجھے بھی ان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہارے لئے عافیت اس میں ہے کہ تم اپنی دعوت بند کرو اور اپنے طرزِ عمل کو درست کرو اور بت پرستی کو اپنا شعار بنا لو ورنہ میں تمہیں سنگسار کردوں گا۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اندازہ لگا لیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی دعوت اور اپنے مؤقف پر اس طرح قائم ہیں کہ اس سے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو تب اس نے کہا کہ میرے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ اور کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا اور اگر میں نے تمہیں دوبارہ دیکھا تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا۔ بعض لوگوں نے اس رجم کو رجم بالید یا رجم باللسان پر محمول کیا ہے حالانکہ آیتِ کریمہ کے الفاظ میں جو زور ہے وہ خود بول رہا ہے کہ اس سے مراد رجم باللسان یا رجم بالید مراد نہیں بلکہ پتھروں سے سنگسار کرنا مراد

Marfat.com

ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قبائل کی زندگی میں جس طرح ایک آقا کو اپنے غلام پر غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے اس طرح باپوں کو بھی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں پر یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ انہیں قتل کر دیں، سنگسار کر دیں یا زندہ درگور کر دیں، اور اس اختیار کے استعمال سے انہیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾

(حضرت ابراہیم نے کہا آپ کی سلامتی رہے، میں آپ کیلئے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا بیشک وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ ۴۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کے والد کسی طرح بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں بلکہ وہ خونی رشتوں کو بھی بھول گئے ہیں اور انہوں نے کھڑے کھڑے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کو سنگسار کرنے کی دھمکی دے دی ہے اور فوری مطالبہ یہ کیا کہ اس وقت فوراً میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حد تک غضبناک ہو گئے ہیں کہ اپنے بیٹے کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں، لیکن اگر اتنی بڑی سزا کے بعد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رویہ نہیں بدلتا اور وہ توحید پر قائم رہتے ہیں تو پھر دوسری سزا یہ تھی کہ انہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد کہنے سننے کی تو کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

اسلام کا مفہوم

آپؑ نے باپ کی دوسری سزا پر عمل کرتے ہوئے باپ کو الوداعی سلام کہا کہ اچھا اگر آپ مجھے برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں آپ کے غضبناک ہونے کی وجہ سے حق کو چھوڑ دوں۔ البتہ میں آپ کی سزا کو قبول کرتے ہوئے گھر سے جا رہا ہوں۔ گھر سے جاتے ہوئے شائستگی کا ثبوت دیتے ہوئے باپ کو سلام کہا جسے وداعی سلام یا سلامِ رخصت کہنا چاہئے جو ہر شائستہ آدمی کہیں سے بھی رخصت ہوتے ہوئے کہتا ہے، چاہے اس کا رخصت ہونا نہایت تکدر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے سلام کے بارے میں یہ سوال اٹھانا کہ کافر کو سلام کہنا جائز ہے یا نہیں ایک غیر متعلق سی بات ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے کسی سے شائستگی سے علیحدہ ہونے کیلئے اسی طریقے کی تعلیم دی ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے، وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا "جب جاہل اور کج بحث لوگ بات کو الجھانا چاہیں تو انہیں سلام کہہ کر رخصت ہو جاؤ"۔ یہ علیحدگی کا شائستہ طریقہ ہے جو قرآنِ کریم نے سکھایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی طریقے کے مطابق اپنے باپ سے الگ ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اگرچہ ناگواری سے یا زخمی دل کے ساتھ علیحدہ ہو رہا ہوں لیکن اس بات کا اطمینان رکھئے کہ میرے دل کے جذبات میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ میں پہلے کی طرح آپ کا خیر خواہ رہوں گا۔

سلام کی بحث کو چھیڑتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ حدیث میں کسی کافر کو ابتداءً سلام کہنے کی ممانعت آئی ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، یہود و نصاریٰ کو ابتداءً سلام نہ کہو مگر اس کے بالمقابل بعض روایات اور احادیث

Marfat.com

میں ایک ایسے مجمع کو ابتدائی سلام کرنا خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے جس میں کفار و مشرکین اور مسلمان سب جمع تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت اسامہؓ کی روایت سے ثابت ہے۔ اس لئے فقہائے امت کا اس کے جواز و عدمِ جواز میں اختلاف ہوا جس کی تفصیل قرطبی نے احکام القرآن میں اسی آیت کے تحت بیان کی ہے۔ اور امام نخعی کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر تمہیں کسی کافر یہودی یا نصرانی سے ملنے کی کوئی دینی یا دنیوی ضرورت پیش آ جائے تو اس کو ابتدائی سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ بے ضرورت سلام کی ابتدا کرنے سے بچنا چاہئے۔ اس طرح مذکورہ دونوں حدیثوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا استغفار کا وعدہ

دوسری بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہی کہ میں گھر سے تو جا رہا ہوں لیکن میں آپ کیلئے اپنے رب سے استغفار کرتا رہوں گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کا اپنے باپ کو سلام کہنا اسی دردمندی اور رقتِ قلبی کا نتیجہ تھا جس کا اظہار استغفار کے وعدے کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ باپ اپنے بیٹے کو رجم کی دھمکی دے رہا ہے اور گھر سے نکلنے کا حکم دے رہا ہے اور بیٹے کے حُسنِ اخلاق کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے کفر کی وجہ سے انتہائی پریشان ہے اور ہمدردی و غمگساری کا اظہار کرتے ہوئے اس کیلئے ہمیشہ دعا کرنے کا وعدہ کر رہا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ اگرچہ میرے رب کو تسلیم نہیں کرتے، اس لحاظ سے اسی رب سے آپ کی مغفرت طلب کرنا عجیب سے بات معلوم ہوتی ہے، لیکن میرا رب چونکہ میرے حال پر انتہائی مہربان ہے، وہ میرے رنج والم کو جانتا ہے۔ وہ مجھ پر مہربانی فرماتے ہوئے ممکن ہے آپ کو ہدایت دے دے اور اس طرح سے آپ کی مغفرت کا سامان ہو جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس رویئے پر اشکال وارد ہوتا ہے کیونکہ کفار کیلئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی دعا کرنے سے منع فرمایا ہے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے یہ وعدہ کیسے کر لیا۔ قرآنِ کریم نے سورۃ توبہ میں اس اشکال کا جواب دیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ

”حضرت ابراہیم کا اپنے باپ کیلئے مغفرت طلب کرنا اس وعدے کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنے باپ سے کیا تھا مگر جب یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو آپؑ نے اس سے براءت کا اعلان کر دیا۔“

اندازہ کریں باپ کیلئے اللہ تعالیٰ نے استغفار کی اجازت نہیں دی۔ باوجود اس کے کہ بیٹے کا دل اپنے باپ کے کفر کی وجہ سے زخمی ہے اور وہ کافر کے انجام کو جانتے ہوئے اپنے باپ کیلئے معافی حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ اجازت کی صورت میں ایک تو وہ مستقل قانون ٹوٹ جاتا جس کے مطابق کسی کافر کی نجات نہیں ہوگی اور دوسری یہ بات کہ پیغمبر جس طرح دنیا میں رحمت بن کر آتا ہے، اسی طرح وہ دینی حمیت کا پیکر بھی ہوتا ہے۔ یہ بات غیرت و حمیت کے خلاف ہے کہ کافر کیلئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا جائے چاہے وہ باپ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ باپ کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے رشتے سے بڑھ کر ہے۔

Marfat.com

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ﴿۴۸﴾

(اور میں چھوڑ کے الگ ہو رہا ہوں تمہیں اوران کو جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، میں صرف اپنے رب ہی کی بندگی کروں گا، امید ہے کہ اپنے رب کی بندگی کر کے میں محروم نہیں رہوں گا۔ ۴۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی غیرت وحمیت

ایک طرف تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رقتِ قلبی کا عالم یہ ہے کہ اپنے باپ کے ظالمانہ رویئے پر بھی وہ ان کیلئے استغفار کرتے ہیں اوران کی دردمندی اس نامناسب سلوک پر بھی شکست نہیں کھاتی اور دوسری طرف غیرت وحمیت کا عالم یہ ہے کہ اپنے گھر کو چھوڑتے ہوئے نہایت جرأت کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ میں اگرچہ گھر سے جا رہا ہوں، اپنا شہر چھوڑ رہا ہوں، اپنی قوم سے الگ ہو رہا ہوں، غربت اور مسافرت میں نہ جانے مجھ پر کیا گزرے گی، لیکن میں یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنے اعتقادات کے بارے میں ہرگز کسی لچک کا روادار نہیں ہوں، مجھے اپنے موقف کے حق ہونے کا مکمل یقین ہے۔ اس لئے میں تم سب سے بھی الگ ہو رہا ہوں اور جن قوتوں کو تم پکارتے ہو، چاہے وہ شخصیتیں ہوں جن کے تم نے بت تراش رکھے ہیں اور چاہے تمہارے خود ساختہ دیوی دیوتا ہوں، میں ان سب سے کنارہ کش ہوتا ہوں۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ جو بھی ان دیویوں اور دیوتاؤں کا انکار کرتا ہے، اس پر ان کی مار پڑتی ہے۔ لیکن میں اس جہالت کو ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ میں صرف اپنے رب کی بندگی کروں گا، اسی کو پکاروں گا، اسی کے سامنے سرِ نیاز جھکاؤں گا۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ میں تمہیں اور وطن کو چھوڑ کر جس تنہائی کا شکار ہو رہا ہوں اللہ تعالیٰ اس کی ضرور تلافی فرمائیں گے اور مجھے اپنی رحمتوں سے نوازیں گے۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ﴿۴۹﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا ﴿۵۰﴾

(پس جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو اوران چیزوں کو جن کو وہ خدا کے ماسوا پوجتے تھے چھوڑ کر الگ ہو گئے تو ہم نے انہیں اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کئے، اور ہم نے ہر ایک کو نبی بنایا۔ ۴۹) اوران کو اپنی رحمت سے نوازا اور ہم نے ان کو نہایت پائیدار شہرت عطا فرمائی۔ ۵۰)

ہجرت اوراس کی برکات

گزشتہ آیتِ کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کی دھمکیوں کے بعد گھر، وطن اوران کی دیویوں اور دیوتاؤں کو چھوڑنے کا اعلان کرکے گویا ہجرت کرنے کا اعلان کر دیا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ہجرت کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے تو اس کے بعد نہ جانے کتنے سالوں کے حالات محذوف ہیں کیونکہ آپؑ مختلف ملکوں

Marfat.com

میں دعوت الی اللہ کے سلسلے میں تشریف لے گئے۔ جب کسی شہر میں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کرتے تو شدید مخالفت کے پیشِ نظر وہ شہر چھوڑنا پڑتا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ جب اس ملک کی سرزمین بھی تنگ ہوجاتی تو پھر آپؑ دوسرے ملک کا رخ کرتے، کیونکہ آپؑ کی زندگی کا حقیقی مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کو عام کرنا اور اسے سربلند کرنا تھا۔ اس لئے آپؑ پہلے ملک شام میں داخل ہوئے۔ وہاں جب آپؑ پر حالات شدید ہوگئے تو پھر مصر تشریف لے گئے۔ اس طرح نہ جانے اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ بالآخر آپؑ فلسطین کے قریب اپنا ٹھکانہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ کا چونکہ وعدہ ہے کہ جو اس کے راستے میں ہجرت کرتا، قربانیاں دیتا اور سب کچھ اس کیلئے تیاگ دیتا ہے تو وہ بھی اپنی نعمتوں کے دروازے اس کیلئے کھول دیتا ہے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دین پر قربان کردیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی۔ آپؑ گھر سے نکالے گئے تھے تو آپؑ کو گھر دیا گیا۔ وطن چھوڑنا پڑا تھا، آپؑ کو وطن عطا کردیا گیا۔ اپنے اعزہ واقرباء سے محروم ہوکر تنہائی کا شکار ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو بیویاں بھی عطا فرمائیں اور اولاد بھی عطا فرمائی۔ اس طرح آپؑ کی تنہائی کا علاج کیا گیا اور آپؑ کو سکون کی زندگی عطا فرمائی گئی تاکہ آپؑ اطمینان سے اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کرسکیں۔ آپؑ کو جو اولاد دی گئی وہ صرف اولاد ہی نہ تھی بلکہ انہیں دنیا کا مقتداء بنایا گیا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کے امام اور مقتداء ہیں اور حضرت یعقوب کا چونکہ نام اسرائیل تھا اس لئے آپؑ کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی اور صدیوں تک اللہ تعالیٰ نے دینی قیادت سے ان کو نوازا۔ نہ جانے کتنے انبیاء و رسل ان میں مبعوث ہوئے اور دنیا کی قابلِ ذکر تاریخ ان کی وجہ سے وجود میں آئی۔

حضرت اسحاقؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ آپ کے پوتے ہیں۔ حضرت اسحاقؑ حضرت اسماعیلؑ کے بعد آپؑ کے انتہائی بڑھاپے کی اولاد ہیں اور میں نہیں جانتا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں پیدا ہوئے ہیں یا آپؑ کی رحلت کے بعد دنیا میں تشریف لائے۔ لیکن ان کا ذکر معلوم ہوتا ہے کہ دو وجہ سے کیا گیا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ان کے ذکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس حد تک نوازا کہ ان کی اولاد میں نہ صرف پے در پے نبی پیدا ہوئے بلکہ وہ اس سلسلۂ دعوت کے امین اور امام بنائے گئے جس نے صدیوں تک اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کا کام کیا۔ کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہوئے اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر میں ٹھکانہ دیا اور وہاں ایک نئی تاریخ نے جنم لیا۔ اور دوسری وجہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذکر کرنے کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات کا اطمینان دلانا ہے کہ ہم نے جو آپؑ کو حضرت اسحاقؑ جیسا بیٹا عطا فرمایا ہے تو آپؑ کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہ آئے کہ نہ جانے اسے طویل زندگی ملے گی یا نہیں۔ حضرت اسحاقؑ لمبی عمر پائیں گے اور وہ صاحب اولاد ہوں گے اور حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا عظیم فرزند اللہ تعالیٰ ان کو عطا فرمائے گا۔

اگلی آیت میں اسی سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو خوب خوب اپنی رحمت سے نوازا۔ ان میں انبیاء کا ایک سلسلہ چلا اور ان کی اولادوں سے ایک قوم وجود میں آئی اور اس طرح ہم نے انہیں نہایت پائیدار شہرت سے نوازا۔ لِسَانَ صِدْقٍ میں لِسَانَ سے مراد ذکر اور شہرت ہے۔ صدق کا معنی سچائی ہوتا ہے، لیکن قَدَمَ صِدْقٍ کی طرح یہاں صِدْقٍ کا معنی رسوخ، پائیداری اور استحکام ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں دعوت الی اللہ کے کام کو خوب فروغ بخشا، اور صدیوں تک آپؑ کی اولاد دنیا کے قابلِ ذکر حصے پر نہ صرف حکمران رہی بلکہ ان کی امامت و قیادت بھی کی۔ حضرت داؤد،

Marfat.com

حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام جیسے عظیم پیغمبر پیدا ہوئے اور اول الذکر دو شخصیتیں تو اپنے دور کی عظیم حکمران بھی رہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا جاہ وجلال اور حکومت کی وسعت تو شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہو۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی اولاد سے نبی آخر الزمان ﷺ پیدا ہوئے اور اس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شہرت اور عظمت کو بقائے دوام حاصل ہوئی۔ آج بھی مسلمان اپنی نمازوں میں ان پر درود بھیجتے ہیں۔ اپنی قربانیوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت قرار دیتے ہیں اور حج کے مناسک کا بیشتر حصہ انہیں کی یادگار ہے۔ ان کی عظمت وشہرت کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں مذاہب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا احترام کرتے اور ان کو اپنا مقتداء سمجھتے ہیں۔

ایک الجھن کا ازالہ

یہاں ایک بات کھٹکتی ہے کہ ہجرت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہجرت کا پہلا ثمر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شکل میں ملا ہے کیونکہ وہ آپؑ کے پہلے فرزند ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلۂ کلام میں ان کا ذکر تک نہیں۔ اس کی درحقیقت دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ چونکہ اس سورت اور بالخصوص اس رکوع میں روئے سخن اصل میں مشرکینِ عرب کی طرف ہے اور قریش بالخصوص حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اس نسبت سے اس سلسلۂ کلام کی روا روی میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کر دینا مناسب معلوم نہیں ہوا بلکہ چند آیتوں کے بعد ان کا مستقل ذکر فرمایا جا رہا ہے تاکہ ان کی اہمیت اور عظمت نمایاں ہو اور دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ اس رکوع سے پہلے دو رکوعوں میں دو واقعات بیان کئے گئے ہیں جن کا تعلق خارقِ عادت سے ہے، یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کے گھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا پیدا ہونا جبکہ ان کے والدین اولاد کی عمر سے گزر چکے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے صرف ماں سے پیدا ہونا یہ ایسے معجزات ہیں جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، وہ کسی کام میں بھی اسباب کا پابند نہیں۔ تو تم ایسی قادرِ مطلق ذات کے ساتھ مخلوقات کو کیسے شریک ٹھہراتے ہو۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذکر اس لئے فرمایا کہ وہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بڑھاپے کی اولاد ہیں جبکہ ان کی والدہ محترمہ حضرت سارہ اولاد سے بانجھ ہو چکی تھیں اور جب ان کو خبر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بیٹا عطا فرمانے والا ہے تو انہوں نے بھی حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریم کی طرح نہایت تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں تو ایک بانجھ عورت ہوں، میرے یہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس نسبت سے حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کا ذکر محلِ کلام کے عین مطابق ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کو مزید دلوں میں راسخ کیا جائے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ کو اس وقت عطا کئے تھے جبکہ وہ جوان تھیں۔ سیاقِ کلام کی مناسبت سے ان کا ذکر اسی سلسلۂ کلام میں کرنے کی بجائے الگ فرمایا گیا کیونکہ ان کی حیثیت بالکل الگ ہے اور وہ ویسے بھی ایک نئی قوم کے جدِ امجد اور مورثِ اعلیٰ ہیں اور جن کی اولاد میں نبی کریم ﷺ جیسی عظیم تر شخصیت پیدا ہوئی ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى

اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥١﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿٥٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ

Marfat.com

هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ
وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ
عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا
نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ
مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ
ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ
خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾
اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ
وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ
بِالْغَيْبِ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا
وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ
عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ
اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ
تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾

Marfat.com

رکوع: ۴۔ (اوراس کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیجئے، بیشک وہ ایک چیدہ اور رسول نبی تھا۔ ۵۱) اور ہم نے اس کو طور کے داہنی جانب سے پکارا، اور راز و سرگوشی کیلئے اس کو قریب کیا۔ ۵۲) اور عطا کیا ہم نے اسے اپنی رحمت سے ہارون کو نبی بنا کر۔ ۵۳) اور کتاب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سرگزشت کو ذکر کیجئے، بیشک وہ وعدے کے پکے اور رسول نبی تھے۔ ۵۴) وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ ۵۵) اور کتاب میں حضرت ادریس کو یاد کیجئے، بیشک وہ صدیق اور نبی تھے۔ ۵۶) اور ہم نے انہیں رتبۂ بلند پر پہنچایا۔ ۵۷) یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے نبیوں میں سے اپنا فضل فرمایا، آدم کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے حضرت نوح کے ساتھ سوار کیا اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسرائیل کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور جن کو برگزیدہ کیا جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔ ۵۸) پھر ان کے بعد ان کی جگہ آئے ناخلف جنہوں نے نماز ضائع کردی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے تو یہ لوگ عنقریب اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ ۵۹) مگر جس نے توبہ کی اور ایمان اور عملِ صالح کی روش اختیار کی، یہی لوگ ہیں جو جائیں گے جنت میں، اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ ۶۰) ہمیشگی کے باغ جن کا خدائے رحمٰن نے اپنے بندوں سے عالمِ غیب میں وعدہ کر رکھا ہے، بیشک اس کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔ ۶۱) وہ اس جنت میں کوئی لغویات نہیں سنیں گے، بس سلام سنیں گے، اس میں ان کیلئے صبح وشام رزق مہیا ہوگا۔ ۶۲) یہ وہ جنت ہے جن کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو پرہیزگار ہوں گے۔ ۶۳) اور ہم نازل نہیں ہوتے مگر اپنے رب کے حکم سے، اسی کی ملکیت (اور اختیار میں) ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہیں اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اور آپ کا رب کسی چیز کو بھولنے والا نہیں۔ ۶۴) وہی رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بس آپ اسی کی بندگی کریں اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہیں، کیا آپ جانتے ہیں اس کی کوئی نظیر؟ ۶۵)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

(اوراس کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیجئے، بیشک وہ ایک چیدہ اور رسول نبی تھا۔ ۵۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذُرِّیت میں اللہ تعالیٰ نے جو برکت عطا فرمائی اور ان میں سلسلۂ نبوت جاری فرمایا تو اس سلسلہ کے جلیل القدر نبی اور رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کی وضاحت کیلئے اس آیتِ کریمہ میں تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ مخلص، رسول اور نبی۔

مخلص کا معنی ومفہوم

مخلص کا معنی ہوتا ہے، چیدہ، چنا ہوا، کسی کارِ خاص کیلئے انتخاب کیا ہوا۔ اس معنی کے لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوئی

Marfat.com

خصوصیت نہیں کیونکہ تمام انبیائے کرام ایک کارِ خاص ہی کیلئے منتخب کئے گئے تھے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں انبیائے کرام کی شان میں کہا گیا ہے:
اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ''ہم نے ان کو ایک خاص کام یعنی آخرت کی یاددہانی کیلئے منتخب کیا تھا'' تمام انبیائے کرام میں اس عموم کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بطورِ خاص سوائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اور کسی کیلئے بھی مخلص کا وصف استعمال نہیں کیا گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی وصفِ امتیازی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ ان کیلئے لقبِ امتیازی ہے تو پھر اس کا مفہوم کیا ہے؟ اور وہ کیا وجہ ہے جس کی باعث حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لقب سے ملقب ہوئے ہیں۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام باقی رسولانِ گرامی کی طرح ایک تو اہلِ مصر اور بنی اسرائیل کی ہدایت کیلئے مبعوث ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے آپؑ کی ذمہ داری عام رسولوں کی طرح تھی۔ لیکن آپؑ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپؑ صرف فرعون اور آلِ فرعون ہی کی ہدایت کیلئے ہی تشریف نہیں لائے تھے بلکہ ان کے ہدایت قبول نہ کرنے کی صورت میں آپؑ کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ آپؑ بنی اسرائیل کو وہاں سے نکالیں اور انہیں اس ظالمانہ غلامی سے نجات دیں جس میں وہ بری طرح گرفتار تھے۔ اس دوگونہ ذمہ داری کے باعث آپؑ کو مخلص کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

بعض دیگر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ مخلص کے لفظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس امتیاز و اختصاص کی طرف اشارہ ہے جو صرف ان کی خصوصیت ہے، کسی اور پیغمبر کو حاصل نہیں۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شرفِ ہمکلامی بخشا تھا۔ قرآنِ کریم نے ان کے اس امتیازی وصف کو کئی جگہ ذکر فرمایا۔ تیسرے پارے کی پہلی آیت میں رسولوں پر ایک دوسرے پر فضیلت کے حوالے سے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔ اسی طرح سورۃ النساء کی آیت ۱۶۴ میں ارشاد ہے کہ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ''اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ اسی وصف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

رسول کا معنی ہے فرستادہ یعنی بھیجا ہوا۔ عربی زبان میں قاصد، پیغام بر، ایلچی اور سفیر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ملائکہ کیلئے بھی یہ لفظ قرآنِ کریم میں استعمال ہوا ہے جب انہیں کسی کارِ خاص کیلئے بھیجا گیا۔ ان برگزیدہ انسانوں کو رسول کہا جاتا ہے جو انسانوں کی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مبعوث ہوتے ہیں اور ان پر جو کتاب اترتی ہے اور جو اس کی تشریحات نازل ہوتی ہیں وہ انہیں لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

نبی کے معنی اور مفہوم کے حوالے سے سابقہ رکوع میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ اختصار کے طور پر یوں کہہ لیجئے کہ نبی خبر دینے والے کو بھی کہتے ہیں اور بلند مرتبہ اور عالی مقام کو بھی۔ اور اس کا ایک معنی طریقہ اور راستہ بھی کیا جاتا ہے۔

نبی اور رسول میں فرق

قرآنِ مجید میں یہ دونوں لفظ بالعموم ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی شخص کو کہیں صرف رسول کہا گیا ہے اور کہیں صرف نبی اور کہیں اسے رسول اور نبی دونوں لفظوں کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ لیکن بعض مقامات پر رسول اور نبی کے الفاظ کا اطلاق اس طرح کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معنی میں فرق ہے۔ مثلاً سورۂ حج کے رکوع ۷ میں فرمایا گیا ہے:
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ''ہم نے تم سے پہلے نہیں بھیجا کوئی رسول اور نہ کوئی نبی۔''
اس استعمال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی اور رسول دو الگ الگ اصلاحیں ہیں۔ چنانچہ اسی باعث اہلِ تفسیر میں ان دونوں لفظوں

Marfat.com

کے معنی اور مفہوم کے تعین میں اختلاف ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ نبی کو اللہ تعالیٰ کسی بھی قوم کی اصلاح کیلئے بھیجتا ہے لیکن اس پر کتاب نازل نہیں کرتا، وہ پہلی کتاب سے استفادہ کرتا ہے اور اگر کہیں اس میں ترمیم یا تحریف ہوئی ہے تو اس پر چونکہ وحی اترتی ہے اس لئے وہ اس وحی کی روشنی میں اس کی اصلاح کرتا ہے اور رسول وہ ہوتا ہے جس پر کوئی کتاب اتری ہو، کوئی نئی شریعت نازل ہوئی ہو اور قرآنِ کریم میں تدبر کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول ان جلیل القدر ہستیوں کیلئے بولا گیا ہے جن کو عام انبیاء کی بہ نسبت زیادہ اہم منصب سپرد کیا جاتا ہے۔ کچھ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ رسول کے آنے سے حجت تمام ہو جاتی ہے۔ جس قوم کی طرف اس کی بعثت ہوتی ہے، اگر وہ قوم اسے قبول نہیں کرتی بلکہ اس کی جان لینے کے درپے ہو جاتی ہے تو اسے ہجرت پر مجبور ہونا پڑتا ہے تو حجت کی تمام ہو جانے کے باعث ایسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جاتا ہے۔ ان تمام احتمالات میں اتنی بات تو ثابت معلوم ہوتی ہے کہ نبی اور رسول میں فرق ہے اور رسول خاص ہے اور نبی عام اور اسی لحاظ سے دونوں کے مرتبہ و مقام اور ذمہ داریوں کی نوعیت میں بھی فرق ہوگا، کیونکہ حاکم نے حضرت ابوذرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے رسولوں کی تعداد پوچھی گئی تو آپؐ نے ۳۱۳ یا ۳۱۵ بتائی۔ اور انبیاء کی تعداد پوچھی گئی تو آپؐ نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار بتائی۔ اس حدیث کی سندیں اگرچہ ضعیف ہیں مگر ایک سند دوسری سند کیلئے تقویت کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح بڑی حد تک ضعف دور ہو جاتا ہے۔ رہے دوسرے احتمالات ان پر کوئی واضح دلیل نہیں۔

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿٥٢﴾

(اور ہم نے اس کو طور کے داہنی جانب سے پکارا، اور راز دو سرگوشی کیلئے اس کو قریب کیا۔ ۵۲)

اَلْاَیْمَنِ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں اَلْاَیْمَنِ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی مقدس اور مبارک بھی ہوتا ہے اور داہنے کو بھی کہتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے پہلا معنی مراد لیا اور بعض نے دوسرا، جبکہ امکان دونوں معنوں کا ہے۔ اگر پہلا معنی مراد لیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر کو جاتے ہوئے رات کی تاریکی میں راستہ بھول گئے۔ دور سے انہوں نے پہاڑ کے اوپر آگ جلتی دیکھی۔ آپؑ نے اپنے بچوں سے کہا کہ تم یہاں ٹھہرو، میں وہاں سے کوئی انگاری لے کر آتا ہوں تاکہ تمہارے لئے آگ جلاؤں اور تم سردی کی شدت سے بچ سکو اور اگر وہاں کوئی باخبر شخص مل گیا تو اس سے راستہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن جب آپؑ اس وادی میں داخل ہوئے جہاں آپؑ نے آگ دیکھی تھی تو وہاں انہوں نے ایک آواز سنی جس کے بارے میں پروردگار فرما رہے ہیں کہ وہ آواز جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سنائی دی تھی وہ وادیِ مقدس طویٰ کی سمت سے سنائی دی تھی تو اس وادی کو ایمن یعنی مقدس اس لئے کہا گیا تھا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جلوہ گاہ تھی۔

دیگر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر جاتے ہوئے جس راستے سے گزر رہے تھے وہ کوہِ طور کے جنوب سے جاتا ہے اور جنوب کی طرف سے اگر کوئی شخص طور کو دیکھے تو اس کے دائیں جانب مشرق اور بائیں جانب مغرب ہوگا۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے طور کے مشرقی دامن کو داہنی جانب فرمایا گیا ہے۔ اس میں شاید تاثر دینا یہ مقصود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو کوہِ طور کو ایک پہاڑ سمجھ کر اس کے پاس سے گزر رہے تھے لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ میں جہاں سے گزر رہا ہوں میرے دائیں جانب اللہ تعالیٰ کی جلوہ گاہ

Marfat.com

ہے اور وہاں سے مجھے نبوت کی عظمت ملنے والی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو نوازتا ہے یا کسی کو کسی کارِ خاص کیلئے چن لیتا ہے تو اس کی طبیعت، اس کی صلاحیتوں اور اس کے کردار وعمل کو پہلے سے اپنے طریقے سے تربیت فرماتا رہتا ہے لیکن جس کی تربیت ہو رہی ہوتی ہے اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میں کس عظیم منصب کیلئے چن لیا گیا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے ہی تجربے سے دوچار ہوئے۔

نَجِیًّا کا مفہوم

اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے اسے راز کی گفتگو کیلئے قریب کیا، یعنی اسے تقرب عطا فرمایا شرفِ ہمکلامی دے کر اور یا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا تحمل انسان کے بس کی بات نہیں۔ کسی انسان میں اگر یہ تحمل پیدا کرنا مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر اپنے قرب کی کوئی ایسی صلاحیت پیدا فرماتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا بوجھ برداشت کر لیتا ہے۔ مراد اس سے صرف یہ ہے کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہمکلامی کیلئے چن لیا۔ کیونکہ پروردگار کا انبیائے کرام کے بارے میں معمول یہ رہا ہے کہ وہ کبھی ان سے براہِ راست کلام نہیں فرماتے بلکہ ہمیشہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا واسطہ درمیان میں ہوتا ہے۔ ان کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کا پیغام ان تک پہنچتا ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے براہِ راست اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور یہ شرف صرف آپؑ کا حصہ ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

(اور عطا کیا ہم نے اسے اپنی رحمت سے ہارون کو نبی بنا کر۔ ۵۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک اور احسانِ عظیم

سورۃ طٰہٰ میں کسی قدر تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے نوازا اور نشانِ ماموریت کے طور پر دو معجزات بھی عطا فرمائے اور پھر آپؑ کو حکم دیا کہ آپؑ فرعون کی ہدایت کیلئے جائیں، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ذمہ داری کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے چند دعائیں فرمائیں۔ ان میں سے ایک دعا جس کا ذکر آیت ۲۹ تا ۳۴ میں فرمایا گیا ہے، یہ تھی کہ "اے میرے رب! میرے لئے میرے اہلِ خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو وزیر مقرر کر دے، اس کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط فرما اور اس کو میری ذمہ داری میں شریک کر، تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح کر سکیں اور زیادہ سے زیادہ تیرا ذکر پھیلا سکیں۔" چنانچہ اس کے بعد آیت ۳۶ اور ۳۷ میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلاتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کو قبول فرمایا اور حضرت ہارون علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر ان کا شریکِ کار کر دیا۔ انبیاء کرام کی تاریخ میں یہ ایک نادر واقعہ ہے جس کی اور کوئی مثال کم از کم تاریخ میں دستیاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول بھی مبعوث فرمائے ان میں سے ہر ایک نے تنہا اپنی ذمہ داریاں ادا کیں۔ البتہ! ایمان قبول کرنے والوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں انصار اور معاونین مہیا فرمائے، لیکن کسی عظیم رسول کے ساتھ کسی نبی کو وزیر اور شریکِ کار کی حیثیت سے مقرر کیا جانا ایک ایسی امتیازی خصوصیت ہے جو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے مخصوص ہے۔ اس لئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بطورِ خاص اس کا ذکر فرمایا گیا اور ممکن ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا ذکر اس وجہ سے بھی ہو کہ یہود نے حضرت ہارون علیہ السلام کو بدنام کرنے کیلئے بعض سنگین جرائم کا انتساب ان کی طرف کیا تھا جبکہ وہ باقی انبیاء کرام کی طرح معصوم اور تمام فضائلِ نبوی سے موصوف تھے۔ چنانچہ ان کی اصل

Marfat.com

حیثیت کو ظاہر کرنے کیلئے یہاں بطورِ خاص ان کا ذکر فرمایا گیا، جسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اظہار بھی قرار دیا گیا اور ان کی نبوت کو بطورِ خاص نمایاں کیا گیا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥٤﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾

(اور کتاب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سرگزشت کو ذکر کیجئے، بیشک وہ وعدے کے پکے اور رسول نبی تھے۔۵۴)
وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ ۵۵)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ

قرائن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مراد حضرت اسماعیل بن حضرت ابراہیم علیہما السلام ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس سے پہلے انہی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام اور آپؑ کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا گیا جبکہ وہ آپؑ کے سب سے بڑے فرزند ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے بنی اسرائیل جیسی امت اٹھائی گئی اور ان میں بڑے بڑے نبی مبعوث ہوئے، اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی اسماعیل کو پیدا کیا گیا اور قریش ان میں نامور ہوئے اور ان میں محمد (ﷺ) جیسی عظیم شخصیت کو مبعوث فرما کر انہیں تمام امتوں کا امام بنا دیا گیا۔ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی باقی اولاد کے ساتھ روا روی میں کر دیا جاتا تو پھر شاید اس بات کی طرف اشارہ نہ ہو سکتا جبکہ اس سورۃ کے مکی ہونے کی وجہ سے اس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر کی ایک خاص اہمیت ہے اور اس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جو پہلی صفت بیان کی گئی ہے اس میں اسی اہمیت کی طرف اشارہ بھی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد یعنی وعدے کو سچا کر دکھانے والے تھے جبکہ کوئی نبی بھی غدر و عدا اور شکستِ عہد کے جرم کا کبھی ارتکاب نہیں کرتا۔ انبیاء کرام تو خیر معصوم ہوتے ہیں، ان پر ایمان لانے والے، ان کے راستے پر چلنے والے بھی کبھی وعدہ توڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ نبی کریم ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ کیا ایک مومن کبھی وعدہ خلافی کر سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہرگز نہیں۔ بعض احادیث میں نبی کریم ﷺ نے عہد کو قرض قرار دیا ہے اور بعض احادیث میں یہاں تک فرمایا لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ ''اس آدمی کا دین نہیں جس میں وعدے کی پابندی نہیں۔'' خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی الخمساء سے انتظار کرنے کا وعدہ فرمایا۔ وہ صاحب جا کر بھول گئے۔ تیسرے دن یاد آیا، وعدے کی جگہ پر پہنچے تو آپؐ کو منتظر پایا، آپؐ نے صرف یہ کہا کہ تم نے مجھے بہت تکلیف دی، میں تین دن سے تمہارے انتظار میں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی صفت کے طور پر بطورِ خاص صادق الوعد کا ذکر عام معنی میں نہیں بلکہ ایک خاص حوالے سے ہے۔ وہ حوالہ جانا پہچانا اور معروف ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خواب دیکھا کہ آپؑ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں ذبح کر رہے ہیں۔ پیغمبر کا خواب چونکہ وحی ہوتا ہے، اس لئے تو آپؑ سمجھ گئے کہ یہ منشاء خداوندی

Marfat.com

ہے۔آپؑ نے صبح بیٹے سے استمزاج کیا کہ میں نے اس طرح خواب دیکھا ہے،تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹا چونکہ اپنے باپ کو اللہ تعالیٰ کا رسول جانتا تھا۔اس لئے بے تأمل کہا کہ اباجان! اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو جو حکم دیا ہے، اسے کر گزریئے، مجھے ان شاء اللہ تعالیٰ آپؑ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں لے کر منیٰ کی ایک وادی میں پہنچے اور انہیں ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے بے تردد گردن آپؑ کے سامنے پیش کر دی۔باپ نے پوری قوت سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی کوشش کی اور بیٹے نے قربان ہونے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔تب اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ مقصود اسماعیل کو ذبح کرنا نہ تھا بلکہ صرف یہ دیکھنا تھا کہ باپ بیٹا تعمیل حکم میں کہاں تک آمادہ، پُرجوش اور ثابت قدم ہیں۔

تاریخ انسانی کا یہ حیرت انگیز واقعہ ایفائے عہد کی ایک ایسی تابندہ مثال ہے جس کی نظیر شاید کہیں اور نہ مل سکے۔اس لئے اس واقعہ کے حوالے سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو صادق الوعد قرار دیا گیا ہے اور آپؑ کی صفات میں اسے نمایاں مقام عطا فرمایا گیا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دوسری صفت

دوسری آیت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کی وضاحت کیلئے یہ فرمایا کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔ایفائے عہد جس کی معراج اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان دے دینا ہے، یہ دراصل ایمان و اسلام کی دوسری تعبیر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لانا درحقیقت ایک عہد ہے اور پھر قدم قدم پر احکام کی تعمیل اور سنت کا اتباع اسلام ہے۔چنانچہ ایمان و اسلام کی وضاحت کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ (جو درحقیقت حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ایک جامع تعبیر ہے) کا کس حد تک اہتمام کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نماز تمام حقوق اللہ کی ایک قانونی تعبیر ہے اور زکوٰۃ تمام حقوق العباد کی۔ان دونوں کے گر جانے یا زندگیوں سے نکل جانے سے دین و شریعت کو کیا نقصان پہنچتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی تقاضا کرتی ہے اور تربیت کی صحیح جگہ ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی گھر ہے۔اس لئے آپ اپنے اہلِ خانہ کو جس میں بیوی کے ساتھ ساتھ بچے شامل ہیں انہیں ان دونوں باتوں کا بطورِ خاص حکم دیتے تھے۔نبی کریم ﷺ کو بھی قرآنِ پاک میں اسی بات کا حکم دیا گیا ہے۔ارشاد ہے: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا "اپنے اہلِ خانہ کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس کی پابندی کیجئے۔" اسی طرح مسلمانوں کو بھی خود نماز کی پابندی کرنے اور اپنے اہلِ خانہ کو آگ سے بچانے کا حکم دیا گیا ہے۔حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر بطورِ خاص عمل پیرا تھے اور آپؑ اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔اس لئے آپؑ کے اس طریقے کو قیامت تک کیلئے ایک مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔مزید اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ تبلیغ و دعوت اور تعلیم و تربیت کا کام ہمیشہ گھر سے شروع کیا جانا چاہئے۔اگر پیغمبر کا اپنا گھر علم و دعوت کا مرکز بن جائے تو اسے ایک مدرسے اور مرکز کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور یہیں سے ہدایت کی شعاعیں پھوٹنا شروع ہو جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ دوسرے گھر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، لیکن اگر خدانخواستہ داعی کا اپنا گھر ہی دعوت کے آثار و نتائج سے محروم ہو تو یہ گھر بجائے مرکز بننے کے طریق ہدایت میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔اہلِ دنیا کا طریقہ ہے کہ وہ سب سے پہلے داعی کے اپنے گھر اور اس کے گھر کے افراد کو جانچتے اور پرکھتے ہیں اور اسی سے دعوت کے حق و باطل ہونے کا بھی اندازہ لگاتے ہیں۔اس لئے نبی کریم ﷺ کو بھی سب سے پہلے اپنے قریبی عزیزوں کو دعوت دینے کا حکم دیا گیا تھا۔

Marfat.com

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیسری صفت

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے تھے، ان کی اپنی ذات سرفروشی اور اتباع امر کا نمونہ تھی۔ اور آپؑ تبلیغ و دعوت کی باریکیوں کو کماحقہ سمجھتے تھے۔ ایک پیغمبر میں رسول اور نبی ہونے کی حیثیت سے جتنی خوبیاں ہوسکتی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام میں جمع کردی تھیں۔ اسی لئے آپؑ کو پسندیدہ ہونے کے لقب سے نوازا گیا یعنی آپؑ بالکل ویسے تھے جیسے اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی اور رسول کو دیکھنا چاہتا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اس اہتمام کے ساتھ شاید اس لئے کیا گیا ہے تاکہ قریش مکہ کو توجہ دلائی جائے کہ تم جو اپنے آپ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کہتے ہو، تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم میں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اعتقادات اور سیرت و کردار میں کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی بندگی کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے۔ اسی کی نماز اور اسی کی زکوٰۃ کی تلقین کرتے تھے۔ ان کی اپنی عبدیت کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنی جان بھی جان آفرین کے سپرد کرنے کیلئے تیار ہوگئے تھے اور تم نے نہ جانے کس کس کو اس کا شریک بنا رکھا ہے اور نہ جانے کس کس کے سامنے تمہارے سر جھکتے ہیں اور تمہاری عبدیت میں کون کون شریک ہے۔ تم ہر ایک کے سامنے جھکتے ہو اور ہر ایک سے ڈرتے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا چاہتے ہو، نہ ڈرنا چاہتے ہو، تو آخر تمہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کیا نسبت ہے؟

اور دوسری وجہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر الگ کرنے کی یہ بھی ہے کہ یہود نے اسلام دشمنی کے جوش میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تاریخ بالکل مسخ کر کے رکھ دی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زندگی پر تو انہوں نے اس طرح پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ کسی کو سراغ لگانے سے بھی ان کا سراغ نہ مل سکے۔ ان کی زندگی سے جن پہاڑوں، جن وادیوں اور جن شہروں کو نسبت تھی ان میں سے ہر ایک کا انہوں نے نام بگاڑا اور انہیں کھینچ تان کر ملک شام لے گئے اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ذبح ہونا ہے، اسی لئے انہیں ذبیح اللہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ خطاب بھی ان سے چھین کر حضرت اسحاق علیہ السلام کو دے دیا۔ انہوں نے اپنے تئیں تحریفات کا ایسا طلسم پیدا کیا ہے کہ بظاہر کہیں بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شخصیت دکھائی نہیں دیتی، لیکن اللہ تعالیٰ اہلِ حق کی قبروں کو ٹھنڈا رکھے۔ انہوں نے تمام تحریفات کا پردہ چاک کر کے ازسرنو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تاریخ کو زندہ کر دیا ہے۔ ان میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کے کام کو خصوصیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

(اور کتاب میں حضرت ادریس کو یاد کیجئے، بیشک وہ صدیق اور نبی تھے۔ ۵۶) اور ہم نے انہیں رتبۂ بلند پر پہنچایا۔ ۵۷)

حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر

یہاں جس اہتمام کے ساتھ سلسلۂ انبیاء کی تاریخ بیان کرتے ہوئے حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر انہیں جن خطابات سے نوازا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عظیم رسول تھے اور ان کی زندگی میں یقیناً ایثار و قربانی، تبلیغ و دعوت

Marfat.com

سرفروشی کے عظیم کارنامے درخشندہ تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ ان کا ذکر یقیناً تورات میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگا۔ لیکن آج جب ہم اسفارِ یہود اور بائیبل ہسٹری کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان کے بارے میں کوئی چیز نہیں ملتی۔ قرآنِ کریم سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم نبی تھے اور ساتھ ہی ساتھ صدیق بھی تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح صدیق کا خطاب اس لئے دیا گیا تھا کہ انہیں بہت ساری آزمائشوں سے گزارا گیا اور وہ ہر آزمائش میں پورے اترے۔ تب اللہ تعالیٰ نے انہیں صدیق کہہ کر خوشنودی کا اظہار فرمایا کہ آپؑ نے واقعی ہر امتحان میں اپنے آپ کو سچا ثابت کر دکھایا۔ سورۃ انبیاء میں ان کا ذکر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا ہے اور سابقہ آیتِ کریمہ میں بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام کی زندگی میں یقیناً کوئی اہم مشابہت ہے جس وجہ سے دونوں کو صابرین میں سے قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ایک بہت بڑے امتحان کے وقت صبر دکھایا، اسی طرح حضرت ادریس علیہ السلام نے بھی صبر کے ساتھ زندگی گزاری اور آپؑ کی زندگی کا اہم عنوان بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح صابر اور صادق الوعد ہی رہا۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو ہمیں قرآنِ کریم سے معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ سے کوئی صحیح حدیث ہم کو ایسی نہیں ملی جن سے ان کی شخصیت کے تعین میں کوئی مدد ملتی ہو۔ البتہ! قرآنِ کریم سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام سے متقدم ہیں کیونکہ اوپر جن انبیاء کرام کا ذکر ہوا ہے ان کے حوالے سے بعد والی آیات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ انبیاء کرام حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت اسرائیل علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ جب ہم ان انبیاء کرام کی ترتیب کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہم السلام تو اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بعد صرف حضرت ادریس علیہ السلام ہی رہ جاتے ہیں جن کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ روح المعانی نے مستدرک حاکم کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں اور یہ حضرت نوح علیہ السلام سے ایک ہزار سال پہلے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ کے حوالے سے زمخشری نے لکھا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی اور رسول ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ۳۰ صحیفے نازل فرمائے اور جدید تحقیق یہ ہے کہ بحرِ مردار کے غاروں میں سے کچھ کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جن کے بارے میں گمان ہے کہ یہ حضرت ادریس علیہ السلام پر نازل ہونے والے صحیفے ہیں، لیکن ان کی زبان چونکہ مردہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے اس لئے پڑھی نہیں جاسکی۔ تو جب تک اسے پڑھا نہ جائے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتابیں کیسی ہیں اور کس پر نازل ہوئی تھیں۔ بحرِ محیط میں لکھا گیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جنہوں نے قلم سے لکھنا شروع کیا اور کپڑا سینا ایجاد کیا۔ اس سے پہلے لوگ عموماً جانوروں کی کھال لباس کے طور پر پہنتے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ناپ تول کے طریقے آپؑ نے ہی ایجاد کئے اور اسلحہ کی ایجاد بھی آپؑ سے شروع ہوئی اور آپؑ نے اسلحہ تیار کر کے بنو قابیل سے جہاد کیا۔ (بحرِ محیط، قرطبی، مظہری، روح المعانی) لیکن ان باتوں میں سے کسی بات کو تاریخی سند کا درجہ حاصل نہیں۔ اسرائیلی روایات میں رطب و یابس سب کچھ موجود ہے۔ خود تورات کا حال یہ ہے کہ وہ کئی مرتبہ دنیا سے غائب ہوئی اور کئی مرتبہ اسے زبانی روایات کے ذریعہ سے مرتب کیا گیا۔ اس وجہ سے اس کے نسخوں میں اختلاف بھی ہوا اور اس کے اندر برابر کمی بیشی بھی ہوتی رہی۔ تو جو باتیں بائبل میں

Marfat.com

بیان ہوئی بھی ہیں ان کی ثقاہت کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ بائبل میں جن بزرگ کا نام حنوک بتایا گیا ہے وہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ ان کے متعلق بائبل کا بیان یہ ہے کہ (اور حنوک ۶۵ برس کا تھا جب اس سے متوسلح پیدا ہوا اور متوسلح کی پیدائش کے بعد حنوک ۳۰۰ برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا......اور وہ غائب ہو گیا، کیونکہ خدا نے اسے اٹھا لیا)۔ (پیدائش باب ۵ آیت ۲۱-۲۴)

تلمود کی اسرائیلی روایات میں ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے جب بنی آدم میں بگاڑ کی ابتدا ہوئی تو اللہ کے فرشتے نے حنوک کو جو لوگوں سے الگ تھلگ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، پکارا کہ "اے حنوک! اٹھو! گوشۂ عزلت سے نکلو اور زمین کے باشندوں میں چل پھر کر ان کو وہ راستہ بتاؤ جن پر ان کو چلنا چاہئے۔ اور وہ طریقے بتاؤ جن پر انہیں عمل کرنا چاہئے"۔ یہ حکم پا کر وہ نکلے اور انہوں نے جگہ جگہ لوگوں کو جمع کر کے وعظ و تلقین کی اور نسلِ انسانی نے ان کی اطاعت قبول کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کر لی۔ حنوک ۳۵۳ برس تک نسلِ انسانی پر حکمران رہے۔ ان کی حکومت انصاف اور حق پرستی کی حکومت تھی۔ ان کے عہد میں زمین پر اللہ کی رحمتیں برستی رہیں۔ (تفہیم القرآن)

وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کا مفہوم

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے اسے بلند مقام پر اٹھا لیا" جس کے ذہن میں کوئی پیچیدگی نہ ہو یا پہلے سے آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ دماغ میں نہ ہو تو وہ یقیناً یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر اور آزمائشوں میں ثابت قدمی کی وجہ سے وہ مقام و مرتبہ عطا فرمایا جو رسالت کے بعد صدیقیت کا مرتبہ ہے، جس پر اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فائز کیا گیا تھا۔ لیکن ذہنی اپچ کے مریضوں کو تو کوئی عجوبہ ملنا چاہئے اور اتفاق سے اسرائیلی روایات میں پہلے سے ایسی خرافات موجود تھیں، انہوں نے ان روایات کو دلیل بنایا اور اس جملے کا یہ مفہوم پیدا کر دیا کہ حضرت ادریس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چوتھے آسمان پر اٹھا لیا اور مزید اس بات سے انہیں تصدیق مل گئی کہ آنحضرت ﷺ کی معراج کی رات چوتھے آسمان پر ان سے ملاقات ہوئی تھی حالانکہ ملاقات تو آپؐ کی اور بھی رسولانِ گرامی سے ہوئی تو کیا انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں پر زندہ اٹھایا تھا۔ مجھے تو حیرانی ایک جدید مفسر صاحب پر ہوئی جو ماشاء اللہ شیخ الحدیث بھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مَكَانًا عَلِيًّا کا معنی اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپؑ کو کسی بلند جگہ پر اٹھایا گیا حالانکہ معمولی عربی جاننے والا جو محاورات کی زبان سے بالکل بے خبر نہ ہو وہ بھی جانتا ہے کہ یہ لفظ مقام و مرتبہ کے معنی میں ہمیشہ استعمال ہوتا ہے، بشرطیکہ اس سے مختلف معنی پر کوئی قرینہ موجود نہ ہو اور یہاں اس کے حق میں قرینہ تو کیا ہوگا البتہ! اس کے خلاف پر قرینہ موجود ہے، وہ اس طرح کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کو قرآنِ کریم نے واضح طور پر اہتمام کے ساتھ بیان کیا اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات نے اس میں کوئی اخفاء باقی نہیں رہنے دیا۔ حضرت ادریس علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اٹھایا جانا بھی ایک غیر معمولی بات تھی اور دنیا کی ہر علمی کتاب کا یہ طریقہ ہے کہ ہر غیر معمولی بات پر دلیل پیش کی جاتی اور اسے اہتمام سے بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ جملہ ایک سپاٹ جملہ ہے جو محاورہ کے مفہوم کو متضمن ہے اس لئے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے رسول ہونے کے ساتھ ساتھ صدیق کے بلند مرتبے پر بھی فائز فرمایا تھا۔ ویسے بھی تلمود نے جن الفاظ میں حضرت ادریس علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کو ذکر کیا ہے ان میں جو

Marfat.com

غرابت اور رکاکت پائی جاتی ہے وہ بجائے خود اس کے ناقابلِ قبول ہونے کا قرینہ ہے۔ تلمود میں ایک طویل قصہ بیان ہوا ہے۔ جس کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ "حنوک ایک بگولے میں آتشیں رتھ اور گھوڑوں سمیت آسمان پر چڑھ گئے۔"

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾

(یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے نبیوں میں سے اپنا فضل فرمایا، آدم کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے حضرت نوح کے ساتھ سوار کیا اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسرائیل کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور جن کو برگزیدہ کیا جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔ ۵۸)

تمام مذکورہ انبیاء کرام کا مشترک وصف

پیشتر ازیں جن انبیائے کرام کا ذکر ہوا ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ ان میں کچھ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور کچھ حضرت نوح علیہ السلام کی اور کچھ حضرت ابراہیم اور حضرت اسرائیل علیہما السلام کی ذرّیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اپنے ادوار اور اپنی قوموں کے گلِ سرسبد تھے۔ انہیں کے آگے پیچھے اور بھی انبیائے کرام اور رسولانِ گرامی تشریف لائے لیکن یہ چند نفوسِ قدسیہ اپنی خصوصی صفات، درخشندہ کارناموں اور اپنی عزیمت و استقامت میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں جس نے تاریخ پر اپنا اثر چھوڑا ہے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی اور بھی نمایاں کڑیاں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمایا۔ لیکن جن کا ذکر فرمایا ہے ان میں حضرت آدم علیہ السلام کی ذرّیت سے حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اور حضرت اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ یہ تمام بزرگ یقیناً تاریخ کی عظیم شخصیات ہیں جن کے سامنے تاریخ سر جھکا کے گزرتی ہے۔ ان میں سے ایک ایک بزرگ نے امتوں کو ہدایت بخشی۔ قرآنِ کریم نے ان کی داستانِ حیات کو انسانوں کیلئے نمونے کے طور پر ذکر فرمایا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانوں کی جن کمزوریوں کے باعث شرک جیسی لعنت جنم لیتی ہے انسانوں کو بچانے کیلئے یہ بیان کرنا ضروری سمجھا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے اور انتہائی عظیم شخصیتوں کے مالک تھے لیکن ان کے کردار و عمل کا اصل جوہر جس نے ان کو اللہ تعالیٰ کے قرب سے مشرف کیا، وہ یہ تھا کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے تھے یعنی وہ اپنی عظمتوں کا سارا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ڈھیر کر دیتے تھے اور اسی کو اپنی معراج سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کا حال یہ تھا کہ جیسے ہی ان کے سامنے کوئی ایسی آیت پڑھی جاتی جس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے، سجدہ کرنے، تضرع کرنے اور عاجزی کرنے کا ذکر ہوتا تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے۔ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے

Marfat.com

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جب بھی کسی آیتِ سجدہ کی تلاوت کی جائے تو آیتِ سجدہ کے مضمون کو دیکھتے ہوئے ساتھ مناسب دُعائیں پڑھی جانی چاہئیں اور بعض احادیث میں آنحضرت ﷺ سے مختلف دُعائیں منقول بھی ہوئی ہیں۔ ان دُعاؤں کا عربی میں یاد کرنا ضروری نہیں، ان کا مضمون اگر ذہن میں رہے تو اپنی زبان میں جو دُعا دِل سے اٹھے وہ مانگ لینی چاہیے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾

(پھر ان کے بعد ان کی جگہ آئے ناخلف جنہوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے تو یہ لوگ عنقریب اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ ۵۹)

خَــلْفٌ...... لام کے سکون کے ساتھ، ناخلف یعنی برے جانشین کو کہتے ہیں۔ اور خلف لام کے فتحہ کے ساتھ، اچھے اور صالح جانشین پر بولا جاتا ہے۔

ناخلف جانشینوں کا تذکرہ

سابقہ آیتِ کریمہ میں چند اولوالعزم اور برگزیدہ رسولوں اور انہی کے راستے پر چلنے والے چنیدہ لوگوں کا ذکر فرماتے ہوئے بطورِ خاص یہ بات فرمائی کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ یہ سوچ کر کہ یہ اس اللہ کا کلام ہے جو خالق کائنات اور قادرِ مطلق ہے، اس کی عظمت کے سامنے جھک جاتے ہیں اور روتے ہوئے اس کی پناہ طلب کرتے اور اس کی توفیق کی آرزو کرتے ہیں۔ ان کا یہی وہ خصوصی طرزِ عمل ہے جس نے انہیں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے وابستہ رکھا ہے اور ان کی زندگی ہمیشہ شریعت کی پابند رہی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی زندگی کا اصل رنگ اور اس کا حقیقی مقصد صرف یہ رہا کہ ہم کسی طرح اپنے اللہ کو راضی کرلیں اور اس کی خوشنودی کا حصول ہمارا مقدر بن جائے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان کے بعد پھر ایسے لوگ آئے جو بظاہر ان کے نام لیوا تھے جو اللہ تعالیٰ کا کلام سن کر سجدہ ریز ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت سے ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے یکسر غافل ہو گئے۔ نماز جو اس کے استحضار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس سے بار بار آدمی کو تجدیدِ عہد کا موقع ملتا ہے اور بار بار اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے رکوع، سجود اور قیام کے ذریعے یہ بات تازہ رہتی ہے کہ تم ہر حال میں اور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ ہی کے بندے ہو اور اسی کی یاد تمہاری زندگی کا اصل سرمایہ ہے۔ لیکن ان کے نالائق جانشینوں کی زندگیوں سے یہ نماز جیسی عظیم دولت خارج ہو گئی۔ نماز ہی ہے جو آدمی کو برائی کے کاموں سے روکتی ہے۔ جب وہ چیز جو برائی کے راستے میں رکاوٹ تھی باقی نہ رہی تو ان کی زندگیوں پر خواہشاتِ نفس کا غلبہ ہو گیا اور وہ اس راستے پر چل پڑے جو نفس اور شیطان کا راستہ ہے جس کا نتیجہ بالآخر تباہی ہے۔

ضیاعِ صلوٰۃ کا مفہوم

آیتِ کریمہ میں اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ کا جملہ استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے کہ ان نالائق جانشینوں نے نماز کو ضائع کر دیا۔ ضیاعِ صلوٰۃ کا لفظ دو معنوں کیلئے بولا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے سرے سے نماز کو اپنی زندگیوں سے خارج کر دیا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں تو نماز میں تبدیلیاں کی گئیں بالآخر اس کی انتہا یہ ہوئی کہ اگر کسی شخص نے ساری زندگی میں ایک دفعہ بھی نماز کی نیت سے کسی

Marfat.com

جگہ اپنی پیشانی رکھ دی اور ماتھا ٹیک دیا تو اس نے گویا کہ نماز کا حق ادا کر دیا۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ انہوں نے حقیقتِ صلوٰۃ گم کر دی کیونکہ نماز درحقیقت اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعتراف، اپنی بندگی کا اعلان اور اللہ تعالیٰ کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تصورات اسی وقت تک ایک نمازی کے اندر رہ سکتے ہیں جب تک وہ نماز کی اس حقیقت کو سمجھ کر نماز ادا کرتا ہے۔ اس لئے صحابہ کرامؓ جب کسی شخص کو دیکھتے تھے کہ وہ نماز کے اعمال تو بجالاتا ہے لیکن اس میں نہ خشوع ہے نہ خضوع، نہ تعدیلِ ارکان، نہ وقت کی پابندی اور نہ اس کا اہتمام۔ ایسی نماز ظاہر ہے نماز کہلانے کی مستحق نہیں، تو وہ صاف فرما دیتے تھے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز کے آداب اور تعدیلِ ارکان میں کوتاہی کرتا ہے۔ تو اس سے دریافت کیا کہ تم کب سے نماز پڑھتے ہو؟ اس نے کہا کہ چالیس سال سے۔ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ تم نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی۔ اگر تم اسی طرح کی نمازیں پڑھتے ہوئے مر گئے تو یاد رکھو کہ فطرتِ محمد (ﷺ) کے خلاف مرو گے۔ ترمذی میں حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو نماز میں اقامت نہ کرے۔ مراد یہ ہے کہ جو رکوع اور سجدہ میں اور رکوع سے کھڑے ہو کر یا دو سجدوں کے درمیان سیدھا کھڑا ہونا یا سیدھا بیٹھنے کا اہتمام نہ کرے، اس کی نماز نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں معنوں میں کوئی تضاد نہیں۔ ضیاعِ صلوٰۃ کا عمل آدابِ صلوٰۃ کے چھوٹنے سے شروع ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص لاپرواہی سے نماز پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر سے حقیقتِ صلوٰۃ نکل چکی ہے۔ پھر یہ لاپرواہی رفتہ رفتہ نماز کی پابندی کو ختم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے اور پھر آخر ایک وقت آتا ہے جب نماز بالکل چھوٹ جاتی ہے۔ جب تک نماز کی عادت رہتی ہے تو نماز کے چھوٹ جانے سے ایک انقباض سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن چند دفعہ نماز چھوٹنے سے انقباض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تو نماز جو ارکانِ صلوٰۃ میں بہت اہمیت کا حامل رکن ہے، جب وہ چھوٹ جاتا ہے تو دین کے باقی احکام بھی قدر و قیمت کھو دیتے ہیں۔ اسی لئے حضرت عمر فاروقؓ نے ایک موقع پر اپنے سب عمالِ حکومت کو ایک ہدایت نامہ جاری کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ ان اھم امرکم عندی الصلوٰۃ، فمن ضیعھا فھو لماسواھا اضیع "میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے، تو جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے تو دوسرے تمام احکامِ دین کو بھی اور زیادہ ضائع کرے گا۔"

نماز چونکہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ تو جب ایسا ذریعہ زندگی سے نکل جاتا ہے تو پھر شہوات کے حملوں کو روکنے کیلئے کوئی مانع باقی نہیں رہتا۔ تو پھر ایک شخص مومن ہوتے ہوئے بھی شہوات کا پیروکار ہو کے رہ جاتا ہے۔

غَيًّا کا مفہوم

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا...... اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے نماز کو چھوڑ دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شہوات کے راستے پر چل پڑے تو بالآخر تم دیکھو گے کہ وہ گمراہی کا شکار ہو جائیں گے۔ اب ان کی زندگیوں میں خیر کے سوتے خشک ہو جائیں گے اور گمراہی کا سرطان پھیلتا چلا جائے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہاں گمراہی سے مراد گمراہی پر ملنے والی سزا ہے یا گمراہی کا انجام ہے۔ دنیا میں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں اور آخرت میں اس کا انجام جہنم ہے۔

Marfat.com

تیسرا مطلب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ غَیٌّ جہنم کی ایک غار کا نام ہے جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اس زنا کار کیلئے تیار کیا ہے کہ جو اپنی زنا کاری پر اصرار کرتا ہے، اور اس شراب پینے والے کیلئے ہے جو شراب کا عادی ہے اور کسی قیمت پر شراب کو چھوڑنا نہیں چاہتا، اور اس سود خور کیلئے ہے جو سود خوری سے باز نہیں آتا، اور ان لوگوں کیلئے ہے جو ماں باپ کی نافرمانی کرتے ہیں، اور جھوٹی شہادت دینے والوں کیلئے اور اس عورت کیلئے جو دوسرے کے بچہ کو اپنے شوہر کا بچہ بنا دے۔ (قرطبی)

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا ﴿۶۰﴾

جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨ الَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَہٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا ﴿۶۱﴾

(مگر جس نے توبہ کی اور ایمان اور عملِ صالح کی روش اختیار کی، یہی لوگ ہیں جو جائیں گے جنت میں، اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ ۶۰) ہمیشگی کے باغ جن کا خدائے رحمٰن نے اپنے بندوں سے عالمِ غیب میں وعدہ کر رکھا ہے، بیشک اس کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔ ۶۱)

جنت میں جانے کا ذریعہ ایمان وعمل ہے

کفر، شرک اور اتباعِ شہوات کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ قیامت کے دن ایسے لوگ جہنم کی اس وادی میں پھینکے جائیں گے جسے غَیٌّ کا نام دیا گیا ہے اور یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنی گمراہی کے انجام کو پہنچیں گے، یعنی جس طرح کی گمراہی میں جس حد تک وہ آلودہ ہوں گے، ویسا ہی ان کو سخت عذاب دیا جائے گا۔ ہاں اگر کوئی شخص یا کوئی قوم یا انسانوں کا کوئی گروہ گمراہی اور گمراہی کے انجام سے بچنا چاہتا ہے تو اس کیلئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول پر ایمان لائے اور ان تمام صداقتوں کی تصدیق کرے جنہیں ایمانیات کہا جاتا ہے اور پھر شریعت کے تمام احکام پر شریعت کے سکھائے ہوئے آداب کے مطابق عمل کرے۔ اور اپنے دل کو خشوع وخضوع سے آباد رکھے، تو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ ان کا حسب ونسب کیا ہے۔ یا وہ کس طرح کی مالی حیثیت اور معاشرتی سٹیٹس رکھتے ہیں بلکہ ان کا ایمان وعمل صالح اللہ تعالیٰ کے یہاں سرخروئی کیلئے کافی ہوگا۔ آخرت میں چلنے والا سکہ ایمان وعمل کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں وہ چیز جو انسان کی قدر وقیمت کا تعین کرتی ہے وہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ ایک کالا کلوٹا مومن جو اعمالِ صالحہ کا خزانہ رکھتا ہے، وہ اس گورے چٹے خاندانی نجابت کے حامل شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے جو ایمان اور عمل صالح میں اس سے فروتر ہے۔ اس لئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ جس نے توبہ کی یعنی جو کفر اور شرک اور بدعملی سے ایمان واطاعت کی طرف لوٹ آیا ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں ایسا نہیں ہوگا کہ جو کسی کا حق بنتا ہوا سے وہ حق نہ دیا جائے یا حق سے کم دیا جائے۔ دنیا میں دونوں طرح کی زیادتیاں ہوتی ہیں۔ حقدار کو حق نہیں ملتا یا جتنا ملنا چاہئے اس میں کمی کر دی جاتی ہے۔ اہلِ جنت کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں چونکہ حسب ونسب کا سکہ نہیں چلے گا بلکہ ایمان وعمل کی بات چلے گی۔ اس لئے جیسا کوئی ایمان وعملِ صالح کا سرمایہ لے کر جائے گا اسے ویسے ہی اجر اور صلہ سے نوازا جائے گا۔

ایمان وعمل کے حامل لوگوں کو کس طرح کی جنت دی جائے گی، اس کا حقیقی علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے، لیکن قرآنِ کریم نے جا بجا اس کا ایک مرقع پیش کیا ہے اور ہر جگہ یہ بات تکرار کے ساتھ فرمائی گئی ہے کہ جنت میں باغات ہوں گے اور وہ بھی ہمیشہ رہنے والے باغات، جن پر کبھی

Marfat.com

خزاں کا سایہ نہیں پڑے گا، جن پر موسم اثر انداز نہیں ہوں گے، سدا بہار باغات اور ہمیشہ لطف و لذت سے معمور اور عجیب بات یہ ہے کہ اہلِ ایمان نے ہمیشہ اسی جنت کی طلب میں جانیں دی ہیں اور دنیا کی دلفریبیوں سے منہ پھیرا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی قدر افزائی کے طور پر فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جنت دینے کا وعدہ فرمایا، ایسے حال میں کہ یہ جنت سے غیب میں ہیں یعنی جنت کو دیکھ نہیں سکتے محض اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کے بتانے پر یقین رکھتے ہیں اور اس وعدہ کو مزید موکد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا اور اس موعود تک اللہ تعالیٰ کے تمام حقدار بندوں کی یقیناً رسائی ہوگی۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہمیں وعدۂ فردا سے بہلایا جا رہا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾

(وہ اس جنت میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے، بس سلام سنیں گے، اس میں ان کیلئے صبح و شام رزق مہیا ہوگا۔ ٦٢)

جنت میں اہلِ جنت کو جو بیش بہا نعمتیں میسر آئیں گی آج تو ان کا تصور بھی ممکن نہیں لیکن قرآن و سنت سے ایسا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو وہاں وہ سب کچھ ملے گا، اس کا نفس جس کی خواہش کرے گا۔ اور یہ نعمت ایسی ہے جو دنیا میں ممکن نہیں کیونکہ بڑے سے بڑا حکمران بھی اپنی خواہشات کی تکمیل سے ہمیشہ عاجز رہتا ہے۔ جب کوئی شخص طاقت اور اقتدار میں بگٹٹ ہو جاتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ میں تمام دنیا پر قابض ہو جاؤں اور تمام دنیا کے وسائل میری گرفت میں آجائیں۔ یہ اس کے نفس کا ایسا ارمان ہے جو ہمیشہ اس کے اندر مچلتا رہتا ہے، لیکن اس کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔ لیکن وہاں ہر جنتی اس آسودگی سے بہرہ ور ہوگا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ایک اور نعمت بھی ہے جو بظاہر بہت معمولی سی ہے لیکن بالعموم انسان اس کے حصول سے عاجز رہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ سنے جو اسے ناگوار گزرے یا جسے لغو اور بیہودہ کہا جا سکے کیونکہ ہر چھوٹا بڑا آدمی تغیرات کی زد میں ہے۔ یہ انقلاب اس کے اندر بھی برپا رہتا ہے اور اس کے گرد و پیش میں بھی۔ ہزار جتن کیا جائے یہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا کہ کبھی کوئی ایسی آواز کان میں نہ پڑے جسے لغو کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اہلِ جنت اس نعمت سے بھی نوازے جائیں گے کہ جنت میں کبھی کوئی بول ان کے کانوں میں ایسا نہیں پڑے گا اور کوئی منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ایسا نہیں آئے گا جو ان کی خوشیوں کو مکدر کر دے۔ وہ جب بھی سنیں گے، سلامتی کی بات سنیں گے۔ اور جب بھی دیکھیں گے، سلامتی کا منظر دیکھیں گے۔ چونکہ ان کے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی اس لئے وہ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو سلام کہیں گے، یعنی مبارکباد دیں گے۔ وہ جدھر نکلیں گے فرشتے انہیں سلام کہیں گے اور مبارکباد دیں گے۔

اہلِ جنت کا رزق

اور انہیں صبح و شام ان کا رزق دیا جائے گا۔ ان کے رزق سے مراد یقیناً وہ غذا ہے جس کی اہلِ جنت کو طلب ہوگی، لیکن آج ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ غذا کیسی ہوگی۔ اگرچہ جنت میں پھلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور ان کے خوش ذائقہ ہونے کا بھی۔ اسی طرح دودھ اور شہد کی نہروں کا بھی تذکرہ ہے۔ لیکن یہ دودھ اور شہد اور یہ پھل اور فواکہ کیا دنیا جیسے ہوں گے؟ یا اس کی حقیقت بھی روحانی ہوگی؟ اس کی حقیقت تو جنت میں جا کے ہی کھلے گی۔ صاف اور سیدھی بات تو یہ ہے کہ جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی اور ناگواری کا کوئی غبار اڑ کر جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا، لیکن جیسا کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اصل رزق تو وہ ہے جو آسمانوں سے نازل

Marfat.com

ہوتا ہے۔اس حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے وہاں رزق کی صورت میں جو کچھ دیا جائے وہ برکاتِ الٰہی ہوں اور اللہ تعالیٰ کی وہ تجلیات ہوں جو اہل جنت کی تمام ضرورتوں اور خوشیوں کا سامان بنیں۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ صبح وشام اہلِ جنت کو رزق دیا جائے گا اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ جیسے ملازموں یا فوجیوں کیلئے کھانے کے اوقات مقرر ہوتے ہیں اور عموماً صبح شام ہی انہیں کھانا مہیا کیا جاتا ہے اور دوپہر کو اگر انہیں بھوک لگے تو بھوک برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ صبح وشام جنت کے ہیں جس کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ محاورۃً یہ بات کہی گئی ہو،تو محاورہ میں صبح شام سے دو متعین اوقات مراد نہیں ہوتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہیں ہر وقت رزق مہیا کیا جائے گا،جب وہ اس کی خواہش کریں گے۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِیًّا ﴿٦٣﴾

(یہ وہ جنت ہے جن کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو پرہیزگار ہوں گے۔ ٦٣)

یہ تعریض ہے ان لوگوں پر جو اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لانے کی بجائے اس خوش فہمی میں زندگی گزار رہے تھے کہ جس طرح ہمیں دنیا میں دولت وثروت میسر ہے اور ہم اپنی دولت کے زور سے جو چاہتے ہیں حاصل کر لیتے ہیں۔اس طرح سے ہماری دنیا ہی ہماری جنت ہے۔تو قیامت کے دن بھی اسی طرح ہمیں اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائیں گے۔

اور کچھ لوگ اس امت میں بھی ہیں جو قرآن وسنت کو اپنے پاس رکھتے ہوئے بھی نجات کیلئے انہوں نے کچھ خود ساختہ راہیں نکال رکھی ہیں۔بنی ہاشم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ چونکہ ہمیں نبی کریم ﷺ سے ایک خاندانی نسبت حاصل ہے،اس لئے شریعت کی پابندیوں سے ہم آزاد ہیں۔ہمارا سید ہونا ہماری نجات کیلئے کافی ہے اور ایسے لوگ تو بڑی تعداد میں ہیں جو فرائض اور حقوق کو ایک طرف رکھ کر چند رسوم کی پابندی کو نجات کیلئے کافی سمجھتے ہیں۔پروردگار نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اپنی جنت کا وارث ان لوگوں کو بنائیں گے جو متقی اور پرہیزگار ہوں گے۔جن کے عقیدہ وعمل میں کوئی خرابی نہیں ہوگی،وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں گے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِیًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا ﴿٦٥﴾

(اور ہم نازل نہیں ہوتے مگر آپ کے رب کے حکم سے،اسی کی ملکیت (اور اختیار میں) ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہیں اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اور آپ کا رب کسی چیز کو بھولنے والا نہیں۔ ٦٤)
وہی رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے،پس آپ اسی کی بندگی کریں اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہیں،کیا آپ جانتے ہیں اس کی کوئی نظیر؟ ٦٥)

Marfat.com

وسطِ کلام میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف سے ایک وضاحت

بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ جتنا ہمارے پاس آتے ہیں اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو کچھ کہا وہ ان آیات میں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو اس کلام خداوندی سے جواب دیا گیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ بعثتِ مبارکہ کے بعد مسلسل حق و باطل کی کشمکش سے گزر رہے تھے۔ آئے دن نئی نئی مخالفتوں سے واسطہ پڑتا۔ اہلِ مکہ ہر روز دشمنی کے نئے ارادوں سے آپؐ کے راستے میں حائل ہوتے۔ اور کبھی کبھی لوگوں کے سامنے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے نبی نہیں، اہلِ کتاب سے مدد لے کر عجیب و غریب سوالات آپؐ کے سامنے پیش کرتے۔ اور کبھی اصحابِ ایمان کی طرف سے بعض ایسی باتیں پوچھی جاتیں جن کا جواب وحیِ الٰہی پر منحصر ہوتا۔ ایسے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی ضرورت محسوس کرتے۔ دشمنوں کی طرف سے کوئی سوال کیا جاتا تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب دیا جائے تو اس کیلئے ایک ہی راستہ تھا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کر اتریں اور آپؐ دشمنوں کے سامنے اسے پڑھ کر سنائیں اور اگر مخالفتوں کا ہجوم اور اذیت رسانیوں کی ہولناکی اس قدر شدید ہو جاتی کہ اس کا برداشت کرنا بعض دفعہ مسلمانوں کیلئے مشکل ہو جاتا تو آنحضرت ﷺ اور مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و نصرت اور نئے احکام کے منتظر رہتے۔ غرضیکہ کشمکش کے اس دور میں قدم قدم پر آنحضرت ﷺ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی ضرورت محسوس کرتے۔ اور ویسے بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نشان اور نوری مخلوق کے سردار ہیں اور برکتیں آپ کے جلو میں چلتی ہیں، اس لئے بھی حضورؐ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ ایک انس محسوس کرتے اور ان کی تشریف آوری سے آپؐ کو سہارا بھی ملتا اور آپؐ کی طبیعت میں فرحت و مسرت کی لہر بھی اٹھتی۔

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ کا حضرت جبرائیل علیہ السلام کیلئے اشتیاق سمجھ میں آتا ہے، لیکن حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو جواب دیا اس سے اگر ایک طرف مشرکین کے غلط عقیدے پر چوٹ پڑتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نہایت مقدس اور طاقتور مخلوق ہونے کے باوجود کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

سب سے پہلی بات حضرت جبرائیل علیہ السلام نے یہ فرمائی کہ ہمارا آنا ہمارے اپنے اختیار میں نہیں۔ ہم تو آپؐ کے رب کے حکم سے اترتے ہیں۔ بظاہر ہم کارکنانِ قضا و قدر ہیں، لیکن قدرت اور اختیار سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ کائنات میں کوئی پتا بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہلتا، کوئی کونپل اس کے حکم کے بغیر نہیں پھوٹتی، کوئی کلی اس کی اجازت کے بغیر نہیں چٹکتی۔ ہم ہر طرف سے اس کے حصار میں ہیں۔ ہر طرف اس کی حکومت اور اس کا اختیار کارفرما ہے۔ جب اس کا حکم ہوتا ہے، ہم حاضر ہو جاتے ہیں اور جب تک اس کا حکم نہیں ہوتا، ہم اترنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کبھی نسیان کا شکار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم دیر بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپؐ جس کشمکش سے گزر رہے ہیں اس کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک واقعہ اس کے علم میں ہے۔ وہ اپنے وسیع علم کے باوجود اگر ہمیں اترنے کا حکم نہیں دیتا تو اس میں بھی اس کی کوئی نہ کوئی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ آپؐ کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ آپؐ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہیں۔ ہمارے آنے میں تعجیل یا تاخیر اسی کے حکم اور اس کی مشیت کے تابع ہے۔

Marfat.com

دوسری آیت میں فرمایا کہ آپؐ کا معاملہ اس ذات کے ساتھ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے۔ اگر وہ کہیں بھولنے لگے تو کائنات کا نظام تلپٹ ہو کے رہ جائے، لیکن ہمیں اس پورے عالمِ تکوین میں کہیں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ اس لئے آپؐ کو اسی کی بندگی اس طرح کرنی ہے کہ اس کے راستے میں کوئی مشکل اور رکاوٹ حائل نہ ہو سکے۔ آپؐ کی بندگی کے راستے میں قدم قدم پر کاوٹیں آئیں گی۔ آپ کو نہ صرف ان پر صبر کرنا ہے بلکہ استقامت بھی دکھانی ہے۔ صبر اور اصطبار دونوں کا مادہ ایک ہے، لیکن عربی کا قائدہ ہے: "کَثْرَۃُ الالفاظ تدل علی کثرۃ المعنی" یعنی الفاظ کی کثرت معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔ اصطبار میں چونکہ صبر سے زیادہ الفاظ ہیں، اس لئے اس کا معنی ہوگا، ایسا صبر جس میں استقامت اور استقلال ہو۔

آخر میں فرمایا کہ آپؐ کے رب کی شانیں تو بیشمار ہیں لیکن ایک شان ایسی ہے جو آپؐ کے علم میں تو ہے لیکن یاد دہانی کیلئے اس پر توجہ بھی دلائی جارہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیا آپؐ اپنے اللہ کا کوئی ہم نام جانتے ہیں۔ "سَمِیّ" کا معنی ہم نام بھی ہوتا ہے اور نظیر و مثیل بھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ مشرکین نے ذاتِ خداوندی کے ساتھ بیشمار قوتوں کو شریک کیا اور انہیں اپنے شرک پر ندامت کے بجائے فخر رہا۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی کسی شریکِ خدا کیلئے اللہ تعالیٰ کا نام تجویز نہیں کیا۔ جتنی مشرک قومیں گزری ہیں آپ ان کے عقائد کا استقصا کر کے دیکھ لیجئے وہ اپنے کسی معبود کو اللہ کے نام سے نہیں پکارتے۔ اور دوسرا معنی تو بالکل واضح ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر، کوئی نظیر اور کوئی مثیل نہیں، تو پھر اس کے ارادوں میں کون مزاحم ہو سکتا ہے۔ اس لئے آپؐ مخالفتوں کی پرواہ نہ کیجئے، وہ ہزاروں سہی اور مخالفت کرنے والے نہایت زور آور سہی لیکن اللہ تعالیٰ کا ہمسر کوئی نہیں۔ اس لئے وہ اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہوں گے اور آپؐ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کے بھروسے پر دین کی دعوت پیش کر رہے ہیں تو آپؐ ان شاء اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ٹھہریں گے۔

حاصل کلام یہ کہ یہ دونوں آیتیں گزشتہ اور آئندہ کلامِ خداوندی کے درمیان جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن انہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کیونکہ ان میں ایک طرح سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں معذرت پیش کی گئی ہے کہ آپؐ کا شوق و انتظار ہمارے لئے ایک اعزاز سے کم نہیں لیکن ہماری حیثیت یہ ہے کہ ہم ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے پابند ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے وحی لے کر نہیں اترتے بلکہ ہمارا اترنا تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ہماری حاضری میں کبھی تاخیر ہو جاتی ہے تو اس کا سبب اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مشیت ہوتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تاخیر سے بھی تشریف لائیں جب بھی اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ ہی کی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ اس لئے آپؐ کو نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ تبلیغ و دعوت کے کام کو جاری رکھنا چاہئے اور دوسری طرف مشرکینِ مکہ کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ تم جن فرشتوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچالیں گے، حضرت جبرائیل علیہ السلام ان کے سردار اور مطاع ہیں۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تک نہیں ہو سکتے اور وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے پابند ہیں تو کسی دوسرے فرشتے کے بارے میں تم یہ کیسے توقع کر سکتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے تمہیں چھڑا لے گا۔

مزید یہ بھی فرمایا گیا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آمد میں تاخیر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی یاد میں نہیں رہے۔ آپؐ کا رب بھولنے والا نہیں۔ کوئی چیز اس کی نگاہوں اور علم سے مخفی نہیں رہتی۔ آپؐ ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہیں۔ وہ تو عبادت میں

Marfat.com

آپ کے اٹھنے بیٹھنے کو بھی دیکھتا ہے۔ تبلیغ و دعوت میں آپ کی مساعی برابر اس کے علم میں ہیں اور دشمنوں کی طرف سے جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ بھی اس سے مخفی نہیں۔ بایں ہمہ! اس کی طرف سے خاموشی یقیناً کسی نہ کسی حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے۔ آپ کو اس پر یقین رکھتے ہوئے اس کی عبادت اور بندگی کو جاری رکھنا چاہئے اور اس راہ میں آنے والی تکلیفوں پر حتی المقدور صبر کرنا چاہئے۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ
حَيًّا ﴿۶۶﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿۶۷﴾
فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾
ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾
ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا
وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾ ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ
نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ
نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾
قُلْ مَنْ كَانَ فِى الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا
مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ
شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۭ
وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾ اَفَرَءَيْتَ
الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ ۭ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ

Marfat.com

اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ
لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوْا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ
بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾

رکوع: ۵۔ (اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔ ٦٦) اور کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ٦٧) پس آپ کے رب کی قسم ہم ضرور جمع کریں گے ان کو بھی اور ان کے شیطانوں کو بھی، پھر ہم ان کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے یا گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوں گے۔ ٦٨) پھر ہم چھانٹ کر الگ کر لیں گے ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو جو خدائے رحمٰن سے سب سے زیادہ سرکش رہے ہوں گے۔ ٦٩) پھر بیشک ہم ان لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ سزاوار ہوں گے۔ ٧٠) اور بیشک تم میں سے ہر شخص ضرور دوزخ پر وارد ہوگا، یہ آپ کے رب کے نزدیک ایک طے شدہ امر واجب ہے۔ ٧١) پھر ہم ان لوگوں کو نجات دے دیں گے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہوگا، اور ظالموں کو اس میں اوندھا گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔ ٧٢) جب ان پر ہماری آیات وضاحت سے تلاوت کی جاتی ہیں تو جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان والوں سے سوال کرتے ہیں کہ فریقین میں سے کس کی رہائش گاہ آرام دہ ہے اور کس کی نشست گاہ خوبصورت ہے۔ ٧٣) اور ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر چھوڑیں جو ان سے ساز و سامان اور شان و شوکت میں کہیں بہتر تھیں۔ ٧٤) اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں تو اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ ان کی رسی اچھی طرح دراز کرے حتیٰ کہ جب وہ دیکھ لیں اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے خواہ عذاب دنیا ہو یا قیامت۔ تو وہ جان لیں گے کون مرتبے کے اعتبار سے بدتر ہے اور کون لاؤ لشکر کے اعتبار سے کمزور تر ہے۔ ٧٥) اور اللہ تعالیٰ اضافہ فرماتا ہے ان لوگوں کی ہدایت میں جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ تیرے رب کے نزدیک اجر کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور انجام کار کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں۔ ٧٦) بھلا آپ نے دیکھا اس شخص کو جو ہماری آیات کا منکر ہوا اور کہا کہ مجھے مل کر رہے گا مال اور اولاد۔ ٧٧) کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے۔ ٧٨) ہرگز نہیں ہم لکھ رکھیں گے جو وہ کہتا ہے اور اس کے عذاب میں مزید اضافہ کریں گے۔ ٧٩) اور جن چیزوں کا وہ مدعی ہے اس کے وارث ہم بنیں گے اور وہ ہمارے پاس اکیلا حاضر ہوگا۔ ٨٠) اور انہوں نے اللہ کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے پشت پناہ بنیں۔ ٨١) ہرگز نہیں، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے دشمن ہو جائیں گے۔ ٨٢)

Marfat.com

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾

(اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔ ٦٦) اور کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ٦٧)

منکرینِ قیامت کے دلائل کی تردید

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی معذرت کے بعد اب پھر اصل سلسلۂ بیان شروع ہو رہا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف سے پیش کردہ کلام میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کا شدت سے انتظار رہتا تھا کیونکہ مخالفین کی جانب سے جیسے جیسے تکلیفوں اور اذیتوں میں شدت بڑھتی جاتی اور مسلمانوں کے مصائب میں اضافہ ہوتا جاتا، ویسے ویسے آنحضرت ﷺ محسوس فرماتے کہ ان حالات میں رہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے شاید کوئی نیا حکم آنے والا ہو، تو اس کیلئے آپ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے منتظر ہو جاتے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں مشرکین کی مخالفت کے پس منظر میں توحید و رسالت کے بعد جو بنیادی عقیدہ کارفرما تھا وہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے کا عقیدہ تھا۔ مشرکین اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق اور رازق مانتے تھے لیکن اس بات میں انہیں شبہ تھا کہ مرنے کے بعد کوئی شخص زندہ کر کے دوبارہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ایک شخص سالوں گزر جانے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے اور اس کے جسم کا نشان تک نہیں رہتا تو آخر اسے دوبارہ کیسے زندہ کیا جاسکتا ہے؟ ان میں اگرچہ ایسے لوگ بھی تھے جو بالکل قیامت کے منکر تھے، لیکن بیشتر لوگ کھلے انکار کی بجائے تردد کا شکار تھے اور عقلی استبعاد کے باعث اس عقیدہ کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اور اس طرح کی باتیں اور عقلی استبعاد کا اظہار چند نام نہاد دانشوروں کی طرف سے نہیں بلکہ اس دور کے عام انسانوں کی یہی سوچ تھی، لیکن کہنے والی زبانیں اگرچہ ان لوگوں کی ہوتی ہیں جو کسی بھی معاشرے کے سربرآوردہ لوگ ہوتے ہیں تو اس آیت میں بھی مراد وہی ہیں لیکن انسان کا لفظ لا کر اس عقیدے کی گہرائی اور عموم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پروردگار نے نہایت سہل اور سادہ انداز میں اس کا رد فرماتے ہوئے ایسی عقلی دلیل دی ہے جو عام سے عام آدمی بھی سمجھتا ہے اور بڑے سے بڑا عقلمند بھی اس کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ دلیل کا حاصل یہ ہے کہ تمہیں دوبارہ جی اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کیلئے جمع ہونے سے انکار اس لئے ہے کہ تمہاری عقل اسے تسلیم نہیں کرتی کہ ایک شخص جو موت کا شکار ہو گیا پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اسے زمین میں دفن کر دیا گیا۔ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باعث مٹی اس کے جسم کو بھی کھا گئی۔ جان اس کی پہلے ہی نکل چکی تھی، جسم کا نشان باقی تھا وہ بھی اب ختم ہو گیا۔ ایسی صورت میں اس شخص کا دوبارہ زندہ ہونا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض کرنے والا انسان کیا بھول گیا ہے کہ وہ اپنے وجود میں آنے سے پہلے لاشے اور عدمِ محض تھا اور اگر اس کے آغاز کو لیا جائے تو پھر یہ کہنا چاہئے کہ اس کے تو ماں باپ تھے جن کے اتصال سے اس کی تخلیق ہوئی، لیکن اس کے جدِ امجد یعنی انسانِ اول کو جب پیدا کیا گیا تو اس کے تو ماں باپ بھی نہ تھے یعنی وہ اپنے ہونے سے پہلے وجود کی کوئی علت بھی نہیں رکھتا تھا۔ تو ایسے عدمِ محض سے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا اور پھر اس کے پیدا ہونے کا جو پراسس ہے وہ بجائے خود عقل کیلئے چیلنج ہے۔ اور پھر دنیا میں اس کی آمد، پھر قدم قدم پر اس کی نشو و نما، حتیٰ کہ شعور اور بلوغت کی عمر کو پہنچ کر اس کا مکمل انسان بن جانا، اس میں کون سا ایسا موقع ہے جو انسان کیلئے حیرانی کی دنیا

Marfat.com

پیدا نہیں کر دیتا اور اس سب کچھ کا آغاز عدمِ محض اور کچھ نہ ہونے سے ہوا اور اب جبکہ انسان ایک وجود رکھتا ہے اور موت کا شکار ہو کر بھی ممکن ہے اس کے وجود کی کوئی نہ کوئی رمق کہیں باقی رہ گئی ہو اور اگر ایسا نہیں تو اس کا ایک نمونہ تو بہر حال موجود ہے، اس سے اس کا از سر نو پیدا کیا جانا کیا پہلے پیدا کیا جانے سے مشکل ہے؟ جو قادرِ مطلق ذات عدمِ محض اور کچھ نہ ہونے سے پیدا کر سکتی ہے، اس کیلئے کچھ ہونے سے پیدا کرنا تو بہت آسان ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ جو مشکل ترین چیز تھی اسے تم نے تسلیم کر لیا اور جو نسبتاً آسان ہے، اس کا انکار کر رہے ہو۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

فَوَرَبِّکَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾

(پس آپ کے رب کی قسم ہم ضرور جمع کریں گے ان کو بھی اور ان کے شیطانوں کو بھی، پھر ہم ان کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے یا گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوں گے۔ ۶۸)

کفار کے انجام سے ترہیب

قیامت کے وقوع پر قرآنِ کریم نے بیشمار دلائل دیئے جن میں عقلی بھی ہیں، نقلی بھی۔ آفاقی بھی ہیں اور انفسی بھی۔ واقعاتی بھی ہیں اور تاریخی بھی۔ لیکن ان کے باوجود جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ پیغمبرانہ ہمدردی اور خیر خواہی کے حوالے سے دعوت وہدایت کی ایک ہی شکل باقی رہ جاتی ہے کہ قیامت کے آجانے کے بعد انکار کرنے والوں کے ساتھ جس طرح کے حالات پیش آنے والے ہیں ان کی ایک تصویر ان کے سامنے رکھ دی جائے کہ اگر ان کی قبولیت کی استعداد پر بالکل پتھر نہیں پڑ گئے تو شاید وہ اپنے انجام کی فکر کر کے صحیح راستہ اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ اس لئے پیشِ نظر آیت کریمہ میں قیامت پر ایک فطری اور واقعاتی دلیل دینے کے بعد قیامت میں ان کے ساتھ پیش آنے والے احوال کا ذکر کیا جا رہا ہے اور وہ بھی انتہائی حتمی انداز میں تاکہ سننے والے پوری طرح متنبہ ہو سکیں۔ ارشاد فرمایا: کہ اے پیغمبر! آپ کے رب کی قسم۔ اس قسم میں اگر ایک طرف آنحضرت ﷺ کیلئے نہایت تلطف کا اظہار ہے تو دوسری طرف شاید یہ اشارہ کرنا بھی مقصود ہے کہ آپؐ کے مخالفین بھی اس بات کے تو قائل ہیں کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، تو آپ کا رب کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو خبردار ہونا چاہئے کہ جس قیامت کا یہ انکار کر رہے ہیں اس دن ہم انہیں ان کے شیطانوں کے ساتھ ضرور اکٹھا کریں گے۔ شیاطین کے ساتھ واؤ مع کے معنی میں ہے۔ یعنی ان میں سے ایک ایک کافر کو اس طرح محشر میں لایا جائے گا کہ جن شیاطینِ جن وانس نے انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی ہر کافر کا شیطان اس کے ساتھ بندھا ہوگا۔ یہ سب زنجیروں میں جکڑے ہوئے محشر میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ انہیں جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے۔

جِثِیٌّ کا مفہوم

جِثِیٌّ ...... جَاثٍ کی جمع ہے۔ جَثَا جُثُوًا کے معنی دوزانو اور اکڑوں بیٹھنے کے ہیں۔ غلام اپنے آقا کے سامنے اور مجرم عدالت میں اپنا فیصلہ سننے کیلئے اسی طرح بیٹھتے ہیں۔ بعض اہلِ لغت کے نزدیک جَثَا کا معنی گھٹنوں کے بل جھکنا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ حشر کی ہولناکیوں کی وجہ سے کافر سیدھے کھڑے نہ ہو سکیں گے اور گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوں گے۔ مجاہدؒ اور قتادہؒ نے یہی مفہوم مراد

Marfat.com

لیا ہے۔ دونوں کے مآل میں کوئی فرق نہیں کہ وہ جہنم کے گرد غلاموں کی طرف اکڑوں بیٹھے فیصلے کا انتظار کر رہے ہوں گے یا جہنم کی ہولناکی کی وجہ سے ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیں گی اور وہ گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوں گے۔

یہ منظر کشی اس لئے کی جارہی ہے تاکہ مشرکین کے عمائدین کو شاید تنبہ ہوسکے کہ آج جبکہ وہ اپنی معمولی دولت اور امارت کے نشے میں اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کی دعوت کو خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب انہیں اس انجام سے دوچار ہونا پڑے گا کہ وہ جہنم کے پاس غلاموں کی طرح بیٹھے یا گرے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے انتظار میں ہوں گے کہ اب ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور عام کفار کو بھی توجہ دلائی جارہی ہے کہ تم جن سرداروں اور لیڈروں کے پیچھے چل کر یا جنات کے موہوم تصورات کا یقین باندھ کر قیامت کا انکار کر رہے ہو، کل کو تم اور تمہارے یہ گمراہ کرنے والے سردار ایک ساتھ زنجیروں میں جکڑے ہوئے گھٹنوں کے بل جہنم کے پاس پڑے اپنے انجام کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ یہ تو انہیں اندازہ ہوجائے گا کہ ہمیں بہرصورت جہنم میں جانا ہے۔ انتظار صرف اس بات کا ہوگا کہ کس کیلئے جہنم کے کس وارڈ میں جانے کا حکم ہوتا ہے۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾

(پھر ہم چھانٹ کر الگ کرلیں گے ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو جو خدائے رحمٰن سے سب سے زیادہ سرکش رہے ہوں گے۔ ٦٩)

کفار کے لیڈروں پر ضرب

یہ اس تصویر کا دوسرا منظر ہے کہ جب سب کافر جہنم کے گرد نہایت بیچارگی کے ساتھ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے اپنے انجام کے انتظار میں ہوں گے تو اچانک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ان میں سے ان لوگوں کو الگ کرلیا جائے جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ اور اس کی رسول کے مخالف رہے اور اللہ تعالیٰ کے دین کے خلاف تحریکیں چلاتے رہے اور قدم قدم پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی ہدایت کے جواب میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے کئے، اور ہر ممکن طریقے سے اللہ تعالیٰ کے نبی اور مسلمانوں کو اذیت پہنچائی اور اس طرح سے انہوں نے عام کافروں کی قیادت کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے قریب بھی نہ آسکیں۔ آج انہیں نکال کر الگ کھڑا کیا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا کہ جس طرح تم ضلالت وگمراہی میں لوگوں کی قیادت کرتے رہے ہو، آج جہنم میں جانے کیلئے بھی ان کی قیادت کرو۔ اس طرح سے وہ اپنی پیروی کرنے والوں کو اپنی قیادت میں وہاں وہاں پہنچائیں گے جو ان کی سزا کی جگہ ہوگی اور پھر وہ خود ان سے بھی بڑھ کر عذاب کی جگہ پر رکھے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے:

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ (النحل: ٨٨)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسرے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکا، ہم ان کے عذاب پر مزید عذاب کو زیادہ کریں گے کیونکہ وہ فساد پھیلاتے تھے۔"

Marfat.com

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ هُمْ اَوْلٰی بِهَا صِلِیًّا ۝٧٠

(پھر بیشک ہم ان لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ سزاوار ہوں گے۔ ۷۰)

صِلِیًّا...... علامہ قرطبی نے جوہری کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب کسی چیز کو تم آگ میں جھونک دو تو عرب کہتے ہیں: صلیت الرجل نارا اذا ادخلته النار و جعلته یصلاها.

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ کفار کی جہنم پر ایسی بھیڑ ہو گی جس کا شمار ہی ممکن نہیں ہوگا، تو ایسی افراتفری میں کون جان سکے گا کہ کون جہنم کے کس حصے اور کس وادی میں داخل کئے جانے کا مستحق ہے اور ممکن ہے اس بھیڑ میں ایسے لوگ بھی دھر لئے جائیں جو سرے سے جہنم میں داخل کئے جانے کے مستحق نہ ہوں۔ اس طرح کی غلط فہمیوں کے ازالے کیلئے فرمایا کہ ایسی غلط فہمی صرف اس شخص کو ہو سکتی ہے جو ہمارے علم کی وسعت سے ناواقف ہے۔ دنیا میں ہماری مخلوقات بیشمار رہی ہیں لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خاکی مخلوق کو سمندر میں پیدا کر دیا ہو اور آبی مخلوق کو کسی صحرا میں جنم دیا گیا ہو۔ پھر مخلوقات کی بیشمار اقسام ہیں۔ ان میں سے ہر مخلوق کو اس کی ضرورت کے مطابق رزق دیا جا رہا ہے۔ کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا کہ کسی مخلوق کو دوسری مخلوق کا رزق دے دیا گیا ہو۔ منطقۂ باردہ کے جانور منطقۂ حارہ میں نہیں پائے جاتے۔ اور منطقۂ حارہ کے جانور منطقۂ باردہ میں نہیں ہوتے۔ حشرات الارض کی ایسی قسمیں بھی ہیں جو زمین کے نیچے اور چٹانوں کے گوشوں میں آباد ہیں، لیکن وہیں ان کی ضرورت کے مطابق انہیں غذا مل رہی ہے۔ جس پروردگار کی علمی وسعت کا یہ عالم ہو اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ اہلِ جہنم کے بارے میں کیسے صحیح فیصلہ کر سکے گا، کج فکری کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے پروردگار نے فرمایا کہ ہم خوب جانتے ہیں، اب بھی جانتے ہیں اور اس وقت بھی جانتے ہوں گے کہ کون شخص جہنم کا سزاوار ہے اور کس وارڈ میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ اور جن شیاطین نے دوسروں کو گمراہ کیا انہیں الگ نکال کر زیادہ سزا کی وادیوں میں کہاں رکھا جا سکتا ہے۔

اسی سے کفار کے اس عقیدے پر بھی چوٹ لگانا مقصود ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے جن کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے وہ شاید یہ کہہ کر ہمیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑا لیں کہ ہم ان لوگوں کو خوب جانتے ہیں، اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ ہمارے علم کے مطابق یہ بہت اچھے لوگ ہیں انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر ایسے تصورات کی جڑ کاٹ دی کہ ہم سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں۔ اس لئے نہ ہمیں کسی کے مشورے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ ہم اس مجرم کو زیادہ جانتے ہیں اور یہ نرمی کا مستحق ہے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰی رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ۝٧١ ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ۝٧٢

(اور بیشک تم میں سے ہر شخص ضرور دوزخ پر وارد ہوگا، یہ آپؐ کے رب کے نزدیک ایک طے شدہ امرِ واجب ہے۔ ۷۱ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دے دیں گے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہوگا، اور ظالموں کو اس میں اوندھا گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔ ۷۲)

Marfat.com

قیامت کے دن کی ہولناکی

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے "مِنکُمْ" کی ضمیر خطاب اور "وارد" کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ مفسرین کا یہ اختلاف بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق کوئی صحیح روایت منقول نہیں، کیونکہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے بعد مفسرین میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جن لوگوں نے ضمیر خطاب کو عام رکھا اور ورود کا معنی دخول کیا ہے، انہوں نے اس پر حضرت جابر بن عبداللہؓ سے ایک روایت بھی بیان کی ہے جسے مسند احمد نے تیسری جلد میں نقل کیا ہے اور حافظ زین نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ حدیث قابلِ قبول ہے تو پھر مفسرین جن میں بڑے بڑے نام شامل ہیں انہوں نے اختلاف کیسے کیا؟ اس لئے صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کوئی صحیح حدیث اس بارے میں ہم تک نہیں پہنچی۔ اس سلسلہ میں عکرمہؓ اور سعید بن جبیرؓ سے جو قول منقول ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اقوال میں سے بھی ایک قول یہی ہے، وہ سیاقِ کلام سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ سابقہ آیات میں جن کفار کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ہم انہیں ضرور محشر میں جمع کریں گے اور پھر اس حالت میں انہیں جہنم پر لائیں گے کہ وہ فیصلے کے انتظار میں جہنم کے کنارے گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوں گے، پھر ان کے ہر گروہ میں سے ہم بڑے بڑے لوگوں کو نکالیں گے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے زیادہ مخالف رہے ہوں گے، انہیں سے خطاب فرماتے ہوئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ تمہیں ہر صورت میں جہنم پر وارد ہونا ہے۔ اس صورت میں ورود کا معنی دخول ہی زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں ہر صورت میں جہنم میں داخل ہونا ہوگا، اور یہ ایسا طے شدہ امر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے واجب کر رکھا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس طرح سے اسلوب میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے کہ پہلے جو بات بصیغۂ غائب کہی جارہی تھی، اب بصیغۂ خطاب کہی جارہی ہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اسلوب میں یہ تبدیلی قرآنِ کریم میں عام ہے اور عرب اپنے خطبات میں کثرت سے اس کا استعمال کرتے تھے اور دونوں کے اپنے اپنے فوائد ہیں۔ پہلی آیت میں غائب کے صیغے سے کفار کا ذکر یہ تصور دینے کیلئے ہے کہ یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ پروردگار ان کی طرف التفات فرمائیں۔ اور پیشِ نظر آیت میں غائب کی بجائے خطاب کا صیغہ لا کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ شدید غضب اور جلال کے انداز میں انہیں کافروں کو جنہیں التفات کے قابل نہیں سمجھا گیا تھا سے خطاب فرمائے گا کہ اب تمہارے لئے داد و فریاد اور عذر و معذرت کا کوئی موقع نہیں، اب تم میں سے ہر ایک کو جہنم میں داخل ہونا ہے۔ اور اس طرح سے آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی دینا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ یہ لوگ کس طرح جہنم میں جل رہے ہوں گے۔

جن مفسرین نے اس آیت کی ضمیر خطاب کو کفار کیلئے مخصوص کیا ہے اور مومنوں کو اس میں شامل نہیں کیا ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۞ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا "بیشک جن کیلئے ہمارا اچھا وعدہ ہو چکا ہے وہ اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے، وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔"

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو جہنم سے دور رکھا جائے گا اور وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سن پائیں گے، تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں۔

یہ تفسیر جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے سیاقِ کلام سے زیادہ موافقت رکھتی ہے لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ دوسری آیتِ کریمہ کا

Marfat.com

مفہوم جو اس آیت کے مضمون کی تکمیل کرنے والا ہے اس سے میل نہیں کھاتا کیونکہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جہنم میں صرف کافر داخل ہوں گے، مسلمانوں کو جہنم کی آہٹ بھی سنائی نہیں دے گی کیونکہ انہیں جہنم سے بہت دور رکھا جائے گا جبکہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جارہا ہے کہ پھر ہم ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے اس جہنم سے نجات دے دیں گے اور کافروں کو اسی حالت میں اس میں چھوڑ دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ جب مسلمان جہنم میں داخل ہی نہیں ہوں گے تو پھر ان کو نجات دینے کا کیا معنی؟ اس سوال سے بچنے کیلئے مندرجہ بالا تفسیر کے قائلین نے یہ تاویل کی ہے کہ فِيهَا کی ضمیر کا مرجع اگرچہ جہنم ہی ہے لیکن مراد اس سے جہنم کا وہ حصہ ہے جس میں ابتدائی طور پر تمام لوگوں کو لایا جائے گا اور جہاں داروغے ان کا جائزہ لے کر ان میں درجہ بندی کریں گے۔ مسلمانوں کو تو یہاں سے جنت میں بھیج دیا جائے گا اور کافر اسی حالت میں انتظار میں رہیں گے کہ انہیں کس وادی میں بھیجا جاتا ہے تا آنکہ انہیں ان مقامات پر پہنچا دیا جائے گا جو ان کے عذاب کیلئے مخصوص ہوں گے۔

بعض مفسرین نے ایک دوسرے انداز سے ان آیات کی تفسیر بیان کی ہے۔ انہوں نے دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت کی تفسیر میں ورود سے مراد دخول نہیں لیا بلکہ مرور لیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمام کافر اور مسلمان اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلے کے مطابق جہنم پر گزریں گے۔ مومن گزر کر جنت میں پہنچ جائیں گے اور کافر جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔ رہی یہ بات کہ ان کا گزرنا جہنم کے کناروں سے ہوگا یا پلِ صراط کے ذریعے، دونوں ہی صورتیں ممکن ہیں۔ اگر دوسری صورت مراد لی جائے تو پھر ان احادیث سے مطابقت ہو جاتی ہے جن میں اہلِ ایمان کا پلِ صراط کے ذریعے گزرنے کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے مدارج کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ یہ یاد رہے کہ ورود کا معنی دخول جس طرح بعض اہلِ لغت کے نزدیک معتبر ہے اسی طرح دیگر اہلِ لغت کے نزدیک نامعتبر بھی ہے وہ اس کا صحیح معنی مرور قرار دیتے ہیں اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے یہی مضمون حدیث میں منقول ہے اور ایک قول اس کی تائید میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا بھی احادیث میں وارد ہوا ہے۔ واللہ اعلم

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾

(جب ان پر ہماری آیات وضاحت سے تلاوت کی جاتی ہیں تو جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان والوں سے سوال کرتے ہیں کہ فریقین میں سے کس کی رہائش گاہ آرام دہ ہے اور کس کی نشست گاہ خوبصورت ہے۔ ۷۳)

مقام اور ندی کا مفہوم

''مقام'' اور ''ندی'' کا ہم نے ترجمہ رہائش گاہ اور نشست گاہ کیا ہے۔ قرطبی نے اسی کو علامہ جوہری سے روایت کیا ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ''مقام'' مرتبہ کے معنی میں اور ''ندی'' سوسائٹی پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کے معنی میں عموم پایا جاتا ہے۔

کفار کی مغرورانہ ذہنیت

اس آیتِ کریمہ میں قیامت اور آخرت کا انکار کرنے والوں کی ذہنیت کو اجاگر کیا جارہا ہے یعنی ان کا انکار صرف عقلی استبعاد کی وجہ

Marfat.com

سے نہیں بلکہ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ ہم دنیا میں جس طرح عیش و آرام اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزار رہے ہیں اور ہمیں معاشرے میں عزت کا جو مقام حاصل ہے اور جس طرح ہمارے دروازوں پر ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ لوگ ہیں۔ کیونکہ یہ دنیا اس کی دنیا ہے، وہ یہ کیسے پسند کرسکتا ہے کہ اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو دنیوی مال و دولت اور آرام وراحت سے نوازے۔ اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہم واقعی اس کی نگاہوں میں پسندیدہ ہیں تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر واقعی قیامت کا ظہور ہو ہی گیا تو وہاں بھی ہم اسی مقام و مرتبہ کے مالک سمجھے جائیں گے کیونکہ یہ بات سراسر نامعقول ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں جن کو محبوب رکھتا تھا انہیں آخرت میں عذاب کی نذر کردے۔ اسی طرح وہ مسلمانوں کے بارے میں اس کے مفہوم مخالف سے استدلال کرتے تھے کہ تم جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھتے ہو اور خود کو اللہ تعالیٰ کا محبوب گردانتے ہو، تمہیں نہ کوئی دنیا کا آرام میسر ہے نہ معاشرے میں تمہیں عزت کا مقام حاصل ہے، تم بے نواؤں اور بے کسوں کا ایسا ٹولہ ہو جن کی اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قیامت میں بھی تمہیں کوئی مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہوگا۔ جس طرح یہاں تم ذلت کی زندگی گزار رہے ہو، وہاں بھی تمہیں ایسی ہی صورتحال سے واسطہ پڑے گا۔

مشرکینِ مکہ دو مغالطوں کا شکار تھے۔ ایک تو یہ کہ آخرت دنیوی زندگی کا عکس ہے۔ جو شخص یہاں جس حالت میں ہے قیامت میں بھی اسی حالت میں ہوگا اور دوسرا مغالطہ یہ تھا کہ ظاہری مال و دولت، خدم و حشم اور ریاست و حکومت یہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کی علامتیں ہیں۔

اشرافِ مکہ اس طرح کے دلائل کا سہارا لے کر مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم خود موازنہ کرکے دیکھو کہ تم اور ہم دو فریق ہیں، دونوں میں سے بہتر حالت میں کون ہے، بس جنت کو بھی اسی کا عکس سمجھو، اگر تم واقعی جنت میں جانا چاہتے ہو تو ہماری پیروی کرو تاکہ ہماری طرح دنیا میں بھی عیش کرو اور آخرت میں بھی تمہیں عیش کی زندگی ملے۔ لیکن تم بجائے اس بات کو سمجھنے کے ہمیں دعوت دیتے ہو کہ ہم تمہاری زندگی جیسی زندگی اختیار کرلیں، تو اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہوگی کہ ہم اپنی دنیا بھی گنوالیں اور آخرت میں بھی عذاب بھگتیں۔

قرآنِ کریم نے جابجا ان دونوں مغالطوں کا رد فرمایا ہے۔ اس کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ یہاں کے گدا، وہاں منعم بنا دیئے جائیں اور یہاں کے حکمران اور دولت مند وہاں جہنم کی پست ترین وادیوں میں پھینک دیئے جائیں، کیونکہ اس کے نزدیک قدر و قیمت، مال و دولت اور مقام و مرتبہ کی نہیں بلکہ ایمان اور حُسنِ عمل کی ہے۔ وہاں نسب و حسب نہیں، کردار کو اہمیت ملے گی۔ فراعنہ اور نماردہ ذلت کی وادیوں میں ہوں گے اور حضرت بلال اور حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے عزت کے تخت پر براجمان ہوں گے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا ﴿٧٤﴾

(اور ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر چھوڑیں جو ان سے ساز و سامان اور شان و شوکت میں کہیں بہتر تھیں۔ ۷۴)

مغروروں کے معارضہ کا جواب

"قَرْن" کے معنی ہیں ایک دور کے لوگ، امت اور قوم۔ "الاثاث" متاع البیت، یعنی گھر کے سامان کو کہتے ہیں۔ رِئْیًا خوش منظر اور شان و شوکت پر بولا جاتا ہے۔ تاج العروس میں اس کی تشریح ان الفاظ سے کی گئی ہے۔ وهو ما رأته العين من حالة حسنة و كسوة

Marfat.com

ظاهرة ''وہ آرائش حالت اور ظاہری لباس جو آنکھوں سے دکھائی دے۔''

اشرافِ قریش کی دلیل اور ان کے معارضہ کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اسباب وسامان اور شان وشوکت کسی فرد یا کسی قوم کے اللہ تعالیٰ کے یہاں مقرب ہونے کی دلیل نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا کے فراعنہ اور نمارده اور سکندر و چنگیز اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوتے اور دنیا کی رہنمائی کرتے اور وہ قومیں کبھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار نہ ہوتیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی شان وشوکت سے نوازا تھا اور دنیا ان کی عظمتوں کے سامنے جھکتی تھی لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے سرکشی دکھائی اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ قوم عاد اور قوم ثمود دنیا کی طاقتور ترین قومیں تھیں۔ فرعون اور اہلِ فرعون ہر طرح کی فراخی اور عیش و عشرت سے بہرہ ور اور بڑی بڑی فوجوں کے مالک تھے، لیکن ان کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٥﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں تو اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ ان کی رسی اچھی طرح دراز کرے حتیٰ کہ جب وہ دیکھ لیں اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے خواہ عذابِ دنیا یا قیامت۔ تو وہ جان لیں گے کون مرتبے کے اعتبار سے بدتر ہے اور کون لاؤ لشکر کے اعتبار سے کمزور تر ہے۔ ۷۵)

اسلوب کی تبدیلی سے ایک حکمت کی طرف اشارہ

تشریح سے پہلے ترجمے کے حوالے سے ایک ضروری بات۔ آیتِ کریمہ میں فَلْيَمْدُدْ کا ترجمہ عام طور پر یہ کر دیا جاتا ہے ''دراز کرتا ہے۔'' یہ ترجمہ اگرچہ غلط نہیں لیکن عام اسلوب سے ہٹا ہوا اور اس حکمت کے ذکر سے خالی ہے جس کی طرف یہاں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ ''دراز کرتا ہے'' نہیں کیا بلکہ یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ اس کی رسی دراز کرے۔ قرآنِ کریم میں اسالیب میں جو بلاغت پائی جاتی ہے اس کی یہ بھی ایک مثال ہے۔ اسلوب کی تبدیلی سے ایک گہری حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کفار کی سرکشی اور تمرد کو دیکھتے ہوئے فوراً ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ پروردگار ایسے لوگوں کو عذاب کا شکار کیوں نہیں کر دیتا۔ کیا اس کی زمین ایسی ہی سستی اور اس کی نعمتیں ایسی ہی بے مایہ ہیں کہ اس زمین پر ایسے سرکش لوگوں کو رہنے اور نعمتوں سے متمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ اس کا جواب اس اسلوب کے ذریعے اس طرح دیا گیا ہے کہ جزاء وسزا کے عام قانون کو دیکھتے ہوئے تو یہ لوگ واقعی اس قابل ہیں کہ انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اپنی شانِ رحمت اور شانِ استغنا بھی ہے، جس وجہ سے زمین پر انسانوں کی ہمہ ہمی ہے، ورنہ اگر ہر چیز عدل کے ترازو میں تلتی اور فوراً جزاء وسزا کا قانون مرتب ہو جاتا تو یہاں کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ غلطیاں کریں یا سرکشی کا راستہ اختیار کریں وہ انہیں سنبھلنے کیلئے مہلت پہ مہلت دیتا چلا جائے تا آنکہ جب اتمامِ حجت ہو جائے یا قیامت کا ساحل طلوع ہو جائے تو تب انہیں گرفت میں لے۔ اس حکمت کی طرف اشارہ کرنے کیلئے یہاں یہ اسلوب اختیار کیا گیا۔

Marfat.com

کفار کے بیہودہ دعاوی کا جواب

اشرافِ مکہ نے مسلمانوں سے یہ کہا تھا کہ تم جو بار بار ہمیں اسلام کی دعوت دیتے ہو اور آخرت کو ماننے کی ترغیب دیتے ہو، تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوتا تو وہ یقیناً ہمیں خوشحالی میں نہ رکھتا اور اگر تم سے خوش ہوتا تو تمہیں ان برے حالوں میں نہ رکھتا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قیامت چونکہ دنیا ہی کے اعمال کا پھل اور یہاں کے حالات کا عکس ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ دنیا میں جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رضامندی سے نوازے، آخرت میں انہیں عذاب کے حوالے کردے۔ اس کے جواب میں پروردگار نے فرمایا کہ کتنی ایسی قومیں ہیں جو زندگی کے عیش اور خوشحالی میں تم سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی سرکشی کے باعث ہلاک کردیا۔ تو تمہاری یہ خوشحالی تمہیں سرکشی کے انجام سے بچا نہ سکے گی۔ اس سے سوال پیدا ہوا کہ پھر مشرکینِ مکہ کو کیوں نہیں ہلاک کیا جارہا۔ اس کے جواب میں پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں قرآنِ کریم نے اس سنتِ الٰہی کو بیان کیا ہے جو اس نے سرکشوں اور نافرمانوں کے بارے میں طے کر رکھی ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں کہ جیسے ہی کوئی پیغمبر کسی قوم کی طرف ہدایت کیلئے مبعوث ہوں اور قوم اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کردے تو وہ فوراً ان پر عذاب بھیج دے کیونکہ نافرمانوں اور جرائم پیشہ لوگوں پر فوری گرفت کمزور حکمرانوں کا شیوہ رہا ہے۔ انہیں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں کو بچ نکلنے کا موقع دیا گیا ہے تو ممکن ہے یہ زیادہ طاقت پکڑ جائیں یا کوئی بڑا جتھہ بنالیں اور پھر ہماری گرفت میں نہ آسکیں۔ اس لئے جیسے ہی ان پر قابو پانا ممکن ہوتا ہے حکمران انہیں گرفت میں لے لیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ قادرِ مطلق اور اور ہمہ گیر حکمرانی کا مالک ہے اس کی قدرت سے کسی کو بھاگ نکلنے کی طاقت نہیں۔ اس لئے وہ پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ مہلت پہ مہلت عطا فرماتا ہے۔ اس طرح سے جن لوگوں میں اصلاح پذیری کی کچھ بھی رمق ہوتی ہے وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جن میں قبولیت اور اثر پذیری کی استعداد کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں وہ اگرچہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے لیکن ان کی فائل موٹی ہوتی جاتی ہے اور ان کے جرم کا ثبوت حتمی صورت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ مزید براں ایک اور بات بھی ہے جس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کرچکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات رحیم و کریم بھی ہے بلکہ اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے۔ اس کی رحمت کا بھی یہ تقاضا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو سنبھلنے کا موقع دے اور یہ موقع اس وقت تک طویل ہوتا جائے جب تک اتمامِ حجت نہ ہوجائے۔

اہلِ مکہ پر عذاب کا نہ آنا اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کا مظہر ہے۔ انہیں مہلت دی گئی ہے اور یہ مہلت اس وقت تک چلے گی جب تک اتمامِ حجت کے بعد اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں آجاتا یا قیامت وقوع پذیر نہیں ہوجاتی۔ اگر عذاب آگیا اور ان لوگوں نے کفر سے توبہ نہ کی یا اپنے کفر سمیت قیامت تک پہنچ گئے تو وہاں انہیں اندازہ ہوجائے گا کہ اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے کون بدتر ہے اور کس کا لشکر زیادہ کمزور ہے۔ آج وہ جن قوتوں پر ناز کرتے اور مسلمانوں پر برتری جتاتے ہیں اس دن ان پر اس کی حقیقت کھل جائے گی۔

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًىؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

(اور اللہ تعالیٰ اضافہ فرماتا ہے ان لوگوں کی ہدایت میں جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ تیرے رب کے نزدیک اجر کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور انجام کار کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں۔ ۷۶)

Marfat.com

ایک اور سنت اللہ کا بیان

اس آیت کریمہ میں ایک اور سنتِ الٰہی کا ذکر ہے وہ یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ نافرمانوں اور سرکشوں کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ سنبھل جائیں یا پھر اپنے انجام کو بدتر سے بدتر بنالیں۔ اسی طرح وہ ان لوگوں کی ہدایت میں بھی اضافہ کرتا ہے جو ہدایت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہدایت کو چار معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور ہم نے سورۂ فاتحہ کی تشریح میں اور سورۂ بقرہ کے آغاز میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ان معنوں میں سے ایک معنی قلبی نور وبصیرت ہے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب وہ کسی نئے راستے کو اختیار کرتا یا نئے نظریئے کو قبول کرتا ہے تو شروع میں اس کا دماغ قبولیت کے مراحل طے کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بات دل میں اترنے لگتی ہے۔ دل کبھی اسے قبول کرتا ہے اور کبھی توہمات کا شکار ہوجاتا ہے۔ اسی کشمکش میں آخر ایک دن ایسا آتا ہے جب دل اس بات پر ٹھک جاتا ہے۔ اور پھر دنیا کا کوئی تغیر دل کے اس اطمینان کو شکست نہیں دے سکتا۔ اسی کو قلبی بصیرت یا قلبی نور کا نام دیا گیا ہے۔ ایک مومن کی معراج یہی ہے۔ جب وہ ہدایت کے راستے کو اختیار کرتا ہے تو وہ ہر طرح کے مراحل سے گزرتا ہے لیکن جب اس راستے میں پیش آنے والی ذہنی الجھنوں اور عملی مشکلات پر ثابت قدم رہتا ہے تو بالآخر اس کے دل میں ایک نور روشن ہوتا ہے جو ہر طرح کے وہم اور بے یقینی کو جلا کے رکھ دیتا ہے۔ جو لوگ ساری عمر دماغی کاوشوں تک محدود رہتے ہیں اور ان کے دل کی کلی کھلنے میں نہیں آتی ان کے بارے میں کھٹکا ہی رہتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی کوئی اور فیصلہ کر بیٹھیں۔ اسی لئے اقبال مشورہ دیتا ہے:

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

ہم جو صحابہ کرامؓ کے اس طرح کے اقوال پڑھتے ہیں کہ آج اگر ہمارے سامنے عالمِ غیب کی وہ ساری چیزیں جن کی اطلاع ہمیں قرآن وسنت نے دی ہے کھل کر سامنے آجائیں اور ہم انہیں بہ چشمِ سر دیکھیں تو ہمارے ایمان ویقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ ہم یقین کی اس دولت کو پاچکے ہیں جو دیکھنے اور سننے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اسی قانون کا اظہار ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے چونکہ اس راستے کی ہر وادی کو سر کرلیا تھا اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے مستحق ٹھہرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کردیا تھا۔ پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ ہر کام کرنے سے پہلے دنیا کے نفعِ عاجل کو نہیں بلکہ نفعِ آجل کو دیکھتے تھے جس کا حاصل یہ تھا کہ ان کا ہر عمل باقی رہنے والا تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو اَلْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ کہا گیا ہے۔ ہر وہ نیک عمل جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کیلئے کیا جاتا ہے وہ باقیات میں شامل ہے۔ اور جو کام دنیا کیلئے کیا جاتا ہے وہ فانی دنیا کی طرح فنا ہوکر رہ جاتا ہے۔

اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ کَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَقَالَ لَاُوۡتَیَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الۡغَیۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ﴿۷۸﴾ کَلَّا ؕ سَنَکۡتُبُ مَا یَقُوۡلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا یَقُوۡلُ وَیَاۡتِیۡنَا فَرۡدًا ﴿۸۰﴾

(بھلا آپ نے دیکھا اس شخص کو جو ہماری آیات کا منکر ہوا اور کہا کہ مجھے مل کر رہے گا مال اور اولاد۔ ۷۷) کیا

Marfat.com

اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے۔ ۷۸) ہرگز نہیں ہم لکھ رکھیں گے جو وہ کہتا ہے اور اس کے عذاب میں مزید اضافہ کریں گے۔ ۷۹) اور جن چیزوں کا وہ مدعی ہے اس کے وارث ہم بنیں گے اور وہ ہمارے پاس اکیلا حاضر ہوگا۔ ۸۰)

ایک اور خود فریبی کا رد

مشرکینِ مکہ جن خود فریبیوں کے باعث قیامت کے انکار کر رہے تھے ان میں سے ایک خود فریبی یہ تھی کہ جو خوشحالی، عیش اور آرام ہمیں دنیا کی زندگیوں میں میسر ہے یہ سب کچھ اگر آخرت وقوع پذیر ہوئی تو وہاں بھی ہمیں ملے گا۔ یہاں کے مالدار اور صاحبِ اولاد وہاں بھی ایسے ہی ہوں گے اور جو دنیا میں بدحالی میں مبتلا ہیں اور نہایت کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں وہ آخرت میں بھی اسی طرح ٹھوکریں کھائیں گے۔ بعض روایات سے ان کی اس خود فریبی کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت خبابؓ بن الارت کی روایت ہے کہ ان کا کچھ قرض عاص بن وائل کے ذمہ تھا۔ یہ اس کے پاس تقاضا کیلئے گئے۔ اس نے کہا میں تمہارا قرض اس وقت تک ادا نہیں کروں گا جب تک تم محمد (ﷺ) کی نبوت کا انکار نہ کرو۔ حضرت خبابؓ نے جواب دیا کہ میں یہ حرکت ہرگز نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو مر جائے اور پھر تجھے قیامت کے دن اٹھایا جائے۔ اس نے ازراہِ مذاق کہا کہ جب مرنے کے بعد میں قبر سے اٹھوں گا، اس وقت میرے پاس دولت کی فراوانی ہوگی، اس وقت میرے پاس آنا، میں تمہارا قرض ادا کردوں گا۔ (بخاری و مسلم) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں جن بداعمالیوں میں مبتلا تھے اس کے بارے میں ان کیلئے فکرمندی کا کوئی موقع نہ تھا کیونکہ ان کا غالب گمان یہ تھا کہ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں، جو شخص مرجاتا ہے اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور قبر ایک دن اس کے جسم کو بھی کھا جاتی ہے۔ اور اگر فرض کریں کہ قیامت کے آنے کا کوئی امکان ہے جس کی وجہ سے لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور محشر میں اعمال کی جوابدہی کیلئے حاضر ہوں گے تو انہیں ان کی بھی تشویش نہیں تھی کیونکہ وہ اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ جو شخص دنیا میں خوش عیشی سے زندگی گزار رہا ہے، آخرت میں بھی اسے ایسی ہی زندگی اور زندگی کے ایسے ہی حالات نصیب ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے ان کے اس مغالطے کا رد کرتے ہوئے اسی انداز میں ارشاد فرمایا کہ آنے والی زندگی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ یکسر غیب کا معاملہ ہے جس پر آج اطلاع ممکن نہیں۔ اسے جاننے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ صرف وحیِ الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نبیوں پر اترتی ہے اور تمہارے نزدیک یہ ذریعہ قابلِ قبول نہیں۔ ایسی صورت میں تمہارا اس عالمِ غیب کے بارے میں کوئی بات کہنا اس کے سوا ممکن نہیں کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ تم نے اس غیب کی دنیا کو جھانک کر دیکھ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی انسان کیلئے ایسا کرنا ممکن نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جو تمہاری دسترس سے باہر ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ تم نے خدائے بزرگ و برتر سے کوئی عہد لے رکھا ہو کہ آخرت میں ہمارے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو دنیا میں ہو رہا ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ بات کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسا عہد لے لے۔ ان تمام امکانات کے مردود ٹھہرنے اور مسترد کیے جانے کے بعد ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ایسی بات کہنے والا ایک ناروا جسارت کا ارتکاب کر رہا ہے اور اسے بالکل اندازہ نہیں کہ میں اس طرح کی بات کر کے کتنی بڑی گستاخی کر رہا ہوں۔ اس لئے پروردگار نے فرمایا، ایسی جسارتیں کرنے والے کو ہم فوری طور پر تو نہیں پکڑتے، البتہ! یہ ضرور ہے کہ ہم اس کی اس طرح کی یاوہ گوئی کو لکھ رکھیں گے، یعنی ہمارے فرشتے اُس کی اس طرح کی باتوں کا ریکارڈ رکھیں گے۔ اور قیامت کے دن اس کے کفر کے باعث جو اسے سزا ملنے والی ہے اس طرح

Marfat.com

کی یاوہ گوئی کی وجہ سے اس میں ہم مزید اضافہ کر دیں گے، یعنی کفر کی سزا الگ ہوگی اور اس طرح کی دریدہ دہنی اور بکواس کی سزا اس پر مستزاد ہوگی، جس طرح ہمارے یہاں عدالتیں اس مجرم کو مختلف قسم کی سزائیں دیتی ہیں جس کے جرائم ایک سے زیادہ ہوں۔ ایسے مجرم کا قیامت کے دن بھی یہی حال ہوگا۔

مزید فرمایا کہ اسے غلط فہمی یہ ہے کہ دنیا میں میرے پاس جو مال و دولت ہے یہ شاید ہمیشہ میرے پاس رہے گا حالانکہ جب اسے موت آجائے گی تو دنیا میں جس مال و دولت اور عہدہ و منصب کے باعث یہ اپنے مالک و آقا کے سامنے بھی گستاخی سے باز نہیں آتا وہ سب کچھ اپنے پیچھے چھوڑ جائے گا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کے بعد اس کے وارث ہم ہوں گے اور جن اعوان و انصار اور لاؤ لشکر پر اسے بڑا گھمنڈ اور غرور ہے وہ قیامت کے دن اکیلا ہمارے پاس آئے گا اور کوئی ان میں سے ان کے ساتھ نہیں ہوگا۔ اور جن شرکاء و شفعاء پر اسے بھروسہ تھا کہ وہ قیامت کے دن میرے کام آئیں گے ان میں کوئی اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔ جس طرح وہ دنیا میں تنہا گیا تھا اسی طرح وہ تنہا ہمارے پاس آئے گا۔

انسان کی بے بصیرتی

انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل اور شعور سے نوازا ہے اور دنیا میں جتنی ہمہ ہمی اور رنگا رنگی نظر آتی ہے وہ سب کچھ اس کی عقل کے طفیل ہے انسانی عقل نے وہ وہ کارنامے انجام دیئے ہیں کہ خود عقل اسے دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔ گزشتہ زمانے میں کون تصور کر سکتا تھا کہ کبھی لوہے میں بھی قوتِ پرواز پیدا ہو جائے گی اور وہ فضاء میں اڑنے لگے گا اور کبھی ایک ایسی مشین ایجاد ہو جائے گی جو انسانی دماغ کی طرح کام کرے گی۔ لیکن یہ سب کچھ کے باوجود انسان اس قدر بے بصیرت واقع ہوا ہے کہ وہ مادہ کے اس پار دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ موت ایک حقیقت ہے لیکن وہ اس کا استحضار نہیں رکھتا۔ قوموں اور انبیاء کی شہادت سے جو حقائق ثابت ہیں اور انسانیت جن اقدار سے ہمیشہ عبارت رہی ہے محض خواہشاتِ نفس کی تعمیل کیلئے ان سے انکار کر دینا بلکہ اسے پامال کر دینا انسان کی روایت رہی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا تھا:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

یہی وہ بے بصیرتی اور خرد کی تنگ دامانی ہے جس کا یہاں گلہ کیا جا رہا ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾

(اور انہوں نے اللہ کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے پشت پناہ بنیں۔ ۸۱) ہرگز نہیں، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے دشمن ہو جائیں گے۔ ۸۲)

Marfat.com

مشرکین کا معبودانِ باطل پر اعتماد

مشرکین نے قیامت کے بارے میں جو غلط تصورات بنا رکھے تھے اور اسی طرح دنیوی مشکلات پر قابو پانے کیلئے جو سہارے تراش رکھے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے علاوہ کچھ اور بھی معبود بنا رکھے ہیں جن کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ ہمارے لئے قوت کا ذریعہ اور طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ ''عِزًّا'' طاقت اور قوت کو کہتے ہیں بلکہ ایسی طاقت جو ضرورت اور مشکل کے وقت پشت پناہی اور پشتیبانی کا فرض انجام دے کیونکہ آدمی ہر مشکل وقت میں کسی ایسے سہارے کی تلاش میں ہوتا ہے جس سے وہ ٹیک لگا سکے اور اس سے قوت حاصل کر سکے۔

مشرکین کے زعمِ باطل کا رد

مشرکینِ عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ یہ بیٹیاں اپنے باپ کو مجبور کر کے ہماری مشکلات کو حل کرتی ہیں اور ان کی وجہ سے ہمارے رزق کی تنگی دور ہوتی ہے اور اگر ہمیں قیامت سے واسطہ پڑا تو یہی بیٹیاں اپنے باپ کو مجبور کر کے ہمیں عذاب سے بچا لیں گی۔ اور مشرکین کے دوسرے طبقوں نے اسی قسم کے اور بہت سے معبود بنا رکھے تھے جنہیں وہ اپنے لئے سہارا سمجھتے تھے۔ لیکن پروردگار فرماتا ہے کہ ان نادانوں کو یہ علم نہیں کہ قیامت کے دن وہ یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے کہ ہم نے ان کو اجازت دی تھی کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا شریک بنائیں اور ہمیں اپنی مشکلات میں معاون اور مددگار سمجھیں بلکہ قرآنِ کریم میں متعدد مواقع پر یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ قیامت کے دن وہ بڑے لوگ جن کے اعتماد پر لوگوں نے شرک کیا ہوگا اور ان کی پیروی کی ہوگی جب وہ انہیں دیکھیں گے تو چیخ اٹھیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں دنیا میں گمراہ کیا اور ہمیں یقین دلایا تھا کہ ہم تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ آج انہیں گرفتار کیا جائے اور دگنا عذاب دیا جائے۔ لیکن وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ تم ہمارے پیروی کرو۔ تم نے اگر اپنے طور سے ہماری پیروی کی ہے تو اس میں ہماری کیا ذمہ داری ہے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں اس طرح کا رویہ اختیار کریں گے کہ وہ گویا ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور جنہیں لوگ اپنا پشتیبان سمجھتے تھے وہ ان کی دشمنی پر اتر آئیں گے اور صاف صاف براءت کا اظہار ہی نہیں کریں گے بلکہ ان پر برہمی کا اظہار بھی کریں گے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ
عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ
عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ
إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ
الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا

Marfat.com

إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ
هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ
وَلَدًا ﴿٩٢﴾ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾
لَقَدْ أَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فَرْدًا ﴿٩٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ
الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ
وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هَلْ
تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾

رکوع: ۶۔ (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کافروں پر شیاطین کو چھوڑ رکھا ہے، وہ انہیں خوب خوب برانگیختہ کر رہے ہیں۔ ۸۳) تو آپ ان کے فیصلے کیلئے جلدی نہ کریں، ہم ان کیلئے اچھی طرح گنتی کر رہے ہیں۔ ۸۴) یاد کرو! جس دن ہم پرہیزگاروں کو رحمٰن کے پاس مہمان بنا کر جمع کریں گے۔ ۸۵) اور مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانکیں گے۔ ۸۶) لوگ شفاعت وسفارش کا اختیار نہیں رکھتے مگر جس نے لے لیا ہے رحمٰن سے وعدہ۔ ۸۷) اور وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد بنا رکھی ہے۔ ۸۸) یقیناً تم نے ایک سخت معیوب بات کہی ہے۔ ۸۹) قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں۔ ۹۰) کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔ ۹۱) اور یہ بات خدا کے شایاں نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنا لے۔ ۹۲) آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدائے رحمٰن کے حضور بندے ہی کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔ ۹۳) اللہ تعالیٰ نے سب کا احاطہ کر رکھا ہے اور اچھی طرح گن رکھا ہے۔ ۹۴) اور ان میں سے ہر ایک اس کے حضور قیامت کے دن یکہ وتنہا حاضر ہو گا۔ ۹۵) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے عنقریب ان کیلئے خدائے رحمٰن مہر و محبت پیدا کر دے

Marfat.com

گا۔ ۹۶) پس ہم نے اس قرآنِ کریم کو آپ کی زبان میں آسان کردیا ہے تاکہ آپ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو بشارت دیں اور جھگڑالو قوم کو انذار کریں۔ ۹۷) اور کتنی کی قوموں کو ان سے پہلے ہم نے ہلاک کردیا، کیا آپ ان میں سے کسی کی (موجودگی) محسوس کرتے ہیں یا آپ ان کی بھنک سنتے ہیں؟ ۹۸)

اَلَمْ تَرَ اَنَّـآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّلَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾

(کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کافروں پر شیاطین کو چھوڑ رکھا ہے، وہ انہیں خوب خوب برانگیختہ کررہے ہیں۔۸۳) تو آپ ان کے فیصلے کیلئے جلدی نہ کریں، ہم ان کیلئے اچھی طرح گنتی کررہے ہیں۔ ۸۴)

اَرْسَلْنَا کامفہوم

اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کا معنی امام رازی، علامہ قرطبی اور علامہ آلوسی کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے شیاطین کو کافروں پر مسلط کردیا۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اَرْسَلْنَا تسلیط کے معنی کو متضمن ہے۔

بعض اہلِ لغت کے نزدیک عرب جب اپنی گفتگو میں یہ کہتے ہیں "ارسل الكلب علی الصيد" تو اس کے معنی ہوتے ہیں "کتے کو شکار پر چھوڑ دیا" اس آیتِ کریمہ میں بھی اسی اسلوب پر یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے "کہ ہم نے ان کافروں پر شیاطین کو چھوڑ دیا ہے کہ وہ جتنا انہیں دعوتِ حق کیخلاف اکسا سکتے ہیں اکسالیں۔"

اَزَّ یَوُزُّ کامفہوم

اَزًّا ...... اَزَّ یَوُزُّ کا معنی ہے برانگیختہ کرنا، بھڑکانا اور اکسانا۔ عربی لغت میں اَزَّ، هَزَّ، فَزَّ، حَضَّ سب ایک معنی میں بولے جاتے ہیں۔ البتہ خفت وشدت اور کمی وزیادتی کے لحاظ سے ان میں باہمی فرق ہے۔ اَزَّ کے معنی میں سب سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔

سنت اللہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئی ہیں جب حق وباطل میں کشمکش اپنے عروج کو چھورہی تھی۔ کفار ہر ممکن طریقے سے دعوتِ اسلامی کا خاتمہ کردینا چاہتے تھے اور آئے دن مخالفت اور اذیت کے نئے سے نئے طریقے ایجاد کئے جارہے تھے۔ ایسے میں نبی کریم ﷺ اور مظلوم مسلمانوں کی نگاہیں بار بار آسمانوں کی طرف اٹھتی تھیں اور وہ اپنی بے بسی کے حوالے سے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نصرت و رحمت کے منتظر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب اندھیرا شدید ہوجاتا ہے تو سحر ضرور طلوع ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق انہیں پریشانی بھی لاحق ہونے لگتی تھی۔ چنانچہ اس پوری صورتحال میں بعض حکمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے یہ خلاف توقع نہیں۔ حق وباطل کی کشمکش میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب

Marfat.com

مخالفین اور معاندین ہر ممکن طریقے سے اللہ تعالیٰ کے رسول کا راستہ روکنے اور اس عظیم نعمت کی ناشکری کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا کہ وہ انہیں اس بات سے روک دے بلکہ وہ مخالفت کے اسباب میں مزید اضافہ کر دیتا ہے اور ان کی قبولیت کے سوتوں کو بالکل خشک کر دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ (زخرف آیت ۳۶) ''جو شخص رحمن کے ذکر سے اعراض کرتا ہے ہم اس پر شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔'' ان لوگوں نے چونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ اس کی مخالفت کی انتہا کر دی ہے، تو اب اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعراض کو مزید پختہ کرنے کیلئے ان پر شیاطین چھوڑ دیئے ہیں۔ ان کا کام شب و روز یہ ہے کہ وہ انہیں زیادہ سے زیادہ اسلام دشمنی پر اکساتے ہیں۔ اگر کبھی ان کی مصلحتیں آڑے آنے لگتی ہیں تو یہ انہیں اور بھڑکاتے ہیں تاکہ یہ لوگ اسلام دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔

تاریخ کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا مذکورہ بالا قانون اللہ تعالیٰ کے رسول جیسی عظیم نعمت کی ناقدری کرنے پر حرکت میں آتا ہے اسی طرح مسلمانوں میں بھی اس وقت حرکت میں آتا ہے جب وہ اسلام کی نعمتِ عظمیٰ کی ناقدری کرتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو نافذ کریں، لیکن وہ بجائے نافذ کرنے کے اس کو زندگی کے ایک ایک دائرے سے خارج کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ تو شروع شروع میں تو اللہ تعالیٰ انہیں مختلف تنبیہات سے متنبہ فرماتا ہے، لیکن جب وہ راہِ راست پر نہیں آتے تو پھر اس ملک کے رہنے والوں کی اکثریت کو اسلام کے حقیقی تصور سے بیگانہ کر دیتا ہے اور اسلام کے مخلص اہلِ علم کی کاوشیں ان کیلئے بیکار ثابت ہونے لگتی ہیں۔ وہ اسلام کو ازکار رفتہ دین سمجھنے لگتے ہیں۔ پاکستان میں بھی (اللہ تعالیٰ معاف کرے) ایسی ہی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے مجبور و مقہور مسلمانوں کو محض اپنے فضل و کرم سے پاکستان جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی اور ایک خونخوار اور منہ زور اکثریت سے انہیں محفوظ فرمایا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی تمام تر سازشوں کے باوجود یہ ملک وجود میں آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس وعدے اور نعرے کی لاج رکھی کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ۔ اور ان کے لیڈرانِ کرام کے اس وعدے کو آزمائش کے طور پر قبول کر لیا کہ ہم پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنائیں گے تاکہ اس تجربے کی کامیابی کو دیکھ کر پوری دنیا اسلام کی طرف مائل ہونے پر مجبور ہو جائے۔ لیکن پاکستان بنتے ہی جس طرح ان وعدوں کی مٹی پلید کی گئی اور آہستہ آہستہ اس ملک کا ایک ایک ادارہ اسلام سے آزاد ہوتا گیا، اس کا شاید نتیجہ ہے کہ آج ملک کی اکثریت اسلامی قانون کے نفاذ کو کوئی اہمیت دینے کیلئے تیار نہیں۔ تعلیمی اداروں سے نکلنے والے اسے بے وقت کی راگنی سمجھتے ہیں۔ ملک میں ابھی تک مخلص اور نیک لوگوں کا ایک طبقہ موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اسلامی قانون کے نفاذ کیلئے اپنی ہمت سے بڑھ کر مساعی بروئے کار لا رہا ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون شاید نافذ ہو چکا ہے کہ شیاطین کو اکثریت پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ شاید اسی کا اثر ہے کہ ان پر اسلام کیلئے کی جانے والی کاوشوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ اللہ تعالیٰ کرے میرا یہ احساس غلط ہو اور اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی صورتحال سے محفوظ رکھے۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ...... متذکرہ بالا صورتحال میں نبی کریم ﷺ اپنے ساتھیوں کی قوتِ مدافعت کو دیکھتے ہوئے بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نصرت کیلئے دعائیں مانگتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ان مخالفین کے خلاف جو فیصلہ ہونے والا ہے آپؐ اس میں جلدی نہ کریں۔ آپ تسکین اور اطمینان رکھیں کیونکہ ان کی مخالفت جتنی شدت اختیار کرتی جا رہی ہے اتنی ہی وہ اپنی مصیبت کو قریب لا رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو شاید ہراساں کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور وہ دعوتِ اسلامی

Marfat.com

کا کام چھوڑ دیں گے، لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ ان کی یہ حرکتیں ان کی بربادی کو ان کے قریب کر رہی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے مزید کہا جا رہا ہے کہ ہم ان کے ایک ایک لمحے کو شمار کر رہے ہیں۔ گھڑی کی سوئی اپنے آخری نقطہ پر پہنچنے والی ہے۔ پس جیسے ہی ان کی مہلتِ عمل ختم ہوگی، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ان پر مسلط ہو جائے گا اور وہ اپنی مخالفت اور اسلام دشمنی کی پاداش میں اپنے بدترین انجام کو پہنچ جائیں گے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾

(یاد کرو جس دن ہم پرہیزگاروں کو رحمٰن کے پاس مہمان بنا کر جمع کریں گے۔ ۸۵) اور مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانکیں گے۔ ۸۶)

وَفْدًا کا معنی

وَفْدًا...... وَفَدَ وَفْدًا کے معنی ہیں کہیں عزت واحترام کے ساتھ جانا، جس طرح سفیر اور قاصد بادشاہ اور امیر کے پاس جاتے ہیں۔ مختار الصحاح کے مطابق وفد ان لوگوں کو کہتے ہیں جو بادشاہوں کے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے جاتے ہیں۔ المفردات میں بھی یہی لکھا گیا ہے۔

وِرْدًا کا معنی

وِرْدًا...... وَرَدَ يَرِدُ سے اسم ہے، اس کے معنی گھاٹ پر اترنے کے ہیں، جس طرح پیاسے اونٹ گھاٹ پر جاتے ہیں۔ ورد کا اصل معنی یقیناً پانی کا قصد کرنا ہے۔ لیکن ابنِ عرفہ نے کہا ورد اس قوم کو کہتے ہیں جو پانی پر جاتی ہے۔ اس لئے جو لوگ پانی کی طلب میں پانی پر جاتے ہیں ان کو بھی ورد کہتے ہیں اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جو آدمی یا جانور پانی پر جاتا ہے وہ پیاس ہی کے وقت جاتا ہے۔ اس لئے ورد کا ترجمہ پیاسا بھی کیا جاتا ہے۔

قیامت کے روز مومنوں اور کفار سے ہونے والا سلوک

کفار اور مشرکین کی چیرہ دستیوں اور حد سے بڑھے ہوئے کفر پر اصرار کے ذکر اور مسلمانوں کو ایسی ناگفتہ بہ اور ناقابلِ برداشت صورتحال پر تسلی دینے کے بعد اب ان دونوں گروہوں کے ساتھ قیامت کے دن جو سلوک ہونے والا ہے اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور ہر طرف سے منہ موڑ کر اسی کے راستے پر چلنے والے اور اسی پر سب کچھ قربان کرنے والے ہیں کیونکہ دنیا میں سب سے بڑا دکھ اور اپنے عہدِ وفا کی پاسداری کی سب سے بڑی سزا انہوں نے ہی کفار کے ہاتھوں اٹھائی ہے اور کفار نے صرف ان کو جسمانی اذیتیں ہی نہیں پہنچائیں بلکہ بار بار ان کی غربت اور بے بسی کے طعنوں سے ان کے شیشۂ دل کو مجروح کیا اور ان کی عزتِ نفس پامال کی ہے۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ آج تم جن لوگوں کو حقیر سمجھتے ہو، قیامت کے دن ہم انہیں لوگوں کو اس طرح اپنے حضور بلائیں گے جیسے بادشاہوں کے یہاں معزز مہمان جایا کرتے ہیں۔ مہمان کے اکرام کا حکم ہر چھوٹے بڑے مومن کو دیا گیا ہے۔ اس لئے ہر سطح کا مسلمان اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنے مہمان کی تواضع کرتا ہے۔ کیا کہنے ہیں اس مہمان کے جو خالقِ کائنات اور شہنشاہِ ارض وسما کا مہمان

Marfat.com

ہو۔اس کی جیسی کچھ آؤ بھگت ہوگی اور جیسی کچھ عزت افزائی کی جائے گی اور جس طرح اس پر نعمتیں نچھاور ہوں گی،اس دنیا میں تو اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔البتہ اس کے ذکر سے جو ایک سرشاری کی کیفیت اور مسرت وشادمانی کی لہر دل میں اٹھتی ہے وہ بھی مسلمان کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے بعد کفار کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اپنے آپ کو اس دنیا کی عزتوں کا مالک سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ اس دنیا کی نیک نامیاں اور عزت افزائیاں شاید انہیں کے گھر کی لونڈی ہیں۔ان کے بارے میں فرمایا کہ ہم انہیں قیامت کے دن اس طرح لائیں گے کہ فرشتے انہیں جہنم کی طرف ہانک رہے ہوں گے اور ان کی حالت ایک پیاسے اونٹ کی ہوگی جو پیاس سے بیتاب ہو کر پانی کی طرف دیوانہ وار بڑھتا ہے لیکن بجائے پانی ملنے کے جہنم کی آگ اس کا استقبال کرتی ہے۔کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت ان کی بے سروسامانی اور بے بسی کا عالم کیا ہوگا۔ وہ پانی کے ایک ایک گھونٹ کو ترس رہے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کی پیاس کی شدت کو اور بھڑکا رہے ہوں گے۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾

(لوگ شفاعت وسفارش کا اختیار نہیں رکھتے مگر جس نے لے لیا ہے رحمٰن سے وعدہ۔ ۸۷)

عَهْدًا کا مفہوم

قیامت کے دن کفار اور مشرکین جب جہنم کی طرف ہانکے جا رہے ہوں گے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہوگا تو وہ شدید تمنا کریں گے کہ کاش آج ہمیں کوئی بچانے والا ہوتا۔وہ جن فرشتوں اور جنات کو اس لئے پکارتے رہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے رہے کہ وہ قیامت کے دن ان کی سفارش کریں گے، وہ دیکھیں گے آج ان کی کوئی سفارش کرنے کی جرأت نہیں کر رہا، کیونکہ آج اگر کسی کے حق میں شفاعت ہوسکتی ہے تو وہ، وہ شخص ہے جس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے لیا ہے۔اسی طرح اگر کوئی سفارش کی جرأت کرسکتا ہے تو وہ بھی وہ شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے عہد لے لیا ہے۔کیونکہ اتَّخَذ کے لفظ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ وہ کون شخص ہے۔جس نے اللہ تعالیٰ سے عہد لیا ہے۔اس کے بارے میں امام ابن جریر نے کہا کہ عہد سے مراد اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا،اس کے رسول کی تصدیق کرنا اور رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو کچھ لے کر آئے ہیں،اس کا اقرار کرنا اور جو کچھ آپؐ نے حکم دیا،اس پر عمل کرنا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہؓ سے یہ بیان کرتے ہوئے سنا، کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات سے عاجز ہے کہ وہ ہر صبح اور شام اللہ تعالیٰ سے عہد لے۔صحابہؓ نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ وہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ ہر صبح و شام کو یہ کہے ''اے اللہ! آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے،غیب اور شہادت کو جاننے والے، میں تیری طرف اس دنیا کی زندگی میں یہ عہد کرتا ہوں کہ میں یہ شہادت دوں گا کہ تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، تو واحد ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں اور بیشک محمد (ﷺ) تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں۔تو مجھے میرے نفس کی طرف نہ سونپ دینا، کیونکہ اگر تو نے مجھے میرے نفس کی طرف سونپ دیا تو وہ مجھے خیر سے دور اور شر کے قریب کر دے گا اور میں تیری رحمت کے سوا اور کسی چیز پر اعتماد نہیں کرتا۔تو میرے لئے اپنے پاس عہد کر لے جس کو تو قیامت کے دن پورا کرے گا، بیشک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔'' پس جب وہ یہ کلمات پڑھ لے گا تو اللہ تعالیٰ ان کلمات پر مہر لگا کر ان کو عرش کے نیچے رکھ دے گا اور جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی یہ ندا کرے گا، کہاں ہیں وہ لوگ جن کا اللہ تعالیٰ کے پاس عہد ہے۔پھر وہ لوگ کھڑے ہو جائیں گے

Marfat.com

اور جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ (المعجم الکبیر رقم الحدیث ۸۹۱۷، المستدرک رقم الحدیث ۳۴۱۸)

شفاعت کا مفہوم

شفاعت سے متعلق قرآن وسنت سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ شفاعت کا مقام انبیائے کرام، شہدائے عظام، اولیائے امت اور چھوٹی عمر میں انتقال کر جانے والے اور نیک لوگوں کو نصیب ہوگا۔ شفاعتِ کبریٰ پر صرف نبی کریم ﷺ فائز ہوں گے۔

شفاعت کیلئے کوئی شخص بھی پیش قدمی نہیں کر سکے گا، صرف وہ شخص شفاعت کرے گا جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملے گی۔

اسی طرح شفاعت ان کیلئے کی جائے گی جن کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت عنایت ہوگی۔

قرآن وسنت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کی اجازت ان لوگوں کیلئے دی جائے گی جنہوں نے زندگی ایمان کے ساتھ اور شرعی احکام کے مطابق گزاری ہوگی۔ اس کے باوجود ان سے جو کوتاہیاں رہ جائیں گی اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ان کی بخشش کیلئے اپنے بندوں میں سے کسی کو شفاعت کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو محض اس لئے شریعت کے احکام کو پامال کرتے اور بدعملی کو اپنا رویہ بنا لیتے ہیں کہ قیامت کے دن ہمیں رسول اللہ ﷺ یا اولیائے کرام کی شفاعت میسر آئے گی اور ہم ان تمام کمزوریوں کی سزا سے بچ جائیں گے۔ فرائض اور حقوق کی بازپرس ساقط ہو جائے گی اور محض شفاعت کے باعث ہمیں جنت میں بھیج دیا جائے گا اور کبھی یہ سہارا انہیں اللہ تعالیٰ سے بغاوت پر اکساتا اور جرأت دیتا ہے۔ ایسے لوگ یقیناً کسی بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے کی شفاعت کی عزت نہیں پا سکیں گے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾

(اور وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد بنا رکھی ہے۔ ۸۸)

انسان کی کمزوری

انسان کی ہمیشہ سے یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ ہر ایسی بات کو قبول کرنے سے پہلوتہی کرتا رہا ہے جس سے اس کی زندگی میں صالح تبدیلی کا راستہ کھلتا ہو۔ انسان کو ہمیشہ اپنی خواہشات کی پیروی میں زندگی گزارنا محبوب معلوم ہوتا ہے اور ایسے راستے پر چلنا جس میں ایمان و کردار کی پختگی اور ایثار وقربانی کا رویہ اختیار کرنا پڑے بوجھل معلوم ہوتا ہے۔ وہ حیوانوں کی طرح یہ چاہتا ہے کہ میں زندگی اس طرح گزاروں جس طرح میرا نفس چاہتا ہے اور جس میں میرے سفلی جذبات کو تسکین ملتی ہے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہر دور کے اچھے اور سچے انسان ہمیشہ ایک ایسی روش کی طرف بلاتے رہے ہیں جس میں اپنی بہت ساری مرضیات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی مرضی کو اختیار کرنا پڑتا ہے، تو بجائے اس کے کہ وہ اس بات کو اختیار کر لے یا بالکل انکار کر دے وہ بیچ کا راستہ اختیار کرتا ہے کہ جس سے ان سچے لوگوں کی دی ہوئی صداقتوں سے یکسر منہ پھیرنے کی نوبت بھی نہ آئے اور اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کا سامان بھی ہوتا رہے۔ چنانچہ اس نے ہمیشہ اس کیلئے کبھی شفاعتِ باطلہ کا راستہ نکالا جس کی تردید گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہو چکی ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد تجویز کی تاکہ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی بازپرس اور اس کے عتاب سے بچا جا سکے۔ چنانچہ انسان کی اسی کمزوری اور سہولت پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے رحمٰن کیلئے اولاد کا تصور اختراع کیا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ رحمٰن دنیا کا نظام اکیلا کیسے

Marfat.com

چلاسکتا تھا اس نے اپنی مدد کیلئے اپنی اولاد بھی بنا رکھی ہے۔ چنانچہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور اس کی قدرت میں شریک ٹھہرایا اور مشرکینِ عرب نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا۔

ولد کا معنی

یہ بات یاد رہے کہ ولد کا لفظ واحد جمع مذکر مونث سب کیلئے آتا ہے۔ اس لئے اس کا معنی صرف بیٹا نہیں بلکہ اولاد ہے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ کے مفہوم میں جس طرح اہلِ کتاب کے بنائے ہوئے بیٹوں کا ذکر ہے اسی طرح مشرکینِ عرب کے عقیدے کے مطابق بیٹیوں کا ذکر بھی ہے۔ ان تمام قوموں نے اپنی بداعمالیوں اور بداطواریوں سے بچنے کیلئے ایک شارٹ کٹ نکالا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد بنا ڈالی اور اپنے تئیں یہ سمجھ کر مطمئن ہوگئے کہ اولاً تو خدا کے سامنے حاضری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر بفرض محال حاضری ہوئی بھی تو اللہ تعالیٰ کی اولاد ہمیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچالے گی۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾

(یقیناً تم نے ایک سخت معیوب بات کہی ہے۔ ۸۹) قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں۔ ۹۰) کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔ ۹۱)

اِدًّا...... اَیْ مُنْكَرًا عَظِيْمًا یعنی سخت معیوب اور قبیح چیز۔ جوہری نے کہا الادّم و الادّة ۔ الدَّاهِيَةُ وَالْاَمْرُ الْفَظِيْعُ (قرطبی)

هَدًّا ......اس کا معنی کسی دیوار وغیرہ کے دھماکے کے ساتھ گرنے کے ہیں۔

اسلوبِ کلام کی تبدیلی

پہلی آیت میں سب سے پہلی بات جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اسلوبِ کلام کی تبدیلی ہے۔ سابقہ آیتِ کریمہ میں بات غائب کے صیغے سے کہی گئی ہے اور اس آیت میں صیغہ خطاب استعمال ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے تو گمراہ اور مشرک قوموں کے طرزِ عمل کا ذکر فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ ان بدبختوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد بنا رکھی ہے اور اس کا انتساب پروردگار کی طرف کیا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ دریدہ دہنی کے ساتھ ساتھ حد سے بڑھی ہوئی جسارت ہے کہ اپنی گمراہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا ہے اور دوسرا ان کی گمراہیوں کا اصل سبب ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایسی باتوں کا تذکرہ بھی نہایت پرجلال انداز میں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے نہایت مثبت اور پرسکون انداز میں ان کی گمراہی کا تذکرہ کیا۔ لیکن پھر یکلخت شدتِ غضب میں جن لوگوں کا غائب سے تذکرہ کیا جا رہا تھا ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ بدبختو، تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی جو نسبت کی ہے یہ کتنی بڑی بات ہے۔ اس سے زیادہ مکروہ، معیوب اور بے ہودہ بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو اتنی بڑی بات ہے کہ تم انسانوں کو تو شاید اس کا اندازہ نہیں لیکن باقی کائنات کیلئے تو اس بات کا برداشت کرنا آسان نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انہیں اسے برداشت کرنے کا حکم نہ دیتا اور پھر ساتھ ہی اس کی طاقت عطا نہ کرتا تو قریب تھا کہ آسمان پھٹ جاتے، زمین

Marfat.com

شق ہوجاتی اور پہاڑ ایک دھماکے سے گر جاتے جبکہ انسان کے دل کا پھٹ جانا اور اس پر موت واقع ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ لیکن زمین و آسمان کا پھٹ جانا اور پہاڑوں کا گر جانا ایک بہت بڑی بات ہے۔ لیکن پروردگار فرماتے ہیں کہ یہ ساری مخلوقات چونکہ ہمارے حکم کے تابع ہیں اس لئے انہوں نے جیسے کیسے اس ظلم کو برداشت کیا، ورنہ ان پر جو گزری ہے اس کا نتیجہ لازماً یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنی حیثیتِ عرفی کھودیتے۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ یہ اندازِ بیان سراسر مجاز ہے، محاوراتی انداز میں یہ بات کہہ دی گئی ہے ورنہ حقیقت میں زمین و آسمان کا پھٹنا مراد نہیں۔ اس لئے کہ زمین، آسمان اور پہاڑ یہ سب از قسمِ جمادات ہیں جن میں نہ روح ہے نہ شعور۔ تو ان کا صدمے سے پھٹ جانے کا کیا معنی؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندر روح یا شعور ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیسا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ لیکن قرآن و سنت سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ چٹانیں اللہ تعالیٰ کے خوف سے پھٹ جاتی ہیں اور بعض دفعہ بڑے بڑے پتھر اللہ تعالیٰ کے خوف سے لڑھک جاتے ہیں۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال سے تأثر ضرور رکھا گیا ہے۔ وہ پروردگار کی عظمت و جلال کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اس لئے یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ جس پروردگار کو وہ خالقِ کائنات، مالکِ ارض وسما اور مدبرِ کائنات سمجھتے ہیں اس کے بارے میں وہ یہ ہرزہ سرائی کیسے گوارا کرسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد بھی ہے جو یقیناً اس کی شریک و سہیم بھی ہوگی کیونکہ یہ تصور اس کے قدیم وازلی اور حی قیوم ہونے کے سراسر خلاف ہے۔ مزید برآں یہ بھی کہ پدری و فرزندی کا رشتہ حدوث واحتیاج کا لازمہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ قدیمہ اور قائمہ کی ضد ہے۔

اللہ تعالیٰ کی غیرت کو چیلنج

اللہ تعالیٰ کیلئے کسی کو ہمسر اور کفو قرار دینا اس کی یکتائی کو بٹہ لگانا اور اللہ تعالیٰ کی غیرت کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ اور یہ بات سامنے کی ہے کہ جس بات پر اللہ تعالیٰ کی غیرت بھڑکتی ہے اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کی دیگر مخلوقات کی غیرت بھی اس پر جوش میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حلم اور اس کی بردباری اس کے غضب اور جلال پر غالب آجاتی ہے تو کفار اور مشرک بسا اوقات دنیا میں اس کے غضب سے بچے رہتے ہیں۔ لیکن اس کی مخلوقات بالخصوص زمین و آسمان اور پہاڑ یقیناً اپنے اوپر وہ قابو نہیں رکھتے۔ اس لئے قریب ہے کہ وہ ایسی باتوں پر پھٹ جائیں اور گر جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم انہیں بے قابو نہیں ہونے دیتا بلکہ ان کی باگیں کھینچ کر رکھتا ہے۔ اس لئے وہ چاہتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کیخلاف کوئی اقدام نہیں کرسکتے۔

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔ اس آیتِ کریمہ میں مزید وضاحت فرمادی کہ زمین و آسمان اور پہاڑوں کے غیض و غضب کو پروردگار نے جو بیان فرمایا ہے اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوگوں نے اللہ تعالیٰ پر اولاد کی تہمت لگائی ہے اور اسی سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کیلئے اولاد ثابت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ اسی وجہ سے اس نے بار دگر اس کو کھول کر بیان فرمایا ہے۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

(اور یہ بات خدا کے شایاں نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنالے۔ ۹۲)

ایک آسان دلیل

اس آیتِ کریمہ میں نہایت سہل انداز میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے حوالے سے ان گمراہ لوگوں کی تردید فرمائی گئی ہے جنہوں نے

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی اولاد بنا رکھی ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کو اولاد کی ضرورت کیا ہے؟ اولاد کی ضرورت کسی نہ کسی احتیاج کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر احتیاج سے پاک ہے یا یہ خواہش ہوتی ہے کہ میری اولاد بڑھاپے میں میری لاٹھی بنے۔ اللہ تعالیٰ پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ کبھی یہ سوچا جاتا ہے کہ بعد میں میرا نام لینے والا کون ہوگا؟ اللہ تعالیٰ پر کبھی موت طاری نہیں ہوگی کہ کبھی ایسا زمانہ آئے جب وہ نہ ہو، کبھی اپنے کاموں کی بجا آوری میں کسی شریک اور معاون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ اکیلے وہ کام کیے نہیں جاسکتے اور اللہ تعالیٰ کو ایسی کوئی ضرورت لاحق نہیں کیونکہ وہ پوری کائنات کے نظام کو چلانے کیلئے یکہ اور تنہا کافی ہے۔ یہی کچھ احتیاجات ہیں جو کسی کو اپنے جانشین کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات حی و قیوم ہے، قدیم، ازلی اور ابدی ہے۔ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو ''کن'' کہتا ہے تو وہ چیز وجود میں آجاتی ہے، تو اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنی اولاد بنائے جو سراسر اس کی ذات کیلئے ایک دھبے کے سوا کچھ نہیں۔

ایک نکتہ

ان آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیلئے رحمٰن کا اسمِ گرامی بار بار استعمال ہوا ہے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نام کے لانے سے عیسائیوں کے عقیدہ ''کفارہ'' کا ابطال مقصود ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان چونکہ پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے، اس کے گناہوں کی بخشش کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو اپنا بیٹا بنایا اور اسے انسانوں کے گناہوں کے کفارے کیلئے سولی پر چڑھایا گیا۔ اس طرح انسان کی نجات کا ایک راستہ نکلا۔ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ رحمٰن ہے تو اسے گنہگار انسانوں کو بخشنے کیلئے اس امر کی حاجت نہیں کہ اس کا ایک بیٹا ہو اور اس معصوم اور بے گناہ کو دنیا بھر کے بدکاروں اور سیاہ کاروں کی پاداش میں سولی چڑھایا جائے۔ وہ رحمٰن ہے، اس کی رحمت کا دامن بڑا وسیع ہے۔ لوگوں کی بخشش کیلئے اس کی رحمت کافی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی صفتِ رحمت کے ساتھ ساتھ چونکہ اس کی ایک صفت عدالت بھی ہے تو انسانوں کی فلاح و نجات کیلئے اس کی دونوں صفات کا ظہور ہوا ہے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾

(آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدائے رحمٰن کے حضور بندے ہی کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔ ۹۳)

اللہ تعالیٰ کی اولاد نہ ہونے کی ایک دلیل

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی اولاد نہ ہونے کی ایک اور عجیب دلیل بیان فرمائی گئی ہے، وہ یہ کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے حضور سب انسان حاضر ہوں گے تو ظاہر ہے کہ ان انسانوں میں مختلف مقام و مرتبہ کے حامل لوگ ہوں گے۔ ان میں انبیائے کرام بھی ہوں گے، شہدائے عظام بھی، صدیقین بھی ہوں گے اور صالحین بھی۔ عباد و زہاد بھی ہوں اور فساق و فجار بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور سب ایک ہی حیثیت میں حاضر ہوں گے، وہ حیثیت ہے ان کے بندہ ہونے کی۔ بندہ ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہوں گے۔ البتہ اپنے کمالات میں فرق کی وجہ سے اجر و ثواب اور تقرب میں ضرور فرق سے نوازے جائیں گے۔ لیکن ان میں کوئی ایسا نہیں ہوگا جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ وہ بلندیِ درجات کے باعث بندہ ہونے کی صفت سے نکل گیا ہے اور اب اس میں خدائی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب خدائے رحمٰن کے حضور حاضر ہونے والے سب بندے ہوں گے تو پھر وہاں کوئی خدا کی اولاد کیسے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ بیٹا

Marfat.com

توبندہ اور غلام نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے باپ کا جز اور سِر ہوتا ہے اور جبکہ قیامت میں ہر شخص بندگی کی تصویر بنے اس کے حضور حاضر ہوگا۔

لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾

(اللہ تعالیٰ نے سب کا احاطہ کر رکھا ہے اور اچھی طرح گن رکھا ہے۔ ۹۴) اور ان میں سے ہر ایک اس کے حضور قیامت کے دن یکہ وتنہا حاضر ہوگا۔ ۹۵)

بدگمانی کا ازالہ

کفار اور مشرکین کی بے بسی کو واضح کرنے کیلئے ارشاد فرمایا کہ جب کفار کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور لایا جائے گا تو یہ گمان نہ کیا جائے کہ یہ بے ہنگم بھیڑ کی شکل میں لائے جائیں گے اور اس بات کا کوئی امکان ہوگا کہ ان میں سے کوئی اگر کھسکنا یا بھاگنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، نہیں۔ ان میں سے ہر شخص پوری طرح اللہ تعالیٰ کے حصار میں ہوگا۔ اس نے سب کا احاطہ کر رکھا ہوگا، کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ وہ اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر ہو سکے اور سب کو شمار کر کے لایا جائے گا اور ان کی نگرانی اتنی مکمل ہوگی کہ شمار وقطار میں کوئی کمی نہیں آسکے گی اور مزید یہ کہ آج جبکہ یہ اپنے جتھے بنائے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید یہ اپنے جتھوں سمیت اٹھائے جائیں گے، ہرگز نہیں، یہ ہمارے حضور یکہ وتنہا لائے جائیں گے۔ نہ ان کی اولاد ان کے ساتھ ہوگی، نہ ان کے اعوان وانصار ان کے ہمراہ ہوں گے۔ نہ ان کے شرکاء وشفعاء کہیں دکھائی دیں گے۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور ہر شخص اپنی فکر میں غلطاں و پریشاں ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

(بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے عنقریب ان کیلئے خدائے رحمٰن مہر ومحبت پیدا کر دے گا۔ ۹۶)

آیت کی وضاحت دو حوالوں سے

اس آیتِ کریمہ کی وضاحت دو حوالوں سے کی جاسکتی ہے اور اس عاجز کے خیال میں ان میں سے کوئی بھی غلط نہیں۔ ایک حوالہ تو یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور معاشرتی بے کسی کا مذاق اڑاتے ہوئے ہمیشہ مسلمانوں پر طنز توڑتے تھے اور جیسے ہی کوئی غریب مسلمان ان کے قریب سے گزرتا جس کا لباس بوسیدہ، جوتے دریدہ اور جسم فاقہ زدہ ہوتا تو عمائدینِ قریش اپنے ساتھیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہتے کہ دیکھئے صاحب یہ لوگ ہیں جو قیصر وکسریٰ پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ انہیں زعم یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن عجم ان کے سامنے جھک جائے گا اور عرب کے مالک ہو جائیں گے۔ اور کبھی یہ کہتے کہ ان بیچاروں کو دنیا میں پوچھتا کوئی نہیں۔ تو یہ اپنی محرومیوں کے مداوے کیلئے آخرت کی نعمتوں کے تذکرے سے اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ ان کے جواب میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ یہ حالت دیر تک رہنے والی نہیں ہے۔ تمہاری خوشحالیاں اور تمہاری سیادتیں عنقریب دم توڑنے والی ہیں اور یہ بے بس اور بے کس مسلمان بہت جلد لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے والے ہیں۔ ان کے اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ یقیناً لوگوں میں نفوذ پیدا کریں گے اور جیسے ہی لوگوں کو ان کے قریب آنے کا موقع ملا تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ اس دھرتی کا اصل سرمایہ تو یہی لوگ ہیں۔ ان کی خدا خوفی اور ان کا اخلاص ان کی دیانت وامانت اور انسانیت سے

Marfat.com

ان کی گہری ہمدردی بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف کھینچے گی۔ آج کی تنی ہوئی گردنیں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کے اخلاق اور حقانیت کے سامنے جھکتی چلی جائیں گی۔ غلط پروپیگنڈا اور بدگمانیاں دیر تک اپنا اثر باقی نہیں رکھ سکتیں۔ جو آج مسلمانوں کو بے کسی اور بے بسی کی تصویر دیکھ رہے ہیں جب انہیں ان کے اندر کا انسان نظر آئے گا تو وہ محسوس کریں گے کہ یہ لوگ تو انسانیت کا چراغ اور اقدارِ انسانیت کی تصویر ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی بعثتِ مبارکہ کے انیس سال کے بعد عمرہ کرنے مکہ معظمہ تشریف لائے تو آپ ؐ کے ساتھ صرف پندرہ سو صحابہ کرامؓ تھے جو آپ کی انیس سالہ انتھک مخلصانہ مساعی کا نتیجہ تھے۔ لیکن جب حدیبیہ کے معاہدے کے دو سال بعد آپ ؐ نے مکہ پر یلغار کی تو آپ ؐ کے ہمراہ دس ہزار نفوسِ قدسیہ تھے اور جب ایک ڈیڑھ سال کے بعد آپ ؐ نے تبوک کا رخ کیا تو آپ کی معیت میں تیس ہزار کا لشکرِ جرار تھا اور جب آپ ؐ نے خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا تو آپ ؐ کے سامنے تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ حاضر تھے۔ یہ سب کچھ اس آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمائی گئی پیشگوئی کی تعبیر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں مسلمانوں کیلئے ایسی مہر و محبت پیدا کی کہ وہ جدھر بھی گئے لوگوں نے ان کے سامنے آنکھیں بچھائیں۔ مفسدین نے اگرچہ فساد اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن سادہ دل عوام نے مسلمانوں کے سامنے دیدہ و دل فرشِ راہ کردیئے۔

دوسرا حوالہ یہ ہے کہ کافر آج مسلمانوں کی کسمپرسی اور بے بسی پر پھولے نہیں سماتے، لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اس دنیا کی ایک دن صف لپیٹی جانے والی ہے، پھر سب لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوں گے، وہاں کفار کے ساتھ جو گزرے گی گزشتہ آیات میں ہم اس کا تذکرہ پڑھ چکے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ جو عزت افزائی اور کرم فرمائی کا سلوک ہونے والا ہے وہ یہ کافر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ آج کے غریب اور بے کس کل کے تخت نشین ہوں گے۔ ان کیلئے خیر مقدمی ترانے گائے جائیں گے۔ ہر طرف سلام و تحیت کی آوازیں آئیں گی۔ اللہ رب العلمین کی طرف سے بھی ان کو سلام کہا جائے گا۔ خود اہلِ جنت بھی نہایت خوشی اور تشکر کے جذبات سے ایک دوسرے کو سلام کہیں گے۔ چاروں طرف مبارک سلامت کا شور ہوگا، تب کفار کو اندازہ ہوگا کہ ہم دنیا میں جنہیں کمزور اور ذلیل سمجھتے تھے۔ آج عزتیں انہیں کے قدموں پر نثار ہو رہی ہیں۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

(پس ہم نے اس قرآنِ کریم کو آپ ؐ کی زبان میں آسان کردیا ہے تاکہ آپ ؐ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو بشارت دیں اور جھگڑالو قوم کو انذار کریں۔ ۹۷)

یَسَّرْنٰهُ ...... میں ضمیر کا مرجع قرآنِ کریم ہے کیونکہ بِلِسَانِكَ اس پر قرینہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کے منصبی فرائض قرآنِ کریم نے شمار کیے ہیں ان میں پہلا فرض قرآنِ کریم لوگوں کو پڑھ کر سنانا ہے اور اس کی تبلیغ اور دعوت دینی ہے۔ اور یہ کام زبان کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ آپ ؐ کی زبان پر اس کو ہم نے آسان کردیا ہے جس کا پڑھ کے سنانا اور جس کی تبلیغ و دعوت آپ ؐ پر فرض ہے تو یقیناً اس سے مراد قرآنِ کریم کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

Marfat.com

تیسیر کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ہم نے اس قرآنِ کریم کو آسان کردیا ہے۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ شاید قرآنِ کریم کو سمجھنے کیلئے کسی غور وتدبر کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو یقیناً اللہ تعالیٰ نے آسان بنایا ہے۔ یعنی اس میں وہ پیچیدگیاں نہیں رکھیں جو عام طور پر ایسی کتاب میں ہوسکتی ہیں جس کا موضوع انسان ہو اور جو انسان کو ایک ضابطۂ حیات مہیا کررہی ہو اور انسان کی قانونی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیاتی، معاملاتی، اخلاقی، تمدنی، تہذیبی، ناسوتی، لاہوتی اور اخروی غرضیکہ انسان کی ہر ضرورت کو زیرِ بحث لاتی، محاکمہ کرتی اور حرفِ آخر کہتی ہو۔ قرآنِ کریم نے ان میں سے ہر بات اس طرح کہی ہے کہ وہ انسانی فطرت کی آواز معلوم ہوتی ہے اور اتنے دلنشیں انداز میں کہی ہے کہ سننے والا اس سے اکتاہٹ محسوس کرنے کی بجائے اپنایت محسوس کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے بعض مباحث یقیناً علماء کے سمجھنے کے ہیں۔ لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ عوام کو اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا گیا۔ مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ پروردگار نے قرآنِ کریم کو نصیحت کیلئے آسان قرار دیا ہے، ہر پہلو سے نہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ تیسیر کا وہ مفہوم نہیں جو تسہیل سے ذہن میں آتا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کی مراد، نصب العین اور مقصد کو سامنے رکھ کر تمام لوازم سے آراستہ کرکے نہایت موزوں اور سازگار بنایا جائے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو تیسیر کے نقطۂ نگاہ سے بھی قرآنِ کریم اپنی مثال آپ ہے۔ پھر اس تیسیر کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسے عربی زبان میں اتارا گیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی زبان عربی تھی تاکہ اسے آپ آسانی سے سمجھ سکیں اور اگر لوگ اسے سمجھنا چاہیں تو آپؐ انہیں آسانی سے سمجھا سکیں اور مزید یہ کہ انسانی اصلاح کے دو ہی طریقے ہیں، ترغیب یا ترہیب۔ قرآنِ کریم میں ان دونوں طریقوں کے حوالے سے متقین کیلئے بشارتیں رکھی گئیں اور کافروں کو ان کے برے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس میں آنحضرت ﷺ کیلئے ایک تسلی بھی ہے کہ آپؐ کی تمام تر کاوشوں کے باوجود اگر کچھ لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں تو آپؐ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آپؐ کی ذمہ داری انہیں قائل کرنا اور جبراً صاحبِ ایمان بنانا نہیں ہے بلکہ آپؐ کا کام تو یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں انہیں ان کی کامیابی اور کامرانی کی خوشخبری سنادیں۔ اور جو لوگ آپؐ کی بات قبول کرنے کی بجائے لڑتے جھگڑتے اور کج بحثی سے کام لیتے ہیں اور ہر وقت مخالفت پر تلے رہتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خبردار کردیں۔

لُدًّا اَلَدُّ کی جمع ہے۔ اَلَدُّ کا معنی جھگڑالو، ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ اہلِ عرب اپنی بدویت کی وجہ سے اکھڑ تو تھے ہی، اپنی امیت اور اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے اپنے خیالات اور جاہلی طور اطوار میں بہت متعصب اور جامد تھے۔ اسی وجہ سے نہ وہ قرآنِ کریم کو سننے کے روادار ہوتے تھے، نہ حضرت نبی کریم ﷺ کی خیرخواہانہ تبلیغی مساعی ان پر اثرانداز ہوتی تھیں بلکہ وہ ہر ممکن طریقے سے آپؐ کو پریشان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۭ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۹۸

(اور کتنی ہی قوموں کو ان سے پہلے ہم نے ہلاک کردیا، کیا آپ ان میں سے کسی کی (موجودگی) محسوس کرتے ہیں یا آپ

Marfat.com

ان کی بھنک سنتے ہیں؟ ۹۸)

کافروں کے انجام پر سابقہ امتوں سے استشہاد

اے پیغمبر! آپ ؐ کا کام تبشیر وانذار ہے۔ جو لوگ آپ ؐ کی دعوت کو قبول کر کے آپ ؐ کے راستے پر چل کر اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور پھر اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر کرتے ہیں تو آپ ؐ انہیں وہ بشارتیں پہنچا دیجئے جو قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کیلئے دی ہیں یا ان کا آپ ؐ کے دل پر نزول ہوتا رہتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو آپ ؐ کی تبلیغی مساعی کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے اور آپ ؐ کی ہمدردی اور اخلاص کو کوئی وزن دینے کیلئے تیار نہیں۔ اور آپ ؐ جس طرح خونِ جگر پی پی کر اللہ تعالیٰ کا کلام انہیں سناتے اور سمجھاتے ہیں اور وہ اسے سننے کے بھی روادار نہیں تو آپ ؐ کو ان کی روش سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہر دور میں ایسے لوگ گزرے ہیں جن میں کچھ راہِ حق پر چلنے والے ہوتے ہیں اور کچھ اس راستے کے دشمن ہوتے ہیں۔ دشمنوں نے نہ اس سے پہلے آوازۂ حق کو برداشت کیا ہے نہ وہ آج کریں گے۔ وہ پہلے بھی اپنے جرم کی پاداش میں تباہ ہو چکے ہیں۔ آج یہ لوگ بھی اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پہلے جو لوگ ہلاک ہو چکے انہیں زمین کی مٹی کھا گئی تاریخ میں وہ عبرت کا نشان ہیں۔ آپ ؐ اگر ان کے کھنڈرات میں گھومتے ہوئے ان کی بو باس کو محسوس کرنا چاہیں تو نہیں کر سکیں گے۔ وہ دنیا کیلئے فتنہ ساماں قومیں تھیں، لیکن آج تاریخ میں ان کی بھنک بھی سنائی نہیں دیتی۔ یہی حال ان کا بھی ہونے والا ہے، لیکن نہ اس سے پہلے لوگوں نے کبھی تاریخ سے عبرت حاصل کی تھی اور نہ یہ لوگ کریں گے۔ آپ ؐ انہیں ان کے انجام کے سپرد کر دیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ طٰهٰ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوۡرَۃُ طٰـہٰ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نام:۔

اس سورۃ کا نام طٰـہٰ ہے۔اسی کلمے سے سورۃ کا آغاز ہوا ہے۔یہ سورت مکی ہے اور مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔اس میں 8 رکوع ہیں۔اس کی آیتوں کی تعداد 135 ہے۔یہ 1641 کلمات اور 5242 حروف پر مشتمل ہے۔

زمانۂ نزول:۔

اس سورت کا زمانۂ نزول سورۂ مریم کے زمانے کے قریب ہی کا ہے۔ممکن ہے یہ ہجرتِ حبشہ کے زمانے میں یا اس کے بعد نازل ہوئی ہو۔لیکن یہ بات قریب قریب یقینی ہے کہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام سے پہلے یہ سورۃ نازل ہو چکی تھی۔

حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام سے متعلق ایک سے زیادہ روایات احادیث میں ملتی ہیں لیکن ان میں سب سے مشہور اور معتبر روایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ نہایت اشتعال کی حالت میں آنحضرت ﷺ کے قتل کی نیت سے گھر سے نکلے۔بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی۔راستے میں ایک شخص جس کا نام نعیمؓ بن عبداللہ تھا اور جس کا تعلق حضرت عمرؓ ہی کے خاندان سے تھا اس کی حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی۔حضرت عمرؓ کو غیر معمولی غیض وغضب میں دیکھ کر پوچھا کہ خیریت تو ہے، کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں آج اس خرخشے کو ختم کرنے کیلئے نکلا ہوں جس نے شہر بھر میں پریشان کن صورت پیدا کر دی ہے۔قومی شیرازہ منتشر ہو رہا ہے، گھر گھر میں لڑائی برپا ہے، باپ بیٹے سے الجھ رہا ہے اور بیٹا باپ سے اور ماں بیٹی سے پریشان ہے اور بیٹی اپنی ماں سے۔میں چاہتا ہوں کہ جس شخص کی وجہ سے ہمارے شہر میں یہ انتشار برپا ہے اسے ختم کر دوں تاکہ اپنی قوم کو انتشار سے بچایا جا سکے۔حضرت نعیمؓ بن عبداللہ نے کہا کہ آپؓ اس شخص کو ختم تو بعد میں کریں پہلے اپنے گھر کی خبر تو لیں۔کچھ معلوم بھی ہے کہ آپ کی بہن اور بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں۔یہ سن کر حضرت عمرؓ کے غیض وغضب میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔آپؓ بجائے نبی کریم ﷺ کو تلاش کرنے کے، پاؤں پٹختے ہوئے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔طبیعت کے اشتعال کے تحت زور زور سے دروازے پر دستک دی۔بہن نے قرائن سے اندازہ کر لیا کہ دروازے پر میرے بھائی کے سوا اور کوئی نہیں۔انہوں نے اپنے شوہر اور حضرت خبابؓ کو بتایا تو حضرت خبابؓ تو فوراً عقبی کمرے میں چھپ گئے اور بہنوئی حضرت سعید بن زید نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھتے ہی پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے تھے، میں آواز سن چکا ہوں۔بہنوئی نے ٹالنے کی کوشش کی تو حضرت عمرؓ نے انہیں مارنا شروع کر دیا۔بہن بچانے کیلئے آگے بڑھیں تو آپؓ نے بہن کو بھی مارا۔یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔جب انہوں

Marfat.com

نے دیکھا کہ عمرؓ کا غضب بڑھتا ہی جا رہا ہے تو دونوں نے نہایت جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ عمرؓ تم سے جو کچھ ہو سکے کر لو، ہم تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ حفیظ نے اس کو شعر کا جامہ پہناتے ہوئے کہا:

بہن بولی عمرؓ ہم کو اگر تو مار بھی ڈالے
شکنجوں میں کسے یا بوٹیاں کتوں سے نچوا لے
مگر ہم اپنے دینِ حق سے ہرگز پھر نہیں سکتے
بلندی معرفت کی مل گئی ہے گر نہیں سکتے

حضرت عمرؓ جو بہن کے سر سے بہتا ہوا خون دیکھ کر پہلے ہی پشیمان ہو چکے تھے اپنی بہن کی بے باکی اور جرأت دیکھ کر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ بہن کہ بھائی کے قدموں کی چاپ سے جس کی جان ہوا ہو جاتی تھی، آج وہ اپنے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس جرأت سے بات کر رہی ہے۔ اس حیرانی اور پشیمانی میں کہنے لگے کہ لاؤ مجھے بھی وہ چیز دکھاؤ جو تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ بہن کو اندیشہ ہوا کہ کہیں عمرؓ غصے میں پھاڑ نہ ڈالیں۔ اس لئے پہلے قسم لی کہ آپؓ اس صحیفے کو پھاڑیں گے نہیں اور پھر کہا کہ وہ ایک پاکیزہ صحیفہ ہے، آپؓ کا جسم ناپاک ہے، آپؓ اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے، اس لئے پہلے غسل کریں۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا، پھر وہ صحیفہ لے کر پڑھنا شروع کیا تو اس میں یہی سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ چند آیتیں ہی پڑھی تھیں، چونکہ کلام کے تیور شناس تھے اس لئے اس کے سحر میں ڈوب گئے۔ بے ساختہ کہا کہ کیا خوب کلام ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت خبابؓ بن ارت جو حضرت عمرؓ کی آہٹ پا کر چھپ گئے تھے باہر نکل آئے اور کہا بخدا مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے نبی کی دعوت پھیلانے میں بڑی خدمت لے گا۔ کل ہی میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ دعا کرتے سنا ہے کہ الٰہی ابوالحکم بن ہشام یا عمر بن خطاب دونوں میں سے کسی ایک کو اسلام کا حامی بنا دے۔ پس اے عمرؓ! اللہ تعالیٰ کی طرف چلو، اللہ کی طرف چلو۔ حضرت عمرؓ جو پہلے ہی قرآن کے اعجاز سے مفتوح ہو چکے تھے حضرت خبابؓ کی اس بات نے ان کے شوق میں اور اضافہ کر دیا۔ اسی وقت حضرت خبابؓ کے ساتھ جا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اسلام قبول کر لیا۔ یہ واقعہ ہجرتِ حبشہ سے تھوڑی ہی مدت پہلے کا ہے۔

مندرجہ بالا تاریخی پس منظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سورت کا نزول اس وقت ہوا ہے جب حق و باطل کی کشمکش اپنے عروج کو چھو رہی تھی۔ کفار اپنی مخالفت میں بے صبری کو پہنچ رہے تھے اور مسلمانوں کی قوتِ برداشت آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی اجازت سے مسلمان حبشہ اور بعض دیگر مقامات کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔

مخالفت کا اصل ہدف چونکہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی اس لئے جیسے جیسے اسلام کی دعوت پھیلتی جا رہی تھی اور مسلمان استقامت کا ثبوت دیتے ہوئے یا تو صبر کی تصویر بنے ہوئے تھے اور یا موقع ملتے ہی ہجرت کی نیت سے شہر چھوڑ رہے تھے، ویسے ویسے آنحضرت ﷺ کی مخالفت اور اذیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اللہ تعالیٰ کے نبی چونکہ پہاڑوں سے بڑھ کر استقامت اور استقلال رکھتے ہیں اس لئے بجائے ہراساں ہونے کے آپؐ اپنی تبلیغ و دعوت کی مساعی میں اور زیادہ محنت کرنے اور جان کھپانے لگے تھے لیکن اس خیال سے آپؐ قلبی کرب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے کہ کفار کا ایمان نہ لانا شاید میری کسی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس سورت میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے اور ساتھ ہی آپؐ کی تبلیغ و دعوت کی مساعی کی ایک حد بھی مقرر کی جا رہی ہے۔ یعنی یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآن، اللہ تعالیٰ نے اس لئے اتارا ہے کہ آپؐ ہر اس شخص کو اس کی یاد دہانی کرائیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور زندگی کو حقیقت سمجھ کر سنجیدگی سے

Marfat.com

اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن جس شخص یا جس گروہ کو اپنے انجام کی کوئی فکر نہیں اور وہ زندگی کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ رکھتے ہیں ان کی آپؐ پر ہرگز کوئی ذمہ داری نہیں۔ آپؐ کا کام سمجھانا ہے، منوانا نہیں۔ یہ قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ خالقِ ارض وسماء اور مالکِ عرش وکونین کا فرمان ہے۔ اسے شایانِ شان انداز میں پہنچا دینا آپؐ کا کام ہے۔ ناقدروں اور معذوروں سے منوانا اور نہایت لجاجت کے ساتھ انہیں سمجھانے کی کوشش کرنا ہرگز آپؐ کی ذمہ داری نہیں۔ آپؐ اپنے اللہ پر بھروسہ رکھئے، وہ آپؐ کی تمام کاوشوں کو چاہے وہ سراً کی جارہی ہوں یا علانیۃً سب سے واقف ہے۔

اس تمہید کے بعد بالاجمال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ اس سے پہلے اس سرگزشت کے چند اجزاء مختلف سورتوں میں بیان ہو چکے ہیں اور سورۂ قصص میں کسی حد تک تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ان اجزاء کو بیان کیا جارہا ہے جن کی طرف توجہ دلانا حالات کی نزاکت کے اعتبار سے ضروری تھا۔ اس سے پیشتر کہ ہم اس سرگزشت کا انطباق آنحضرت ﷺ کے حالات پر کریں۔ اس سورت میں بیان کئے جانے والے اجزاء کی طرف اشارے کئے دیتے ہیں۔

اس سورۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے اہم اجزاء

سب سے پہلے ان حالات کی طرف اشارہ جن حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔

سندِ ماموریت اور دشمن کے مقابلے کیلئے عصاء اور ید بیضاء عطا فرمائے گئے۔

حکم دیا گیا کہ فرعون کے پاس انذار ودعوت کیلئے جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فریضۂ تبلیغ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کچھ دعائیں مانگیں، وہ قبول کر لی گئیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق الیقین سے بہرہ ور کرنے اور تقویتِ قلب کیلئے ان احسانات کو ذکر فرمایا جو بچپن سے آج تک آپؑ پر کئے گئے۔ اسرائیلی بچوں کے قتلِ عام کے دوران کس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچایا گیا۔ آپؑ کی والدہ کے دل میں کس طرح ایک تدبیر ڈالی گئی اور کس طرح اللہ تعالیٰ کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمن سے آپؑ کی پرورش کرائی گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی کا قتل، آپؑ کی جان کو خطرہ اور اس کی غائبانہ اطلاع اور پھر آپؑ کا مدین کو سفر اور حفاظت سے آپؑ کا مدین پہنچنا اور ایک جائے پناہ کا میسر آنا اور پھر مختلف آزمائشوں اور مراحل سے گزرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق وادیٔ مقدس طویٰ میں پہنچنا اور منصب نبوت پر سرفراز ہونا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کو دعوتِ ایمان اور فرعون کا معارضہ۔

فرعون کا ساحروں کو مقابلے کیلئے جمع کرنا اور پھر اس مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی اور ساحروں کا ایمان لانا۔

مختلف جانگسل مراحل سے گزرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہجرت کا حکم، فرعون کی طرف سے ان کا تعاقب، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دریا کے پار پہنچنا اور فرعون اور اس کی فوجوں کی غرقابی۔

صحرائے تیہ میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور بنی اسرائیل کی مسلسل ناشکری۔

تورات لینے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر جانا اور بنی اسرائیل کے سامری کے فتنہ میں مبتلا ہونے کی تفصیل اور

Marfat.com

اس کے اسباب وعواقب پر تبصرہ۔

اس سرگزشت کے خاتمے پر نبی کریم ﷺ کی طرف التفات اور آپؐ کو تسلی۔

واقعہ آدم وابلیس سے قریش کو تنبیہ اور مسلمانوں کو صبر کی تلقین۔

صبر کے حصول کیلئے نماز کی تلقین۔

چند حقائق

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے حالات اور بالخصوص ان واقعات پر (جن کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے) جب ہم غور کرتے ہیں تو چند باتیں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں۔

1- عرب میں یہودی ایک بڑی تعداد میں آباد تھے۔ نجران میں عیسائیوں کی ریاست قائم تھی اور جزیرۂ عرب میں پھیلی ہوئی عرب قوم یہ تینوں گروہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا نبی مانتے تھے۔ یہود کی تو نسبت ہی ان کے ساتھ تھی۔ عیسائی بھی سابقہ انبیاء پر ایمان رکھتے تھے اور عرب اہلِ کتاب کے علمی تفوق کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا نبی سمجھتے تھے۔ تینوں قوموں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس تعارف کی وجہ سے آپ کے جستہ جستہ حالات بیان کرنا ضروری سمجھا گیا تا کہ ان واقعات کے آئینہ میں بعض اعتراضات کی لغویت واضح کی جائے۔

2- اہلِ مکہ عام طور پر یہ کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) اگر اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہوتے تو یقیناً آپؐ کے ساتھ کوئی غیر معمولی نشانیاں ہوتیں مثلاً عرب بھر میں باقاعدہ اعلان کیا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نبی مبعوث ہو چکے ہیں۔ پھر آپؐ کی مدد کیلئے کوئی نہ کوئی فرشتہ آپؐ کے ساتھ رہتا جو لوگوں کی دست برد سے آپؐ کو محفوظ رکھتا۔ خزانے آپؐ کے ساتھ چلتے، تو تیں آپؐ کی ہمسفر ہوتیں۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ بغیر کسی اعلان وتشہیر کے آپؐ نے غارِ حرا سے اتر کر اور کوہِ صفا پر چڑھ کر اپنی نبوت کا اعلان کر دیا۔ کوئی فرشتہ آپؐ کے ساتھ نہیں آیا، کوئی غیر معمولی بات کا اظہار نہیں ہوا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ سنا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت اس حال میں دی گئی کہ آپؑ کئی سالہ جلاوطنی کا دور گزار کر اپنے ملک کی طرف محوِ سفر تھے کہ راستہ بھول جانے کے باعث آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تو آپؑ کو نبوت دے دی گئی۔ نہ آپؑ کو علم تھا کہ میں نبی بننے والا ہوں، نہ وہاں کوئی دیکھنے والا تھا، نہ سننے والا اور بے بسی اور بے کسی کا یہ عالم تھا کہ ایک لاٹھی، فقیرانہ لباس اور بکریوں کے ایک ریوڑ کے سوا آپؑ کے پاس کچھ نہیں۔ اس کے باوجود آج تک تاریخ ان کے کارناموں کے گن گاتی ہے۔

3- قریش یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو رسول بنانا ہی تھا تو وہ یقیناً قریش کے کسی رئیس کو رسول بناتا، کیونکہ رسالت ایک نہایت عزت دار منصب ہے جو فقط اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے وہ کسی غریب اور معمولی آدمی کو کیسے عطا ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت سے یہ بتایا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قوم سے تعلق رکھتے تھے جو ایک طویل عرصے سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ اگرچہ پیغمبروں کی اولاد تھے لیکن اب عزت نام کی کوئی چیز ان کے گھر میں نہ تھی۔ انہیں میں سے ایک فرد کو جو مسافرت کے سوا کوئی سرمایہ نہیں رکھتا منصبِ نبوت پر سرفراز کیا جا رہا ہے تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حاملِ نبوت کیلئے دولت وامارت اور خاندانی نسبتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ جسے خلعتِ نبوت پہنایا جاتا ہے اس میں کیا خصوصیات دیکھی

Marfat.com

جاتی ہیں، لیکن بظاہر جومحسوس ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس میں ایک ہی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کی زندگی بے عیب ہوتی ہے۔ وہ سیرت و کردار میں نہایت مصفا اور مجلا ہوتا ہے۔ وہ پتھروں کے ڈھیر میں ہیرے کی طرح چمکتا ہے۔ وہ صورت وسیرت، اخلاق وعادات، فہم وفراست اور قوتِ فیصلہ میں بینظیر ہوتا ہے۔ وہ تلمیذِ رحمٰن اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حجت ہوتا ہے۔ وہ فاقے کرتا ہے لیکن اس کی بے نیازی بادشاہوں کو شرمسار کرتی ہے۔ دولت اس کے قدموں میں آتی ہے لیکن اس کا چولھا بجھا رہتا ہے۔ وہ دولت کو اس طرح تقسیم کرتا ہے جیسے کوئی بے قیمت چیز لوگوں میں بانٹ دی جاتی ہے۔

4- حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت سے یہ بتایا جارہا ہے کہ اشرافِ قریش اور دیگر اہلِ مکہ جس طرح کے اعتراضات وشبہات اور مکروظلم کے ہتھکنڈے محمد (ﷺ) کیخلاف استعمال کررہے ہیں یہ سب کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بھی استعمال کیا گیا۔ فرعون اور آلِ فرعون نے ایک سے ایک بڑھ کر آپؑ کیخلاف تدبیریں اختیار کیں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بے سروسامانی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی تائیدونصرت سے کامیاب وکامران ٹھہرے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ اور مسلمان بھی اپنی بے سروسامانی کے باوجود کفار کے مقابلے میں غالب وکامران ہوں گے۔ کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ہاتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا اسی طرح اس کی تائید نبی کریم ﷺ کے ساتھ بھی ہے۔

5- اس سرگزشت کے آغاز میں اس ہدایت اور تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی۔ قریش اور دوسرے لوگوں کو یہ بتایا جارہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم وہدایت بھی بالکل وہی ہے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر تشریف لائے تھے۔ تم اگر انہیں اللہ تعالیٰ کا سچا نبی مانتے ہو تو پھر آنحضرت ﷺ کی مخالفت کیوں کرتے ہو۔ پھر اس سرگزشت کے ضمن میں سامری کے خدا بنانے اور بنی اسرائیل کے اس کے سامنے جھک جانے کے ذکر کے بعد جو انہیں سزا دی گئی اور جس طرح ہزاروں آدمی قتل کئے گئے اس کا ذکر فرمایا گیا ہے تاکہ مشرکین کو معلوم ہو کہ جو بھی پیغمبر دنیا میں آیا ہے اس نے سب سے زیادہ شرک کی مذمت اور اس کی تردید میں کوششیں صرف کی ہیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ بھی سب سے زیادہ زور شرک کی مذمت پر دے رہے ہیں۔

آخر میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ ان منکرینِ حق کے معاملے میں جلدی اور بے صبری نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفروانکار پر فوراً نہیں پکڑتا بلکہ سنبھلنے کیلئے کافی مہلت دیتا ہے اور وہ جو کچھ اہلِ حق کے ساتھ کرتے ہیں انہیں ایک وقت تک برداشت کرتا ہے۔ آخر ایک وقت آتا ہے کہ حق غالب آتا ہے اور باطل مٹا دیا جاتا ہے۔ اس لئے آپؐ اور مسلمانوں کو نہایت صبرواستقامت سے اس وقت تک اپنا کام جاری رکھنا چاہئے لیکن یہ یقین رکھئے کہ کامیابی آپؐ کا مقدر ہے اور ناکامی اور تباہی کفار اور مشرکین کی قسمت ہے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۱۳۵	سُوْرَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰهٰ ۚ (۱) مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى ۙ (۲) اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ
يَّخْشٰى ۙ (۳) تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ؕ (۴) اَلرَّحْمٰنُ
عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (۵) لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَ
مَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى (۶) وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ
السِّرَّ وَاَخْفٰى (۷) اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۸) وَهَلْ
اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ (۹) اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّىْۤ
اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّىْۤ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (۱۰)
فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِىَ يٰمُوْسٰى ؕ (۱۱) اِنِّىْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ
بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ؕ (۱۲) وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (۱۳)
اِنَّنِىْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِىْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ (۱۴)
اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (۱۵)
فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى (۱۶)
وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (۱۷) قَالَ هِىَ عَصَاىَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ
اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِىْ وَلِىَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۱۸) قَالَ اَلْقِهَا

Marfat.com

یٰمُوْسٰی ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ قف
سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی ﴿۲۱﴾ وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ
بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰی ﴿۲۲﴾ لِنُرِیَكَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْكُبْرٰی ﴿۲۳﴾
اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾

رکوع: ا۔ طٰهٰ ﴿۱﴾ (یہ سورت طا ھا ہے۔ ا) ہم نے آپؐ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ آپؐ مشقت میں پڑیں۔ ۲) یہ تو بس نصیحت ہے، اس کیلئے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ ۳) یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اتارا گیا ہے، اس ذات کی طرف سے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ ۴) وہ رحمٰن ہے جو عرشِ حکومت پر متمکن ہے۔ ۵) اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے۔ ۶) اگر تم زور سے بات کرو (یا چپکے سے) تو وہ جانتا ہے (علانیہ کو بھی) پوشیدہ کو بھی اور بہت زیادہ مخفی کو بھی۔ ۷) (اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اسی کیلئے ہیں تمام اچھے نام۔ ۸) کیا آئی ہے آپ کے پاس موسیٰ کی سرگزشت۔ ۹) جبکہ موسیٰ نے ایک آگ دیکھی تو اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ تم لوگ یہاں ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے تاکہ میں اس سے ایک انگارہ لے آؤں یا ممکن ہے مجھے وہاں کوئی راستہ دکھانے والا مل جائے۔ ۱۰) جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے، آواز آئی، اے موسیٰ۔ ۱۱) یہ میں تمہارا رب ہوں، پس تم اپنے جوتے اتار دو، کیونکہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ ۱۲) میں نے تجھ کو چن لیا ہے تو جو وحی کی جارہی ہے اسے غور سے سنو۔ ۱۳) بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی بندگی کرو اور میری یاد کیلئے نماز قائم کرو۔ ۱۴) بے شک قیامت ضرور آنے والی ہے، میں اسے مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ ۱۵) پس نہ روکے تمہیں اس سے وہ شخص جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے کہ تم ہلاک ہو کر رہ جاؤ۔ ۱۶) اور اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ ۱۷) عرض کی یہ میرا عصا ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کیلئے پتے جھاڑتا ہوں اور میرے لئے اس میں کئی اور فائدے بھی ہیں۔ ۱۸) پروردگار نے فرمایا، اس کو زمین پر ڈال دو، اے موسیٰ۔ ۱۹) حضرت موسیٰ نے اسے ڈال دیا تو دفعتاً وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بن گیا۔ ۲۰) اللہ نے فرمایا کہ اسے پکڑ لو اور ڈرو نہیں، ہم اس کو پھر اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ ۲۱) اور دبالو اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے وہ وہاں سے ایک دوسری نشانی بن کر چٹا سفید بغیر کسی مرض کے برآمد ہوگا۔ ۲۲) تاکہ ہم اپنی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بعض کا تمہیں مشاہدہ کرائیں۔ ۲۳) تم فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔ ۲۴)

Marfat.com

طٰہٰ ۝۱ (یہ سورت طا ھا ہے۔ ۱)

طٰہٰ کا مفہوم

(طٰـــہٰ ......حروفِ مقطعات میں سے ہے۔اس لفظ کی تفسیر میں علمائے تفسیر کے اقوال بہت ہیں۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قبیلہ عُکل اور قبیلہ عک کے نزدیک اس کا معنی ہے یا رجل، یعنی اے شخص۔حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ قبیلہ عک میں طٰہٰ بمعنی یا حبیبی، یعنی اے میرے حبیب استعمال ہوتا ہے۔بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک یہ اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طٰہٰ اور یٰسین آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی میں سے ہیں،لیکن بے غبار بات جو اس سلسلے میں کہی جا سکتی ہے وہ وہی ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ اور جمہور علماء نے فرمائی ہے۔کہ جس طرح قرآنِ کریم کی بہت سی سورتوں کے ابتدا میں آئے ہوئے حروفِ مقطعات مثلاً الف لام میم وغیرہ متشابہات میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا،لفظ طٰـــہٰ بھی انہیں میں داخل ہے اور حروفِ مقطعات کی وضاحت ہم کسی حد تک سورۂ بقرہ کے آغاز میں کر چکے ہیں۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۝۲ اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ۝۳

(ہم نے آپؐ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ آپؐ مشقت میں پڑیں۔ ۲) یہ تو بس نصیحت ہے،اس کیلئے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ ۳)

اس آیت کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت

اس آیت کی تفسیر مفسرین نے مختلف پہلوؤں سے کی ہے۔

1- قرآنِ کریم کی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ پر جو عظیم ذمہ داری ڈالی گئی،آپؐ نے اس کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ اس میں صرف کر ڈالا اور اپنی صلاحیتیں اس میں نچوڑ ڈالیں،لیکن جب آپ نے اس قدر محنت و ریاضت کے بعد بھی لوگوں میں اس کی طلب محسوس نہ کی بلکہ مخالفت میں زبانیں دراز ہونے لگیں اور ہر قیمت پر مخالفین نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو آپؐ کی بے کلی اور بے چینی انتہا کو پہنچ گئی۔آپؐ سوچنے لگے کہ لوگوں کے قرآنِ کریم کی دعوت کو قبول نہ کرنا شاید یہ معنی رکھتا ہے کہ میری مساعی میں کوئی کمی ہے۔مجھے اس کیلئے جو محنت کرنی چاہئے شاید میں اس میں کوتاہی کر رہا ہوں۔تو آپؐ نے اگر ایک طرف اپنی مساعی میں اضافہ فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے تائید و نصرت اور توفیق کیلئے مسلسل دعاؤں میں اضافہ کیا تو دوسری طرف جب مخالفین کے رویئے میں کوئی مثبت تبدیلی نہ دیکھی تو دل کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا اور آپؐ بیمار رہنے لگے۔ چنانچہ اس صورتحال کے پیش نظر پروردگار نے نہایت دلنواز انداز میں آنحضرت ﷺ کو اس آیتِ کریمہ میں سمجھایا ہے کہ آپؐ پر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپؐ لوگوں سے اسے منوا کے چھوڑیں۔آپؐ کا کام تبلیغ و دعوت ہے،لوگوں کو صاحبِ ایمان بنانا نہیں۔جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور حق شناسی کی رمق ہوگی وہ یقیناً آپؐ کی تبلیغ و دعوت سے ایمان قبول کرے گا،لیکن جو لوگ ان صلاحیتوں سے عاری ہیں اور حق شناسی کا کوئی جذبہ ان میں موجود نہیں تو آپؐ زبردستی ان کے دلوں میں ایمان اتار دینے کے مکلف نہیں بنائے گے۔چنانچہ جہاں تک تبلیغ و دعوت کا تعلق ہے آپؐ بفضلہٖ تعالیٰ اس میں کوئی

Marfat.com

کمی نہیں کر رہے۔ لیکن جہاں تک لوگوں کا اسے قبول کرنے کا تعلق ہے اس کی آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں، وہ مانتے ہیں تو اپنی عاقبت سنواریں گے اور انکار کرتے ہیں تو اپنی ہی عاقبت بگاڑیں گے۔ آپؐ اس سے اتنا اثر کیوں لیتے ہیں کہ آپؐ کیلئے یہ قرآن کسی مشکل کا باعث بن جائے۔ اس سے آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی دی گئی اور آپؐ کی ذمہ داری کی ایک حد بھی معین کر دی گئی۔ اور یہ بھی اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی دعوت و تبلیغ سے بھی صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر حق شناسی اور اثر پذیری کی قوت ہو۔

2- بعض اہلِ تفسیر کا خیال یہ ہے کہ عہدِ نبوت کے ابتدائی ایام میں آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی پیروی میں مسلمان قیامِ لیل میں بڑی مشقت اٹھاتے تھے۔ بعض دفعہ آنحضرت ﷺ ساری ساری رات نماز میں کھڑے رہتے اور قرآنِ کریم پڑھتے رہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آپؐ کے قدم مبارک سوج جاتے۔ اس پر پروردگار کی رحمت جوش میں آئی اور اس آیتِ کریمہ کے ذریعے حکم دیا گیا کہ آپؐ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا گیا اور نہ نبوت آپؐ کو اس لئے دی گئی ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہمت سے بڑھ کر مشقت کریں اور ساری ساری رات اس طرح قیام میں گزار دیں کہ قدمِ مبارک پر ورم آ جائے۔ آپؐ کو اس قدر محنت نہیں کرنی چاہئے بلکہ آپؐ اسی قدر قیام کریں اور قرآنِ کریم کی تلاوت جاری رکھیں جس سے آپؐ کو تھکاوٹ نہ ہو اور آپؐ کا جسم جسے برداشت کر سکے۔

3- تَشْقٰٓی ...... بعض اہلِ علم کے نزدیک شقاوت سے ہے، جو سعادت کی ضد ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دن ابوجہل اور نضر بن حارث آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے اِنَّکَ شَقِیٌّ لِاَنَّکَ تَرَکْتَ دِیْنَ آبَائِکَ ”آپؐ شقی ہیں، کیونکہ آپؐ نے اپنے آباء کا دین چھوڑ دیا ہے۔“ ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ پہلے سارا شہر آپؐ کی عزت کرتا تھا، لوگ آپؐ کے راستے میں پلکیں بچھاتے تھے، اب آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں اور برا بھلا کہا جاتا ہے اور آپؐ بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے ہیں، تو شقی وہی ہوتا ہے جس کا یہ حال ہو۔ اس کے جواب میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور یہ بتایا گیا کہ قرآن بدبخت بنانے کیلئے نازل نہیں ہوا، یہ تو بدبخت کو اوجِ سعادت تک پہنچانے کیلئے آیا ہے۔ یہ ابوجہل و نضر جسے شقاوت سمجھ رہے ہیں وہ تو عین سعادت اور کمالِ سعادت تک پہنچنے کا زینہ اور ہر سعادت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

تَذْكِرَةً ...... بعض اہلِ علم کے نزدیک اس کا معنی یاد دہانی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ یاد دہانی اس چیز کی کرائی جاتی ہے جو پہلے سے انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ خارج کی کسی چیز کی یاد دہانی نہیں کرائی جاتی، صرف فرق یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک بات اپنے اندر رکھتے ہوئے بھول چکا ہوتا ہے۔ یاد دہانی سے اسے مستحضر کر دیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم بھی ایک یاد دہانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیں کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں سکھاتا بلکہ انہیں حقائق کی یاد دہانی کرتا ہے جو خود ہماری فطرت کے اندر موجود ہیں لیکن ہم ان سے غافل ہیں۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ ان حقائق کی یاد دہانی کیلئے وہ جو دلائل استعمال کرتا ہے وہ بھی ہماری دیکھی بھالی چیزوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ کبھی وہ دلائلِ آفاق سے کام لیتا ہے اور کبھی دلائلِ انفس سے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے لئے اجنبی نہیں، بلکہ بعض دفعہ قرآنِ کریم پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جسے غالب نے شعر کا جامہ پہنایا ہے:

دیکھئے تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ مُذَکِّر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ آپؐ کو مصیطر یعنی داروغہ بنا

Marfat.com

کر نہیں بھیجا گیا۔ آپؐ لوگوں کو ان حقائق کی یاددہانی کیلئے تشریف لائے تھے جن کی حیثیت متاعِ گم گشتہ کی ہے یعنی وہ انسانیت کی متاع اور انسان کی بندگی کا اثاثہ ہیں لیکن انسان اپنی خودفراموشی اور خدافراموشی سے انہیں بھی بھلا چکا ہے۔

تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ۝۴

(یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اتارا گیا ہے، اس ذات کی طرف سے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ ۴)

قرآنِ کریم کی عظمت

تَـنْـزِیْل ...... مصدر ہے، یہاں مفعول کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ نزول اور تنزیل میں فرق یہ ہے کہ تنزیل میں ایک اہتمام اور تدریج کا معنی پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی یہ لفظ لا کر اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نہایت عظیم الشان کتاب ہے اور اسے نہایت اہتمام اور ترتیب و تدریج کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام اسے لے کر اترتے ہیں جو تمام فرشتوں کے سردار اور مطاع ہیں اور جب وہ اترتے ہیں تو فرشتوں کی فوجیں ان کے ہمرکاب ہوتی ہیں۔ یہ اہتمام اس کی حفاظت کیلئے کیا جاتا ہے تاکہ کسی شیطانی قوت کو قرآنِ کریم کے نزول میں دخل اندازی کی جرأت نہ ہو سکے۔ اور پھر یہ قرآنِ کریم دفعۃً ایک ہی دفعہ نازل نہیں کیا گیا بلکہ تھوڑا تھوڑا حسبِ ضرورت ایک تدریج کے ساتھ نازل فرمایا گیا تاکہ اسے سمجھنے، یاد کرنے اور پھر اس پر عمل کرنے میں آسانی ہو۔ اور اسے یاددہانی بنایا گیا تاکہ اس کے ذریعہ سے انسان کی فکری گم گشتہ متاع کو از سر نو زندہ کیا جائے اور چونکہ نسیان انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے اس لئے بار بار اس کے سمجھانے بجھانے کا انتظام کیا گیا تاکہ قرآنِ کریم کی کوئی بات نظرانداز نہ ہو سکے۔ اور مزید یہ فرمایا کہ اس قرآنِ کریم کی عظمت یہ ہے کہ یہ اس ذاتِ ذوالجلال کا کلام ہے جو زمین اور بلند آسمانوں کا خالق ہے۔ یہ کسی ذہنی اپچ کا نتیجہ، فکری آوارگی کا شاخسانہ اور سنی سنائی بات نہیں بلکہ اس کا کلام ہے جس کے کرم اور فیض سے ہر مخلوق کو وجود ملا ہے۔ جس کلام کی نسبت ایسے عظیم متکلم سے ہو اس کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کی جاسکتا کہ اسے رد کر دینے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑے گی۔ ایک طرف قرآنِ کریم کے مخاطبوں کو یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ خالقِ کائنات کے کلام کو نظرانداز کرنے بلکہ اس کی مخالفت کرنے کا انجام بہت برا ہوگا اور آنحضرت ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپؐ خالقِ ارض و سماء کے سفیر اور پیامبر ہیں۔ آپؐ کا کام یہ نہیں کہ آپؐ ایک سائل کی طرح اللہ تعالیٰ کا کلام ان کے سامنے پیش کریں بلکہ آپؐ کی شان یہ ہے کہ آپؐ نہایت ہمدردی اور ذمہ داری سے اللہ تعالیٰ کا کلام اس شان سے ان تک پہنچائیں کہ انہیں اندازہ ہو سکے کہ اس کا رد کرنا ہمارے لئے آسان نہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۝۵

(وہ رحمٰن ہے جو عرشِ حکومت پر متمکن ہے۔ ۵)

قرآنِ کریم رحمت کا اظہار اور اس کا انکار خطرناک ہے

مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ساری عظمتوں کے باوجود رحمٰن بھی ہے۔ اس کی صفتِ رحمت کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ انسانوں کو پیدا کر کے یونہی نہ چھوڑ دے بلکہ جس طرح انسانوں کیلئے ان کی جسمانی ضرورتیں فراہم کرے اسی طرح ان کی معنوی قوتوں کو بھی مہیا کرے جس سے وہ

Marfat.com

اپنے زندگی کے نصب العین اور مقصد کے مطابق زندگی گزارنے کی رہنمائی پاسکیں۔اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اس نے اپنا آخری رسول مبعوث کیا اور اس پر آخری کتاب اتاری اور ساتھ ہی اس غلط فہمی کو دور کیا کہ پیغمبر کا آنا محض رسمی کارروائی نہیں اور نہ کتاب کا اترنا صرف تبرک کیلئے ہے کہ تم اسے مانو یا نہ مانو تمہاری زندگی اور آخرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا بلکہ تمہیں یقین ہونا چاہئے کہ جس عظیم ذات نے رحمٰن ہونے کی وجہ سے تمہاری ہدایت کا انتظام کیا ہے وہ اپنے عرشِ حکومت پر متمکن بھی ہے۔تم اس کی حکومت کی گرفت میں ہو۔اس نے اگرچہ تمہیں زندگی گزارنے کا طریقہ اور رہنمائی دے کر فی الجملہ آزاد چھوڑ دیا ہے لیکن وہ برابر تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔تمہارا ایک ایک عمل محفوظ رکھا جارہا ہے اور پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ جب وہ تمہارے ایمان وعمل کے بارے میں تم سے باز پرس کرے گا۔

سیاقِ کلام سے "عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی" کا جو مفہوم نمایاں ہوتا ہے اسے ہم نے عرض کر دیا ہے۔لیکن اس سلسلے میں جو بے غبار بات کہی جاسکتی ہے وہ وہی ہے جسے ہمارے سلف صالحین نے نقل فرمایا ہے کہ اس کا معنی تو معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس کے بارے میں قیل وقال اور جرح وقدح کرنا جہالت ہے کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہے جس کی مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی ﴿۶﴾

(اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے۔ ۶)

اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کی وسعت

پروردگار جس حکومت کے تخت پر متمکن ہے اس کی وسعتیں انسانی دل ودماغ میں نہیں سما سکتیں۔انسان صرف آسمانوں کو دیکھتا ہے اگرچہ اسے حدِ نگاہ سمجھتا ہے۔لیکن آسمانوں کی حقیقت سے واقف نہیں تو وہ اس کی وسعتوں کو کیا جان سکتا ہے۔زمین سب سے چھوٹا کرہ ہے۔ انسان آج تک اس کے مَالَہٗ وَمَا عَلَیْہِ سے واقف نہیں ہوسکا۔اس کے پہاڑوں کی بلندیاں اور اس کے سمندروں کی پہنائیاں ابھی تک اس کی صلاحیتوں کو چیلنج کر رہی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ زمین کا قطر تین ہزار میل ہے لیکن انسان نے اپنے جدید ترین آلات سے اسے چھیدنے کی کوشش کی ہے تو 600 میل سے آگے نہیں بڑھ سکا۔زمین اور آسمان کے اندر قدرت نے کیا کیا پیدا کر رکھا ہے اور کیسے کیسے خزانے اس میں مدفون ہیں آج تک انسان اس کا ایک حصہ بھی دریافت نہیں کرسکا۔حیرانی کی بات ہے کہ جو پروردگار اس قدر عظیم مملکت کا مالک اور ایسی مہیب قوتوں کا حاکم ہے۔کوئی مخلوق اس کی شریک کیسے ہوسکتی ہے یا اس کے اختیارات میں حصہ دار کیسے بن سکتی ہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کی گرفت سے بچا سکتی ہے تو اسے پروردگار کی حکومت کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے اس کی قدرتوں کا مراقبہ کرنا چاہئے۔جس طرح اس کی ذات غیر محدود ہے اسی طرح اس کی قدرتیں بھی بے پناہ ہیں اور دنیا کی کوئی چیز اس کی خدائی سے باہر نہیں۔

بعض نادان یہ سمجھتے تھے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک اور حکمران ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ نہ جانے کن بلندیوں پر فائز ہے۔ہم پستیوں میں رہنے والے لوگ ان بلندیوں تک رسائی کیسے پاسکتے ہیں اور ہماری فریادوں کو وہاں تک جانے کا موقع کیسے مل سکتا ہے۔ہم چیختے رہیں ہماری چیخیں وہاں تک کیسے پہنچ سکتی ہیں۔ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا:

Marfat.com

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿٧﴾

(اگر تم زور سے بات کرو (یا چپکے سے) تو وہ جانتا ہے (علانیہ کو بھی) پوشیدہ کو بھی اور بہت زیادہ مخفی کو بھی۔ ۷)

پروردگار کی وسعتِ علم

تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری فریادیں اور تمہاری چیخیں اس حاکم الحاکمین تک کیسے پہنچ سکتی ہیں کیونکہ وہ کائنات کی ان بلندیوں پر براجمان ہے جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے حالانکہ اس کے علم اور خبر کا عالم یہ ہے کہ وہ تمہاری ان باتوں کو بھی جانتا ہے جنہیں تم علانیہ کہتے ہو، اور ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو تم چپکے سے کہتے ہو۔ وہ تمہارے ہر پوشیدہ عمل کو بھی دیکھتا ہے اور ان باتوں سے بھی آگاہ ہے جو تمہارے نہاں خانۂ دماغ میں ابھی پرورش پا رہی ہیں۔ جو بات تم نے تنہائی میں اپنے کسی عزیز سے کہی ہے اسے اس کی بھی اطلاع ہے۔ اور جو تم کسی سے کہنے کا ارادہ رکھتے ہو لیکن ابھی کہنے کی نوبت نہیں آئی، وہ اس سے بھی واقف ہے۔

''سِر'' پوشیدہ بات کو کہتے ہیں اور ''اخفیٰ'' اس خیال کو کہتے ہیں جو ابھی دل یا دماغ میں مچل رہا ہے یا جسے ابھی دماغ میں پیدا ہونا ہے۔

دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپؐ کے دشمن آپؐ کی مخالفت میں جو کچھ کر رہے ہیں ہم اس سے بے خبر نہیں۔ آپؐ جن مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں ہم انہیں برابر دیکھ رہے ہیں۔ آپؐ کوئی بات اپنے پروردگار سے صبر کی زبان میں کہتے ہیں، ہم اسے بھی جانتے ہیں اور کوئی دعا یا مناجات فرماتے ہیں تو ہم اس سے بھی بے خبر نہیں۔ آپؐ کی کوئی بات زبان پر آئے یا دل کے مخفی گوشوں میں رہے آپؐ کا رب اس سے بھی ہر حال میں آگاہ رہتا ہے۔ کوئی مخفی سے مخفی بھید ایسا نہیں جو اس علیم و خبیر کی نگاہ سے پوشیدہ ہو۔ اگر کسی وقت آپؐ کو کہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے تاخیر کا خیال ہوتا ہے تو اس میں بھی یقیناً کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی بے خبری کے باعث یہ تاخیر ہوئی ہے۔ آپؐ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں ہیں اور آپؐ کا خدا ہر وقت اور ہر حالت میں آپؐ کو دیکھتا ہے۔

فصیح عربی زبان کا ایک اسلوب ہے کہ مقابل کے الفاظ بربنائے قرینہ عام طور پر حذف کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں بھی اسی اسلوب کے تحت مقابل الفاظ چھوڑ دیئے گئے ہیں کیونکہ ذہین قاری خود بخود ان الفاظ کو محسوس کر لیتا ہے۔ اس آیت میں اگر ان محذوفات کو کھول دیا جائے تو عبارت اس طرح ہوگی وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ اَوْ تُخَافِتْ بِهٖ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَالسِّرَّ وَاَخْفٰى

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴿٨﴾

(اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اسی کیلئے ہیں تمام اچھے نام۔ ۸)

پروردگار کا تعارف

پروردگار کی چند صفات بیان کرنے کے بعد وہ بات فرمائی گئی ہے جو پروردگار کا اصل تعارف، اس بحث کا حاصل اور تمام حقائق کا نچوڑ ہے۔ اس کے تعارف میں جو کچھ بھی کہا جائے اس کی آخری بات یہی ہے اور اس کی جس قدر بھی صفات بیان کی جائیں اس کا ثمر بھی یہی ہے۔

Marfat.com

اس کی یہی چند صفات نہیں بلکہ اس کی صفات لامحدود ہیں کیونکہ ہم جس طرح اس کی ذات کی وسعتوں سے ناواقف ہیں اسی طرح اس کی صفات کا استقصاء کرنے سے بھی معذور ہیں۔ نہ اس کی ذات کی کوئی انتہا ہے، نہ اس کی صفات کی انتہا ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ جتنے بھی اچھے اور خوبصورت نام ہو سکتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام اہلِ علم کے نزدیک اسماء سے مراد اس کی صفات ہیں۔ ان آیات میں اگرچہ اس نے صرف اپنی خالقیت، اپنی رحمانیت، اپنی حاکمیت، اپنی مملکت کی وسعت اور اپنے علم کی بے پناہی کا ذکر فرمایا ہے جن کا تصور کر کے کوئی عقل مند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے سوا کوئی اور اِلٰہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی صفات یہی تو نہیں ہیں تمام اچھی صفات اس کی صفات ہیں اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ جس طرح متذکرہ بالا صفات شرک کی تردید کیلئے کافی ہیں اسی طرح آنحضرت ﷺ کے اطمینان اور تسلی کیلئے بھی ان صفات کا ذکر کفایت کرتا ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی قدر و منزلت کا کیا کہنا کہ آپؐ پر سایہ جس طرح ان صفات کا ہے اسی طرح تمام صفات آپؐ کی طرف متوجہ رہتی ہیں اور آپؐ گویا اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عالیہ کے حصار میں رہتے ہیں:

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۞

(کیا آئی ہے آپ کے پاس موسیٰ کی سرگزشت۔ ۹)

هَلْ کا مفہوم

هَلْ ...... استفہام کیلئے آتا ہے۔ یہ استفہام کبھی تقریری ہوتا ہے اور کبھی انکاری۔ یہاں یہ استفہام تقریری ہے اور جہاں تک اس کے موقعِ استعمال کا تعلق ہے اسے دو موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی تہدید و وعید کیلئے اور کبھی ترغیب و تشویق کیلئے۔ یہاں اس کا استعمال ترغیب و تشویق کیلئے ہے۔ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے دل میں تشویق پیدا کی جا رہی ہے تاکہ وہ شوق سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت سنیں۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اچانک بغیر کسی مناسبت کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع کر دیا گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ ہم سورت کے تعارف میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اہلِ کتاب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا رسول سمجھتے ہی تھے عرب بھی انہیں اہلِ کتاب کے اثر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کی نبوت اور تعلیم کے حوالے سے جو کچھ اعتراض کرتے تھے کسی پیغمبر کی زندگی کے واقعات سے ان اعتراضات کا جواب دیا جاتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت سے ان تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور اس تعلیم کی جھلک دکھائی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی اور جو بعینہٖ وہی ہے جو نبی کریم ﷺ پیش فرما رہے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ جس صورتحال سے دوچار تھے اور جس طرح آپؐ کی مخالفت کی جا رہی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے تقابل سے اس کے ایک ایک منظر کی تائید کی جا رہی ہے۔ چنانچہ آغاز اس بات سے کیا جا رہا ہے کہ دشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے آپؑ مصر چھوڑ کر ناگفتہ بہ حالات میں مدین پہنچے تھے، وہاں اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی دستگیری فرمائی وہاں آپؑ کو ایک ایسی جائے پناہ ملی جس نے آپؑ کے تمام غموں کا مداوا کر دیا۔ وعدے کے مطابق آٹھ یا دس سال گزارنے کے بعد وہاں سے آپؑ مصر جانے کے ارادے سے نکلے لیکن راستہ بھول گئے۔

Marfat.com

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿۱۰﴾

(جبکہ موسیٰ نے ایک آگ دیکھی تو اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ تم لوگ یہاں ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے تا کہ میں اس سے ایک انگیاری لے آؤں یا ممکن ہے مجھے وہاں کوئی راستہ دکھانے والا مل جائے۔ ۱۰)

حضرت موسیٰؑ کو راستے میں پیش آنے والے واقعات

آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی یقیناً آپ کے ساتھ تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی خادم بھی ہو۔ روایات میں کہا گیا ہے کہ آپ کے ساتھ بکریوں کا ایک ریوڑ بھی تھا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی اہلیہ جاڑوں کے موسم اور سخت سردی کی وجہ سے کانپ رہی ہیں۔ آپ اس پریشانی میں مبتلا ہوگئے کہ اب کیا کیا جائے۔ آپ نے چقماق رگڑ کر آگ نکالنے کی کوشش کی لیکن سردی کی شدت کی وجہ سے آگ نہ نکلی۔ آپ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دور سے ایک آگ دکھائی دی تو آپ نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ تم یہاں ٹھہرو مجھے ایک آگ دکھائی دی ہے، میں وہاں جاتا ہوں ممکن ہے وہاں کوئی راستہ دکھانے والا مل جائے یا میں وہاں سے آگ کی چنگاری لے آؤں تا کہ آپ اسے تاپ سکیں۔

بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ اٰنَسْتُ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو آگ دیکھی تھی وہ کوئی آگ کا الاؤ نہ تھا بلکہ ایک شعلہ مستعجل تھا جو چمکا اور بجھ گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ "اٰنَسْتُ، رَاَیْتُ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور تفسیر مظہری کے مطابق ایناس ایسی چیز دیکھنا ہے، جس کے دیکھنے سے دل میں انس وطمانیت پیدا ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک شعلہ نہیں بلکہ آگ تھی اور آگ بھی ایسی جسے دیکھ کر اس کی طرف لپکنے کو جی چاہتا تھا۔ ویسے بھی ایک معمولی عقل بھی یہ بات سمجھتی ہے کہ پہاڑوں کے ہجوم میں ایک شعلہ جلا اور بجھ گیا تو اس سے یہ کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ آگ کہاں تھی، اس کا راستہ کہاں ہے اور ڈھونڈنے والے کو کہاں پہنچنا ہے؟ اس کیلئے تو ضروری تھا کہ ایک نمایاں آگ ہوتی جو ماحول کو روشن کر دیتی تا کہ راستہ بھولنے والا اس کو دیکھ کر وہاں پہنچ جاتا۔ اس لئے جن روایات میں یہ بات کہی گئی ہے وہ بے اصل نہیں معلوم ہوتی کہ یہ عجیب قسم کی آگ تھی جو اپنے اندر دلکشی اور دلآویزی رکھتی تھی۔ اس نے ایک سرسبز وشاداب درخت کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور اس کے جلنے سے ہر آن اس درخت کی شادابی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰى ﴿۱۱﴾ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾

(جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے، آواز آئی، اے موسیٰ۔ ۱۱) یہ میں تمہارا رب ہوں، پس تم اپنے جوتے اتار دو، کیونکہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ ۱۲)

آگ کی جگہ کے قریب اللہ تعالیٰ کا حکم

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں آگ دیکھی تھی جب اس کے قریب پہنچے تو مسند احمد وغیرہ میں وہب بن منبہ کی روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس آگ کی طرف چلے اور اس کے قریب پہنچے تو ایک عجیب حیرت انگیز منظر دیکھا کہ ایک بڑی آگ ہے جو ایک

Marfat.com

ہرے بھرے درخت کے اوپر شعلے مار رہی ہے مگر حیرت یہ ہے کہ اس درخت کی کوئی شاخ یا پتا جلتا نہیں بلکہ آگ نے درخت کے حُسن اور تری و تازگی اور رونق میں اور زیادتی کردی ہے۔ یہ حیرت انگیز منظر کچھ دیر تک اس انتظار میں دیکھتے رہے کہ شاید کوئی چنگاری آگ کی زمین پر گرے تو یہ اٹھالیں۔ جب دیر تک ایسا نہ ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گھاس وغیرہ کے کچھ تنکے جمع کر کے اس آگ کے قریب کیا کہ ان میں آگ لگ جائے گی تو ان کا کام ہو جائے گا مگر جب یہ گھاس پھونس آگ کے قریب کیے تو آگ پیچھے ہٹ گئی اور بعض روایات میں یہ ہے کہ آگ ان کی طرف بڑھی یہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بہرحال آگ حاصل کرنے کا مطلب پورا نہ ہوا۔ یہ عجیب وغریب آگ سے حیرت کے عالم میں تھے کہ ایک غیبی آواز آئی (روح) یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ کے دامن میں پیش آیا جو ان کی داہنی جانب تھا اور جس کا نام طویٰ تھا۔

نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی ⑪ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ بحر محیط، روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے یہ آواز اس طرح سنی کہ ہر جانب سے یکساں آرہی تھی۔ اس کی کوئی جہت متعین نہیں تھی اور سننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کانوں سے نہیں بلکہ اعضاء بدن سے سنا گیا جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آواز کا حاصل یہ تھا کہ جس چیز کو آپؑ آگ سمجھ رہے ہیں وہ آگ نہیں اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی ہے اور اس میں فرمایا کہ میں ہی آپؑ کا رب ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس آواز کے متعلق یہ یقین کس طرح ہوا کہ حق تعالیٰ ہی کی آواز ہے۔ اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے قلب کو اس پر مطمئن کر دیا کہ وہ یقین کرلیں کہ یہ آواز حق تعالیٰ ہی کی ہے۔ دوسری اس آگ کے حیرت انگیز حالات کہ درخت کو جلانے کے بجائے اس کی تازگی اور حُسن بڑھا رہی ہے اور آواز بھی عام لوگوں کی آواز کی طرح نہیں کہ ایک سمت سے آئے بلکہ ہر طرف سے یہ آواز یکساں سنی جارہی ہے۔ دوسرے صُرف کانوں نے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء جو سننے کیلئے وضع نہیں ہوئے سب اس کی سماعت میں شریک تھے۔ اس سے بھی سمجھا گیا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز ہے۔

حق تعالیٰ کا کلامِ لفظی بلا واسطہ سنا

روح المعانی میں بحوالہ مسند احمد وہب کی روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب ندا ''یا موسیٰ'' کے لفظ سے دی گئی تو انہوں نے لبیک کہہ کر جواب دیا اور عرض کیا کہ میں آواز سن رہا ہوں مگر آواز دینے والے کی جگہ معلوم نہیں، آپ کہاں ہیں تو جواب آیا کہ میں تیرے اوپر، سامنے، پیچھے اور تیرے ساتھ ہوں۔ پھر عرض کیا کہ میں یہ کلام خود آپ کا سن رہا ہوں یا آپ کے بھیجے ہوئے کسی فرشتہ کا، تو جواب آیا کہ میں خود ہی آپ سے کلام کر رہا ہوں۔ اس پر صاحبِ روح فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کلام لفظی بلا واسطہ فرشتہ کے خود سنا ہے جیسا کہ اہل السنۃ والجماعت میں سے ایک جماعت کا مسلک یہی ہے کہ کلامِ لفظی بھی قدیم ہونے کے باوجود سنا جاسکتا ہے۔ اس پر جو شبہ حدوث کا کیا جاتا ہے اس کا جواب ان کی طرف سے یہ ہے کہ کلامِ لفظی اس وقت حادث ہوتا ہے جبکہ وہ مادی زبان سے ادا کیا جائے جس کیلئے جسم، سمت، جہت شرط ہے نیز سننے کیلئے صرف کان مخصوص ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس طرح سنا کہ نہ آواز کی کوئی جہت وسمت تھی اور نہ سننے کیلئے صرف کان مخصوص تھے بلکہ سارے اعضاء سن رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ صورت احتمال حدوث سے پاک ہے۔ واللہ اعلم۔ (معارف القرآن)

Marfat.com

پروردگار کا تعارف

اس آواز نے سب سے پہلے یہ غلط فہمی دور کی کہ اے موسیٰ تم جسے آگ سمجھ کے آئے ہو وہ آگ نہیں بلکہ میں تمہارا رب ہوں۔ تو تم اس وقت اپنے رب کے دربار اور اس کے حضور میں ہو۔ اس کا دربار چونکہ نہایت ادب کی جگہ ہے اس لئے اپنے جوتے اتار دو۔ تم بظاہر تو طور کی وادی میں ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی تجلیات کا مرکز بنا کر اپنے قرب کی جگہ بنا دیا ہے۔ اس لئے یہ جگہ کوہِ سینا کے دامن میں ہونے کے باوجود ایک مقدس وادی بن گئی ہے جس کا نام طویٰ ہے۔ اس وادی کے تقدس کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ تم اپنے جوتے اتار دو۔ زمین کی مٹی کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے طاہر اور مطہر بنایا ہے، اس کی وجہ سے جوتے کی ناپاکی بھی دور ہو جاتی ہے لیکن وہ جگہ جو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مرکز بن جائے وہاں انسان صرف پاکیزگی لئے ہی حاضر نہیں ہوتا بلکہ وہاں کی حاضری کیلئے ادب اور تواضع کا اہتمام بھی کرنا پڑتا ہے۔ اسلام میں ابتدائی زمانے میں اگرچہ مسجدوں میں جوتے سمیت جانے اور نماز پڑھنے کی اجازت تھی کیونکہ اس وقت پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ یہود نے احکام کے ظاہر کو جس طرح اس کی روح پر غالب کر دیا ہے اس کی مخالفت کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ صرف صفائی، پاکیزگی کے تصور کو پختہ کرنے کا اہتمام کیا جائے، لیکن بعد میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے معمول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو مسجد میں نہایت تواضع اور ادب کے ساتھ داخلے اور نماز پڑھنے کی ترغیب دی گئی۔ آج بھی نمازِ جنازہ وغیرہ چونکہ عام طور پر کھلے میدانوں میں ادا کی جاتی ہے تو اسے جوتے سمیت ادا کرنے میں کوئی ہرج نہیں، لیکن مسجدوں میں جوتا پہن کر داخل ہونا یقیناً تواضع اور ادب کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بشیر بن خصاصیہ کو قبروں کے درمیان جوتے پہن کر چلتے دیکھا تو آپؐ نے فرمایا کہ جب تم اس مکان سے گزرو جس کا احترام مقصود ہے تو اپنے جوتے اتار دو۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں بھی جوتا اتارنے کی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم طویٰ کی پاک وادی میں ہو۔

وَاَنَا اخْتَرْتُکَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ﴿۱۳﴾

(میں نے تجھ کو چن لیا ہے تو جو وحی کی جا رہی ہے اسے غور سے سنو۔ ۱۳)

حضرت موسیٰؑ پر آپؑ کی حیثیت کا انکشاف

پروردگار نے سابقہ آیتِ کریمہ میں اپنا تعارف کرایا، پھر اس جگہ کی شناخت بتائی جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کھڑے تھے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت واضح کی گئی ہے کہ آپؑ کا اس جگہ حاضر ہونا اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے مشرف ہونا ایک عام آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ یہ عنایات اس وجہ سے ہو رہی ہیں کہ آپؑ کو پروردگار نے چن لیا اور برگزیدہ کر لیا ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو نبوت دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب آپؑ اسی لمحے یقین کر لیجیے کہ آپؑ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور نبی چونکہ وہ ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی وحی اترتی ہے تو اب آپؑ پر وحی کی جا رہی ہے، اسے غور سے سنو، کیونکہ کلامِ الٰہی سننے کا ایک ادب ہے، اسے دوسرے کلام کی طرح لاپرواہی اور بے نیازی سے نہیں سنا جا سکتا۔ استماع کا لفظ لا کر جہاں کلامِ الٰہی کے سننے کے ادب کی طرف اشارہ ہے وہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف پوری طرح متوجہ کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو عزت اور عظمت عطا فرمائی جا رہی ہے اس کا اظہار بھی ہے اور ساتھ ہی

Marfat.com

ساتھ آپؑ کو جو نبوت کا عظیم منصب سونپا گیا ہے اس کی ذمہ داری کی طرف اشارہ بھی ہے۔

بعض روایات میں کہا گیا ہے (اگرچہ ان کی ثقاہت محلِ نظر ہے) کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس آیت کو سن کر اس طرح ادب کی تصویر بن کر کھڑے ہوگئے کہ دونوں ہاتھ اپنے عصا پر رکھ لئے اور ٹھوڑی اپنے ہاتھوں پر ٹکالی اور سراپا ادب بن کر کلام الٰہی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴿۱۴﴾

(بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی بندگی کرو اور میری یاد کیلئے نماز قائم کرو۔ ۱۴)

حضرت موسیٰؑ کو دی جانے والی اولیں تعلیم

یہ اولین تعلیم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی اور یہی تعلیم ہمیشہ تمام انبیائے کرام کو دی گئی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

1- سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اے موسیٰ تم جس آواز کو سن رہے ہو، یہ آواز تمہارے خدا کی آواز ہے۔ میں ہی اللہ ہوں جو تم سے مخاطب ہوں۔ دنیا نے اگرچہ ہمیشہ مجھے تسلیم کیا ہے لیکن جہاں تک میرے الٰہ ہونے کا تعلق ہے اس میں انہوں نے ہمیشہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ہر قوم نے اپنے اپنے حالات اور بگاڑ کے مطابق مختلف قوتوں کو میرا شریک بنایا ہے۔ ان کی پوجا پاٹ بھی کی ہے اور ان سے استمداد بھی کی ہے۔ لیکن تمہیں اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ جس طرح میں کائنات کا خالق ہوں اور میری تخلیق میں کسی کا کوئی دخل نہیں اسی طرح میں اس کائنات کا مالک اور آقا بھی ہوں۔ میں ہی اس کائنات کا حاکمِ مطلق ہوں۔ میں جس طرح غیر مشروط پرستش کرانے کا حق رکھتا ہوں اسی طرح میں مطاعِ مطلق بھی ہوں۔ میں رب ہونے کی وجہ سے جس طرح مخلوقات کو پالتا ہوں اور ان کی جسمانی ضروریات کی کفالت کرتا ہوں اسی طرح میں نے جن وانس کی معنوی اور روحانی تربیت کی ذمہ داری بھی لے رکھی ہے۔

2- جس ذات کی یہ صفات ہوں اسی ذات کو زیبا ہے کہ اس کی عبادت اور بندگی کی جائے۔ اس لئے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم صرف میری بندگی کرو اور مجھے ہی معبود مانو اور اس بندگی میں کسی اور کو شریک مت کرو۔ عبادت ایک وسیع لفظ ہے۔ جس طرح اس کے مفہوم میں پرستش داخل ہے اسی طرح اطاعت بھی اس کا حصہ ہے۔ اس لئے جس طرح میرے سوا کسی اور کی پوجا پاٹ نہیں ہوسکتی، کسی اور سے دل آباد نہیں کئے جاسکتے، کسی اور پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، کسی اور سے خوف نہیں کھایا جاسکتا، اسی طرح کسی اور کی غیر مشروط اطاعت بھی نہیں ہوسکتی۔ نہ اس کی پرستش میں کسی کو شریک کیا جاسکتا ہے نہ اس کی اطاعتِ مطلقہ میں کسی کو ساجھی بنایا جاسکتا ہے۔ پرستش اور اطاعت دونوں مل کر وفاداری اور غلامی کے جس مفہوم کو مکمل کرتی ہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہے۔

3- توحید اور عبادت کے تصور کو کامل اور راسخ کرنے کیلئے نماز قائم کرنے کا حکم دیا۔ اقامت کے لفظ سے اہتمام کی طرف اشارہ کیا کہ نماز خاموشی اور تنہائی میں پڑھنے سے مناجات کا حق تو ادا کیا جاسکتا ہے اور یقیناً اخلاص کو بھی اس سے جلا ملتی ہے، لیکن اس سے اقامت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اجتماعی طور پر انفرادی اور اجتماعی پابندی کے ساتھ اس طرح نماز ادا کی جائے کہ پہلے اس کے بلاوے کیلئے اذان گونجے، پھر لوگ کشاں کشاں مسجد کی طرف بڑھیں، لوگوں کا امام آگے بڑھے اور انتہائی نظم وضبط کے ساتھ صفیں سیدھی ہوں، امام بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کرے اور پھر اس کا کلام پڑھ کر سنائے اور لوگ پیچھے ہاتھ اٹھا کر یعنی پوری دنیا کو پیچھے پھینک کر

Marfat.com

نہایت آمادگی کے ساتھ غلام کی طرح ہاتھ باندھ کر غلاموں کی تصویر بن کر غلامی کے اظہار کیلئے کھڑے ہوں پھر اسی غلامی کی تکمیل کیلئے کبھی رکوع میں جھکیں، کبھی سجدے میں زمین پر سر رکھ دیں، کبھی قیام میں تن کر کھڑے ہو جائیں۔ اور مقصود اس سے صرف یہ ہو کہ دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے معمور ہوں، زبانیں اس کے ذکر سے زمزمہ سنج ہوں اور ماحول اللہ تعالیٰ کی کبریائی کی تصویر بن جائے۔

چنانچہ یہی وہ نماز ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی سب سے بڑی محافظ ہے اور تمام انبیائے کرام کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلے اسی کی ہدایت ہوئی اور اسی کے ذریعے سے بندہ اپنے عہد بندگی کو بار بار اس طرح یاد کرتا ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ کی یاد اس سے الگ نہیں ہوتی اور وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے نماز کو قائم رکھا، اس نے پورے دین کو قائم رکھا اور جس نے نماز کو ضائع کر دیا، اس نے پورے دین کو ضائع کر دیا۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ نماز قائم کر، تاکہ میں تجھے یاد کروں۔ جس طرح دوسری جگہ فرمایا گیا ہے فَاذْكُرُونِیْ اَذْكُرْكُمْ ''تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز جس طرح اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے، اسی طرح ایک بہت بڑی سعادت بھی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نماز قائم کرنے والوں کو یاد رکھتا ہے۔ اس شخص کی عظمت کا کیا کہنا جسے اس کا مالک یاد کرتا ہو کیونکہ اس کی یاد نہ صرف زندگی کی ضامن بلکہ دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ⑮

(بے شک قیامت ضرور آنے والی ہے، میں اسے مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ ۱۵)

توحید اور نماز کے بعد قیامت کی تلقین

توحید، عبادت اور نماز کے بعد اب قیامت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اٰتِيَةٌ کا لفظ لا کر ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، وہ یہ کہ ایسے لوگ بہت کم گزرے ہیں اور آج بھی کچھ زیادہ نہیں جو قیامت کے سرے سے منکر ہوں۔ عرب کھل کر قیامت کا انکار نہیں کرتے تھے البتہ! انہیں اس کے آنے کا یقین نہیں تھا۔ آج کا انسان بھی قیامت کا اقرار کرتا ہے لیکن اس کے اندر اس کے آنے کا یقین پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے سب سے پہلے یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ قیامت کا آنا حتمی اور یقینی ہے۔ کیونکہ اٰتِيَةٌ اسمِ فاعل ہے۔ اس کے اندر زور اور تاکید ہے۔ اس کا معنی صرف یہ نہیں کہ قیامت آئے گی بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ شدنی اور اٹل ہے۔ اس کے بعد اس کے آنے کا مقصد بیان کیا گیا ہے یعنی قیامت صرف اس لئے نہیں آئے گی کہ کائنات کی بساط لپیٹ دی جائے بلکہ اس لئے آئے گی کہ ہر فرد کو اس کے اعمال کی جزاء یا سزا ملے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا ہر عمل محفوظ رکھا جائے گا۔ اس کی ذہنی کاوشیں مجسم حالت میں سامنے لائی جائیں گی۔ اسے مخفی اس لئے رکھا گیا ہے تاکہ لوگوں کو ہمیشہ اس کے آنے کا کھٹکا لگا رہے۔ اگر اس کے آنے کو کھول دیا جاتا، تاریخ بتا دی جاتی، وقت طے ہو جاتا تو جو لوگ اس کی آمد سے بہت فاصلے پر ہوتے وہ لاپراہی کا شکار ہو جاتے۔ اور جو اس کے قریب زمانے میں ہوتے، ان کی آزمائش ادھوری رہتی۔ اس لئے صرف یہ بتایا گیا کہ وہ کسی وقت بھی آ سکتی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا کہ اس کی تیاری کیلئے انسان کی زندگی مہلت عمل بنائی گئی ہے۔ موت کے آ جانے کے بعد تیاری کا ہر عمل رک جائے گا۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا کہ جس کی موت آ گئی اس کی قیامت تو قائم ہو گئی۔ اس لئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ قیامت کب آئے گی، وہ کسی وقت بھی آئے ہر شخص کی زندگی ہی تیاری کا موقع ہے اس میں قیامت کی

Marfat.com

تعجیل یا تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ اگر ذہنوں میں یہ بات تازہ رہے کہ قیامت کسی وقت بھی آ سکتی ہے ہوسکتا ہے وہ ہماری زندگی میں آ جائے تو پھر کوئی شخص بھی آخرت کی تیاری سے غافل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے زور دے کر فرمایا گیا کہ قیامت آ کے رہے گی اور اس کا آنا اس لئے ضروری ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان کو آزمایا جائے کہ وہ اپنی زندگی کو حسنِ عمل سے آراستہ کرتا ہے یا خواہشات کی تکمیل میں صرف کر دیتا ہے۔

اَکَادُ اُخْفِیْھَا ...... کے الفاظ جملہ معترضہ کے طور پر آئے ہیں۔ اکثر مفسرین نے اَکَادُ کو اُرِیْدُ کے معنی میں لیا ہے جس سے شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں قیامت کو چھپا کے رکھنا چاہتا ہوں تا کہ لوگوں کو ہر وقت اس کے آنے کا اندیشہ رہے اور وہ عمل کیلئے کوشاں رہیں، لیکن بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اَکَادُ سے جملہ کے اندر ایک نیا مضمون پیدا ہو گیا ہے کہ میں اگرچہ قیامت کو چھپائے رکھنا چاہتا ہوں اور ابھی یہ پردہ میں ڈالے رکھوں گا لیکن خود قیامت کا حال یہ ہے کہ وہ بے نقاب ہوجانے کیلئے بے قرار ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ الاعراف میں بھی گزر چکا ہے۔ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْتَةً ''آسمان وزمین دونوں اس کے بوجھ سے گراں بار ہیں، وہ تمہارے اوپر بس اچانک ہی آ دھمکے گی۔''

فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْھَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِھَا وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ فَتَرْدٰی ﴿۱۶﴾

(پس نہ روکے تمہیں اس سے وہ شخص جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے کہ تم ہلاک ہو کر رہ جاؤ۔ ۱۶)

عَنْھَا اور بِھَا کی ضمیروں کا مرجع

مفسرین نے عَنْھَا اور بِھَا کی ضمیروں کے مرجع میں اختلاف کیا ہے۔ جمہور مفسرین کا خیال تو یہ ہے کہ دونوں ضمیروں کا مرجع السَّاعَةَ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقہ آیتِ کریمہ میں السَّاعَةَ کا لفظ گزرا ہے۔ قریب ہونے کی وجہ سے اسی کو دونوں ضمیروں کا مرجع ہونا چاہئے۔ جو شخص بھی دونوں آیتوں کو پڑھے گا وہ سیاقِ کلام سے خود بخود سمجھ جائے گا کہ یہاں السَّاعَةَ ہی ضمیروں کا مرجع ہے اور اسی پر زور دینا بھی مقصود ہے کیونکہ مذہب کی تاریخ اور انسانی فطرت دونوں اس بات پر شاہد ہیں کہ انسان جب بھی بگڑا ہے قیامت اور آخرت کے تصور سے بیگانہ ہو کر بگڑا ہے۔ جب کسی شخص کو اس بات کا یقین نہیں رہتا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب قیامت کا صور پھونکا جائے گا۔ محشر بپا ہوگا، اللہ تعالیٰ کی عدالت سجے گی اور تمام لوگ اپنے زندگی بھر کے افکار واعمال کا حساب دینے کیلئے عدالت کے کٹھہرے میں کھڑے کئے جائیں گے۔ اسی حساب اور جوابدہی کے نتیجے میں جزاء اور سزا کا ترتب ہوگا۔ یہ تصور جب تک یقین بنا رہتا ہے انسان آخرت کی تیاری سے غافل نہیں ہوتا اور جوابدہی کا احساس ہمیشہ اسے راہِ راست پر رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ اور جب یہ تصور یقین کی قوت سے محروم ہوجاتا ہے تو پھر اس کی زندگی غیر ذمہ داری اور غیر سنجیدگی کا ایسا نمونہ بن جاتی ہے کہ جس میں انسانی قدریں ختم ہوجاتی ہیں، اخلاق تباہ ہوجاتے ہیں اور انسان حیوانی زندگی اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیائے کرام کو جس تعلیم وتربیت کے منصب پر فائز کیا اس میں سب سے زیادہ زور آخرت کی یاددہانی پر تھا۔

بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ اور جن کی تعداد زیادہ نہیں کہ عَنْھَا کی ضمیر کا مرجع الصلوۃ یعنی نماز ہے۔ اور بِھَا کی ضمیر کا مرجع السَّاعَةَ یعنی قیامت ہے۔ اس میں اگرچہ انتشارِ ضمائر لازم آتا ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ انتشارِ ضمائر اس وقت کلام میں عیب

Marfat.com

ہوتا ہے جب اس پر کوئی قرینہ موجود نہ ہو اور یہاں قرینہ بالکل واضح ہے۔ اس آیت میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں یَصُدَّنَّ اور دوسرا یُؤْمِنُ اور زبان کا ذوق رکھنے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ روکنے کا تعلق نماز سے ہے اور ایمان لانے کا تعلق قیامت سے ہے۔ اس لئے یہاں مرجع کے تعین میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

یہ دوسری رائے بھی قابلِ احترام ہے لیکن آیتِ کریمہ کا مفاد اگر سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پیشِ نظر آیت اور سابقہ آیت میں تمام تر زور قیامت پر یقین پیدا کرنے کیلئے دیا گیا ہے۔ نماز کی یقیناً بے حد اہمیت ہے اور اس کا ذکر گزشتہ سے پیوستہ آیت میں ہو چکا ہے۔ کلام چونکہ ایک ترتیب سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس ترتیب کا تقاضا یہی ہے کہ ان دونوں آیتوں کو قیامت کے عقیدے کیلئے ہی مخصوص سمجھا جائے۔

وَاتَّبَعَ هَوٰهُ ...... یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی شناخت یہ ہے کہ وہ خواہشِ نفس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ چونکہ اسے اپنے اعمال کی جوابدہی کا کوئی کھٹکا نہیں رہتا اس لئے اسے سارے کھیت میں چرنے سے عار نہیں ہوتا۔ وہ ہر طرح کے مال اور ہر طرح کے مفادات کو خوانِ یغما سمجھتا ہے۔ حصولِ زر کا ہر ذریعہ اس کیلئے جائز ٹھہرتا ہے اور مال و دولت اور زندگی کی راحتوں کی اس کے نزدیک کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ میری زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ دنیا جمع کروں اور زیادہ سے زیادہ راحت و آرام اپنے لئے حاصل کروں۔ دولت، عزت اور اقتدار اس کے ایسے دیوتا ہیں جن کی وہ ہمیشہ پوجا کرتا رہتا ہے۔ کوئی اخلاقی وعظ اور کوئی حرفِ دانش اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ نتیجہ آخر یہ ہوتا ہے کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھ نہ جانے کس کس کو لے کر ڈوبتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا، ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ⑰

(اور اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ 17)

عربی زبان میں ہماری زبان کی طرح یمین و یسار یعنی دایاں اور بایاں دونوں ہاتھوں کیلئے بولے جاتے ہیں، لیکن کبھی یمین کا لفظ اس تقسیم سے مجرد ہو کر بھی صرف ہاتھ کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور یہاں صرف ہاتھ ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ ؑ سے سوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دین کے بنیادی حقائق کا علم دینے اور بعض ضروری اخلاقی صداقتوں پر توجہ دلانے کے بعد نہایت اپنائیت سے سوال کیا کہ اے موسیٰ! آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟ آپ کے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو ایک ہی نظر میں دیکھنے سے معلوم نہ ہوتی۔ ایک لاٹھی تھی جو اکثر آپؑ کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اس لئے سرسری نظر میں بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پروردگار کا یہ سوال کسی تحقیق کیلئے نہیں بلکہ اظہارِ التفات و نوازش کیلئے تھا۔ جس طرح باپ بعض دفعہ اپنے بیٹے کو ازراہِ محبت ایسی چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے جس کو وہ بیٹے سے زیادہ جانتا ہے۔ اسی طرح پروردگار نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کیا۔ اور اس سے شاید یہ مقصود بھی ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی

Marfat.com

طرح یہ بات ذہن میں تازہ کرلیں کہ ان کے ہاتھ میں ایک سادہ سی لاٹھی ہے جس سے چھوٹے موٹے کام لئے جاسکتے ہیں، اس میں کوئی غیر معمولی صلاحیت نہیں۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾

(عرض کی یہ میرا عصا ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کیلئے پتے جھاڑتا ہوں اور میرے لئے اس میں کئی اور فائدے بھی ہیں۔ ۱۸)

اَتَوَكَّؤُا...... ٹیک لگانا، سہارا لینا۔ اَهُشُّ...... درختوں کے پتے جھاڑنا۔ مَاٰرِبُ...... اس کا واحد مَاْرُبَةٌ، مَاْرِبَةٌ، مَاْرَبَةٌ اس کا معنی ہے حوائج۔

حضرت موسیٰ ؑ کا جواب

سوال کا جواب صرف اتنا بھی ہوسکتا تھا کہ یہ میری لٹھیا ہے کیونکہ اس قدر جواب کفایت کرتا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپؑ نے عرض کیا کہ یہ میری وہ لاٹھی ہے کہ جب میں تھک جاتا ہوں تو اس پر ٹیک لگالیتا ہوں یا ایسی ہی کوئی اور ضرورت لاحق ہوتی ہے تو تب بھی اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اسی لاٹھی کے ذریعے میں اپنی بکریوں کیلئے پتے جھاڑتا ہوں کیونکہ میرا کام بکریوں کو چرانا ہے، شاخیں بلند ہونے کی وجہ سے جب بکریاں خود پتوں تک نہیں پہنچ سکتیں تو میں اپنی لاٹھی سے ان کے کھانے کیلئے پتے جھاڑتا ہوں۔ اسی طرح اور بھی کئی کام میں اس سے لیتا ہوں۔ اس تفصیل کو صرف سوال کا جواب کہنا تو مشکل ہے، اس میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے محسوس کیا کہ میں اپنے خالق و مالک اور اپنے آقا سے ہمکلام ہوں۔ یہ ایسا شرف ہے جو کبھی کسی انسان کو میسر نہیں آیا اور میں بھی نہیں جانتا کہ یہ لمحہ پھر بھی لوٹ کے آئے گا یا نہیں۔ تو مجھے ان لمحات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کیلئے اپنے جواب کو طویل کرنا چاہئے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی عنایات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکوں اور لطفِ کلام سے دیر تک حظ اٹھا سکوں۔ اور کیا عجب کہ میرے جواب کی طوالت سے مزید سوال و جواب کی راہ کھلے اور مجھے مزید شرفِ ہمکلامی سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے۔ یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جس ذات سے کوئی شخص دل و جان سے محبت کرتا ہے اور اسے اپنی رسائی سے بہت بلند سمجھتا ہے تو اگر کبھی ایسے محبوب کے آستانے پر حاضری کا موقع ملے تو وہ یقیناً ہزار بہانوں سے اسے طویل تر کرنے کی کوشش کرے گا۔ ایسی ہی کچھ کیفیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی معروضات میں کسی حد تک تفصیل سے کام لیا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾

(پروردگار نے فرمایا، اس کو زمین پر ڈال دو، اے موسیٰ۔ ۱۹) حضرت موسیٰ نے اسے ڈال دیا تو دفعتاً وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بن گیا۔ ۲۰)

Marfat.com

عصائے موسیٰ ایک معجزہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کے جوفوائد بیان فرمائے اور اس کی جن صلاحیتوں کی طرف اشارہ کیا ان میں سے کوئی بات بھی غیر معمولی نہ تھی۔ ہر چرواہے کے ہاتھ میں ایسی ہی لاٹھی ہوتی ہے اور وہ اس سے ایسے ہی کام لیتا ہے، لیکن پروردگار نے حکم دیا کہ اے موسیٰ! اسے زمین پر ڈال دو اور پھر قدرتِ خداوندی کا کرشمہ دیکھو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اسے زمین پر ڈال دیا۔ ڈالنے کی دیر تھی وہ تو ایک سانپ بن گیا۔ اس آیت میں تو اس سانپ کیلئے حَيَّةٌ کا لفظ آیا ہے۔ جو عام سانپ کیلئے بولا جاتا ہے۔ یہ اسم جنس ہے اور اس کا اطلاق چھوٹے اور بڑے اور مذکر اور مونث ہر طرح کے سانپ پر ہوتا ہے اور سورۃ الاعراف آیت ۱۰۷ میں اسے ثعبان مبین کہا گیا ہے۔ اس کا معنی بہت بڑا سانپ یا اژدھا ہے۔ اور سورۃ النمل آیت ۱۰ میں اسے جَآنٌّ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا اطلاق باریک سانپ پر کیا جاتا ہے۔ ان تینوں آیات کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں تو ایک اژدھا تھا، لیکن جب وہ دوڑتا تھا تو باریک سانپ کی طرح تیزی سے دوڑتا تھا۔ کیونکہ بڑے تن و توش والا سانپ کبھی بھی تیز نہیں دوڑ سکتا اور اس کے جسم میں پھرتیلا پن نہیں ہوتا۔ وہ اپنے جسم کو بڑی مشکل سے حرکت دیتا ہے۔ لیکن یہ عجیب طرح کا سانپ تھا کہ دیکھنے والا اژدھا سمجھ کر اس سے خوف کھاتا تھا۔ لیکن جب وہ حرکت میں آتا تھا تو اس کی تیزی کے مقابلے میں کوئی سانپ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اور یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پہلی دفعہ جب اس معجزے کا ظہور ہوا تو آپؑ کی لاٹھی ایک عام سانپ کی طرح آپؑ کے سامنے بل کھانے اور دوڑنے لگی۔ اس سے تو صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ ہم نے اس لاٹھی میں سانپ بننے کی صلاحیت رکھی ہے تو آپؑ جب بھی اس سے کام لینا چاہیں گے یہ آپؑ کیلئے سانپ بن جائے گی لیکن جب آپؑ کو فرعون کے سامنے تبلیغ و دعوت کیلئے جانا پڑا اور آپؑ نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے نمائندے کے طور پر اس کے سامنے پیش کیا تو آپؑ نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ میں واقعی اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوں، اسے کوئی نشانی دکھانا چاہی تو آپؑ نے عصا اس کے سامنے پھینکا تو اس وقت وہ عام سے سانپ کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا بلکہ وہ اژدھا بن گیا تاکہ فرعون اور اس کے مصاحبین یہ دیکھ کر سہم جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ لوگ خوف زدہ ہو گئے اور آپؑ کیخلاف کوئی بڑا اقدام کرنے کی کبھی جرأت نہ کر سکے۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْأُوْلٰى ﴿۲۱﴾

(اللہ نے فرمایا کہ اسے پکڑ لو اور ڈرو نہیں، ہم اس کو پھر اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ ۲۱)

جیسے ہی آپؑ کا عصا سانپ کی صورت میں ظاہر ہوا تو آپؑ اسے دیکھ کر ڈر گئے کیونکہ سانپ کو دیکھ کر ڈرنا ایک امر طبعی ہے۔ ہر انسان اچانک سانپ کو دیکھے تو ڈر جاتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تو خواب و خیال میں بھی نہ ہو گا کہ میری لاٹھی اچانک سانپ بن جائے گی۔ وہ جس لاٹھی کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ اسے سانپ مارنے کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے تو وہ خود سانپ بن گئی، تو آپؑ کا اس سے خوف کھانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہاں اگر آپؑ اسے دیکھ کر بالکل نہ ڈرتے تو یہ خلافِ فطرت بات ہوتی اور اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ آپؑ کو شاید پہلے سے معلوم تھا کہ میری لاٹھی سانپ بن جائے گی۔ چنانچہ جیسے ہی آپؑ اسے دیکھ کے ڈرے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اے موسیٰ، اسے پکڑ لو۔ ہم اسے دوبارہ پہلی حالت پر لوٹا دیں گے یعنی جیسے یہ پہلے لاٹھی تھی ویسی ہی لاٹھی بن جائے گی۔

Marfat.com

وَاضۡمُمۡ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ اٰیَۃً اُخۡرٰی ﴿۲۲﴾

(اور دبا لو اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے وہ وہاں سے ایک دوسری نشانی بن کر چٹا سفید بغیر کسی مرض کے برآمد ہوگا۔ ۲۲)

ید بیضا، دوسرا معجزہ

عصائے موسیٰ کے سانپ بن جانے کے معجزے کے بعد دوسرا معجزہ پروردگار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ عطا فرمایا کہ تم اپنا ہاتھ بغل میں دباؤ۔ جب تم اس کو بغل سے نکالو گے تو وہ اس طرح چمکتا ہوا نکلے گا جیسے سورج چمکتا ہے۔ بَیۡضَآءَ کا اطلاق ایسی سفید چیز پر ہوتا ہے جو روشن اور چمکدار ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنا ہاتھ بغل میں دبا کر نکالتے تھے تو وہ ایسے چمکتا تھا کہ اس سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں یہ دوسرا معجزہ تھا جو پروردگار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا۔ سانپ کا معجزہ خوف، دہشت اور طاقت کی علامت تھا جس کی وجہ سے کوئی دشمن حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حملہ نہیں کر سکتا تھا اور ید بیضا کا معجزہ روشنی کا استعارہ تھا۔ گویا آپؑ اپنے ساتھ ایک ایسی ہدایت لے کر آئے تھے جو انسانوں کی زندگیوں میں ایک روشن انقلاب کی نوید تھی۔ اس کے قبول کر لینے سے زندگی اور ماحول میں ایسی روشن تبدیلی آ سکتی تھی جس سے انسان کی قسمت جگمگا اٹھتی۔

مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ کا مفہوم

بَیۡضَآءَ کے بعد مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ کا اضافہ ایک غلطی کے ازالے کیلئے کیا گیا۔ تورات میں یہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سینے پر رکھ کر اپنا ہاتھ ڈھانپ لیا اور جب اسے نکالا تو وہ برص کی طرح سفید تھا۔ گویا آپؑ کا ہاتھ برص کی بیماری میں مبتلا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا یہ تو ایک معجزہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کے ہاتھ کو سفیدی اور چمک عطا فرمائی تھی لیکن اس میں کوئی بیماری نہ تھی۔ یہاں سوء کا لفظ بیماری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور مزید اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ آپؑ کے ہاتھ میں یہ تبدیلی اس وقت آئے گی جب آپؑ بغل سے اسے نکالیں گے، ورنہ عام حالت میں ہاتھ ویسے ہی رہے گا جیسے قدرت نے اسے بنایا ہے اور بیماری کے بارے میں یہ کہنا ضروری نہیں کہ بیماری وقتی نہیں ہوتی مستقل ہوتی ہے۔ جب تک اس بیماری سے شفاء حاصل نہیں کر لی جاتی۔ ایسی تو کوئی بیماری نہیں ہوتی کہ بغل سے ہاتھ نکالو تو وہ بیماری ظاہر ہو جائے اور کچھ دیر بعد پھر ہاتھ اپنی اصلی حالت میں آ جائے۔ قرآنِ کریم نے تورات کی اس غلطی کی اصلاح فرمائی۔ نیز اس کے بعد ارشاد فرمایا اٰیَۃً اُخۡرٰی یہ مستقل جملہ نہیں بلکہ یہ دوسرا حال ہے۔ ایک حال تو یہ ہے کہ وہ بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا نکلے گا اور دوسرا حال یہ ہے کہ وہ ایک دوسری نشانی بن کے نکلے گا۔

لِنُرِیَکَ مِنۡ اٰیٰتِنَا الۡکُبۡرٰی ﴿۲۳﴾

(تاکہ ہم اپنی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بعض کا تمہیں مشاہدہ کرائیں۔ ۲۳)

دو معجزات دینے کے بعد پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ صرف انہی دو معجزات پر اکتفا کیا جائے گا بلکہ آئندہ چل کر ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بڑی بڑی فتوحات سے نوازیں گے۔ یہ دو معجزات تو تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے جیسے آئندہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں مزید معجزات کی ضرورت پڑے گی اور دشمن کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی مزید تائید

Marfat.com

اور نصرت کی حاجت محسوس ہوگی تو ہماری قدرت وقہر مانیت اور خوارق ظہور پذیر ہوں گے۔ چنانچہ اسی عصائے موسیٰ سے اور کیسے کیسے کرشمے دیکھنے میں آئے۔ بحر قلزم میں راستے اسی عصائے موسیٰ کے مارنے سے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائے اور اسی عصا سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹے۔ من وسلویٰ کی صورت میں بنی اسرائیل کو غذا دی گئی۔ پوری قوم کے سر پر بادلوں کا سائبان تان دیا گیا۔ اسی طرح کے اور معجزات جب ضرورت پڑے گی عطا فرمائے جائیں گے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ معجزات کے باب میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ انبیائے کرام کو اس وقت معجزات عطاء فرمائے گئے ہیں جب ان کی قوموں نے شدت سے ان کا مطالبہ کیا اور مقصود ان سے یہ ہوتا تھا کہ اس سے ان پر اتمامِ حجت ہوجائے اور حق سے انحراف کیلئے کوئی عذر ان کے پاس باقی نہ رہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ کیوں ہوا کہ ادھر آپؑ کو نبوت دی گئی اور ادھر آپؑ کو دو معجزات عطا فرما دیئے گئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسی حکمران کے پاس ہدایت کیلئے بھیجا جا رہا تھا جو نہایت سرکش اور نہایت ظالم واقع ہوا تھا۔ اس کے پاس غیر مسلح حالت میں جانا اپنے آپ کو خطرات میں جھونکنے کے مترادف تھا۔ فرعون جیسے منتقم اور جبار حکمران سے یہ کوئی بعید نہ تھا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو دیکھتے ہی قتل کا حکم دے دیتا یا اور کوئی فوری اقدام کر گزرتا۔ اس لئے حضرت موسیٰ حضرت ہارون کو عصائے موسیٰ جیسے معجزے سے مسلح کر کے بھیجا گیا کہ جس کے ہوتے ہوئے آپ کو اچانک احتساب میں لانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے آپؑ نے فرعون سے پہلی ہی ملاقات میں ان دونوں معجزات کا اظہار بھی کر دیا تاکہ فرعون اور آلِ فرعون کو اندازہ ہوجائے کہ موسیٰ اور ہارون اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت کے ساتھ بھیجے گئے ہیں اور جس ذات نے انہیں ان قوتوں سے مسلح کیا ہے وہ تمہارے تخت الٹنے اور تاج چھیننے کی بھی قوت رکھتا ہے۔ اس کے دریاؤں کا پانی تم پر جھپٹ سکتا ہے اور زمین تمہارے پاؤں تلے سے کھینچی جا سکتی ہے۔ یہی وہ تصور تھا جس نے فرعون جیسے کم ظرف اور بد باطن شخص کو کسی بڑے اقدام سے روکے رکھا اور کئی سالوں تک مصر میں آپؑ کو دعوت کا کام کرنے کا موقع ملا اور بالآخر آپؑ بنی اسرائیل کو لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾

(تم فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔ ۲۴)

حضرت موسیٰؑ کو اداءِ رسالت کیلئے پہلا حکم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی گئی اور پھر انہیں سندِ ماموریت کے طور پر اور ظالم حکمران کے دفاع کیلئے معجزات عطا فرمانے کے بعد جو پہلا حکم دیا گیا وہ یہ تھا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔ اس کی سرکشی اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بھی تھی اور بندوں کے ساتھ بھی۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی سرکشی کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ کہلاتا تھا۔ وہ مصریوں کے سب سے بڑے دیوتا سورج کا اپنے آپ کو اوتار کہتا تھا اور مصریوں کے دل و دماغ پر اپنے آپ کو مسلط کرنے کیلئے جا بجا اس کے اسٹیچو اور بت نصب کئے گئے تھے اور

Marfat.com

لوگوں کو ان کی پوجا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور بندوں کے ساتھ اس کا معاملہ یہ تھا کہ وہ امراء کی ایک محدود تعداد کے علاوہ لوگوں کو سر اٹھا کے چلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور بنی اسرائیل کو اس حد تک دبا کے رکھا گیا تھا کہ جب اس نے محسوس کیا کہ ان کی افرادی قوت بڑھتی جا رہی ہے اور ان کی نسل میں اضافہ دوسری قوموں کی نسبت کہیں زیادہ ہے تو اس نے سیاسی خود غرضی سے کام لیتے ہوئے حکم دے دیا کہ ان کے نوزائیدہ بچوں کو قتل کر دیا جائے یا دریائے نیل میں بہا دیا جائے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھا جائے تا کہ ان سے لونڈیوں کی طرح گھر کی خدمت بھی لی جائے اور سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بھی بنایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یوں تو تمام اہلِ مصر کی طرف مبعوث کیے گئے تھے لیکن مصریوں کے سامنے دعوتِ عام دینے سے پہلے آپؑ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ شخصی حکومتوں میں اور وہ بھی فرعون جیسی جابرانہ حکومت میں بادشاہ کی مرضی کیخلاف براہِ راست عوام کے سامنے دعوت پیش کرنا اور ان کی اصلاح کیلئے کام کا آغاز کرنا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور تھا۔ بادشاہِ وقت اگر دعوت سے متاثر ہو جائے اور وہ ایمان لے آئے تو پھر اس کی رعایا کا دعوت قبول کر لینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ لوگ ہمیشہ اپنے بادشاہوں کے دین پر چلتے ہیں۔ اسی لئے انبیائے کرام کا طریقِ دعوت ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ سب سے پہلے ان قوتوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہیں جنہیں لوگوں پر کسی طرح کا بھی اثر و اقتدار حاصل ہوتا ہے تا کہ ان کی قبولیت سے لوگوں میں کام کرنا آسان ہو جائے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ قبول کرنے کی بجائے مخالفت اور معاندت پر اتر آئے ہیں تو پھر وہ عام لوگوں کو اپنی دعوت کا ہدف بنا کر اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کیلئے وقف کر دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی حکمت کے پیشِ نظر سب سے پہلے فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَ
يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾
وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾
وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ
كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ
مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾ اَنِ
اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ
يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ڬ وَلِتُصْنَعَ

Marfat.com

عَلٰى عَيْنِىْ ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِىْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ
يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَقَتَلْتَ
نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۬ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِىْۤ
اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿٤٠﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ
لِنَفْسِىْ ﴿٤١﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِىْ وَلَا تَنِيَا فِىْ ذِكْرِىْ ﴿٤٢﴾
اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ
اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَاۤ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ
لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِىْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ
فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ
مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِىَ اِلَيْنَاۤ
اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿٤٩﴾
قَالَ رَبُّنَا الَّذِىْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿٥٠﴾ قَالَ فَمَا بَالُ
الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ فِىْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ
وَلَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا
سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ
شَتّٰى ﴿٥٣﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى النُّهٰى ﴿٥٤﴾

Marfat.com

رکوع: ۲۔ (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرے سینے کو میرے لئے کھول دے۔ ۲۵) اور میرے کام کو آسان کر دے۔ ۲۶) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ ۲۷) تا کہ لوگ میری بات سمجھیں۔ ۲۸) اور میرے خاندان سے میرو زیر بنا دے۔ ۲۹) میرے بھائی ہارون کو۔ ۳۰) اس سے مضبوط کر میری کمر کو۔ ۳۱) اور اس کو میری ذمہ داری میں شریک بنا۔ ۳۲) تا کہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح کریں۔ ۳۳) اور زیادہ سے زیادہ تیراذکر کریں۔ ۳۴) بیشک تو ہمارا نگران رہا ہے۔ ۳۵) فرمایا ملا تجھ کو تیرا سوال اے موسیٰ (تیری درخواست منظور ہوئی)۔ ۳۶) اور ہم نے تم پر ایک بار اور بھی احسان کیا تھا۔ ۳۷) جبکہ ہم نے تمہاری ماں کو وحی کی جو آگے وحی کی جا رہی ہے۔ ۳۸) کہ اس کو صندوق میں رکھ دو پھر اس کو دریا میں ڈال دو، پس دریا اس کو کنارے پر ڈال دے کہ اس کو اٹھا لے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے، میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی تا کہ تم پرورش پاؤ میری آنکھ کے سامنے۔ ۳۹) جبکہ تمہاری بہن جاتی اور یہ کہتی تھی کہ کیا میں تمہیں بتاؤں وہ شخص جو اس کی پرورش کر سکتا ہے، پس ہم نے تم کو تمہاری ماں کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمناک نہ ہو۔ اور تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تم کو غم سے نجات دی، ہم نے تمہیں خوب اچھی طرح پرکھا، پھر تم کئی سال اہلِ مدین میں رہے، پھر تم آ گئے ایک اندازہ کئے ہوئے وقت پر، اے موسیٰ۔ ۴۰) میں نے اپنی ذات (کارِ خاص) کیلئے مخصوص کر لیا ہے۔ ۴۱) اب تم اور تمہارا بھائی میری آیات لے کر جاؤ، اور میرے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا۔ ۴۲) تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ ۴۳) پس اسے نرمی سے دعوت دو، شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈرنے لگے۔ ۴۴) دونوں نے عرض کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرے یا اس کی سرکشی اور بڑھ جائے۔ ۴۵) فرمایا تم اندیشہ نہ کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، (ہر بات) سن رہا ہوں اور (ہر چیز) دیکھ رہا ہوں ۴۶) پس اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو دکھ نہ پہنچا، ہم تیرے رب کی طرف سے ایک بڑی نشانی بھی لے کر آئے ہیں اور سلامتی اس شخص پر ہے جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ ۴۷) ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ہے جو جھٹلائیں اور روگردانی کریں۔ ۴۸) فرعون نے سوال کیا: اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ ۴۹) حضرت موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی۔ ۵۰) اس نے پوچھا تو پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے؟ ۵۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ پہلی قوموں کا حال میرے رب کے پاس، ایک رجسٹر میں (محفوظ) ہے، نہ میرا رب بھٹکتا ہے نہ بھولتا ہے۔ ۵۲) وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہارے لئے راستے نکالے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس سے مختلف نباتات کی گوناگوں قسمیں پیدا کر دیں۔ ۵۳) کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو چراؤ، اس کے اندر اہلِ عقل کیلئے نشانیاں ہیں۔ ۵۴)

Marfat.com

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ﴿٢٧﴾
يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ﴿٢٩﴾ هَارُونَ أَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ﴿٣١﴾
وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ﴿٣٢﴾

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرے سینے کو میرے لئے کھول دے۔ ۲۵) اور میرے کام کو آسان کردے۔ ۲۶) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ ۲۷) تاکہ لوگ میری بات سمجھیں۔ ۲۸) اور میرے خاندان سے میرو زیر بنادے۔ ۲۹) میرے بھائی ہارون کو۔ ۳۰) اس سے مضبوط کر میری کمر کو۔ ۳۱) اور اس کو میری ذمہ داری میں شریک بنا۔ ۳۲)

منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے دعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے اپنے منصب کی بجا آوری کیلئے جانے کا حکم دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی منصبی ذمہ داریوں کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے متذکرہ بالا دعائیں کیں۔ ان میں سے پہلی دعا یہ تھی کہ پروردگار میرے سینے کو کھول دے، یعنی شرح صدر فرمادے۔ اس دعا کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلی چیز جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبوت اور رسالت بہت بڑا منصب ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ کوئی شخص بڑی سے بڑی محنت اور صلاحیت سے بھی اسے حاصل نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انبیائے کرام اس منصب کے ملنے کے بعد اپنے آپ کو بہت گراں بار محسوس کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے جانے والے علومِ نبوت کا تحمل، اللہ تعالیٰ کا دین لوگوں تک پہنچانے کیلئے جانگسل محنت و ریاضت لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے ناگفتہ بہ سلوک کی برداشت اور ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کیلئے جرأت و استقامت اس راہ کی ناگزیر سنتیں ہیں جن کا تصور ہی کپکپا دینے کیلئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی جب ان میں سے ایک ایک چیز کا احساس کرتے ہیں تو وہ کانپ اٹھتے ہیں۔ اس ذمہ داری کے منصب کی گراں باریوں سے سینہ بھنچنے لگتا ہے تو وہ بے ساختہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دستِ دعا پھیلا دیتے ہیں۔ الٰہی! جس عظیم کام کیلئے مجھے چنا گیا ہے میرا سینہ اس کیلئے کھول دے، میرے سینے میں جو اضطراب اور تردد پیدا ہو رہا ہے اس کو دور فرمادے، میرے سینے کی خلش کو ہمت و عزیمت سے تبدیل کردے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عظیم منصب کی نزاکتوں کو محسوس کرتے ہوئے سب سے پہلے یہی دعا فرمائی۔ پھر دوسری دعا مانگی کہ الٰہی! میرے کام کو آسان فرمادے، کیونکہ میری فہم و فراست اور میرا حوصلہ اور تدبر اس عظیم مہم کی کامیابی کی ضمانت نہیں بن سکتے۔ اس راستے کی مشکلات کو دور کرنا تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے تو اپنے فضل و کرم سے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور فرمادے۔ ہمارے رسول پاک ﷺ کی بھی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپؐ ہر کام سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ الْطُفْ بِنَا فِي تَيْسِيرِ كُلِّ عَسِيرٍ فَإِنَّ تَيْسِيرُ كُلِّ عَسِيرٍ عَلَيْكَ يَسِيرٌ

''اے اللہ! ہم پر مہربانی فرما، ہر مشکل کام کو آسان کرنے کیلئے، کیونکہ ہر مشکل کام کا آسان کردینا آپ کے لئے بہت آسان ہے۔''

Marfat.com

زبان کی گرہ کھولنے کا مفہوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیسری دعا فرمائی کہ یا اللہ میری زبان کی گرہ کھول دے تا کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

ہمارے قدیم مفسرین نے ''عُقْدَۃً'' سے زبان کی لکنت مراد لی ہے اور اس کی تائید میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام دودھ پیتے رہے تو اپنی والدہ کے پاس رہے اور جب دودھ چھڑا دیا گیا تو فرعون کے گھر میں لائے گئے اور وہیں تربیت پانے لگے۔ جب ذرا کھیلنے کی عمر کو پہنچے تو ایک دن فرعون اور اس کی بیوی آسیہ کے پاس کھیل رہے تھے کہ اچانک فرعون کی ڈاڑھی پکڑ لی اور ایک روایت میں ہے کہ ایک چپت بھی رسید کی اور بعض دوسری روایات کے مطابق فرعون کا تاج اتار کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ فرعون اس پر برہم ہو گیا اور اس نے آپؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آسیہ نے کہا: شاہا! آپ بچے کی بات کا کیا برا مناتے ہیں، بچہ تو کسی بات کی سمجھ نہیں رکھتا وہ تو ہر بات کو کھیل سمجھتا ہے، آپ چاہیں تو اس کا تجربہ کر لیں۔ چنانچہ تجربے کیلئے ان کے سامنے ایک تھال میں دھکتے انگارے رکھے گئے اور دوسرے تھال میں ہیرے جواہرات۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواہرات کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپؑ کا ہاتھ پکڑ کر انگاروں کی طرف بڑھا دیا۔ آپؑ نے انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا جس سے آپؑ کی زبان جل گئی اور لکنت پیدا ہو گئی جو نبوت تک آپؑ کی زبان میں باقی رہی۔ اسی کو تفسیر مظہری اور قرطبی نے بھی روایت کیا ہے۔ لیکن یہ روایت کئی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی صحیح روایت میں ایسی کوئی بات ذکر نہیں کی گئی اور جو روایات اس سلسلے میں وارد ہیں وہ نہایت ضعیف بلکہ موضوع ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ خود ان روایات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ بعض روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ آپؑ کی زبان میں لکنت پیدائشی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انگارہ منہ میں ڈالنے کا واقعہ افسانے کے سوا کچھ نہیں۔ اور بعض روایات میں فرعون کے سر سے تاج اتارنے کا ذکر ہے اور بعض روایات میں ڈاڑھی نوچنے کا اور اگر درایت سے کام لیا جائے تو تب بھی اس روایت کا قبول کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ بچہ جو چلنے اور کھیلنے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے وہ بڑی آسانی سے آگ کی تپش کو محسوس کر سکتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بجائے کسی ہیرے کو اٹھانے کے انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا کیونکہ جیسے ہی آپؑ نے انگارہ ہاتھ میں لیا ہو گا تو ہاتھ کی جلن سے بیتاب ہو کر یقیناً آپؑ بچے کی طرح چیخے ہوں گے۔ اولاً تو انگارے کو ہاتھ میں پکڑنا بچے کیلئے ناممکن ہے اور پھر اسے اٹھا کر منہ میں ڈالنا تو سراسر خلافِ عقل ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایسا کیا تو یہ بات بھی چنداں قابلِ قبول نہیں کیونکہ بجائے اس کے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطے سے آپؑ کا ہاتھ جلایا جاتا، یہ بات زیادہ آسان تھی کہ آپؑ کا ہاتھ فرعون کے تاج یا ڈاڑھی تک نہ پہنچنے دیا جاتا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ لکنت پیدائشی طور پر آپؑ کی زبان میں تھی تو یہ بات اس لئے قبول کرنا مشکل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی جس طرح سیرت و کردار میں اہلِ دنیا سے بلند اور بے عیب ہوتے ہیں اسی طرح وہ کسی خلقی عیب میں بھی مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ اپنے دور کے خوبصورت ترین فرد سمجھے جاتے ہیں۔ لکنت ایک ایسا عیب ہے جس سے انسان کی تضحیک ہوتی اور شخصیت بے وزن ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی میں ایسی کسی چیز کا ہونا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

جدید مفسرین کا خیال یہ ہے کہ ''عُقْدَۃً'' سے مراد زبان کی لکنت نہیں بلکہ خطابت کی صلاحیت کا نہ ہونا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اندر اظہار و بیان کے وقت ایک جھجک محسوس کرتے تھے اور یہ ایسی چیز ہے جس کا تعلق زبان کی لکنت سے نہیں بلکہ طبیعت کے انداز سے ہے۔ ہماری تاریخ میں ایسے لوگ گزرے ہیں جو اپنی تمام تر ذاتی وجاہت کے باوجود تقریر کرنے پر قادر نہیں تھے۔ گفتگو بہت اچھی کرتے تھے

Marfat.com

لیکن اسٹیج پر آنا پسند نہ تھا۔ برصغیر کے مشہور فقیہ مفتی کفایت اللہ مرحوم گزرے ہیں ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ گفتگو میں بہت مشاق تھے اور نثر نویسی میں بھی کسی سے کم نہ تھے، لیکن تقریر کبھی نہیں کرتے تھے۔

اس آیتِ کریمہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اندر خطابت کا ولولہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ کبھی تقریر کی امنگ آپؑ کے اندر پیدا نہیں ہوئی اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اب جب آپؑ پر ایک ایسی ذمہ داری ڈالی گئی جس کی ادائیگی کیلئے خطابت ایک لازمی ضرورت تھی۔ کیونکہ ایک رسول کیلئے سب سے پہلا کام اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں خطابت اور تقریر ہی ابلاغ و دعوت کا سب سے بڑا ذریعہ تھا کیونکہ وہ زمانہ پریس کا زمانہ نہ تھا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے کیونکہ تورات تحریری شکل میں نازل ہوئی تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخبار اور جرائد اس زمانے میں ناپید تھے۔ کسی بات کو عام کرنے کا ذریعہ خطابت اور زبان آوری تھی جس کی قوت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپؑ اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قادر نہیں تھے۔ آپؑ کی گفتگو میں کوئی کمزوری نہ تھی، لیکن اب ذمہ داری وہ آپڑی تھی جس کیلئے نہایت فصاحت و بلاغت کی ضرورت ہے۔ اس لئے آپؑ نے دعا فرمائی۔ یا اللہ! میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنادے اور اس سے میری کمر کو مضبوط کردے۔ اس دعا میں تو صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ میرے بھائی ہارون جو میرے اہل میں سے ہیں انہیں میرے کام میں شریک فرمادے، یعنی جس ذمہ داری پر مجھے فائز کیا گیا ہے اس میں انہیں بھی شریک کردیجئے تاکہ ہم دونوں مل کر اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھاسکیں۔ وزیر کا معنی ہی بوجھ اٹھانے والا اور ذمہ داری میں ہاتھ بٹانے والا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم میں بعض دوسری آیات میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ سورۂ قصص آیت ۳۴ میں فرمایا گیا ہے کہ "میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں۔ ان کو ایک معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ کردیجئے تاکہ وہ میری تصدیق کریں، مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔" اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ محسوس فرمارہے تھے کہ میں جب لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کروں گا تو میرا سیدھا اور سپاٹ انداز شاید لوگوں کو متاثر نہ کرسکے۔ اس کیلئے ایک زوردار خطیب کی ضرورت ہے۔ اس لئے اپنے بھائی ہارون کیلئے دعا مانگی کہ انہیں میرے ساتھ کردیجئے کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہیں۔ میرے اندر وہ فصاحت نہیں جو ہارون کے اندر ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ضرورت فصاحت کی ہے یعنی بات کو کھول کے بیان کرنے اور زوردار انداز میں کہنے کی، جس کی کمی حضرت موسیٰ علیہ السلام محسوس کررہے تھے۔ بات یہ نہیں تھی کہ میری زبان میں لکنت ہے اور میں صاف بول نہیں سکتا۔ لیکن قرآنِ کریم میں اور بائیبل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو تقریریں نقل کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام میں وہ فصاحت اور طلاقتِ لسانی آگئی تھی جو زوردار تقریر کرنے کیلئے ضروری ہے۔

ہم نے مفسرین کے دونوں مؤقف آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں جسے چاہے قبول کرلیجئے لیکن یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ہکلے یا توتلے آدمی کو اپنا رسول مقرر فرمائے کیونکہ رسول ہمیشہ شکل و صورت، شخصیت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنے دور کے ممتاز لوگ ہوتے ہیں۔ جس طرح ان کے کردار میں کوئی خامی نہیں ہوتی اسی طرح وہ اپنی شکل و صورت میں بھی ہر طرح کی خامی سے مبرا ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا ظاہر اور باطن دونوں ان کی نبوت پر دلیل ہوتے ہیں۔ اس خیال سے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی۔

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾

(تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح کریں۔ ۳۳) اور زیادہ سے زیادہ تیرا ذکر کریں۔ ۳۴) بیشک تو ہمارا نگران رہا

Marfat.com

ہے۔ (۳۵)

تسبیح ذکر کا مفہوم

حضرت ہارون علیہ السلام کو شریکِ کار بنائے جانے کی درخواست اس لئے ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح اور زیادہ سے زیادہ تیرا ذکر کر سکیں۔ تسبیح سے مراد یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی شان، اس کی صفات اور اس کی مرضیات اور احکام کے منافی ہیں۔ ہم ہر حالت میں ان کی نفی کریں۔ اور جو چیزیں اس کی شان، اس کی صفات اور اس کی مرضیات اور احکام کے موافق ہیں ان کا اثبات کریں اور انہیں عام کرنے کی کوشش کریں۔ یہ تسبیح اگرچہ انفرادی بھی ہو سکتی ہے لیکن ایک ایسا ماحول جس میں فرعون کی خدائی کا چرچا ہو اور اس کے تراشیدہ بت پوجے جاتے ہوں اور ہر طرف شرک کی سمیّت پھیلی ہوئی ہو۔ ایسے ماحول میں انفرادی تسبیح اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لیکن اگر کوئی غم بٹانے والا، حوصلہ دینے والا اور تسبیح کا ساتھی موجود ہو تو یہ کام آسان ہو جاتا ہے اور اس میں دل بھی لگتا ہے۔ اور دوسری بات یہ فرمائی کہ ہم زیادہ سے زیادہ تیرا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ ذکر سے مراد یاد بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ فریضۂ نبوت کی ادائیگی کی ایک تعبیر ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نبی اپنی خلوت وجلوت میں جو کچھ کرتا ہے وہ فریضۂ نبوت کی ادائیگی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ نماز پڑھتا ہے یا بازار میں کاروبار کرتا ہے۔ وہ مجلس آرائی کرتا ہے یا میدانِ جنگ میں قوت آزمائی کرتا ہے۔ ہر حال میں کارِ نبوت انجام دیتا ہے۔ اس کی رزم و بزم میں فرق عمل کا نہیں، میدانِ عمل کا ہوتا ہے۔ کیونکہ نماز بھی اسی کے ذکر کیلئے ہوتی ہے اور جہاد بھی اسی کے ذکر کو بلند کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ کاروبار بھی اسی کے احکام کو عام کرنے کیلئے ہوتا ہے اور معاملات بھی اسی کی ہدایات کو چلن بنانے کیلئے ہوتے ہیں۔ غرضیکہ پیغمبر کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی تسبیح وذکر سے خالی نہیں ہوتا۔ کبھی وہ فرد اور معاشرے کو ان چیزوں سے پاک کر رہا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا میں حائل ہیں۔ اور کبھی ان احکام کے نافذ کرنے میں مصروف ہوتا ہے جو اس کے ذکر کی علامت ہیں۔

تیسری آیت دو طرح کے احساسات کی جامع معلوم ہوتی ہے۔ ایک تو یہ احساس کہ الٰہی آج تک ہم پر جو نوازشات ہوتی رہی ہیں وہ تیرے ہی فضل و کرم کا نتیجہ تھیں ورنہ ہمارا ایسا کوئی ذاتی استحقاق نہ تھا جو تیری عنایات کو دعوت دے سکتا۔ تیری ان ہی نوازشات اور عنایات کو دیکھ کر یہ حوصلہ ہوا ہے کہ ان دعاؤں کیلئے اپنا دامن تیرے سامنے پھیلا دیا ہے۔ پہلے بھی تیرا ہی سہارا تھا، اب بھی تیرا ہی سہارا ہے۔ تیرے ہی کرم کو تیرے مزید کرم کا سفارشی بنایا ہے۔

دوسرا احساس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا اللہ! تو ہماری خلوت وجلوت سے واقف ہے۔ ہماری کمزوریوں اور توانائیوں کو جانتا ہے۔ تو اس حال میں بھی ہمارا نگران ہوتا ہے جب ہم خود فراموشی کا شکار ہو کر اپنے حال سے ناواقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ تو ہماری مشکلات سے بھی واقف ہے اور ہماری ضرورتوں کو بھی جانتا ہے اور فریضہ تبلیغ کی جانکاہیوں کا بھی تجھے علم ہے، ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما جس سے ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو سکیں اور ہمیں تیرے حضور سرخروئی حاصل ہو سکے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾

(فرمایا ملا تجھ کو تیرا سوال اے موسیٰ (تیری درخواست منظور ہوئی)۔ ۳۶)

سُؤْلَ ...... سوال کا ہم معنی ہے۔ درخواست اور التجا کو بھی کہتے ہیں۔

Marfat.com

اجابتِ دعا

اس مختصر سے جملے میں اللہ تعالیٰ کی شان بھی جھلکتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پیار بھی برس رہا ہے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کی عنایات کا اظہار بھی ہو رہا ہے۔ ادھر دعائیں ختم ہوئیں، ادھر بشارت سنا دی گئی۔ جیسے کوئی حکمران بیک جنبشِ قلم کسی کی درخواست کو منظور کر لیتا ہے۔ اے موسیٰ!، کا خطاب بھی اپنے اندر بہت معنویت رکھتا ہے۔ اس میں جو اپنائیت اور پیار ہے اس کا تو کیا ہی کہنا لیکن ساتھ ہی گزشتہ آیت کا اثبات بھی ہے کہ اے موسیٰ! واقعی ہم ہر حال میں تجھے دیکھ رہے ہیں، تو ہم سے دور نہیں ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ﴿٣٧﴾ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ﴿٣٨﴾ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ﴿٣٩﴾

(اور ہم نے تم پر ایک بار اور بھی احسان کیا تھا۔ ۳۷) جبکہ ہم نے تمہاری ماں کو وحی کی جو آگے وحی کی جا رہی ہے۔ ۳۸) کہ اس کو صندوق میں رکھ دو پھر اس کو دریا میں ڈال دو، پس دریا اس کو کنارے پر ڈال دے کہ اس کو اٹھا لے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے، میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی تاکہ تم پرورش پاؤ میری آنکھ کے سامنے۔ ۳۹)

اضطراب دور کرنے کیلئے احسانات کا تذکرہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مزید مانوس کرنے اور آپ پر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس کا اضطراب دور کرنے اور انہیں یہ بتانے کیلئے کہ آپ پیدائش سے لے کر اب تک اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات کا مورد رہے ہیں یہ ارشاد فرمایا کہ ہم اس سے پہلے بھی آپ پر احسان کر چکے ہیں اور اب آپ کو نبوت اور معجزات دے کر اور آپ کی دعائیں قبول فرما کر آپ پر جو مزید نوازشات کی گئی ہیں یہ انہیں احسانات کا تسلسل ہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے جو آپ پر احسانات کئے گئے تھے اس کی ایک تفصیل بیان فرمائی۔

جس کی ابتدا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرعون نے ایک ظالمانہ حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے گھروں میں جو بھی بچہ پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے اور جو بچی پیدا ہو، اسے زندہ رکھا جائے تاکہ ان بچیوں سے لونڈیوں کا کام لیا جائے۔ روایات میں ہے کہ فرعون کو اس کے نجومیوں نے یہ اطلاع دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو تیری تباہی کا باعث بنے گا۔ فرعون نے اس بچے کا راستہ روکنے کیلئے یہ حکم جاری کیا۔ مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ نجومیوں نے بھی کوئی ایسی اطلاع دی ہو، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ فرعون اور اس کے مصاحبین یہ محسوس کرتے تھے کہ بنی اسرائیل میں پیدائش کی شرح دوسری قوموں سے زیادہ ہے، ان کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر افزائش کا یہی سلسلہ جاری رہا تو اندیشہ ہو سکتا ہے کہ یہ اپنی افرادی قوت کے بل بوتے پر حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں۔ اور اگر دوسرے مخالف خاندانوں نے ان کی حمایت کی تو ممکن ہے کہ یہ ملک میں انقلاب برپا کر دیں۔ اس اندیشے کا راستہ روکنے کیلئے آج ہی سے ہمیں یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد کو زندہ نہ رہنے دیا جائے تاکہ ان کی نسل آگے نہ بڑھے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ اسی

Marfat.com

زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ آپؑ کی والدہ نے روایات کے مطابق تین مہینے تک آپؑ کو چھپائے رکھا، لیکن جب محسوس کیا کہ خطرہ قریب آ رہا ہے تو آپ انتہائی پریشان ہو گئیں، لیکن بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تم ایک تابوت میں بچے کو رکھ کر دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کر دو، پھر یہ دریا کا کام ہے کہ وہ اس تابوت کو کنارے پر ڈال دے۔ تم اس بارے میں اطمینان رکھو، ہم بچے کو تمہاری طرف لوٹائیں گے اور اس کو اپنا رسول بنائیں گے۔ (یہ دوسری بات سورہ قصص میں کہی گئی ہے) مزید فرمایا کہ دریا کے کنارے سے اسے وہ شخص اٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی دشمن ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ ایک تو یہ بات کہ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کیلئے وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ شاید نبیہ تھیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں وحی کا لفظ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، اصطلاحی معنی میں نہیں۔ وحی کا لغوی معنی دل میں کسی بات کا ڈال دینا ہے جسے عام طور پر الہام کہا جاتا ہے اور ایسے الہامات عموماً اولیاء اللہ کو ہوتے رہتے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اس طرح کی وحی بعض اوقات کسی فرشتے کے واسطے سے بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے حضرت مریم کے واقعہ میں اس کی تصریح ہے، لیکن بعض اہل علم یہ کہتے ہیں کہ فرشتے کا متمثل ہو کے آنا اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا، اس کا وقوع سابقہ امتوں میں تو ہوا ہے، اس امت میں نہیں۔ کیونکہ ختم نبوت نے ایسے تمام اشتباہات کو ختم کر دیا ہے۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں آپؑ کو بچانے کیلئے جو ترکیب ڈالی گئی تھی وہ ایک خیال تھا جو آپ کے دل میں ڈالا گیا تھا۔ البتہ اس کا اہتمام ضرور کیا گیا تھا کہ انہیں یہ اطمینان ہو جائے کہ آنے والا خیال اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے تاکہ وہ اتنا بڑا اقدام کر گزریں۔ ورنہ کسی ماں کیلئے بچے کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

دوسری وضاحت طلب بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اس تابوت کو وہ پکڑے گا جو اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن ہوگا۔ فرعون کی دشمنی اللہ تعالیٰ سے تو واضح ہے کیونکہ وہ کافر تھا اور اللہ تعالیٰ سے کفر کرتا تھا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کی دشمنی کا کیا معنی؟ جبکہ اس نے ان کی تربیت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ تربیت تو بعد کا عمل ہے لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تابوت سے نکالا گیا اس وقت تو یقیناً فرعون آپؑ کا دشمن تھا کیونکہ وہ آپؑ کو بنی اسرائیل ہی میں سے کسی کا بچہ سمجھتا تھا اور بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا وہ حکم دے چکا تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل کر دیتا اگر اس کی بیوی آسیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی محبت میں مبتلا نہ ہو جاتیں۔ انہوں نے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ظلم سے بچایا اور پھر فرعون بھی آپؑ سے محبت کرنے لگا۔ کیونکہ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا پرتو حضرت موسیٰ پر ڈال دیا تھا۔ چنانچہ جو بھی آپؑ کو دیکھتا، آپؑ کی من موہنی شکل پر فریفتہ ہو جاتا۔ یوں تو پیغمبر اپنے وقت کے حسین ترین لوگ ہوتے ہیں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ ایک بڑے ظالم دشمن سے بچانا تھا اس لئے بطورِ خاص اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا اس طرح پرتو آپ کے چہرے پر ڈالا کہ وہ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ دلوں میں اترنے لگے اور اس کے نتیجے میں فرعون ان پر فریفتہ ہو گیا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تابوت جب کنارے پر جا کر لگا تو فرعون اور اس کی بیوی دریائے نیل کے کنارے پر سیر کر رہے تھے۔ ان کی نظر اچانک اس تابوت پر پڑی تو وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس میں جھانک کے دیکھا تو ایک خوبصورت من موہنا بچہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بس بچے کی ایک جھلک ان کے دل میں اتر گئی اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے فرعون کے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

Marfat.com

تربیت کا سامان کر دیا۔

اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُکَ فَتَقُوْلُ ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَنْ یَّکْفُلُہٗ ؕ فَرَجَعْنٰکَ اِلٰٓی اُمِّکَ کَیْ تَقَرَّ عَیْنُھَا وَلَا تَحْزَنَ ۬ؕ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰکَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا ۬ۚ فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْٓ اَھْلِ مَدْیَنَ ۬ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ۝۴۰

(جبکہ تمہاری بہن جاتی اور یہ کہتی تھی کہ کیا میں تمہیں بتاؤں وہ شخص جو اس کی پرورش کر سکتا ہے، پس ہم نے تم کو تمہاری ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمناک نہ ہو۔ اور تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تم کو غم سے نجات دی، ہم نے تمہیں خوب اچھی طرح پرکھا، پھر تم کئی سال اہلِ مدین میں رہے، پھر تم آ گئے ایک اندازہ کئے ہوئے وقت پر، اے موسیٰ۔ ۴۰)

دو احسانات کا ذکر

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے اس احسان کا ذکر فرما رہے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ محترمہ کے پاس لوٹائے جانے کے سلسلے میں کیا۔ ایک تو یہ بات بجائے خود کتنا بڑا احسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان بچانے کیلئے ایک نہایت کارآمد تدبیر ان کی والدہ کے دل میں ڈالی اور اس سے نہ صرف بچے کی جان بچ گئی بلکہ اسے فرعون کے محل میں پہنچا دیا۔ فرعون اور اس کی بیوی دونوں نے اسے اپنی تربیت میں لے لیا۔ اب دوسرا احسان یہ ہے کہ زندگی بچ جانے اور محلات میں تربیت کا سامان ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ان کی والدہ پر یہ احسان فرمایا کہ ایک ایسی تدبیر کی جس کے نتیجے میں حضرت موسیٰ اپنی والدہ کی آغوش میں پہنچ گئے۔ بچے کی جان کو اگر خطرہ لاحق ہو تو ماں کی جان پر بن جاتی ہے۔ اور اگر بچے کی جان بچ جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتی اور ایک اطمینان محسوس کرتی لیکن زیادہ مدت نہیں گزرتی کہ اب بچے سے دور رہنا اس کیلئے سزا سے کم نہیں ہوتا۔ وہ دل و جان سے یہ چاہتی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے مجھے اپنے بچے کو حاصل کرنا ہے، کیونکہ میری آنکھیں اس کے بغیر ٹھنڈی نہیں ہو سکتیں۔ اور میرے دل کو اس کے لمس کے بغیر سکون نہیں مل سکتا۔ اس لئے کسی بھی مامتا پر حقیقی احسان یہ ہے کہ نہ صرف اس کے بچے کی زندگی بچ جائے بلکہ وہ اس کی آغوش میں پہنچ جائے۔ چنانچہ یہ دوسری تدبیر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماں کی آغوش میں پہنچانے کیلئے ان کی ماں کے دل میں ڈالی تو ماں نے اپنی بیٹی کو دریا کے کنارے کنارے تابوت سے کچھ فاصلے پر چلنے اور دیکھتے رہنے کی ہدایت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کی بیوی دونوں بچے کو اٹھا کر گھر میں لے گئے، اسے نوکروں کے حوالے کیا اور گھر میں جو ملازمائیں تھیں انہیں کہا کہ بچے کو دودھ پلانے کا انتظام کرو۔ آیاؤں اور اناؤں نے ہر ممکن کوشش کی، لیکن بچے نے کسی کے دودھ کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے حیران اور پریشان ہو کر فرعون کی بیوی کو بتایا کہ بچہ کسی کا دودھ قبول نہیں کر رہا۔ حضرت موسیٰ کی بہن کو کسی طرح اس کی اطلاع ملی تو اس نے فرعون کی بیوی سے کسی طرح رابطہ کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتہ دے سکتی ہوں جو اس بچے کی نہایت اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے۔ فرعون کی بیوی چونکہ حضرت موسیٰ کے دودھ نہ پینے کی وجہ سے بہت پریشان تھی، اس نے فوراً اس تجویز کو قبول کر لیا اور اس طرح حضرت موسیٰ کی بہن کو اپنی والدہ کو فرعون کے محل میں لے جانے کا موقع مل گیا۔ والدہ نے جیسے ہی حضرت موسیٰ کو اپنی گود میں لیا تو بچہ ہمکتا ہوا ماں کے سینے سے لگ گیا اور دودھ پینے لگا۔ اس طرح سے

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ماں کی آغوش میں پہنچادیا۔

حضرت موسیٰ اپنی ماں کی آغوش میں پلنے لگے لیکن آپؑ کی والدہ وقتاً فوقتاً حضرت موسیٰ کو فرعون کی بیوی کے پاس ملانے کیلئے لے جاتیں۔ حضرت موسیٰ کا جب دودھ چھڑادیا گیا تو پھر آپؑ محل میں تربیت پانے لگے۔ حتیٰ کہ شہزادوں کی طرح پل کے جوان ہو گئے۔ بنی اسرائیل یوں بھی پیغمبروں کی اولاد تھے اور حضرت موسیٰ تو خود آگے چل کر پیغمبر بننے والے تھے اس لئے قرینِ قیاس یہ ہے کہ آپؑ دوسرے نوجوانوں سے زیادہ طاقتور، زیادہ تنومند، زیادہ خوبصورت اور زیادہ خوش اخلاق ہوں گے۔ پہلے تو آپؑ اپنی والدہ کو رضاعی ماں سمجھتے ہوں گے لیکن یقیناً کسی نہ کسی وقت ان کو بتادیا گیا ہوگا کہ یہی آپؑ کی حقیقی ماں ہے۔ اس لئے آپؑ محل میں رہنے کے باوجود بار بار اپنے گھر یعنی ماں اور بہن سے ملنے کیلئے آتے۔ اس طرح بنی اسرائیل سے راہ و رسم پیدا کرنے اور ان کی مظلومیت دیکھنے کا موقعہ ملا۔ آپؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کی حیثیت مصر میں غلاموں کی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی بستی بھی اصل شہر سے الگ بسائی گئی تھی۔ وہ لوگ صرف خدمت اور بیگار کیلئے شہر جاتے اور وہاں اپنے قبطی آقاؤں کے ہاتھوں بری طرح پٹتے اور ذلیل ہوتے۔ حضرت موسیٰ کی غیرت ان مناظر کو دیکھ کر جوش میں آجاتی۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ بھی ایسے ہی کسی وقت میں پیش آیا۔ آپؑ نے دیکھا کہ ایک اسرائیلی ایک قبطی کے ہاتھوں پٹ رہا ہے۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ کو دیکھ کر آپؑ سے مدد کی درخواست کی۔ آپؑ جب اسے بچانے کیلئے آگے بڑھے تو قبطی اپنے نسلی اور قومی غرور کی وجہ سے آپؑ سے بھی الجھ پڑا۔ حضرت موسیٰ چونکہ طاقتور آدمی تھے، آپؑ نے اسے ایک گھونسا رسید کیا جو ہمیشہ کسی شخص کی زیادتی کو روکنے کیلئے ہر عزت والا آدمی استعمال کرتا ہے۔ مقصود اس سے صرف دفاع ہوتا ہے، کسی کو قتل کرنا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ گھونسا کہیں ایسا بے ڈھب پڑا کہ قبطی وہیں ڈھیر ہو گیا۔

یہ واقعہ ہونے کو تو ہو گیا، لیکن حضرت موسیٰ اس کی وجہ سے شدید رنج و غم میں مبتلا ہو گئے۔ بنی اسرائیل پیغمبروں کی اولاد اور مذہب اسرائیل کے وارث ہونے کی وجہ سے مذہب کی بنیادی باتوں سے بے خبر نہ تھے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اگرچہ ابھی تک نبوت نہیں ملی تھی لیکن آپؑ مذہب کی بنیادی باتوں سے آگاہ اور تقویٰ و اخلاص کے احساسات سے بہرہ ور تھے۔ آپؑ کو اس بات نے پریشان کر دیا کہ اگرچہ اس قتل میں میرا ارادہ شامل نہیں لیکن بہر حال یہ ایک جرم ہے جو میرے ہاتھوں سرزد ہوا ہے۔ اس لئے آپؑ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم نے موسیٰ کو اس غم سے نجات دی یعنی ہم نے اس کی توبہ قبول فرمالی۔"

اور دوسری بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کی چونکہ بنی اسرائیل سے ہمدردیاں کھلتی جارہی تھیں اور آپؑ مختلف مواقع پر قبطیوں کے ظلم کو روکنے کی کوشش فرماچکے تھے۔ اس سے فرعونیوں کو اندیشہ ہوا کہ اگر حضرت موسیٰ اسی طرح فرعونیوں کے مظالم کے خلاف سینہ سپر رہے تو بنی اسرائیل کو ایک حوصلہ مند لیڈر ہاتھ آجائے گا۔ کوئی تعجب نہیں کہ کل کو وہ حکومت کیلئے دردِ سر بن جائیں۔ اس سے اگر یہ گمان کر لیا جائے کہ فرعونیوں نے حضرت موسیٰ کا داخلہ شہر میں بند کر دیا تھا تو یہ بات خلافِ امکان نہیں۔ لیکن متذکرہ بالا واقعہ پیش آنے کے بعد جب یہ بات کھل گئی (جس کا ذکر سورۂ قصص میں آئے گا) کہ قبطی کے قاتل حضرت موسیٰ ہیں تو آپؑ سمجھ گئے کہ اب حکومت میرے خلاف اقدام کرنے میں تامل نہیں کرے گی۔ آپؑ ابھی اس بات پر سوچ ہی رہے تھے کہ شہر کی دوسری جانب سے ایک شخص دوڑتا ہوا آپؑ کے پاس پہنچا جو حکومت ہی کا آدمی ہوگا، لیکن آپؑ سے غائبانہ ہمدردی رکھتا تھا اس نے بتایا کہ فرعون نے آپؑ کو قتل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ اس لئے جتنی جلدی ہو سکے آپؑ شہر سے نکل جائیے۔ چنانچہ آپؑ بغیر کسی تیاری کے بے سروسامانی کی حالت میں شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور نجانے کتنے دکھ اٹھا کر آپؑ

Marfat.com

مدین پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور ایک معزز گھر میں آپؑ کو پناہ مل گئی۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے فرعون کی گرفت اور سزا کے خطرے سے آپؑ کو بچایا اور آپؑ کی پریشانی کو دور فرمایا۔

فتون کا مفہوم

وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا...... فتون یا تو قعود کے وزن پر ہے یا فتنہ کی جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے موسیٰ ہم نے تمہیں کئی بار آزمائش میں ڈالا اور مختلف مشکلات میں ڈال کر پرکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخصیت کو کسی بڑے منصب پر فائز کرنا چاہتا ہے تو اس کی شخصیت کی تعمیر کیلئے اسے مختلف امتحانات سے گزارتا ہے، کبھی مالی مشکلات میں مبتلا کرتا ہے، کبھی جسمانی تکلیفیں دیتا ہے، کبھی نامساعد حالات کی نذر کر دیتا ہے۔ کبھی مخالفوں کو کھل کھیلنے کی آزادی دے دیتا ہے اور کبھی اس کے برعکس آزمائش کی شکل یہ ہوتی ہے کہ انعامات و افضال کی بارش کر دیتا ہے۔ دولت کی ریل پیل کر دیتا ہے، ایک سے ایک بڑھ کر آسانی مہیا کرتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرا بندہ صبر کرتا ہے یا بے صبری دکھاتا ہے اور دوسری صورت میں وہ یہ اندازہ کرتا ہے کہ یہ شکر کرتا ہے کہ ناشکری کرتا ہے کیونکہ دین بلکہ زندگی دو ہی چیزوں کا نام ہے، صبر اور شکر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے نرم اور گرم حالات سے گزارا۔ محلات کی زندگی بھی دیکھی اور اپنے خاندان کی محرومیاں بھی دیکھیں۔ اُدھر جوتے چمکتے دیکھے اِدھر چہرے بھی ویران دیکھے۔ جوانی میں قدم قدم پر احساس مجروح ہوتے دیکھا، اور ذلتوں کے سائے گہرے ہوتے دیکھے۔ مدین کی تکلیف دہ مسافرت اور بے سروسامانی کے زخم بھی برداشت کیے۔ پھر سالوں تک حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائیں۔ پہاڑوں اور دروں میں اور درختوں کے نیچے بکھرے ہوئے کانٹوں پر بھی چلے اور بکریاں سنبھالتے ہوئے طبیعت کے نشیب و فراز سے بھی گزرے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تاکہ آپؑ ان ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے قابل ہو جائیں اور آپؑ کے اندر وہ صفات پیدا ہو جائیں جو انسانوں کی اصلاح اور ان سے معاملات کرتے ہوئے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ ایک مثال سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز ایک لیلا ریوڑ سے الگ ہوگیا۔ اس کی تلاش میں حضرت موسیٰ دن بھر اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے رہے۔ شام کے قریب وہ ہاتھ آیا۔ پکڑ کر غصہ میں اسے زدوکوب کرنے کی بجائے اٹھا کر سینے سے لگالیا اور کہنے لگے، یہ تو نے کیا کیا، مجھے بھی تھکا دیا اور خود بھی تھک گئے۔ یہ حلم و بردباری اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس قدر شفقت پیدا ہو، تب ہی نبوت کے فرائض انجام دیئے جاسکتے ہیں۔

امام طحاوی نے حدیثِ فتون کے عنوان سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے جسے ہمارے مفسرین نے عموماً ابنِ کثیر کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ لیکن علامہ ابنِ کثیر کی رائے یہ ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں بلکہ حضرت عبداللہ ابن عباس پر موقوف ہے اور انہوں نے حضرت کعب احبار کی روایات کو بیان کیا ہے۔ یوں تو یہ حدیث بہت پُرلطف ہے لیکن ہر طرح کے رطب و یابس سے معمور ہے۔ اس لئے ہم اس کا نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ''پھر آپؑ چند سال اہلِ مدین میں ٹھہرے۔''

حضرت موسیٰؑ کا مدین میں قیام

ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جب آپؑ کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا گیا اور حکومت نے آپؑ کو گرفتار کرنا چاہا تو حکومت چونکہ

Marfat.com

نہایت ظالم تھی جس سے کسی قسم کے انصاف کی توقع نہ تھی۔اس لئے آپؑ شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور کئی دنوں کے سفر کے بعد آپؑ مدین پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔مدین کے ایک چشمے پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں،لیکن دو لڑکیاں اپنے گلے کو روکے ہوئے کھڑی ہیں۔آپؑ کو بڑی غیرت آئی تو آپؑ نے ان لڑکیوں سے پوچھا کہ تم اپنے گلے کو روکے ہوئے کیوں ہو،تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے والد بوڑھے ہیں،بکریاں چرا نہیں سکتے۔اس لئے ہم دونوں بہنیں ریوڑ لے کر نکلتی ہیں یہاں پانی پلانے کیلئے چونکہ چرواہے موجود ہوتے ہیں اس لئے ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وہ جائیں تو ہم اپنی بکریوں کو پانی پلائیں۔آپؑ ان کی یہ بات سن کر آگے بڑھے اور ڈول کھینچ کھینچ کر ان کی بکریوں کو پانی پلایا۔اس کے بعد ایک درخت کے نیچے آ بیٹھے۔ایک اجنبی جگہ اجنبی ماحول کوئی جان نہ پہچان خالی ہاتھ اور خالی پیٹ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے،یا اللہ! میں اس وقت نہایت محتاج ہوں،مجھے جو بھی عطا کر دیا جائے میں ہر طرح سے اس کا مستحق ہوں۔آپؑ دعاؤں اور پریشانیوں میں مستغرق تھے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی ایک صاحبزادی آپؑ کے پاس پہنچی اور یہ پیغام دیا کہ میرے والد آپؑ کو بلاتے ہیں تاکہ آپؑ کو اس نیکی کی مزدوری دی جائے جو آپؑ نے ہمارے ساتھ کی ہے۔آپؑ حضرت شعیب کے پاس پہنچے، اپنے حالات بیان کئے۔انہوں نے تسلی دی کہ آپؑ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو ظالموں سے نجات دے دی ہے اور ساتھ ہی یہ پیشکش کی کہ آپؑ میری بکریوں کے ریوڑ چرایئے تو میں اس شرط پر آپؑ کے ساتھ اپنی ایک بچی کا نکاح کر دوں گا کہ آپؑ آٹھ سال تک یا دس سال تک میری بکریوں کو چرائیں گے۔اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اس مسافرت اور غربت میں آپؑ کیلئے جائے پناہ کا انتظام کر دیا۔آپؑ وہاں آٹھ یا دس سال گزار کر اپنی بیوی کو ساتھ لے کر مصر جانے کے ارادے سے نکلے۔اس بات کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ آپؑ کے ساتھ کوئی اور بھی تھا یا نہیں۔سفر میں راستہ بھول گئے۔تاریک اور یخ بستہ رات،چقماق سے آگ نکالنا چاہی تاکہ گرمی کا سامان کر سکیں،لیکن آگ نہ نکلی۔ادھر اُدھر دیکھا،دور ایک آگ نظر آئی۔آپؑ نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ آپ یہاں رکیں،میں نے ایک آگ دیکھی ہے،وہاں جاتا ہوں،کوئی آدمی مل گیا تو راستہ معلوم کر لوں گا یا وہاں سے آگ کی کوئی انگاری لیتا آؤں گا۔آپؑ وہاں آگ لینے پہنچے،تو آپؑ کو نبوت دے دی گئی۔آپؑ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں راستہ بھول گیا ہوں لیکن درحقیقت آپؑ راستہ نہیں بھولے تھے بلکہ آپ کی حقیقی منزل کا یہی راستہ تھا،وہ منزل آپؑ کو مل گئی تھی البتہ! منزل از خود نہیں مل گئی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے اندازے کے مطابق آپؑ اس منزل پر پہنچے تھے۔

پیدائش سے لے کر نبوت ملنے تک آپؑ کا یہ سفر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں طے ہوا۔اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی دستگیری فرمائی اور نوازشات کی بارش کی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر وقت آپؑ کے ہمرکاب رہی ہے۔اب آپؑ کو جس ذمہ داری پر فائز کیا جا رہا ہے،یقین کر لیجئے کہ جس طرح آپؑ کی گزشتہ زندگی اس کی حفاظت اور رحمت کے سائے میں گزری ہے اسی طرح آئندہ بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید آپؑ کے ساتھ رہے گی۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿٤١﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾
اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾

(میں نے تمہیں اپنی ذات (کارِ خاص) کیلئے مخصوص کر لیا ہے۔ ۴۱) اب تم اور تمہارا بھائی میری آیات لے کر جاؤ، اور میرے ذکر میں ڈھیلے نہ پڑنا۔ ۴۲) تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ ۴۳)

Marfat.com

دونوں بھائیوں کو اداءِ رسالت کیلئے جانے کا حکم

آپؑ کو جس عظیم منصب کیلئے ہم نے چنا ہے اور اب تک کی زندگی جس کیلئے ٹریننگ کے طور پر گزری ہے، اب اس منصب کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ مصر اور دور دور کا علاقہ کفر اور گمراہی میں ڈوبا ہوا ہے۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو انہیں راہِ راست دکھا سکے۔ اس کارِ خاص کیلئے اے موسیٰ، اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص کر لیا ہے اور تمہاری دعاؤں کے نتیجے میں تمہارے بھائی کو بھی تمہارا شریک کار بنا دیا گیا ہے۔ وہ بھی اس مقصد کی بجا آوری اور اس راستے کی مشکلات کا سامنا کرنے میں تمہارا دستِ راست ہوگا۔ اس لئے اب اس کارِ خاص کو انجام دینے کیلئے نکل کھڑے ہوں۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ میرے ذکر میں سستی نہ کرنا۔ ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی یاد بھی ہے اور اس کی عبادت بھی۔ کیونکہ اس کی عبادت، اس کی اطاعت اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا یہ وہ قوت کا سامان ہے جو اس راستے پر چلنے والوں کی پناہ بھی ہے اور اسلحہ بھی۔ اور دوسرا معنی کارِ نبوت کا انجام دینا ہے یعنی تم دونوں کی جو اصل ذمہ داریاں ہیں یعنی نبوت کے فرائض کی بجا آوری، اس میں سستی نہ ہونے پائے۔

''ونی'' کمزوری اور کوتاہی کو کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ اور آپؑ کے بھائی کو اپنی آیات لے کر جانے کا حکم دینے کے بعد اگلی آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کا دین لے کر تمہیں فرعون کے پاس جانا ہے۔ یعنی پہلے صرف نکلنے کا حکم دیا اور اس آیت میں اس بات کا تعین کر دیا کہ تمہیں جانا کہاں ہے۔ اور یہ بات بھی واضح کر دی کہ تمہیں جانا کس مقصد کیلئے ہے۔ اس سلسلے میں فرمایا کہ تمہیں فرعون کے پاس اس لئے جانا ہے کہ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کی ربوبیت کے مقابلے میں وہ حاکم مطلق اور رب بنا بیٹھا ہے۔ تم جا کر اسے اس کی اصل حیثیت واضح کرنے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

(پس اسے نرمی سے دعوت دو، شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈرنے لگے۔ ۴۴)

طریقِ دعوت سے متعلق ہدایت

اس آیتِ کریمہ میں طریقِ دعوت سے متعلق ہدایت دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ فرعون کے پاس جا کر نہایت نرمی سے اس کے سامنے دعوت پیش کرو۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپؑ دونوں کمزور ہیں۔ اگر آپؑ نے کوئی سختی سے بات کہی تو وہ بگڑ کر نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں وہ عصا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ہیبت اور قوت عطا فرمائی تھی۔ فرعون کیلئے یہ آسان نہ تھا کہ وہ آپؑ پر حملہ کرے یا آپؑ کو تکلیف پہنچانے کا حکم دے۔ نرمی کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ یہ حق کی فطرت ہے۔ وہ نرمی اور اخلاق سے دلوں میں اترتا ہے، زبردستی مسلط نہیں کیا جاتا۔ داعیِ حق معلم اور مربی ہوتا ہے۔ اس کے اندر معلم کا صبر اور برداشت اور مربی کی ہمدردی اور غمگساری یکساں طور پر اپنی نمود رکھتی ہیں۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ اگر آپؑ نے اسے نہایت ہمدردی اور غمگساری سے دعوت دی تو امکان ہے کہ وہ نصیحت کو قبول

Marfat.com

کرلے کیونکہ زبان سے جھڑنے والے الفاظ پھولوں کی طرح خوشبو دیتے ہیں۔اور ہمدردی اور غمگساری سے کہی ہوئی بات ہی دلوں کا مرہم بنتی ہے۔اسی طرح نرمی کے ساتھ ہی اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا تذکرہ کیجئے اور اس کے تحمل اور بردباری کو واضح کیجئے۔اسی طرح اس کی گرفت کے احوال قوموں کی تاریخ کے آئینہ میں دکھایئے۔اس طرح ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت یا اس کی گرفت سے ڈرنے لگے۔

لَعَلَّ...... کے معنی میں جو امید و رجا ہے اس کا تعلق پروردگار کی ذاتِ والاصفات سے نہیں بلکہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے ہے۔یعنی تم اس امید پر پوری کوشش کرنا کہ شاید وہ ہدایت کو قبول کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگے۔اللہ تعالیٰ کا علم چونکہ نہایت جامع اور مکمل ہے اس لئے اس کے یہاں امید و رجا کا گزر نہیں ہوتا بلکہ وہاں ہر چیز قطعیت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ بھی داعیِ حق بن کر اٹھتے اور لوگوں میں یہ فرض انجام دیتے ہیں انہیں سب سے پہلے اپنی ذات کے گنبد سے آزاد ہونا چاہئے۔انہیں مخاطب کی کسی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے فریضۂ حق ادا کرنے کی سوچ اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے۔یہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔پتھر کو ہیرے کی چمک دے دینا اتنا مشکل نہیں جتنا انسان کو انسان بنانا مشکل ہے۔جس طرح جوہری ہر ایک نہیں ہوتا اسی طرح داعیِ حق بننے پر بھی محنت کرنا پڑتی ہے۔اس کیلئے حصولِ علم کے ساتھ اہلِ حق کی صحبت اٹھانا اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فہم عطا کرنے کی دعائیں مانگنا بہت ضروری ہے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾

(دونوں نے عرض کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرے یا اس کی سرکشی اور بڑھ جائے۔۴۵)

"فَرَطَ" کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی کے خلاف عاجلانہ اقدام کے ہوتے ہیں۔

دونوں بھائیوں کی طرف سے اندیشے کا اظہار

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے گزارش کی کہ الٰہی! ہمیں فرعون کے پاس جانے میں تو کوئی تامل نہیں لیکن ہمیں اندیشہ اس بات کا ہے کہ وہ بہت زود رنج اور مشتعل آدمی ہے۔بات شروع ہوتے ہی بھڑک اٹھے اور کوئی بات سنے بغیر ہم پر چڑھ دوڑے اور یا پھر جتنا وہ پہلے سرکش ہے اس سے بڑھ کر سرکش ہو جائے کہ تم کون ہوتے ہو مجھے سمجھانے والے، میں نہیں جانتا کہ کوئی مجھ سے بڑھ کر بھی صاحبِ اقتدار ہے، میں خزانوں کا مالک ہوں، دریائے نیل میرے قدموں میں ہے، میرا ملک جس میں ہر چیز کی بہتات ہے اور کسی نعمت کی کمی نہیں وہ مکمل طور پر میرے قبضے میں ہے۔اس طرح اندیشہ ہے کہ وہ آپ کی شان میں گستاخیاں کرنے لگے۔لیکن دونوں کا انداز نہایت عاجزانہ اور فدویانہ تھا۔مقصود حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہ تھا بلکہ فرعون کے ظلم اور اپنی بے بسی کی طرف توجہ دلانا تھا تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں کوئی وعدہ مل جائے جس کی بنیاد پر ہمارے حوصلے توانا ہوں اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد بڑھے۔اور مزید یہ بات بھی کہ فرعون کا ظلم اور سرکشی کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہ تھی۔اس لئے ان دونوں نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا اس سے سب واقف تھے۔

قرآنِ کریم نے جہاں بھی انبیائے کرام کا ذکر کیا ہے اس میں نہایت تقدس اور احترام پایا جاتا ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب اور معزز بندے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق نہایت عاجزی کا ہے لیکن بندوں پر ان کا احترام اور تعظیم واجب ہے۔لیکن اس کے برعکس جب ہم بائبل میں انبیائے کرام کا تذکرہ پڑھتے ہیں تو اس سے دلوں میں احترام اور تقدس پیدا ہونے کی بجائے ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے۔قرآن انہیں جلیل

Marfat.com

القدر ہستیاں قرار دیتا ہے جن کے دم سے انسانیت کی فلاح وابستہ ہے، لیکن بائبل انہیں جس طرح پیش کرتی ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کر لیجئے کہ اسی واقعہ کو جس کو اس آیت میں بیان کیا جارہا ہے بائیبل میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

سواب آ، میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں کہ تو میری قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے O موسیٰ نے خدا سے کہا کہ میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لاؤں۔ (کتاب خروج ۳۱۰۱۱)

اسی کتاب کے باب چہارم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تمام معجزات عطا فرما دیئے گئے اور پھر انہیں فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا تو بھی آپؑ نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

''اب تو جا، میں تیری زبان کا ذمہ لیتا ہوں اور تجھے سکھاتا رہوں گا کہ تو کیا کہے گا O تب اس نے کہا اے خداوند! میں تیری منت کرتا ہوں کسی اور کے ہاتھ سے جسے تو چاہے یہ پیغام بھیج O تب خداوند کا قہر موسیٰ پر بھڑکا O''

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴿۴۶﴾

(فرمایا تم اندیشہ نہ کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، (ہر بات) سن رہا ہوں اور (ہر چیز) دیکھ رہا ہوں ۴۶)

نہایت محبت سے تسلی

پروردگار نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اور ہارون! تمہیں اس بات کا ہرگز اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ فرعون تم پر تعدی کرے گا یا اس کی طغیانی میں اضافہ ہو جائے گا کیونکہ تعدی اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب آپ بے بس اور بے کس اور بے سہارا ہوں۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ میں تمہارا پشت پناہ، تمہارا حامی و مددگار اور تمہاری پناہ گاہ ہوں۔ معیت کا لفظ کہنے کو تو مختصر سا ہے لیکن اس کے مضمرات بہت وسیع ہیں۔ اللہ کریم جب کسی سے یہ کہہ دے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو اس کے بعد اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مزید فرمایا کہ وہ تم سے اگر کوئی بات کہے گا تو میں اسے سنوں گا اور اگر کوئی حرکت کرے گا تو میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ جب ہر چیز میری نگاہ میں اور ہر بات میری سماعت میں ہے اور کوئی چیز مجھ سے مخفی نہیں اور میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں تو پھر تمہیں اندیشہ کس بات کا۔ اس میں ایک طرف سے شاہانہ انداز ہے جس سے دشمن کا پتہ پھٹ جاتا ہے اور دوسری طرف نہایت محبت کا اظہار ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت کی پھوار برس رہی ہے اور فرعون اور آلِ فرعون پر غضب کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور دونوں کا نتیجہ جاننے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں۔

فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰکَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۴۸﴾

(پس اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو دکھ نہ پہنچا، ہم تیرے رب کی طرف سے ایک بڑی نشانی بھی لے کر آئے ہیں اور سلامتی اس شخص پر ہے جس نے

Marfat.com

ہدایت کی پیروی کی۔ (۴۷) ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ہے جو جھٹلائیں اور روگردانی کریں۔ (۴۸)

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے تردد اور اندیشے کو دور فرمانے کے بعد حکم دیا کہ اب تم فرعون کے پاس جاؤ اور اس کے سامنے یہ دعوت پیش کرو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول بن کے آئے ہیں۔ رسول کی حیثیت اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی حضرت ہارون علیہ السلام رسول نہیں، نبی تھے۔ لیکن یہاں دونوں کیلئے رسول کا لفظ یا تو علی سبیل التغلب کے طور پر استعمال ہوا ہے اور یا لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ ہم دونوں اللہ تعالیٰ کے پیغامبر ہیں۔

اس سے پہلے دو دفعہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم گزر چکا ہے، پہلے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا اور اس کے بعد دونوں کو، جس میں صرف فرعون کے پاس جانے کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کے پاس اس لئے جاؤ کہ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی اصلاح تمہاری ذمہ داری ہے۔ طغیان یعنی سرکشی کا تعلق ساری زندگی کے بگاڑ سے ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے شامل ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وسیع المعنی لفظ ہے اور اس کے بعد کی بات **Understood** معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ تمہاری بات کو قبول نہیں کرتا اور اپنی قوم اور بنی اسرائیل تک تمہاری دعوت کو بھی پہنچنے نہیں دیتا تو پھر اسے یہ کہو کہ اگر تمہیں یہ بات گوارا نہیں کہ ہم اہلِ مصر کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کی بات پیش کریں، تو پھر بنی اسرائیل جو درحقیقت پیدائشی مسلمان ہیں انہیں تمہارے ظلم نے کافر بنا رکھا ہے۔ انہیں ہمارے ساتھ جانے دو۔ اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے۔ مصر کے مکانوں سے وہ صحرا اچھا ہے جس میں فرعون کی بجائے اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکتا ہو اور جس میں فرعون کی غلامی سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی غلامی کی جا سکتی ہو۔ اس لئے ہم مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر لے جانا چاہتے ہیں تاکہ وہ غلامی کی ذلت سے نکل کر آزادی کا سانس لے سکیں اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید کا حق ادا کر سکیں۔ تم نے انہیں ظلم کے جس شکنجے میں جکڑ رکھا ہے انہیں اس سے نجات دے دیں کیونکہ فرعون بنی اسرائیل پر بڑے بڑے مظالم کر رہا تھا۔ انہیں بیگار میں پکڑا جاتا، بے زبان چوپایوں کی طرح ان سے دن بھر مشقت لی جاتی اور ہر طرح کا ذلت آمیز سلوک کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کیلئے اپنے ان دو بندوں کو بھیجا تھا۔

مزید فرمایا کہ ہم تیرے پاس اپنے رب کی جانب سے ایک بڑی نشانی لے کر بھی آئے ہیں۔ اس سے مراد شاید عصائے موسیٰ ہے۔ اس کی حیثیت سندِ ماموریت کی سی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی تم یہ نہ سمجھو کہ ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کا دعویٰ محض ایجادِ بندہ ہے۔ عصائے موسیٰ پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ جس کے ہاتھ میں یہ عصا ہو گا وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہی ہو سکتا ہے۔ اور جس کے ہاتھ پر سورج طلوع ہوتا ہو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہو گا۔ ہم اپنی اس حیثیت کے حوالے سے تمہیں یہ کہتے ہیں کہ سلامتی صرف اس شخص کیلئے ہے جو اس ہدایت کی پیروی کرے جسے ہم لے کر آئے ہیں۔ اس کا انداز ملاحظہ فرمائیے کہ بات فرعون سے ہو رہی ہے لیکن یک لخت حاضر سے غائب کی طرف کلام کا رخ بدل گیا ہے تاکہ فرعون یہ نہ سمجھے کہ مجھے خصوصی طور پر یہ بات کہی جا رہی ہے بلکہ عمومی انداز میں یہ فرمایا گیا کہ جو شخص بھی سلامتی کا طالب ہے اسے ہماری لائی ہوئی ہدایت کی پیروی کرنا ہو گی۔ اسی طرح اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ ہم پر یہ بات وحی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب اس شخص کیلئے ہے جو پیغمبروں کی تکذیب کرتا ہے اور ان کی تعلیمات سے روگردانی کرتا ہے۔ یہاں بھی بات عمومی انداز میں فرمائی گئی ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر چونکہ دنیا کو توحید سکھانے اور راہِ ہدایت پر چلانے کیلئے آتے ہیں اس لئے وہ اپنی اس دعوت پر تو کسی طرح کی مفاہمت کیلئے تیار نہیں ہوتے اور اپنی دعوت کے بنیادی نکات میں تو وہ کسی طرح اخفا سے کام نہیں لیتے۔ البتہ! اپنے لب ولہجہ کو اس وقت تک دھیما رکھتے ہیں جب تک مخالفین پر اتمامِ حجت نہیں ہو جاتا۔ اس لئے یہاں فرعون پر اپنی طرف سے عذاب کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ کی اس وحی کی خبر دی ہے جو ان پر آئی تھی کہ تکذیب اور روگردانی کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جاتا ہے۔ اور پھر بات کو بھی عموم کے انداز میں کہا گیا ہے تا کہ فرعون اسے اپنے لئے خاص نہ سمجھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عموم سے خارج نہیں۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿٤٩﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿٥٠﴾

(فرعون نے سوال کیا، اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟ ۴۹) حضرت موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی۔ ۵۰)

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے ساتھ فرعون کا مکالمہ

گزشتہ دو آیتوں میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد اگرچہ یہ بات ذکر نہیں کی گئی کہ آپ دونوں حضرات فرعون کے پاس گئے یا نہیں۔ لیکن پیشِ نظر آیات میں فرعون اور ان کے درمیان مکالمہ یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ یہ دونوں حضرات اس کے پاس پہنچے اور اسے جا کر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔

اس پیغام میں تین باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ پہلی یہ بات کہ اے فرعون! تم اس کائنات اور اس مصر کے رب نہیں ہو بلکہ اس کا رب وہ ہے جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ ہم پہلے اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ فرعون کی حیثیت مصر میں اوتار بادشاہ کی سمجھی جاتی تھی، وہ مصریوں کے عقیدے میں ان کے سب سے بڑے دیوتا ''سورج'' کا مظہر تھا اور اسی عقیدے کے تحت اس کے بت تمام مصر میں پوجے جاتے تھے۔

دوسری بات اس پیغام میں یہ ہے کہ ہم تیرے رب کی طرف سے رسول بن کے آئے ہیں۔ اور ہمارے پاس دو معجزات بھی ہیں جو ہماری ماموریت کی سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ زندگی کی کامیابی اور آخرت کا دارومدار ہماری رہنمائی اور ہدایت کے قبول کرنے پر ہے جس نے ہماری رسالت اور ہدایت سے انکار کیا اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو سکتا ہے۔

یہ تینوں باتیں فرعون کیلئے چونکا دینے والی تھیں۔ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی یہ حیثیت کہ وہ زندہ رب ہے اور کائنات اس کے احکام کی پابند ہے بالکل ایک نئی بات تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھا کہ کائنات کا ایک خالق ہے اور اس کی حیثیت سب سے بلند ہے اور وہی اس کائنات کا رب بھی ہے لیکن وہ یہ سمجھتا تھا کہ زبانی کلامی اس کی اس حیثیت کو قبول کر لینا انسانوں کیلئے کافی ہے، عملی زندگی میں اس کی کوئی حیثیت نہیں اور مزید اسے جس بات نے پریشان کیا وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ دنیا کو زندگی گزارنے کا ایک طریقہ سکھاتا ہے اور اسی پر انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح کا دارومدار ہے۔ وہ اپنا طریقہ جن مقدس انسانوں پر نازل کرتا ہے انہیں رسول کہا جاتا ہے۔ ان کی رہنمائی کو قبول کرنا اور ان کی پیروی کرنا نجات کی ضمانت ہے اور جو شخص ان کی تکذیب کرتا اور ان کے طریقے سے روگردانی کرتا ہے وہ دنیا میں بھی عذاب کا شکار ہو سکتا ہے

Marfat.com

اور آخرت میں تو یقیناً اس کیلئے ہمیشہ کی ناکامی ہے۔ اس لئے اس نے سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ پوچھا کہ تم جس رب کی بات کر رہے ہو، وہ کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں نہایت اختصار سے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ کوزے میں سمندر بند کر دینے کی ایک نادر مثال ہے۔ لیکن اس جواب کو سمجھنے کیلئے بہت ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ ربوبیت کا مفہوم کیا ہے، تکوینِ وجود کے مراتب کیا ہیں، ربوبیت کی اقسام کیا ہیں، ہدایت کا مفہوم کیا ہے، اس کے مراتب کیا ہیں، انسانوں کیلئے خصوصی ہدایت کیا ہے، اسے قبول نہ کرنے کے نتائج کیا ہیں اور رسالت کیوں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے؟؟؟ ایسے ہی چند اور حقائق کے فہم پر اس کے جواب کو سمجھنے کا دارومدار ہے۔ بنابریں ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ ان حقائق پر ایک تفصیلی گفتگو کی جائے۔

تکوینِ وجود کے چار مراتب

خالقِ کائنات نے اپنی آخری کتاب میں تکوینِ وجود کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں۔ خلق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت۔ کائنات کی ہر مخلوق کا عدم سے وجود میں آنا اس کی صفتِ خلق کا اظہار ہے۔ مگر ہر مخلوق کا اس طرح پیدا کیا جانا جس طرح اسے ہونا چاہئے تھا اور اس کے نک سک کا درست ہونا اور اس میں انتہا درجے کا تناسب پایا جانا اور ہر طرح اپنے ماحول سے اس کا مناسبت رکھنا اور ماحول کا اس کے ساتھ مناسب ہونا یہ وہ چیز ہے جس کو تسویہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر مخلوق اپنے وجود کے اعتبار سے اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس کا جسم اور اس کا ماحول باہم دگر ایک دوسرے کیلئے معاون اور مددگار بن گئے ہیں۔ پرند ہوا میں اڑتے ہیں تو انہیں پر عطا کئے گئے۔ مچھلیاں پانی میں پیدا ہوتی ہیں تو انہیں تیرنا سکھایا گیا۔ حشرات الارض کوڑا کرکٹ میں پیدا ہوتے ہیں تو انہیں رینگنا سکھایا گیا۔ چرند اور درند جنگل میں دوڑ پھر رہے ہیں تو انہیں دوڑنا سکھایا گیا۔ مچھلی خشکی میں پیدا نہیں کی گئی۔ پرندے پانی میں پیدا نہیں کئے گئے کیونکہ ان کا جسمانی تناسب اس کی اجازت نہیں دیتا پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر مخلوق کیلئے پہلے سے یہ طے کر دیا گیا کہ اسے کس طرح کا کام انجام دینا ہے؟ اس کی حدودِ کار کیا ہوں گی؟ اس کی قوتِ عمل کس طرح کی ہوگی؟ اسے کب تک کس حال میں رہنا ہے؟ اور کس حد تک اپنے کام کو انجام دینا ہے؟ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کریم میں تقدیر کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورج اور چاند کو پیدا کیا گیا تو ان کے عمل کا ایک دائرہ ٹھہرا دیا گیا، ستارے بنائے گئے تو انہیں ان کی ڈیوٹیاں سمجھا دی گئیں، نباتات سے لے کر آسمان کی ہر مخلوق تک ہر ایک کیلئے ایک تقدیر بنا دی گئی۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج اپنے دائرۂ کار سے باہر نکل جائے یعنی کائنات کو روشنی دینے اور گرمی پہنچانے سے رک جائے، یہ ممکن نہیں کہ چاند اپنی حلاوت سے اہلِ زمین کو محروم کر دے، یہ نہیں ہو سکتا کہ ستارے جھلملانا چھوڑ دیں۔ یہ ناممکن ہے کہ پھول خوشبو دینے اور پانی پیاس بجھانے سے انکار کر دے۔ ہر ایک اپنے کام پر لگا ہوا ہے اور اسے اپنا دائرۂ کار اچھی طرح معلوم ہے اور پھر شعور کی آنکھ سے مزید کام لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تمام مخلوقات کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ تمہارا مقصدِ وجود کیا ہے اور تمہیں اپنے اپنے فرائض کس طرح انجام دینا ہیں۔ مچھلی کو اگر پانی میں تیرنے کا حکم دیا گیا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ اس کو تیرنا نہ سکھایا گیا ہو۔ پرند کیلئے اگر ہوا میں اڑنے کو مقدر کیا گیا تو ایسا نہیں ہے کہ اسے اڑنے کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ سورج، چاند اور ستاروں کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ انہیں اس کی ہدایت نہ دی گئی ہو۔ قرآنِ کریم کہتا ہے:

"لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ"

(سورج کی مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور رات کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے ہر ایک کا

Marfat.com

اپنا دائرۂ کار ہے اور اپنے دائرۂ کار میں مصروفِ عمل ہے)۔

اس ہدایت کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ اسے وجود ملا ہو اور وہ غایتِ وجود سے بے خبر ہو اور پھر اس کو روبعمل لانے سے وہ بے بہرہ ہو۔ اس نے کلیوں کو پیدا کیا تو انہیں چٹکنا بھی سکھایا، اس نے پھول کو پیدا کیا تو اسے مہکنا بھی سکھایا، اس نے درختوں کو پیدا کیا تو انہیں لہکنا بھی سکھایا، اس نے بادل کو پیدا کیا تو اسے کڑکنا بھی سکھایا، اس نے رعد کو گرجنا اور بجلی کو چمکنا سکھایا، اس نے پرندے کو چہکنا اور ہوا کو چلنا سکھایا، اس نے آگ کو جلانا اور پانی کو بہنا سکھایا، اس نے حسن کو مچلنا اور عشق کو پگھلنا سکھایا۔ غرضیکہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جسے اس نے تقدیر اور ہدایت سے نہ نوازا ہو۔ حتیٰ کہ اگر غور و فکر کے چند اوراق اور الٹے جائیں تو بعض چیزیں ایسی سامنے آتی ہیں کہ آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مچھلیوں میں دو کا سفر بہت حیرت انگیز ہے۔

1۔ سامن مچھلی:

یہ اگر کسی ندی میں پیدا ہو تو جوان ہونے کے بعد یہ پہلے دریا میں اور وہاں سے سمندر میں چلی جاتی ہے اور وہاں مدتوں رہتی ہے اور جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی موت قریب آگئی ہے تو وہ واپس چل پڑتی ہے۔ یہ سمندر اور دریا سے ہوتی ہوئی ندی کے اس مقام پر جارکتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اگر وہ دورانِ سفر کسی غلط ندی کی طرف مڑ جائے تو اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ واپس آجاتی ہے۔

2۔ ایل مچھلی:

یہ کسی ندی میں ہو یا دریا میں جوان ہونے کے بعد اپنے وطن سے چل پڑتی ہے اور ہزاروں میل دور جزائر برمودہ (اوقیانوس) میں چلی جاتی ہے۔ وہاں بچے دے کر مر جاتی ہے یہ بچے وہاں سے چل کر اپنی ماں کے وطن میں آجاتے ہیں اور وہاں سے پھر جزائر برمودہ میں پہنچ کر پہلے بچے دیتے ہیں بعد ازاں مر جاتے ہیں۔

ہدایت کے مدارج

تکوین وجود اور تکمیل وجود کے یہ چار مراحل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو پیدا فرمایا پھر اس کا تسویہ کیا، پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کر دی اور پھر اسے اس کی تقدیر کے مطابق زندگی اور معیشت کی راہ پر چلنے کا طریقہ سکھایا۔ یعنی ہدایت عطا فرمائی۔ اس ہدایت پر اگر غور کیا جائے تو اس کے چار طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ نباتات میں یہ ہدایت فطری رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے جس کے نتیجے میں بیلیں زمین پر پھیلتی، پودے سر اٹھاتے، درخت تن کر کھڑے ہوتے ہیں پھر ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ہدایت کے مطابق برگ و بار لاتا اور پھل اور پھول دیتا ہے۔ لیکن حیوانات میں ہم اس فطری ہدایت کو اندرونی الہام کی شکل میں دیکھتے ہیں کہ ہر حیوان کا بچہ ادھر پیدا ہوتا ہے ادھر کوئی الہام کرنے والا اسے یہ الہام کرتا ہے کہ تیری غذا ماں کے سینے میں یا تیرے قریب ہی رکھ دی گئی ہے وہاں سے تجھے اس طرح حاصل کرنی ہے۔ چنانچہ ہم بلی کے بچے کو دیکھتے ہیں کہ ابھی اس نے آنکھیں کھولی نہیں اور خارج کے مؤثرات نے اسے چھوا تک نہیں مگر وہ اپنی ماں کی چھاتی کو ٹٹولتا ہے اس پر منہ مارتا ہے اور پستان کو منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے اور بلی فرطِ محبت سے اسے چاٹ رہی ہے۔ آپ نے بلی کو دیکھا ہوگا جسے اس سے پہلے بچہ جننے کا کوئی تجربہ نہیں ہے مگر جیسے ہی اس کے وضعِ حمل کے دن قریب آتے ہیں وہ الگ تھلگ کونے کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے اور پھر کسی الگ کونے کو عافیت کی جگہ سمجھتے ہوئے بیٹھ جاتی ہے اور بچے جن دیتی ہے اور پھر وہ جس طرح اپنے بچوں کی نگہداشت کرتی ہے اور ایک موہوم خطرہ

Marfat.com

محسوس کرتے ہوئے مختلف جگہیں بدلتی ہے یہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ کوئی اندرونی الہام ہے جو اسے ہر معاملہ کی ہدایت دے رہا ہے۔خود انسان کا بچہ جو جانوروں کے بچوں سے بھی زیادہ بے بس ہوتا ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

"ھُوَ الَّذِیْ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَیْئًا"

(وہ ذات ہے جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے)۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی ماں کی ممتا بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگاتی ہے اور وہ ماں کی چھاتی کے ساتھ منہ مارنے لگتا ہے اور پستان منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے تا کہ اپنی غذا حاصل کر کے۔سوال یہ ہے کہ آخر اس بچے کو کون سکھاتا ہے کہ تیری غذا ماں کی چھاتی میں ہے اور تجھے اس طرح اسے چوسنا ہے یہ وہ اندرونی الہام ہے جس کے ذریعے انسان کو سب سے پہلی ہدایت دی جاتی ہے۔

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور ادراک کی ہدایت ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہرِ دماغ سے محروم ہیں جسے عقل وفکر سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انہیں ادراک واحساس کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی و معیشت کیلئے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد وتناسل اور ہدایت ونگرانی کے تمام فرائض حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔پھر حواس وادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کیلئے ایک ہی طرح کی نہیں بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی جیسی استعداد اس کے احوال کیلئے ضروری تھی۔چیونٹی کی قوت شامہ نہایت دور رس ہوتی ہے اس لئے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کرتی ہے، چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار نہ دیکھ سکیں یہی وہ ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشاد کیا گیا ہے فرعون نے جب پوچھا:

"فَمَنْ رَّبُّکُمَا یَامُوْسٰی"

(اے موسیٰ! تمہارا پروردگار کون ہے؟)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْئٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی"

(ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔پھر اسے ہدایت دی، یعنی اس پر زندگی اور معیشت کی راہ کھول دی)

پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ راہ عمل آسان کر دینے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔فرمایا:

"مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ، مِنْ نُّطْفَۃٍ، خَلَقَہٗ فَقَدَّرَہٗ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَہٗ"

(اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا۔نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کی تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کیلئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ آسان کر دی)۔

ہدایت کے یہ دو مرتبے ہوئے جنہیں ہم ہدایتِ الہام اور ہدایتِ حواس کے نام سے جانتے ہیں۔یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان سب کیلئے ہیں۔الہام کی ہدایت انسان اور حیوان میں سعی وطلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔حواس کی ہدایت کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے۔یہ ہمیں دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی قوتیں بخشتی ہے اور انہی کے ذریعے ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔حیوان کیلئے تو ہدایت کے یہ

Marfat.com

دونوں مرتبے کافی ہیں کیونکہ اسے زندگی کا جو طریقہ اور جو نصب العین سکھایا گیا ہے اس کیلئے کسی تیسرے مرتبۂ ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن انسان کیلئے ایک تیسرے مرتبۂ ہدایت کی بھی ضرورت ہے کیونکہ اس کے لئے مجرد احساس کافی نہیں اور نہ صرف محسوسات کا علم اس کیلئے کفایت کرتا ہے۔ انسان کو تو استنباط اور استنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ احکام کی بھی ضرورت ہے اور کلیات کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ کام صرف حواس کی ہدایت سے ممکن نہیں۔ اس لئے انسان کو ایک تیسرے مرتبۂ ہدایت سے نوازا گیا۔ یہ وہ ہے جسے جوہرِ عقل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جوہرِ عقل دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں الہام ووجدان اور حواس کی روشنی پیدا کردی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم اجسام ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے اسی طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہرِ ادراک جو نباتات میں مخفی اور حیوانات کے وجدان ومشاعر میں نمایاں تھا انسان کے مرتبہ میں پہنچ کر درجۂ کمال تک پہنچ گیا اور جوہرِ عقل کے نام سے پکارا گیا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایتِ فطرت کے ان تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت وعمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اس مرتبہ سے ایک بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کرسکتیں جس حد تک فطرت کی رہنمائی سے ترقی کررہی ہیں۔ الہام کی ہدایت ہم میں طلب وسعی کا جوش پیدا کرتی ہے۔ مطلوبات زندگی کی راہ پر لگاتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے اس کا ادراک حاصل نہیں کرسکتی۔ یہ کام حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی راہنمائی جب درماندہ ہوجاتی ہے تو حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، زبان چکھتی ہے، ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے اور اس طرح ہم اپنے وجود کے باہر کی تمام محسوس اشیاء کا ادراک حاصل کرلیتے ہیں۔ لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آنکھ دیکھتی ہے مگر صرف اسی حالت میں جبکہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں اور اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے۔ مثلاً روشنی نہ ہو یا فاصلہ زیادہ ہو تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ بریں! حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کرسکتی ہے کہ اشیاء کا احساس پیدا کردے لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے ہمیں استنباط واستنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم کلیات وضع کرتے ہیں اور کلیات سے احکام نکالتے ہیں۔ اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔

اسے مثال سے یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ حواس تعمیر کے کام میں مزدوروں کی طرح ہیں۔ جن کا کام خام مواد مہیا کرنا، بکھری ہوئی چیزیں فراہم کرنا اور مسالہ بہم پہنچانا ہے اور عقل کی حیثیت ایک معمار کی ہے جس کا کام بکھرے ہوئے مواد کو جوڑ کر ایک عمارت کی تشکیل دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حواس کے بعد عقل کا جوہر عطا نہ کیا جاتا تو ہماری بکھری ہوئی معلومات، ہمارے منتشر محسوسات، ہماری زندگی کے کسی شعبہ کیلئے معاون ثابت نہ ہوتے کیونکہ ان سے کام لینا، انہیں ترتیب دینا اور ان سے کلیات وضع کرنا اور پھر ان سے احکام استنباط کرنا۔ عقل کا کام ہے اور عقل کی عدم موجودگی میں ظاہر ہے یہ کام نہیں ہوسکتا تھا اور ہم زندگی کے میدان مین ناکام ہوجاتے۔ پھر ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وجدان اور فطری الہام کی نگرانی کیلئے حواس کی راہنمائی کی ضرورت ہے کیونکہ وجدان اور احساس غلطیوں سے مبرا نہیں۔ ان کی تصحیح ونگرانی کیلئے ہمیں حواس کی راہنمائی کی ضروت ہے اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حواس کی راہنمائی بھی نارسائی کا شکار ہوتی ہے اور غلطیوں سے محفوظ بھی نہیں۔ مثلاً ہم دور سے ایک چیز دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حجم نہیں رکھتی۔ حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتی ہے۔ ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں لیکن ہماری قوت ذائقہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ اس کا مزا کڑوا ہے۔ ہم تالاب میں لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں لکڑی بالکل سیدھی ہوتی ہے۔ لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے

Marfat.com

کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں اور ہمیں ایسی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں اب اگر مرتبۂ حواس سے ایک بلند تر مرتبۂ ہدایت کا وجود نہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ ہم حواس کی درماندگیوں میں حقیقت کا سراغ پاسکتے لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے۔ وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری راہنمائی کرتی ہے وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے۔ اگرچہ ہماری آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ شہد کا مزا ہر حال میں میٹھا ہے اور اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ ہمارے منہ کا مزا بگڑ گیا ہے۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے سے کان بجنے لگتے ہیں۔ اور ایسی حالت میں جو صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ خارج کی صدائیں نہیں خود ہمارے دماغ کی گونج ہوتی ہے۔ گذشتہ معروضات میں آپ نے دیکھا کہ وجدان اور الہام کی ہدایت کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے نہیں بڑھ سکتی تھی اور پھر حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور اس کے ساتھ یہ بات بھی کہ وہ غلطیوں اور نارسائیوں سے محفوظ بھی نہیں تھی۔ ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ دونوں کمزوریاں عقل کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہیں۔ کیونکہ عقل زندگی کے ہر شعبہ میں نہ تو مکمل رہنما ہے اور نہ بالکل صحیح راہنما ہے۔ اس کا بھی ایک محدود دائرۂ عمل ہے جس سے یہ آگے نہیں بڑھ سکتی اور اس کی کارفرمائی بھی غلطیوں سے مبرا نہیں کیونکہ اس کا دائرۂ عمل جیسا کچھ بھی ہے وہ محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ یعنی وہ صرف اس حد تک کام دے سکتا ہے۔ جس حد تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟ اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟ جس سے آگے ہماری چشم حواس نہیں بڑھ سکتی۔ یہاں پہنچ کر عقل ایک قلم درماندہ ہوجاتی ہے اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔ بقول اقبال :

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

یوں کہنا چاہئے کہ عقل ایک صحیح راہنما ہے۔ لیکن مکمل نہیں۔ غلطی ہماری ہے کہ ہم اسے ایک مکمل رہنما سمجھ کر زندگی کے ہر دائرۂ عمل میں اس سے راہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی آدمی نے کسی صراف سے یہ پوچھا کہ صراف میاں تمہارا میزان کیسا ہے؟ اس نے کہا بالکل صحیح ہے۔ بالکل صحیح تولتا ہے۔ ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہونے دیتا۔ اس نے کہا اگر تمہاری بات صحیح ہے تو پھر اس میں اپنی دکان تول کر دکھاؤ۔ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا بھلے آدمی یہ دکانیں تولنے کیلئے تھوڑی بنایا گیا ہے۔ اس میں تو سونا چاندی تولتے ہیں۔ اس نے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ تمہارا میزان صحیح ہے۔ اس نے کہا میں نے صحیح کہا تھا۔ یہ غلطی میزان کی نہیں تمہاری ہے کہ تم اس میں وہ چیز تلوانا چاہتے ہو جو اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ ہم بھی عقل سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو اس کے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ اس کا دائرۂ کار محسوسات تک محدود ہے۔ طبیعیات تک محدود ہے رہی یہ بات کہ محسوسات کے دائرہ کے پیچھے کیا ہے اور مابعد الطبعیات کیا ہے عالم لاہوت اور عالم الٰہیات کیا ہے، عالم ملکوت کا کیا حال ہے؟ عالم برزخ میں کیا ہو رہا ہے؟ عالمِ آخرت میں کیا ہوگا؟ موت اور زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ روح کس چیز کا نام ہے کائنات کی ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیا ہیں؟ اخلاقی مسلمات کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج وزوال کے اصل اسباب کیا ہیں؟ وہ اخلاقی نقطہ کیا ہے جس سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے اور پھر انسانیت پروان چڑھتی ہے؟ انسانیت

Marfat.com

کے مسلمہ مسائل کا اجتماعی حل کیا ہے؟ انسان کے اندر بیٹھا ہوا انسان کس چیز سے مرتا اور کس چیز سے جیتا ہے؟ یہ وہ زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں جس سے پردہ اٹھانا عقل کی بساط سے باہر ہے۔ لیکن جب ہم انہی چیزوں کا جواب عقل سے مانگتے ہیں تو ہم اس پر ایک ایسا بوجھ لاد دیتے ہیں جس کے تحمل کی طاقت اس میں نہیں ہے بلکہ بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے بالکل پیش پا افتادہ حقائق بھی انسانی عقل کی گرفت سے باہر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ غور فرمائیے کہ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں میں کچھ اس طرح گھرا ہوا، بلکہ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب بھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

جذبات تو پھر بھی ایک زوردار شے ہے۔ وہم تو انسانی احساسات میں سے ایک کمزور حس کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات وہم جیسا کمزور جذبہ بھی عقل انسانی پر غالب آ جاتا ہے۔ عقل جانتی ہے کہ ایک انسان کو گذرنے کیلئے ایک فٹ یا زیادہ سے زیادہ دو تین فٹ چوڑی گزرگاہ کافی ہے۔ اگر کسی عقل کے پرستار سے یہ پوچھا جائے کہ دریا کے اوپر گزرگاہ بنانے کیلئے کتنا چوڑا پل ہونا چاہئے تو وہ عقل کے مطابق اتنی ہی چوڑائی تجویز کرے گا۔ لیکن اگر کسی عقل کے پرستار سے کسی ایسے پل پر سے گزرنے کو کہا جائے جو تین فٹ چوڑا ہو لیکن اس کے نیچے سے گزرنے والا دریا طغیانی پر آیا ہوا ہو جس کی موجیں اچھل کر دریا کے پل کو چھو رہی ہوں تو یہی عقل کا پرستار کبھی اس پل پر سے گزرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ بلکہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر گذرنے سے صاف انکار کر دے گا۔ غور فرمائیے کہ جس عقل کو جذبات اپنا اسیر بنا لیں اور وہم اسے شکست دے دے وہ زندگی کے معاملات حل کرنے میں کہاں تک مؤثر ہو سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ عقل کے میزان ہونے اور مؤثر رہنما ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب اس کے دائرۂ کار سے باہر اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسے ایک مکمل رہنما سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی کمزوری کا عالم بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جذبات اور وہم کی زنجیروں سے آزاد کرنے سے بھی عاجز ہے۔ یہاں تک تو معاملہ پھر بھی عقل کے مؤثر نہ ہونے کا ہے لیکن اس وقت تو معاملہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے جب عقل نہ صرف یہ کہ مؤثر نہیں رہتی بلکہ بعض دفعہ اپنی رہنمائی میں وہ غلط نتائج پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ موقع وہ ہے جب عقل کو خواہشات کا غلام بنا دیا جاتا ہے انسان عجیب واقع ہوا ہے کہ وہ اصلاً خواہشات کی پیروی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے بروئے کار لاتے ہوئے نام عقل کا رکھتا ہے۔ حالانکہ اگر دیانت داری سے غور کیا جائے تو وہاں عمل دخل عقل کا نہیں بلکہ سراسر خواہشات کا ہوتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم نے ایک جگہ ارشاد فرمائی:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ

(کہ اگر حق ہوائے نفس کی پیروی کرنے لگے تو زمین و آسمان اور اس میں جو کچھ ہے وہ تباہ ہو جائے)۔

اور یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ فلسفہ قانون میں فلاسفہ کا ایک گروہ پایا جاتا ہے جن کا نمایاں نمائندہ مشہور ماہر قانون ڈاکٹر فرائیڈ مین ہے۔ اس نے اپنے نظریہ کی وضاحت کیلئے ''دی لیگل تھیوری'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اس میں ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

''عقل صرف انسانی جذبات و خواہشات کی غلام ہے اور اس کو انہی کا غلام ہونا بھی چاہئے۔ عقل کا اس کے سوا اور کوئی

Marfat.com

کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان جذبات کی بندگی اور ان کی اطاعت کرے۔"

پھر اس نظریے سے جو نتیجہ نکلنا چاہئے وہ ڈاکٹر فرائیڈ مین کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"اس کے سوا ہر چیز یہاں تک کہ اچھے برے کے تصورات اور یہ الفاظ کہ فلاں کام ہونا چاہئے اور فلاں کام ہونے کے لائق ہے کلی طور پر جذباتی باتیں ہیں اور دنیا میں اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔"

ممکن ہے کہ آپ اسے محض ایک فلسفی کی بڑ سمجھیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں عقل کی برتری کا دعویٰ کیا جاتا ہے بلکہ عقل کی غلامی کی جارہی ہے وہاں عملی زندگی میں یہی فلسفہ ہمیں حاکم دکھائی دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاق کی ہر قدر رفتہ رفتہ شکست وریخت کا شکار ہے۔ رحم اتنی بڑی اخلاقی قدر ہے کہ شائد کوئی اس کا انکار نہ کر سکے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے بموں سے انسانیت پر جو ظلم ہوا انسانیت کی پیشانی آج بھی اس سے عرق آلود ہے۔ لیکن اندازہ فرمائیے کہ جب اس واقعہ کو خالصتاً عقل کی نگاہ سے دیکھا گیا تو اسے ظلم کی بجائے رحم بنا دیا گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جیسی علمی اور عالمی کتاب میں ان تباہ کاریوں کا ذکر بعد میں کیا گیا جو ایٹم بم کی بدولت ہیروشیما اور ناگاساکی میں برپا ہوئیں لیکن ایٹم بم کے تعارف میں یہ جملہ سب سے پہلے لکھا گیا ہے:

"سابق وزیراعظم ونسٹن چرچل نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ایٹم بم نے جنگ کو مختصر کر کے دس لاکھ امریکی سپاہیوں اور اڑھائی لاکھ برطانوی سپاہیوں کی جانیں بچائیں۔"

انداہ فرمائیے! اس قسم کی منطق میں کون سے ظلم وستم اور کون سی سفاکی ایسی ہے جسے عقل کے خلاف کہا جا سکے؟ اسی طرح شرم وحیاء انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے لیکن خالص عقل کے پیروکاروں نے جس طرح اس کی مٹی پلید کی ہے اور اس بنیادی قدر کو جس طرح انسانی زندگی سے خارج کر دیا ہے اس کو سمجھنے کیلئے میں شرم وحیاء سے معذرت کے ساتھ آٹھ سو سالہ پرانی ایک مثال پیش کر رہا ہوں۔

"تاریخ اسلام میں ایک فرقہ "باطنیہ" کے نام سے گزرا ہے۔ اس کا ایک مشہور لیڈر عبیداللہ القیر وانی اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

وما العجب من شئی کالعجب من رجل یدعی العقل ثم یکون له اخت او بنت حسناء ولیست له زوجة فی حسنها فیحرمها علی نفس وینکحها من اجنبی ولو عقل الجاهل لعلم انه احق باخته وبنته من الاجنبی وماوجه ذلک الاان صاحبهم حرم علیهما الطیبات (الفرق بین الفرق لعبدالقاهر البغدادی)

"اس سے زیادہ تعجب کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے اور خود اس کی بیوی اتنی حسین نہیں ہوتی مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام قرار دے کر اسے کسی اجنبی سے بیاہ دیتا ہے۔ حالانکہ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حق دار ہیں۔ اس بے عقلی کی وجہ دراصل صرف یہ ہے ان کے آقا نے ان پر عمدہ چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔"

آپ ممکن ہے کہ اسے آٹھ سو سالہ پرانی غیر ترقی یافتہ حالت کی عکاس سمجھ کر نظرانداز کر دیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ

Marfat.com

دور میں جس طرح عقلِ خالص کی پیروی میں اضافہ ہوا ہے اسی طرح اس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار کی پامالی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آج کے دور میں بہن سے نکاح باقاعدہ ایک نعرہ بن چکا ہے اور امریکہ کی بعض ریاستوں میں باقاعدہ اس کے حق میں جلوس نکالے گئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اس بداخلاقی کو روکنے کے لئے میڈیکل سائنس کے حوالے سے یہ دلیل دی جاتی رہی ہے کہ استلذ اذ بالاقارب سے طبی نقصانات ہوتے ہیں۔ لیکن آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آرہی ہیں انہوں نے نہ صرف ان طبی نقصانات کی توجیہ کو غلط ثابت کر دیا ہے بلکہ استلذ اذ بالاقارب کو انہوں نے انسان کی فطری خواہش یعنی ہیومین ارج قرار دے کر انسان کا بنیادی حق تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی جارہی ہیں اور اسی رویہ کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر چکی ہے اور یہ اخلاقی اعتبار سے انتہائی قابل نفرت خصلت جس کی وجہ سے قوم لوط پر اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ نہ صرف کوئی برائی نہیں رہی بلکہ اسے باقاعدہ ایک علم بنادیا گیا ہے۔ آپ امریکہ کی لائبریریوں میں جائیں تو وہاں آپ کو اس برائی کے حق میں لکھی ہوئی کتابوں پر مشتمل علیحدہ سیکشن ملے گا۔ جس کا عنوان ہوگا۔ ''گے اسٹائل آف لائف''

چند سال پیشتر امریکی رسالے ٹائم نے لکھا کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اسلئے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست تھے۔ لیکن اس اقدام کے خلاف امریکہ میں شور مچ رہا ہے۔ مظاہرے ہو رہے ہیں اور چاروں طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ آپ نے جن لوگوں کو ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے فوج کے عہدوں سے برخاست کیا ہے یہ آپ نے ایک خلافِ عقل حرکت کی ہے۔ اس لئے ان کو دوبارہ بحال ہونا چاہئے اور اس کے حق میں دلیل یہ دی جارہی ہے کہ یہ ایک ہیومن ارج ہے اور ہیومین ارج کو دبایا نہیں جاسکتا اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر ہو رہا ہے اور اب تو یہ معاملہ یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ بات صرف جنس انسانی کی نہیں رہی بلکہ اب تو جانوروں کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جارہا ہے۔

اس تمام بحث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اور حیوان کی زندگی کے تحفظ اور اس کو معیشت کی راہ پر لگانے کیلئے سب سے پہلے فطری رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اپنا کام کرتی ہے۔ اس کے بعد باہر کی زندگی کی راہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے حواس خمسہ کی راہنمائی مہیا فرمائی۔ حواس خمسہ نے محسوسات کے دائرے میں رہ کر انسانی زندگی کو آگے بڑھایا۔ پھر جب انسان کے قدم محسوسات سے آگے بڑھے تو اسے عقل کی راہنمائی عطا فرمائی گئی۔ اب ہم نے تفصیل سے دیکھا کہ عقل انسان کی راہنمائی کیلئے بہت مؤثر رہنما ہونے کے باوجود اعمال کی درستگی اور انضباط کیلئے کافی نہیں۔ وہ قدم قدم پر جذبات کی اسیر ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ قوت واہمہ سے شکست کھا جاتی ہے اور اگر یہ جذبات ہوائے نفس کی لپیٹ میں آجائیں تو پھر عقل نہ صرف اس کے سامنے بے دست و پا ہو جاتی ہے۔ بلکہ عموماً وہ ہوائے نفس کی وکالت کرنے لگتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاقی قدریں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ عقلی مسلمات شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اب جس پروردگار نے قدم قدم پر حیوان اور انسان کی راہنمائی فرمائی کیا یہ ممکن ہے کہ وہ انسان کو غلطان و پیچان چھوڑ دے کہ وہ ہوائے نفس کا شکار ہو کر اپنی زندگی اور آخرت تباہ کرلے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس پروردگار کی رحمت سے یہ بات یقیناً بعید ہے کہ وہ عقل کے بعد انسان کو کسی اور راہنمائی سے محروم فرمادے۔ بلکہ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جس طرح وجدان کے بعد حواس کی رہنمائی پروردگار نے عطا فرمائی اور حواس کے بعد عقل کی، اسی طرح اس نے اپنے ذمہ یہ بات لے رکھی ہے کہ عقل کے بعد زندگی کو رہنما سے محروم نہیں رکھے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے جابجا ان مراتب ہدایت کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا

(ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا جسے ایک کے بعد ایک مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں۔ پھر اسے ایسا بنا دیا کہ سننے والا، دیکھنے والا وجود ہو گیا۔ ہم نے اس پر راہِ عمل کھول دی۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا۔ یعنی یا تو اللہ کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک ٹھیک کام میں لائے اور فلاح وسعادت کی راہ اختیار کرے یا ان سے کام نہ لے اور گمراہ ہو جائے)۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ

(کیا ہم نے اسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دے دی ہیں (جن سے وہ دیکھتا ہے) اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں) اور کیا اس کو ہم نے (سعادت وشقاوت کی، دونوں راہیں نہیں دکھا دیں؟)۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ

(اور اللہ نے تمہارے لیے سننے اور دیکھنے کے حواس پیدا کر دیئے اور سوچنے کیلئے دل (یعنی عقل) تاکہ تم شکر گذار رہو (یعنی اللہ کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک طریقہ پر کام میں لاؤ)۔

ان آیات اور ان کے ہم معنی آیات میں حواس اور مشاعر اور عقل وفکر کی ہدایت کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، لیکن وہ تمام مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت وشقاوت کا ذکر کیا گیا ہے وحی ونبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں۔ مثلاً

"اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى"

(بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم راہنمائی کریں اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں۔ یعنی دنیا وآخرت کی ضرورتوں کیلئے رہنمائی ہماری ذمہ داری ہے)۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى

(اور باقی رہی قوم ثمود، تو اسے بھی ہم نے راہ حق دکھلا دی تھی۔ لیکن اس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ اختیار کیا)۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ

(اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی تو ضروری ہے کہ ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں)۔

انسانی زندگی کی ضرورتیں جہاں کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، لوگوں سے میل جول رکھنا، عناصر قدرت اور عناصر فطرت سے مستفید ہونا ہیں وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ باہمی میل جول کے آداب کیا ہیں، خود میری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کے کیا

Marfat.com

فرائض اور کیا حقوق ہیں؟ شائستگی اور دل بستگی کیا ہے؟ ان کے آداب کیا ہیں؟ دوسروں کے مجھ پر حقوق کیا ہیں؟ ہمسائیگی کیا ہے؟ اخوت ومحبت کسے کہتے ہیں؟ ماں باپ کا احترام کیا ہے؟ علم کس چیز کا نام ہے اور اس کی حدود کیا ہیں؟ عورت اور مرد کا رشتہ کیا ہے اور اس کی نزاکتیں کیا ہیں؟ محرم کسے کہتے ہیں اور نامحرم کون ہے؟ عبادات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی یا ختم ہو جائیگی؟ اس کا انجام فنا ہے یا بقاء ہے؟ کیا کوئی دوسری دنیا بھی ہے؟ تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا میں مرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاؤں گا؟ یہ عالم برزخ کیا ہے؟ اور عالم آخرت کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیسی ہیں؟ وہ اگر ہمارا مالک ہے تو وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے؟ قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟ آدمی ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتا ہے تو اس کا صلہ کیا ہوگا؟ اخلاقی مسلمات کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کیا ہیں؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کن کاموں سے زندہ ہوتی ہے اور کن کاموں سے مرجاتی ہے؟ اور اسی طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب انسان کو ملنا چاہئے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ان کا جواب نہ حواس کے پاس ہے اور نہ عقل کے پاس۔ اب اگر ہمیں اپنے محسوسات کی دنیا میں جوابات دینے کیلئے حواس وعقل کی راہنمائی دی گئی ہے تو کیا عالم ناسوت اور عالم ملکوت کی حقیقتوں اور اپنی دنیا میں سرفرازی اور آخرت میں سرخروئی اور اس آنکھ کے پردے کے پیچھے کے حقائق کو جاننے کیلئے ہمیں کوئی راہنمائی نہیں دی جائے گی؟ اور ہم بے خبری میں غلط سلط فیصلے کرتے رہیں گے۔

یقیناً وہ ذات جس نے چیونٹی تک کی ضرورتیں پوری کی ہیں وہ انسان کو اس سے بے خبر نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ اس نے حواس اور عقل کے ذریعے کے بعد ہمیں ایک اور ذریعۂ علم بھی بخشا جس کا نام وحی اور رسالت ہے اور اس وحی کے حاملین کو پیغمبر نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اس ذریعہ سے انسانوں کو وہ سب کچھ بتایا گیا جو اس کی دنیوی، اخروی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضرورت تھی بلکہ اس ذریعۂ علم کے ذریعے انسانوں کی دنیا بھی اور آخرت بھی تباہ ہونے سے بچالی گئی۔ تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں کتنی قومیں اس صفحۂ ہستی پر قوت کا نشان بن کر اٹھیں لیکن اپنی اخلاقی بے راہ روی اور غلط فیصلوں کے نتیجے میں اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں۔ آسمانی کتابوں نے جابجا اس تاریخ کو بیان کیا ہے تاکہ انسان اس بات کو سمجھے کہ انسانی بقاء کا دارومدار اس کی اخلاقی زندگی اور توانائی پر ہے کیونکہ اخلاقی زندگی میں گراوٹ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی بلکہ انسانیت سے تہی دامن کر دیتی ہے۔ وہ شرم وحیاء سے عاری ہو کر کتوں، بلیوں کی سطح پر آجاتا ہے۔ رحم ومروت سے بے بہرہ ہو کر درندوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ حرام وحلال سے بے گانہ ہو کر حشرات الارض کی جگہ نشے کی حالت میں گلی کوچوں میں پڑا دکھائی دیتا ہے۔ آخرت کی محبت سے محروم ہو کر اور حبِ دنیا کا اسیر بن کر بندۂ درہم ودینار بن جاتا ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اس ذریعۂ علم کو پہچانیں جسے وحی الٰہی کہا جاتا ہے اور ان کے حاملین کا راستہ اختیار کریں جنہیں پیغمبر اور رسول کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا میں بہت کچھ بدل گیا اور بگڑ گیا ہے مگر پھر بھی آپ کو جہاں تہاں بھی کوئی روشنی دکھائی دیتی اور انسانیت کی نمود ملتی ہے وہ سراسر ان انبیاء کا ورثہ ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتے تو ہم اس رہنمائی سے یکسر محروم رہ جاتے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾

(اس نے پوچھا تو پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے؟ ۵۱)

Marfat.com

فرعون کا ایک شاطرانہ سوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک جملے میں جس طرح ایک پورا مضمون سمیٹ دیا تھا اور نہایت حکیمانہ باتیں فرمائی تھیں۔ فرعون یا تو اسے سمجھ نہیں سکا اور یا اس نے قصداً ان باتوں کا اثر زائل کرنے کیلئے نہایت طنز اور تحقیق کے انداز میں یہ سوال کیا کہ اچھا اگر تم اپنے رب کے پاس سے پیغام لے کے آئے ہو تو پھر تو تمہیں اگلی قوموں کے احوال کی بھی خبر ہوگی، یعنی ہمارے جو آباؤ اجداد گزر چکے ہیں تم ان کے بارے میں بتا سکتے ہو کہ وہ کس حال میں ہیں۔ اس نے اپنے تئیں ایک بڑا مضبوط جال پھینکا تھا کہ اگر موسیٰ یہ کہیں کہ وہ لوگ بہت اچھی حالت میں ہیں، جنت میں انہیں اعلیٰ مقامات دیئے گئے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ہم تو انہیں کے طریقے پر چلنے والے لوگ ہیں۔ اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں تو پھر تم ہمیں کیا سمجھانے آئے ہو کیونکہ ہماری زندگی تو انہیں کی زندگیوں کا عکس ہے۔ ہمارے طور اطوار بالکل وہی ہیں جیسے وہ زندگی گزارتے تھے۔ اور اگر موسیٰ یہ کہیں کہ وہ گمراہ اور کافر لوگ تھے اس لئے اپنے کفر کی پاداش میں پکڑے گئے ہیں تو میں اسے ایک سیاسی مسئلہ بنا دوں گا اور لوگوں کو یہ کہہ کر مشتعل کروں گا کہ سنو! یہ نام نہاد پیغمبر تمہارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتے ہیں۔

ہر دور میں برخود غلط اور متکبر لوگوں نے سنجیدہ باتوں کا اسی طرح مذاق اڑایا ہے۔ عوام تو ہمیشہ سے کالانعام رہے ہیں۔ وہ جذبات پر جیتے اور جذبات پر مرتے ہیں۔ انہیں کسی بھی جذباتی بات پر مشتعل کر دینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ فرعون نے بھی یہی تدبیر کرنے کی کوشش کی۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ پہلی قوموں کا حال میرے رب کے پاس، ایک رجسٹر میں (محفوظ) ہے، نہ میرا رب بھٹکتا ہے نہ بھولتا ہے۔ ۵۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے طنز اور طنز آمیز رویہ پر کوئی ردعمل دکھانے کی بجائے نہایت باوقار انداز میں فرمایا کہ جو لوگ گزر چکے ہیں ان کی زندگیوں کے بارے میں ایک ایک بات اللہ تعالیٰ کے پاس ایک عظیم دفتر میں محفوظ ہے۔ اور یہ دفتر ایسا ہے جس میں کوئی چھوٹی بڑی بات چھوٹنے نہیں پائی لیکن یہ محض حفاظت کیلئے نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص جب جوابدہی کیلئے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے تو اس کی زندگی کا روزنامچہ اس دفتر سے حاصل کردہ معلومات کی بنیاد پر اس کے سامنے ہوگا۔ نہ کسی چیز کو چھپایا جا سکے گا اور نہ کسی چیز کا اضافہ کیا جا سکے گا کیونکہ یہ دفتر اور رجسٹر میرے رب کا ہے جس میں انسانوں کے اعمال منضبط کئے جاتے ہیں اور میرا رب ہر طرح کی خطا اور نسیان سے پاک ہے۔ نہ وہ غلطی کرتا ہے اور نہ وہ بھولتا ہے۔ اس لئے تمہارے سوال کا اصل جواب تو وہاں جا کر کھلے گا۔ میں جو ہدایت لے کے آیا ہوں اس کا براہ راست تعلق ان لوگوں سے ہے جو اس وقت موجود ہیں۔ اس لئے تمہیں میری دعوت پر غور کرنا چاہئے۔ پہلے لوگوں کے حالات جیسے بھی ہوں انہیں قیامت کے دن ہم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَ ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ

Marfat.com

لِّاُولِی النُّھٰی ﴿۵۳﴾

(وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہارے لئے راستے نکالے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس سے مختلف نباتات کی گونا گوں قسمیں پیدا کر دیں۔ ۵۳) کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو چراؤ، اس کے اندر اہلِ عقل کیلئے نشانیاں ہیں۔ ۵۴)

پروردگار کی جانب سے چند توضیحی ہدایات

اندازِ کلام سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب "یَنْسٰی" پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کی چار آیتیں تفہیم و توضیح کیلئے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اس کی مثالیں جا بجا گزری ہیں کہ کسی واقعہ کو بیان کرنے یا کوئی حکایت رقم کرنے کے بعد پروردگار پند و نصیحت کے طور پر یا وضاحت و تفہیم کیلئے کچھ باتیں ارشاد فرماتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب فرعون کے جس سوال کے حوالے سے تھا وہ درحقیقت وہاں سے شروع ہوا تھا جہاں اس نے یہ پوچھا تھا کہ اے موسیٰ! تمہارا رب کون ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار کی ہدایت کے مطابق جو جواب ارشاد فرمایا وہ نہایت حکیمانہ اور نہایت جامع تھا۔ اب اسی سوال کے جواب میں نہایت آسان باتیں کہی جا رہی ہیں جس سے عوام کیلئے بھی اس جواب کا سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے زمین کو انسانوں کیلئے گہوارے کی طرح بچھا دیا ہے۔ ہم اس زمین پر چلتے اور اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ حیرانی ہوتی ہے کہ نہ وہ اتنی نرم ہے کہ اس میں دھنس جائیں اور نہ اتنی سخت ہے کہ اس پر چلنے یا لیٹنے سے جسم چھل جائے۔ پھر جس طرح ماں کے سینے سے بچے کو دودھ ملتا ہے اسی طرح زمین کی آغوش سے انسان کی غذا نکلتی ہے یعنی وہ راحت رسانی کے لحاظ سے بھی گہوارہ ہے اور نفع رسانی اور اشیائے ضرورت کی بہم رسانی کے اعتبار سے بھی گہوارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر یہ گہوارہ اتنا مکمل ہے کہ انسان موت کے بعد ہمیشہ کیلئے اسی میں سو جاتا ہے۔ زمین میں نہ جانے کن مصلحتوں کے تحت نشیب و فراز رکھے گئے ہیں اور پہاڑی اور میدانی علاقوں میں زمین کو تقسیم کیا گیا ہے۔ لیکن قدرت کی کرم نوازی یہ ہے کہ اس نے زمین کے اندر چلنے کیلئے راستے بنائے اور پہاڑوں میں درے کھول دیئے۔ پھر اس کی ربوبیت کا مزید فیضان یہ ہے کہ زمین کو اس نے اگرچہ قوتِ روئیدگی سے معمور کر دیا لیکن اس کی روئیدگی اس وقت تک اپنا کام نہیں دکھا سکتی جب تک آبیاری کا سامان نہیں ہوتا۔ اس لئے پروردگار نے آسمان سے پانی برسایا اور اس سے قسم قسم کی نباتات اور طرح طرح کے درخت اگائے جن میں سے کچھ انسانوں کی خوراک کیلئے ہیں اور کچھ مویشیوں کا چارہ۔ اس لئے فرمایا کہ زمین کی پیداوار سے خود بھی کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو بھی چراؤ۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو بالکل سامنے کی ہیں لیکن اپنے مؤثر ہونے میں بے مثال ہیں۔ ایک عام آدمی بھی یہ بات سمجھتا ہے کہ جس کی زمین پر میں رہتا ہوں اور جس کی پیدا کردہ خوراک سے پیٹ بھرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر زندگی کی تمام سہولتیں مہیا کیں۔ عجیب بات ہے کہ میں اسے چھوڑ کر کسی اور کو رب بنا لوں۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے عقل و خرد سے نوازا ہے وہ اس نظامِ ربوبیت میں نہ جانے کیا کیا حکمتیں محسوس کرتے ہیں۔ اسی میں ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت دکھائی دیتی ہے، اسی سے وہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر استدلال کرتے ہیں، اسی سے انہیں جزاء و سزا کے تقاضے بھی سمجھ میں آتے ہیں اور ہر طرف قدرت کی رحمت دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اس میں اہلِ عقل کیلئے قدم قدم پر نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ جب اس میں غور کرتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں:

Marfat.com

هرکہ بینم در جہاں غیرے تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾
وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا
مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ
بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾
قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰى
فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا
عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾
فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰنِ
لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ
الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ
اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ
مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ
اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾
قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا
صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾

Marfat.com

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ ﴿٧٠﴾ قَالَ
آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۖ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۖ
فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي
جُذُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَىٰ ﴿٧١﴾ قَالُوا لَن
نُّؤْثِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا ۖ فَاقْضِ مَا أَنتَ
قَاضٍ ۖ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٧٢﴾ إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا
خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۗ وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿٧٣﴾ إِنَّهُ
مَن يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴿٧٤﴾
وَمَن يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ
الْعُلَىٰ ﴿٧٥﴾ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ
وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَن تَزَكَّىٰ ﴿٧٦﴾

رکوع: ۳۔ (اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ ۵۵)
اور ہم نے اس کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں تو اس نے جھٹلایا اور انکار کر دیا۔ ۵۶) اس نے کہا اے موسیٰ! کیا تم اس
لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہماری سرزمین سے نکال باہر کرو۔ ۵۷) ہم بھی تمہارے
مقابل میں ایسا ہی جادو لائیں گے، پس ہمارے اور اپنے درمیان ایک مقابلے کا دن مقرر کر لو، نہ ہم اس کی مخالفت کریں
اور نہ تم کرو، جمع ہونے کی جگہ ہموار اور کھلی ہو۔ ۵۸) حضرت موسیٰ نے کہا تمہارا مقابلے کا دن جشن کا دن ہے اور یہ
خیال رہے کہ تمام لوگ چاشت کے وقت جمع ہو جائیں۔ ۵۹) فرعون وہاں سے پلٹا پھر اپنی ساری تدبیریں اکٹھی
کیں پھر مقابلہ پر آیا۔ ۶۰) حضرت موسیٰ نے ان سے کہا تمہاری بربادی ہو، اللہ پر جھوٹ نہ باندھو، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی
عذاب سے تمہاری جڑ اکھاڑ دے اور جس نے خدا پر جھوٹ باندھا وہ نامراد ہوا۔ ۶۱) پس وہ جھگڑنے لگے اپنے
معاملے میں آپس میں اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔ ۶۲) انہوں نے کہا یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں یہ

Marfat.com

چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دیں۔ اور تمہارے اعلیٰ طرزِ زندگی کو درہم برہم کر دیں۔ ۶۳) پس اپنی ساری تدبیریں جمع کر لو، پھر ان کے مقابلے میں متحد ہو کر آؤ اور آج کامیاب وہی رہے گا جو غالب آئے گا۔ ۶۴) جادوگروں نے کہا، اے موسیٰ! تم پیش کرو یا ہم پیش کرنے والے بنتے ہیں۔ ۶۵) حضرت موسیٰ نے کہا بلکہ تم ہی پیش کرو، تو اچانک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے اثر سے آپؐ کو یوں دکھائی دینے لگیں جیسے وہ دوڑ رہی ہوں۔ ۶۶) تو موسیٰ علیہ السلام دل میں کچھ ڈرے۔ ۶۷) ہم نے کہا ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے۔ ۶۸) جو تمہارے ہاتھ میں ہے اسے زمین پر ڈال دو، یہ ان کے سارے سوانگ کو جو انہوں نے رچایا ہے نگل جائے گا، انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ فقط ایک جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر جہاں بھی جائے کبھی فلاح نہیں پاتا۔ ۶۹) تو جادوگر سجدے میں گر پڑے اور کہنے لگے کہ ہم نے مان لیا ہارون اور موسیٰ کے رب کو۔ ۷۰) فرعون نے کہا کہ تم اس پر ایمان لے آئے، اس سے پہلے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا، بیشک وہی تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی ہے، اب میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹوں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا، پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔ ۷۱) انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز تمہیں ترجیح دینے والے نہیں ہیں ان روشن دلائل پر جو ہمارے سامنے آئے ہیں اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، تم کر گزرو جو کچھ کر سکتے ہو، تم زیادہ سے زیادہ اسی زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہو۔ ۷۲) ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں تا کہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اور اس جادوگری کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ ۷۳) حقیقت یہ ہے کہ جو شخص مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گا اس کیلئے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔ ۷۴) اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہو گا جس نے نیک عمل کئے ہوں گے ایسے لوگوں کیلئے بلند درجے ہیں۔ ۷۵) سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ جزاء ہے اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔ ۷۶)

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

(اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ ۵۵)

نظامِ ربوبیت سے قیامت پر استدلال

اسی زمین پر جو پروردگار کا نظامِ ربوبیت پھیلا ہوا ہے اس سے قیامت پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا۔ یعنی ان تمام عناصر کا تعلق زمین سے ہے جو انسانی جسم کی بناوٹ میں استعمال ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا کیا کہنا کہ جس طرح اس نے زمین کو ہمارے لئے گہوارہ بنایا ہے اسی طرح اسے ہمارے مادۂ تخلیق کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اسی سے بننے والا انسان اور اسی کے سینے پر زندگی گزارنے والا انسان آخر کار ایک دن موت کا شکار ہوتا ہے اور اسی کے سینے پر سر رکھ کر سو جاتا ہے۔ پھر اسی کی آغوش میں اس کی قبر بنتی ہے۔ حشر تک اسی میں سوئے رہنے کے بعد ایک دن اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے اسی زمین سے نکالا جائے گا۔ قدرت نے انسان

Marfat.com

اسی زمین سے بنایا، اسے اس کا کچھ علم نہیں۔ اسی زمین سے قیامت قائم ہونے سے پہلے اسے نکالا جائے گا۔ جس قادرِ مطلق نے زمین سے اس کا قالب بنا کر اسے زندگی عطا کی تھی وہ اسی زمین سے اپنے قدرتِ کاملہ سے اسے دوبارہ زندہ کرے گا تاکہ وہ اپنے زندگی کے تمام اعمال کی جوابدہی اللہ تعالیٰ کے سامنے کر سکے۔ نیکی کی جزاء ملے اور برائی کی سزا ملے۔

وَلَقَدْ اَرَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾

(اور ہم نے اس کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں تو اس نے جھٹلایا اور انکار کر دیا۔ ۵۶)

فرعون کا تمرد

یوں تو انسان کی ہدایت کیلئے اس کے گرد و پیش میں نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور خود اس کا وجود سمجھنے کیلئے ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ لیکن فرعون اس قدر بگڑ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اسے اپنی تمام نشانیاں دکھائیں۔ ان نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں اور معجزات ہیں جس کا ظہور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر مختلف وقتوں میں ہوا۔ لیکن فرعون نے ہر بات کو جھٹلایا اور اللہ تعالیٰ کے ہر حکم سے روگردانی کی۔ ویسے تو ہر آدمی کیلئے اپنی نفسانی خواہشات کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں۔ لیکن جس شخص نے زندگی میں اپنی خواہشات کو مقاصد میں تبدیل کر دیا ہو اور اس کی زندگی تمام تر ان سے عبارت ہو کے رہ گئی ہو۔ اس کیلئے یہ خواہشات ایسے پتھر بن جاتی ہیں جن کی وجہ سے وہ زندگی کے دریا میں کبھی تیرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ فرعون تو ایک بڑے ملک کا حکمران تھا اور حکومت ہر حکمران کی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ جان دے دیتا ہے لیکن حکومت سے دستبردار نہیں ہوتا۔ اور فرعون صرف حکومت ہی کا اسیر نہیں تھا وہ تو اسے ربوبیت کا ذریعہ بنائے بیٹھا تھا۔ جا بجا اس کے اسٹیچوز پوجے جا رہے تھے۔ ایسی صورت میں اس کیلئے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت کو قبول کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن دوسری طرف اسے مشکل یہ تھی کہ اس کا مقابلہ ایسے دو افراد سے آپڑا تھا جو اللہ تعالیٰ کے رسول تھے۔ ان کے دلائل، ان کی شخصیتیں، ان کا بے عیب کردار، ان کی تبلیغ و دعوت کا مؤثر انداز اس کیلئے ایک مصیبت بن کے رہ گیا تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کو ناکام کرنے کیلئے ایک بہت خطرناک تدبیر سوچی۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾

(اس نے کہا اے موسیٰ! کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہماری سرزمین سے نکال باہر کرو۔ ۵۷)

ایک خطرناک الزام

فرعون نے کہا کہ تم دونوں نے نبوت کا تو بہروپ دھار رکھا ہے درحقیقت تم سیاسی شعبدہ باز ہو۔ تم نبوت کے دعوے کے ذریعے اپنی قوم کو منظم کرنا چاہتے ہو اور میری قوم کو مجھ سے بدگمان کر دینا چاہتے ہو۔ اور اس طرح سے تم ہمیں ہماری مملکت سے بے دخل کر دینے کا پروگرام لے کر آئے ہو۔ یہ وہ بات تھی جو بہت عرصے سے فرعون اور اس کی قوم کے دماغوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خوفزدہ تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر انہیں کوئی حوصلہ مند لیڈر میسر آ گیا اور کسی دوسری قوم سے ان کا سمجھوتہ ہو گیا تو یہ ہمارے لئے مشکلات پیدا

Marfat.com

کر سکتے ہیں۔ اب جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ایسی دعوت لے کر میدان میں آئے ہیں جس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں اور ان کی شخصیتیں ایسی زوردار ہیں کہ لوگ ان میں اپیل محسوس کرتے ہیں، تو یہ دبا ہوا اندیشہ ان کی زبان پر آ گیا جس سے ان کے خوف کا بھی اظہار ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی کہ اس طریقے سے وہ اپنی قوم میں متحد رہنے کا جذبہ بھی پیدا کر سکتے ہیں اور ان کو اشتعال بھی دلانا مقصود ہے کہ اگر تم نے ان دونوں حضرات کی باتیں سنیں اور ان سے متاثر ہوئے تو یاد رکھو یہ ملک تم سے چھن جائے گا اور بنی اسرائیل یہاں کے حکمران ہوں گے۔

مزید ایک بات جو فرعون نے کہی وہ یہ ہے کہ تم اپنی کامیابی کیلئے جادو کو ذریعہ بنا چکے ہو اور اسے تم اپنا معجزہ قرار دیتے ہو حالانکہ وہ جادو ہے، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اہلِ مصر اس فن سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اسی میدان میں تمہارا مقابلہ کیا جائے اور تمہیں شکست دے کر تمہارے ارادوں کو ناکام کر دیا جائے۔

فَلَنَاْتِیَنَّکَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَکَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَکَانًا سُوًی ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُکُمْ یَوْمُ الزِّیْنَةِ وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًی ﴿۵۹﴾

(ہم بھی تمہارے مقابل میں ایسا ہی جادو لائیں گے، پس ہمارے اور اپنے درمیان ایک مقابلے کا دن مقرر کر لو، نہ ہم اس کی مخالفت کریں اور نہ تم کرو، جمع ہونے کی جگہ ہموار اور کھلی ہو۔ ۵۸) حضرت موسیٰ نے کہا تمہارا مقابلے کا دن جشن کا دن ہے اور یہ خیال رہے کہ تمام لوگ چاشت کے وقت جمع ہو جائیں۔ ۵۹)

ہم اپنے ملک کے چیدہ چیدہ جادوگروں کو بلائیں گے جو تمہارے اس جادو کا توڑ کریں گے۔ اس کے بعد لوگوں پر یہ بات کھل جائے گی کہ تم نے جادو کے زور پر لوگوں کو بہکانا چاہا تھا اور پھر اپنے لوگوں میں اپنے بھرم کو باقی رکھنے کیلئے مقابلے کی دعوت دینے میں پہل کی کہ تم وعدے کا کوئی دن یا کوئی جگہ مقرر کرو، ہم ہر جگہ تمہارے ساتھ مقابلے کیلئے تیار ہیں۔

مَوْعِدٌ ...... یہ ظرف زمان بھی ہے اور ظرف مکان بھی۔ اس لئے اس کا معنی وقت موعود بھی ہو سکتا ہے اور مقامِ موعود بھی۔ سُوًی کے معنی وسط کے ہیں۔ یعنی ایسی جگہ جو درمیان کی جگہ ہو اور ہر ایک کیلئے وہاں پہنچنا آسان ہو۔

فرعون نے مزید تاکید کرتے ہوئے کہا کہ جو دن اور جگہ متعین ہو جائے اس کی مخالفت نہ ہماری طرف سے ہو گی اور نہ تمہاری طرف سے ہونی چاہئے۔ اور جگہ ایسی ہونی چاہئے جہاں پہنچنا سب کیلئے آسان ہو یعنی ہم بھی وہاں آسانی سے پہنچ سکیں اور تم بھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ اللہ تعالیٰ پر بے پناہ یقین تھا اس لئے نہایت اعتماد سے فرمایا کہ مجھے تمہارا چیلنج منظور ہے۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ مقابلے کا دن ایسا ہونا چاہئے جو مصریوں میں معروف ہو، تاکہ انہیں یاد رہے۔ تمہارے یہاں سال میں دو تین بڑے میلے ہوتے ہیں۔ ان میں سے یوم الزینہ بھی ایک میلہ یا جشن کا دن ہے، بس وہی دن مقرر کر لو۔ لوگ ویسے بھی ایسے جشنوں کیلئے پہلے سے تیار ہوتے ہیں جب وہ اس مقابلے کا سنیں گے تو انہیں ایک اور تفریح ہاتھ آ جائے گی اور وہ زیادہ شوق سے پہنچیں گے اور دوسری بات یہ فرمائی کہ چونکہ یہ بہت بڑا اجتماع ہوگا اور ہر ایک کی خواہش ہو گی کہ وہ اپنی نگاہوں سے اس مقابلے کو دیکھے۔ اس لئے اس کا وقت چاشت کا وقت ہونا چاہئے جبکہ روشنی ہر طرف پھیل چکی ہوتی ہے۔

Marfat.com

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

(پس فرعون وہاں سے پلٹا پھر اپنی ساری تدبیریں اکٹھی کیں پھر مقابلہ پر آیا۔ ۶۰)

فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان جب مقابلہ کی بات مکمل ہوگئی اور باہمی قول وقرار ہوگیا تو پھر فرعون وہاں سے اپنے عمائدین کی طرف آیا۔ دربار کے امراء کو اکٹھا کیا اور آئندہ مقابلے کیلئے تمام ضروری امور پر مشاورت کی۔ ایک ایک پہلو پر غور کیا۔ شکست یا فتح کے نتائج پر گفتگو ہوئی اور ہر پہلو سے مکمل تیاری کے احکام صادر کردیئے گئے۔ جب تمام انتظامات مکمل ہوگئے تو تب فرعون مقابلے کے میدان میں اترا۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾

(حضرت موسیٰ نے ان سے کہا تمہاری بربادی ہو، اللہ پر جھوٹ نہ باندھو، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی عذاب سے تمہاری جڑ اکھاڑ دے اور جس نے خدا پر جھوٹ باندھا وہ نامراد ہوا۔ ۶۱)

فَيُسْحِتَكُمْ...... اسحات سے ہے۔ اس کا اصلی معنی تو ہڈی پر سے گوشت نوچنے کے ہیں۔ مراد اس سے کسی چیز کا استحصال کرنا اور اس کی جڑ اکھاڑ دینا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برسرِ موقع نصیحت

معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ اس خطاب کا نچوڑ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے عمائدین اور جادوگروں کے سامنے ارشاد فرمایا ہے۔ فرعون سے ایک مقابلۂ عام کی قرارداد ہوجانے کے بعد آپؑ نے پیغمبرانہ خیرخواہی کا ثبوت دیتے ہوئے اس مقابلے کے ذمہ داروں سے آخری بات کہنا ضروری سمجھا تاکہ وہ اچھی طرح اپنے معاملے پر غوروفکر کرلیں، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ تھا کہ فرعون اور آلِ فرعون کی یہ جسارت کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو ساحر قرار دے کر جادوگروں کو مقابلے کیلئے بلائیں، کہیں اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث نہ ہوجائے۔ چنانچہ اس اندیشے کی وجہ سے آپؑ نے ضروری سمجھا کہ فرعون اور اس کے مصاحبین بیشک میری بات کو قبول نہ کریں لیکن میں اپنا فرض ضرور انجام دوں گا۔ چنانچہ آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ اے شامت زدو، تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ تم کیا کرگزرنے والے ہو اور اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔ تم فرعون کے رب ہونے پر اصرار کررہے ہو اور اپنے اس عقیدے کی صداقت کو ثابت کرنے کیلئے جادوگروں کو مقابلے کیلئے بلا رہے ہو اور اس طرح سے تم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں کسی دوسرے کو شریک ٹھہرا کر اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔ فرعون ایک معمولی حکمران ہے وہ اپنی حکومت اور سطوت میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ پروردگار جو کائنات کا خالق و مالک ہے تم اس کی ربوبیت میں کسی کو شریک ٹھہراؤ اور پھر اس کے غضب سے بچے رہو۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی رسول نہیں آتا تو لوگوں کو بےخبری کا فائدہ پہنچتا رہتا ہے لیکن اس کی طرف سے رسول آجانے اور تبلیغ ودعوت کا حق ادا ہوجانے کے بعد اتمامِ حجت ہوجاتا ہے۔ پھر تکذیب اور انکار کرنے والوں پر کسی وقت بھی عذاب ٹوٹ سکتا ہے۔ تم اس حقیقت کو سمجھو اور اپنے انجام کی فکر کرو اور یہ یقین رکھو کہ جس نے بھی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے وہ نامرادی سے کبھی نہیں بچا۔

Marfat.com

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰی ﴿۶۲﴾

(پس وہ جھگڑنے لگے اپنے معاملے میں آپس میں اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔ ۶۲)

آپؑ کی نصیحت کا اثر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخلصانہ اور خیر خواہانہ تنبیہ کا اثر یہ ہوا کہ جادوگر اور دوسرے شرکائے مجلس آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ موسیٰ اور ہارون دونوں جادوگر ہیں۔ انہوں نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو کے کھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہمارے پاس بڑے بڑے ساحروں کی کمی نہیں۔ وہ یقیناً اس کا توڑ کرلیں گے۔ لیکن کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ جو کچھ تم لوگوں نے دیکھا ہے اور جس قسم کی باتیں ان دونوں بھائیوں نے اب تک کی ہیں۔ یہ نہ جادوگری ہے اور نہ وہ دونوں جادوگر ہیں۔ اس لئے تمہیں اس معاملے میں اچھی طرح غور وفکر کرلینا چاہئے۔ اس پر کچھ لوگوں نے رائے دی کہ اس معاملے میں کھل کر اختلاف نہ کرو تمہاری باتیں عام لوگوں تک نہیں پہنچنی چاہئیں۔ چنانچہ ان کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے پرائیویٹ میٹنگ کی اور نہایت رازداری سے اس کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کیا۔

قَالُوْٓا اِنْ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِھِمَا وَیَذْھَبَا بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی ﴿۶۳﴾

(انہوں نے کہا یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دیں۔ اور تمہارے اعلیٰ طرز زندگی کو درہم برہم کردیں۔ ۶۳)

اِنْ ھٰذٰنِ ...... یہ "اِنْ" مخفف "اِنَّ" کے معنی میں ہے۔ "لَسٰحِرٰنِ" پر الف اس کا قرینہ ہے۔ یہاں ایک نحوی الجھن ہے، وہ یہ کہ اِنَّ تو ہمیشہ اسم کو نصب دیتا ہے۔ اس لئے آیت یوں ہونی چاہئے تھی اِنَّ ھٰذَیْنِ لَسٰحِرٰنِ لیکن یہاں ھٰذٰنِ مرفوع ہے جو نحوی قاعدہ کے خلاف ہے۔ علماء کرام نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں۔

1- کوفیوں کے نزدیک یہ اِنْ، اِنَّ کا مخفف نہیں بلکہ نافیہ ہے اور ساحران پر جو لام ہے وہ اِلَّا کے معنی میں ہے۔

2- عرب کے بعض قبائل تثنیہ کو رفعی، نصبی، جری حالت میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں جیسے:

ان اباھا وابا اباھا قد بلغا فی المجد غایتاھا

بنی الحرث بن کعب، زبیر، خثعم، کنانہ سب تثنیہ کو الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ (قرطبی) علامہ آلوسی نے اسے سب سے عمدہ توجیہ کہا ہے۔

الْمُثْلٰی...... امثل کی مونث ہے۔ جیسے افضل سے فضلیٰ۔ اس کا معنی ہے مثالی، معیاری، اعلیٰ، عمدہ اور برتر۔

مُثْلٰی کا مفہوم

مشاورت کے شرکاء میں جو زیادہ پرجوش تھے انہوں نے کہا کہ تم نہ جانے کن اندیشوں میں مبتلا ہوگئے ہو۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ

Marfat.com

دونوں بھائی بہت بڑے جادوگر ہیں۔ ان کے پاس دوسرے کو متاثر کرنے اور حالات کو حسب حال بنانے میں جادو ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس لئے ہمارے جادوگر بھائیوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بنی اسرائیل کے دو معمولی نوجوان جنہوں نے کہیں بھی جادو کا فن سیکھنے میں محنت نہیں کی اور ہمارے بھائی جن کی زندگیاں اس فن کی خدمت کرتے ہوئے گزری ہیں ان کیلئے چیلنج بن جائیں تو یہ ایک بہت تکلیف دہ اور شرمندہ کر دینے والی بات ہوگی۔ اس طرح سے تمام جادوگروں کو اشتعال دلانے کی کوشش کی گئی۔

دوسری بات یہ کہی کہ یہ معاملہ صرف ایک مقابلے کا نہیں بلکہ ملک کی بقاء کا ہے۔ یہ لوگ تمہیں اس ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی ملک میں بہت بڑی تعداد ہے وہ ملک کی آبادی کا تقریباً دس فیصد ہیں۔ اور مزید یہ کہ اس ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حکومت سے ناراض ہیں اور ہر اس قوت کا ساتھ دینے کیلئے بے چین ہیں جو حکومت کو بدل سکتی ہو۔ بنابریں ہم سب پر عموماً اور جادوگروں پر خصوصاً یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن کے زور سے ان دو جادوگروں کو شکست دے کر ملک کو بچانے کی تدبیر کریں کیونکہ اگر یہ اس مقابلے میں شکست کھا گئے تو ان کے تمام عزائم خاک میں مل جائیں گے۔ اور اگر یہ جیت گئے تو پھر ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

اور تیسری بات یہ کہی کہ مصر ایک بہت متمدن ملک ہے، اس کی ایک خوبصورت ثقافت ہے، اس کا ایک قومی تشخص ہے۔ صدیوں میں اس نے اپنی ایک تہذیب بنائی اور مخصوص تمدن کو وجود دیا ہے۔ اگر یہ لوگ کامیاب ہو گئے تو ملک میں وہی نظام نافذ کرنے کی کوشش کریں گے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری مخصوص تہذیب اور ہمارا خوبصورت تمدن اور ہماری خوشنما ثقافت، ہمارے آرٹ اور ہماری تمام تفریحات اور ہماری خواتین کی آزادیاں سب کچھ سلب ہو کر رہ جائے گا۔ یہ لوگ ہمارے محلات میں گھوڑے باندھیں گے۔ ہماری آزادانہ تقریبات، شریفانہ متانت کا نام دے کر شرم وحیاء کی زنجیروں میں جکڑ دیں گے۔ اگر ہم اس صورتحال سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اس مقابلے میں اپنی پوری قوت صرف کر دینی چاہئے اور بجائے آپس میں اختلاف پیدا کرنے کے ایک متحدہ محاذ بنا کر اور اپنی طاقت کو مجتمع کر کے مقابلے میں اترنا چاہئے۔

حیرانی ہوتی ہے کہ جو بات فرعون کے ایوان ہائے حکومت میں صدیوں پہلے کہی گئی تھی آج وہی بات مسلمانوں کی حکومتوں کے ایوانوں میں بھی کہی جاتی ہے۔ وہ بھی فرعون کی حکومت کے خطرے کو ملک کی بقاء کا مسئلہ قرار دیتے تھے۔ آج بھی حکمران اپنی بقاء کیلئے ملکی بقاء کا حوالہ دیتے ہیں، جس حکومت کے نظم ونسق میں عوام کا کوئی دخل نہ تھا اسی حکومت کی طرف سے عوام کو استعمال کرنے کیلئے تمہارا ملک، تمہارا تمدن اور تمہاری ثقافت کے نام سے بہکایا جا رہا تھا اور آج بھی حکومتیں اسی طرح عوام کو بہکاتیں اور استعمال کرتی ہیں اور جس طرح آج اصلاح کی ہر کوشش کو حکومت پر قبضہ کرنے کا الزام دے کر پابند سلاسل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بالکل یہی بات فرعون اور اس کے عمائدین بھی کہہ رہے تھے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ صدیوں کے طویل سفر کے باوجود شیطانی حربوں میں کتنی یکسانی اور باطل کے مقاصد میں کتنی ہم آہنگی ہے۔

فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا ۚ وَقَدۡ اَفۡلَحَ الۡيَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰى ﴿۶۴﴾

(پس اپنی ساری تدبیریں جمع کر لو، پھر ان کے مقابلے میں متحد ہو کر آؤ اور آج کامیاب وہی رہے گا جو غالب آئے گا۔ (۶۴)

Marfat.com

ہر طرح کی تیاری کی تاکید

وہ جادوگر جو مقابلے کیلئے بلائے گئے تھے مشاورت کرنے والوں نے حالات کا جائزہ لینے اور خدشات کا اظہار کرنے کے بعد انہیں تاکید کرتے ہوئے کہا کہ اب تمام تر کامیابی کا دارومدار تمہاری کاوشوں پر ہے۔ وہ دونوں بھائی چونکہ بہت بڑے جادوگر ہیں اس لئے ایسی کوئی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی جو بے دلی سے کی جائے یا کوشش کرنے والوں میں انتشار پایا جائے۔

اقتدار کے حاشیہ نشینوں اور خدمت گزاروں میں عموماً یہ مسئلہ رہا ہے کہ جب بھی حکومت کو کوئی مہم درپیش ہوتی ہے تو اس کے حمایتی بڑھ چڑھ کر اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہیں، لیکن ان کے اندر دو کمزوریاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ ایک تو یہ کہ حکومت کی مہم اور اس کی ترجیحات کو وہ کبھی اپنی ترجیحات نہیں سمجھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بظاہر ان کی اچھل کود تو دکھائی دیتی ہے لیکن ان کے دل حکومت کی ہمنوائی میں نہیں دھڑکتے اور دوسری یہ بات کہ اقتدار کے حمایتیوں میں ہمیشہ گروہ بندی ہوتی ہے۔ ہر گروہ دوسرے سے آگے بڑھ کر صاحب اقتدار کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ اس مہم کی کامیابی میری کاوشوں کے بغیر ممکن نہیں۔ اور میں اس کیلئے جان لڑا دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ لیکن ان کا آپس کا انتشار ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔ لیکن اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ فرعون اور اس کے قریبی لوگ معلوم ہوتا ہے اس صورتحال کو سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے زور دے کر کہا کہ تمہارے اندر کوئی انتشار نہیں ہونا چاہیے۔ تم اپنی تدبیروں کو باہمی مشاورت سے ایک اجتماعی شکل دینے کی کوشش کرو۔ اور پھر دونوں بھائیوں کے مقابل میں ایک متحدہ محاذ بنا کر اترو اور یہ بات ذہن نشین کرلو کہ آئندہ کی کامرانیاں اس گروہ کیلئے ہیں جو آج کے مقابلے کیلئے کامیاب رہتا ہے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِمَّآ اَنْ تُلْقِیَ وَاِمَّآ اَنْ نَّکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی ﴿۶۵﴾

(جادوگروں نے کہا، اے موسیٰ! تم پیش کرو یا ہم پیش کرنے والے بنتے ہیں۔ ۶۵)

دونوں فریق آمنے سامنے

باہمی قرارداد اور پھر مختلف قسم کی تیاریوں کے بعد دونوں فریق مقابلے پر اترے۔ ایک طرف جادوگروں کی ایک بڑی تعداد تھی اور دوسری طرف حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے ساتھ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ بھی موجود ہوں۔ جادوگروں نے پیشہ ورانہ اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے حضرت موسیٰ سے کہا کہ تم اپنا پانسہ پھینکو گے یا ہم اپنا ہنر دکھائیں۔ انہوں نے کہنے کی حد تک تو حضرت موسیٰ کو پہل کرنے کی پیشکش کی، لیکن الفاظ کا انتخاب بتاتا ہے کہ وہ پہل کرنے کیلئے بیتاب تھے کیونکہ وہ تجربہ کار جادوگر تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ مقابلے میں تقدیم و تاخیر سے مقابلے پر اثر پڑتا ہے اور بعض دفعہ محض تقدیم بازی جیتنے کا سبب بنتی ہے اور محض تاخیر سے بعض دفعہ ہوا خیزی ہوجاتی ہے اور یہ بات تو واضح ہے کہ جادو تو غیر متوقع نتیجہ خیزی کا نام ہے۔ اگر ایک فریق پہلے ہی ہلہ میں غیر متوقع اور حیران کن چیزوں کے اظہار سے دماغوں کو مسحور کردیتا ہے تو اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ﴿۶۶﴾

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ﴿۶۷﴾

Marfat.com

(حضرت موسیٰ نے کہا بلکہ تم ہی پیش کرو، تو اچانک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے اثر سے آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں جیسے وہ دوڑ رہی ہوں۔ ٦٦) تو موسیٰ علیہ السلام دل میں کچھ ڈرے۔ ٦٧)

جادو کا اثر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ اللہ تعالیٰ پر بے پناہ اعتماد تھا اس لئے آپ نے بے تأمل کہا کہ تم ہی اپنا ہنر دکھانے میں پہل کرو۔ آیت کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے یہ بات کہی انہوں نے ایک لمحے میں نہ جانے کتنی لاٹھیاں اور کتنی رسیاں میدان میں ڈال دیں۔ ان کے ڈالنے کی دیر تھی کہ ان کے جادو کے اثر سے لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں کی طرح رینگنے لگیں اور ایسا لگتا ہے کہ رخ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف تھا۔ آپ نے جب دیکھا کہ سینکڑوں سانپ میری طرف بڑھ رہے ہیں تو اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا لیکن آپ اپنی جگہ سے ہلے نہیں البتہ! آپ نے اپنے دل میں ایک خوف سا ضرور محسوس کیا کیونکہ آپ پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان بھی تھے کیونکہ ہر پیغمبر انسان ہوتا ہے۔ پیغمبری ایک عظیم منصب ہے جو بندوں اور اللہ کے درمیان پیغام پہنچانے کا فرض انجام دیتا ہے اور پیغمبری کے تقاضوں کے مطابق پیغمبر کو بہت سے کمالات دیئے جاتے ہیں جو دوسرے انسانوں کو نہیں دیئے جاتے۔ وہ اپنی عادات واطوار اور افکار وکردار میں معصوم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اسے ایک ایسا مقام حاصل ہوتا ہے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ بایں ہمہ! وہ ایک انسان ہوتا ہے، اسے بھی بھوک لگتی ہے، وہ بھی بیمار ہوتا ہے، وہ بھی شادی کرتا ہے، اس کے بچے بھی ہوتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کیلئے کاروبار بھی کرتا ہے اور پھر اپنی طبعی عمر گزار کر واصل بحق ہو جاتا ہے۔ پیغمبر ہونے کے باوجود اس کے طبعی اور انسانی تقاضے ختم نہیں ہوتے۔ البتہ وہ شریعت کی حدود سے کبھی آگے نہیں بڑھتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی انسانیت کے تقاضے سے اس صورتحال سے گھبرائے۔ عام انسانوں کی طرح آپ پر بھی جادو کا اثر ہوا۔ جادو صرف نگاہوں کے راستے سے قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے۔ کسی شے کی حقیقت وماہیت کو تبدیل نہیں کرتا اور حقیقت سامنے آ جائے تو فوراً اس کا طلسم پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یہ بھی مسمریزم اور ہپناٹزم کی طرح نظر بندی کا ایک کھیل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جادو کا اثر پیغمبر پر بھی ہوسکتا ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ پر بعض یہود نے جادو کیا اور روایاتِ حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اسی کے علاج کیلئے معوذتین نازل ہوئیں اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے خبر دینے سے اس جادو کا علاج کیا گیا۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ جادو کے زور سے پیغمبر کے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کی صلاحیت کو متاثر نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنے والی وحی اس کے دل ودماغ سے کبھی محو نہیں ہوتی۔

پیش نظر آیتِ کریمہ میں خِیفَۃً کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں پیدا ہونے والا خوف بہت معمولی اور وقتی تھا، لیکن پروردگار نے اس پر بھی دستگیری فرمائی۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ﴿٦٨﴾

(ہم نے کہا ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے۔ ٦٨)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بن جانے سے جو خدشہ سا پیدا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے دور کرنے کیلئے فوراً بشارت نازل فرمائی کہ ڈرو مت، ان جادوگروں کا جادو کتنا بھی عظیم ہو، معجزے پر غالب نہیں آ سکتا۔ اس لئے غالب اور سربلند تمہیں رہو گے۔

Marfat.com

وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا ۖ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ ۖ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴿٦٩﴾

(جو تمہارے ہاتھ میں ہے اسے زمین پر ڈال دو، یہ ان کے سارے سوانگ کو جو انہوں نے رچایا ہے نگل جائے گا، انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ فقط ایک جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر جہاں بھی جائے کبھی فلاح نہیں پاتا۔ ۶۹)

معجزہ اور سحر میں فرق

جادوگروں کا کرتب واقعی متاثر کن تھا۔ سینکڑوں سانپ میدان میں رینگتے نظر آ رہے تھے اور دیکھنے والے نہایت مرعوبیت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی وقتی طور پر اس سے متاثر ہوئے لیکن پروردگار نے حکم دیا کہ آپ کے ہاتھ میں جو عصا ہے اسے زمین پر پھینک دو۔ تم دیکھو گے کہ جادوگروں نے جو بیشمار سانپ میدان میں پھیلا دیئے ہیں یہ ان سب کو ہڑپ کر جائے گا کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ جادو کا کھیل ہے جو نظر کو فریب تو دے سکتا ہے لیکن حق کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔ ''تلقف'' کے لفظ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ ہڑپ کر جائے گا۔ اس لئے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ میدان میں جادوگروں نے جتنی لاٹھیاں پھینکیں اور رسیاں پھیلائیں وہ سب کو نگل گیا۔ وہ ایک ایسا خوفناک اژدھا تھا جس کی پھنکار دور دور تک سنائی دیتی تھی اور اس کا جبڑا کھلا تھا۔ اسے کسی چیز کو نگلتے ہوئے دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن آیتِ کریمہ میں ما صنعوا کے الفاظ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ اس اژدھا نے رسیوں اور لاٹھیوں کو نہیں نگلا بلکہ اس طلسم اور جادو کے اثر کو نگلا تھا جس کی بدولت وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ نظر آ رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ واقعہ کی شکل یہ ہو کہ وہ لاٹھیوں اور سانپوں کو نگلتا ہوا اس طرح آگے بڑھ رہا تھا کہ جادو کا اثر ختم ہوتا جا رہا تھا اور پیچھے وہ لاٹھیوں اور رسیوں کو پھینکتا جا رہا تھا۔ چنانچہ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ اب میدان میں لاٹھیاں اور رسیاں تو موجود ہیں لیکن ان میں سے کسی میں ہلنے کی سکت نہیں کہ انہیں سانپ گمان کیا جا سکے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ساحر جہاں بھی جائے وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کے دو مطلب لئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہاں کہیں بھی جادو اور شعبدہ بازی حق کے مقابلے میں آئے گی اور جادوگر اسے ذریعہ بنا کر حق کو شکست دینے کی کوشش کریں گے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے بشرطیکہ اہلِ حق استقامت اور توکل علی اللہ میں کمزوری نہ آنے دیں۔ جادو وقتی طور پر نگاہوں کو فریب دے سکتا ہے لیکن حق کو شکست نہیں دے سکتا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انبیائے کرام اور ان کے راستے پر چلنے والے اپنے فکر و کردار کی بلندی اور اپنی دعوت کی صداقت کے باعث لوگوں میں ایک صالح تبدیلی پیدا کرتے ہیں اور ان کی زندگی کی سچائی اور ان کی دعوت کا نور دلوں کو روشنی دیتا ہے حتیٰ کہ مخالفین بھی دلوں میں ان کی عظمت کو تسلیم کرنے لگتے ہیں۔ وہ جب تک دنیا میں رہتے ہیں مینارۂ نور بن کے رہتے ہیں اور جب دنیا سے جاتے ہیں تو تاریخ کا ورق الٹ کر جاتے ہیں اور ان کی دعوت دنیا کیلئے ایک پیغام ثابت ہوتی ہے۔ جادوگر اپنی تمام طلسم آرائی کے باوجود دنیا میں ایسا کبھی کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ وہ لوگوں کو حیران تو کر سکتے ہیں لیکن کسی تبدیلی کا آغاز نہیں کر سکتے۔ وہ اہلِ دنیا سے پیسہ بٹور سکتے ہیں لیکن دلوں میں ان کیلئے کبھی احترام پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ معاشرے کے گرے پڑے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ ساحر جہاں بھی ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ نہ اسے کبھی عزت ملتی ہے اور نہ وہ دنیا کو کوئی پیغام دے سکتا ہے۔

Marfat.com

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ﴿۷۰﴾

(تو جادوگر سجدے میں گر پڑے اور کہنے لگے کہ ہم نے مان لیا ہارون اور موسیٰ کے رب کو۔ ۷۰)

جادوگروں کا اعترافِ حق

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنا عصا زمین پر پھینکا تو وہ بہت بڑا اژدھا بن کر جادوگروں کی تمام طلسم آرائی کو نگل گیا۔ جادوگر چونکہ جادو کی حدود کو جانتے اور اس کے اثرات کو پہچانتے تھے، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ عصائے موسیٰ نے جس طرح ہمارے کیئے ہوئے سحر کے اثرات کو لقمۂ دہن بنایا ہے یہ کسی جادو کا عمل نہیں کیونکہ جادو دوسرے جادو کے اثر کو ختم تو کر سکتا ہے لیکن اس کیلئے ایک وقت درکار ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک جادو دوسرے جادو کو فوراً نگل جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کرتب میں دوسروں سے بڑھ کر کمال کر اظہار کرے۔ چنانچہ جادوگروں کو جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہمارے مقابلے میں جو کچھ پیش آیا ہے وہ جادو نہیں، معجزہ تھا۔ اور معجزہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے یقیناً حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ چنانچہ یقین ہوتے ہی وہ اس طرح سجدے میں گرے جس طرح میدان میں لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی گئی تھیں۔ قرآنِ کریم نے دونوں کیلئے ٹھیک ہی فعل استعمال کیا ہے بلکہ یہاں فعل مجہول لا کر شاید یہ تصور دینا مقصود ہے کہ حقیقت کے شعور نے انہیں اس حد تک وارفتہ کیا کہ وہ تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر اور غور و فکر کو نظر انداز کر کے اس طرح سجدے میں گرے جیسے وہ خود نہیں گرے بلکہ اپنی وارفتگی کے ہاتھوں گرائے گئے ہیں اور مزید عجیب بات یہ ہے کہ اہلِ مصر کے یہاں یہ طریقہ رائج تھا کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کمالِ فن کا اعتراف کرتا تھا تو وہ اعتراف کے طور پر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا تھا۔ تو انہوں نے سجدہ ریز ہوتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمالِ فن کا اعتراف نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ ہم اس رب کو ماننے کا اعلان کرتے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جس کی نمائندگی موسیٰ اور ہارون کر رہے ہیں۔ اور جس کے حکم نے انہیں یہ قوت اور جسارت بخشی ہے کہ وہ فرعون جیسے پر ہیبت حکمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے اور اس کے ساتھ مقابلے کیلئے میدان میں کھڑے ہیں۔

اس سے ایک اور بات کی طرف بھی ہمیں رہنمائی ملتی ہے وہ یہ کہ یہ مقابلہ درحقیقت جادوگروں کے درمیان نہیں تھا اور نہ یہ معلوم کرنے کی کوشش تھی کہ موسیٰ بڑے جادوگر ہیں یا ساحرانِ مصر؟ بلکہ مقابلہ اس بات پر ہو رہا تھا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا دعویٰ لے کر آئے ہیں اور اس کے ثبوت کیلئے انہوں نے جو نشانیاں دکھائیں وہ معجزات ہیں یا جادو کا نتیجہ۔ فرعون اور اس کے عمائدین نے اسے معجزہ تسلیم کرنے کی بجائے جادو قرار دے کر مقابلے کا ڈول ڈالا اور یہ کوشش کی کہ مصر کے بڑے بڑے جادوگروں سے مقابلے کے ذریعے یہ ثابت کر دیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جسے معجزہ کہتے ہیں، وہ جادو ہے۔ ورنہ جادوگروں کے مقابلے میں وہ کبھی شکست نہ کھاتا۔ اب جبکہ عصائے موسیٰ نے اژدھا بن کر جادوگروں کے تمام طلسم کو پامال کر ڈالا تو جادوگر سمجھ گئے اور تماشا دیکھنے والے بھی کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور ان کے ہاتھ سے ظاہر ہونے والا یہ کمال جادو کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ معجزہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں میں اس خیال کا پیدا ہو جانا اور مقابلے میں اس بات کا ثابت ہو جانا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، یہ ایسی خطرناک بات تھی جس کے نتیجے میں مصر میں برپا ہونے والے انقلاب کو روکا نہیں جا سکتا تھا اور فرعون

Marfat.com

کیلئے یہ ایک ایسی ضرب تھی جو اس کی کمر توڑنے کیلئے کافی تھی۔ چنانچہ اس نے نہایت ذہانت سے اس ہاری ہوئی بازی کو جیت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنی شکست کو ایک دوسرا رنگ دے کر پیدا ہونے والے خطرناک نتائج سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی ایک موہوم سعی کی۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾

(فرعون نے کہا کہ تم اس پر ایمان لے آئے، اس سے پہلے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا، بیشک وہی تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی ہے، اب میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹوں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا، پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔ ۷۱)

فرعون کا آخری حربہ

فرعون اس شکست پر بھڑک اٹھا اور جادوگروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے صرف اپنی شکست تسلیم نہیں کی بلکہ موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لانے کا بھی اعلان کیا ہے حالانکہ تمہارا رب میں ہوں اور تم جانتے ہو کہ اس ملک میں کوئی کام میری اجازت کے بغیر نہیں ہوتا، لیکن تم نے میری اجازت کے بغیر اتنا بڑا اقدام کر کے دراصل بغاوت کی ہے، لیکن تم یہ نہ سمجھو کہ ہم تمہاری اس حرکت کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ تم نے بظاہر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی نبوت کا اقرار کیا لیکن ہم جانتے ہیں کہ تم نے ملی بھگت سے موسیٰ کے ساتھ مل کر ایک سازش تیار کی ہے۔ وہ تمہارا گرو ہے۔ تم نے یہ جادوگری اسی سے سیکھی ہے۔ تم نے اس کے معجزے سے شکست نہیں کھائی بلکہ تم نے اپنے استاد کے جادو سے شکست کھائی ہے اور تم آپس میں یہ طے کر کے آئے تھے کہ اپنے استاد کا غلبہ ثابت کر کے اور اسے اس کی پیغمبری کا ثبوت بنا کر یہاں سیاسی انقلاب برپا کر دو گے۔ سورۃ الاعراف میں الفاظ زیادہ واضح ہیں:

اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا

"یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے دارالسلطنت میں ملی بھگت کر کے کی ہے تا کہ سلطنت سے اس کے مالکوں کو بے دخل کر دو۔"

اب دیکھو میں تمہیں اس کی سزا کیا دیتا ہوں۔ میں تمہارے بے ترتیب ہاتھ پاؤں کاٹوں گا اور پھر تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا یعنی تمہیں سولی دینے کیلئے سولی گھر نہیں لے جایا جائے گا بلکہ عام پبلک کے سامنے کھجور کے تنوں پر تمہیں لٹکا دیا جائے گا تا کہ آنے جانے والے تمہاری عبرتناک موت کا نظارہ کریں۔ تب تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے اپنے گرو سے ڈر کر جس طرح سازش میں شرکت کی ہے وہ تمہیں کس قدر مہنگی پڑے گی۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا گرو جادو کے زور سے تمہیں بڑی سے بڑی سزا دے سکتا ہے لیکن اب تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ وہ ایسی سزا نہیں دے سکتا جیسی سزا میں تمہیں دوں گا۔

یہ ہری ہوئی بازی جیت لینے کیلئے فرعون کا آخری حربہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جادوگروں کو ایسی خوفناک سزا سے ڈرا کر میں ان سے اس بات کا اعتراف کرا لوں گا کہ انہوں نے واقعۃً حضرت موسیٰ سے ملی بھگت کی تھی اور اس طرح مملکت کے خلاف سازش تیار کی تھی اور ساتھ ہی وہ

Marfat.com

لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ جادوگروں کا شکست تسلیم کر لینا در حقیقت شکست نہیں بلکہ ایک سازش ہے جس کا ہم سب لوگ شکار ہوئے ہیں۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اب جادوگروہ نہیں رہے جو مقابلے میں آنے سے پہلے فرعون سے اپنے معاوضے کا سوال کر رہے تھے بلکہ اب ان کے اندر ایمان کا نور روشن ہو گیا ہے۔ اس لئے ان کی استقامت نے فرعون کی اس چال کو بھی ناکام بنادیا۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ ﴿٧٢﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿٧٣﴾

(انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز تمہیں ترجیح دینے والے نہیں ہیں ان روشن دلائل پر جو ہمارے سامنے آئے ہیں اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، تم کر گزرو جو کچھ کر سکتے ہو، تم زیادہ سے زیادہ اسی زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہو۔ ۷۲) ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں تا کہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اور اس جادوگری کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ ۷۳)

ایمان کا کرشمہ

جادوگروں نے فرعون کی دھمکیوں کے جواب میں بجائے کمزور پڑنے کے نہایت جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ ہم تجھے اس وقت تک رب تسلیم کرتے رہے ہیں جب تک حقیقت نے ہماری آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ اب جبکہ واضح دلائل نے ہمیں حقیقت شناس بنادیا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھ چکے ہیں تو اب ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری ان دھمکیوں کو ان دلائل پر جو ہمارے سامنے آچکے ہیں اور تمہاری ذات کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے ترجیح دینے کی حماقت کریں۔ رہی یہ بات کہ تم ہمیں بدترین سزا دینا چاہتے ہو تو تم سے جو ہو سکتا ہے کر گزرو۔ تم زیادہ سے زیادہ اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہو کہ ہم سے ہماری زندگیاں اور ہماری دنیا چھین لو۔ لیکن ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں ان باتوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ہم فانی زندگی کے بدلے میں ابدی زندگی کا سودا کر چکے ہیں اور دنیوی عیش وآرام کے بدلے میں ہم جنت کی نعمتوں کی امید رکھتے ہیں۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے کوئی ایسا زیاں نہیں

حیرانی ہوتی ہے کہ چند لمحے پہلے جو جادوگر فرعون کو رب مانتے تھے اور دنیوی فوائد حاصل کرنے کیلئے ہر ذلت قبول کرنے کیلئے تیار تھے۔ اب اچانک انہیں کیا ہوا کہ ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ نسلوں کے مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی ذات کو اپنا رب مانتے اور اخروی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں ان میں کتنی تعداد ایسی ہے جو مادی زندگی کے عشق سے نکلنے کو تیار نہیں اور جنہوں نے معاش یا اقتدار کو اپنا رب سمجھ رکھا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص دل کی پوری آمادگی اور اخلاص سے اللہ تعالیٰ کے راستے پر آتا ہے تو پھر قدرت کی طرف سے نوازنے میں دیر نہیں لگتی۔ اسے اللہ تعالیٰ کی ذات اور آخرت پر ایسا یقین آجاتا ہے کہ وہ اخروی نعمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اب اس کیلئے آخرت کی خاطر دنیا کی بڑی سے بڑی راحت کو چھوڑنا مشکل نہیں رہتا بلکہ صحابہ کرام کی زندگیاں تو ہمیں بتاتی ہیں کہ وہ آخرت کی طلب میں نقدِ جان پیش کرنے

Marfat.com

کیلئے اس طرح بے قرار رہتے تھے جیسے ایک دنیادار دنیوی نعمتوں کیلئے بے قرار ہوتا ہے۔ انہوں رسول اللہ ﷺ کی صحبت نے رخِ دوست کا ایسا نظارہ کرایا تھا کہ زندگی ان کیلئے دشوار ہوگئی تھی۔ اقبال اسی کو امامت کا مستحق سمجھتا ہے جو آج بھی مسلمانوں میں ایسا ہی جذبہ بیدار کرسکے۔ وہ کہتا ہے:

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں دکھا کر تجھے رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

جادوگروں نے مزید کہا کہ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں اب فکر تیری سزاؤں کی نہیں اس بات کی ہے کہ ہمارا رب ہماری خطائیں معاف فرمادے۔ ہم نے اب تک جہالت کی وجہ سے نہ جانے کیا کیا گناہ کئے ہیں اور اب تازہ گناہ یہ ہے کہ ہمارا گمان پہلے ہی یہ ہورہا تھا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، جادوگر نہیں۔ لیکن تم نے ہمیں مجبور کیا تو ہم مجبوراً میدانِ مقابلہ میں اترے۔ ہم اس گناہ پر بھی اللہ تعالیٰ سے بخشش کے طلبگار ہیں۔ اور اگر اس پاداش میں ہمیں جان دینی پڑتی ہے جس کی تو ہمیں دھمکی دے رہا ہے تو ہم اسے اپنے لئے ایک اعزاز سمجھ کر قبول کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس کی رضا کیلئے قربانی دینا ہر ایک کے نصیب کی بات نہیں۔ یہ اسی کا مقدر ہوتا ہے جس کو پروردگار اپنے لئے چن لیتا ہے، اور ویسے بھی اس کی راہ میں جان دینا اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان نہیں کیونکہ:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿٧٤﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿٧٥﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿٧٦﴾

(حقیقت یہ ہے کہ جو شخص مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا اس کیلئے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔ ۷۴) اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا جس نے نیک عمل کئے ہوں گے ایسے لوگوں کیلئے بلند درجے ہیں۔ ۷۵) سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ جزاء ہے اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔ ۷۶)

ایک تضمین

یہ تینوں آیتیں جادوگروں کے کلام کا حصہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا اپنا اضافہ ہے۔ اندازِ کلام بتا رہا ہے کہ پروردگار نے جادوگروں کے

Marfat.com

جواب کے ساتھ اپنی بات ملا کر اس کو مکمل اور مطابقِ حال کر دیا ہے اور ویسے بھی جو کچھ ان میں کہا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہے۔

اس میں اصولی بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کا کوئی خصوصی تعلق نہیں۔ اس کے یہاں نجات اور تقرب کیلئے دو چیزیں درکار ہیں، ایمان اور عملِ صالح۔ ان دونوں میں ترقی سے آدمی کے مدارج میں ترقی ہوتی ہے اور جو شخص ان دونوں سے تہی دامن ہے وہ مجرم ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حضور مجرم کی حیثیت سے پیش ہوگا۔ اس کا انجام یقیناً جہنم ہے اور جہنم ایسی ہولناک جگہ ہے جس میں داخل ہونے والا نہ زندہ ہوگا اور نہ مرے گا۔ انسان اگر بڑی سے بڑی تکلیف میں بھی مبتلا کر دیا جائے تو وہ ایک حد تک اسے برداشت کرتا ہے۔ لیکن جب وہ تکلیف نا قابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پھر موت کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس سزا کی ہولناکی کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں داخل ہونے والا شخص سزا کی شدت سے موت کی آرزو کرتا ہے لیکن موت نہیں آتی بلکہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ جہنم میں آگ جب جلنے والوں کی کھالیں جلا دے گی تو وہ شاید یہ سمجھیں گے کہ اب ہمارے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جیسے ہی کسی کی کھال جل کے جھڑے گی تو ہم اسے نئی کھال پہنا دیں گے تاکہ وہ نئے سرے سے عذاب کا مزہ چکھے۔ ایسی ہولناک سزا کا دنیا میں تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہاں ہر سزا کی ایک انتہا ہے اور ہر شدت کا ایک انجام یعنی موت ہے۔ لیکن وہاں دونوں چیزیں نہیں ہوں گی۔ اہلِ جہنم زندہ رہیں گے لیکن موت سے بدتر اور موت کی تمنا کریں گے لیکن یہ موت کبھی نہیں آئے گی۔ اس لئے فرمایا گیا کہ نہ وہ مرے گا اور نہ وہ جئے گا اور دوسری آیت میں فرمایا کہ جو شخص مومن ہوگا اور ساتھ اس نے نیک عمل کئے ہوں گے تو اس کیلئے جنت کی بے پایاں نعمتیں ہیں۔ آیت کے اسلوب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جس کے ساتھ عملِ صالح بھی پایا جاتا ہو۔ اور جو ایمان عملِ صالح سے بالکل خالی ہے وہ محض موروثی ایمان ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں۔ البتہ اگر ایمان کے ساتھ کسی حد تک بھی عمل کا سرمایہ موجود ہو تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بدعملی اور بے عملی کی سزائیں بھگتنے کے بعد کبھی نہ کبھی یہ شخص ایمان کی وجہ سے جنت میں چلا جائے گا۔ لیکن جو شخص صرف اس لئے مومن ہے کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا، اس کے علاوہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ اسلام کے تقاضے کیا ہیں اس کا ایمان ایک ٹھونٹھ درخت کے مانند ہے جو برگ و بار سے بالکل خالی ہے۔ ایسے درخت کی لکڑی جلنے کے سوا اور کسی کام نہیں آتی۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عملِ صالح کی توفیق دی ہے ان کیلئے سدا بہار باغات ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں اور پھر اس بات کو مکرر ارشاد فرمایا کہ یہ ان لوگوں کا صلہ ہے جنہوں نے اپنے ظاہر و باطن اور اپنے عقیدہ و عمل کو پاکیزہ بنایا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایمان کے ساتھ حُسنِ عمل کی کس قدر اہمیت ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰىٓ ۙ اَنْ اَسْرِ
بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا
وَّلَا تَخْشٰى ﴿٧٧﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ
مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿٧٩﴾ يٰبَنِيْٓ

Marfat.com

اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ
الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿٨٠﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ
يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ
اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ
يٰمُوْسٰى ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾
قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾
فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ
رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۭ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ
غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿٨٦﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ
بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ
اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا
هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ
قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾

رکوع: ۴۔ (ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ اور ان کیلئے سمندر میں خشک راستہ بنالو، تمہیں کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ تمہیں اندیشہ ہو (ڈوب جانے کا)۔ ۷۷) پس فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ ۷۸) فرعون نے اپنی

Marfat.com

قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی۔ ۷۹) اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کے دائیں جانب تمہاری حاضری کیلئے وقت مقرر کیا اور تم پر ہم نے من وسلویٰ اتارا۔ ۸۰) ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اسے کھا کر سرکشی نہ کرو ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب اترتا ہے تو یقیناً وہ گر کر رہتا ہے۔ ۸۱) اور میں ان لوگوں کیلئے بڑا ہی غفار ہوں جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح کریں پھر ہدایت کی روش اختیار کریں۔ ۸۲) اور کیوں جلدی کی تم نے اپنی قوم سے اے موسیٰ۔ ۸۳) عرض کی، وہ یہ ہیں میرے پیچھے، اور میں، اے میرے رب! تیری خوشنودی کیلئے جلدی چلا آیا۔ ۸۴) ارشاد ہوا تو ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔ ۸۵) موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غضبناک اور افسردہ خاطر لوٹے اور فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا تم سے تمہارے رب نے نہایت اچھا وعدہ نہیں کیا تھا۔ تو کیا طویل مدت گزر گئی اس وعدے پر (اور تم اس کے ایفا سے مایوس ہو گئے) یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو۔ اس لئے تم نے میری ٹھہرائی ہوئی میعاد کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ ۸۶) انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپ سے کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی اپنی مرضی سے نہیں کی بلکہ قوم کے زیورات کا بوجھ جو ہمارے حوالے کیا گیا تھا ہم نے اس کو پھینک دیا، پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا۔ ۸۷) پس اس نے ان کیلئے ایک بچھڑے کا ڈھانچہ برآمد کر دیا جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی۔ پس انہوں نے کہا یہی تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا بھی معبود ہے، لیکن موسیٰ بھول گئے۔ ۸۸) کیا یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ وہ اختیار رکھتا ہے ان کیلئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا۔ ۸۹)

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿٧٧﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾

(ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ اور ان کیلئے سمندر میں خشک راستہ بنا لو، تمہیں کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ تمہیں اندیشہ ہو (ڈوب جانے کا)۔ ۷۷) پس فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ ۷۸)

فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا...... صاحبِ کشاف کے نزدیک ضربِ طریق کا معنی راستہ بنا لینے کے ہیں۔

مقابلے کے اثرات

جادوگروں سے مقابلے میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی فتح نے حسبِ توقع اہلِ مصر پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ فرعون نے اگرچہ سیاسی شعبدہ بازیوں سے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن دلوں میں اس مقابلے کے اثرات کو روکنے کی کوئی تدبیر وہ نہ کر سکا۔ اس مقابلے کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی نبوت کے بارے میں یکسو ہو گئے اور آہستہ آہستہ

Marfat.com

ان کے اندر یہ یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ فرعون کی حکومت کفر کی حکومت ہے اور ہم لوگ مسلمان ہیں، ہمیں بہر صورت کفر کی اس حکومت سے نجات حاصل کرنی ہے ورنہ جس شخص کی نظر بھی قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر ہے وہ جانتا ہے کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کسی اجتماعی فیصلے کے ہرگز قابل نہیں ہوتی۔ وہ خطرات کو برداشت کرنے کی بجائے اپنی غلامی پر قانع رہنا پسند کرتی ہے۔ ان کی طبیعتوں میں خطر پسندی کا گزر دور دور تک نہیں ہوتا۔ اس لئے ملک چھوڑ دینے اور ایک نئی تاریخ کے راستے پر پڑ جانے کا حوصلہ یہ بات بتانے کیلئے کافی ہے کہ بنی اسرائیل ذہنی تربیت کے اعتبار سے بہت سے مراحل طے کر چکے تھے اور اس کا آغاز یقیناً جادوگروں کے ساتھ اسی معرکے سے ہوا۔ انہوں نے جب اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید دیکھی تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کیلئے تیار ہو گئے۔

جہاں تک عام اہلِ مصر کا تعلق ہے ان میں اگرچہ ہم کسی بڑی تبدیلی کے آثار نہیں دیکھتے لیکن ایک بات واضح ہے کہ جادوگر بنی اسرائیل میں سے نہیں بلکہ اہلِ مصر کی کسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جس طرح حق کو قبول کیا اور پھر اس راستے میں ہر قربانی دینے کا عزم بالجزم کیا اس کا یقیناً یہ نتیجہ ہوا ہوگا کہ بہت بڑی تعداد نہ سہی ایک محدود تعداد ان کے راستے پر چلنے کیلئے تیار ہو گئی ہوگی، شاید یہی وجہ ہے کہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ آپ راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر نکل جائیں بلکہ یہ فرمایا گیا کہ میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ۔ یہاں بنی اسرائیل کی بجائے عبادی کا لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلنے والے لوگ بنی اسرائیل کے علاوہ دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے بھی تھے۔

واقعۂ ہجرت اور اس کا پس منظر

حاصل کلام یہ کہ جادوگروں سے مقابلے کے بعد عام بیداری کی جو لہر اٹھی فرعون نے اسے روکنے کیلئے دار و گیر میں مزید سختی کر دی۔ کمزور لوگوں کی مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا، بنی اسرائیل پر ہونے والے مظالم میں تیزی آ گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ و دعوت کے ذریعے عام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلایا اور فرعون سے بھی بار بار ملاقاتیں کیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید و نصرت کیلئے مزید معجزات عطا فرمائے جو فرعون اور آلِ فرعون بلکہ تمام اہلِ مصر کیلئے ایک عذاب سے کم نہ تھے۔ سورۃ الاعراف میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ چنانچہ جب کوئی مصیبت مصر پر نازل ہوتی تو فرعون گھبرا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا کہ آپ دعا کریں کہ یہ مصیبت ٹل جائیں، ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیج دیں گے، کیونکہ اب دعوت الی اللہ کی صورت یہ ہو گئی تھی کہ جب فرعون اور اس کے زیر اثر لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں دل سخت کر لئے بلکہ اس طرح ہراس پیدا کر دیا کہ کسی کیلئے بھی اس دعوت پر لبیک کہنا آسان نہ رہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ کہا کہ تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ اگر تمہیں ایمان اور اہلِ ایمان کا وجود گوارا نہیں تو ہم تمہارا ملک چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ آپ کے پیشِ نظر غالباً یہ تھا کہ بنی اسرائیل اگرچہ اپنے دلوں میں ایمان رکھتے ہیں لیکن اگر وہ اسی طرح مصریوں کے ساتھ رہیں گے تو ان کے اندر ایمان کے برگ و بار کبھی پھوٹنے نہیں پائیں گے اور ان کی اسلامی شریعت کے مطابق کبھی بھی تربیت نہیں ہو پائے گی۔ اگرچہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مکمل طور پر بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں مانگی تھی بلکہ صرف یہ چاہا تھا کہ ہمیں شہر سے باہر بیابان میں تین دن عید منانے کی اجازت دی جائے جہاں ہم اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانیاں دے سکیں۔ اور اسی سلسلے میں بعض اہلِ علم کا یہ بھی خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مکہ معظمہ لے جانا چاہتے تھے لیکن قرآنِ کریم سے تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ

Marfat.com

نے فرعون سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو تا کہ وہ تمہارے کفر اور غلامی کے اثرات سے آزاد ہو کر اپنے اندر اسلامی زندگی کی خوبو پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اسی سلسلے میں فرعون اور آلِ فرعون کو تنبیہ کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار مختلف قسم کی آزمائشیں نازل ہوتی رہیں۔ کبھی بارشیں روک دی گئیں، کبھی پانی کو خون بنا دیا گیا، کبھی مینڈکوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کر دیا گیا، کبھی ہر جگہ کھٹمل اور جوئیں پیدا کر دی گئیں۔ چنانچہ جب بھی ایسی کوئی آزمائش نازل ہوتی تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑی عاجزی سے وعدہ کرتا کہ آپ دعا کریں، یہ مصیبت جاتی رہے، تو ہم بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیج دیں گے۔ لیکن جب کئی سالوں تک اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہر طرح سے اس پر اتمامِ حجت کر چکے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ آپ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ اس کیلئے ایک رات مقرر کر دی گئی، وقت طے ہو گیا اور جگہ کا بھی تعین کر لیا گیا جہاں سے اکٹھے ہو کر سب کو نکلنا تھا۔ چنانچہ نہایت خاموشی اور نظم و ضبط کے ساتھ رات کی تاریکی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکلے۔ اس زمانے میں نہر سویز موجود نہ تھی، بحر احمر سے بحر روم تک کا پورا علاقہ کھلا ہوا تھا مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے بچ کر گزرنا محال تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحر احمر کی شمالی خلیج کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ ادھر فرعون کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ بنی اسرائیل شہر سے نکل گئے ہیں تو وہ اپنی فوجوں کو ساتھ لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک ان کے سروں پر آ پہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ بنی اسرائیل نے جب دیکھا کہ سامنے سمندر کی موجیں پوری طغیانی میں ہیں اور پیچھے فرعون کی فوجیں چلی آ رہی ہیں تو وہ چیخ اٹھے۔ اِنَّا لَمُدْرَكُوْن ''ہم تو پکڑ لئے گئے'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت جلال سے فرمایا كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْن ''ہرگز نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے ضرور راستہ دے گا۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ اپنا عصا سمندر پر مارو۔ عصا مارنے کی دیر تھی، قرآنِ کریم کہتا ہے فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْم ''سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا۔'' اور اس طرح سے صرف یہی نہیں کہ پانی رک جانے کے باعث راستہ بن گیا بلکہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ کے مطابق بیچ کا تمام حصہ سوکھ کر سڑک بن گیا۔

اس واقعہ کے مطابق تورات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ قرآنِ کریم کی دی ہوئی تفصیل کے قریب قریب ہے۔ تورات کی کتاب خروج باب ۱۴ میں منقول ہے، (اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے، بنی اسرائیل سے کہہ کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اس کو دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے...... پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر ایک خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا اور مصریوں نے تعاقب کیا۔) آپ قرآنِ کریم اور تورات کے الفاظ پر غور کیجئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک صریح معجزہ ہے جس میں طبعی زمینی عوامل کا کوئی دخل نہیں۔ اس سے ان لوگوں کے خیالات کی اصلاح ہو جانی چاہئے جو کہتے ہیں کہ ہَوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر ہٹ گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اولاً تو اتنے بڑے جوار بھاٹے کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں اور اگر فرض کر لیں کہ یہ جوار بھاٹا ہی تھا تو کیا جوار بھاٹے میں یا ہَوا کے طوفان کی وجہ سے کبھی اس طرح بھی پانی ہٹتا ہے کہ دونوں طرف ٹیلوں کی طرح پانی کھڑا ہو جائے اور بیچ کا حصہ سوکھ کر سڑک بن جائے۔

دوسری آیت میں فرعون کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس نے جب ساحلِ سمندر پر پہنچ کر دیکھا کہ سمندر کا پانی دو حصوں

Marfat.com

میں تقسیم ہوگیا ہے اور درمیان میں ایک راستہ بن گیا ہے جس سے بنی اسرائیل نہایت اطمینان سے سمندر کے دوسرے پار پہنچ گئے ہیں تو اس نے بھی اپنا گھوڑا سمندر میں اتار دیا تو اس کی پیروی میں تمام فوج سمندر میں اتر گئی۔ جب فرعون اور اس کی فوج عین سمندر کے بیچ میں پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو مل جانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ پانی کے ملتے ہی فرعون اپنی فوجوں سمیت پانی میں غرق ہوگیا۔

آیت کا دوسرا جملہ **فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ "پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔"** یہ عربی زبان کا ایک ایسا اسلوب ہے جس میں انتہائی ہیبت پائی جاتی ہے۔ اس میں شاید اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جب سمندر کا پانی آپس میں ملا اور اس میں فرعون اور اس کے فوجی گھر گئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں نے ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ پانی میں ڈوبنا بجائے خود بڑی اذیت کی بات ہے لیکن سمندر کی موجوں کے تھپیڑوں کا ہدف بن جانا اور پھر پانی کا ڈوبنے والے کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا اور پٹخنا یہ وہ اذیت ہے جس کا تصور بھی ہلا دینے کیلئے کافی ہے۔

دو عبرت انگیز مناظر

فرعون اور آلِ فرعون اپنے انجام کو پہنچ گئے لیکن اس میں دو منظر ایسے ہیں جو نہایت عبرت خیز ہیں۔ پہلا منظر یہ ہے کہ فرعون اور آلِ فرعون یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے برسوں تک بنی اسرائیل کو مظالم کی چکی میں پیسا تھا۔ کوئی اذیت ایسی نہیں جو انہیں نہ پہنچائی ہو اور کوئی ذلت ایسی نہیں جس کا انہیں نشانہ نہ بنایا ہو۔ وہ ان کے ہاتھ میں بے بس کھلونوں کی مانند تھے۔ لیکن آج عجیب منظر یہ تھا کہ انہیں موجیں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھیں اور ان کی چیخیں آسمانوں تک پہنچ رہی تھیں اور وہی مقہور و مجبور سمندر کے دوسرے کنارے پر کھڑے انہیں ڈوبتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ڈوبنے والوں کو شاید اس کا ہوش نہ ہو کہ کن لوگوں کی نظریں ہم پر پڑ رہی ہیں لیکن بنی اسرائیل بقائمی ہوش و حواس اپنے سابقہ ظالم آقاؤں کے پانی میں غرق ہونے کا نظارہ کر رہے تھے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت ان کے احساسات کیا تھے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی مظلوم قوم جب ظالموں کو حالات کی گرفت میں دیکھتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر بجا لاتی ہے اور اس کے دل کو ایک سکون ملتا ہے۔ اسی لئے سورۂ بقرہ آیت ۵۰ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کیلئے سمندر کو پھاڑنے کی نعمت کا ذکر کرتے ہوئے بطورِ خاص یہ بات فرمائی کہ تم اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اب دوسرا منظر بھی اس سے کم عبرت انگیز نہیں کہ فرعون کی ساری فوجیں پانی میں ڈوب گئیں اور ان میں سے کسی کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملا، لیکن سورۂ یونس آیات ۹۰-۹۲ میں فرمایا گیا ہے کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو وہ پکارا آمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ "میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے اس خدا کے سوا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں۔" مگر اس آخری لمحے کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ، فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً "اب ایمان لاتا ہے؟ اور پہلے یہ حال تھا کہ نافرمانی کرتا رہا اور فساد کئے چلا گیا، اچھا آج ہم تیری لاش کو بچائے لیتے ہیں تاکہ تو بعد کی نسلوں کیلئے نشانِ عبرت بنا رہے۔"

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰی ﴿۷۹﴾

(فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی۔ ۷۹)

Marfat.com

قائداور رعایا کی ذمہ داری

آلِ فرعون اور مصر پر جو مصیبت آئی اور وہ جس برے انجام کو پہنچے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کو صحیح رہنمائی دینے کی بجائے گمراہ کیا۔ وہ ایسا بزعم خود غلط تھا کہ وہ اپنی ہر بات کو حرف آخر سمجھتا تھا۔ وہ حکمران کی حیثیت سے صرف حکم دینا جانتا تھا وہ یہ بات نہیں سمجھتا تھا کہ اس کی حیثیت ایک راعی کی ہے جس طرح ایک چرواہا اپنے گلے کی حفاظت کرتا اور اسے ہر طرح کے نقصان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح میری بھی ذمہ داری ہے کہ میں اپنی رعایا کو صحیح رہنمائی مہیا کروں اور انہیں ایسے راستوں پر چلنے سے روکوں جو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔

اسی طرح رعایا کی بھی ذمہ داری ہے۔ وہ جب یہ دیکھے کہ ہمارا حکمران راعی نہیں بلکہ محض بادشاہ ہے جسے اپنے احکام اور خواہشات کی تعمیل عزیز ہے۔ رعایا کی تربیت اور ان کی صحیح رہنمائی سے اسے کوئی سروکار نہیں، تو پھر انہیں فیصلہ کرنا چاہئے کہ ہمیں ایسے حکمران کو برداشت کرنا چاہئے یا نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح فرعون نے اپنا فرض انجام نہیں دیا اسی طرح رعایا نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں تباہ ہو گئے۔

اس سے مشرکینِ مکہ کو شاید یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تمہارے سردار اور لیڈر تم کو اسی راستے پر لئے جا رہے ہیں جس پر فرعون اپنی قوم کو لے جا رہا تھا اور تم بھی آنکھیں بند کر کے فرعون کی قوم کی طرح ان کے پیچھے چلے جا رہے ہو۔ اگر تم میں کچھ بھی عقل ہے تو فرعون اور اس کی قوم کے انجام سے سبق سیکھو اور صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ کے رسول تمہارے درمیان موجود ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی کتاب نازل ہو رہی ہے لیکن کس قدر بدنصیبی کی بات ہے کہ تم آبِ حیات سے منہ پھیر کر آبِ سموم پینے پر اصرار کر رہے ہو۔

اس قصے کے خاتمے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائیبل کے بیانات کا بھی جائزہ لے لیا جائے تا کہ ان لوگوں کے جھوٹ کی حقیقت کھل جائے جو کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لئے گئے ہیں۔ بائبل کی کتاب خروج (Exodus) میں اس قصے کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان کے حسب ذیل اجزاء قابل توجہ ہیں:

1- باب ۴، آیت ۲۔۵ میں بتایا گیا ہے کہ عصا کا معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا اور آیت ۱۷ میں انہی کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ''تو اس لاٹھی کو اپنے ہاتھ میں لئے جا اور اسی سے ان معجزوں کو دکھانا۔'' مگر آگے جا کر نہ معلوم یہ لاٹھی کس طرح حضرت ہارون علیہ السلام کے قبضے میں چلی گئی اور وہی اس سے معجزے دکھانے لگے۔ باب ۷ سے لے کر بعد کے ابواب میں مسلسل ہم کو حضرت ہارون علیہ السلام ہی لاٹھی کے معجزے دکھاتے نظر آتے ہیں۔

2- باب ۵ میں فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پہلی ملاقات کا حاصل بیان کیا گیا ہے، اور اس میں سرے سے اس بحث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ربوبیت کے مسئلہ پر ان کے اور فرعون کے درمیان ہوئی تھی۔ فرعون کہتا ہے کہ ''خداوند کون ہے کہ میں اس کی بات مانوں اور بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا۔'' مگر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیتے کہ ''عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے۔'' (باب ۵۔ آیت ۲۔۳)۔

3- جادوگروں سے مقابلے کی پوری داستان بس ان چند فقروں میں سمیٹ دی گئی ہے:

Marfat.com

"اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ جب فرعون تم کو کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ تو ہارون سے کہنا کہ اپنی لاٹھی کو لے کر فرعون کے سامنے ڈال دے تا کہ وہ سانپ بن جائے اور موسیٰ اور ہارون فرعون کے پاس گئے اور انہوں نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی فرعون اور ان کے خادموں کے سامنے ڈال دی اور وہ سانپ بن گئی۔ تب فرعون نے بھی داناؤں اور جادوگروں کو بلوایا اور مصر کے جادوگروں نے بھی اپنے جادو سے ایسا ہی کیا کیونکہ انہوں نے بھی اپنی اپنی لاٹھی سامنے ڈالی اور وہ سانپ بن گئیں لیکن ہارون کی لاٹھی ان کی لاٹھیوں کو نگل گئی۔" (باب ۷، آیت ۸۔۱۲)

اس بیان کا مقابلہ قرآن کے بیان سے کر کے دیکھ لیا جائے کہ قصے کی ساری روح یہاں کس بری طرح فنا کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جشن کے دن کھلے میدان میں باقاعدہ چیلنج کے بعد مقابلہ ہونا، اور پھر شکست کے بعد جادوگروں کا ایمان لانا جو قصے کی اصل جان تھا، سرے سے یہاں مذکور ہی نہیں ہے۔

4- قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ بنی اسرائیل کی رہائی اور آزادی کا تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ مطالبہ صرف یہ تھا "ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزل بیابان میں جا کر خداوند اپنے خدا کیلئے قربانی کریں۔" (باب ۵، آیت ۳)

5- مصر سے نکلنے اور فرعون کے غرق ہونے کا مفصل حال باب 11 سے 14 تک بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سی مفید معلومات اور قرآن کے اجمال کی تفصیلات بھی ہمیں ملتی ہیں اور ان کے ساتھ متعدد عجیب باتیں بھی مثلاً باب 14 کی آیات 15، 16 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا جاتا ہے کہ "تو اپنی لاٹھی (جی ہاں اب لاٹھی حضرت ہارون سے لے کر پھر حضرت موسیٰ کو دے دی گئی ہے) اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔" لیکن آگے چل کر آیت 21، 22 میں کہا جاتا ہے کہ "پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔" یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آیا یہ معجزہ تھا یا طبعی واقعہ؟ اگر معجزہ تھا تو عصا کی ضرب سے ہی رونما ہوگیا ہوگا، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اور اگر طبعی واقعہ تھا تو یہ عجیب صورت ہے کہ مشرقی آندھی نے سمندر کو بیچ میں سے پھاڑ کر پانی کو دونوں طرف دیوار کی طرح کھڑا کر دیا اور بیچ میں سے خشک راستہ بنا دیا۔ کیا فطری طریقے سے ہوا کبھی ایسے کرشمے دکھاتی ہے؟

تلمود کا بیان نسبۃً بائبل سے مختلف اور قرآن سے قریب تر ہے، مگر دونوں کا مقابلہ کرنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ ایک جگہ براہِ راست علم وحی کی بنا پر واقعات بیان کئے جا رہے ہیں اور دوسری جگہ صدیوں کی سینہ بسینہ روایات میں واقعات کی صورت اچھی خاصی مسخ ہو گئی ہے۔ ملاحظہ ہو؛ The Talmud Selections, H. Polano; pp. 150-54 (تفہیم القرآن)

Marfat.com

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

(اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کے دائیں جانب تمہاری حاضری کیلئے وقت مقرر کیا اور تم پر ہم نے من وسلویٰ اتارا۔ ۸۰) ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اسے کھا کر سرکشی نہ کرو ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب اترتا ہے تو یقیناً وہ گر کر رہتا ہے۔ ۸۱) اور میں ان لوگوں کیلئے بڑا ہی غفار ہوں جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح کریں پھر ہدایت کی روش اختیار کریں۔ ۸۲)

احسانات یاد دلا کر بنی اسرائیل کو تنبیہ

بنی اسرائیل سمندر کو عبور کرنے کے بعد کن مراحل سے گزرے اس کا ذکر سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ کسی موقع پر پروردگار نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں کی یاد دلا کر ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں تو اس سلسلے میں بطورِ خاص جن نعمتوں اور احسانات کا ذکر کیا گیا وہ متذکرہ بالا آیات میں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی بات جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل! تم پر اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ تم فرعون جیسے بدترین دشمن کے آہنی پنجے میں گرفتار تھے، وہ تمہاری نسل کشی کا فیصلہ کر چکا تھا اور جو لوگ اس وقت زندہ تھے ان کی زندگی موت سے بدتر تھی۔ عزت اور راحت عرصہ دراز سے تمہارے گھروں سے رخصت ہو چکی تھی اور قومی افتخار سے تم بری طرح محروم کر دیئے گئے تھے۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیجا۔ اس نے تمہارے دلوں میں جذبات کی دنیا پیدا کی، تمہارا ٹوٹا ہوا رشتہ اللہ تعالیٰ سے جوڑا اور تمہیں فرعون کے مظالم سے نجات دلانے کیلئے جب وہ رات کی تاریکی میں ہجرت کے ارادے سے نکلا تو سامنے سمندر نے تمہارا راستہ روک دیا اور پیچھے سے فرعون تعاقب کرتا ہوا پہنچ گیا۔ اب تمہارے سامنے موت کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم اور اپنی قدرت سے تمہیں سمندر کے پار اتارا اور فرعون اور اس کی فوجوں کو سمندر میں غرق کر دیا۔ اس طرح تمہاری زندگیوں کی بقاء کا سامان کیا گیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تمہیں نئی زندگی عطا کی گئی لیکن تمہاری وہ کمزوریاں جو غلامی نے تمہارے اندر پیدا کر دی تھیں اور تمہاری وہ گمراہیاں جو فرعون کے زیر سایہ تمہارے اندر پروان چڑھ چکی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم قبطیوں کی طرح بتوں کو پوجنے لگے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی صحرائے سینا میں تمہارا گزر ایک مندر پر ہوا تو وہاں ایستادہ بتوں کو دیکھ کر تمہیں بھی شوق چرایا اور تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بے جھجک مطالبہ کر دیا کہ آپ بھی ہمارے لئے ایک بت بنا دیجئے تاکہ ہم اسے خدا کی طرح پوجا کریں تو تب اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا کہ تم طور کے مشرقی دامن میں پہنچو جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی تو وہاں تمہاری زندگی کی رہنمائی کیلئے تمہیں تورات عطا کی جائے گی، لیکن اس پر بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے جو کردار دکھایا اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ مزید اپنے احسانات کو یاد دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم پر من وسلویٰ اتارا۔ بائبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشتِ سین میں ایلیم

Marfat.com

اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آ گئی تھی، اس وقت من وسلویٰ کا نزول شروع ہوا اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ (خروج باب ۱۶، گنتی باب ۱۱، آیت ۷۔۹ یشوع باب ۵ آیت ۱۲)

کتاب خروج میں من وسلویٰ کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے۔

''اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے من؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔'' (باب ۱۶، آیت ۱۳۔۱۵)

''اور بنی اسرائیل نے اس کا نام من رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزہ شہد کے بنے ہوئے پوئے کی طرح تھا۔'' (آیت ۳۱)

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے (لوگ اِدھر اُدھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چکی میں پیستے، اوکھلی میں کوٹ لیتے تھے، پھر اسے ہانڈیوں میں ڈال کر روٹیاں بناتے تھے، اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر گاہ میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ من بھی گرتا تھا۔'' (باب ۱۱، آیت ۸۔۹)

''من وسلویٰ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کے طور پر بنی اسرائیل کو عطا فرمائے تھے کیونکہ اس وقت بنی اسرائیل کے پاس خوراک کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ خوراک چالیس سال تک انہیں میسر رہی، لیکن جب انہیں خوراک کے ذرائع میسر آ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کو ختم کر دیا۔ چنانچہ آج نہ وہاں بٹیروں کی کثرت نظر آتی ہے اور نہ کہیں من پایا جاتا ہے۔ تلاش اور تجسس کے شوقین لوگ وہاں جا کر کوشش کرتے ہیں کہ کہیں ان چیزوں کا سراغ ملے۔ لیکن من کا خاص طور پر کہیں سراغ نہیں ملتا۔

اگلی آیت میں فرمایا کہ ہم نے تمہیں یہ نعمتیں عطا کی ہیں تم انہیں شوق سے کھاؤ، یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا پاکیزہ رزق ہے، لیکن یاد رکھو کہ نعمت کی فراوانی تمہارے اندر طغیان یا سرکشی پیدا نہ کرے، نعمت پر شکر ادا نہ کرنا، اس کے تقاضوں کے مطابق طرزِ عمل نہ اپنانا، اسراف کا راستہ اختیار کرنا یا کسی بھی نعمت کی فراوانی کو اپنی ذاتی محنت کا نتیجہ سمجھنا، یہ سب چیزیں طغیان میں شامل ہیں۔

جس طرح شکر سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اس طرح سرکشی اور ناشکری سے اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور جس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے وہ بلندی کی کسی سطح پر بھی ہو وہاں سے گر کر رہتا ہے۔ عزت کا تخت چھن جاتا ہے اور ذلت کی اتھاہ گہرائی مقدر بن جاتی ہے۔ فرعون کو اسی طغیانی نے تباہ کیا کہ وہ بندگی کو بھول کر خدائی کا صور پھونکنے لگا۔ نتیجہ کیا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو گیا۔

اگلی آیت میں فرمایا کہ کوئی شخص کتنا بھی بگڑ جائے اور گمراہی کی کسی حد کو بھی پہنچ جائے وہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گا، اللہ تعالیٰ کو غفار پائے گا، یعنی وہ صرف بخشنے والا نہیں بلکہ بہت بخشنے والا ہے۔ البتہ ضرورت چار چیزوں کی ہے۔ (1) کہ وہ سرکشی کی ہر قسم سے توبہ کرے۔ (2) اللہ تعالیٰ، اس کے رسول، اس کی کتاب اور آخرت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرے۔ (3) اللہ تعالیٰ اور رسول کی ہدایات کے مطابق اور دل کے اخلاص کے ساتھ عمل کرے۔ (4) زندگی بھر راہِ راست پر استقامت اختیار کرے، نہ کبھی ڈولے نہ کبھی ٹھٹکے۔

Marfat.com

وَمَآ اَعۡجَلَکَ عَنۡ قَوۡمِکَ یٰمُوۡسٰی ﴿۸۳﴾ قَالَ ھُمۡ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیۡ وَعَجِلۡتُ اِلَیۡکَ رَبِّ لِتَرۡضٰی ﴿۸۴﴾

(اور کیوں جلدی کی تم نے اپنی قوم سے اے موسیٰ۔ ۸۳) عرض کی، وہ یہ ہیں میرے پیچھے، اور میں، اے میرے رب! تیری خوشنودی کیلئے جلدی چلا آیا۔ ۸۴)

آیت کا پس منظر

جب بنی اسرائیل بحر احمر کو عبور کر کے سینا کے بیابان میں پہنچے تو وہاں ان کا گزر ایک بت پرست قوم پر ہوا۔ ان کی عبادت و پرستش کو دیکھ کر بنی اسرائیل نے کہا کہ جس طرح انہوں نے موجود اور محسوس چیزوں یعنی بتوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے احمقانہ سوال پر انہیں ڈانٹتے ہوئے فرمایا: اِنَّکُمۡ قَوۡمٌ تَجۡھَلُوۡنَ ، اِنَّ ھٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمۡ فِیۡهِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ "تم ایک جاہل قوم ہو، بیشک تباہ ہونے والا ہے جس پر یہ ہیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب باطل ہے۔" اس وقت پروردگار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے بنی اسرائیل سے وعدہ فرمایا کہ تم کوہ طور کی دائیں جانب جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت دی گئی تھی پہنچ جاؤ تو ہم تمہیں ایک کتاب عطا کریں گے جو تمہاری زندگیوں کیلئے دستور العمل ہوگی۔ سورۃ الاعراف میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے پروردگار نے ارشاد فرمایا:

وَوٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَةً وَّاَتۡمَمۡنٰھَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَةً ۚ وَقَالَ مُوۡسٰی لِاَخِیۡهِ ھٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ وَاَصۡلِحۡ وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِیۡلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ .

آیت ۱۴۲، الاعراف

"اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا مزید دس راتوں سے۔ تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور اصلاح کرتے رہنا اور فساد کرنے والوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔"

اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تورات عطا کئے جانے سے پہلے تیس شب و روز کا اعتکاف کرنا ہوگا، لیکن حکمتِ تربیت کے تحت اس اعتکاف میں دس راتوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوہِ طور پر آپؑ کا قیام ایک دو روز کا نہیں بلکہ تیس اور پھر چالیس روز کا تھا۔ آپؑ نے اپنے ساتھ ستر سر برآوردہ لوگوں کو لیا اور کوہِ طور پر حاضری کیلئے مستعد ہوئے لیکن جانے سے پہلے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنایا اور انہیں ہدایت کی کہ آپؑ کا کام بنی اسرائیل کی نگرانی کرنا اور ہر ممکن طریقے سے ان کے حالات کی اصلاح کرنا ہے اور ساتھ ہی اشارہ بھی کر دیا کہ بنی اسرائیل میں مفسدین کا ایک گروہ موجود ہے ممکن ہے میری غیر حاضری میں وہ کوئی مسئلہ پیدا کریں، تو آپؑ کا کام یہ ہے کہ آپؑ ان پر نظر رکھیں اور ان مفسدین کے راستے پر چلنے کی بجائے لوگوں کو ان کے راستے پر چلنے سے روکیں۔ ان ہدایات کے بعد آپؑ کوہِ طور کیلئے روانہ ہو گئے۔ لیکن اپنے ساتھیوں کو اپنے ساتھ لے جانے کی بجائے ان کو راستے میں چھوڑا

Marfat.com

اور انہیں انتظار کرنے کا حکم دے کر خود تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ جب اس مقامِ مقررہ پر پہنچے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے آپؑ کی حضوری کی جگہ تھی تو پروردگار نے پوچھا کہ موسیٰ تم نے اپنی قوم کو پیچھے چھوڑ کر تنہا آنے میں جلدی کیوں کی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرے ساتھی بھی پیچھے چلے آ رہے ہیں اور وہ بھی پہنچنے ہی والے ہوں گے، میں فرطِ شوق میں اس لئے جلدی چلا آیا ہوں تاکہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔

پروردگار کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کہ آپؑ اپنی قوم کو پیچھے چھوڑ کر جلدی کیوں چلے آئے، اس کا ایک محمل تو یہ ہے کہ آپؑ کے پیچھے جو کچھ آپؑ کی قوم نے کیا اس سے آپؑ کو آگاہ کرنا تھا۔ لیکن دوسرا محمل یہ ہے (جسے روح المعانی میں ذکر کیا گیا ہے) کہ اس سوال کی وجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی تربیت کے متعلق ایک خاص ہدایت دینا اور ان کی عجلت پر تنبیہ کرنا تھا کہ آپؑ کے منصبِ رسالت کا تقاضا یہ تھا کہ آپؑ قوم کے ساتھ رہتے، ان کو اپنی نگاہوں میں رکھتے اور اپنی نگرانی میں ساتھ لاتے۔ آپؑ کی عجلت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سامری نے قوم کو گمراہ کر دیا ہے۔

انبیائے کرام سے سرزد ہونے والی لغزشوں کا مفہوم

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انبیائے کرام معصوم ہوتے ہیں، ان سے کبھی کوئی لغزش صادر نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے وہ لغزش مراد ہے جو اتباعِ ہوا کے نتیجے میں سرزد ہوتی ہے۔ وہ کبھی بھی ہوائے نفس سے مغلوب ہو کر راہِ راست سے متجاوز نہیں ہوتے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کا عشق اور اس کے دین کی سربلندی کی فکر دوسرے لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے وہ ایک ایک شخص کی ہدایت کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے جب کبھی معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق اور وارفتگی کا ہو یا انسانوں کو راہِ ہدایت کی طرف لانے کا تو وہ بعض دفعہ حدِ مطلوب سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ یہ تجاوز ایسا ہے جسے محمود ہی کہنا چاہئے۔ اس لئے کہ عشق و محبت میں حدود کا تعین نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی چونکہ میزانِ حق ہوتے ہیں اور ان کا ہر قول و فعل دوسروں کیلئے نمونہ ہوتا ہے اس لئے تبلیغ و دعوت، شوقِ خداوندی یا رضا طلبی کی راہ میں جب کبھی اللہ تعالیٰ کے نبی کا قدم حدِ مطلوب سے آگے بڑھنے لگتا ہے تو پروردگار اس پر تنبیہ فرماتا ہے۔ یہ تنبیہ بھی اسی نوعیت کی معلوم ہوتی ہے۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾

(ارشاد ہوا تو ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔ ۸۵)

بنی اسرائیل کی آزمائش

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ ہم نے تمہاری قوم کو فتنہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل جس طرح گوسالہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہوئے۔ اس لعنت میں مبتلا انہیں خدا کی طرف سے کیا گیا تھا، لیکن حقیقت میں اس کا مطلب یہ نہیں بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ افراد اور قوموں کو کسی نہ کسی آزمائش میں ڈال کے آزماتا ہے۔ آزمائش میں ناکام ہونے والے اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں اور کامیاب ہونے والوں کیلئے یہ آزمائش تربیت کا

Marfat.com

سامان ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل گزشتہ کئی سالوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے معجزات کی صورت میں اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھتے چلے آرہے تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے کئی دفعہ مصر میں وبائیں پھوٹیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں سے ان کا ازالہ ہوا۔ اب کچھ ہی عرصہ پہلے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کتنا بڑا منظر دیکھا کہ بحرِ قلزم ان کیلئے روک دیا گیا اور خشک راستے بنا دیئے گئے۔ یہ سب لوگ خراماں خراماں دوسرے کنارے جا پہنچے لیکن فرعون اور اس کی فوج ان کی آنکھوں کے سامنے غرقاب ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اتنے واضح مناظر کو دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات پر یقین میں کوئی کمی باقی نہیں رہ سکتی لیکن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایمان ویقین کی آزمائش کیلئے گوسالہ پرستی کا ایک موقع پیدا کیا تاکہ اندازہ ہوسکے کہ یہ لوگ توحید پرستی میں کہاں تک مخلص اور ثابت قدم ہیں، لیکن جیسے ہی سامری جیسے شعبدہ باز نے ان کیلئے شرک کا ایک راستہ کھولا تو بنی اسرائیل کی اکثریت اس میں مبتلا ہوگئی۔

سامری کا فتنہ

اس کی صورت یہ ہوئی کہ سامری نے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ تم اپنے زیورات میرے حوالے کردو، میں انہیں بھٹی میں گلا کر اینٹوں یا سلاخوں کی شکل میں ڈھال دوں گا تاکہ سفر کی رواروی میں اس سونے اور چاندی کو سنبھالنا آسان ہوجائے، لیکن جب اس نے اس ڈھالی ہوئی چیز کو بھٹی سے باہر نکالا تو وہ ایک بچھڑے کا دھڑ تھا۔ یعنی ایک ایسا بچھڑا جسے سونے سے ڈھالا گیا تھا لیکن اس میں جان نہیں تھی۔ لیکن جب اس سے ہوا گزرتی تھی تو اس کے اندر سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی۔ بنی اسرائیل مصر میں رہ کر چونکہ گوسالہ پرستی کے مرض میں مبتلا رہ چکے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ان کے سامنے ایک سنہری رنگ کا بولتا ہوا گوسالہ آیا اور پھر سامری نے نہایت ہوشیاری سے ان کو یہ باور کرایا کہ اصل میں یہی تمہارا خدا ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا ہے، موسیٰ تو نہ جانے بھول کر کہاں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ تو بنی اسرائیل اس کے سامنے جھک گئے اور اس کے سامنے قربان گاہ بنا کر قربانیاں بھی پیش کرنے لگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر جب پروردگار نے اس کی خبر دی تو انہیں نہایت دکھ ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ میری سالہا سال کی محنت لٹ گئی اور سارا بنا بنایا کھیل چوپٹ ہوگیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سامری کی شناخت سے متعلق چند ضروری باتیں عرض کردی جائیں۔ مولانا مودودی تفہیم القرآن میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:

سامری کی حقیقت

یہ اس شخص کا نام نہیں ہے بلکہ یائے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہرحال کوئی نہ کوئی نسبت ہی ہے خواہ قبیلے کی طرف ہو یا نسل کی طرف یا مقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح السامری کہہ کر اس کا ذکر کررہا ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سامری قبیلے یا نسل یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ اس سے زیادہ کوئی تشریح قرآن کے اس مقام کی تفسیر کیلئے فی الحقیقت درکار نہیں ہے لیکن یہ مقام ان اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی مشنریوں اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی حد کردی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ، معاذ اللہ، قرآن کے مصنف کی جہالت کا صریح ثبوت ہے۔ اس لئے کہ دولتِ اسرائیل کا دارالسلطنت ''سامریہ'' اس واقعہ کے کئی صدی بعد ۹۲۵ ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا، پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے ''سامریوں'' کے نام سے شہرت

Marfat.com

پائی۔ان کا خیال یہ ہے کہ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہری بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا اور یہودیوں کے ذریعہ سے حضرت محمد (ﷺ) نے اس بات کی سن گن پالی ہوگی، اس لئے انہوں نے لے جا کر اس کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہری بچھڑے کی پرستش رائج کرنے والا ایک سامری شخص تھا۔اسی طرح کی باتیں ان لوگوں نے ہامان کے معاملہ میں بنائی ہیں جسے قرآن فرعون کے وزیر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور عیسائی مشنری اور مستشرقین اسے اخسویرس (شاہ ایران) کے درباری امیر ''ہامان'' سے لے جا کر ملا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا ایک ثبوت ہے۔شاید ان مدعیانِ علم وتحقیق کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص یا قبیلہ یا مقام ہوا کرتا تھا اور ایک نام کے دو یا زائد اشخاص یا قبیلہ و مقام ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا حالانکہ سمیری قدیم تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں اس قوم کے یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔پھر خود اس سامریہ کی اصل کو بھی دیکھ لیجئے جس کی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔بائبل کا بیان ہے کر دولتِ اسرائیل کے فرمانروا عمری نے ایک شخص ''سمر'' نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا اور چونکہ پہاڑ کے سابق مالک کا نام سمر تھا اس لئے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا (سلاطین ۱، باب ۱۶۔آیت ۲۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے ''سمر'' نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پا کر ان کی نسل یا قبیلے کا نام سامری اور مقامات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں سامری کے متعلق تحقیق کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ متذکرہ بالا تحقیق سے ملتا جلتا ہے۔وہ لکھتے ہیں (قیاس کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے کیونکہ جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے عربی میں اس کا نام قدیم سے سامری آرہا ہے اور اب بھی عراق میں ان کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔یہاں قرآن کا السامری کہہ کر اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں، اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے۔یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا۔)

اس سے چند سطور آگے چل کر مولانا آزاد لکھتے ہیں (بہر حال سمیری قبائل کا اصل وطن عراق تھا، مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔مصر سے ان کے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آچکا ہے۔پس معلوم ہوتا ہے کہ اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ کا بھی معتقد ہو گیا تھا اور جب بنی اسرائیل نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا۔اسی کو قرآن کریم نے السامری کے لفظ سے یاد کیا ہے۔) (ترجمان القرآن جلد دوم، ص ۴۶۴، ۴۶۵)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تحقیق یہ ہے (بعض جدید محققین کا خیال ہے کہ قدیم مصری زبان میں سمر کہتے ہیں پردیسی، غیر ملکی، بیرونی کو۔سامری سے مراد ہے کوئی شخص جو غیر اسرائیلی تھا اور مصر سے اسرائیلی کے ساتھ ہو گیا تھا۔) (تفسیر ماجدی، سورہ طٰہٰ)

بعض اہلِ لغت کا خیال ہے کہ السامرۃ بنی اسرائیل کے قبائل میں سے ایک قبیلہ ہے۔سامری اسی قبیلے کا فرد تھا۔

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿٨٦﴾

(پس موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غضبناک اور افسردہ خاطر لوٹے اور فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا تم سے

Marfat.com

تمہارے رب نے نہایت اچھا وعدہ نہیں کیا تھا۔ تو کیا طویل مدت گزر گئی اس وعدے پر (اور تم اس کے ایفا سے مایوس ہو گئے) یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو۔ اس لئے تم نے میری ٹھہرائی ہوئی میعاد کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ ۸۶)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی اور قوم پران کا عتاب

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستی میں مبتلا ہونے کی خبر ملی تو آپؑ پر اس کا وہی اثر ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ آپؑ نے محسوس کیا کہ میری سالہا سال کی محنت معرضِ خطر میں ہے۔ میری جان جوکھوں کی کمائی ترازو کے پلڑے میں ہے۔ آپؑ نہایت افسردہ لیکن غصے سے بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف لوٹے۔ تو آپؑ نے نہایت برہمی سے اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں سے فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے رب نے تم سے بہترین وعدہ نہیں کیا تھا؟ یعنی میں نے تمہیں اپنے اللہ کی طرف سے یہ نوید سنائی تھی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری رہنمائی کیلئے کتاب عطا فرمانے والا ہے۔ اسی کی روشنی میں تم اپنی زندگی کو بناؤ گے اور ہمیشہ کیلئے تمہارے اور تمہاری نسلوں کیلئے یہ کتاب مینارۂ نور ہو گی لیکن تم بجائے اس وعدے کے مطابق کتاب کا انتظار کرنے کے ایک ایسی معصیت میں مبتلا ہو گئے جس کا تصور بھی کسی صاحبِ ایمان قوم سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیا تم نے یہ گمان کر لیا تھا کہ موسیٰ کو گئے ہوئے اتنا طویل عرصہ ہو گیا ہے کہ اب وہ لوٹ کے نہیں آئیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جو کتاب دینے کا وعدہ کیا تھا وہ کیسے پورا ہو سکے گا۔ مراد یہ ہے کہ اس وعدے پر کوئی طویل وقت نہیں گزرا تھا، میں تیس راتوں کا بتا کر گیا تھا اس پر صرف دس راتوں کا اضافہ ہوا کہ تم نے ایمان کو کفر سے بدل ڈالا یا تم اپنی بدنصیبی سے یہ فیصلہ کر چکے ہو کہ تم ایسے کرتوت کرو گے جن کی وجہ سے تم پر خدا کا غضب بھڑکے گا۔ اس وجہ سے تم نے مجھ سے کئے ہوئے وعدے کی پرواہ نہ کی اور اس کی خلاف ورزی کر ڈالی حالانکہ میں جاتے ہوئے تم سے یہ وعدہ لے کر گیا تھا کہ ایمان پر قائم رہنا، میرے بھائی ہارون کی پیروی کرنا۔ لیکن تم نے ہر وعدے کو فراموش کر دیا۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَکَ بِمَلْکِنَا وَلٰکِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَکَذٰلِکَ اَلْقَی السَّامِرِیُّ ﴿۸۷﴾

(انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپؑ سے کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی اپنی مرضی سے نہیں کی بلکہ قوم کے زیورات کا بوجھ جو ہمارے حوالے کیا گیا تھا ہم نے اس کو پھینک دیا، پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا۔ ۸۷)

قوم کے بزرگوں کی معذرت

بنی اسرائیل کے سربرآوردہ لوگوں سے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب طلبی کی کہ میں نے تم سے جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اطاعت پر قائم رہنے کا عہد لیا تھا تم نے اسے کیوں توڑا اور ان کی ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے تم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی، تو انہوں نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا آپؑ ہم سے ناراض نہ ہوں ہم نے ہرگز آپؑ سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی اپنے اختیار سے نہیں کی۔ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ ہم اس میں بالکل بے اختیار تھے۔ قوم کے لوگوں نے سامری کے اکسانے پر ہم سے اپنے زیورات

Marfat.com

کا مطالبہ اس شدت سے کیا کہ ہم ہزار خواہش کے باوجود اس کا انکار نہ کر سکے۔ سامری نے انہیں بہکایا کہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انتظار میں ہو لیکن وہ اس وقت تک نہیں آئیں گے جب تک تم اپنے زیورات اتار کر پھینک نہیں دو گے، لیکن لوگ چونکہ اپنے زیورات حفاظت کے نقطۂ نظر سے اپنے سرداروں کے پاس جمع کرا چکے تھے انہوں نے ان سے مطالبہ شروع کر دیا کہ آپ ہمارے زیورات ہمیں واپس کریں اور پھر وہ زیورات لے کر انہوں نے سامری کے حوالے کئے۔ سامری نے انہیں بھٹی میں ڈال کر پگھلایا اور چونکہ وہ ایک ماہر بت گر تھا، اس نے نہایت مہارت سے ایک بچھڑے کی صورت تیار کی۔

زِيْنَةِ الْقَوْمِ سے مراد

اس میں سب سے پہلے یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ یہاں زِيْنَةِ الْقَوْمِ سے مراد زیورات ہیں، لیکن قوم سے مراد کیا ہے؟ ہمارے اکثر مفسرین نے اس سے قومِ فرعون مراد لی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس یہ زیورات اپنے نہیں بلکہ قومِ فرعون کے تھے اور اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر یہ زیورات بنی اسرائیل کے اپنے ہوتے تو پھر آیتِ کریمہ میں زِيْنَةِ الْقَوْمِ کی بجائے زِيْنَتَنَا کا لفظ ہوتا حالانکہ قوم کا لفظ جس طرح دوسروں کیلئے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح اپنے لوگوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے جبکہ سورۃ الاعراف آیت ۱۴۵ میں مِنْ حُلِيِّهِمْ کا لفظ آیا ہے۔ اس میں ضمیر کا مرجع قومِ موسیٰ ہے۔ اس کا صاف معنی یہ ہے کہ قومِ موسیٰ نے اپنے زیورات سے بچھڑا بنایا۔ جو لوگ اس سے قومِ فرعون مراد لیتے ہیں ان کے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قومِ فرعون کے زیورات بنی اسرائیل کے ہاتھ کیسے لگے۔ اس کا عام طور پر وہی جواب دیا جاتا ہے جس کا ذکر تورات میں ہے۔ چنانچہ بائبل کتابِ الخروج میں ذکر ہے (پھر خدا نے موسیٰ سے یہ بھی کہا کہ تم بنی اسرائیل سے یوں کہنا کہ خداوند تمہارے باپ دادا کے خدا، ابراہام کے خدا اور اسحاق کے خدا اور یعقوب کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر...... اور یوں ہوگا جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کے مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے۔) (باب ۳، آیت ۱۵ تا ۲۲)

دوسرے مقام پر مرقوم ہے:

(سو اب تو لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیور لے۔) (باب ۱۱، آیت ۲۔۳)

غور فرمائیے کہ بنی اسرائیل کو عاریت کے نام سے دھوکہ دہی کی ترغیب دی جا رہی ہے اور اس طریقے سے نیت ان کی لوٹنے کی ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس دھوکہ بازی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا رہی ہے۔ کون صاحبِ ایمان ایسی گھٹیا حرکت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر سکتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں میں کس دیدہ دلیری سے تحریف کی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے اس توجیہ کو رد کر کے ایک دوسری توجیہ اختیار کی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب فرعون اور اس کا لشکر بحرِ قلزم میں غرق کر دیا گیا تو کچھ وقت گزرنے کے بعد سمندر کی لہروں نے ان کی لاشوں کو اٹھا کر ساحل پر پھینک دیا۔ چونکہ اس زمانے میں رؤساء، جرنیل اور اعیانِ مملکت زیور پہنا کرتے تھے۔ تو یہ فرعونی بھی زیوروں سے آراستہ تھے۔ بنی اسرائیل نے جب ان مردہ لاشوں کو زیوروں سے مزین دیکھا تو انہوں نے ان کے زیور اتار لئے۔ اس طرح سے قومِ فرعون کا بے انداز سونا ان کے ہاتھ آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے پاس

Marfat.com

جوزیور تھے یہ وہ تھے جو فرعونیوں کی لاشوں سے اتارے گئے تھے۔علامہ قرطبی نے اس توجیہ کو" قِیلَ " کہہ کر نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ قول کوئی وزن نہیں رکھتا۔لیکن جن لوگوں نے اس توجیہ کو اختیار کیا ہے وہ اس کو بہترین توجیہ سمجھتے ہیں اور پھر اس سے پیدا ہونے والے مالِ غنیمت کے مسائل پر تفصیلی بحث بھی کرتے ہیں۔حالانکہ ہم سورۂ یونس میں پڑھ چکے ہیں کہ فرعون جب ڈوبنے لگا تو اس نے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔لیکن اس کا یہ ایمان اس لئے قبول نہ کیا گیا کہ وقتِ مرگ ایمان لانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔لیکن اس کے اس اعلان کی یہ قدر ضرور کی گئی کہ پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ آج ہم تیرے جسم کو نجات دے دیں گے تاکہ تو بعد کے آنے والوں کیلئے عبرت بنا رہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سمندر کی موجوں نے صرف ایک ہی لاش کو باہر پھینکا تھا جو فرعون کی لاش تھی، باقی تمام فوج سمندر کا لقمہ ہو کر رہ گئی حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو حق کی دشمنی میں فرعون سے پیچھے نہ تھے اور بنی اسرائیل کو اذیت پہنچانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ لیکن تاریخ نے کسی کے بارے میں خبر نہیں دی کہ کسی کی لاش باہر پھینکی گئی ہو اور اگر پھینکی گئی ہوتی تو اس بات کا بہت امکان تھا کہ فرعون کے مصاحبین کی لاشوں کو حنوط کر کے اس کے ساتھ محفوظ کر دیا جاتا۔اس لئے قرینِ قیاس یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ زینت القوم سے مراد بنی اسرائیل کی عورتوں کے اپنے زیور ہیں، قومِ فرعون کے نہیں۔

یہی وہ زیور تھے جو بنی اسرائیل کے سرداروں نے بنی اسرائیل کے اصرار پر ان کے سامنے پھینک دیئے۔معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی اس ذمہ داری سے گراں بار تھے اور یہ گراں باری ذمہ داری کے احساس کی وجہ سے تھی۔اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ ان زیوروں کو قومِ فرعون کے زیور سمجھ کر انہیں محفوظ رکھنا جائز سمجھتے تھے۔چنانچہ یہی زیور اس بھٹی میں ڈالے گئے۔

اَلْقَی السَّامِرِیُّ کا مفہوم

فَکَذٰلِکَ اَلْقَی السَّامِرِیُّ اس کا ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ "اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا" یعنی جہاں باقی زیور ڈالے گئے وہاں سامری نے بھی اپنا حصہ لا کر ڈالا۔وہ شاید ظاہر یہ کرنا چاہتا تھا کہ میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ تمام زیورات کو گلا کر اینٹوں یا سلاخوں کی شکل دے دی جائے۔لیکن ہمارے اکثر مفسرین نے اس کا جو مطلب لیا ہے اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔لیکن بعض اہلِ علم کے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہے "اور اس طرح سامری نے ڈھال کر پیش کر دیا" ان کا کہنا یہ ہے کہ "القاء" کا لفظ عربی میں وسیع معنوں میں آتا ہے۔یہ جس طرح زمین پر کسی چیز کے ڈال دینے یا پھینک دینے کے معنی میں آتا ہے، اسی طرح پانسہ پھینکنے، کوئی ہنر دکھانے یا کوئی کرتب دکھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سامری نے اپنا کرتب دکھایا۔اور اس کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں ہے۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۙ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾

(پس اس نے ان کیلئے ایک بچھڑے کا ڈھانچہ برآمد کر دیا جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی۔پس انہوں نے کہا یہی تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا بھی معبود ہے، لیکن موسیٰ بھول گئے۔ ۸۸)

سامری کی شعبدہ بازی

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سامری نے ان سادہ لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر تم اپنے سارے زیورات اس بھٹی میں ڈال

Marfat.com

دو اور انہیں گلا کر انہیں کوئی دوسری شکل دے دو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئیں گے۔ تو وہ اپنی سادگی سے اپنے اپنے زیور لا کر اس میں پھینکتے رہے حتیٰ کہ سامری نے اپنے اخلاص کا یقین دلانے کیلئے اپنے زیور بھی پھینکے اور پھر نہایت عیاری سے ان کے پگھلانے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چونکہ یہ ایک ماہر بت گر تھا اس لئے سونے سے ایک بچھڑے کی شکل بنا دینا اس کیلئے کوئی مشکل نہ تھا۔ چنانچہ لوگ تو اس انتظار میں تھے کہ زیورات پگھل کر کوئی ایسی صورت اختیار کر لیں گے جس سے ان کا ساتھ رکھنا آسان ہو جائے گا۔ لیکن اس نے اچانک ایک ایسا بچھڑا نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا جو گائے کی طرح بھاں بھاں کی آوازیں نکالتا تھا۔ ایک ماہر بت گر اور ذہین آدمی کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ وہ ایک ایسا دھڑ جو اندر سے خالی ہو اس میں دو سوراخ اس طرح رکھے کہ جب صحرا کی ہوا اس سے گزرے تو وہ آواز پیدا کرے۔ یہی کام سامری نے کیا۔ اور نہایت معصوم بن کر یہ کہا کہ میں تو زیورات پگھلا رہا تھا، یہ اچانک اس سے بچھڑا برآمد ہوا ہے اور پھر یہ بولتا بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے، لیکن موسیٰ بھول کر اسے کوہِ طور کی چوٹیوں پر تلاش کر رہے ہیں۔

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾

(کیا یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ وہ اختیار رکھتا ہے ان کیلئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا۔ ۸۹)

لوگوں کی سادگی پر تعجب

یہ ان لوگوں کی سادہ لوحی پر تعجب کا اظہار بھی ہے اور دکھ کا اظہار بھی، کہ ان احمقوں نے اسے بھاں بھاں کرتے دیکھ کر خدا سمجھ لیا لیکن وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ اس میں یہ طاقت ہے کہ کسی کا کچھ نقصان کر سکے، کسی کو تکلیف دے سکے یا کسی کو فائدہ پہنچا سکے۔ اللہ تعالیٰ تو کائنات کا خالق و مالک ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق کی زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سب کا روزی رساں ہے۔ وہ اگر سننے اور دیکھنے سے محروم ہے اور نفع و ضرر پر اختیار نہیں رکھتا تو اس کی خدائی کا کائنات کو کیا فائدہ۔ یہ سامری نے جو کچھ بنایا اس کی حیثیت ایک کھلونے کی ہے جو آواز نکالتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ خدا کھلونا نہیں ہوتا، وہ کائنات کا کارساز ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ

مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ
وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا
مُوْسٰى ﴿٩١﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿٩٢﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۗ
اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿٩٣﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ

Marfat.com

إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ
قَوْلِي ﴿٩٤﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا
بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ
لِي نَفْسِي ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ
وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّن تُخْلَفَهُ وَانظُرْ إِلَىٰ إِلَٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ
عَلَيْهِ عَاكِفًا لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾ إِنَّمَا
إِلَٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾ كَذَٰلِكَ
نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِن لَّدُنَّا
ذِكْرًا ﴿٩٩﴾ مَّنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾
خَالِدِينَ فِيهِ وَسَاءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِمْلًا ﴿١٠١﴾ يَوْمَ يُنفَخُ فِي
الصُّورِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿١٠٢﴾ يَتَخَافَتُونَ بَيْنَهُمْ
إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ﴿١٠٣﴾ نَّحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ إِذْ يَقُولُ أَمْثَلُهُمْ
طَرِيقَةً إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾

رکوع: ۵۔ (اور ہارون ان سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اے لوگو! تم اس کے ذریعہ سے فتنے میں ڈال دیئے گئے، تمہارا رب تو رحمٰن ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ ۹۰) وہ بولے کہ ہم تو اب اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آ جائے۔ ۹۱) حضرت موسیٰ نے کہا، اے ہارون! تمہیں کس چیز نے روکا تھا

Marfat.com

جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو رہے ہیں۔ ۹۲) کہ تم میری پیروی نہ کرو، کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔۹۳) حضرت ہارون نے جواب دیا، اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی نہ پکڑ نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا آپؑ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔ ۹۴) اے سامری! (اس فتنہ انگیزی) سے تیری غرض کیا تھی؟ ۹۵) اس نے کہا میں نے وہ چیز دیکھی جو لوگوں نے نہ دیکھی تو میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور پھر اس کو ڈال دیا اور اس طرح میرے نفس نے آراستہ کردی میرے لئے یہ بات۔ (اور اسی طرح میرے نفس نے مجھے سجھایا) ۹۶) موسیٰ علیہ السلام نے کہا چل دُور ہو، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا اور تیرے لئے ایک اور وقتِ موعود بھی ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو ریجھا ہوا تھا، اب ہم اس کو جلائیں گے، پھر اس کو سمندر میں بکھیر دیں گے۔ ۹۷) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ ۹۸) (اے پیغمبر! اسی طرح ہم آپ کو گزرے ہوئے حالات کی خبریں سناتے ہیں اور خاص اپنے پاس سے ہم نے آپ کو ایک ذکر عطا کیا ہے۔ ۹۹) جو اس سے اعراض کریں گے، وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ ۱۰۰) اسی کے وبال میں ہمیشہ گرفتار رہیں گے اور قیامت کے دن یہ بہت بھاری بوجھ ہوگا۔ ۱۰۱) جس دن صور پھونکا جائے گا اور مجرموں کو اس دن ہم اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ خوف کے مارے ان کی آنکھیں نیلی پڑی ہوں گی۔ ۱۰۲) وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ دنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن گزارے ہوں گے۔ ۱۰۳) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے جبکہ ان میں جو سب سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہوگا وہ کہے گا کہ بس زیادہ سے زیادہ ایک دن تم ٹھہرے ہوگے۔ ۱۰۴)

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾

(اور ہارون ان سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اے لوگو! تم اس کے ذریعہ سے فتنے میں ڈال دیئے گئے ہو، تمہارا رب تو رحمٰن ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ ۹۰)

حضرت ہارون علیہ السلام کی فتنہ سے بریت

اس آیتِ کریمہ کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود ہو جسے علمی زبان میں دفع دخلِ مقدر کہتے ہیں۔ بائبل کو دیکھ کر اس عقدہ کا راز کھلتا ہے۔ وہ اس طرح کہ قرآنِ کریم اس سے پہلے یہ بات واضح کر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کو عجل پرستی کی گمراہی میں سامری نے مبتلا کیا تھا، لیکن بائیبل یہ بتاتی ہے کہ یہ گناہِ عظیم کا ارتکاب کرنے والے حضرت ہارون علیہ السلام تھے، سامری نہیں۔ اس کی عبارت یہ ہے (اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لئے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہوگیا؟ ہارون نے ان

Marfat.com

سے کہا، تمہاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آ ؤ۔ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ہارون کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی، تب وہ کہنے لگے، اے اسرائیل یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کیلئے عید ہوگی۔) (خروج باب ۳۲، آیت ۱۔۵)

اس آیت کو غور سے پڑھیئے، یہ تورات کی آیت ہے جسے ہم آسمانی کتاب سمجھتے ہیں۔ حیرانی ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے یہاں نہ جانے نبوت کا کیا تصور ہے، وہ نبی کی حیثیت کیا سمجھتے ہیں۔ اور اگر واقعی ان کے نزدیک نبی دنیا میں توحید کی تبلیغ کیلئے آتے ہیں تو پھر متذکرہ بالا عبارت میں حضرت ہارون علیہ السلام کو نبی سمجھتے ہوئے جس طرح شرک کا داعی ثابت کیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو بت پرستی کی تعلیم دیتا ہے تو آخر اس کی کیا حقیقت ہے۔ قرآنِ کریم نے اس بات کو الزام قرار دیتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کی اس آیت میں بریت فرمائی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل جس طرح گمراہ ہوئے اور انہوں نے عجل پرستی کے گناہِ عظیم کا ارتکاب کیا اس کی ذمہ داری حضرت ہارون علیہ السلام پر نہیں بلکہ سامری پر ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تو پہلے ہی انہیں سمجھا چکے تھے کہ تمہیں سامری نے ایک فتنے میں مبتلا کر دیا ہے، میں اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جانشین ہوں، تمہیں بہر صورت میرا اتباع کرنا چاہئے۔ تمہارا خدا، خدائے رحمٰن ہے۔ یہ گائے کا بچھڑا خدا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس گمراہی میں پڑنے سے اجتناب کرو۔

اہلِ کلیسا کی ہٹ دھرمی

قرآنِ کریم کی اس وضاحت کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ عیسائی دنیا قرآنِ کریم کی ممنون ہوتی اور مسلمانوں کی شکر گزار ہوتی کہ اس نے ہمارے پیغمبر کا دامن ایک بہت بڑے الزام سے پاک کر دیا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ عیسائی مشنری اور مغربی مستشرقین اس بات پر مصر ہیں کہ بائبل میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ البتہ قرآنِ کریم نے غلطی کی ہے۔ اس سے ان کی ہٹ دھرمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے حالانکہ اسی باب میں چند سطر آگے چل کر بائیبل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اس جھوٹ کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ اس باب کی آخری دس آیتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی لاوی کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہِ عظیم کیا ہے انہیں قتل کیا جائے اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اس بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گوسالہ پرستی کا مرتکب ہوا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ہارون علیہ السلام نہ صرف اس گناہ کے مرتکب ہوئے تھے بلکہ بائیبل کے مطابق وہی اس کے سرغنہ تھے تو پھر انہیں قتل کیوں نہ کیا گیا؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ بائیبل میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ ایجادِ بندہ اور کھلی تحریف ہے اور تحریف کرنے والے اگلے آیتوں تک پہنچتے ہوئے بھول گئے کہ ہم اس سے پہلے کیا لکھ چکے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی عزت اور حیثیت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ آگے چل کر ان کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بنی لاوی کی سرداری اور مقدس کی کہانت سے سرفراز کیا گیا۔

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾

(وہ بولے کہ ہم تو اب اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آجائے۔ 91)

حضرت ہارون علیہ السلام کی ساری کوششوں کے باوجود لوگوں کی اکثریت نے آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ آخری بات

Marfat.com

انہوں نے یہ کہی کہ ہم اس عجل پرستی میں راہِ راست پر ہیں یا فتنے میں مبتلا کر دیے گئے ہیں، اس کا فیصلہ اب اس وقت ہوگا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئیں گے۔ ان کے آنے تک ہم اپنی اس روش کو بدلنے کیلئے تیار نہیں، ہم تو برابر عجل پرستی میں لگے رہیں گے۔

قَالَ یٰھٰرُوْنُ مَامَنَعَکَ اِذْ رَاَیْتَھُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ ﴿۹۳﴾ قَالَ
یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ ۚ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ
وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ﴿۹۴﴾

(حضرت موسیٰ نے کہا: اے ہارون! تمہیں کس چیز نے روکا تھا جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو رہے ہیں۔ ۹۲) کہ تم میری پیروی نہ کرو، کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔ ۹۳) حضرت ہارون نے جواب دیا، اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی نہ پکڑ نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا آپؑ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔ ۹۴)

حضرت ہارون علیہ السلام سے پرسش اور ان کا جواب

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے نہایت غضبناک اور افسردہ حالت میں واپس تشریف لائے اور قوم کو عجل پرستی میں مبتلا دیکھ کر نہایت برہم ہوئے۔ سب سے پہلے ان سربرآوردہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو اپنے اپنے قبیلوں کی اصلاح کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے۔ اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف توجہ کی جن پر قوم کی اصلاح کی اصل ذمہ داری تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقیناً یہ خیال رہا ہوگا کہ حضرت ہارون اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، وہ کسی حالت میں بھی کسی برائی سے سازگاری پیدا نہیں کر سکتے، لیکن ان کے سامنے جس طرح ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب ہوا ہے یقیناً ان سے کوئی فروگزاشت ہوئی ہے۔ انہیں جتنی قوت سے انہیں روکنا چاہئے تھا، شاید وہ قوت بروئے کار نہیں لا سکے۔ اس لئے جواب طلبی کرتے ہوئے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ آپؑ کی ڈاڑھی پکڑی اور سر کے بال کھینچے کہ تمہاری موجودگی میں یہ کیا غضب ہو گیا کہ جس قوم کو توحید کی علمبردار بنایا جا رہا تھا، وہ شرک کے دلدل میں دھنس گئی۔ حضرت ہارون علیہ السلام چونکہ آپؑ کے بھائی بھی تھے اور آپؑ کو ان سے غائت درجہ محبت بھی تھی اس وجہ سے اس برہمی میں صرف غضبناکی ہی نہیں دکھائی دیتی بلکہ ایک دکھ اور کرب بھی جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آپؑ نے کہا کہ اے ہارون جب تم نے یہ دیکھا کہ قوم گمراہی کے راستے پر چل پڑی ہے تو تم نے میری پیروی کیوں نہ کی۔ کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ حضرت ہارون کو کوہِ طور جاتے ہوئے اپنا جانشین بنا کر اور یہ حکم دے کر گئے تھے کہ مفسدین کے طریقے کی پیروی نہ کرنا۔ یعنی بنی اسرائیل میں مفسدین کا ایک گروہ موجود ہے۔ انہیں سر اٹھانے کا موقع نہ دینا۔ لیکن حضرت ہارون نے اپنا عذر بیان کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس کی معنویت بھی توجہ کے قابل ہے اور آپؑ نے جو انداز اختیار کیا اس میں صورتِ حالات کے بارے میں گہرے دکھ کا اظہار بھی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے غائت درجہ تعلق کا حوالہ بھی۔ آپ نے کہا کہ ہم نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے، جس کرب سے تم گزر رہے ہو، میں اس کی شدت کو سمجھتا ہوں، لیکن اس کیلئے آپؑ مجھ سے جو سختی کر رہے ہیں اس میں آپؑ کو یہ خیال رہنا چاہئے کہ بنی اسرائیل میں ہمارے دشمن بھی ہیں، وہ ہم پر ہنسیں گے، آپؑ ان کو شماتت کا موقع نہ دیں۔ سورۃ الاعراف میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ رہی یہ بات کہ میں نے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے آپؑ کو یہ معلوم ہونا

Marfat.com

چاہئے کہ میرے ساتھ اتنے تھوڑے لوگ رہ گئے تھے اور سامری نے اتنا بڑا گروہ مہیا کرلیا تھا کہ میں اگر حکمت اور درگزر سے کام نہ لیتا تو اندیشہ تھا کہ یہ لوگ مجھے قتل کرڈالتے، کیونکہ ان کے ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اور اگر میں اپنے پاس موجود قوت کو ساتھ لے کر ان سے قتال کرتا تو بنی اسرائیل میں اس طرح دو مستقل گروہ بن جاتے کہ پھر شاید ان کو ایک کرنا مشکل ہوتا۔ آپؑ کی وجاہت اور معاملہ فہمی سے امید رکھتے ہوئے میں نے خاموشی اختیار کرلی کہ چند دنوں کی بات ہے جب آپؑ آجائیں گے تو آپؑ ضرور کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے اور ویسے بھی آپؑ کی ہیبت کے سامنے یہ لوگ سر اٹھانے کی جرأت نہیں کریں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کے جواب سے استدلال کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ قوم کا اجتماع ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ قوم میں تفرقہ اور اختلاف سے اگر حق کی قیمت پر بھی بچا جاسکتا ہو تو یہ کوئی بڑی قیمت نہیں۔ ان کے نزدیک قوم کا شیرازہ اور ان کا اجتماع حق پرستی سے بڑھ کر ہے۔ اگر ان کی اس بات کو قبول کرلیا جائے تو پھر تو تمام انبیائے کرام کی تبلیغی کوششیں اور تمام مصلحین کی اصلاحی کاوشیں نہ صرف بیکار دکھائی دیتی ہیں بلکہ جرم قرار دی جاسکتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ پر بھی قریش بار بار یہ الزام لگاتے تھے کہ آپؐ کی دعوت نے قوم میں تفریق پیدا کردی ہے۔ ہماری اجتماعی قوت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ انہوں نے اپنی شیرازہ بندی کو باقی رکھنے کیلئے یہاں تک پیشکش کرڈالی کہ ہفتے میں تین دن ہم تمہارے خدا کی پوجا کریں گے اور تین دن تم ہمارے بتوں کی پوجا کرو۔ اس طرح ایک وحدت کی شکل پیدا ہوسکتی ہے اور قوم تفریق سے بچ سکتی ہے، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس تجویز پر غور کرنے سے بھی انکار کردیا کیونکہ:

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾

(اے سامری! (اس فتنہ انگیزی) سے تیری غرض کیا تھی؟ ۹۵) اس نے کہا میں نے وہ چیز دیکھی جو لوگوں نے نہ دیکھی تو میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور پھر اس کو ڈال دیا اور اس طرح میرے نفس نے آراستہ کردی میرے لئے یہ بات (اور اسی طرح میرے نفس نے مجھے سجھایا) ۹۶)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف

اس آیت کے مفہوم میں علماء تفسیر میں خاصا اضطراب پایا جاتا ہے۔ ہمارے قدیم مفسرین کرام کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ سامری نے جوابدہی کرتے ہوئے یہ کہا کہ جب ہم بحر احمر کو عبور کررہے تھے تو وہاں میں نے حضرت جبرائیل امین کو گزرتے ہوئے دیکھا جو ایک گھوڑے پر سوار تھے تو گھوڑے کا قدم جہاں پڑتا تھا، وہاں سبز گھاس اگ آتی تھی۔ میں نے یہ سمجھا کہ اس خاکِ قدم میں حیات بخش اثر ہے۔ چنانچہ میں نے وہاں سے مٹی کی ایک مٹھی بھرلی اور حفاظت سے اپنے پاس رکھ لی۔ جب آپؑ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مجھے یہ خیال سوجھا کہ زیورات کو گلا

Marfat.com

کر ایک بچھڑے کا ڈھانچہ بنایا جائے اور اس میں یہ مٹی ڈالی جائے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس سونے کے ڈھانچے میں مٹی ڈالنے سے زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ بولنے لگا۔

قدیم مفسرین ہی میں سے ایک گروہ اس کا ایک دوسرا مفہوم بیان کرتا ہے۔ اس مفہوم کے اصل پیش کرنے والے تو ابو مسلم اصفہانی ہیں، لیکن امام رازی نے بھی اپنی تفسیر میں اس کا ذکر کیا اور اس کو صحیح ثابت کرنے کیلئے کئی دلائل دیئے۔ علامہ ابی حیان اندلسی نے اس قول کو بحر محیط میں ذکر کیا اور اس کی تردید نہیں کی۔ اسی طرح علامہ نیشاپوری نے بھی اپنی تفسیر میں اسے نقل کیا اور اس پر خاموشی اختیار کی۔ ابو مسلم اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ کا مفہوم یہ ہے کہ "سامری یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے آپ کی تعلیمات پر غور کیا، مجھے اس میں وہ کمزوریاں دکھائی دیں جو دوسرے لوگوں کو دکھائی نہیں دیں۔ اس لئے میں ان کی تصدیق نہ کر سکا۔" فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ کا مطلب یہ ہے کہ "پھر میں آپ کی صحبت میں رہا تو آپ کی صحبت کے اثر کی وجہ سے میں نے ان میں سے کچھ باتوں کو قبول کر لیا، لیکن جب میں نے ان باتوں پر مزید غور کیا فَنَبَذْتُهَا تو میں نے ان باتوں کو پھینک دیا یعنی انہیں بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ میں نے کیا یہ میرے نفس نے سجھایا، کسی اور نے مجھے نہیں اکسایا۔

اس تفسیر میں اور تو کوئی خرابی نہیں لیکن الفاظ سے جس طرح اسے کشید کیا گیا ہے، اسے نرم سے نرم الفاظ میں سخن سازی کی ایک مثال کہا جا سکتا ہے۔ ایک کتاب جو عربی مبین میں نازل ہوئی ہے اس میں ایسے معموں اور پہیلیوں کی گنجائش تو نہیں ہو سکتی۔

بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ سامری نے جو کچھ کہا وہ محض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفت سے بچنے کی ایک کوشش تھی۔ اس کیلئے اس نے ایک خوبصورت بہانہ تراشا اور اسے اپنے کشفی مشاہدے کے طور پر پیش کیا۔ اور اس سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ میرے اندر کچھ ایسی صلاحیتیں بھی ہیں جو دوسروں میں نہیں۔ میں صرف حواس خمسہ اور عقل سے ہی کام نہیں لیتا بلکہ بعض دفعہ کشف کی نگاہ سے بھی دیکھتا ہوں، لیکن ساتھ ہی اس نے اعتراف بھی کر لیا کہ اب مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ محض میرے نفس کا فریب تھا جس کی وجہ سے میں نے فتنہ کھڑا کر دیا اور میں غلطی سے فریب کو کشف سمجھ بیٹھا۔

مزید کچھ علماء کی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ دراصل سامری کے قول کی روایت ہے، لیکن مفسرین اسے امر واقعی اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں، اسی سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔

حقیقت یہ ہے جو شخص بھی اس سلسلۂ کلام میں اس آیت کو پڑھے گا وہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لے گا کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا جس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک زبردست مکر و فریب کی سکیم تیار کی تھی۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی اور ساری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا بلکہ اس پر مزید یہ جسارت بھی کی کہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک پر فریب داستان گھڑ کر رکھ دی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا اور ساتھ ساتھ یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقش قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ہی ہوں جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے رسول کا لفظ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے استعمال کیا تھا تو یہ اس کی ایک اور مکاری تھی۔ وہ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ذہنی رشوت دینا چاہتا تھا تا کہ وہ اسے اپنے نقش قدم کی مٹی کا کرشمہ سمجھ کر پھول جائیں اور اپنی مزید کرامتوں کا اشتہار دینے کیلئے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ قرآن کریم اس سارے معاملے کو

Marfat.com

سامری کے فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اپنی طرف سے بطور واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قباحت لازم آتی ہو اور لغت کی کتابوں سے مدد لے کر خواہ مخواہ کی سخن سازی کرنی پڑے بلکہ بعد کے فقرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس طرح اس کو پھٹکارا ہے اور اس کیلئے سزا تجویز کی ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے گھڑے ہوئے اس پرفریب افسانے کو سنتے ہی انہوں نے اس کے منہ پر مار دیا۔ (تفہیم القرآن)

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَکَ فِی الْحَیٰوۃِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَکَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰۤی اِلٰـهِکَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاکِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾

(موسیٰ علیہ السلام نے کہا چل دُور ہو، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا اور تیرے لئے ایک اور وقتِ موعود بھی ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو ریجھا ہوا تھا، اب ہم اس کو جلائیں گے، پھر اس کو سمندر میں بکھیر دیں گے۔ ۹۷)

سامری کیلئے سزا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کی بات سے اندازہ کرلیا کہ وہ ایک مکار اور فریبی شخص ہے اور ساتھ ہی ساتھ منافق بھی۔ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں کوئی صداقت نہیں ہے اور جو اس نے حرکت کی ہے اس کا سبب یہ نہیں کہ اس نے نقشِ رسول میں زندگی کے آثار دیکھ لئے تھے بلکہ اس کا سبب اس کا نفاق ہے۔ یہ مصر میں ان لوگوں میں شامل رہا ہوگا جو گائے کی پوجا کرتے تھے۔ اب اسی کے زیر اثر اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ان لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنایا جو بنی اسرائیل کی صفوں میں پہلے سے موجود تھے اور اپنی شعبدہ بازی سے ان کو اس حد تک متأثر کیا کہ خالقِ حقیقی کی پرستش سے ہٹا کر گوسالہ پرستی پر لگا دیا۔ تو آپؑ نے اس کی حقیقت کو سمجھ کر اسے ڈانٹ پلائی اور فرمایا کہ تم اس معاشرے سے نکل جاؤ، یعنی تمہاری سزا یہ ہے کہ تم بنی اسرائیل کے معاشرے میں نہیں رہ سکتے۔ تمہارا جرم اس قدر مکروہ ہے کہ اس کے بعد تمہیں انسانوں میں رہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تم اب انسانی آبادی میں نہیں بلکہ جنگلی جانوروں کی طرح جنگل میں زندگی گزارو گے اور جب کسی انسان سے سامنا ہو تو یہ بھی تمہاری سزا کا حصہ ہے کہ تم اسے دیکھتے ہی چیخنا شروع کردو کہ میرے قریب نہ آنا، مجھے ہاتھ نہ لگانا، میں انسانوں سے ملنے کے لائق نہیں۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے قانونی طور پر یہ سزا دی گئی اور اس کی ذمہ داری ٹھہرائی گئی کہ وہ انسانوں سے دور رہے اور اگر کوئی انسان سامنے آئے تو خود اسے یہ بتائے کہ میں سزا یافتہ اور راندہ ہوا شخص ہوں۔ اس لئے مجھے تم سے ملنے کی اجازت نہیں، تم میرے قریب نہ آنا۔

دوسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ اسے کوڑھ کے مرض میں مبتلا کردیا گیا ہو اور کوڑھی کے بارے میں بائبل کی کتاب احبار میں جو قواعد بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک قاعدہ یہ ہے کہ جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے "ناپاک، ناپاک" جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا اور وہ ہے بھی ناپاک۔ بس وہ اکیلا رہا کرے، اس کا مکان لشکرگاہ کے باہر ہو۔ (باب ۱۳، آیت ۴۵۔۴۶)

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کوئی ایسی بیماری پیدا کردی ہو کہ اگر کوئی شخص اسے چھوئے تو اُسے بھی بخار ہوجائے اور اسے بھی۔ اسی بیماری کے پیشِ نظر وہ ہر شخص کو دیکھ کر چلانے لگتا کہ میں ایک نامراد شخص ہوں جس کو ملنے والا بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس

Marfat.com

لئے تم مجھے ہاتھ نہ لگانا ورنہ تم بھی بخار کا شکار ہو جاؤ گے اور میں بھی بخار میں پھنکنے لگوں گا۔

ایک اشکال کا جواب

ممکن ہے کسی ذہن میں یہ خیال آئے کہ تورات اور قرآنِ کریم دونوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے عجل پرستی کا جرم کیا تھا، انہیں قتل کی سزا دی گئی تھی اور سامری تو اس فتنے کا سرغنہ تھا۔ اس کی وجہ سے لوگ اس شرک میں مبتلا ہوئے، تو اسے قتل کی سزا کیوں نہ دی گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ قتل کی تکلیف چند لمحوں کی ہے، لیکن اِسے جو سزا دی گئی وہ تو زندگی بھر کیلئے ہے۔ کسی شخص کو اس سے بڑھ کر سزا نہیں دی جاسکتی کہ وہ ایک ایسی اذیت ناک بیماری میں مبتلا ہو جائے جس کا کوئی مداوئی نہ ہو، اور اسے انسانوں کیلئے جائے نفرت بنا دیا جائے۔ اور مزید یہ کہ وہ اپنے قابلِ نفرت ہونے کا خود اعلان بھی کرے۔ کوڑھیوں کو بھی اگرچہ آبادی سے باہر رکھا جاتا تھا اور ان کی زندگی بھی نہایت المناک ہوتی تھی لیکن ان کی یہ حالت اس وقت تک رہتی تھی جب تک وہ بیماری سے شفایاب نہیں ہو جاتے تھے۔ لیکن سامری کو دی جانے والی سزا کسی معین مدت کیلئے نہیں بلکہ زندگی کی آخری سانس تک کیلئے تھی۔

مزید یہ فرمایا گیا کہ تمہاری یہ سزا تمہاری زندگی میں ہے اور اس سزا کی اندوہنا کی اور اس کا قابلِ نفرت ہونا بجائے خود بہت بڑا عبرت کا سامان ہے لیکن یہ سزا آخری نہیں، تمہارے لئے ایک دن مقرر ہے، یعنی قیامت کا دن، اس دن تم سے اصل جواب طلبی ہوگی اور وہاں کی سزا ابدی سزا ہوگی جس سے تمہیں کبھی رستگاری نہیں ہوگی۔

عجل کا انجام

اصل بنائے فساد وہ بچھڑا تھا جو سامری نے سونے سے ڈھالا تھا، اس کے بارے میں فرمایا کہ دیکھو جسے تم نے خدا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور تم آج تک اس پر اعتکاف کئے بیٹھے ہو اور مسلسل لوگوں کو یہ تصور دے رہے ہو کہ تمہارا اصل خدا یہی ہے۔ اب دیکھو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے اس خدا کا کیا حشر کرتے ہیں، اسے ہم جلائیں گے اور پھر اس کو ریزہ ریزہ کر کے پانی میں بہا دیں گے۔ اگر یہ واقعی خدا ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے اس عبرتناک انجام کو روک دے اور تمہیں بھی اس سزا سے بچالے جس کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے اور یہ سب کچھ تمہارے اس خدا کے ساتھ اس لئے کیا جائے گا تا کہ ان بیوقوف لوگوں کو اندازہ ہو جائے جو تمہارے فریب کی وجہ سے اس عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں کہ یہ ان کا خدا نہیں، محض فریبِ نظر ہے۔

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ ۹۸)

اِلٰہ صرف اللہ ہے، اس پر دلیل

اس سے بڑی جہالت اور کیا ہوگی کہ انسان مخلوقات کا گلِ سرسبد ہونے کے باوجود اسے اپنا معبود بنا لے جسے اس کی خوراک اور ضرورت کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ گائے انسان کو دودھ مہیا کرتی ہے اور گائے کے بچھڑے انسان کی خوراک کے کام آتے ہیں اور بعض دفعہ باربرداری کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ وہ انسان جو ان تمام مخلوقات کا مخدوم بنایا گیا اور جسے اللہ تعالیٰ نے عقل اور

Marfat.com

شعور سے نوازا وہ بیل کی طرح آوازیں نکالنے والے ایک بچھڑے کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے۔اس حماقت اور جہالت کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا معبود اور تمہارا الٰہ وہ اللہ ہے جسے ہر دور میں ہر قوم نے پہچانا۔اللہ اسمِ ذات ہے۔عموماً عبرانی اور سریانی قوموں نے اسی سے ملتے جلتے الفاظ کو اپنے معبود کا نام ٹھہرایا۔اِلٰہیا، الوہیا، الوہ اِلٰہ ہی سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں اور اسی کو الف لام تعریف نے اللہ بنا دیا ہے۔تو وہی اللہ ہے جو تمام مخلوقات کا معبود ہے۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تمام مخلوقات کے نظامِ زندگی کو بناتا، سنوارتا اور اس کی نگرانی کرتا ہے۔جہاں تہاں اس کی مخلوقات آباد ہیں چاہے وہ زمین کے اوپر ہوں یا زمین کے نیچے۔آسمانوں میں ہوں یا فضا میں۔کوئی مخلوق اس کی نگرانی کی نگاہ سے اوجھل نہیں۔وہ ہر ایک کو دیکھتا اور جانتا ہے، ہر ایک کی ضروریات کو پہچانتا ہے۔وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ضروریات کی تبدیلی تک کا لحاظ کرتا ہے۔تو جس ذات کا علم اتنا وسیع ہے وہ اس کی اجازت کیونکر دے سکتا ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو۔حکمران اپنے اقتدار میں دوسروں کو اس لئے شریک کرتے ہیں کہ وہ اپنی مملکت کی وسعتوں کو جان نہیں سکتے۔ایک ایک جگہ اور ایک ایک چیز ان کی نگاہوں میں نہیں ہوتی۔دور دراز علاقوں کی رعایا کی حالت سے وہ بے خبر رہتے ہیں۔اس لئے انہیں ضرورت پڑتی ہے کہ مختلف علاقوں میں اپنے ماتحتوں کو پھیلا دیں اور انہیں اختیارات دے دیں کہ وہ اپنی زیرِ نگرانی رعایا کو ضروریات مہیا کریں۔بڑے سے بڑا بادشاہ اپنی مملکت کی وسعتوں سے کبھی آگاہ نہیں ہوتا اور اپنی تمام رعایا کی خبر اسے کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔اِلّا یہ کہ اس کے تمام عمال جو خود اس نے جگہ جگہ مقرر کر رکھے ہیں وہ رعایا کی اطلاع اسے پہنچائیں اور اس کی اجازت سے سب کی احتیاجات کو پورا کریں۔لیکن اللہ تعالیٰ ان تمام کمزوریوں سے پاک ہے۔اس کی ایسی مخلوقات بھی ہیں جو انسان کی حدودِ علم سے ماورا ہیں۔اللہ تعالیٰ نہ صرف انہیں جانتا ہے بلکہ انہیں روزی بھی مہیا کرتا ہے۔کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اپنے ایسے عالمِ کل اور قادرِ مطلق معبود کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بنایا جائے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾

(اے پیغمبر! اسی طرح ہم آپ کو گزرے ہوئے حالات کی خبریں سناتے ہیں اور خاص اپنے پاس سے ہم نے آپ کو ایک ذکر عطا کیا ہے۔ ۹۹)

سورت کے آغاز اور پیشِ نظر آیات میں ربط

پیشِ نظر آیت اور اس سے پیوستہ آیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس سورت کا آغاز جس موضوع سے ہوا تھا اسی پر اس کا اختتام کیا جا رہا ہے۔سورت کے آغاز میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہم نے یہ قرآن کریم آپؐ پر اس لئے نازل نہیں کیا تھا کہ آپ کسی مشکل میں پڑ جائیں بلکہ اس کے نزول کا سبب تو یہ ہے کہ بگڑی ہوئی نوعِ انسانی کیلئے یہ ایک یاددہانی اور نصیحت ہے لیکن اس کا فائدہ صرف وہ اٹھا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو۔پھر اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کو بیان کیا گیا اور اس میں یہ دکھایا گیا کہ حضرت موسیٰ کو جب اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی تو اس کے بعد ان کو ایک کتاب بھی دی گئی جسے انسانی زندگی کی رہنما بنایا گیا۔لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وہ لوگ ایمان لائے اور اس کتاب سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا جن کے دلوں میں خشیتِ الٰہی تھی۔جادوگروں کے دل میں جب خشیتِ الٰہی کا نور جگمگا اٹھا تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک گئے لیکن فرعون اور آلِ فرعون اپنی نامرادی کے باعث اللہ تعالیٰ کی خشیت سے دور رہے تو وہ نہ صرف ایمان کی دولت سے محروم رہے بلکہ انہوں نے نبی کی نبوت کو ناکام کرنے بلکہ اسے بنی اسرائیل سمیت تباہ کرنے کیلئے بحرِ قلزم تک اس کا تعاقب کیا۔لیکن

Marfat.com

انجام کیا ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے کامیاب و کامران ٹھہرے اور فرعون اور اس کی قوم اپنی حکومت، وجاہت اور دولت کے باوجود بحرِ قلزم کا شکار ہوئے۔ قریش کو اچھی طرح اس بات کو سوچ لینا چاہئے کہ یہ آیات ان کیلئے آئینہ ہیں۔ ان سے ان کو اپنے انجام کو جاننے میں مدد مل سکتی ہے اور انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کامیابی نبی کریم ﷺ اور ان پر ایمان لانے والوں کے انتظار میں ہے کیونکہ قریش کا وہی رویہ ہے جو فرعون اور اس کی قوم کا تھا اور نبی کریم ﷺ وہی دعوت پیش کر رہے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیش کی تھی۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

(جو اس سے اعراض کریں گے، وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ ۱۰۰) اسی کے وبال میں ہمیشہ گرفتار رہیں گے اور قیامت کے دن یہ بہت بھاری بوجھ ہوگا۔ ۱۰۱) جس دن صور پھونکا جائے گا اور مجرموں کو اس دن ہم اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ خوف کے مارے ان کی آنکھیں نیلی پڑی ہوں گی۔ ۱۰۲) وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ دنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن گزارے ہوں گے۔ ۱۰۳) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے جبکہ ان میں جو سب سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہوگا وہ کہے گا کہ بس زیادہ سے زیادہ ایک دن تم ٹھہرے ہو گے۔ ۱۰۴)

قرآنِ کریم سے اعراض کا انجام

جب اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول آتا ہے تو پھر اس پر ایمان لانے اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کی رہنمائی کے قبول کرنے یا نہ کرنے پر لوگوں کی قسمتوں کا انحصار ہوتا ہے اگر وہ قبول کر لیں تو بچ جاتے ہیں، انکار کر دیں اور تمرد اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول پر نازل ہونے والی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی رسالت قیامت تک کیلئے ہے۔ اسی طرح قرآنِ کریم کی رہنمائی بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہے۔ جو شخص اور جو قوم اس کی رہنمائی قبول کرنے سے اعراض کرتی ہے اولاً تو وہ دنیا ہی میں مختلف مصائب کا شکار ہوتی ہے ورنہ جہاں تک قیامت کا تعلق ہے اس دن قرآن وسنت سے پہلوتہی اور اعراض ان کیلئے ایک بہت بڑے بوجھ کا باعث بنے گا۔ یہ ایک ایسا بارِ گناہ ہوگا جس کے وبال سے کبھی انہیں خلاصی نہیں ہوگی اور قیامت کے دن بدترین سزا کا باعث بنے گا۔

Marfat.com

قیامت کا منظر

قیامت کو معمولی بات نہ سمجھا جائے، یہ ایک ایسی ہمہ گیر جوابدہی کا دن ہے جس میں تمام نوع انسانی کے افراد صور پھونکے جانے کے بعد اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور کشاں کشاں میدانِ حشر میں پہنچیں گے۔ بعض لوگوں کو فرشتے ہانکتے اور پیٹتے ہوئے میدانِ حشر میں لے جائیں گے۔ اس دن کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ خوف کے مارے ان کے سارے جسم نیلے پڑ جائیں گے، کیونکہ جب خوف کی وجہ سے خون سکڑ جاتا ہے تو جسم نیلا پڑنے لگتا ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک ''زُرق'' ازرق کی جمع ہے اس سے مراد نیلی آنکھیں ہوتی ہیں یا نیلی آنکھوں والا۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ خوف کی وجہ سے ان کی آنکھیں نیلی اور بے نور ہو جائیں گی، جیسے موت کے وقت پتلیاں نیلی پڑ جاتی ہیں۔ اس لئے اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی شکلیں بگڑ جائیں گی اور ان کے چہرے پر خوف کے گہرے اثرات ہوں گے کیونکہ عرب نیلی اور کرنجی آنکھ کو بدنما سمجھتے تھے۔

قیامت کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ جب لوگ میدانِ حشر میں نہایت بے بسی کے ساتھ خوف کی حالت میں گرفتار ہوں گے تو ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہیں گے کہ دنیا کی زندگی یا برزخ کا دور ہم جو گزار کے آئے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ دس دن کی مدت ہوگی۔ یعنی یا تو اس ہیبت ناک منظر کی وجہ سے دنیا میں قیام کا تصور ان کی نگاہوں میں سمٹ جائے گا اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جس حال میں زندگی کا آخری سانس لیا انہیں صرف وہ یاد ہوگا برزخ کے تصور سے بالکل بے بہرہ ہو جائیں گے۔ وہ محسوس کریں گے کہ جان کنی کے بعد جو ہم پر حالت گزری ہے اس کی مدت زیادہ سے زیادہ دس دن ہوگی۔ لیکن یہ باتیں وہ سرگوشی کے انداز میں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کی سرگوشیوں کو بھی جانتے ہیں۔ اس لئے ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا کہیں گے اور ان کی کیا حالت ہوگی۔ اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ان کا محتاط ترین آدمی جو نہایت سوچ سمجھ کر بات کرنے کا عادی ہے اور یا ان کا بوجھ بجھکڑ جس کو یہ لوگ اپنا دانشور سمجھتے تھے وہ یہ کہے گا کہ دس دن کی مدت تو بہت ہوتی ہے۔ تم تو بصد مشکل دنیا میں ایک دن گزار کے آئے ہو۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ زندگی جو ابدی اور ہمیشہ رہنے والی ہے اور جس کے مقابلے میں دنیا اور برزخ کی زندگی ایک دن کے بھی برابر نہیں، ہم اس ابدی زندگی کے تصور سے بالکل بے خبر اور بے فکر ہیں، لیکن دنیا کے بارے میں نہایت فکر مند، نہایت حساس اور ہر وقت اس کی تیاری میں کھوئے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جو سفر لمبا ہو اس کیلئے تیاری زیادہ کی جائے کیونکہ:

مسافر شب سے اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے

لیکن ہمارا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ

يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا

Marfat.com

عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ
الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ
الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ يَعْلَمُ
مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿١١٠﴾ وَعَنَتِ
الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿١١١﴾ وَمَنْ
يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ
وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ
رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ
لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ ع

رکوع: ٦۔ (اور وہ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب انہیں جڑوں سے اکھیڑ کر پھینک دے گا۔ ١٠٥) پس اس زمین کو چٹیل میدان بنا دے گا۔ ١٠٦) کہ تم اس میں کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے۔ ١٠٧) اس روز سب لوگ پکارنے والے کے پیچھے پیچھے چلیں گے، کوئی روگردانی نہیں کر سکے گا اور آوازیں رحمٰن کے خوف سے خاموش ہو جائیں گی، پس تم نہ سنو گے مگر مدھم سی آہٹ۔ ١٠٨) اس دن کوئی سفارش نفع نہیں دے گی، بجز اس آدمی کے کہ اسے رحمٰن اجازت دے اور اس کے قول کو پسند فرمائے۔ ١٠٩) وہ جانتا ہے لوگوں کے آنے

Marfat.com

والے حالات کو اور گزرے ہوئے واقعات کو، اور لوگ اس کا اپنے علم سے احاطہ نہیں کرسکتے۔ ۱۱۰) لوگوں کے چہرے اس حی و قیوم کے آگے جھک جائیں گے اور نامراد ہوا وہ شخص جس نے ظلم کا بوجھ اٹھایا۔ ۱۱۱) اور جو شخص نیک عمل کرتا ہے اور وہ صاحب ایمان بھی ہے تو اسے اندیشہ نہیں ہوگا کسی حق تلفی یا تعدی کا۔ ۱۱۲) اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا اور اس میں ہم نے اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے واضح کردی تاکہ یہ لوگ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر کچھ سوجھ بوجھ پیدا کریں۔ ۱۱۳) پس، بہت برتر ہے اللہ بادشاہِ حقیقی، پس آپ قرآن کے اخذ میں جلدی نہ کریں اس سے پہلے کہ آپ کی طرف اس کی وحی پوری ہوجائے، اور دعا مانگا کیجئے، میرے رب! (اور) زیادہ کر میرے علم کو۔ ۱۱۴) ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا، سو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ ۱۱۵)

وَيَسْـئَلُوْنَـكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّىْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَـذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾

(اور وہ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب انہیں جڑوں سے اکھیڑ کر پھینک دے گا۔ ۱۰۵) پس اس زمین کو چٹیل میدان بنادے گا۔ ۱۰۶) کہ تم اس میں کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے۔ ۱۰۷)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ نَسْفًا اس کا معنی ہے جڑ سے اکھیڑ دینا، پیس کر رکھ دینا، چھاج میں ڈال کر پھٹکنا۔ آیت میں یہ لفظ جس طرح وارد ہوا ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے ابن الاعرابی نے لکھا ہے **يقلعها قلعا من اصولها ثم يسيرها رملا يسيل سيلا ثم يسيرها كالصوف المنقوش تطيرها الرياح هكذا وهكذا** "انہیں جڑوں سے اکھیڑ کر ریت کی طرح پیس کر رکھ دے گا۔ پھر دھنی ہوئی اون کے گالوں کی طرح ہوائیں انہیں اڑا کرلے جائیں گی اور ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔"

قَاعًا ...... ہموار میدان۔ صَفْصَفًا ...... چٹیل میدان، جس میں کوئی چیز اگی ہوئی نہ ہو۔ عِوَجًا ...... کجی، موڑ، بل، اَمْتًا ...... چھوٹا ٹیلہ، سلوٹ۔

اعتراض کا جواب

مشرکینِ مکہ میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے تھے۔ ایک تو وہ تھے جو بالکل قیامت کے منکر تھے اور دوسرے وہ تھے جو اگرچہ قیامت آنے کا یقین نہیں رکھتے تھے لیکن انکار بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ قیامت کے وقوع پر قسم قسم کے اعتراضات کرتے تھے اور اسے خلافِ عقل سمجھتے تھے۔ انہیں اعتراضوں میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ کہتے ہیں کہ قیامت کا پہلا مرحلہ یہ ہوگا جو نفخۂ اولیٰ سے شروع ہوگا کہ ہر چیز تباہ و برباد ہوجائے گی، زمین بھی ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور کوئی چیز اپنی جگہ سلامت نہیں رہے گی۔ حالانکہ پہاڑ ایسے مستحکم گڑے ہوئے ہیں کہ انہیں کوئی اکھیڑ نہیں سکتا اور بعض اہلِ علم کے نزدیک عرب پہاڑوں کو غیر فانی سمجھتے تھے۔ تو ان کی موجودگی اور ایستادگی کے باوجود زمین کیسے ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ بالخصوص شہر مکہ کو وہ جب دیکھتے تھے کہ پیالے کی مانند چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے تو وہ پوری زمین کو پہاڑوں میں گھرا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اس لئے جب بھی زمین کی شکست و ریخت کی بات ہوتی تو سب سے پہلے ان کے ذہن میں پہاڑوں کا سوال

Marfat.com

پیدا ہوتا تھا۔اس کے جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ تم پہاڑوں کو ایسا جما ہوا سمجھتے ہو کہ کوئی انہیں اکھیڑ نہیں سکتا حالانکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ کوئی بعید نہیں کہ وہ انہیں اس طرح تباہ و برباد کرے کہ کوٹ پیٹ کر انہیں ریزہ ریزہ کر دے۔اور پھر دھنی ہوئی اون کے گالوں کی مانند ہوا میں اڑتے پھریں اور زمین کو بالکل سپاٹ اور ہموار میدان بنا دیا جائے کہ اس میں نہ کوئی نشیب رہے اور نہ فراز۔نہ کوئی بل باقی رہے نہ کوئی سلوٹ۔کہیں کوئی موڑ دکھائی نہ دے اور کوئی ٹیلہ نظر نہ آئے۔

عالم آخرت میں زمین کی جو نئی شکل بنے گی اسے قرآن مجید میں مختلف مواقع پر بیان کیا گیا ہے۔سورۂ انشقاق میں فرمایا اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ''زمین پھیلادی جائے گی۔''سورۂ انفطار میں فرمایا اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ''سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے۔''جس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ سمندروں کی تہیں پھٹ جائیں گی اور سارا پانی زمین کے اندر اتر جائے گا۔ سورۂ تکویر میں فرمایا اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ''سمندر بھر دیئے جائیں گے یا پاٹ دیئے جائیں گے۔''اور یہاں بتایا جا رہا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے ساری زمین ایک ہموار میدان کی طرح کر دی جائے گی۔اس سے جو شکل ذہن میں بنتی ہے وہ یہ ہے کہ عالمِ آخرت میں یہ پورا کرۂ زمین سمندروں کو پاٹ کر، پہاڑوں کو توڑ کر، نشیب و فراز کو ہموار اور جنگلوں کو صاف کر کے بالکل ایک گیند کی طرح بنا دیا جائے گا۔یہی وہ شکل ہے جس کے متعلق سورۂ ابراہیم آیت ۴۸ میں فرمایا یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ ''وہ دن جبکہ زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی۔''اور یہی زمین کی وہ شکل ہوگی جس پر حشر قائم ہوگا اور اللہ تعالیٰ عدالت فرمائے گا۔پھر اس کی آخری اور دائمی شکل وہ بنا دی جائے گی جس کو سورۂ زمر آیت ۷۴ میں یوں بیان فرمایا گیا: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ، فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ یعنی متقی لوگ'' کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے اپنے وعدے پورے کئے اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا، ہم اس جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کیلئے۔''اس سے معلوم ہوا کہ آخر کار یہ پورا کرہ جنت بنا دیا جائے گا اور خدا کے صالح و متقی بندے اس کے وارث ہوں گے۔اس وقت پوری زمین ایک ملک ہوگی۔پہاڑ، سمندر، دریا، صحرا، جو آج زمین کو بے شمار ملکوں اور وطنوں میں تقسیم کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ انسانیت کو بھی بانٹے دے رہے ہیں، سرے سے موجود ہی نہ ہوں گے۔ (واضح رہے کہ صحابہ و تابعین میں سے ابنِ عباسؓ اور قتادہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جنت اسی زمین پر ہوگی اور سورۂ نجم کی آیت عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہ جنت ہے جس میں اب شہداء کی ارواح رکھی جاتی ہیں)۔ (تفہیم القرآن)

یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾

(اس روز سب لوگ پکارنے والے کے پیچھے پیچھے چلیں گے، کوئی روگردانی نہیں کر سکے گا اور آوازیں رحمٰن کے خوف سے خاموش ہو جائیں گی، پس تم نہ سنو گے مگر مدھم سے آہٹ۔ ۱۰۸)

هَمْسًا ......مدھم آواز، پاؤں کی آہٹ کو بھی کہتے ہیں۔چپکے چپکے بولنے کی آواز۔

Marfat.com

خودسروں کا انجام

آنخضرت ﷺ جب مکے کے لوگوں کے سامنے قرآن پڑھتے تو وہ اس قدر شور مچاتے کہ قرآن کی آواز دب جاتی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ قرآنِ کریم چونکہ اپنے اندر بے پناہ تاثیر رکھتا ہے، اگر یہ کانوں میں پڑے گا تو اثر کئے بغیر نہ رہے گا۔ اس کی تاثیر سے بچنے کیلئے ایک ہی طریقہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو شور مچاؤ تاکہ اس کی آواز کانوں میں نہ آنے پائے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ جب قریش کے سامنے دین کی دعوت پیش کرتے تو وہ سیدھے منہ بات سننے کے روادار نہ ہوتے۔ الٹے سیدھے سوالات کرتے اور پھبتیاں کستے اور ان کی گردنیں بجائے جھکنے کے اور اکڑتی چلی جاتیں۔ اس آیتِ کریمہ میں اس صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ آج ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ ان کی سرکشی بڑھتی ہی چلی جارہی ہے لیکن قیامت کے روز جب انہیں پکارنے والا میدانِ حشر کی طرف نکلنے کی ندا دے گا تو یہ نہایت خاموشی سے اور سر جھکا کر اس کی پیروی کریں گے۔ کیا مجال ہے جو کوئی ان میں روگردانی کر سکے یا کجی دکھا سکے۔ اس روز ان کی ہر طرح کی سرکشی قصۂ پارینہ بن جائے گی اور ان کی زبانیں اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے خاموش ہو جائیں گی۔ بے شمار مخلوقات کی موجودگی کے باوجود ہیبت اور خوف کا عالم یہ ہوگا کہ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دے گی اور اگر کوئی آواز کانوں میں پڑے گی بھی تو وہ صرف چلنے والوں کے قدموں کی آواز ہوگی، اس کے علاوہ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ وہ منہ سے کوئی لفظ نکال سکے۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾

(اس دن کوئی سفارش نفع نہیں دے گی، بجز اس آدمی کے کہ اسے رحمٰن اجازت دے اور اس کے قول کو پسند فرمائے۔ ۱۰۹)

شفاعت کا صحیح تصور

قیامت کے حوالے سے عربوں میں جو گمراہیاں پائی جاتی تھیں اور جن کی وجہ سے انہیں قیامت کی پرواہ تک نہ تھی ان میں سے ایک گمراہی یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر واقعی قیامت آ ہی گئی تو ہمیں اس کی کیا پرواہ ہے کیونکہ جن قوتوں کو ہم نے آج تک اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک سمجھ کر پکارا ہے اور ہمیشہ ان کی پوجا کی ہے وہ قیامت کے دن ہماری سفارش کریں گی اور ان کی سفارش ہمارے لئے نجات کی ضامن ہو گی۔ عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھ کر پوجتے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ بیٹیاں عام طور پر اپنے باپ کو ضد کر کے منا لیا کرتی ہیں۔ اگر پروردگار نے ہمیں عذاب دینے کا ارادہ کیا تو یہ بیٹیاں اللہ تعالیٰ سے ضد کر کے ہمیں چھڑا لیں گی۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے پروردگار نے فرمایا کہ تم نے نہ جانے اپنے پروردگار کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ اس کی ذات اتنی عظیم ہے کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کو اس کے دربار میں دم مارنے کی مجال نہیں ہوگی۔ فرشتے ہوں یا اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے وہ قیامت کے دن دست بستہ اور لب بستہ کھڑے ہوں گے۔ ان کے چاہنے والے انہیں اپنی طرف متوجہ کریں گے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ کسی کی یہ ہرگز مجال نہیں ہوگی کہ وہ اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی کی سفارش کرنا شروع کر دے۔ سفارش کرنے کی سعادت صرف اسے حاصل ہوگی جسے اللہ تعالیٰ نے اذن دیا ہوگا۔ اور دوسری یہ بات کہ جن عظیم شخصیتوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لب کشائی کی اجازت ملے گی وہ بھی صرف ان لوگوں کی شفاعت کر سکیں گے جن کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اذن دیا جائے گا اور جن کیلئے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے گا کہ ان کی شفاعت کی جائے۔ اور

Marfat.com

وہ جو کہنا چاہیں گے اللہ تعالیٰ وہ سننا پسند بھی فرمائے اور بعض اہلِ علم کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ قول سے مراد کلمۂ شہادت ہے یعنی جس شخص کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہوگا اللہ تعالیٰ اس کیلئے سفارش کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔ اس لئے حدیث میں آتا ہے کہ بعض ایسے لوگ بھی ہوں گے جو جہنم میں جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے لیکن ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہوگا تو کبھی نہ کبھی ایسا وقت آئے گا کہ نبی کریم ﷺ ان کی شفاعت فرمائیں گے تو انہیں حوضِ کوثر پر لا کر ڈال دیا جائے گا۔ آپ ان پر حوضِ کوثر سے جام بھر بھر کر ڈالنا شروع کریں گے تو وہ آہستہ آہستہ اس طرح زندگی سے آشنا ہوں گے جیسے برسات کے دنوں میں جھلسی ہوئی زمین اور مرا ہوا غلہ زندگی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

شفاعت کی بنیاد ایمان و عمل پر ہے۔ ان دونوں میں کمی اور نقصان کے باعث نجات کا معاملہ ملتوی ہو جاتا ہے۔ جس شخص کے عمل میں کچھ کمی رہی ہوگی، شفاعت اس کی کمی کی تلافی کرے گی اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائیں گے۔ لیکن جس شخص نے شفاعت کے غلط تصور پر بھروسہ کرتے ہوئے نہ ایمان کی تفصیلات کو جانا اور نہ عمل سے اس کی آبیاری کی، اسے کوئی شفاعت میسر نہیں آئے گی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿١١٠﴾

(وہ جانتا ہے لوگوں کے آنے والے حالات کو اور گزرے ہوئے واقعات کو، اور لوگ اس کا اپنے علم سے احاطہ نہیں کر سکتے۔ ۱۱۰)

شفاعت کے صحیح تصور پر دلیل

اس آیتِ کریمہ میں شفاعت کی علی الاطلاق اجازت نہ دینے کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ دنیا میں قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کو کسی افسر کی جانب سے سزا ملتی ہے تو وہ افسر کے جاننے والوں بلکہ اس پر اثر رکھنے والوں کو تلاش کرتا ہے اور جب کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے تو وہ اسے درخواست کرتا ہے کہ آپ براہِ کریم میری سفارش کر کے میری سزا معاف کرا دیں۔ سفارش کرنے والا سزا دینے والے افسر کے پاس جا کر دو کام کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ آپ کے پاس سزا پانے والے شخص کی جو اطلاعات پہنچی ہیں وہ مبنی بر حقیقت نہیں۔ لوگوں نے آپ کو غلط معلومات پہنچائی ہیں اور یا سنی سنائی باتیں کہہ دی گئی ہیں۔ آپ چونکہ براہِ راست مذکورہ شخص سے آگاہ نہیں ہیں اور اس کے حالات سے کما حقہ واقف نہیں ہیں اس لئے آپ نے موجود اور دستیاب معلومات کی بنیاد پر اسے سزا دے دی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ میں آپ کو یقین دلاؤں کہ میں اس کے حالات کو خوب جانتا ہوں۔ میں اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر یہ سفارش کر رہا ہوں کہ وہ شخص بے گناہ ہے، آپ سے معاف کر دیں۔ سزا دینے والا افسر چونکہ حالات سے براہِ راست واقف نہیں ہوتا اس لئے وہ ایسی سفارشوں کی بنیاد پر بعض دفعہ اپنا فیصلہ واپس لے لیتا ہے اور یہی انصاف کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے بارے میں بھی بالواسطہ معلومات کا محتاج نہیں۔ اس کا علم سہاروں سے بے نیاز ہے۔ جنگل میں کوئی پتا بھی گرتا ہے تو وہ اس سے بھی واقف ہے اور سمندر کی گہرائی میں کوئی مچھلی حرکت کرتی ہے تو وہ اسے بھی دیکھتا ہے۔ کوئی شخص ہزار تنہائیوں اور تاریکیوں میں چھپ کر کوئی کام کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں اسے دیکھتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی شخص اس کے پاس جا کر یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ کی معلومات بالواسطہ ہیں، آپ براہِ راست حالات سے واقف نہیں اور میں آپ کے پاس صحیح حالات کا علم لے کر آیا ہوں۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اگلے اور پچھلے حالات سے واقف ہے۔ اور کوئی دوسرا شخص اس طرح کسی

Marfat.com

کے حالات سے واقف نہیں ہوسکتا۔ تو پھر کوئی سفارش کی جرأت کرے تو کیوں کر؟ ایسی صورتحال میں ایک ہی شکل باقی رہ جاتی ہے کہ جو شخص بھی شفاعت کرے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے کرے۔ اور وہ بات کہے جو حقیقت پر مبنی ہو اور اللہ تعالیٰ اسے سننا پسند بھی فرمائے۔ اور یہ شفاعت اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ حالات سے آگاہ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کیلئے ایک اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جائے گا۔

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾

(لوگوں کے چہرے اس حیی قیوم کے آگے جھک جائیں گے اور نامراد ہوا وہ شخص جس نے ظلم کا بوجھ اٹھایا۔ ۱۱۱)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

سفارش کرنے والا دوسرا کام یہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اثر استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سزا دینے والے افسر کو یہ احساس دلاتا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے اگر تم نے میری سفارش قبول نہ کی تو یہ رشتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اور پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ جس طرح میں ایک کام کیلئے تمہارے پاس آیا ہوں ایسے ہی کئی کام تمہیں بھی میرے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ کیونکہ میں بھی ایک مؤثر مسند پر فائز ہوں اور ایک خاص حیثیت کا مالک ہوں۔ اگر تم نے میری بات کو قبول نہ کیا تو تم اپنا نقصان کرو گے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش کیلئے حاضر ہونے والا کوئی شخص بھی ایسی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے سب مقبول بندے اور اس کے یہاں بڑا تقرب رکھنے والے اس کے سامنے ادنیٰ بندوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ جس قدر کوئی معرفتِ حق سے بہرہ ور ہے اتنا ہی وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجز سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اس کے قلب ونگاہ میں بسی رہتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ تم جن لوگوں کی شفاعت پر بھروسہ کر کے یہ سمجھتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اثر انداز ہوسکتے ہیں کیونکہ وہ بڑی حیثیتوں کے مالک ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سب لوگوں کے چہرے اور سب لوگوں کی شخصیتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اور سب اس کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں اور اسی سے پناہ مانگتے رہتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ تم نے پروردگار کے بارے میں یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس نے اپنے سارے اختیارات ان قوتوں کو دے رکھے ہیں جنہیں تم اپنی ضرورتوں کیلئے پکارتے ہو اور خود وہ عضوِ معطل بن کر کائنات کے کسی گوشے میں آرام کر رہا ہے اور یا فلاسفہ کے نزدیک اس کی حیثیت علۃ العلل کی ہے جو ایک دفعہ کائنات کو حرکت دے کر اب تماشا دیکھ رہا ہے۔ جس طرح ایک بوڑھا آدمی اپنے بڑھاپے کے باعث گھر میں بیکار چیز ہو کر رہ جاتا ہے مشرکین نے بھی پروردگار کو ایسا ہی سمجھ رکھا تھا۔ اس لئے فرمایا کہ حیی اور قیوم ہے۔ وہ زندہ خدا ہے اور باقی ہر زندہ مخلوق کی زندگی اس کے حکم سے بندھی ہوئی ہے۔ بے شمار کُرّے آسمان کی وسعتوں میں محوِ پرواز ہیں لیکن یہ آپس میں کبھی متصادم نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس قیوم ذات نے انہیں سنبھالا ہوا ہے۔ کائنات کا ہر گوشہ اس کے حکم سے زندہ اور اپنے فرائض ادا کر رہا ہے اور کوئی چیز اس کی نگرانی کی نگاہ سے باہر نہیں۔ کوئی چیز اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتی۔ ہر مخلوق اس کے تکوینی نظام میں بندھی ہوئی ہے۔ جو ذات اس قدر قوتوں کی مالک اور اس قدر عظمتوں کی حامل ہے تم اس کے بارے میں یہ سمجھتے ہو کہ جو شخص چاہے گا وہ منہ اٹھائے اس کے پاس شفاعت کیلئے پہنچ جائے گا۔

مزید فرمایا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی بہت بڑا جرم ہے لیکن شرک اس کے نزدیک ایسا جرم ہے جس کی کوئی تلافی نہیں اور جسے پروردگار کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ اس لئے فرمایا کہ جس شخص نے ظلم کا بار اپنے سر پر اٹھالیا، وہ نامراد ہوگیا اور قرآنِ کریم کی وضاحت کے مطابق شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم جب عقیدے کے حوالے سے ظلم کا لفظ بولتا ہے یا زند

Marfat.com

کے مجموعی رویئے کو اس لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو اس سے مراد شرک ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾

(اور جو شخص نیک عمل کرتا ہے اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہے تو اسے اندیشہ نہیں ہوگا کسی حق تلفی یا تعدی کا۔ ۱۱۲)

نجات پانے والے

اللہ تعالیٰ کے یہاں نجات کا راستہ وہ نہیں جو مشرکین نے سمجھ رکھا ہے کہ ساری زندگی عیش و عشرت اور اتباعِ ہوا میں گزار کر یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے ان کی شفاعت ہماری نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔ یہ تصور عقل کے لحاظ سے بھی کس قدر مہمل ہے کیونکہ زندگی اور پھر اس میں حواس اور عقل جیسی نعمت اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتیں اس لئے تو نہیں دی گئیں کہ انسان خواہشات کے اتباع میں زندگی گزار کر یہاں سے رخصت ہو جائے اور زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے تو پھر تو یہ کہنا پڑے گا کہ انسان جو کائنات کا گلِ سرسبد ہے اس کی تخلیق فعلِ عبث کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند ہے کہ وہ عبث کام کرے۔ یقیناً اس زندگی اور ان بے پایاں نعمتوں کا کوئی مقصد ہے جس کے حوالے سے کل کو باز پرس ہونے والی ہے۔ اس لئے نجات یا عدمِ نجات کا تعلق اگر کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس زندگی اور ان نعمتوں کے حوالے سے ہے جن سے انسان کو بہرہ ور کیا گیا ہے۔ اس لئے یہاں نہایت اصولی بات فرمائی گئی کہ اس شخص کی نامرادی میں کوئی شبہ نہیں جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کو پہچاننے کی بجائے شرک کا رویہ اختیار کیا۔ اور بندگانِ خدا سے بہتر تعلقات رکھنے کی بجائے ظلم کا طریقہ اپنایا۔ البتہ نجات صرف ان لوگوں کیلئے ہے جنہوں نے ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ زندگی گزاری۔ یعنی انہوں نے مقصدِ زندگی کو سمجھا، اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی، اس کے احکام کو جانا اور اپنے آپ کو اس پر قربان کر دیا۔ یہی وہ میرٹ ہے جس پر آخرت میں کامیابی کا دارومدار ہے۔ یہاں اسی میرٹ کو بیان فرمایا گیا کہ آخرت میں ہر طرح کی حق تلفی اور ہر طرح کی تعدی اور زیادتی کے اندیشے سے صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جس نے ایمان کی دولت پائی اور عملِ صالح سے اسے پروان چڑھایا۔ اور اعمال کئے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کا محتسب جانا اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو رہنما بنایا۔ ایسے لوگوں کا یقیناً یہ حق ہے کہ وہ دنیا میں حیاتِ طیبہ سے نوازے جائیں اور آخرت میں انہیں وہ فوز و فلاح نصیب ہو جس کی امید پر انہوں نے زندگی میں تلخیاں برداشت کی تھیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾

(اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا اور اس میں ہم نے اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دی تاکہ یہ لوگ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر کچھ سوجھ بوجھ پیدا کریں۔ ۱۱۳)

قرآنِ عربی کا مفہوم

اس سے پہلے آیت ۹۹۔۱۰۰ میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے آپ ؐ کو اپنی طرف سے ایک ذکر عطا کیا ہے جو اس سے اعراض کریں گے وہ

Marfat.com

قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ کا عطف انہی آیتوں پر ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی مضمون پر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے جو قرآنِ کریم نازل کیا ہے اور جس پر تمام انسانوں کی نجات کا دارومدار ہے ہم نے اس میں دو صفات ایسی رکھی ہیں جو سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے۔ یہ خطاب براہِ راست اہلِ مکہ سے ہو رہا ہے اور ان کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو عربی زبان بولتے ہیں۔ تو قرآنِ کریم کے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس کا فہم اور ادراک ان کیلئے آسان ہو گیا ہے اور مزید یہ کہ اسے نازل بھی اس عربی زبان میں کیا گیا ہے جو قریش کی زبان ہے۔ اس کے محاورات، اس کی تلمیحات حتیٰ کہ اس کا روزمرہ وہی ہے جسے قریش پہلے سے جانتے ہیں۔ اس کی آیاتِ رحمت اور آیاتِ عذاب کے مدلولات کو سمجھنا ان کیلئے کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے باہمی ربط وضبط اور اس کے اسالیب کا صحیح ادراک ان کیلئے سامنے کی بات ہے۔ اب یہ لوگ یہ عذر نہیں کر سکتے کہ ہم قرآنِ کریم کی دعوت سے اس لئے فائدہ نہ اٹھا سکے کہ وہ ایک ایسی زبان میں تھا جسے ہم نہیں سمجھ سکتے تھے۔

قرآنِ کریم کا عربی زبان میں نازل ہونا جس طرح عربوں کیلئے سہولت کا باعث تھا اسی طرح یہ اتمامِ حجت کا ذریعہ بھی تھا۔ جس طرح آخری رسول کا ان کی طرف مبعوث ہونا اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے لیکن ساتھ ساتھ اتمامِ حجت بھی ہے اسی طرح قرآنِ کریم کا عربی زبان میں آنا رحمت ہونے کے ساتھ ساتھ اتمامِ حجت بھی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کیلئے عربوں کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہے گا۔

تصریفِ وعید کا مفہوم

دوسری صفت یہ ہے کہ ہم نے عربی قرآن کی صورت میں جس طرح اپنی دعوت کو ان کے ذہنوں کے قریب اور ان کیلئے آسان کر دیا اسی طرح ہم نے گوناگوں انداز میں مختلف پیرایہ ہائے بیان بدل کر انہیں تنبیہات بھی کیں۔ مختلف معذب قوموں کے تذکروں سے انہیں جھنجھوڑا گیا اور زندگی کے مختلف نمونوں سے ان کی زندگیوں میں ارتعاش پیدا کرنے کوشش کی تاکہ ان کے اندر اپنی ڈگر سے ہٹ کر نئے طریقے سے سوچنے کی امنگ پیدا ہو۔ یہ اپنی زندگی کے غیر سنجیدہ رویئے کو بدلنے پر آمادہ ہو سکیں اور یہ تاریخ کے آئینہ میں اپنی زندگیوں کے حُسن وقبح اور اپنے ہولناک انجام کی تصویر دیکھ سکیں۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

(پس، بہت برتر ہے اللہ بادشاہِ حقیقی، پس آپؐ قرآن کے اخذ میں جلدی نہ کریں اس سے پہلے کہ آپؐ کی طرف اس کی وحی پوری ہو جائے، اور دعا مانگا کیجئے، میرے رب! (اور) زیادہ کر میرے علم کو۔ ۱۱۴)

اللہ تعالیٰ بہت بزرگ و برتر ہے، وہ انسانوں کی پرستش اور بندگی کی حاجت نہیں رکھتا۔ سارے انسان بھی گمراہ ہو جائیں، اس کی الوہیت اور حاکمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود اگر وہ انسانوں کی ہدایت کیلئے اس قدر رحمت کا سلوک فرماتا ہے جیسا کہ متذکرہ بالا آیت میں گزر چکا، تو یہ سراسر اس کا کرم اور اس کی عنایت ہے۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو ہدایت

وہ ذات اس قدر عظیم اور بلند ہے کہ انسان براہ راست اس سے ہدایت اخذ نہیں کرسکتا۔ انسانی صلاحیتیں اس کی رویت اور اس کے سماع پر دسترس نہیں رکھتیں۔ اس لئے اس نے انسانوں کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اپنے پیغمبر بھیجے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے ان کے دلوں پر اپنا کلام اتارا۔ پیغمبر بھی انسان ہی ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ انہیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازتا ہے اور ان کو ایسا حوصلہ عطا فرماتا ہے کہ وہ اس کے کلام کا جو وحی کی صورت میں ان پر نازل ہوتا ہے تحمل کرسکیں۔ آنحضرت ﷺ پر بھی اسی طرح قرآنِ کریم نازل کیا گیا۔ چنانچہ جب قرآنِ کریم حضرت جبرائیل علیہ السلام لے کر نازل ہوتے تھے تو کلامِ خداوندی سے غائت درجہ شوق، شغف اور محبت کے باعث آنحضرت ﷺ پر ایک بیتابی کی کیفیت طاری ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپؐ کو اس بات کا شدید احساس رہتا کہ جیسی کامل توجہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے سماع میں ہونی چاہئے اس میں کمی نہ آنے پائے۔ اور پھر اس کے یاد کرنے میں بھی کوئی کمزوری نہ رہ جائے۔ ایک طرف کلامِ خداوندی کا جلال اور اس پیغام کی عظمت، دوسری طرف آنحضرت ﷺ کا شوق اور شغف اور ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی کہ کہیں کوئی لفظ میرے حافظے میں محفوظ ہونے سے نہ رہ جائے اس سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی جو آنحضرت ﷺ پر بہت شاق گزرتی اور بڑی گرانی کا باعث بنتی۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت محبت سے مزید کرم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب جبرائیل ہمارا کلام لے کر اتریں تو آپؐ نہایت اطمینان سے اسے سنیں۔ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ کیونکہ اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا اور پھر اس کا بیان کرانا یہ سب ہماری ذمہ داری ہے۔ آپؐ اس خیال میں مبتلا نہ ہوں کہ کوئی آیت آپؐ کے حافظے میں پیوست ہونے سے رہ جائے گی۔ یہ وہ بات ہے جو سورۂ قیامہ میں فرمائی گئی تھی۔ اب اسی کا اعادہ کرتے ہوئے پھر یاد دہانی فرمائی گئی ہے کہ آپؐ قرآنِ کریم کے اخذ کرنے میں شوق و اضطراب کا غیر معمولی اظہار نہ کریں بلکہ وحی کے ختم ہونے کا انتظار کریں۔ اس کے بعد آپؐ دیکھیں گے کہ جو کچھ وحی کیا گیا ہے، وہ سب کچھ آپؐ کے حافظے میں محفوظ ہے۔ البتہ آپؐ کے شوق و اضطراب کیلئے یہ بات کفایت کرتی ہے کہ آپؐ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اپنے علم میں افزونی کیلئے دعا کرتے رہیں۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

(ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا، سو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ ۱۱۵)

ربطِ کلام

سابقہ آیاتِ کریمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان کرنے کے بعد یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل اور اہلِ مصر کی ہدایت کیلئے رسول بنا کر بھیجا اور پھر انہیں تورات دینے کیلئے کوہِ طور پر بلایا اور وہ جاتے ہوئے اپنی قوم کو بتا کر گئے کہ میں تمہارے لئے ایک ہدایت نامہ لینے کیلئے جا رہا ہوں جس سے ہمیشہ تم رہنمائی حاصل کرسکو گے۔ لیکن قوم نے اس ہدایت نامہ کا انتظار کرنے کی بجائے عجل پرستی میں مبتلا ہو کر ایک ایسی گمراہی کا راستہ کھولا جس کیخلاف برسوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں تیار کر رہے تھے۔ اس کے بعد ان واقعات کے اختتام پر آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں نے آپؐ کو اپنی طرف سے قرآنِ کریم کی شکل میں ایک نصیحت اور یاد دہانی سے نوازا ہے تاکہ آپؐ کی قوم اور باقی اہلِ دنیا اس گمراہی میں مبتلا نہ ہوں جس میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے۔ مزید

Marfat.com

یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نازل ہونے والے ذکر پر آئندہ دنیا کی زندگی کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس پر عمل کریں گے تو یہاں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں گے۔ لیکن اگر انہوں نے اس ذکر سے اعراض کیا اور ہوائے نفس کی پیروی کی تو پھر یہاں بھی انہیں برے انجام سے واسطہ پڑے گا اور آخرت میں ان کا بارِ گناہ ان کیلئے ایک ایسا وبال بن جائے گا جس سے وہ کبھی نجات نہ پا سکیں گے۔

اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ ہم اس وقت جو نصیحت آپ کے واسطے سے آپ کی قوم کو کر رہے ہیں کہ تمہاری کامیابی کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت کے اتباع میں ہے۔ یہ بات کوئی نئی نہیں، ہم نے تخلیقِ آدم کے فوراً بعد انہیں یہی بات بتلائی تھی اور ان کے واسطے سے ان کی اولاد کو اس کا پابند بنایا گیا تھا، لیکن حضرت آدم علیہ السلام جس طرح ایک حکم کی اطاعت میں نسیان کا شکار ہوئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اولادِ آدم نے اگر ان کمزوریوں پر قابو نہ پایا تو وہ بھی بار بار اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے سلسلے میں نسیان کا شکار ہوں گے، جس کا انجام بہت خطرناک ہے۔

ابلیس کی بات ماننے کا سبب

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا تھا، پھر انہیں ان علوم و معارف سے آگاہ کیا تھا جس سے فرشتے بھی بے خبر تھے۔ انہیں اس حد تک قدر و منزلت سے نوازا گیا کہ جنت ان کا مسکن ٹھہری اور ان کا دل بہلانے کیلئے حضرت حوا کو ان کے ساتھ رکھا گیا۔ البتہ! یہ بات ضرور ہے کہ وہ ایک انتہائی پاکیزہ ماحول اور گناہ کی ہر آلودگی سے دور جنت میں رہنے کے باعث گناہ کے کسی محرک سے ہرگز آگاہ نہ تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ خدع و فریب کیا ہوتا ہے اور کس طرح اس کے حملوں سے بچا جا سکتا ہے۔ بنا بریں اپنی تمام تر قدر و منزلت کے باوجود جب شیطان نے انہیں بہکانے کیلئے تزویر کے آلات سے ان پر حملہ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو یاد نہ رکھ سکے جو انہیں ایک درخت کے پھل سے اجتناب کا دیا گیا تھا، حالانکہ اچھی طرح بتا دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے وہ کسی وقت بھی تم پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ لیکن حضرتِ آدم علیہ السلام اپنی معصومیت کے باعث ان پیشگی تنبیہات کو دل و دماغ کا اس طرح حصہ نہ بنا سکے جو ان کے اندر ایک مضبوط ارادے کی شکل اختیار کر لیتا۔ اور اپنی معصومیت کے باعث دجل و فریب کی گہرائی تک اترنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سے اولادِ آدم کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ تم تو دنیا میں رہ کر فریب کی وارداتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہوائے نفس کے حملے بڑے شدید ہوتے ہیں اور تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ عقلِ عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے۔ اس لئے تمہارے بچاؤ کی یہی ایک صورت ہے کہ تم شیطانی وارداتوں سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ کے رسول کی رہنمائی کی پناہ میں آ جاؤ اور اپنے اندر وہ یقین و ایمان اور جذبۂ اطاعت پیدا کرو جو عزمِ صمیم بن کر شیطنت کے ہر حملے کا مقابلہ کر سکے۔

حضرت آدمؑ کی فروگزاشت اور ابلیس کی نافرمانی میں فرق

مزید یہ بات بھی بتلائی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے یقیناً ایک قصور سرزد ہوا۔ آپؑ کو جو حکم دیا گیا تھا آپؑ اسے بھلا بیٹھے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب ہو گیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جیسے ہی آپؑ کو تنبہ ہوا تو آپؑ کے دل و دماغ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، کمر بارِ ندامت سے جھک گئی، شدتِ غم سے دل پھٹنے لگا اور فرطِ حیاء سے آسمان کی طرف

Marfat.com

نگاہ اٹھانے کی ہمت نہ ہورہی تھی۔ چنانچہ قدرت نے دستگیری فرمائی۔ آگے بڑھ کر آپ کو ٹوٹنے سے بچالیا اور گرنے سے تھام لیا، کیونکہ آپ کی پشیمانی نے یہ واضح کردیا کہ مجھ سے گناہ ضرور سرزد ہوا ہے لیکن میں گنہگار نہیں ہوں، مجھ سے نافرمانی کا ظہور ہوا ہے لیکن میں نافرمان نہیں ہوں۔ میں اپنی لغزش اور فروگزاشت پر دل کی تمام گہرائیوں سے نادم ہوں اور مغفرت کا طلبگار ہوں اور ایک دوسری نافرمانی ابلیس کی بھی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنی نافرمانی پر اصرار کیا بلکہ قیامت تک کیلئے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگ کر سرکشی اور تمرد کا راستہ اختیار کرلیا۔ اولادِ آدم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اولاً تو اپنے باپ کی طرح گناہ کے قریب نہ جانا کیونکہ تمہارے پاس گناہ کی پہچان کے تمام ذرائع موجود ہیں۔ لیکن اگر تم ہوائے نفس سے مغلوب ہوکر کبھی گناہ کر ہی بیٹھو تو پھر اپنے جدِ امجد کے طریقے کو اختیار کرنا، شیطان کے راستے پر نہ جانا۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ندامت کا اظہار کرنا اور گریہ وزاری سے مغفرت طلب کرنا کہ خود اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آجائے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى ﴿116﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ ھٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا
يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿117﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ
لَا تَعْرٰى ﴿118﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿119﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ
الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿120﴾
فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ
وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۡ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿121﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ
فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿122﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى ڏ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ
وَلَا يَشْقٰى ﴿123﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ
نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿124﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ
كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿125﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ

Marfat.com

تَنْسٰی ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِیْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ یُؤْمِنْۢ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ؕ
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی ﴿۱۲۷﴾ اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ
مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۱۲۸﴾

رکوع: ۷۔ (اور جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، اس نے انکار کردیا۔ ۱۱۶) تو ہم نے کہا، اے آدم! یہ تمہارا بھی دشمن ہے اور تمہاری بیوی کا بھی، سو ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے اور پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ ۱۱۷) اس میں تم کو یہ مقام حاصل ہے کہ تم اس میں نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے رہو گے۔ ۱۱۸) اور نہ تم کو اس میں پیاس لگے گی اور نہ دھوپ ستائے گی۔ ۱۱۹) تو شیطان نے آدم کے دل میں وسوسہ ڈالا، کہا کہ اے آدم! کیا میں تمہیں ہیشگی کے درخت اور ایسی بادشاہی کا سراغ دوں جس پر کبھی کہنگی نہ آئے۔ ۱۲۰) پس ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھالیا تو ان کی شرمگاہیں ان پر عریاں ہوگئیں تو وہ اپنے اوپر جنت کے پتے گانٹھنے گونتھنے لگے اور آدم نے اپنے رب کی حکم عدولی کی، سو وہ بھٹک گئے۔ ۱۲۱) پھر اسے اس کے رب نے چن لیا، پھر اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت بخشی۔ ۱۲۲) حکم ہوا کہ تم سب یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ محروم رہے گا۔ ۱۲۳) اور جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا تو یقیناً اس کی زندگی بہت تنگی میں گزرے گی اور قیامت کے دن اسے ہم اندھا اٹھائیں گے۔ ۱۲۴) وہ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا حالانکہ میں دنیا میں دیکھنے والا تھا۔ ۱۲۵) اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس میری نشانیاں آئی تھیں تو، تو نے ان کو نظرانداز کردیا تھا، اسی طرح آج تجھے بھی نظرانداز کردیا جائے گا۔ ۱۲۶) اسی طرح ہم اپنی حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیرپا ہے۔ ۱۲۷) کیا ان کیلئے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ کتنی ہی قوموں کو ان سے پہلے ہم نے ہلاک کردیا جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں، بیشک اس کے اندر اہل عقل کیلئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ ۱۲۸)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی ﴿۱۱۶﴾

(اور جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، اس نے انکار کردیا۔ ۱۱۶)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں نہایت اجمال سے حضرت آدم کے جس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اب اس کی کسی حد تک تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

Marfat.com

حضرت آدم علیہ السلام کا قالب تیار کیے جانے کے بعد جب ان میں روح پھونکی گئی تو تمام فرشتوں کو سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا۔ اس سے پہلے سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف میں ہم یہ تفصیل عرض کر چکے ہیں کہ یہ حکم صرف ملائکہ کیلئے ہی تھا یا اس میں جنات بھی شامل تھے؟ اور فرشتوں کے جس سجدے کا حکم دیا گیا تھا، کیا یہ وہی سجدہ تھا جسے ہم سجدۂ عبادت کہتے ہیں یا اس سجدہ کی نوعیت کچھ اور تھی؟ اور مزید یہ بات کہ ابلیس نے انکار کے بعد کیا رویہ اختیار کیا اور کس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی تحقیر کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان سے برتر بتایا اور پھر یہ چیلنج کیا کہ مجھے جس طرح یہاں سے نکالا جارہا ہے، یہ چونکہ سب کچھ آدم کی وجہ سے ہوا ہے تو میں اسے اور اس کی اولاد کو راستی پر چلنے کا موقع نہیں دوں گا۔ میں ہر ممکن طریقے سے انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

حضرتِ آدم کا یہ واقعہ ساتویں دفعہ یہاں بیان ہو رہا ہے اور ہر دفعہ تخلیقِ آدم کا وہ حصہ ذکر کیا جاتا ہے جو موقع کے مطابق ہوتا ہے اور اگر کہیں پہلے کہی ہوئی بات کے تکرار کی نوبت آتی ہے تو پیرایۂ بیان بدل جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب تک قرآنِ کریم کے وہ تمام مقامات جہاں حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے جمع کر کے نہ دیکھ لئے جائیں، اس وقت تک اس واقعہ کی (جو مختلف ضمنی واقعات پر مشتمل ہے) تفصیلات دستیاب نہیں ہوتیں۔ اور ان واقعات کی صحیح گہرائی اور گیرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور مزید یہ بات بھی کہ ان واقعات کے بار بار ذکر ہونے کے باوجود کہیں بھی اس بات کا احساس نہیں ہونے پاتا کہ ہم یہ بات پہلے پڑھ چکے ہیں۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی دفعہ یہ بات ہمارے علم میں آرہی ہے اور اگر یہ پہلے سے ذہن میں موجود بھی تھی تو اس کے بعض گوشے ایسے ہیں جو اب ہماری آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿١١٧﴾

(تو ہم نے کہا، اے آدم! یہ تمہارا بھی دشمن ہے اور تمہاری بیوی کا بھی، سو ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے اور پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ ۱۱۷)

حضرت آدمؑ کو ابلیس کی دشمنی سے آگاہی

حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہراتے ہوئے پروردگار نے آگاہ کر دیا تھا کہ یہ ابلیس تمہارا دشمن ہے۔ آیتِ کریمہ میں "ھذا" کا لفظ یہ اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت آدم ابلیس کو جانتے پہچانتے تھے۔ اس نے سب کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اور اس کی دشمنی سے بھی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ میں آدم سے بہتر ہوں کیونکہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ آگ سے پیدا ہونے والی مخلوق مٹی سے بننے والی مخلوق کے سامنے کیسے سجدہ کر سکتی ہے۔ اور پھر وہ اس بات سے بھی واقف ہوں گے کہ اس نے آدم کے خلاف صرف حسد کا اظہار نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ سے مہلت بھی مانگی ہے کہ مجھے اپنی فضیلت اور آدم کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے۔ میں اس کی اولاد کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر پروردگار نے حضرت آدم کو متنبہ کیا کہ یہ تمہارا دشمن ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں بہکا کر کوئی ایسا کام کرا دے جس کے بعد تم جنت میں نہ رہ سکو۔ اور ان نعمتوں اور عنایات سے محروم ہو جاؤ جن سے تم بہرہ ور ہو اور جو راحت و آرام اور عیش کی زندگی تمہیں جنت میں حاصل ہے وہ تم سے چھن جائے اور ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاؤ جو دکھوں سے معمور ہے اور جس میں اپنی روٹی کمانے کیلئے ہزار پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

فَتَشْقٰى ...... شقاء سے ہے۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ یہاں شقاء سے مراد وہ کلفت اور تھکن ہے جو کسب معاش کے باعث انسان محسوس کرتا ہے۔ یہاں تشقٰی کا لفظ شقاوت اور بدبختی کے معنی میں مستعمل نہیں ہوا۔

Marfat.com

اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی ﴿۱۱۹﴾

(اس میں تم کو یہ مقام حاصل ہے کہ تم اس میں نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے رہو گے۔ ۱۱۸) اور نہ تم کو اس میں پیاس لگے گی اور نہ دھوپ ستائے گی۔ ۱۱۹)

اب جبکہ اس جنت میں تمہیں بغیر کسی کسب اور مشقت کے بنیادی ضرورتیں میسر ہیں لیکن اگر تمہیں جنت سے ابلیس نے نکلوا دیا تو تم کسبِ معاش کی کلفتیں برداشت کرنے کیلئے چھوڑ دیئے جاؤ گے۔

جنت کی تعریف

جنت میں اہلِ جنت کو ملنے والی نعمتیں حدِ شمار سے باہر ہیں۔ آج ان کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔ قرآنِ کریم میں معجزانہ انداز میں ایک بات کہہ کر جنت کی منظر کشی کو ناممکن بنا دیا ہے کہ تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جس کی تمہارے نفس خواہش کریں گے۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جو عام آدمی تو کیا بڑے سے بڑا دولت مند اور بڑے سے بڑا حکمران بھی اس حالت کو کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ہر آدمی کے ہزاروں ارمان ہیں اور جتنا کوئی شخص بڑا ہے اس کے ارمان بھی اتنے ہی بڑے ہیں اور یہ ارمان کبھی پورے نہیں ہوتے۔ حکومتیں ہمیشہ تزلزل کا شکار رہتی ہیں۔ دولت ڈھلتی چھاؤں ہے۔ ہمیشہ جینے کی آرزو کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ حوادث و مصائب سے نہ محکوم محفوظ ہے نہ حاکم۔ جبکہ ہر نفس یہ چاہتا ہے کہ میں زندگی میں کوئی غم نہ دیکھوں۔ اس طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ جنت کس قدر انمول نعمتوں اور ناممکن عنایات کی امین ہے، تو بجائے ان نعمتوں کو ذکر کرنے کے یہاں بنیادی ضرورتوں کو ذکر فرمایا گیا ہے جن کا حاصل کرنا ہر شخص کیلئے ضروری ہے۔ پہلی بات یہ فرمائی کہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ فکرِ معاش اور پیٹ کا بھرنا ہے۔ اس لئے حضرت آدم کو فرمایا جا رہا ہے کہ جنت میں تمہیں کبھی بھوک نہیں لگے گی۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تمہیں غذا کی حاجت نہیں ہوگی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ نعمتوں کی اس طرح فراوانی ہوگی کہ کبھی بھوک کو ستانے کا موقع نہیں ملے گا۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ تم کبھی ننگے نہیں ہو گے۔ یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ تمہیں لباس میسر نہ آئے۔ تمہیں ہمیشہ حلۂ جنت میں ملبوس رکھا جائے گا۔ خلعتِ فاخرہ سے نوازا جائے گا۔ روٹی اور کپڑے کے بعد تیسری بنیادی ضرورت پانی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ وہاں تمہیں کبھی پیاس تنگ نہیں کرے گی کیونکہ ہر طرف چشمے ابل رہے ہوں گے اور نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی اور چوتھی یہ بات کہ تمہیں ایسے محلات دیئے جائیں گے جس میں تمہیں کبھی دھوپ پریشان نہیں کرے گی۔ لیکن اگر تمہیں اس جنت سے شیطان نکلوانے میں کامیاب ہو گیا تو سوچ لو کہ ان میں سے ایک ایک نعمت جو تمہیں بے مزد اور بغیر کسی مشقت کے میسر تھی چھن جائے گی۔ اب تمہیں اپنی روٹی، کپڑا، پانی اور مکان اور دیگر آسائشوں کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے پڑیں گے اور اپنی جان کھپانی پڑے گی۔ بعض دفعہ ان چیزوں کے حصول کیلئے کبھی پسینہ بہانا پڑے گا، اور کبھی اپنی ایک ایک قوت اس راستے میں نچوڑ دینی پڑے گی۔

فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْکٍ لَّا یَبْلٰی ﴿۱۲۰﴾

(تو شیطان نے آدم کے دل میں وسوسہ ڈالا، کہا کہ اے آدم! کیا میں تمہیں ہمیشگی کے درخت اور ایسی بادشاہی کا سراغ دوں جس پر کبھی کہنگی نہ آئے۔ ۱۲۰)

ابلیس کی تزویر

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم ابھی جنت میں تھے اور اللہ تعالیٰ کی سکیم کے مطابق خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے ابھی زمین پر تشریف نہیں لائے تھے کہ شیطان جس نے اللہ تعالیٰ سے حضرت آدم اور ان کی ذرّیت کو گمراہ کرنے کیلئے مہلت

Marfat.com

حاصل کر لی تھی اپنے کام کا آغاز کر چکا تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اس بات کا سراغ لگانے میں لگا رہا کہ میں حضرت آدم کو کس طرح بہکا سکتا ہوں۔ آخر کار اس نے انسانی فطرت کے گہرے مطالعہ سے یہ نکتہ اخذ کیا کہ انسان کے اندر یہ کمزوری رکھی گئی ہے کہ وہ جس چیز سے محبت کرتا اور شب و روز اس میں اضافے کی فکر میں رہتا ہے، وہی اس کی اصل کمزوری ہے۔ اگر اسے کسی طرح یقین دلا دیا جائے کہ فلاں کام کرنے سے تمہاری یہ مطلوب اور محبوب چیز بہتر انداز میں تمہیں مل سکتی ہے تو وہ آگے بڑھ کر اس کے قبول کرنے کیلئے مستعد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابلیس جنت میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ گمراہی کیلئے ممکن ذرائع مہیا فرما چکا تھا۔ اس نے حضرت آدم سے نہ جانے کیسے ملاقات کا وقت لیا اور کس طرح اپنی گزشتہ دشمنی پر معذرت کرتے ہوئے آئندہ کیلئے خیر خواہی کا یقین دلایا اور کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کو زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ سے محبت کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ جنت ان لوگوں کا مسکن ہے جو اللہ تعالیٰ سے پیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے پیار کرتا ہے۔ میں آپ کا خیر خواہ ہونے کی وجہ سے آپ کی خدمت میں یہ بتانے کیلئے حاضر ہوا ہوں کہ جس درخت کا پھل کھانے سے آپ کو روکا گیا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جو شخص بھی اس کا پھل کھا لیتا ہے اسے بقائے دوام حاصل ہو جاتی ہے، اسے کبھی موت نہیں آتی اور کبھی جنت سے اسے نکالا نہیں جاتا۔ آپ اگر ہمیشہ کی بادشاہت چاہتے ہیں اور ایسا ملک جس کو کبھی زوال نہ آئے ظاہر ہے کہ وہ جنت ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ آپ اس درخت کا پھل کھا لیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں تو ہمیشگی کا درخت اور لازوال سلطنت کا حوالہ دیا گیا ہے جبکہ سورۃ الاعراف میں دونوں کے فرشتے بن جانے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے یہ دونوں مختلف باتیں ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ قرآنِ کریم کے بیان میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہو۔ اس لئے لوگوں نے اس کی مختلف توجیہات کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ بالکل سامنے کی بات یہ ہے کہ ابلیس حضرت آدم کو ورغلانے کیلئے صرف ایک دفعہ ہی جنت میں نہیں گیا بلکہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف طریقوں سے اور مختلف پیشکشیں لے کر حاضر ہوتا رہا ہے۔ کبھی اس نے لازوال سلطنت کی بات کی، کبھی حیاتِ دوام کی اور کبھی فرشتے بن جانے کی۔ نہ جانے اسے اس طریقے سے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ غرور اور فریب دہی کے جتنے طریقے ممکن ہو سکتے ہیں وہ سب اس نے حضرت آدم کو اپنے دام میں لانے کیلئے صرف کر ڈالے۔ میرا گمان یہ ہے وہ ان میں سے کسی طریقے سے کامیاب نہیں ہو سکا۔ تب اس نے آخری وار کیا۔ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں، صرف آپ کی حیاتِ دوام کیلئے یہ کوشش کر رہا ہوں۔ حضرت آدم اس کی دشمنی سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ میں اس کے بہکاوے میں آ کر جنت سے نکل بھی سکتا ہوں، لیکن جب اس نے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائی اور پھر آپ کے سامنے وہ بات پیش کی جو آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھی، یعنی جنت میں ہمیشہ کا قیام اور اللہ تعالیٰ کی دائمی رضا اور اس کی محبت کا حصول۔ تو وہ اس سے انکار نہ کر سکے۔ ان کے جذبۂ محبت نے انہیں مجبور کیا کہ ابلیس دشمن ہی سہی لیکن اللہ تعالیٰ کا نام لے کر تو کوئی دشمن بھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور وہ بھی جنت میں؟ اس لئے آپ کو اس پر یقین کر لینا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی جس محبت نے آپ کو اسیر بنا رکھا ہے اسے حاصل کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہئے۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

(پس ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو ان کی شرمگاہیں ان پر عریاں ہو گئیں تو وہ اپنے اوپر جنت کے پتے گانٹھنے، گونتھنے لگے اور آدم نے اپنے رب کی حکم عدولی کی، سو وہ بھٹک گئے۔ ۱۲۱)

Marfat.com

ابلیس کے فریب کا اثر

آخر ابلیس کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور حضرت آدم اور حضرت حوا شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنت کا جو خلعت انہیں پہنایا گیا تھا، وہ اس سے محروم کر دیئے گئے۔ جیسے ہی انہوں نے اپنے آپ کو برہنہ دیکھا تو شرم وحیاء کے شدید تأثر کے تحت اِدھر اُدھر سے جنت کے درختوں کے پتے کھینچ کر اپنے اوپر چپکانے لگے۔ جنت کی جو اور نعمتیں انہیں عطا فرمائی گئی تھیں وہ تو اس وقت تک باقی رہیں جب تک انہیں جنت سے نکلنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن سرکاری پوشاک ان سے فوراً اتروالی گئی۔ اس سے ایک بات جو سمجھ میں آتی ہے اور جو نہایت اذیتاک بھی ہے وہ یہ ہے کہ شیطان جب بھی انسانی سیرت وکردار پر حملہ کرتا ہے اور اس کو بدعملی پر اکساتا ہے تو اس کا سب سے پہلا حملہ انسان کی شرم وحیاء پر ہوتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ میں اسے اس جوہر سے محروم کردوں۔ چنانچہ جیسے جیسے اس کے شرم وحیاء کا لباس اترتا جاتا ہے، ویسے ویسے وہ سفلی جذبات کا اسیر ہوتا جاتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ بے حیائی میں کتے بلیوں کی سطح تک اتر جاتا ہے لیکن اسے اپنے اس بگاڑ کا کبھی احساس نہیں ہوتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بھی اس کے اندر یہ جوہر پیدا کرنے میں ناکام رہتی ہے بلکہ آج کی تعلیم جس کا نصاب لارڈ میکالے نے مرتب کیا تھا اس کا تو اصل ہدف ہی یہ ہے کہ لڑکیوں کو نسوانیت کے زیور سے محروم کردیا جائے اور مردوں کو مردانگی کے جوہر سے، اور دونوں کو اس حد تک آزادانہ اختلاط کے نتیجے میں بے حیاء کردیا جائے کہ وہ بے حیائی کو تہذیب سمجھیں اور شرم وحیاء کی ہر بات کو رجعت پسندی قرار دیں۔

عَصٰی ، غَوٰی کا مفہوم

وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ......اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی، سو وہ بھٹک گیا۔ عَصٰی کا مصدر عصیان ہے۔ یہ فعل ماضی معروف ہے۔ اس کا معنی ہے "اور آدم نے نافرمانی کی۔" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت آدم ابلیس کے وسوسوں سے اس قدر متأثر ہوئے کہ وہ یہ بھول گئے کہ ابلیس میرا دشمن ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھانے سے اس فریب میں مبتلا ہوگئے کہ کوئی شخص قسم کھا کر جھوٹ کیسے بول سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حضور ہمیشہ کے تقرب کی خواہش میں آپؑ وہ کام کر بیٹھے جس سے آپؑ کو روکا گیا تھا۔ اس پس منظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپؑ نے حکم عدولی ضرور کی لیکن آپؑ کے اندر حکم عدولی کا جذبہ نہیں تھا۔ اس کا محرک یقیناً اللہ تعالیٰ کے دائمی قرب کی خواہش تھی، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آپؑ سے حکم عدولی ہوگئی جبکہ آپؑ حکم عدولی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپؑ بقائے دوام اور عیشِ دوام کے حصول کی کوشش میں ایک ایسا کام کر بیٹھے جس نے آپؑ کی زندگی کا عیش وآرام خاک میں ملا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابن الاعرابی نے غَوٰی کا معنی فسد علیه عیشه کیا ہے۔ لیکن امام لغت اسماعیل بن حماد الجوہری نے الصحاح میں غَوٰی کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غَوٰی کا معنی صرف گمراہ ہونا نہیں بلکہ اہلِ زبان اسے دو معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ (۱) گمراہ ہونا (۲) حصولِ مقصد میں ناکام ہونا۔ اس تحقیق کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرتِ آدم نے جس مقصد کیلئے ابلیس کی بات مانی تھی، آپؑ وہ مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اس لئے بعض مترجمین نے غَوٰی کا معنی کیا ہے، وہ نامراد ہوا۔ یعنی اپنے مقصد کو نہ پاسکا۔

Marfat.com

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

(پھر اسے اس کے رب نے چن لیا، پھر اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت بخشی۔ ۱۲۲)

اجتباء کا مفہوم

حضرتِ آدم علیہ السلام ابلیس کی کوششوں سے شجرِ ممنوعہ کا پھل تو کھا بیٹھے لیکن جیسے ہی انہیں تنبہ ہوا تو ان کی دنیا اندھیر ہوگئی، وہ سمجھ گئے کہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر چکا ہوں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ اگر ایسا کوئی قصور سرزد ہو جائے تو اس کے بعد کیا کرنا چاہیے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا صدمہ اور دوسری اس بے خبری کی پریشانی، شب و روز رونے دھونے کے سوا کوئی کام نہ رہا اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ حضرتِ آدم نے نافرمانی ضرور کی ہے لیکن وہ نافرمان نہیں ہیں۔ اس لئے ان کی بے بسی اور بے کسی کو دیکھ کر رحمت کی نظر فرمائی اور ان کو گرنے سے سہارا دیا اور اپنے خصوصی فضل و کرم سے انہیں اپنے تقرب کیلئے چنتے ہوئے توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔ پروردگار جب کسی کو نوازتا اور اپنا بناتا ہے تو اس پر سب سے پہلا کرم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنی غلطیوں کا شعور ہو جاتا ہے اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کے آستانے پر اس طرح ڈھیر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی اس کا سر اٹھاتی ہے۔ چنانچہ یہاں اجتباء کے لفظ سے یہی توبہ کی توفیق مراد ہے۔ سورۂ بقرہ میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ''آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لئے۔'' یہ وہی کلمات ہیں جن کے ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کی۔ اور سورۃ الاعراف میں انہیں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پروردگار نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور مزید یہ کرم فرمایا کہ زندگی میں آنے والے مراحل کیلئے ہدایت عطا فرمائی کہ اب تمہیں زندگی کا سفر کس طرح طے کرنا ہے۔

اس آیت سے جہاں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اصل خوبی یہ نہیں کہ وہ فرشتوں کی طرح کبھی گناہ نہ کرے بلکہ اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ گناہ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ لیکن اگر کبھی بشری تقاضوں سے کوئی گناہ ہو جائے تو ابلیس کی طرح اس پر اڑنے کی بجائے فوراً ندامت کے آنسوؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک جائے۔ وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم سے اگر غلطی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کی غلطی سے درگزر فرمایا بلکہ انہیں دوبارہ تقرب سے نوازا، انہیں توبہ کی توفیق بخشی اور پھر توبہ قبول فرمائی۔ اس قدر مکمل وضاحت کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ حضرت آدم دنیا میں اس طرح تشریف لائے کہ آپؑ کی پیشانی پر نافرمانی کا داغ تھا اور پھر آپؑ کی ذرّیت گناہ کا بار لے کر پیدا ہوتی رہی۔ عیسائیوں میں انسان کے ابدی گناہگار ہونے کا جو تصور ہے، اس وضاحت کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

اسی طرح اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم جس طرح نسلِ آدم کے جدِ امجد ہیں، اسی طرح وہ نبی بھی ہیں کیونکہ قرآنِ کریم سے ہمیں زندگی کیلئے جو رہنمائی ملتی ہے اس کا تعلق صرف زمینی حالات ہی سے نہیں بلکہ اس کا غالب حصہ اس بات پر مشتمل ہے کہ ہم کوئی سا کام اللہ تعالیٰ کی رضامندی سے ہٹ کر نہ کریں، اسی سے ہماری دنیوی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں گی اور یہی رویہ ہماری اخروی کامیابیوں کا ضامن ہوگا۔ اس اساسی تصور کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان زندگی کے ہر معاملے میں صرف حواس اور عقل سے رہنمائی حاصل کرے کیونکہ عقل یقیناً اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کی ناراضگی کے اسباب کیا ہیں؟ اس کیلئے ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی دی جائے جسے وحیِ الٰہی اور نبوت کہا جاتا ہے۔ بنابریں یہ تسلیم کئے بغیر چارہ

Marfat.com

نہیں کہ جس طرح حضرت آدم ہمارے مورثِ اعلیٰ ہیں، اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے پہلے نبی بھی ہیں۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

(حکم ہوا کہ تم سب یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ محروم رہے گا۔ ۱۲۳)

سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف میں اس آیت کے تمام متعلقات پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس میں ہم یہ گزارش کر چکے ہیں کہ زمین پر حضرت آدم کا بھیجا جانا خلافتِ ارضی کی ذمہ داریوں کی بجا آوری کیلئے تھا اور اسی لئے نوعِ انسانی کی تخلیق کی جارہی تھی۔ اور جنت کے واقعہ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ آئندہ بھی اصل کشمکش آدمیت اور شیطنت میں ہوگی۔ ابلیس ذُرّیت آدم کو ہر ممکن طریقے سے گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا کیونکہ وہ ان کا حقیقی دشمن ہے اور ذُرّیتِ آدم کا کام اس کی دشمنی کا مقابلہ کرنا اور اس ہدایت کے مطابق جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جائے گی زندگی گزارنا ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کیلئے حضرت آدم وحوا اور ابلیس کو زمین پر اتارا گیا۔ اس آیت میں تثنیہ کا صیغہ دیکھ کر بعض اہلِ علم کو یہ گمان گزرا ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم اور حضرت حوا ہیں حالانکہ سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف میں اترنے کا ذکر جمع کے صیغہ کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہاں بھی جمیعاً کی قید ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اور تثنیہ کا مفاد بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدم اور ابلیس کو دو گروہوں کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

ابلیس اور آدم میں اصل تعلق

ان دونوں کو اترنے کا حکم دے کر ان کے درمیان اصل تعلق کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، یعنی ابلیس تمہارا دشمن ہوگا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے تمہیں بہکائے گا اور تم اس کو دشمن سمجھ کر اس کے ہر راستے پر چلنے اور اس کے بہکاووں میں آنے سے گریز کرو گے، بلکہ شیطنت کے مقابلے میں ہر ممکن طریقے سے چوکنا رہنے کی کوشش کرو گے اور اگر یہ مراد لیا جائے کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے سے مراد، یہ ہے کہ آدم وحوا ایک دوسرے کے دشمن ہیں تو ظاہر ہے کہ میاں بیوی میں تعلق محبت اور مودۃ کا ہے، دشمنی کا نہیں۔ ان میں دشمنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ شیطانی وساوس اور اس کی وارداتوں سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ دشمنی کا حقیقی تعلق صرف ابلیس اور آدم میں ہے۔ اسی طرح دونوں کی ذُرّیتیں بھی ہمیشہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہیں گے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

حضرتِ آدم اور ذُرّیتِ آدم کو شیطانی لشکر کا مقابلہ اور اپنا دفاع کرنے کیلئے جو دفاعی ہتھیار دیئے اسے ہدایت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی اور اللہ تعالیٰ کے نبی کا اسوہ جس سے شریعت کے اصول وفروع وجود میں آتے ہیں مراد ہے۔ یہ ہدایت دے کر اولادِ آدم کو بہرہ ور کر دیا گیا کہ اگر تم اپنی زندگی میں گمراہی سے اور آخرت میں محرومی سے بچنا چاہتے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی پابندی کرو۔ یہی وہ ہتھیار ہے جس سے تم شیطانی حملوں سے اپنا دفاع کر سکو گے۔ اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر تم جنت کی نعمتوں تک

Marfat.com

پہنچ سکتے ہو۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ
رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ
وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

(اور جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا تو یقیناً اس کی زندگی بہت تنگی میں گزرے گی اور قیامت کے دن اسے ہم اندھا اٹھائیں گے۔ ۱۲۴) وہ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا حالانکہ میں دنیا میں دیکھنے والا تھا۔ ۱۲۵) اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس میری نشانیاں آئی تھیں تو، تو نے ان کو نظر انداز کر دیا تھا، اسی طرح آج تجھے بھی نظر انداز کر دیا جائے گا۔ ۱۲۶)

ذکر...... کا معنی ہے نصیحت، یاد دہانی، یاد، قرآنِ کریم۔

ضَنْكًا ...... مصدر ہے۔ آیتِ کریمہ میں یہ معیشت کی صفت واقع ہوا ہے اور جب مصدر صفت واقع ہو جیسے "زَيْدٌ عَدْلٌ" تو مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور مذکر اور مؤنث دونوں کی صفت واقع ہو سکتا ہے۔ "مَعِيْشَةً ضَنْكًا" کے معنی تنگ زندگی کے ہیں جو سکون، طمانیت اور فراغِ خاطر و شرحِ صدر کی نعمت سے محروم ہو۔

ذکر سے اعراض کا نتیجہ

سابقہ آیتِ کریمہ میں حضرت آدم اور آپ کی اولاد سے کہا گیا ہے کہ تمہاری خوراک اور اس کے لوازمات تو زمین سے پیدا ہوں گے اور تمہاری مساعی سے بروئے کار آئیں گے، اور تمہاری عقل ان میں اضافے کرے گی لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ زندگی گزارنے کیلئے رہنمائی کون دے گا، زندگی کے مقاصد کون متعین کرے گا، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی درستی اور بہتری کیلئے احکام کون دے گا تو اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ رہنمائی اور ہدایت اور زندگی کا قانون اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئے گا۔ اسی قانون کی پیروی اور انہی احکام کی اطاعت پر زندگی کی فوز و فلاح کا دارومدار ہو گا۔ اور اسی ہدایت پر عمل ہر طرح کی گمراہی اور محرومی سے تحفظ کی ضمانت ہو گا۔

اب اسی حقیقتِ ثابتہ کے منفی پہلو کو اس آیتِ کریمہ میں بیان کیا جا رہا ہے اور اس کا دائرۂ اثر تمام نوعِ انسانی اور قیامت تک تمام زمانوں تک پھیلاتے ہوئے اپنی آخری کتاب میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ جو شخص یا جو قوم میری یاد سے اعراض کرے گی یعنی میرے دیئے ہوئے قانون کی پابندی کو تسلیم نہیں کرے گی، میرے نازل کردہ احکام کو ماننے سے انکار کر دے گی اور میرے دین کو اپنا رہنما بنانے کی بجائے اپنے وضعی قوانین اور اپنے رسم و رواج کو رہنما بنائے گی اور اگر اس کو لپیٹ کے کہا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ میری نازل کردہ آخری کتاب کی ہدایات اور اس کی توضیح و تشریح ہمارے آخری رسول ﷺ کی سنت کو نظر انداز کرے گی (کیونکہ ذکر میں یہ سب باتیں شامل ہیں)، تو ہم اس کی معیشت کو تنگ کر دیں گے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک معیشت کا معنی روزی ہے۔ تو اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہم ان کی روزی کو تنگ کر دیں گے۔ ان کے وسائلِ رزق میں کمی کر دی جائے گی، پیداوار معیار سے گر جائے گی، آبادی رفتہ رفتہ بھوک کا شکار ہونے لگے گی۔ لیکن سلف صالحین نے عام طور پر اس کا مفہوم یہ لیا ہے کہ اور علامہ ابن کثیر نے جو کچھ فرمایا ہے، اس کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ ان کی زندگی تنگ کر

Marfat.com

دی جائے گی، وہ سکون وطمانیت اور فراغِ خاطر سے محروم ہو جائیں گے اور شرح صدر کی نعمت ان سے چھن جائے گی۔ وہ اپنے پاس وسائل رکھتے ہوئے بھی بے اطمینانی کا شکار رہیں گے۔ دولت وثروت کے انبار، جاہ وجلال کے بلند ترین مناصب اور متنوع اشیائے خورد ونوش کے باوجود انہیں آسودگی نصیب نہیں ہوگی، وہ بیش قیمت لباس پہنیں گے لیکن ان کا دل اداس، روح بے چین اور طبیعت افسردہ رہے گی۔ بڑا وسیع کاروبار رکھتے ہوئے بھی حقیقی خوشی سے وہ کوسوں دور رہیں گے۔ خواب آور گولیوں کے بغیر سو نہیں سکیں گے۔ مختلف عوارض کا شکار ہو کر ادویہ کے محتاج ہو کر رہ جائیں گے۔ ان کی دولت وثروت انہیں سکون دینے کی بجائے ان کی مصروفیت اور ان کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنے گی، خودکشی کی وارداتیں بڑھ جائیں گی، جان ومال غیر محفوظ ہو کر رہ جائیں گے، انسان بے ساختہ پکارے گا:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

انسان ہزار انکار کرے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ انسان کے اندر ایک روح بھی موجود ہے۔ جسم کی اپنی طلب ہے اور روح کی اپنی طلب۔ جسم کو ضروریات، تلذذات، تکلفات اور تعیشات سے بہلایا جا سکتا ہے۔ لیکن روح کی طلب اپنی جگہ باقی رہتی ہے بلکہ جیسے جیسے جسم کی پوجا پاٹ بڑھتی جاتی ہے، روح کی بے قراری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسے اس وقت چین نصیب ہوتا اور آسودگی ملتی ہے جب آدمی اپنے اصل مالک یعنی پروردگار کو یاد کرتا ہے۔ اس کی طرف سے غفلت اور لاتعلقی آہستہ آہستہ اسے مار تو سکتی ہے لیکن انسان کو آسودہ نہیں کر سکتی۔ ضمیر کی آواز کو خاموش کر دینے کے بعد بھی انسان یوں محسوس کرتا ہے کہ میں کسی چیز کو گم کر بیٹھا ہوں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو لوگ ایمان وعمل کا دعویٰ رکھتے ہیں ہم نے انہیں بھی نہایت پریشان حال اور پراگندہ بال دیکھا ہے۔ وہ روح کی ضرورت کو سمجھتے ہیں اس کے باوجود ان کی زندگی میں اضطراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے برعکس کتنے ایسے لوگ ہیں جن کا مذہب سے واجبی سا رشتہ بھی نہیں۔ وہ خدا کے تصور کو محض ایک وہم سمجھتے ہیں لیکن ان کی زندگی نہایت آسودہ اور مطمئن دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر فریبِ نظر ہے۔ مذہب کا نام لینے والے ناآسودہ اس لئے ہیں کہ وہ مذہب کا نام لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے حقیقی معنوں میں اتنے ہی دور ہیں جتنا اللہ تعالیٰ سے انکار کرنے والے۔ ایسے لوگ تو بعض دفعہ انکار کرنے والوں سے بھی زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ کھل کھیلنا چاہتے ہیں تو نام نہاد مذہب کا بھرم انہیں کھلنے نہیں دیتا اور چونکہ اس کی حقیقت سے تہی دامن ہیں اس لئے اس کی برکات سے بھی محروم رہتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ نہ اِدھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے رہتے ہیں۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اور جہاں تک دوسرے لوگوں کا تعلق ہے ان کا بظاہر ٹھاٹ باٹ اور کروفر دیکھنے والوں کو غلط فہمی کا شکار کر دیتا ہے۔ کاش کوئی ان کے سینوں میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرے تو اسے اندازہ ہوگا کہ ان کا اندر کا غم کتنا گہرا ہے اور انہوں نے کس چابکدستی سے اس پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

Marfat.com

قیامت میں اعراض کا نتیجہ

وَ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ...... جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض کریں گے، دنیا میں تو ان کی زندگی تنگ کردی جائے گی اور آخرت میں جب ان کو اٹھایا جائے گا تو وہ اندھے ہوں گے۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹۷ میں یہی بات زیادہ سخت انداز میں فرمائی گئی ہے کہ (ہم انہیں قیامت کے دن ان کے منہ کے بل اٹھائیں گے۔ اندھے، گونگے اور بہرے) کیونکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا انکار کرتے اور اس کی کتاب کو رہنما بنانے کی بجائے اپنے وضعی علوم کو رہنما بناتے ہیں قرآنِ کریم انہیں اندھا بہرہ اور بے سمجھ قرار دیتا ہے۔ جو اپنی بے سمجھی اور انکار کے باعث جانوروں سے بڑھ کر ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام یقیناً یہی ہونا چاہیے کہ انہیں قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے۔ اور جب وہ حیران ہو کر یہ کہیں کہ ہم تو دنیا میں بینا اور آنکھیں رکھنے والے تھے، ہمیں اندھا کیوں اٹھایا گیا تو پروردگار ان کی اصل حیثیت سے انہیں آگاہ کرے گا کہ تم نے دنیا میں جس طرح میری ہدایت کے بارے میں اندھا اور بہرہ ہونے کا ثبوت دیا تھا یعنی ہم نے تمہیں آنکھیں دی تھیں لیکن تم نے حقیقت کو کبھی دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ تمہیں کان دیئے تھے، تم نے کبھی کوئی نصیحت کی بات سن کے نہ دی، تمہیں دل دیا تھا لیکن وہ کبھی دین کی بات کو سمجھنے اور دینی احساس کے تحت دھڑکنے پر آمادہ نہ ہوا۔ تو تم نے جو رویہ اپنے لئے دنیا میں اختیار کیا تھا آج ہم نے اسی کے مطابق تمہیں اٹھایا ہے۔ تم نے دنیا میں ہمارے احکام سے نہ صرف روگردانی کی بلکہ انہیں نظر انداز کیا۔ آج ہم نے تمہیں نظر انداز کردیا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے قیامت میں مجرمین کی حالت کو مختلف انداز میں بیان فرمایا ہے مثلاً سورۃ ق آیت ۲۲ میں تو یہ فرمایا ہے کہ "اب ہم نے تیرے حجابات ہٹا دیئے ہیں، آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔" جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تو جن حقائق کا انکار کرتا رہا ہے کیونکہ وہ تمہیں نظر نہیں آتے تھے تو تم نے اپنے نظر نہ آنے کو دلیل بنا کر انہیں حقائق کے وجود ہی سے انکار کردیا۔ آج ہم نے تیری نظر کو وہ قوت دے دی ہے کہ تم ان حقائق کو بچشمِ سر دیکھ سکتے ہو۔ اور کسی جگہ ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ مثلاً سورۃ ابراہیم آیت ۴۳ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ "اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اس دن کیلئے جب یہ حال ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، سر اٹھائے بھاگے چلے جارہے ہوں گے، نظریں اوپر جمی ہوں گی اور دل اڑے جاتے ہوں گے۔" اور پیشِ نظر آیت میں بھی اسی طرح کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ یہ تو قرآنِ کریم میں کھلا تضاد ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت میں ہر شخص کو مختلف کیفیتوں سے واسطہ پڑے گا۔ کہیں یہ دکھانے کیلئے کہ جن حقائق کا تم انکار کرتے تھے ان کی حقیقت کیا ہے۔ تو نہ صرف آنکھیں کھول دی جائیں گی بلکہ نگاہ تیز کردی جائے گی اور کہیں ان کا نامۂ عمل دکھانے کیلئے انہیں اتنی بینائی دی جائے گی جس سے وہ اپنا نامۂ عمل پڑھ سکیں اور کہیں ان کی ذلت کو آشکارا کرنے اور محرومی کو گہرا کرنے کیلئے ان کی بینائی چھین لی جائے گی تاکہ وہ اپنی قسمت کو روئیں اور پیٹیں۔ اس طرح سے جہنم کے مختلف مناظر اور مختلف ضرورتوں کے تحت مجرمین کی حالت میں تبدیلی آتی رہے گی۔ تو یہ بیان کا تضاد نہیں بلکہ حالات کا تضاد ہے جو واقعہ کے عین مطابق ہے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

(اسی طرح ہم اپنی حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیرپا ہے۔ ۱۲۷)

اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے اپنی صلاحیتوں اور اپنے اختیارات کو اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود میں

Marfat.com

استعمال کرنے کے بجائے ان کاموں میں استعمال کیا اور ان راہوں میں صرف کیا جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا تھا اور قدم قدم پر ان حدود سے تجاوز کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے سرے سے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کر دیا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی سنت پر مبنی قانون کو نافذ کرنے کے پابند ٹھہرائے گئے ہو۔ یعنی تم صرف عبادات کے ہی مکلف نہیں ٹھہرائے گئے ہو بلکہ اس کے مکمل دین کو نافذ کرنے کے پابند ہو۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اقتدار بخشا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا دین نافذ کرنے کی بجائے ان وضعی قوانین کو نافذ کیا جنہیں غیر مسلم دنیا نے وضع کیے تھا ہماری پارلیمنٹ نے اللہ تعالیٰ کے دین سے آزاد ہو کر قانون سازی کی اور عدالتوں میں فیصلے اس قانون کے مطابق کیے گئے جس کا تعلق اسلامی شریعت سے زیادہ مغربی قانون اور تہذیب سے تھا۔ اس طرح سے عملی طور پر انہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو ہم دنیا میں یہ سزا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی تنگ کر دی جاتی ہے، جس کی تفصیل گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم نے بیان کی ہے۔ لیکن یہ سزا سخت اور رسوا کن ہونے کے باوجود اس عذاب کے مقابلے میں بڑی ہلکی ہے جو آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جانے والا ہے۔ وہ نہایت شدید بھی ہے اور ایسا باقی رہنے والا ہے کہ جس کی مدت کبھی ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔

احساسِ زیاں

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اور کچھ مخلص لوگوں کی قربانیوں کے نتیجے میں یہ ملک عطا کیا جو اسلامی دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت تھی اور جس کو حاصل کرتے ہوئے ہمارے سیاسی رہنماؤں نے بار بار اپنی قوم کو یقین دلایا اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ اسے اسلامی قوانین کی تجربہ گاہ بنایا جائے گا اور اس کے تعلیمی اداروں کو اسلامی علوم کا مرکز بنایا جائے گا۔ یہاں اسلامی قوانین اس طرح پڑھائے جائیں گے کہ وضعی قوانین پر ان کی برتری ثابت کی جائے گی اور تمام جدید علوم کو اسلامی علوم کے سانچے میں اس طرح ڈھال دیا جائے گا کہ جدید سے جدید علم اسلامی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا جائے گا اور اسلامی رنگ میں آراستہ کر کے اسے پڑھایا جائے گا۔ یہاں سے پڑھ کر نکلنے والا ہر شخص ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان اور ادیب اور دانشور بعد میں ہوگا، مسلمان پہلے ہوگا۔ دین و دنیا کی دوئی ختم کر دی جائے گی۔ ہمارا دین دنیا کی رہنمائی کرے گا اور ہماری دنیا دین کے تابع رہے گی۔ ہماری عدالتوں میں اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق فیصلے ہوں گے، ہماری پارلیمنٹ ہماری اجتماعی زندگی کی ضروریات کیلئے ان معاملات میں قانون سازی کرے گی جس میں اسلامی شریعت خاموش ہے۔ لیکن ان قوانین کا مزاج اسلام کے مزاج میں ڈھل کے تیار ہوگا۔ مملکت کا نام اسلامیہ ہوگا اور وہ اسلام کے احکام کی صرف نمائندہ ہی نہیں بلکہ اسے نافذ کرنے والی اور دنیا کے سامنے اس کو برتر ثابت کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ اس ملک کے رہنے والوں کی تہذیب اور ثقافت اسلام کی تجربہ گاہ سے تیار ہو کے نکلے گی۔ اس ملک کا ہر فرد اپنے آپ کو مسلمان کہنے میں فخر محسوس کرے گا۔ لیکن آج جب ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ہم اپنی منزل سے دور، اپنے مقصد سے لاتعلق اور اپنے رختِ سفر سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی سالمیت اور آزادی ایک سوالیہ نشان بن گئی ہے۔ اسلام کی بنیادی اقدار اور اس کے اہداف ایک الزام بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم آپس میں نرم اور کافروں کے معاملے میں سخت ہونے کی روایت رکھنے کے باوجود ہم اس کے برعکس حکومت کا مقصد طے کر چکے ہیں۔ ہماری تعلیم، ہماری تہذیب، ہماری ثقافت، ہمارا تمدن، ہمارا طرزِ حکومت، ہمارا تصورِ ریاست اور ہمارا مقصدِ زندگی ہر چیز تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی تبدیلی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری معیشت تنگ کر دی گئی ہے۔ ہمارے وسائل روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ دنیا کی نظروں میں ہماری عزت خاک میں مل گئی ہے۔ غربت میں اس حد تک

Marfat.com

اضافہ ہو چکا ہے کہ ہماری بہت بڑی تعداد غربت کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ امن وامان کا معاملہ مخدوش ہو کر رہ گیا ہے۔ اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ اپنی حالت برقرار نہیں رکھ سکا۔ لیکن سب سے بڑا صدمہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں رہنے والوں کی ایک بڑی تعداد احساسِ زیاں سے محروم ہو چکی ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بہت بڑی حد تک غیر ملکی تصورات قبول کر چکا ہے۔ ہمارے حکمران اسلام تو دور کی بات ہے مسلمانوں کے مفادات کی بجائے کفر کے مفادات کی خدمت بجالا رہے ہیں۔ کاش ہم ان آیات کو غور سے پڑھیں اور اس کے آئینہ میں اپنی شکل پہچاننے کی کوشش کریں۔

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

(کیا ان کیلئے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ کتنی ہی قوموں کو ان سے پہلے ہم نے ہلاک کر دیا جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں، بیشک اس کے اندر اہلِ عقل کیلئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ ۱۲۸)

عربوں کے مطالبے کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں معلوم ہوتا ہے کہ روئے سخن کفار مکہ کی طرف ہے۔ وہ چونکہ آئے دن کسی نہ کسی نشانی یا عذاب کا مطالبہ کرتے رہتے تھے، ممکن ہے اس میں ان کے مطالبے کا جواب بھی دیا گیا ہو۔ عرب چونکہ تجارت پیشہ لوگ تھے، مختلف ممالک کا سفر ان کی تجارتی ضرورت تھی۔ اثنائے سفر ان کا گزر ان اجڑی ہوئی بستیوں اور ویران کھنڈروں کے پاس سے بھی ہوتا تھا جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو چکی ہیں۔ ان میں قومِ ثمود، قومِ عاد اور قومِ لوط کی بستیوں سے عرب خوب واقف تھے۔ ان بستیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں اگر ہمارے رسول کی کوئی دلیل اپیل نہیں کرتی اور تم ان کی کوئی بات مان کے دینے کیلئے تیار نہیں ہو تو جن معذب قوموں کی بستیوں سے تم گزرتے ہو تو کیا ان کی تباہی اور بربادی بھی تمہیں سوچنے پر مجبور نہیں کرتی کہ کبھی ان بستیوں میں زندگی کی رنگینیاں آباد ہوں گی۔ یہاں کے رہنے والے کبھی عیش وعشرت میں زندگی گزارتے ہوں گے اور آج یہاں خاک اڑ رہی ہے۔ آخر ان پر ایسی کیا افتاد پڑی اور یہ لوگ تباہی کی نذر کیوں ہو گئے۔ لیکن تمہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں، تم خود اس سے واقف ہو اور سینہ بسینہ روایت ہونے والی ان کی تاریخ تمہارے لئے اجنبی نہیں۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ ان کی طرف بھی اللہ تعالیٰ کے رسول آئے، انہیں وہی دعوت دی گئی جو آج تمہیں دی جا رہی ہے۔ لیکن جب ان کا انکار انتہا کو پہنچ گیا اور خیر کی قوتوں کو دشمن سمجھ کر انہیں ختم کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور ان کا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ کیا یہ تباہی اور ویرانی بھی تمہیں ہدایت دینے کیلئے کافی نہیں کہ تم اپنی حالت بدلنے اور اس تباہی سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ ان بستیوں کی ایک ایک اینٹ اور ان کا ایک ایک ذرہ عقل والوں کیلئے اپنے اندر بڑی نشانیاں رکھتا ہے۔ تم اگر ان سے کچھ سیکھنا چاہو تو بہت کچھ سیکھ سکتے ہو۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب قومیں بگڑ جاتی ہیں، پھر ان کی نگاہیں بھی بگاڑ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان کے دل ہر اچھی بات کیلئے بنجر ہو جاتے ہیں۔ وہ عبرت کی جگہوں سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے آج کی زبان میں کلچر تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

شاعر نے انہی کا ماتم کرتے ہوئے ٹھیک کہا۔

Marfat.com

عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾
فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ
وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ
تَرْضٰى ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ
زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٣١﴾
وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ
نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿١٣٢﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ
اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ اَنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ
بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ
اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿١٣٤﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾ ع

رکوع: ۸۔ (اگر آپ کے رب کی جانب سے ایک فیصلہ پہلے طے نہ ہو چکا ہوتا اور ایک وقت مقرر نہ کر دیا ہوتا تو عذاب مسلط ہو کے رہتا۔ ۱۲۹) پس آپ صبر کریں ان کی دل دکھانے والی باتوں پر اور آپ تسبیح کریں اپنے رب کی حمد کے ساتھ، سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کریں اور دن کے اطراف میں بھی، تاکہ آپ نہال ہو جائیں۔ ۱۳۰) آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے

Marfat.com

کافروں کے چند گروہوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے۔ یہ محض زیب و زینت ہے دنیوی زندگی کی تا کہ ہم انہیں ان سے آزمائیں اور آپ کے رب کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ۱۳۱) اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دیجئے، اور خود بھی اس پر جمے رہئے، ہم آپ سے روزی کا سوال نہیں کرتے بلکہ ہم ہی آپ کو روزی دیں گے، اور اچھا انجام پرہیزگاری کا ہی ہوتا ہے۔ ۱۳۲) اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اپنے رب کے پاس سے ہمارے لئے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے، کیا ان کے پاس وہ بینہ نہیں آئی جو پہلے صحیفوں میں ہے۔ ۱۳۳) اگر ہم ان کو اس سے پہلے ہی کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے، اے ہمارے رب! تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیرے احکام کی پیروی کرتے۔ ۱۳۴) کہہ دیجئے ہر شخص انتظار کر رہا ہے تو تم بھی انتظار کرو، تم عنقریب جان لو گے کہ سیدھی راہ والے کون ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔ ۱۳۵)

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾

(اگر آپ کے رب کی جانب سے ایک فیصلہ پہلے طے نہ ہو چکا ہوتا اور ایک وقت مقرر نہ کر دیا ہوتا تو عذاب مسلط ہو کے رہتا۔ ۱۲۹)

عذاب میں تاخیر کا سبب

نبی کریم ﷺ جب قریش کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دیتے تو ان کی معاندانہ مخالفت پر تنبیہ کرتے ہوئے انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی ڈراتے، تو وہ بجائے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کے نہایت ڈھٹائی سے آنحضرت ﷺ کا منہ چڑاتے اور بار بار مطالبہ کرتے کہ وہ عذاب کہاں رک گیا ہے، وہ آ کیوں نہیں پاتا۔ معلوم ہوتا ہے یہ محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں ان کی اس مہمل بات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے جو پہلے سے طے ہو چکا ہے کہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی ہدایت کیلئے مبعوث کیا جاتا ہے تو اس قوم کو ایمان لانے اور ہدایت قبول کرنے کیلئے ایک مہلت دی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جیسے ہی کوئی انکار کرے تو سزا میں دھر لیا جائے بلکہ انہیں زیادہ سے زیادہ موقع دیا جاتا ہے تا کہ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں اور اچھی طرح اپنے انجام پر غور کر لیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو یہاں کلمہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ ان پر عذاب کب آئے گا اور یہ مہلت کب ختم ہو گی، اس کیلئے ایک اجل اور مدت معین کر دی جاتی ہے۔ جب وہ معین مدت آ پہنچتی ہے تو پھر عذاب کے آنے میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے اسی قانون اور فیصلے کے تحت اہلِ مکہ اور دوسرے عرب بھی جن تک یہ دعوت پہنچ چکی ہے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچے ہوئے ہیں اور اگر یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے رویئے اور کرتوتوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان پر اب تک عذاب نازل ہو چکا ہوتا۔

قرآنِ کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے اس بات کا وعدہ کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک آپؐ ان میں موجود ہیں اور جب عذاب کی مدت قریب آ جائے گی تو آپؐ کو اس وقت ہجرت کا حکم دے

Marfat.com

دیا جائے گا۔ آپ جیسے ہی ہجرت کر کے ان کے علاقے سے نکلیں گے تو پھر ان کی زندگیاں عذاب کیلئے مباح ہو جائیں گی۔ ہر امتِ دعوت کا آنے والے پیغمبر کے ساتھ وہی رشتہ ہوتا ہے جو جسم کا روح کے ساتھ۔ جسم اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک روح اس میں باقی ہے اور جب روح نکل جاتی ہے تو پھر جسم کو اولاً تو اس کے اہلِ خانہ ہی جلد از جلد دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر خدانخواستہ کوئی شخص ایسے حالات میں مرا جہاں کوئی پرسانِ حال نہ تھا تو اس کا جسم سڑنا اور ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح امتیں بھی اپنے نبیوں اور رسولوں کی موجودگی کے ساتھ زندہ ہوتی ہیں۔ ان کے نکل جانے کے بعد وہ ایک جسدِ بے روح کی مانند ہیں جن کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی ﴿۱۳۰﴾

(پس آپ صبر کریں ان کی دل دکھانے والی باتوں پر اور آپ تسبیح کریں اپنے رب کی حمد کے ساتھ، سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کریں اور دن کے اطراف میں بھی، تاکہ آپ نہال ہو جائیں۔ ۱۳۰)

آنحضرت ﷺ کو صبر کی تلقین اور نماز کی تاکید

دنیا کا سب سے مشکل کام کسی انسان میں حقیقی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ ایسی تبدیلی جس سے غلط افکار صحیح افکار میں ڈھل جائیں اور ہر فکری الجھاؤ صحیح سمت اختیار کر لے۔ اور سیرت و کردار کی تمام خرابیاں ایک ایک کر کے اصلاح پذیر ہو جائیں اور اگر اس مقصد کا ہدف کوئی ایک فرد نہیں بلکہ ایک ایسی قوم ہو جو فکری اور عملی خرابیوں میں تمام دنیا سے سبقت کر چکی ہو اور پھر اپنے خیالات اور اعتقادات میں اتنی راسخ اور جامد ہو کہ وہ تنقید کرنے والے اور ہمدردانہ رائے دینے والے کا منہ نوچ لینے سے بھی گریز نہ کرے اور اس کی کوشش یہ ہو کہ اس کے خیالات سے متصادم آواز حلق سے باہر نہ نکلنے پائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے اصلاح کام کرنے والے کو کس قدر دشواریوں، مخالفتوں، بدزبانیوں اور اذیتوں سے واسطہ پڑتا ہو گا۔ نبی کریم ﷺ ایسی ہی صورتحال سے دوچار اور ایسے ہی مراحل سے گزرنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اصلاح کے جس عمل کا آپ آغاز کر چکے تھے اور جس دین کی دعوت قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے اسے آپ کسی حد تک روک دیتے اور حالات میں بہتری کا انتظار کرتے۔ اس لئے کہ جس طرح چمگادڑوں کے احتجاج کے باوجود سورج اپنی کرنیں بکھیرنے سے رک نہیں سکتا، اسی طرح پیغمبر بھی اپنے وظیفۂ نبوت میں کسی طرح کی تخفیف پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے ہی حالات میں آنحضرت ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ اپنے دعوت کے کام کو جاری رکھئے۔ رہی ان لوگوں کی یاوہ گوئی اور بے ہودہ طرزِ عمل، آپ اس پر صبر کیجئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ صبر آسان کام نہیں۔ بدزبانی سے دل میں گھاؤ پڑ جاتے ہیں اور حد سے بڑھی ہوئی مخالفت ارادوں کو مضمحل کر دیتی ہے۔ اس لئے اس کے مقابلے کیلئے آپ نماز کو ذریعہ بنائیں کیونکہ بڑی سے بڑی مخالفت اور بڑی سے بڑی مصیبت کے مقابلے کیلئے قرآنِ کریم یہی مفید نسخہ تجویز کرتا ہے کہ صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو۔ نماز، نمازی میں وہ توانائی اور توکل علی اللہ کی وہ قوت اور دنیا کی بے ثباتی کا وہ یقین اور اپنی صداقت وحقانیت پر وہ اعتماد پیدا کرتی ہے جس سے بگڑے ہوئے حالات کا سامنا کرنا اور ہر کمزوری کو صبر کی زنجیر پہنا دینا آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں اگرچہ تسبیح اور تحمید کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے بعد تسبیح کیلئے اوقات کا ذکر فرما کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ مراد اس سے نماز ہے۔ تسبیح

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو ان تمام انتسابات سے پاک کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ۔اسی کو تنزیہہ کہتے ہیں۔ اور تحمید اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان تمام صفاتِ عالیہ سے متصف کرنا ہے جو اس کی شان کے لائق ہیں۔ اسی لئے یہاں تسبیح کو حمد کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔ مقصود اس سے اللہ تعالیٰ کی وہ یاد ہے جو علائق و وسائط کی تمام کمزوریوں سے پاک اور تمام ان اعلیٰ صفات سے متصف ہو جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ایسی یاد عملی شکل میں اگر کہیں متشکل ہوتی ہے تو وہ نماز ہے۔

اوقاتِ نماز کا تعین

نماز کے اوقات کا تعین کرتے ہوئے فرمایا گیا قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ''سورج کے طلوع اور غروب سے پہلے۔'' اس سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔ بخاری شریف میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور سب سے پہلے ان دونوں نمازوں کا ذکر ان کی اہمیت کے پیشِ نظر کیا گیا ہے۔

مزید فرمایا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ ''رات کے وقتوں میں نماز پڑھو'' اس سے مراد عشاء اور تہجد کی نمازیں ہیں۔ فَسَبِّحْ کو دوبارہ لا کر ان دونوں نمازوں کی تاکید کرنا مقصود ہے کیونکہ یہ دونوں نمازیں نفس پر بہت شاق گزرتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہوا شخص جلدی سو جانا چاہتا ہے۔ اس لئے عشاء کی نماز اس کیلئے گراں ہوتی ہے اور تہجد کی نماز کا وقت گہری نیند کا وقت ہوتا ہے جس سے اٹھنا اور پھر اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا نفس کو روندنے کے مترادف ہے۔

وَاَطْرَافَ النَّهَارِ ''اور دن کے کناروں میں نماز پڑھو'' اس سے مراد ظہر، مغرب اور چاشت کی نمازیں ہیں۔ چاشت اور مغرب کا اطرافِ نہار میں ہونا تو واضح ہے۔ جہاں تک ظہر کا تعلق ہے اس کے سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ دن دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ظہر کا وقت دن کے پہلے حصے کے آخری کنارے اور دوسرے حصے کے ابتدائی کنارے پر ہے۔

لَعَلَّكَ تَرْضٰى ''تا کہ آپ خوش ہو جائیں، یا شاید آپ راضی ہو جائیں۔''

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ مخالفین کی بدزبانیوں اور اذیت رسانیوں سے یقیناً آپ کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن اگر آپ نے صبر کو بہمہ وجوہ اختیار کر لیا اور نماز کی گہرائیوں میں ڈوب گئے تو آپ کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ یہ تکلیفیں اس راستے کی لازمی سنتیں ہیں جنہیں اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ تاریکی کے بعد سحر طلوع ہوتی ہے اور ہر تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے۔ آپ دعوت و تبلیغ کے جن جانگسل مراحل سے گزر رہے ہیں، یہ نہ سمجھئے کہ حالات ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اپنا رنگ دکھائے گی اور بہت جلد انہیں تکلیفوں اور مشقتوں سے وہ مراحل جنم لیں گے جس میں ہر مرحلے کے بعد نئی سے نئی کامیابی کا سورج طلوع ہوگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسلام کا قافلہ آگے بڑھتا جائے گا اور یہ آج کے مخالف یا تو تحلیل ہو جائیں گے اور یا اسلام کی آغوش میں آ جائیں گے۔ آج کے پریشان کرنے والے کل کو آپ کے راستے میں جانیں نچھاور کرنا اپنے لئے سعادت سمجھیں گے۔ اسلام ایک مضبوط قوت بن جائے گا حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا کہ سارا جزیرۂ عرب آپ کے قدموں میں ہوگا۔ مکہ جو مرکزِ اعصاب ہے، اس کے سقوط کے بعد قوت و ہیبت آپ کے قدموں سے پھوٹے گی۔ جس طرح سورۃ والضحیٰ میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہاں بھی یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اس وقت آپ اپنی کامیابیوں اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو دیکھ کر نہال ہو جائیں گے۔

Marfat.com

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾

(آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے کافروں کے چند گروہوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے۔ یہ محض زیب و زینت ہے دنیوی زندگی کی تاکہ ہم انہیں ان سے آزمائیں اور آپ کے رب کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ١٣١)

آیت کی ترکیب

آیت کی ترکیب:۔ ایک صورت یہ ہے کہ اَزْوَاجًا کو مَتَّعْنَا کا مفعول بنایا جائے، تو مِنْهُمْ اس کی صفت ہوگی، ایسی صورت میں معنی ہوگا ''کافروں کے مختلف گروہ۔'' دوسری صورت یہ ہے کہ اَزْوَاجًا حال ہو اور بِہٖ کی ضمیر ذُو الْحَال۔ اس وقت مِنْهُمْ مَتَّعْنَا کا مفعول بِہٖ ہوگا اور مِنْ تبعیض کیلئے ہوگا۔ اس صورت میں تقدیر کلام یوں ہوگی ''مَتَّعْنَا بِهٖ بعضهم حال كون الممتنع به اصناف من المال'' اور زَهْرَةُ الْحَيٰوة فعل محذوف اَعْطَيْنَاهُمْ کا مفعول ہوگا او اگر اس کو مَتَّعْنَا کا مفعول بنایا جائے تو اس وقت یہ ماننا پڑے گا کہ مَتَّعْنَا اَعْطَيْنَا کے معنی کو متضمن ہے۔ یعنی دنیا کی آرائش و رونق۔

آیت کے مختلف مفاہیم

اس آیتِ کریمہ کے مختلف مفاہیم ہو سکتے ہیں۔ ایک مفہوم تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا نبوت کے ابتدائی سالوں میں یہ طریقہ رہا کہ آپؐ اشراف قریش کو اپنی دعوت کا ہدف بناتے تھے۔ آپؐ کا دیگر انبیائے کرام کی طرح یہ خیال تھا کہ لوگ ہمیشہ اپنے حکمرانوں یا اپنے امراء کے پیچھے چلتے ہیں۔ اگر بڑے بڑے امراء اللہ تعالیٰ کا دین قبول کر لیں تو ان کا اثر و اقتدار دین کے کام آئے گا اور اس راستے کی بہت سی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ اسی طرح انہیں جو دولت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے جب وہ اسلام کی حقیقت کو سمجھ لیں گے تو یہی دولت اسلامی کی نشر و اشاعت اور غریب لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں صرف ہوگی۔ چنانچہ آپؐ حضرت صدیق اکبرؓ کو ساتھ لے کر حج کے ایام میں قبائل کے سرداروں سے ملتے۔ اور عام دنوں میں قریش کے روساء آپؐ کی خصوصی توجہ کا مرکز بنتے اور شاید اسی خیال کے تحت آپؐ نے طائف کا سفر فرمایا اور طائف کے تین بڑے سرداروں سے ملاقات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب آپؐ کی کوششیں اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق بار بار ناکام ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو امرائے قریش اور سردارانِ قبائل کی طرف زیادہ متوجہ ہونے سے روک دیا، بلکہ بعض دفعہ توجہ دلائی کہ جو غریب لوگ آپؐ کی وفاداری کا عہد کر چکے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لا چکے ہیں۔ یہی درحقیقت اسلام کا حقیقی اثاثہ ہیں۔ آپ انہیں پر زیادہ توجہ مبذول کریں۔

آپؐ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ بڑے لوگوں کا اثر و رسوخ اور ان کی دولت اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ انہیں اسلام قبول کر کے ان نعمتوں کا حق ادا کرنا چاہئے۔ بڑے بدنصیب ہیں کہ قدرت نے انہیں نوازا ہے اور وہ ناشکری پر تلے ہوئے ہیں۔ قیامت میں یہ لوگ جہاں کفر

Marfat.com

کی پاداش میں پکڑے جائیں گے وہیں ناشکری کی سزا بھی پائیں گے۔ لیکن آپؐ کو ان کے مال و دولت کی زیادہ پرواہ نہیں کرنی چاہئے کہ یہ اسلام کے کام آتی تو اچھا ہوتا اور کل کو یہ لوگ اسی جرم میں زیادہ سزا پائیں گے کیونکہ ہم نے انہیں یہ دولت اس لئے عطا فرمائی ہے کہ ہم اس کے ذریعے انہیں آزمانا چاہتے ہیں۔ تو اگر وہ اس آزمائش میں ناکام ہو رہے ہیں تو آپؐ اس سے دل گرفتہ نہ ہوں۔

دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن روئے سخن آپؐ پر ایمان لانے والوں کی طرف ہے۔ غریب لوگ جب دیکھتے تھے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت سے انکار کرتے اور قدم قدم پر آنحضرت ﷺ کی نہ صرف مخالفت کرتے ہیں بلکہ آپؐ کو اور مسلمانوں کو اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دولت کے انبار دے رکھے ہیں۔ انہیں اقتدار اور رسوخ حاصل ہے اور وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ رہے ہم لوگ، ہم اسلام کی خاطر تکلیفیں اٹھاتے اور دکھ جھیلتے ہیں لیکن ہمیں نان شبینہ تک نصیب نہیں ہوتا۔ یہ دنیادار لوگ ہمیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے منظورِ نظر ہوں اور اسی وجہ سے انہیں نوازا گیا ہو۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے گرے ہوئے لوگ ہوں اور اسی وجہ سے ہمیں دکھوں میں مبتلا کیا گیا ہو۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے فرمایا گیا ہے کہ جن لوگوں کو آپ سمجھتے ہیں کہ نوازا گیا ہے، وہ درحقیقت آزمائش میں مبتلا کئے گئے ہیں۔ لیکن وہ اپنی حماقت میں اپنی آزمائش کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کی دلیل سمجھ رہے ہیں اور آپ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں تقرب، عیش و عشرت اور کثرتِ دولت سے نہیں ملتا، وہاں تو صرف ایمان و عمل کی قدر کی جاتی ہے جس سے بفضلہٖ تعالیٰ آپ بہرہ ور ہیں۔ یہ تو قیامت کے دن معلوم ہوگا کہ یہ لوگ اپنی آزمائش میں ناکام ہونے کے بعد کس ہولناک سزا میں مبتلا کئے جائیں گے۔ آج یہ مچھلی کی طرح خود فریبی میں مبتلا ہیں جو شکاری کی کنڈی کو گوشت لگا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی ہے کہ مجھے آج گوشت کھانے کو ملا ہے اور شوق سے اس پر منہ مارتی ہے لیکن شکاری اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کب کانٹا اس کے حلق سے نیچے اترے اور میں اسے باہر کھینچوں، لیکن مچھلی کو احساس نہیں ہوتا کہ میں اپنے برے انجام کی طرف بڑھ رہی ہوں۔

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پر شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

ان کا حال بھی اس سے مختلف نہیں، لیکن آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

آنحضرت ﷺ کا بلند مرتبہ

وَرِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی "اور آپ کے رب کا رزق بہتر اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔" آیت کے اس حصے میں نبی کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ آپ اگرچہ دینی مصالح کے پیشِ نظر دولت مندوں کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور یہ بھی پیشِ نظر ہوتا ہے کہ کاش ان کی دولت اسلام کے کام آتی۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کے پروردگار نے آپ کیلئے جو عطا و بخشش، نورِ ہدایت، سعادتِ نبوت اور مراتبِ عالیہ کا جو رزق مقدر کیا ہے اس کے مقابلے میں دولتِ دنیا کی کیا حیثیت ہے۔ یہ دنیا کی بہار چند روزہ ہے جس پر کسی وقت بھی خزاں کا حملہ ہو سکتا ہے۔ یہاں کا عیش و عشرت اور یہاں کی مجالسِ طرب ہمیشہ قوموں کیلئے تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کمالات آپ کو عطا فرمائے ہیں اور آپ کے دم سے دنیا میں جس بہار کے پھول کھلنے لگے ہیں اور انسانی زندگی پر جس طرح ایک پائیدار بہار آنے لگی ہے اور آپ کے فیضان سے جس طرح افکار و کردار کی کھیتی روز بروز بارآور ہو رہی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی وہ عطا ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔

Marfat.com

جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوگا، وہاں آپ کی منقبت کے قصیدے بھی پڑھے جائیں گے۔ آپ کی عظمت کا پرچم تو قیامت کے دن بھی سرنگوں نہیں ہوگا بلکہ اس روز بھی آپ امامتِ کبریٰ کے منصب پر فائز کیے جائیں گے۔

امت کیلئے درس

اور اگر یہ سمجھا جائے کہ اس جملے میں روئے سخن آنحضرت ﷺ کے واسطۂ گرامی سے اس امت کی طرف بھی ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کو دنیا کے خزف ریزوں کو اپنی چاہت بنانا زیب نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قوموں کی قیادت کیلئے اٹھایا ہے۔ درہم و دینار کسی اور کا ہدف تو ہو سکتے ہیں لیکن جس امت کی ذمہ داری یہ ٹھہرائی گئی ہے کہ اہلِ دنیا کو فکر کی بلندی، عمل کی پختگی، نیت کی صفائی، اخلاق کی وسعت، دل و دماغ کی طہارت، خلقِ خداوندی کے ساتھ رحمت و مودت، گمراہی سے نفرت، حق کیلئے غیرت و حمیت جیسی صفات عطا کرے اور اللہ تعالیٰ کی دھرتی کو اللہ تعالیٰ کے دین کا مورد بنا کر خلقِ خدا کو پرامن زندگی کی ضمانت دے۔ اس کے پاس یہ وقت کہاں ہے کہ وہ دنیا کے خزف ریزوں کو تلاش کرتی پھرے۔ ضروریاتِ زندگی سے اسے بھی فارغ نہیں رکھا گیا لیکن اسے ضروریات کو مقصد بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جس طرح جانوروں میں ایک شاہین بھی ہے اسے زندگی کے جو اہداف دیئے گئے ہیں وہ باقی جانوروں سے بالکل مختلف ہیں۔ انسانوں میں امتِ مسلمہ کو شاہین صفت بنایا گیا ہے۔ یہ زندگی کی ضروریات کو شاہین ہی کی طرح حاصل کرتی ہے لیکن اس کے اہداف ہمیشہ اس پر حاوی رہتے ہیں۔ اقبال نے یہی بات واضح کرنے کیلئے شاہین کی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

(اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دیجئے، اور خود بھی اس پر جمے رہیے، ہم آپ سے روزی کا سوال نہیں کرتے بلکہ ہم ہی آپ کو روزی دیں گے، اور اچھا انجام پرہیزگاری کا ہی ہوتا ہے۔ ۱۳۲)

Marfat.com

تربیت کیلئے نماز کی اہمیت

دعوت الی اللہ کے کام میں جس طرح مخالفین کی مخالفت اور معاندت اور ان کی بے ہنگم زبان سے نکلنے والے شعلے اور ان کی عقربی فطرت سے ٹپکنے والا زہر رکاوٹ بنتا اور پریشان کرتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی اپنی بے بسی اور غربت اور مخالفین کی فارغ البالی اور امارت وسطوت بھی سوچ کا عنوان بن جاتی ہے۔ ان دونوں قباحتوں اور رکاوٹوں پر قابو پانے کیلئے تسبیح وتحمید یعنی نماز کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی گئی کہ زخارفِ دنیا کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے گا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تقرب کا ذریعہ نہیں بلکہ آزمائش ہے جس سے کسی قوم کو آزمایا جاتا ہے۔ انسان کے پاس وہ چیز جس پر فخر کیا جا سکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق، دنیا سے بے رغبتی اور خلقِ خدا کی اصلاح کی فکرمندی کا جذبہ ہے۔ اسی سے انسانیت کا جوہر ہاتھ آتا ہے، اسی سے دل کی دردمندی، عفو ودرگزر اور ہمدردی وخیرخواہی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اسی سے وہ مضبوط کردار جنم لیتا ہے جن سے انسانیت فروغ پاتی ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کی اہمیت کے پیشِ نظر اس آیتِ کریمہ میں دوبارہ نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ آیت میں بھی نماز کا حکم دیا گیا تھا لیکن اس کے مخاطب صرف آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی تھی۔ اس آیت میں آپ کے اہل کیلئے بھی نماز کی تاکید کی گئی ہے۔ اور خود آنحضرت ﷺ کو اس کی نگرانی اور اس کی پاسداری کا حکم دیا گیا ہے۔

اہل کا مفہوم

آیتِ کریمہ میں اہل کا لفظ استعمال ہوا ہے بعض لوگوں نے اس سے صرف اہلِ بیت کو مراد لیا ہے اور اہلِ بیت میں بھی نبی کریم ﷺ کے علاوہ صرف چار نفوسِ مقدسہ کو شامل کیا گیا ہے جبکہ اہل بیت لغت اور اصطلاح کے حوالے سے ہمیشہ بیوی بچوں کو کہا جاتا ہے اور اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ بیوی کی موجودگی کے باوجود اسے اہلِ بیت میں شامل نہ کیا جائے۔ لیکن عام آدمی کے اہل اور پیغمبر کے اہل میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ جب میں اپنے اہل کی بات کرتا ہوں تو اس سے مراد بیوی اور بچے ہوتے ہیں لیکن جب نبی کریم ﷺ اپنے اہل کی بات فرماتے ہیں اور پروردگار آپ کے اہل کے بارے میں کوئی حکم دیتا ہے تو اس سے مراد صرف بیوی بچے، آپ کے داماد اور نواسے ہی نہیں بلکہ تمام امت کے صاحبِ ایمان وعمل لوگ ہیں کیونکہ اہلِ لغت کے نزدیک اہل خصوصی تعلقات والوں کو کہا گیا ہے۔ لسان العرب میں ہے اھل الرجل اخص الناس به ''اھل الرجل سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس شخص سے خاص تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اھل کل نبی امته ''نبی کے اہل سے اس کے امتی مراد ہوتے ہیں۔'' آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کل تقی نقی فھو آلی ''ہر متقی اور پرہیزگار آدمی میری آل ہے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو ہدایت کی جارہی ہے کہ آپ کی امت کے وہ لوگ جو آپ کے قریب اور آپ کے زیرِ تربیت ہیں کو خصوصی طور پر نماز کا حکم دیں اور پوری امت کو عمومی طور پر آپ اس کی تاکید فرمائیں اور پھر خود بھی اس پر اصطبار اختیار کریں، یعنی آپ نماز کی پابندی بھی کریں اور اپنے زیرِ تربیت لوگوں سے اس کی پابندی کروائیں اور ان کی اس طرح دیکھ بھال اور نگرانی کریں جس طرح ایک کسان اپنے کھیت کی نگرانی کرتا ہے۔ کیونکہ نماز کی وجہ سے ہر شخص کا اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق پیدا ہوگا جیسا ایک مسلمان کا ہونا چاہئے۔ اس سے دل ودماغ میں اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے، اس کے قادرِ مطلق ہونے اور اس کی کبریائی رگ وپے میں بس جانے، اسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانے، اسی سے مشکل وقت میں استمداد کرنے اور اسی پر ہر حال میں بھروسہ رکھنے اور دشمنوں کی ہر طرح کی مخالفتوں کا سامنا کرنے کا وہ ذوق پیدا ہوگا جس سے سیرت وکردار میں پختگی آئے گی، اللہ تعالیٰ کے آستانے سے گہرا تعلق پیدا ہوگا

Marfat.com

اور زندگی کے ہر گوشے میں وہ چراغ روشن ہوں گے جس سے قلب ونگاہ کی ہر تاریکی دور ہو جائے گی۔ دنیا طلبی کا بحران سرد ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب باقی ہر طرح کی طلب پر غالب آ جائے گی۔

لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ط نَحْنُ نَرْزُقُكَ ''ہم آپ سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ آپ کو رزق ہم دیں گے۔'' ہم آپ اور آپ کے متبعین کیلئے رزق کی ذمہ داری اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا بار آپ پر نہیں ڈال رہے۔ آپ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف رہئے اور اپنے ماننے اور خصوصی تعلق رکھنے والوں کی نگرانی کیجئے کہ ان کے اندر کسی طرح کا تساہل نہ آنے پائے۔ اس عظیم اور کٹھن کام کی مصروفیات میں یقیناً آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو کسبِ معیشت کے مواقع بہت کم ملیں گے۔ اس لئے ہم نے اس کی ذمہ داری خود قبول کر لی ہے تاکہ آپ دعوت الی اللہ اور دنیا کی اصلاح کے کام میں پوری طرح توجہ دے سکیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام کوئی بھکشوؤں یا راہبوں کے گروہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ہر شخص پر اپنی اور بیوی بچوں کی ضروریات فراہم کرنے کا فرض عائد کیا ہے۔ لیکن جن حالات سے اس وقت مسلمان گزر رہے تھے اس میں اس فرض کی ادائیگی کا امکان بہت کم تھا اور مزید یہ بات بھی کہ اگر مسلمان ضروریات کی فراہمی میں لگ جاتے جبکہ وہ اسلام کا ہراول دستہ تھے تو اسلام کی بالادستی، نشر واشاعت اور عمومی غلبے کا کام پوری طرح کبھی نہ ہو سکتا۔ اس لئے پروردگار نے اس کا انتظام فرمایا کہ جیسے جیسے اسلامی قافلہ آگے بڑھا، فتوحات کے دروازے کھل گئے اور مفتوح ملکوں کی دولت مسلمانوں کے قدموں میں ڈھیر ہونے لگی۔ بجائے اس کے کہ وہ دولت کو ڈھونڈتے، دولت انہیں ڈھونڈ کر ان کے گھروں تک آ پہنچی۔

ایک قیمتی اشارہ

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ''اور اچھا انجام پرہیزگاری کیلئے ہے۔'' اس میں اشارہ شاید اس طرف ہے کہ تمہیں اپنی ضروریات کی فراہمی کیلئے ضرور محنت کرنی چاہئے۔ دینے والا ہاتھ لینے والے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ لیکن باقی دنیا کی طرح تم ضروریاتِ زندگی کو زندگی کا مقصد کبھی نہ بنانا۔ تقویٰ جو تربیتِ نفس اور ایفائے عہدِ خداوندی اور دین کی بالادستی کا ایک جامع عنوان ہے اسے زندگی کا مقصد بھی ہونا چاہئے اور منزل بھی۔ انسان کی بنیادی ضروریات کوئی زیادہ نہیں اور ان کی فراہمی کیلئے بہت زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑتی۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب زندگی میں تکلفات پیدا ہوتے ہیں اور پھر یہ بڑھتے بڑھتے تعیّشات تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب انسان ان تعیّشات کا رسیا ہو جاتا ہے تو اسے ان کے حصول کیلئے زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کرنا اور صلاحیتوں کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اسے تقویٰ کے خلاف کہا اور یہ ہدایت کی کہ تمہاری زندگی چیونٹی کی طرح خاک بسری میں نہیں گزرنی چاہئے بلکہ تمہارا اصل ہدف شاہین کی طرح آسمان کی وسعتوں میں بلند پروازی ہو۔ البتہ اس کیلئے جو بنیادی ضرورتیں چاہئیں اس کی فراہمی سے بھی دریغ نہیں ہونا چاہئے اور ذہن میں ہمیشہ یہ بات رہے کہ اچھا انجام اللہ تعالیٰ نے صرف اہلِ تقویٰ کیلئے رکھا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہدِ وفا کو کبھی شکست نہیں ہونے دیتے، کبھی اس کی نافرمانی ان کی زندگی میں در آنے کی جرأت نہیں کر سکتی اور ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے اور بالادستی کیلئے صرف ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾

(اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اپنے رب کے پاس سے ہمارے لئے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے، کیا ان کے پاس وہ بینہ نہیں آئی جو پہلے صحیفوں میں ہے۔ ۱۳۳)

Marfat.com

نشانی کا مطالبہ کرنے والوں کو جواب

اہلِ مکہ اور اشرافِ قریش جب آنحضرت ﷺ کے دلائل کے سامنے بے بس ہو جاتے اور قرآنِ کریم کی معجزانہ بلاغت ان کی زبانیں گنگ کر دیتی تو وہ بجائے ہدایت قبول کرنے یا اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے آنحضرت ﷺ پر حملہ آور ہوتے اور اگر صحابہ کرام سے گفتگو ہوتی تو ان سے بھی یہی کہتے کہ یہ صاحب اگر اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو جیسے پہلے رسولانِ گرامی نے بڑے بڑے حسی معجزات دکھائے ہیں تو ایسا کوئی حسی معجزہ جس کے بعد انکار کرنا مشکل ہو جائے یہ کیوں نہیں دکھاتے۔ چونکہ اس طرح کے سوالات عموماً اہلِ مکہ اہلِ کتاب کی انگیخت سے کرتے تھے اس لئے اس آیتِ کریمہ میں انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اس نبی کی صداقت اور حقانیت پر کوئی واضح دلیل یا نشانی مانگتے ہو تو کیا تمہارے پاس پہلے صحیفوں کی نشانی نہیں پہنچی، یعنی وہ تو تمہارے ہاتھوں میں ہے اور تم ان کتابوں میں پڑھتے بھی ہو کہ اس میں نبی آخر الزمان ﷺ کی صفات اور احوال کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور ہمارے یہ رسول انہی صفات کے مصداق، مصدق اور حامل بن کر آئے ہیں۔ ان کتابوں میں آج بھی نبی آخر الزمان ﷺ کے بارے میں جو تفصیلات موجود ہیں ان کا آنحضرت ﷺ کے حالات سے تقابل کر کے دیکھو، کیا ان میں کوئی فرق ہے۔

اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک جتنے صحیفے اور کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہیں ان میں بیشتر تو تاریخ کی نذر ہو چکیں۔ البتہ! تورات، زبور اور انجیل اب بھی اہلِ کتاب کے ہاتھوں میں ہیں۔ ان کے اہلِ علم انہیں پڑھتے بھی ہیں۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ ان میں عقائد، احکام اور معروفات کی کیا تفصیلات دی گئی ہیں۔ آج جبکہ قرآنِ کریم نازل ہو رہا ہے تو کیا وہ دیانتداری سے محسوس نہیں کرتے کہ قرآنِ کریم نے پہلی آسمانی کتابوں کی تعلیمات کی روح کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ ان کے وہ احکام جو ابدی تھے وہ قرآنِ کریم میں اسی طرح یا مزید صحت مند اضافوں کے ساتھ ذکر دیئے گئے ہیں۔ اور کوئی ایسی بات جو انسانی فلاح و بقا کیلئے ضروری تھی اس میں تشنگی باقی نہیں رہنے دی گئی جبکہ سب جانتے ہیں کہ جس رسول اکرم ﷺ پر یہ کتاب اتری ہے وہ خود امی محض ہیں، اُمی ماحول میں پلے بڑھے جس میں علم کے ادنیٰ تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔ بایں ہمہ انہوں نے ایسی کتاب پیش کی ہے جس کے بارے میں سعدی نے ٹھیک کہا تھا:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

اس کتاب کی فصاحت و بلاغت، غیر معمولی اندازِ بیان، اس کے در و بست کی پختگی اور اس میں پیش کردہ نظامِ زندگی میں باہمی حیران کن ربط، زندگی کے اہم معاملوں پر محاکمہ، انسانی عروج و زوال کے مسلمات، پہلی آسمانی کتابوں کی تحریفات کی اصلاح، سابقہ آسمانی کتابوں کی بعض ابتدائی ہدایات کی تکمیل اور قیامت تک انسانی ضرورتوں کے حوالے سے مکمل ضابطۂ حیات ایسی صفات ہیں جس نے دنیائے علم کو اس کے سامنے سرنگوں کر دیا ہے۔ کیا اہلِ کتاب کو اس دلیل کے علاوہ اور بھی کسی دلیل کی ضرورت ہے۔

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

Marfat.com

اگر ہم ان کو اس سے پہلے ہی کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے، اے ہمارے رب! تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیرے احکام کی پیروی کرتے۔ ۱۳۴)

اس آیتِ کریمہ میں روئے سخن مشرکین کی جانب ہے کیونکہ سابقہ آیتِ کریمہ میں جو مطالبہ کیا گیا ہے اس کی انگیخت اگر چہ اہلِ کتاب کی طرف سے تھی لیکن پیش کرنے والے مشرکین تھے۔ اس لئے پہلے اہلِ کتاب کو اس کا جواب دیا گیا، اب مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ نادانو! تم بار بار آیتِ عذاب کے نزول کا مطالبہ کرتے ہو اور اتنی بات نہیں سمجھتے کہ کیا عذاب آ جانے کے بعد تمہیں اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی مہلت ملے گی۔ عذاب سے تو تمہاری جڑ کٹ جائے گی اور آخرت کا عذاب تمہاری اس جسارت کی وجہ سے اور زیادہ سخت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر رحم فرمایا کہ تمہاری جسارتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بجائے عذاب بھیجنے کے تمہاری اصلاح کیلئے رسول بھیجا۔ اب کس قدر حماقت کی بات ہے کہ تم رسول پر ایمان لانے کی بجائے جو دنیا میں رحمت کا پیغامبر بن کر آیا ہے، اس سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو۔ عذاب تو ہم تمہاری خرمستیوں کی وجہ سے رسول کی بعثت سے پہلے بھی تم پر نازل کر سکتے تھے، لیکن پھر قیامت کے دن تم ضرور اپنے رب سے یہ کہتے کہ پروردگار تو نے کسی رسول کو بھیج کر ہمیں ہدایت دینے سے پہلے ہی سزا دے ڈالی، حالانکہ اگر ہماری طرف رسول بھیجا جاتا تو ہم ضرور اس کا اتباع کرتے۔ وہ تیرے احکام ہمیں سناتا تو ہم تیرے احکام کی اطاعت کرتے۔ لیکن تو نے بجائے رسول بھیجنے کے ہماری ذلت و رسوائی کا سامان کر دیا۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے تمہارے اس اعتراض کی بنا پر تمہاری طرف رسول بھیجا تاکہ تمہیں یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ ملے۔ اب بجائے اللہ تعالیٰ کے رسول کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو، سوچ لو اس کا انجام کیا ہوگا۔

ذلت اور خزی عام استعمال میں ہم معنی ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی کتاب میں دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو پھر ان دونوں میں خفیف سا فرق بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ذلت اس احساس کو کہتے ہیں جو ذلت میں مبتلا ہونے والا شخص محسوس کرتا ہے۔ اور خزی اس رسوائی کو کہتے ہیں جسے دوسرے دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی بھی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو وہ ان دونوں طرح کے احساسات سے گراں بار ہوتی ہے۔ دوسری قومیں انہیں دیکھ کر عبرت حاصل کرتی ہیں اور وہ اپنے تئیں ذلت کی تصویر بن جاتے ہیں۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾

(کہہ دیجئے ہر شخص انتظار کر رہا ہے تو تم بھی انتظار کرو، تم عنقریب جان لو گے کہ سیدھی راہ والے کون ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔ ۱۳۵)

آخری وارننگ

یہ اس سورۃ کی آخری آیت ہے۔ اہل مکہ کو تفہیم اور انذار کی حد تک جو کچھ کہنا تھا وہ مکمل ہو گیا۔ اب اس آیت میں آخری وارننگ دی جا رہی ہے اور شدت عتاب کا عالم یہ ہے کہ اب براہِ راست مشرکین سے خطاب فرمایا جا رہا ہے۔ اب تک غائب کے صیغوں میں بات ہو رہی تھی لیکن اب دھمکی اور وارننگ کیلئے تخاطب کا انداز اختیار کیا گیا۔ فرمایا گیا ہے کہ تم اگر کسی بھی معقول بات کو سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہو، پیغمبر کی غیر معمولی شخصیت اور اس کا بے عیب کردار اور قرآنِ کریم کا معجزانہ اسلوب بھی تمہیں اپیل نہیں کرتا تو پھر تم انتظار کرو۔ کیونکہ آج جس طرح مسلمان شب و روز کی مساعی کا پھل دیکھنا چاہتے ہیں اس طرح شیطانی قوتیں اپنی نامرادی کے انجام کو دیکھنے کی متمنی ہیں۔ وہ تو اپنے تئیں

Marfat.com

دعوت الی اللہ کے اس کام کو ناکام کرنے میں لگی ہوئی ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے برے انجام کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اب ان انتظار کرنے والوں کی نگاہوں میں آخری پیمانہ یہ ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں کون غالب آتا ہے اور کون اپنے برسرحق ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ تم بھی اسی پیمانے اور اسی زاویئے سے آنے والے حالات کا انتظار کرو۔ عنقریب تم دیکھ لوگے کہ یہ قافلۂ حق جو وسائل کے اعتبار سے بالکل تہی دامن ہے اور جس کے افراد دہائیوں میں گنے جاسکتے ہیں کس طرح چند سالوں میں اس ملک کی غالب قوت بن کر ابھرتا ہے اور کس طرح جزیرۂ عرب کی حد تک حق سربلند ہوتا ہے اور کس طرح غلط راستوں پر چلنے والے اور مخالفت کرنے والے اپنے زخم چاٹنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ چند ہی سالوں میں اس وارننگ نے حقیقت بن کر دکھایا۔ بے بس اور بے کس لوگوں کا یہ قافلہ ایک طاقت بن کر اٹھا اور 8 ہجری میں کفر کی قوتوں کا مرکز مکہ سرنگوں ہوگیا اور پھر دو ہی سالوں میں جزیرۂ عرب کے ایک ایک گوشے میں اللہ تعالیٰ کا نام گونجنے لگا۔ ہر طرف سے کفر اور شرک کے آثار مٹا دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اسلام کی صداقت لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاس

سُوْرَۃُ الْاَنْبِیَآءِ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوۡرَةُ الۡاَنۡبِيَآءِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نام:۔

اس سورت میں بہت سے انبیائے کرام کا ذکر کیا گیا ہے۔اس مناسبت سے اس سورت کا نام الانبیاء تجویز کیا گیا ہے۔یہ نام نہ تو کسی آیت سے ماخوذ ہے اور نہ یہ اس کا عنوان ہے بلکہ محض شناخت کیلئے ایک علامت ہے۔

زمانۂ نزول:۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سورۃ الکھف اور مریم اور طٰہٰ اور انبیاء یہ چاروں سورتیں نزول کے اعتبار سے ابتدائی سورتیں ہیں اور میری یہ قدیم دولت اور کمائی ہیں جن کی میں ہمیشہ حفاظت کرتا ہوں۔(قرطبی) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے اس قول سے گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ سورۃ ابتدائی زمانے میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔اس کے مضمون اور اندازِ بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔اور یہ بات بھی تقریباً مسلمہ ہے کہ یہ سورۃ بتمام وکمال مکی ہے،اس میں ہجرت کے بعد نازل ہونے والی کوئی آیت شامل نہیں۔اس میں ۷رکوع ۱۱۲آیات،۱۱۸۶کلمے اور ۴۸۹۰حروف ہیں۔

باقی مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد پر زور دیا گیا ہے اور اس کے مندرجات سے وہ کشمکش بھی جھلکتی نظر آتی ہے جو ان عقائد کے ردعمل میں نبی کریم ﷺ اور سردارانِ قریش کے درمیان برپا ہوچکی تھی۔چنانچہ اسی نسبت سے اس سورت میں تفصیل سے ان کے بعض اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کا جواب دیا گیا ہے۔خصوصیت سے جن اعتراضات کو قریش بہت اہمیت دیتے تھے بلکہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے وہ مندرجہ ذیل تھے۔

1- ان کے ذہنوں میں یہ بات پیوست ہوچکی تھی کہ انسان کی اصل شناخت ہم ہی لوگ ہیں کیونکہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور بیت اللہ کے متولی ہونے کی وجہ سے انسانوں میں خصوصی شرف کے حامل ہیں۔تو ہم جیسے لوگوں میں وہ صفات کیسے پیدا ہوسکتی ہیں جو نبوت سے میل کھاتی ہیں۔نبوت ایک عظیم منصب ہے جس کی عظمت کا بوجھ انسان تو کم از کم بالکل نہیں اٹھا سکتا۔اس کیلئے کوئی فرشتہ ہونا چاہئے یا کوئی اور ایسی مخلوق جو غیر معمولی فضائل کی حامل ہو۔محمد (ﷺ) ہماری قوم کے ایک فرد ہیں۔ہماری طرح ایک انسان اور بشر ہیں۔ہمارے ایک بھائی کے بیٹے اور ہم ہی میں سے کسی کے بھتیجے اور کسی کے بھانجے ہیں۔قریش ہی کی ایک معزز شاخ میں ان کی شادی ہوئی ہے۔ہماری طرح وہ بھی اولاد رکھتے ہیں۔کسی بات میں وہ ہم سے مختلف نہیں ہیں۔تو پھر یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت جیسے عظیم منصب کا

Marfat.com

تاج ان کے سر پر سجا دیا ہے۔ وہ یقیناً بشر ہیں، تو بشر نبی یا رسول نہیں ہوسکتا۔ رہی یہ بات کہ ان کی ذات میں ایک کشش ہے، ان کے کلام میں تاثیر ہے، ان پر اترنے والی کتاب ہر لحاظ سے بینظیر ہے۔ تو یہ سب باتیں دراصل ان کی ذات کا حصہ نہیں بلکہ جادو کا اثر ہیں۔ وہ ایک جادوگر ہیں اور جادو کے فن سے وہ لوگوں کو متاثر کر لیتے ہیں۔

2- علاوہ ازیں اور بھی متعدد اعتراضات آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور قرآنِ کریم پر قریش کی طرف سے کئے جاتے تھے لیکن کسی اعتراض پر بھی وہ جمتے نہیں تھے۔ حالات کے مطابق اعتراضات اور الزامات بدلتے رہتے تھے۔ اس سورۃ میں ان پر گرفت کی گئی ہے اور نہایت مؤثر جواب دیئے گئے ہیں۔

3- قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کے بارے میں ان کا طرزِ عمل نہایت غیر سنجیدہ تھا۔ وہ آپؐ کی شخصیت کی دلآویزی اور قرآنِ کریم کی دلنشینی سے بہت گھبراتے تھے۔ اس لئے کبھی تو شور برپا کر کے آپؐ کی دعوت کو بے اثر کرنے کی کوشش کرتے۔ جب آپؐ اس پر انہیں تنبیہ کرتے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے۔ آپؐ انہیں جوابدہی کا احساس دلانے کی کوشش کرتے تو وہ لوگوں کو یہ کہہ کر اس سے روکتے کہ یہ دنیا محض ہمارے جی بہلانے کیلئے بنائی گئی ہے۔ اس کی حیثیت کھیل تماشے سے زیادہ نہیں۔ اس لئے یہاں کئے ہوئے اعمال کی جوابدہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے دیوتاؤں کی رزم گاہ سمجھتے تھے اور بعض مشرکین ہندوؤں کی طرح اسے بھگوان کی لیلا قرار دیتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ چند روزہ کھیل ہے جو بغیر کسی مقصد کے ختم ہونے والا ہے۔ چنانچہ ان کے اسی غیر سنجیدہ رویئے نے ان کو ہر طرح کی جوابدہی سے بے نیاز کر دیا تھا۔ قرآنِ کریم نے اسی پر ضرب لگانے کیلئے اس سورت کا آغاز نہایت متنبہ کرنے والے انداز سے کیا ہے۔

4- سورت کے مطالب کو اگر سمیٹ کر ذکر کیا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ قریش کے متضاد اعتراضات اور الزامات کا ذکر کرنے اور ان کا مؤثر جواب دینے کے بعد متعدد انبیائے کرام کی سرگزشتوں کے حوالے سے ان تمام حقائق کو مبرہن کیا گیا ہے جن کی قرآن کے ذریعے ان کو دعوت دی جارہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ قریش کو متنبہ کیا گیا کہ اگر تم ان حقائق کو تسلیم نہیں کرو گے تو تمہیں بدترین انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

5- مشرکین اور نبی کریم ﷺ کے درمیان اصل بنائے نزاع شرک پر مشرکین کا اصرار اور توحید کیخلاف ان کا جاہلانہ تعصب تھا۔ انبیائے کرام کے تذکروں میں بالخصوص اس بات کو نمایاں کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انبیائے کرام سے بڑھ کر کسی کا مقام و مرتبہ نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی خدائی یا اس کے اختیارات میں کسی کی شرکت کا جواز ہوسکتا تو وہ صرف انبیائے کرام ہوسکتے تھے، لیکن حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے رسولانِ گرامی کا تذکرہ ہوا ہے اور اس میں یہ دکھایا گیا کہ جب بھی ان کی قوموں کی طرف سے مخالفتیں ناقابلِ برداشت ہوگئیں اور وہ پیغمبر کے قتل کے منصوبے باندھنے لگے تو اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں نے صرف اللہ تعالیٰ کو پکارا اور بار بار اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ مخالفین کیلئے ہدایت کی دعائیں بھی مانگیں اور ان پر عذاب نازل کرنے کی استدعائیں بھی کیں۔ اگر تعالیٰ کے سوا کوئی اور اختیارات کا مالک ہوتا یا خود انبیائے کرام کو مافوق البشر اختیارات ہوتے تو وہ ان کا استعمال کرتے اور یا کسی اور کو پکارتے۔

اسی طرح جن انبیائے کرام کو کسی بڑی افتاد سے واسطہ پڑا جیسے حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نے نگل لیا اور حضرت ایوب علیہ السلام غیر معمولی حوادث کا شکار ہوگئے لیکن اپنے تمام تر مقام و مرتبہ کے باوجود اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے عاجزی کی، گڑگڑائے اور مدد مانگی۔ اس طرح سے مشرکین پر یہ بات واضح کی کہ تم جس شرک پر اصرار کر رہے ہو، انبیائے کرام کی تاریخ قدم قدم پر اس کی تردید کر رہی ہے۔

6- یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اشرافِ قریش جس طرح اسلامی دعوت کے ساتھ کبرو غرور کا معاملہ کر رہے تھے اس کا اصل سبب کیا ہے؟

Marfat.com

کاش انہیں معلوم ہوتا کہ ان کا یہ کبر وغرور اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے اور دولت و ثروت کی جس فراوانی میں ان کے کبر و غرور کو آج تک غذا پہنچائی ہے وہ آپ اپنی موت مرنے والی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد پیشگوئی کی گئی ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنے کبر و غرور اور اپنے وسائل کے بل بوتے پر اسلامی دعوت کو ختم کر دو گے حالانکہ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب یہ دعوت غالب آ جائے گی کیونکہ وہ دعوت اطرافِ مکہ سے مکہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس کا نفوذ اس طرح آہستہ آہستہ مکے میں اپنے لئے راستے پیدا کر رہا ہے جس طرح طلوعِ سحر آہستہ آہستہ پھیلتی ہے۔ آنکھیں بند کرنے والے شپرہ چشم صبح کی روشنی سے ہزار انکار کریں لیکن اس کے پھیلنے کو روک نہیں سکتے اور ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کی زبان سے یہ اعلان بھی کیا گیا کہ میں جو پیشگوئی کر رہا ہوں یہ کسی دماغی اپج کا نتیجہ نہیں بلکہ میں وحی کے ذریعے سے تمہیں آگاہ کر رہا ہوں، تم اسے سننے سے ہزار انکار کرو لیکن تم اس کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔

7- سورت کے آخری رکوع میں بارِ دگر زور دے کر یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں رنگ و نسل اور مال و دولت کے حوالے کام نہیں آئیں گے، وہاں چلنے والا سکہ نیکی اور راستی کی راہ پر صدق و اخلاق سے گامزن ہونا ہے۔ آج جب لوگ دنیوی وسائل کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں قیامت کے دن ذلت کا شکار ہوں گے اور نارِ جہنم میں جلیں گے۔ اور جنہیں آج غربت کی وجہ سے حقیر سمجھا جاتا ہے وہ اپنے ایمان واخلاص کے باعث قیامت کے دن عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ فرشتے مرحبا اور خوش آمدید کہتے ہوئے ان کا استقبال کریں گے اور انہیں اللہ تعالیٰ جنت میں وہ نعمتیں عطا فرمائے گا جو آج کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔

8- سورت کے آخر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ خوش نصیب ہے وہ امت جو اللہ تعالیٰ کے اس آخری پیغام کی حامل بنے گی اور نہایت شرف کے لائق ہے وہ امت جو اس آخری نبی پر ایمان لائے گی، جسے رحمت اللعالمین بنا کے بھیجا گیا ہے اور یہی وہ لوگ ہوں گے جنہیں خلافتِ ارضی سے نوازا جائے گا اور جو لوگ اسے رد کریں گے انہیں اپنے بدترین انجام سے واسطہ پڑے گا۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ٧	سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ مَكِّيَّةٌ	اٰيَاتُهَا ١١٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ①
مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ
هُمْ يَلْعَبُوْنَ ② لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ
تُبْصِرُوْنَ ③ قٰلَ رَبِّیْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۫
وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ④ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ
افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ⑤
مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ
يُؤْمِنُوْنَ ⑥ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ
فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑦ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ
جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ⑧ ثُمَّ
صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا
الْمُسْرِفِيْنَ ⑨ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑩ ع

Marfat.com

رکوع: ۱۔ (قریب آ گیا ہے لوگوں کیلئے ان کے محاسبے کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ۱) ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو تازہ نصیحت بھی آتی ہے اس کو بہ تکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں۔ ۲) ان کے دل غفلت میں مدہوش ہیں اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے تو کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے۔ ۳) (آنحضرت ﷺ نے) فرمایا، میرا رب آسمان اور زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے اور وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۴) بلکہ انہوں نے کہا یہ تو خواب پریشان ہیں بلکہ اس کو انہوں نے خود گھڑ لیا ہے بلکہ وہ ایک شاعر ہیں، پس یہ ہمارے پاس کوئی اس طرح کی نشانی لائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ پہلے رسول بھیجے گئے تھے۔ ۵) ان سے پہلے کسی بستی کے لوگ بھی، جن کو ہم نے ہلاک کیا، ایمان لانے والے نہ بنے، تو کیا یہ لوگ ایمان لانے والے بنیں گے۔ ۶) اور آپؐ سے پہلے ہم نے رسول بنا کر نہیں بھیجا مگر مردوں کو، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، تو تم اہلِ علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ ۷) اور ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔ ۸) پھر ہم نے ان سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ان کو اور جن کو ہم چاہتے ہیں نجات دی اور حدود سے تجاوز کر جانے والوں کو ہلاک کر دیا۔ ۹) اور ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے، جس میں تمہارا ذکر ہے، تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ۱۰)

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۚ ۝١

(قریب آ گیا ہے لوگوں کیلئے ان کے محاسبے کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ۱)

قریش کے رویئے پر تنبیہ

قریش اور باقی دنیا کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب دنیا کے بارے میں ان کا غلط تصور تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا ہے۔ اور اگر اس کا کوئی مقصد ہے تو وہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ باقی مخلوقات کی طرح انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ زمین پہ اپنی مرضی کی زندگی گزاریں، کھائیں پییں عیش کریں، لڑیں بھڑیں غرضیکہ جو چاہیں سو کریں۔ اپنے اپنے وقت میں طبعی عمر گزار کر موت کا شکار ہو جائیں اس کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں۔ اسی غلط فہمی کی وجہ سے قریش کو ان کے غیر سنجیدہ رویئے پر بار بار توجہ دلانے کے باوجود ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہر بات کو ایک مذاق سمجھتے تھے اور یہ بات کہ ایک دن دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ازاول تا آخر اس دنیا میں پیدا ہونے والے انسان زندہ کئے جائیں گے۔ ایک محشر بپا ہوگا، ہر شخص اپنا نامۂ عمل لے کر پہنچے گا، ایک ایک عمل کا حساب ہوگا اور اسی حساب کے مطابق جزاء وسزا کا ترتب ہوگا۔ قریش یہ باتیں سن کر از راہِ استہزاء یہ کہتے تھے کہ اربوں کھربوں مخلوق نہ جانے کہاں پیدا ہوئی اور کہاں مٹی میں مل دل گئی۔ اتنی بڑی تعداد میں مٹی بن جانے والے لوگوں کو دوبارہ زندگی کیسے مل سکتی ہے اور اس سے بھی

Marfat.com

عجیب تربات یہ ہے کہ ایک آدمی زندگی میں بیشمار اعمال انجام دیتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایک عمل کا ریکارڈ رکھا جائے اور پھر قیامت کے دن اسی ریکارڈ کو نامۂ عمل کی صورت میں ایک ایک آدمی کے ہاتھ میں دے کر کہا جائے کہ خود اسے پڑھ کے دیکھو کہ تم دنیا میں کیسے زندگی گزار کے آئے ہو۔ یہ سراسر ایسی باتیں ہیں جن کی حیثیت خیالی تصورات سے زیادہ نہیں، ہم ان اوہام و تصورات کی بناء پر اپنے عیش کو کیسے مکدر کر لیں، اپنی زندگی کے رنگ میں بھنگ کیسے ڈال لیں۔ ان کے اسی رویئے پر تنبیہ کرنے کیلئے غیر معمولی طرزِ بیان اختیار کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے غیر سنجیدہ رویئے پر نظرِ ثانی کرنے کیلئے تیار ہو جائیں۔

محاسبے کا مفہوم

ارشاد فرمایا گیا کہ لوگوں کے محاسبے کا وقت قریب آ لگا ہے اور ان بدنصیبوں کا حال یہ ہے کہ یہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔
اب سوال یہ ہے کہ محاسبے کا وقت قریب آنے کا معنی و مفہوم کیا ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ قیامت کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب لوگوں کو اپنا حساب دینے کیلئے اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا۔ قریب آنے سے مراد وہ ہے جسے آنحضرت ﷺ نے اس طرح واضح فرمایا بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ کَهَاتَيْنِ ''میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں۔'' آپؐ نے دو انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا کہ جس طرح دو انگلیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں، میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ میں انسانوں کی ہدایت کیلئے آخری پیغمبر ہوں، جسے سنبھلنا ہے اس کیلئے یہی ایک موقع ہے، کیونکہ میرے بعد کوئی اور آنے والا نہیں۔ رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو چودہ صدیاں گزر گئیں۔ اگر قیامت قریب ہوتی تو اب تک آ چکی ہوتی۔ لیکن یہ محض قلتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ کائنات اور انسانی زندگی ایسی حقیقت نہیں جسے ہم اپنے حساب کے پیمانوں سے ناپیں۔ جس طرح کائنات کی وسعتیں آج تک علم کی پیمائش میں نہیں آ سکیں، اسی طرح اس کا زمانہ بھی ہمارے اندازوں میں آنے والا نہیں۔ قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کا جو زمانہ گزر چکا وہ زیادہ ہے اور جو باقی ہے وہ تھوڑا ہے۔ اور اصلاح و ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلے کے مطابق بعثتِ انبیاء کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کے آخری رسول تشریف لا چکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باقی زمانہ کتنا رہ گیا ہوگا۔ رہا چودہ صدیوں کا گزر جانا تو ہم اپنے اندازوں میں اسے کتنا بھی زیادہ سمجھیں لیکن کائنات کے سفر میں یہ ایک مختصر زمانہ ہے۔
معراج کے سفر میں آنحضرت ﷺ کو دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں دکھائی گئی تھی۔ حضرت جرائیل علیہ السلام نے بتایا تھا کہ حضورؐ آپ اس سے دنیا کی عمر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس کا بچپن، لڑکپن، جوانی اور ڈھلتی عمر کا زمانہ گزر چکا ہے، اب یہ بڑھاپے میں ہے۔ ظاہر ہے کہ گزرے ہوئے زمانہ کی نسبت سے اب اس کا خاتمہ قریب ہے۔
عرب کہتے ہیں كُلُّ مَاهُوَ آتٍ قَرِيبٌ ''ہر وہ چیز جس کا آنا یقینی ہو وہ قریب ہوتی ہے۔'' اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ قیامت بہت قریب ہے کیونکہ اس کا آنا بے حد یقینی ہے۔
محاسبہ کا وقت قریب آنے کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کی موت اس کے پاؤں کے تسمے کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کسی وقت بھی آخری وقت آ سکتا ہے۔ موت کے بعد قبر میں پہنچتے ہی ہر انسان کو ایک اجمالی محاسبے سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے اسے شخصی قیامت کہا گیا ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد مبارک ہے مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ ''جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو قائم ہو گئی۔'' اس مفہوم کے اعتبار سے تو حساب کا وقت قریب آنا بالکل ہی واضح ہے کیونکہ ہر شخص کی موت خواہ عمر کتنی ہی ہو، کچھ دور نہیں اور جبکہ عمر کی انتہا معلوم نہیں تو ہر وقت

Marfat.com

آدمی کے سر پر موت کا خطرہ سوار رہتا ہے۔

بعض اہلِ علم نے اس کا ایک اور مطلب سمجھا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ سورۃ طٰہٰ کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو وارننگ دی ہے کہ ہر باخبر شخص اس کشمکش کے نتیجے کے انتظار میں ہے جو مکہ معظمہ میں حق و باطل کے درمیان برپا ہے۔ تم بھی انتظار کرو، عنقریب دیکھ لو گے کہ صحیح راستے پر کون تھا۔ آنحضرت ﷺ تمہیں جس انجام سے ڈرا رہے تھے اور تمہارے لئے عافیت کا راستہ کھول رہے تھے ان کی بات صحیح تھی یا تمہارا غیر سنجیدہ رویہ صحیح تھا۔ اور تم بات بات پر ان سے آیتِ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اب تمہارا مطالبہ پورا ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ یعنی اب وہ وقت دور نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کامیابی کی منزلیں طے کرے گی اور تم میدانِ بدر میں اس عذاب کی ایک جھلک دیکھو گے یعنی تمہاری قیادت کی پہلی صف ہلاک کر دی جائے گی۔ اگر مکہ معظمہ میں قبولِ ایمان کا سلسلہ اندر ہی اندر دھیرے دھیرے جاری نہ رہتا تو پیغمبر کی ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق تمہیں تباہ کر دیا جاتا۔ جب تک آنحضرت ﷺ نے ہجرت نہیں فرمائی تو ان کا وجود تمہاری خیریت کی ضمانت تھا اور جب وہ ہجرت کر گئے تو وہ مظلوم و مقہور لوگ جو قبولیتِ ایمان کے باعث تمہارے گھروں میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ان کا استغفار تمہاری خیریت کا باعث رہا ہے۔ لیکن اب فتح مکہ کا وقت قریب آ رہا ہے، جب وہ انقلاب اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو جائے گا جس کیلئے آنحضرت ﷺ تشریف لائے تھے اور تمہارا محاسبہ بھی تمہارے سر پر آ پہنچے گا۔ اب وہ شخص بچے گا جو ایمان لے آئے گا یا ملک چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ اس آیتِ کریمہ میں ان اہلِ علم کے نزدیک اس محاسبے کی طرف اشارہ ہے۔ اس عاجز کی ناچیز رائے یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ ان تینوں مطالب کی طرف اشارہ کر رہی ہے کیونکہ ان تینوں میں آپس میں کوئی تضاد نہیں۔ اور ساتھ ہی نہایت تأسف سے فرمایا گیا ہے کہ کیسے بدنصیب ہیں یہ لوگ کہ نہایت خطرناک لمحہ ان کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ نہ صرف غفلت میں سر ڈبوئے ہوئے ہیں بلکہ اس دعوت سے اعراض کر رہے ہیں جس کا پیغام ان کیلئے زندگی بخش ثابت ہو سکتا ہے۔

مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝٢

(ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو تازہ نصیحت بھی آتی ہے اس کو بے تکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں۔ ۲)

اعراض کی کیفیت

اس آیتِ کریمہ میں ان کے اعراض کی کیفیت بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کا وہ اعراض جس کے پس منظر میں ان کی غفلت اور ان کا غیر سنجیدہ رویہ کارفرما ہے اپنے اندر لاابالی پن کے ساتھ سرمستی اور شرارت کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ قرآنِ کریم انہیں بار بار ان کے غلط رویئے پر ٹوکتا ہے اور مختلف اسالیب سے انہیں تذکیر و تنبیہ کے ذریعے متوجہ کرتا ہے لیکن ان کا حال یہ ہے کہ جب بھی کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے جو ان کیلئے نئی یاددہانی ہوتی ہے بجائے اس کی طرف متوجہ ہونے کے سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اگر سنیں گے تو نہایت تکلف سے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا مذاق بھی اڑائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو بات اس قدر غیر سنجیدہ رویئے سے سنی جائے وہ کیسے مؤثر ہو سکتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ سننے والا اس سے کوئی صحیح اثر قبول نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ انتہائی ہمدردی، خیر خواہی اور فکرمندی کے جذبات کے ساتھ ان کے سامنے قرآنِ کریم کی آیات پڑھتے ہیں۔ انہیں زندگی کے مقاصد سے بہرہ ور کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ انہیں آنے والی زندگی میں محاسبے سے آگاہ کرتے

Marfat.com

ہیں لیکن وہ ان باتوں کا اثر قبول کرنے کی بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور اپنی جہالت کا احساس کرنے کی بجائے ان باتوں کو نادانی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔اس کا سبب بالکل واضح ہے کہ انہوں نے زندگی کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے۔یہ دنیا محض ایک کھیل تماشا ہے اور ہم یہاں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اس کھیل تماشے کا حصہ بننے کیلئے آئے ہیں۔اس سے بڑھ کر حماقت کی اور کیا بات ہوگی کہ ہم اس بات کو قبول کرلیں کہ ایک ایسی زندگی آنے والی ہے جس میں ہمارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔چنانچہ اس تاثر کے تحت وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر کان لگانے کو تیار نہیں ہوتے۔

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳

(ان کے دل غفلت میں مدہوش ہیں اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے تو کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے۔ ۳)

مشکل الفاظ کی تشریح

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ "یہ دوسرا حال ہے۔" وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کے فقرہ میں اَسَرُّوا فعل ہے نَجْوٰی مفعول ہے اور الَّذِيْنَ فاعل ہے۔ نحو کا قاعدہ یہ ہے کہ فاعل اگر اسمِ ظاہر ہو تو فعل واحد ہوتا ہے۔اس قاعدے کے مطابق اَسَرَّ النَّجْوٰی ہونا چاہئے تھا۔فاعل ظاہر ہونے کے باوجود فعل کو جمع کیوں لایا گیا۔اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اَسَرُّوا میں واؤ ضمیر جمع نہیں بلکہ علامتِ جمع ہے تاکہ اَسَرُّوا کا لفظ سنتے ہی سننے والے کو پتہ چل جائے کہ اس کا ایک فاعل نہیں بلکہ متعدد ہیں۔دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "واؤ ضمیر جمع" فاعل ہے اور الَّذِيْنَ فاعل نہیں بلکہ واؤ کا بدل ہے۔اور واؤ مبدل منه ہے۔

قریش کے اعراض کا سبب

اس آیت کریمہ کے پہلے جملے میں سابقہ آیت میں ان کے مذکور رویئے کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے کہ یہ لوگ قرآنِ کریم جیسی مؤثر اور باوقار کتاب اور آنحضرت ﷺ جیسے دلآویز شخصیت کی دعوت کا بھی اس لئے مذاق اڑاتے ہیں کہ ان کے دل غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔جس طرح ایک مدہوش اور مخمور شخص کسی بات کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے،اسی طرح یہ بھی نہ صرف اپنی قبولیت کی صلاحیت کھو چکے ہیں بلکہ ان کے سردار اور سربرآوردہ لوگ جب تنہا ہوتے ہیں تو اپنی مجلس میں سرگوشی کے انداز میں اس دعوت کیخلاف سازشیں کرتے ہیں۔اور چونکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس دعوت کے اثرات آہستہ آہستہ لوگوں میں پھیل رہے ہیں۔آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت لوگوں کے دلوں میں اترتی جارہی ہے اور قرآنِ کریم کے الفاظ کی تاثیر ہزار کوششوں کے باوجود دلوں کے بند دروازوں کو کھول رہی ہے تو وہ آپس میں اس کا راستہ روکنے کیلئے نئی نئی تدبیریں سوچتے اور نئی نئی چالیں ایجاد کرتے ہیں تاکہ لوگوں میں اس دعوت کے پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔چنانچہ اس کیلئے انہوں نے جو سازشیں تیار کیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ انہوں نے لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ تم اس شخص کی باتوں سے متاثر ہونا شروع ہوگئے ہو،ذرا یہ تو سوچو کہ یہ شخص اپنے آپ کو نبی کہتا ہے،تو کیا ہم جیسا کوئی شخص نبوت کے عظیم مقام پر فائز ہوسکتا ہے۔

Marfat.com

اس میں اور ہم میں آخر ایسا بنیادی فرق کیا ہے۔ یہ بھی ہم جیسا ایک انسان ہے، ہماری طرح کھاتا ہے پیتا ہے، بازاروں میں کاروبار کرتا ہے، گھومتا پھرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جس کی وجہ سے ہم اس کو نبی تسلیم کرلیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی باتوں میں بلا کی تاثیر ہے، اس کی شخصیت میں ناقابلِ انکار معصومیت اور دلآویزی ہے جو دوسرے لوگوں میں اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب کچھ جادو کا نتیجہ ہے جس نے اس کی شخصیت کو مؤثر بنادیا ہے اور اس کی باتوں میں اثر پیدا کردیا ہے کہ جو اس کے پاس جاتا ہے اس کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔ ہمارے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم نہ اس کی بات سنیں اور نہ اس کے قریب جائیں تاکہ اس کا جادو ہم پر اثرانداز نہ ہوسکے۔

آنحضرت ﷺ کی دعوت کی تاثیر کی مثالیں

ہمارے سیرت نگاروں نے آنحضرت ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کی دعوت کے مؤثر ہونے کی چند مثالیں ذکر کی ہیں جنہیں قریش جادو کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ جسے ہمارے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ عتبہ بن ربیعہ (ابوسفیان کے خسر ہند جگر خوار کے باپ) نے سردارانِ قریش سے کہا، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جاکر محمد (ﷺ) سے ملوں اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ یہ حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کی تعداد روز بروز بڑھتی دیکھ کر اکابرِ قریش سخت پریشان ہورہے تھے۔ لوگوں نے کہا! ابوالولید! تم پر پورا اطمینان ہے، ضرور جاکر اس سے بات کرو۔ وہ حضورؐ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا ''بھتیجے، ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی، تم خود جانتے ہو اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھہرایا۔ اس کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی۔ باپ دادا جو مرچکے ہیں ان سب کو تم نے گمراہ اور کافر بنایا۔ بھتیجے، اگر ان باتوں سے تمہارا مقصد دنیا میں اپنی بڑائی قائم کرنا ہے تو آؤ ہم سب مل کر تم کو اتنا روپیہ دے دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہوجاؤ۔ سرداری چاہتے ہو تو ہم تمہیں سردار مانے لیتے ہیں۔ بادشاہی چاہتے ہو تو بادشاہ بنا دیتے ہیں اور اگر تمہیں کوئی بیماری ہوگئی ہے جس کی وجہ سے تم کو واقعی سوتے یا جاگتے میں کچھ نظر آنے لگا ہے تو ہم سب مل کر بہترین طبیبوں سے تمہارا علاج کرائے دیتے ہیں۔'' یہ باتیں وہ کرتا رہا اور نبی کریم ﷺ خاموش سنتے رہے۔ جب وہ خوب بول چکا تو آپ نے فرمایا ''ابوالولید، جو کچھ آپ کہنا چاہتے تھے کہہ چکے ہیں، یا اور کچھ کہنا ہے؟'' اس نے کہا بس مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا اچھا اب میری سنو۔ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ، حٰمٓ، تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مسلسل آپ سورۂ حٰم السجدہ کی تلاوت فرماتے رہے اور عتبہ پیچھے زمین پر ہاتھ ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ اڑتیسویں آیت پر پہنچ کر آپ نے سجدہ کیا اور پھر سر اٹھا کر عتبہ سے فرمایا، ''ابوالولید جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' عتبہ یہاں سے اٹھ کر سردارانِ قریش کی طرف پلٹا تو لوگوں نے دور سے ہی اس کو آتے دیکھ کر کہا ''خدا کی قسم، ابوالولید کا چہرا بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر وہ گیا تھا۔'' اس کے پہنچتے ہی لوگوں نے سوال کیا ''کہو ابوالولید کیا کر آئے ہو؟'' اس نے کہا ''خدا کی قسم، آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے

Marfat.com

پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ واللہ یہ شعر نہیں ہے نہ سحر ہے اور نہ کہانت۔ اے معشر قریش، میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی باتیں جو میں نے سنی ہیں رنگ لاکر رہیں گی۔ اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کا خون تمہاری گردن پر نہ ہوگا، دوسروں پر ہوگا۔ اور اگر یہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت۔" لوگوں نے کہا "واللہ، ابوالولید تم پر بھی اس کا جادو چل گیا۔" اس نے کہا "یہ میری رائے ہے، اب تم جانو اور تمہارا کام۔" (ابن ہشام، جلد اول، ص ۳۱۳۔۳۱۴) بیہقی نے اس واقعہ کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب حضورؐ سورہ حم السجدہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے کہ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ تو عتبہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا کہ خدا کیلئے اپنی قوم پر رحم کرو۔

دوسرا واقعہ ابن اسحاق نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ قبیلہ اراش کا ایک شخص کچھ اونٹ لے کر مکہ آیا۔ ابوجہل نے اس کے اونٹ خرید لئے اور جب اس نے قیمت طلب کی تو ٹال مٹول کرنے لگا۔ اراشی نے تنگ آ کر ایک روز حرم کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا کر پکڑا اور مجمع عام میں فریاد شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے۔ سرداران قریش نے اس شخص سے کہا کہ "ہم کچھ نہیں کر سکتے، دیکھو وہ صاحب جو اس کونے میں بیٹھے ہیں ان سے جا کر کہو، وہ تم کو تمہارا روپیہ دلوا دیں گے۔" اراشی نبی کریم ﷺ کی طرف چلا گیا اور قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا "آج لطف آئے گا۔" اراشی نے جا کر حضورؐ سے اپنی شکایت بیان کی۔ آپؐ اسی وقت اٹھ کر کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابوجہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے پیچھے ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ گزرے اس کی خبر لا کر دے۔ نبی کریم ﷺ سیدھے ابوجہل کے دروازے پر پہنچے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا "کون؟" آپؐ نے جواب دیا "محمد۔" (ﷺ) وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپؐ نے اس سے کہا "اس شخص کا حق ادا کر دو۔" اس نے جواب میں کوئی چون و چرا نہ کی، اندر گیا اور اس کے اونٹوں کی قیمت لا کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ قریش کا مخبر یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا اور سرداروں کو سارا ماجرا سنا دیا اور کہنے لگا کہ واللہ آج وہ عجیب معاملہ دیکھا ہے جو کبھی نہ دیکھا تھا۔ ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) جب نکلا ہے تو محمد (ﷺ) کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا اور جب محمد (ﷺ) نے اس سے کہا کہ اس کا حق ادا کر دو تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ابوالحکم بن ہشام کے جسم میں جان نہیں ہے۔ (ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۹۔۳۰)

یہ تھا شخصیت اور سیرت و کردار کا اثر اور وہ تھا کلام کا اثر، جس کو وہ لوگ جادو قرار دیتے تھے اور ناواقف لوگوں کو یہ کہہ کر ڈراتے تھے کہ اس شخص کے پاس نہ جانا ورنہ جادو کر دے گا۔ (تفہیم القرآن)

قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ④

(آنحضرت ﷺ نے) فرمایا، میرا رب آسمان اور زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے اور وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۴)

Marfat.com

ایک داعی کا اعتماد علی اللہ

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم نے دو باتیں پڑھی ہیں۔ ایک یہ بات کہ مشرکینِ مکہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں مختلف باتیں کہتے تھے۔ کبھی انہیں جادوگر قرار دیتے اور کبھی کسی اور نام سے پکارتے۔ اور دوسری یہ بات کہ ان کی شخصیت کے اثر اور قرآنِ پاک کی تاثیر سے پریشان ہو کر اپنی خفیہ مجالس میں اس کے توڑ کیلئے تدبیریں سوچتے اور چھپ چھپ کر منصوبہ بندی کرتے تھے۔ ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق وہ بات فرمائی جو اس آیتِ کریمہ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس آیت کا لب ولہجہ اور اس کا اسلوب دیکھ کر حیرت ہونے لگتی ہے کیونکہ کفارِ مکہ تو آپ کی شخصیت کا اثر زائل کرنے اور آپ کی دعوت کی تاثیر کو کم کرنے کیلئے آپ کے بارے میں بہت ہلکی باتیں کہتے اور عجیب وغریب بدگمانیاں پیدا کرتے تھے۔ لیکن اس آیت کا لب ولہجہ اس قدر دھیما ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس ژاژ خائی کا آپ پر کوئی اثر نہیں۔ اور آپ کو ان کی خفیہ منصوبہ بندیوں سے کوئی خوف نہیں۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ میرے اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں۔ اور مزید یہ بات کہ جس وقت یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے اس وقت مسلمانوں میں ابھی وہ طاقت نہیں آئی تھی کہ وہ قوت سے کفار کا راستہ روک دیتے اور ان کی زبانیں بند کر دیتے۔ مکی زندگی آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی مظلومیت کی زندگی ہے۔ ظالم ظلم توڑتے تھے اور آپؐ انہیں برداشت کرتے تھے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ آپؐ ان کی باتوں کا منہ توڑ جواب دیتے آپؐ نے ان باتوں کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کیا۔ جس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ایسی فضول باتوں کا جواب دینا میرے منصب سے بہت فروتر ہے اور دوسری یہ بات کہ میری دعوت نے اگرچہ تاحال اتنی طاقت حاصل نہیں کی کہ ہم تم سے طاقت کی زبان میں بات کر سکیں، لیکن ہماری پشت پر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کے علم اور قدرت کے سامنے ہر قوت اور ہر طاقت سرنگوں ہے۔ میں اس معاملے کو اسی کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ تمہاری خفیہ تدبیروں سے بھی واقف ہے اور تمہیں سزا دینے پر بھی قادر ہے۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۵﴾

(بلکہ انہوں نے کہا یہ تو خواب پریشان ہیں بلکہ اس کو انہوں نے خود گھڑ لیا ہے بلکہ وہ ایک شاعر ہیں، پس یہ ہمارے پاس کوئی اس طرح کی نشانی لائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ پہلے رسول بھیجے گئے تھے۔ ۵)

مشرکین کے اشکالات کی تعبیر ''اضغاثِ احلام'' کا مفہوم

بَلْ ..... کلمۂ استدراک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک بات کہتا ہے۔ جب دیکھتا ہے کہ اس سے میرا مقصد پورا نہیں ہوا تو ایک قدم آگے بڑھ کر دوسری بات کہتا ہے۔ مشرکین مکہ کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے ان کے اتہامات کو کلمۂ بَلْ سے ذکر فرمایا کیونکہ وہ کسی ایک بات پر جمنے کی بجائے آئے دن نئی بات اختراع کرتے تھے۔ پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ کسی طرح آنحضرت ﷺ کی دعوت کے اثرات کو بے اثر کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ انہوں نے سب سے پہلے آپؐ کو بشر قرار دیا اور یہ کوئی تہمت یا الزام نہ تھا بلکہ ایک حقیقت تھی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کے لوازم کو خود اختراع کیا۔ ان کے نزدیک جو بشر ہوتا ہے، وہ نبی نہیں ہو سکتا اور جو نبی ہوتا ہے وہ بشر نہیں ہو سکتا۔ ان کے اور عام لوگوں کے ذہن میں بھی یہ غلط بات پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی کہ نبوت اور بشریت میں تضاد ہے۔ یہ ایک

Marfat.com

جگہ جمع نہیں ہوسکتے، پھر دوسرا الزام لگایا کہ وہ جادوگر ہے اور اس کے کلام کی تاثیر دراصل اس کے جادو کا نتیجہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے الزامات کو رد کرتے ہوئے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا کیونکہ وہ جس گھٹیا سطح پر اتر چکے تھے آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ان کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک نہیں جاسکتی تھی۔ اب اس آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ہمارے لگائے ہوئے الزامات وہ اثر نہیں دکھا رہے جو ہم چاہتے ہیں تو اب انہوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک اور بات کہی کہ تم اس پیغمبری کا دعویٰ کرنے والے شخص کی زبان سے جو عالمِ غیب کی خبریں سنتے ہو اور جس طرح وہ جنت دوزخ کا ذکر کرتا، عالمِ برزخ کی تفصیلات بیان کرتا ہے، زندگی اور موت کے حقائق کو واضح کرتا اور ہماری فلاح و بقاء کیلئے نہایت اہم باتوں کو لازم ٹھہراتا ہے تو تم ان باتوں سے متاثر ہو کر اس کے قریب ہونے لگتے ہو حالانکہ ان باتوں کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خوابِ پریشاں ہیں، یعنی صرف خواب ہی نہیں بلکہ منتشر اور متضاد خواب۔ ایک تو خواب ہی کی کوئی حقیقت ضروری نہیں ہوتی اور پھر پریشان خواب تو معدے کی خرابی یا شخصیت کے انتشار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ احلام خوابوں کو کہتے ہیں اور اضغاث، ضغث کی جمع ہے۔ ضغث گھاس کی اس مٹھی کو کہتے ہیں جو رطب و یابس اور خشک و تر دونوں کا مجموعہ ہو۔ اس لئے اس کا ترجمہ خوابِ پریشان کیا جاتا ہے۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس شخص کے دل میں کچھ خیالات بسے ہوئے ہیں۔ اس کی قوتِ واہمہ انہیں خیالات کو مختلف شکلوں میں اس کے خواب میں متشکل کر دیتی ہیں اور وہ شاید اسے حقیقت سمجھ کر لوگوں سے کہنا شروع کر دیتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ باتیں مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ اور یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں بارہا دنیا میں ایسا ہو چکا ہے کہ بعض لوگ اپنے ہی خیالات کو اپنے خواب کی صورت میں دیکھتے اور اسے ایک حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ اور یہی وہ افترا ہے جس کی وجہ سے یہ سارا فساد پیدا ہوا ہے۔ یعنی خوابِ پریشاں دیکھنے والا شاید اس قدر ذمہ دار نہیں کیونکہ خواب پر کسی کا قابو نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے من پسند نتائج نکالنا اور پھر کوئی دعویٰ کشید کر لینا یہ وہ گناہ ہے جو اس نبوت کا دعویٰ کرنے والے سے سرزد ہو رہا ہے۔

آنحضرت ﷺ پر شاعر ہونے کا الزام

مشرکینِ مکہ کو ایک مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ وہ قرآنِ کریم میں بیان کردہ حقائق کو تو خوابِ پریشاں کہہ کر لوگوں کو بدگمان کرنے میں شاید کامیاب ہو جاتے لیکن جب وہ یہ دیکھتے کہ قرآنِ کریم کے کلام میں جس طرح شیرینی ہے، اسی طرح ہیبت و شوکت بھی ہے۔ ایک وقار اور تمکنت بھی ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کا جواب ممکن نہیں۔ اور مزید یہ کہ عام لوگ قرآنِ کریم کی انہی خصوصیات کے باعث جب اپنے سرداروں سے پوچھتے کہ اگر یہ شخص پیغمبر نہیں تو جو یہ کلام پڑھ کے سناتا ہے وہ غیر معمولی کلام کیوں ہے۔ اس کی ہر بات انسانی کلام سے بہت ممتاز، بہت ارفع اور بالکل نرالی ہے، تو اس کا سبب کیا ہے۔ تو اس کا جواب دینے کیلئے اشرافِ قریش نے باہمی سرگوشیاں کیں۔ تو آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لوگوں سے یہ کہا جائے کہ اس کلام میں یہ خصوصیات اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ اس کا کہنے والا شاعر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں، محمد (ﷺ) کا کلام ہے۔ اور اس کلام میں شیرینی اور دلآویزی اس وجہ سے پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ایک شاعر بھی ہے۔ اس کے کلام کی سحر آفرینی بالکل اسی نوعیت کی ہے جس نوعیت کی سحر آفرینی ہمارے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اور اس میں ان شاعروں کا کوئی کمال نہیں ہوتا، اصل میں ان کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو ان کو شعر القا کرتا ہے۔ اہلِ عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کے دل میں عجیب و غریب خیالات ڈالتا ہے اور بعض دفعہ بنے بنائے اشعار اس کے دل میں اتار دیتا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے قرآنِ پاک کی تعلیمات اور اس کی غیر معمولی خصوصیات کو بے اثر کرنے کا ایک راستہ نکالا اور آخری حربہ جس کو وہ نہایت

Marfat.com

مؤثر سمجھتے تھے یہ اختیار کیا کہ اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے جیسے پہلے پیغمبر گزرے ہیں تو پھر ان کی طرح حسی معجزات کیوں نہیں دکھاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ عصائے موسیٰ اور ید بیضا لے کر آئے تھے۔ یہی حال باقی انبیاء کا بھی تھا، تو آخر یہ نبوت کا دعویٰ کرنے والا شخص ایسے محسوس معجزات ہمیں کیوں نہیں دکھاتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص شاعر ہے، ساحر ہے، پیغمبر نہیں۔ اگر پیغمبر ہوتا تو ہمیں بھی ایسے ہی معجزات دکھاتا۔

ایک خلجان کا ازالہ

اس بات سے ذہن میں یہ خلجان نہیں پیدا ہونا چاہئے کہ نبی کریم ﷺ سے شاید کبھی کوئی معجزہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مختلف اوقات میں نبی کریم ﷺ سے خرقِ عادت واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ شق القمر یعنی چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، مٹھی میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، آپؐ کے ہاتھوں کی انگلیوں سے پانی کے چشموں کا رواں ہونا، آپؐ کی دعا سے چند آدمیوں کا کھانا کئی سو آدمیوں کیلئے کافی ہو جانا، بعض جانوروں کا آپؐ کے کان میں باتیں کہنا، قبروں میں اصحابِ قبر کو عذاب ہوتے ہوئے محسوس کرنا اور اس کے سبب کی خبر دینا۔ ایسے بے شمار معجزات ہیں جسے لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دیکھا، لیکن آپؐ نے کبھی کسی مطلوبہ معجزے کو دکھانا پسند نہیں فرمایا۔ جس طرح مثلاً قومِ صالح نے حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ آپؐ ہمیں پہاڑ سے اونٹنی نکال کر دکھائیں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، پہاڑ پھٹا اور اونٹنی نکل آئی۔ لیکن وہی اونٹنی بالآخر ان کی تباہی کا باعث ہوئی۔ مشرکینِ مکہ بھی اس طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اس طرح کے کسی مطالبے کو پذیرائی نہیں بخشی، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب کوئی قوم کوئی مخصوص معجزہ مانگتی ہے اور اپنا ایمان کو اس کے ساتھ مشروط کر دیتی ہے تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اگر وہ مخصوص معجزہ اس کو دکھا دیں اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی دعاؤں سے اور آپؐ کے آخری نبی ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپؐ سے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ جب تک آپؐ ان میں ہیں، ہم انہیں عذاب نہیں دیں گے۔ اور جب تک ان میں استغفار کرنے والے موجود ہیں اس وقت تک ان پر عذاب نازل نہیں ہوگا۔ اب اگر ان کا کوئی مخصوص مطالبہ جو ایمان کے ساتھ مشروط ہوتا ہے پورا کر دیا جاتا اور وہ اس کے بعد بھی ایمان نہ لاتے تو اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ان پر عذاب نازل ہو جاتا جبکہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ یہ قوم عذاب میں مبتلا ہو کیونکہ آپؐ کی موجودگی میں عذاب نہ بھیجنے کا پروردگار وعدہ فرما چکے تھے اور مزید یہ بات کہ آپؐ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہ تھا جس سے اصلاح کا سلسلہ باقی رہتا۔ آنحضرت ﷺ کو اٹھا لیا جاتا اور کفار عذاب کی نذر ہو جاتے تو پھر قیامت تک آنے والے انسانوں کو دین کہاں سے ملتا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اب نوعِ انسانی ارتقا کے آخری مراحل کی طرف بڑھ رہی تھی، اور نبی آخر الزماں ﷺ قیامت تک آنے والے لوگوں کیلئے ہدایت کا سامان لے کر آئے تھے۔ حسی معجزات وقتی طور پر متاثر تو کر سکتے ہیں لیکن آنے والے دور میں ان سے دل و دماغ کو متاثر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ آخری پیغمبر کی دعوت کا دارومدار معجزات پر نہیں بلکہ آفاق و انفس اور عقل و بصیرت کے دلائل پر رکھا جاتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو قرآنِ کریم جیسا معجزہ عطا فرمایا جو قیامت تک آنے والے انسانوں کو رہنمائی فراہم کرتا رہے گا۔ اس میں دماغوں اور عقلوں کو جلا دینے کا سامان بھی ہے، دلوں کو تسکین دینے کی قوت بھی ہے اور وہ ضابطۂ حیات بھی ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

Marfat.com

اور سابقہ امتوں کا یہ تجربہ بھی ہے کہ ان کے مطلوب معجزات انہیں مہیا کر دیئے گئے، اس کے باوجود وہ ایمان لانے کیلئے تیار نہ ہوئے حالانکہ انہوں نے ان معجزات کے ظہور کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا تھا۔ لیکن جب معجزات ظہور پذیر ہو گئے تو اسے انہوں نے جادو یا شعبدہ بازی قرار دینا شروع کر دیا۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ افکار کی تبدیلی اور کردار کی تعمیر ایسی تعلیم سے ممکن ہوتی ہے جس کی بنیاد آفاق وانفس کے دلائل اور عقل وفطرت کے داعیات پر ہو۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم کا مدار چونکہ ایسے ہی دلائل پر رکھا گیا تھا، اس لئے اس کے نتیجے میں جو انقلاب برپا ہوا اس کی نمود اس سے پہلے انسان نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ صرف 23 سال کے عرصے میں ایک ایسی صالح جماعت تیار ہو گئی جس نے ایک محدود عرصے میں معلوم زمین کے زیادہ حصے پر اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کر دیا۔ وہ جہاں بھی گئے لوگوں کے دکھ سمٹتے گئے اور خوشیوں کی بہار آتی گئی۔ ان کے سامنے صرف سر ہی نہیں جھکے بلکہ دل بھی جھکتے چلے گئے اور وہ لوگ جو پہلے ہر بھلی بات کے دشمن تھے، اب وہ خدا کے دین کے مناد، مبلغ اور منفذ بن کر دنیا میں پھیل گئے۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝٦

(ان سے پہلے کسی بستی کے لوگ بھی، جن کو ہم نے ہلاک کیا، ایمان لانے والے نہ بنے، تو کیا یہ لوگ ایمان لانے والے بنیں گے۔ ٦)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اگر پیغمبر کی صداقت کا یہی معیار ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے مطلوب معجزات دکھائے تو پھر وہ امتیں جنہوں نے اپنے نبیوں سے اس شرط پر کوئی مخصوص معجزہ طلب کیا تھا کہ اگر یہ معجزہ دکھا دیا گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے، تو آخر وہ ایمان کیوں نہ لائے۔ حتیٰ کہ اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور وہ تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ یہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ قومیں معجزات کی طلب یہ سمجھ کر کرتی ہیں کہ پیغمبر ایسا کر نہیں سکے گا تو ہم اس کی تکذیب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن جب وہ معجزہ دکھا دیتا ہے تو چونکہ وہ کسی طرح بھی ایمان لانے والے نہیں تھے اس لئے وہ پھر بھی ایمان سے محروم رہتے ہیں۔ اس تاریخ کا حوالہ دے کر پروردگار آنحضرت ﷺ کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپؐ ان لوگوں کی باتوں سے پریشان نہ ہوں، معجزے سے کبھی کوئی مومن نہیں ہوا۔ ان لوگوں کو بھی اگر ایسے معجزات دکھا دیئے جائیں تو یہ بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ البتہ! یہ ضرور ہوگا کہ مطلوب معجزے کے دکھائے جانے کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں یہ عذاب کے مستحق ضرور ہو جائیں گے۔ لیکن آپؐ کی موجودگی میں اور آپؐ کے آخری نبی ہونے کی وجہ سے ہم اس قوم کو ختم کرنا نہیں چاہتے۔ اس لئے آپؐ نہایت استقامت کے ساتھ اپنا کام جاری رکھیں۔ ایک وقت آئے گا جب یہ لوگ اسلام کی آغوش میں آ جائیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اہلِ طائف نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیا وہ تاریخ کا حصہ ہے لیکن جب پہاڑوں کا فرشتہ آپؐ کے پاس بھیجا گیا اور اس نے گزارش کی کہ اگر آپؐ پسند کریں تو جن دو پہاڑوں کے درمیان طائف واقع ہے میں انہیں آپس میں ملا دوں تا کہ یہ سب کے سب تباہ ہو جائیں، تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں دنیا کی تباہی کیلئے نہیں آیا، میں امید رکھتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو ان کی نسلوں سے صاحبِ ایمان اٹھیں گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٧

Marfat.com

(اور آپؐ سے پہلے ہم نے رسول بنا کر نہیں بھیجا مگر مردوں کو، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، تو تم اہلِ علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ ۷)

آپ ﷺ کے بشر ہونے میں حکمت

اوپر آیت نمبر 3 میں مخالفین کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے کہ یہ شخص جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے یہ تو تمہاری طرح ایک بشر ہے، بشر نبی نہیں ہوسکتا تو یہ کیسے نبی ہو گیا۔ اس آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ ہم نے اس سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں وہ سب انسان، بشر بلکہ مرد تھے۔ کسی اور مخلوق میں سے ہم نے کبھی کوئی رسول نہیں بھیجا، کیونکہ ہر صاحبِ عقل جانتا ہے کہ افادہ اور استفادہ صرف ہم جنس سے ہوسکتا ہے، غیر جنس سے نہیں۔ فرشتے کو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ وہ بیمار پڑتا ہے نہ زخمی ہوتا ہے، نہ اس کے اندر احساسات ہیں نہ انفعالات، نہ اس کی خواہشات ہیں نہ عزائم، جبکہ انسان ان تمام قوتوں کا مرقع ہے تو اگر فرشتہ نبی بن کر آتا تو اس کی زندگی سے انسانی زندگی کو کیا فائدہ پہنچتا اور وہ انسانوں کیلئے کیسے اسوہ ثابت ہوتا۔ اس لئے اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں، یہ خلافِ عقل بھی ہے اور خلافِ نقل بھی۔

تاریخی حوالے کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ اے اہلِ مکہ! اگر تم ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوتے ہو تو پھر تم ان لوگوں سے پوچھ لو جو اس وقت اسلام دشمنی میں تمہارے پشت پناہ بنے ہوئے ہیں، یعنی اہلِ کتاب۔ اور مدینے میں جو مکے سے بہت دور نہیں تھا چونکہ صرف یہود ہی آباد تھے اس لئے یہاں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف اشارہ ہے کہ تم ان کی پٹی پڑھانے سے آنحضرت ﷺ پر اعتراضات کرتے ہو۔ اس لحاظ سے وہ تمہارے معین اور مددگار ہیں۔ انہیں اہلِ ذکر اس لئے فرمایا گیا کہ وہ ہزار کوتاہیوں کے باوجود اپنے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب رکھتے تھے۔ ان کا ایمان و عمل چاہے کیسے ہی بگاڑ کا شکار ہوا ہو کتاب کی موجودگی کی وجہ سے وہ دین کی بنیادی باتوں سے واقف تھے۔ انبیاء کی تاریخ ان کے سامنے تھی بالخصوص بنی اسرائیل میں آنے والے مشہور انبیاء کو وہ خوب جانتے تھے۔ اس لئے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم امی ہونے کی وجہ سے اگر ان باتوں کو نہیں جانتے ہو تو ان جاننے والوں اور علم رکھنے والوں سے پوچھ لو کہ اس سے پہلے جو نبی آئے ہیں کیا وہ بشر تھے یا کچھ اور تھے۔ ان سے پوچھو کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کیا تھے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کس جنس سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اسلام دشمنی کے باوجود اتنے گئے گزرے تو نہیں کہ تاریخ دشمنی پر اتر آئیں۔ وہ یقیناً تمہیں بتائیں گے کہ وہ سب بشر تھے۔ تو پھر آنحضرت ﷺ کے بشر ہونے پر تمہیں اعتراض کیوں ہے۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴿۸﴾

(اور ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔ ۸)

انبیائے کرام انسانی احتیاجات سے ماوراء نہیں ہوتے

کفارِ مکہ کو آنحضرت ﷺ پر یہ اعتراض بھی تھا کہ یہ شخص کیسے رسول ہوسکتا ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں گھومتا یعنی کاروبار کرتا ہے قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِى الْاَسْوَاقِ ''انہوں نے کہا، یہ کیسا رسول ہے کھانا کھاتا ہے اور

Marfat.com

بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔'' اس آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے کوئی ایسا جسم تخلیق نہیں فرمایا جو کھانے پینے سے مبرا ہو۔ ہر جسم کی زندگی غذا کی محتاج ہے۔ انبیائے کرام چونکہ بشر ہوتے ہیں اور بشر ایک جسم رکھتا ہے۔ ظاہر ہے وہ کھائے پیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو انبیائے کرام بھی ضرورت کے تحت کھاتے پیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی زندگی کھانے پینے کیلئے نہیں ہوتی البتہ! کھانا پینا زندگی کیلئے ہوتا ہے وہ اس لئے زندہ نہیں رہتے کہ اکل وشرب کے مزے لوٹیں بلکہ اکل وشرب صرف ان کی ضرورت ہوتے ہیں، زندگی ان کی اس مقصد کیلئے وقف ہوتی ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ انہیں مبعوث فرماتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے ہر سطح پر انسانی ذہن کے افق کو روشن کیا ہے اور اسے وہ بلندی عطا کی ہے جس سے پہلے وہ بالکل بے خبر تھا۔ لوگوں کے یہاں خدارسیدہ ہونے اور گناہوں سے محفوظ زندگی گزارنے کیلئے ضروری تھا کہ علائق دنیوی سے وہ زندگی یکسر بے نیاز ہو۔ ایک کھانے کمانے والا، کاروبار کرنے والا اور دنیوی معاملات کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے والا ان کے نزدیک کچھ اور تو ہو سکتا ہے لیکن بزرگ، ولی یا خدارسیدہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا ان کے نزدیک ایک ایسا داغ ہے جو کسی اللہ والے کے دامن پر زیب نہیں دیتا۔ چنانچہ آج تک دوسری قوموں کے زیرِ اثر مسلمانوں میں بھی اس کے آثار باقی ہیں۔ آج جب بھی کسی اللہ کے ولی کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کی ایسی صفات بیان کی جاتی ہیں جو کسی فرشتے کی صفات تو ہو سکتی ہیں، انسان کی ہرگز نہیں۔ یعنی انہوں نے برسوں کا روزہ رکھا، شادی نہیں کی، ایک تہہ خانے میں محبوس رہے اور لوگوں کو کبھی منہ نہ دکھاتے تھے۔ اسلام کی نگاہ میں ان میں سے کوئی بات بھی تقربِ الٰہی کی علامت نہیں۔ بلکہ اس سے رہبانیت کی بو آتی ہے۔ اقبال نے شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

تیرے دیر و حرم سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری

اسلام نے ایک مومن کو ہر دور کا امام بنایا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں دنیوی فرائض کو اس طرح ادا کر کے دکھاتا ہے جس سے یہ بات واضح ہو سکے کہ دین کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ وہ تجارت کرتا ہے، مزدوری کرتا ہے، ملازمت کرتا ہے، نکاح کرتا ہے، بچوں کی تربیت کرتا ہے، لوگوں سے میل جول رکھتا ہے، ہر طرح کے اجتماعی معاملے میں شریک ہوتا ہے، لیکن اس کا کوئی کام بھی اپنی مرضی اور اپنے طریقے کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ ہر کام کرنے سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو دیکھتا ہے اور شریعت کے طریقے کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، پھر اس کے مطابق اپنا کام انجام دیتا ہے۔ وہ دنیا کو اس طرح برت کے دکھاتا ہے جس سے یہ بات مبرہن ہو جاتی ہے کہ دنیوی معاملات میں ایک مومن اور کافر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی دنیا کو یہی سکھانے کیلئے آتے ہیں اور وہ اس کیلئے سب سے مکمل اسوہ اور نمونہ ہوتے ہیں لیکن اہلِ مکہ چونکہ اس بارے میں اپنا مخصوص طرزِ فکر رکھتے تھے، اس لئے انہوں نے آنحضرت ﷺ کے معمولات کو جو نبوت کا عکس تھے دنیاداری سمجھ کر نبوت کے برعکس قرار دیا اور صاف کہا کہ آپؐ تو ہماری طرح ایک دنیادار آدمی ہیں آپؐ پیغمبر کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپؐ تو اسی طرح کھاتے پیتے ہیں جس طرح ہم کھاتے پیتے ہیں۔ چنانچہ اسی کے جواب میں ایک ایسی بات فرمائی گئی جو عقل کو اپیل کرتی ہے کہ پیغمبر بھی جسم رکھتے ہیں تو ہر جسم جو اپنے خصائص رکھتا ہے وہی خصائص پیغمبروں کے اجسام کے بھی ہوتے ہیں۔

نبی حیاتِ جاوداں لے کر نہیں آتے

دوسری بات ارشاد فرمائی کہ وہ ہمیشہ رہنے والے نہیں ہوتے۔ انہیں بھی باقی انسانوں کی طرح موت آتی ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنا

Marfat.com

صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔اس میں کفارِ مکہ کے اس عقیدہ کا رد ہے۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کبھی موت سے ہمکنار نہیں ہوتے اور محمد (ﷺ) چونکہ ہماری ہی طرح ایک بشر ہیں اس لئے یقیناً موت سے ہمکنار ہوں گے تو وہ پیغمبر کیسے ہو سکتے ہیں۔قرآنِ کریم نے دوسری جگہ بھی کفار کے اس عقیدے کا ذکر کیا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کو کبھی موت نہیں آتی۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدِ ''ہم نے آپؐ سے پہلے کسی بشر کو ہیشگی اور دوام نہیں بخشا۔'' كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ''ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔''امیر مینائی نے ٹھیک کہا:

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝۹

(پھر ہم نے ان سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ان کو اور جن کو ہم چاہتے ہیں نجات دی اور حدود سے تجاوز کر جانے والوں کو ہلاک کر دیا۔ ۹)

رسول کی تکذیب ہلاکت کا باعث ہے

اللہ تعالیٰ جب بھی کسی رسول کو کسی قوم کی ہدایت کیلئے مبعوث فرماتا ہے تو اس رسول کو اپنی قوم کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بعض دفعہ جان وتن بھی خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔بگڑی ہوئی قوم ہدایت کی دعوت دینے والی زبان کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دینے پر تل جاتی ہے۔پیغمبر پر ایسے نازک لمحات بھی آتے ہیں جب حوصلے شکست ہونے لگتے ہیں۔ایسے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ونصرت نازل ہوتی ہے اور اپنے پیغمبر کو یقین دلایا جاتا ہے کہ حق آپ کے ساتھ ہے، باطل آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔جیسے ہی آپ کی قوم حد سے گزرنے لگے گی تو ہم آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والوں کو بچا لیں گے اور آپ کی قوم پر عذاب نازل کر دیں گے۔یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے ہر رسول کے ساتھ کرتا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اپنی ذات میں ایک بشر ہوتا ہے۔لیکن اپنے تعلق اور وابستگی میں دوسرے انسانوں سے بہت بلند ہوتا ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ کی وحی اترتی ہے جبکہ دوسرے انسان وحی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔پروردگار اس کی دعوت کی بقا اور زندگی کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے جبکہ باقی تمام مخلوقات اس کے تکوینی اور طبعی نظام کے تحت زندگی اور موت کا شکار ہوتی ہیں۔اللہ تعالیٰ براہِ راست کسی انسان سے کوئی وعدہ نہیں کرتا لیکن انبیائے کرام کے تقرب اور وابستگی کا عالم یہ ہے کہ پروردگار براہِ راست ان سے وعدہ کرتا ہے اور پھر وعدے کو ایفا کرتا ہے۔ان کی زندگی کو ان کی قوم کی زندگی کیلئے ضمانت بنا دیتا ہے۔وہ اپنی قوم کے جسد میں روح کے مانند ہوتے ہیں کہ جس طرح روح نکلنے سے جسد بیکار ہو جاتا ہے، اسی طرح پیغمبر کی ہجرت کر جانے سے قوم غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔اب اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں رہتی اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔

متذکرہ بالا اللہ تعالیٰ کی سنت کو اس آیت میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح سابقہ امتوں کی طرف رسول آتے رہے ہیں، اسی طرح آنحضرت ﷺ اہلِ عرب کی طرف خصوصاً اور باقی دنیا کی طرف عموماً رسول بن کر تشریف لائے ہیں۔آپؐ کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا وہی وعدہ ہے جو باقی رسولوں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔قریش مکہ کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ان کی زندگی اور بقا کا انحصار آنحضرت ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے پر ہے۔اگر انہوں نے اس دعوت کو قبول نہ کیا اور آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی دعوت کے بارے میں حد سے گزر گئے اور

Marfat.com

اللہ تعالیٰ سے بغاوت اور سرکشی میں تمام حدود پامال کردیں تو پھر جس طرح پہلی امتوں کو ہلاک کیا گیا ہے یہ بھی اس ہلاکت سے بچ نہیں سکیں گے، کیونکہ باغیوں اور سرکشوں کو کبھی بھی زندہ نہیں چھوڑا جاتا۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰

(اور ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے، جس میں تمہارا ذکر ہے، تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ۱۰)

ذکر کا ایک معنی ہے یاد دہانی۔ اور دوسرا ہے یاد، تذکرہ اور سرگزشت۔

آیت کے مختلف مفاہیم

پہلے معنی کے اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ہم نے پہلی امتوں کی طرف رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں تاکہ ان پر حجت تمام ہوجائے اور وہ قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے پاس تو کوئی انذار اور تبشیر کرنے والا نہیں آیا تھا ورنہ ہم دوسروں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور صالح ہوتے۔ اس بے خبری میں ہمیں آخر کیسے پکڑا جاسکتا ہے لیکن رسول کے آجانے اور کتاب کے نازل ہوجانے کے بعد وہ یہ عذر پیش کرنے سے قاصر ہوجاتے ہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے جواب طلبی کرے گا اور اپنے جواب کے مطابق وہ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اسی طرح اے اہلِ عرب ہم نے تمہاری طرف یاد دہانی کیلئے بھی اپنا آخری رسول بھیجا اور آخری کتاب اتاری۔ اب تمہارے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو پہلی امتوں کے ساتھ رسول کی دعوت اور کتاب کی ہدایت کے حوالے سے ہوتا رہا ہے۔ جن امتوں نے اسے قبول کیا وہ سرفراز ہوئیں اور جنہوں نے انکار کیا وہ اس کی پاداش میں عذاب کا شکار ہوئیں۔ اے اہل عرب! آج تمہارے سامنے بھی ایک فیصلہ کن مرحلہ ہے کہ تم اس دعوت کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ اگر تم نے خدانخواستہ اسے رد کردیا اور اپنی مخالفت کا رویہ نہ بدلا تو تمہیں اس لئے معاف نہیں کردیا جائے گا کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور بیت اللہ کے متولی ہو اور حرم کے رہنے والے یا بیت اللہ کا حج کرنے والے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہاں قانون کی عملداری میں دو عملی نہیں۔ وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت کسی کیلئے نہیں بدلتی۔ اس کے قانون میں کسی کیلئے کوئی ڈھیل نہیں۔ اس لئے تمہیں اس آئینہ میں اپنی شکل پہچان کر اپنے انجام کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ چنانچہ اس سخت تہدید و وعید کے بعد فرمایا گیا ہے کہ کیا تم اس سیدھے اور صاف معاملے پر غور نہیں کرتے کہ تم کس راستے پر چل پڑے ہو اور کس خطرناک انجام کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہو۔

دوسرے معنی کے اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ مکہ سے یہ کہا جارہا ہے کہ تم ہمارے پیغمبر کو کبھی شاعر کہتے ہو اور کبھی کاہن ٹھہراتے ہو اور جس کتاب کو وہ تمہارے پاس لے کے آیا ہے اسے کبھی شاعری، کبھی ساحری اور کبھی پراگندہ خواب سے تعبیر کرتے ہو۔ تم نے اس کتاب میں آخر ایسی کون سی عجیب بات دیکھی ہے جو تمہاری سمجھ میں آنے والی نہیں؟ اگر تم اسے غور سے پڑھو تو دیکھو گے کہ اس میں جو عقائد بیان کئے گئے ہیں وہ تمہاری کامیابی کی اساس ہیں، جو ضابطۂ حیات دیا گیا ہے وہ تمہاری کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ اس میں انسان کی فطرت اور ساخت اور اس کے آغاز و انجام پر جو گفتگو ہوئی ہے ظاہر ہے وہ تمہاری ہی کہانی ہے اور تم جو کچھ اس دعوت کے حوالے سے کررہے ہو تمہیں ان غلطیوں پر متنبہ کیا گیا ہے اور سابقہ امتوں کے احوال سے استشہاد کرتے ہوئے تمہیں تنبیہ کی گئی ہے۔ پھر تمہارے سامنے اچھے اور برے انسانوں کے اخلاق و اوصاف کو کھول کر بیان کردیا گیا ہے تاکہ تم فضائلِ اخلاق سے اپنے آپ کو مزین کرو اور قبائح سے اجتناب کرو۔

Marfat.com

اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تمہارے لئے کامیابی کا راستہ کیا ہے اور ناکامی کس راستے کا انجام ہے۔ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جو تم سے تعلق نہ رکھتی ہو اور جسے اجنبی اور بیگانہ سمجھ کر تم اس سے وحشت اختیار کرو۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم ان باتوں پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے ہو۔

تیری ہر ادا میں بل ہے، تیری ہر نگہ میں الجھن
میری آرزو میں لیکن کوئی پیچ ہے نہ خم ہے

متذکرہ بالا دونوں مفاہیم اس حوالے سے بیان کئے گئے ہیں کہ خطاب قریش یا اہلِ عرب سے ہے۔ لیکن ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ خطاب مسلمانوں سے ہو۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے جس میں اے مسلمانو! تمہاری اپنی سرگزشت ہے۔ تمہارے لئے زندگی کے مختلف نمونوں کو زیر بحث لایا گیا ہے اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں کون سا دہ نمونہ ہے جو تمہارے لئے تجویز کیا گیا ہے اور گزشتہ امتوں کی تاریخ سے ان باتوں کو بیان کیا گیا ہے جن سے تمہیں بچنا ہے اور گزشتہ انبیائے کرام کے واقعات کو بیان کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کے نقوشِ قدم تمہارے انتظار میں ہیں کیونکہ اب قیامت تک اس روشنی کے تم امین بنائے گئے ہو تا کہ تم غور وفکر سے اس کتاب کے آئینہ میں اپنی شکل پہچاننے اور اس کے حُسن وقبح کو دیکھنے کی کوشش کرو۔

حضرت احنف بن قیس ایک مشہور تابعی گزرے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اتنے بڑے قبیلے کے سردار اور اس قدر ہردلعزیز تھے کہ اگر انہیں غصہ آجاتا تو کئی ہزار تلواریں بے نیام ہو جاتیں۔ ایک دفعہ ان کے سامنے یہ آیتِ کریمہ پڑھی گئی۔ سن کے کہنے لگے کہ ذرا قرآنِ کریم تو لاؤ، میں بھی دیکھوں کہ اس میں میرا ذکر کہاں ہے؟ اس میں اگر ہم سب کی سرگزشت بیان کی گئی ہے اور سب کا ذکر کیا گیا ہے تو یقیناً اس میں میرا بھی ذکر ہوگا۔ انہوں نے سب سے پہلے شخصیات کے حوالے سے عباد وزہاد کو دیکھا، ان کے احوال کو پڑھا، انبیاء کے حالات دیکھے، تاریخ کے مختلف ادوار میں اللہ تعالیٰ کے جن مقرب بندوں نے راہِ حق میں قربانیاں دی ہیں ان کو پڑھا۔ اس کے شکر گزار بندوں اور صبر کرنے والوں کے حالات دیکھے تو پکار اٹھے کہ یا اللہ مجھ پر تیرا بے حد کرم ہے لیکن میں ایسا خوش نصیب نہیں کہ میں اپنے آپ کو ان عظیم لوگوں میں شمار کر سکوں۔ پھر انہوں نے ان لوگوں کے حالات پڑھنے شروع کئے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنے یا جن کے بارے میں پروردگار نے ناخوشی کا اظہار فرمایا۔ ان میں فراعنہ اور نمارده بھی ہیں، ہامان اور قارون بھی ہیں، اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے قاتل اور اپنی ذات کی سربلندی کیلئے جان دینے والے بھی ہیں۔ ان میں فساق وفجار کے گروہ بھی ہیں اور منافقین کے ٹولے بھی۔ ایک ایک کو پڑھتے گئے آخر چیخ اٹھے کہ پروردگار میں ایسا گیا گزرا بھی نہیں کہ ان میں اپنے آپ کو شامل کرلوں، تو آخر میں کہاں ہوں؟ تیرا ارشاد تو یہ ہے کہ اس کتاب میں سب کا ذکر ہے۔ آخر جب وہ اس آیت پر پہنچے وَآخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحًا وَّآخَرَ سَيِّئًا ۔ الخ "اور کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ملے جلے اعمال کئے، کچھ نیک اور کچھ برے، انہیں اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کی نظر فرمائے گا، بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔" پڑھتے ہی جھوم اٹھے کہ میں اپنے اللہ کے قربان جاؤں، اس نے مجھے بھلایا نہیں، یہ ہے میری تصویر، مجھے اپنے بارے میں نہ خوش فہمی ہے نہ غلط فہمی۔ اس کی توفیق سے بہت سی نیکیاں کرنے کا بھی موقع ملا ہے اور بہت سی کوتاہیاں بھی ہوئی ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میری کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا۔ احنف اپنے رب کے پاس چلے گئے لیکن اس آیت کے فہم کا ایک راستہ کھول گئے۔

اقبال نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا:

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا

Marfat.com

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً

وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ
مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ
وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾
فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾
وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ
اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ
نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَ
لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ ۚ
يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً
مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ
اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾
لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ
دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِىَ
وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِىْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ
فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ

Marfat.com

اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ
الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ
بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَهُمْ مِّنْ
خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ یَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْۤ اِلٰهٌ مِّنْ
دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِیْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾ ع

رکوع: ۲۔ (اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا جن کے لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے اور ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھا کھڑے کئے۔ ۱۱) اور جب انہوں نے ہمارا عذاب محسوس کیا تو لگے وہاں سے بھاگنے۔ ۱۲) (ہم نے کہا) اب مت بھاگو، اور واپس لوٹو اپنے عیش کے سامانوں اور اپنے مکانوں کی طرف تا کہ تم سے باز پرس کی جائے۔ ۱۳) کہنے لگے، ہائے ہماری کم بختی، بیشک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ ۱۴) پس وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹے ہوئے کھیت اور بجھی ہوئی آگ کی مانند کر دیا۔ ۱۵) ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشا کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ ۱۶) اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے، اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے۔ ۱۷) بلکہ ہم حق سے باطل پر چوٹ لگاتے ہیں، پس وہ اسے کچل دیتا ہے، پھر وہ دیکھتے دیکھتے نابود ہو جاتا ہے اور تمہارے لئے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو۔ ۱۸) اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی سے نہ سرکشی کرتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں۔ ۱۹) وہ شب وروز اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ اکتاتے نہیں۔ ۲۰) کیا انہوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لئے ہیں جو (زمین کو یا مردوں کو) زندہ اور شاداب کرتے ہیں۔ ۲۱) اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے، تو اللہ، عرش کا مالک، ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ ۲۲) وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے پرسش نہیں کی جاسکتی اور ان تمام سے باز پرس کی جائے گی۔ ۲۳) کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، اے پیغمبر ان سے کہئے کہ اپنی دلیل پیش کرو، یہ قرآن جو نصیحت ہے ان لوگوں کیلئے جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے بلکہ ان میں سے اکثر حق سے بے خبر ہیں، اس لئے وہ اس سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ۲۴) اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری ہی عبادت کرو۔ ۲۵) اور وہ کہتے

Marfat.com

ہیں کہ خدائے رحمٰن نے (اپنے لئے) اولاد بنالی ہے، وہ ان باتوں سے پاک ہے بلکہ وہ خدا کے مقرب بندے ہیں۔
۲۶) اس سے بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ ۲۷) اللہ تعالیٰ جانتا ہے
جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کیلئے جسے وہ پسند فرمائے
اور وہ اللہ کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں۔ ۲۸) اور جو ان میں سے یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا میں اِلٰہ ہوں تو ہم اس کو
جہنم کی سزا دیں گے، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ ۲۹)

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ⑪

(اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا جن کے لوگ اپنے جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے اور ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھا کھڑے کئے۔ ۱۱)

تاریخ کا حوالہ

روئے سخن قریش ہی کی طرف ہے، ان سے کہا جا رہا ہے کہ جس طرح تم ایک قوم کی حیثیت سے یہاں آباد ہو اور تمہاری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری رسول بھیجا ہے اسی طرح تم سے پہلے تم سے زیادہ وسیع سطح پر تم سے بڑی قومیں زمین کے مختلف حصوں میں آباد رہی ہیں ان کی طرف بھی مختلف وقتوں میں رسول بھیجے گئے لیکن جب انہوں نے رسول کی ہدایت کو قبول کرنے کی بجائے ظلم کا راستہ اپنایا یعنی بجائے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے کے شیطان کی بندگی جاری رکھی اور اپنے نفس کے تقاضوں کی پیروی کرتے رہے اور اس طرح انہوں نے اپنے اوپر ظلم ڈھایا کہ جس مقصد کیلئے انہیں پیدا کیا گیا تھا اسے اختیار کرنے کی بجائے اور ہی چیزوں کو اپنا مقصد بنالیا اور اپنے غلط رویے سے اپنے اوپر ظلم ڈھانے کے ساتھ ساتھ دوسروں پر بھی زیادتیاں کیں اور اللہ تعالیٰ کی زمین کو ظلم سے بھر دیا تو تب ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور ان کی تمام قوت و شوکت دھری رہ گئی۔ ان کی بے شمار فوجیں ان کا تحفظ نہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا عذاب آیا کہ ان کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ اب اگر تم بھی اسی راستے پر بڑھتے چلے جانے پر اصرار کر رہے ہو اور اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی دعوت قبول کرنے کی بجائے ہر ممکن طریقے سے اسے روکنے کے درپے ہو اور تم نے بھی وہی ظالمانہ روش اپنالی ہے تو پھر یاد رکھو تمہارا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔ جس طرح آج وہ تاریخ میں عبرت کا سامان بن کے رہ گئے ہیں اسی طرح تم بھی کہانیوں کا عنوان بن کے رہ جاؤ گے۔

غلط فہمی کا ازالہ

تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ اس علاقے کی رونق اور اس کی آبادی تمہارے دم سے ہے۔ تم نہ ہوتے تو حرم کی پاسبانی کون کرتا اور اللہ تعالیٰ کے گھر طواف و زیارت کیلئے آنے والوں کی دیکھ بھال کون کرتا۔ گویا اس سرزمین کی مانگ کے تم سیندور ہو۔ تمہارے نہ رہنے سے یہ بستی اجڑ جائے گی۔ یاد رکھو پہلی تباہ ہونے والی قومیں بھی اسی پندار کا شکار تھیں۔ انہیں بھی یہ زعم تھا کہ ہم نہ ہوئے تو یہ گلستاں بھی باقی نہیں رہے گا۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ جس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دھرتی پر آباد کیا ہے اس کیلئے کوئی مشکل نہیں کہ وہ انہیں مٹا دے اور کسی دوسری قوم کو

Marfat.com

یہاں آباد کر دے۔ چنانچہ دیکھ لو متذکرہ بالا قوموں کا انجام تمہارے سامنے ہے لیکن جس سرزمین پر وہ آباد تھے وہ زمین آج بھی اسی طرح سرسبز و شاداب ہے۔ زندگی کی رونقیں وہاں آج بھی رقصاں ہیں۔ البتہ وہ لوگ اپنی تباہی اور بربادی کو پہنچ چکے ہیں۔ اس میں تمہارے لئے بہت بڑا سبق ہے کہ تم اپنی آبادی کیلئے اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس سرزمین کی آبادی کیلئے تمہارا محتاج نہیں۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾

(اور جب انہوں نے ہمارا عذاب محسوس کیا تو لگے وہاں سے بھاگنے۔ ۱۲)

عذاب سے کوئی پناہ نہیں

اللہ تعالیٰ کے رسول جب ان کے تمرد اور سرکشی کے باعث انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے تھے تو وہ بھی تمہاری طرح ان کے انذار کو خاطر میں نہیں لاتے تھے بلکہ بڑھ چڑھ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے بلکہ کبھی تو ایسا ہوتا کہ بار بار ہمارے رسول کو چڑاتے کہ جس عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو وہ عذاب آخر کہاں رک گیا ہے، آ کیوں نہیں پاتا۔ لیکن جب اس عذاب کے آثار ظاہر ہونے لگے اور ان کے دروازوں پر دستک دی تو پھر انہیں یقین آیا کہ ہم جسے محض ایک ڈراوا سمجھتے تھے وہ تو واقعی حقیقت بن کر ہمارے سروں پر آ پہنچا ہے۔ تب اس سے بچنے کیلئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے کہ شاید کوئی چیز ہماری پناہ گاہ بن جائے اور اس کی پناہ میں ہم اس عذاب سے اپنے آپ کو بچا لیں۔ لیکن انہیں کیا خبر کہ جب اللہ کا عذاب آ جاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس سے بچا نہیں سکتی اور جب وہ دبوچ لیتا ہے تو کوئی اس کے چنگل سے نکل نہیں سکتا۔ تم بھی آج اسی خود فریبی میں مبتلا ہو جس میں وہ مبتلا تھے، تم بھی اسی کے انتظار میں ہو کہ عذاب تمہارے دروازوں پر آ پہنچے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو یاد رکھو تمہیں کوئی پناہ نہیں دے سکے گا۔

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾

(ہم نے کہا) اب مت بھاگو، اور واپس لوٹو اپنے عیش کے سامانوں اور اپنے مکانوں کی طرف تا کہ تم سے باز پرس کی جائے۔ ۱۳)

ممکن ہے کہ جب اس قوم پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برسا ہو اور وہ اپنے بچاؤ کیلئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہوں تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ندا سنائی گئی ہو کہ تم تو اس عذاب کو ایک مذاق سمجھ رہے تھے، اب اس سے بھاگتے کیوں ہو۔ اگر تم میں ہمت ہے تو اس کا سامنا کرو۔

ایک طنزیہ اسلوب

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صورتحال کی تعبیر ہو، یعنی عذاب نے اپنی زبانِ حال سے یہ کہا ہو کہ جس عذاب کا تم منہ چڑایا کرتے تھے اور جس کے آنے کا تمہیں گمان تک نہ تھا، اب تم اس سے بھاگتے کیوں ہو۔ تم میں ہمت ہے تو اپنے ان عیش کدوں کی طرف لوٹو جن میں تم رات دن دادِ عیش دیا کرتے تھے۔ اپنے ان محلات میں جا کر اپنی مسندوں پر فروکش ہو جاؤ جہاں دنیا تمہاری ہیبت کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ عیش کے جن

Marfat.com

سامانوں نے تمہیں ہر طرح کی سنجیدہ بات سے غافل کر دیا تھا اور تم اس بات کو بھول گئے تھے کہ کوئی اس کائنات کا خالق و مالک بھی ہے۔ اب انہیں عیش گاہوں اور محلات میں بیٹھ کر دوبارہ اپنے خدم و حشم کو دعوت دو، تا کہ وہ پھر تمہارے سامنے سرِ تعظیم و تکریم جھکائیں اور کورنش بجالائیں اور پھر اپنی کونسلوں کی میٹنگز بلاؤ تا کہ وہ تمہاری فہم و فراست سے استفادہ کریں۔ یہ طنز و تضحیک کا ایک انداز ہے کہ تمہارے بس میں ہے تو یہ سب کچھ کرو، لیکن اب تم کچھ نہیں کر سکو گے، اب تو تم اپنے نہایت برے انجام سے دوچار کئے جاؤ گے کیونکہ یہ عذاب تم پر آیا ہی اس لئے ہے کہ تم سے تمہاری بداعمالیوں کا جواب طلب کیا جائے اور تم نے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو روکنے کیلئے جو مجرمانہ ہتھکنڈے اختیار کئے رکھے اس کی تم سے باز پرس کی جائے۔ عیش کدے تو تمہارے ساتھ ختم ہو گئے، اب تو تمہیں جوابدہی کیلئے اٹھایا جائے گا تا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

(کہنے لگے، ہائے ہماری کم بختی، بیشک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ ۱۴) پس وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹے ہوئے کھیت اور بجھی ہوئی آگ کی مانند کر دیا۔ ۱۵)

بعد از وقت اعتراف کام نہیں آتا

جب عذاب کے تھپیڑوں نے انہیں پٹخنا شروع کیا، تو تب انہیں اپنے اعمال اور اپنے رویئے کی حقیقت یاد آئی۔ اب تک ان کی آنکھوں پر عیش و عشرت کی جو پٹی چڑھی ہوئی تھی جیسے ہی وہ اتری تو انہیں اندازہ ہوا کہ ہم تو واقعی پرلے درجے کے نافرمان تھے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول ہمیں زندگی کے حقائق کی طرف بلاتا تھا لیکن ہمارے سامنے خواہشات کے اتباع کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ اب ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ ہم واقعی خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر عذاب بھیج کر ظلم نہیں کیا بلکہ یہ ظلم کی رات ہم نے خود اپنے اوپر تانی ہے۔ اس مصیبت کو ہماری بداعمالیوں نے دعوت دی ہے۔ لیکن اب ان کے پاس واویلا کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اب وہ اپنی قسمت کو روتے اور اپنی بداعمالیوں کا نوحہ کر رہے تھے۔ لیکن قدرت نے اس کی بھی انہیں زیادہ مہلت نہیں دی۔ ان کے رونے دھونے اور چیخ و پکار کا ہنگامہ جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں دھن ڈالا۔ صرف زندگی ہی نہیں چھینی گئی جسموں کے پرخچے بھی اڑا دیئے گئے۔ جہاں کبھی بہاریں رقص کرتی اور زندگی کی دلفریبیاں مسکراتی تھیں اب وہاں ان کی لاشیں کٹی ہوئی گھاس کی مانند پڑی تھیں جن میں زندگی کا کوئی شرارہ نہ تھا۔

حَصِيْدًا۔ حَصَدَ...... درانتی سے فصل کاٹنے کو کہتے ہیں۔ خٰمِدِيْنَ ...... خمود سے ہے۔ اس کا معنی ہے، آگ کا بجھانا۔

ان دونوں لفظوں کو اکٹھا لا کر شاید اس طرح اشارہ ہے کہ جب فصل کاٹی جاتی یا گھاس کاٹی جاتی ہے تو پھر اس کے خشک انبار کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ نتیجتاً وہ راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ اب یہ متکبر اور مغرور لوگوں کی قوم راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی تھی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾

(ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشا کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ ۱۶)

Marfat.com

ایک توجیہ، ایک تبصرہ

اللہ تعالیٰ متمرد قوموں پر جو عذاب بھیجتے ہیں یہ اس کی توجیہ بھی ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت پر توجہ نہیں دیتے اور جس کی تصویر اب قریش تھے ان کے نظریہ حیات پر تبصرہ بھی ہے۔

توجیہ کی صورت یہ ہے کہ اگر اس زمین پر بسنے والے انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی گرفت نہ آئے اور ان کی زندگی بھر کے حساب کیلئے آخرت کا تصور نہ ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا کسی حکیم و عادل کی تخلیق نہیں بلکہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے اور یا ایک ایسا تھیٹر ہے جس میں ہر ایکٹر کو اپنا کردار ادا کرنے کی آزادی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا کردار اچھا ہے یا برا، اس کے نتائج دنیا اور اہل دنیا پر کس طرح کے مرتب ہوتے ہیں، اسے بہر حال آزادی حاصل ہے کہ وہ اس دنیا میں جیسی چاہے زندگی گزارے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہاں ظالم اور مظلوم میں کوئی فرق نہیں، نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں، اچھائی اور برائی یکساں ہیں، علم اور جہالت ہم وزن اور ہم قیمت ہیں۔ اگر اس تصور کو قبول کر لیا جائے تو پھر واقعی یہاں کسی کا کوئی محاسبہ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اگر حقیقت یہ نہیں بلکہ اس کائنات کو تخلیق کرنے والے نے اسے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد کار فرما ہے۔ اس نے انسان کو حواس اور عقل دے کر جس طرح اپنی ضروریات پیدا کرنے کی صلاحیت دی ہے اسی طرح اپنے پیغمبر اور کتابیں نازل کر کے اسے ہدایت سے بھی نوازا ہے اور اسے یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ دنیا تیرے لئے دارالامتحان ہے۔ تجھے آنے والی دنیا کیلئے یہاں رہ کر تیاری کرنا ہے۔ وحی کے ذریعے زندگی کے حُسن و قبح، جائز و ناجائز، اچھائی اور برائی اور حلال و حرام کا تعین کر دیا گیا ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ایک راستہ وہ ہے جس پر چلنے والے اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور دوسرا راستہ وہ ہے جس پر چلنے والے اس کے غضب کا شکار ہوں گے۔ ایک ضابطۂ حیات دے کر سب پر لازم کر دیا گیا ہے کہ اس کی پابندی کرو گے تو اس کے نتیجے میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے انعامات ملیں گے اور اگر اس ضابطے کی خلاف ورزی کرو گے تو دنیا میں بھی اس کا غضب بھڑک سکتا ہے اور آخرت میں تو وہ ہمیشہ کیلئے ایسے لوگوں کو جہنم کی نذر کر دے گا۔ یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد اب جب لوگ اس کے طریقے پر چلنے کی بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کرتے اور دوسروں کی زندگی کیلئے خطرہ پیدا کرتے ہیں اور زمین کو ظلم سے بھر دیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں بھی کبھی محاسبے کے طور پر اس کا عذاب آتا ہے تاکہ اہل دنیا کو معلوم ہو جائے کہ یہ دنیا ایک دارالعمل اور دارالامتحان ہے، کوئی کھیل تماشا نہیں جس میں کوئی باز پرس نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کے مخالفین کے نظریہ حیات پر تبصرہ ان معنوں میں ہے کہ وہ یہی سمجھتے تھے کہ انسان کو دنیا میں پیدا کر کے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے اور جس طرح چاہے طرزِ عمل اختیار کرے اس سے کوئی باز پرس ہونے والی نہیں۔ یہ چند روز کی زندگی جیسے کیسے بھی گزر جائے اس کے بعد مکمل فنا ہے اور اس کے بعد کوئی زندگی نہیں جس میں اچھے اور برے کی تمیز سامنے آئے اور اچھائی پر جزا ہو اور برائی پر سزا ملے۔ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ اگر یہ تصور قبول کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے جس کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت پر توجہ دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾

(اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے، اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے۔ ۱۷)

Marfat.com

اللہ جیسی ذات سے کھیل اور کارِ عبث کا صدور ناممکن ہے

عربی زبان میں حرف لَوْ کا استعمال فرضی چیزوں کیلئے ہوتا ہے جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ اور کبھی ایسے موقع پر اس کا استعمال ہوتا ہے جو کہنے والے کی شان کے لائق نہ ہو۔ اس کائنات کے نظام کو کھیل سمجھنا ایک ایسی بات ہے کہ جس کا کوئی وجود نہیں کیونکہ کائنات کے نظام پر غور وفکر کرنے والا اس طرح کی بات کبھی نہیں کہہ سکتا۔ کائنات کی ایک ایک چیز چاہے اس کا تعلق زمین سے ہو یا آسمان سے وہ اس طرح ایک نظام میں جکڑی ہوئی ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے چشمِ بینا عطا فرمائی ہے اور جس نے علم کے چند جام پیئے ہیں وہ اس میدان میں جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا اور حیرت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اسے اس کے انتظام و انصرام کا ایک ایک گوشہ سمجھنے میں دشواری تو ضرور پیش آتی ہے لیکن زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی مخلوقات میں ایک حیرت انگیز نظم و ترتیب، ایک بے حد وسیع نظامِ ربوبیت اور حیرت میں ڈال دینے والا نظامِ حکمت نگاہوں کے سامنے آئے بغیر نہیں رہتا۔ جس شخص کو ان حقائق کا معمولی سا احساس بھی ہے وہ اس کائنات کو لہو اور کھیل قرار نہیں دے سکتا۔ بالخصوص حضرت انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا گلِ سرسبد بنایا ہے اور خلافتِ ارضی کا تاج جس کے سر پر سجایا ہے اور جسے نہ صرف جوہرِ عقل سے نوازا بلکہ نبوت و رسالت کی عظیم نعمت بھی اسی کے اندر رکھی ہے۔ اس کی زندگی کو لہو ولعب قرار دینا تو اور بھی زیادہ حیران کن ہے۔ اس لئے اس کا ذکر حرف لَوْ سے کیا گیا۔

اور دوسری یہ بات کہ جب انسان کی بصیرت مخلوقات میں حکمتوں پر مبنی وسیع تر نظام کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے تو وہ اس کائنات کے خالق کے بارے میں کیا تصور کر سکتی ہے۔ بجز اس کے کہ قدم قدم پر انسان نہ صرف ورطۂ حیرت میں ڈوبتا ہے بلکہ اس کی کمالِ تخلیق اور کمالِ قدرت کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایسی ذات کے بارے میں یہ سمجھنا کہ اس نے کائنات کو یا حضرت انسان کو محض کھیل تماشے کیلئے پیدا کیا ہے تو کیا کوئی عقل مند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی اعلیٰ صفات سے میل کھاتی ہے۔

اسی سے متفرع کرتے ہوئے پروردگار نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ چلئے بالفرض اگر ہمیں کھیلنا ہی ہوتا اور اس کیلئے ہمیں کسی کھلونے کی ضرورت ہوتی تو ہم ایسا کھلونا اپنے پاس ہی سے بنا لیتے۔ یہ تو کبھی نہ کرتے کہ انسان جیسی ذی حس، ذی شعور اور ذمہ دار مخلوق کو پیدا کرتے، پھر ان کے درمیان حق و باطل کی ایک خلیج حائل کر دیتے اور انہیں بتا دیتے کہ یہ دنیا حق و باطل کی رزم گاہ ہے یہاں جو لوگ میرے ہیں انہیں حق کیلئے جینا اور مرنا ہے اور جو شیطان کے بندے ہیں انہیں باطل کی ہمنوائی میں میدانِ رزم کو گرم کرنا ہے۔ اس طرح سے ہمیشہ کیلئے یہ دنیا ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہے جس میں مختلف وقتوں میں اللہ تعالیٰ کے نام لیوا اور اس کے دین پر چلنے والے اس کی خاطر خون بہاتے اور جانیں دیتے ہیں۔ اس راستے میں کتنے سہاگ لٹتے، کتنے گھر ویران ہوتے، کتنی گودیں اجڑتیں اور کتنے بچے یتیم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ آسمانوں سے یہ کھیل دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پروردگار نے یہ دنیا انسان کیلئے دارالامتحان نہیں بنائی بلکہ یہ ایک رومی اکھاڑہ ہے جہاں غلاموں اور قیدیوں کو بھوکے درندوں سے لڑوایا جاتا اور بوٹیاں نچوا کر امراء خوشی سے ٹھٹھے لگاتے اور محظوظ ہوتے۔ کائنات کا اور انسان کا یہ تصور صرف اسی ذہن میں آ سکتا ہے جو نہ اس کائنات کو سمجھتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی عظمت سے آگاہ ہے۔ اس کے نزدیک ظالم اور مظلوم، سرکش و باغی اور وفادار و تابعدار، ناشکرے اور نابکار اور حق شناس و شکر گزار سب برابر ہیں۔ اس دنیا میں نہ کوئی روزِ عدل ہے اور نہ کوئی ایسا دین جو عدل کی تعلیم دے سکے اور لوگوں کو اس کیلئے تربیت دے سکے۔ یہ ایسا بے ہودہ تصور ہے جس سے بڑھ کر کسی بے ہودگی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

Marfat.com

آخری جملہ کہہ کر درحقیقت اسی تصور کی تردیدِ مزید ہے کیونکہ دنیا میں ایسی مشرک قومیں گزری ہیں اور اب بھی ہیں جو اس کائنات کو اپنے دیوتاؤں کی ایک تماشا گاہ سمجھتی ہیں اور ہندو فلسفیوں نے اس کو بھگوان کی لیلا سے تعبیر کیا اور آج کی مادہ گزیدہ دنیا جس طرح مادہ پرستی میں حد سے تجاوز کر چکی ہے وہ اگرچہ زبان سے نہ کہے لیکن حقیقت میں اس کے نزدیک بھی دنیا کی حیثیت اس سے مختلف نہیں۔ وہ اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھتے ہیں اس لئے ان کے ذہنوں میں قیامت کا تصور قرار نہیں پکڑتا اور ویسے بھی اگر وہ اس تصور کو قبول کر لیں تو انہیں اپنی زندگی میں تبدیلی کا عمل پیدا کرنا ضروری ہو جاتا ہے یا کم از کم ان کے ضمیر میں جوابدہی کا ایک شعلہ سا ضرور جلنے بجھنے لگتا ہے جو انہیں مادہ طلبی میں اندھا نہیں ہونے دیتا۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

(بلکہ ہم حق سے باطل پر چوٹ لگاتے ہیں، پس وہ اسے کچل دیتا ہے، پھر وہ دیکھتے دیکھتے نابود ہو جاتا ہے اور تمہارے لئے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو۔ ۱۸)

آیت کے دو مفہوم

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا ایک سنجیدہ نظام سے چل رہی ہے۔ انسان کی سرشت میں نیکی کا پہلو غالب رکھا گیا ہے۔ بدی کی طرف اس کا میلان اس وقت بڑھتا ہے جب نیکی کیلئے کام کرنے والے نیکی کے فروغ میں کوتاہی کرتے ہیں۔ اس کائنات کی سرشت کے مطابق کوئی باطل چیز یہاں جم نہیں سکتی۔ باطل یہاں جب بھی سر اٹھاتا ہے حقیقت سے اس کا تصادم ہو کر رہتا ہے اور آخر کار وہ مٹ کر ہی رہتا ہے۔ حق و باطل کی یہ کشمکش کبھی مختلف نتائج دیتی ہے اس کی وجہ اہلِ حق کی ناکامی ہوتی ہے ورنہ حق کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔ جب بھی اہلِ حق، حق کی پیروی میں اخلاص کا ثبوت دیتے ہیں اور حق کی سربلندی میں جان لڑاتے ہیں تو باطل ان کے سامنے کبھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اس حقیقت کے حوالے سے قریش سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم آج باطل کا ساتھ دے کر اپنی قسمت باطل کے ساتھ وابستہ کر لو گے تو اللہ تعالیٰ کے رسول کا یہ قافلہ جو حق کے علمبرداروں کا قافلہ ہے ایک وقت آئے گا کہ تم اس کے ہاتھوں پٹ جاؤ گے اور اگر تم نے اپنی نام نہاد قوت سے کام لے کر ان کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو کوئی تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تمہاری قوت کو توڑ ڈالے اور تمہیں پامال کر کے رکھ دے۔ معذب قوموں کی تاریخ تمہارے سامنے ہے۔ انہوں نے بھی تمہاری طرح اس کائنات کو محض تماشا گاہ، محض ایک خوانِ یغما اور محض ایک عیش کدہ سمجھ کر زندگی گزارنے کی کوشش کی اور ہر ممکن طریقے سے حق کا راستہ روکا۔ لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ اس لئے تمہارے لئے عقل کا راستہ یہ ہے کہ تم حقیقت کو سمجھو اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو قبول کرو، اسی میں عافیت ہے اور اسی میں کامیابی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ حق و باطل کی کشمکش جاری رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ ساتھ باطل کو بھی مہلت دیتا رہتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی نگاہ میں حق و باطل دونوں یکساں ہیں بلکہ باطل کا باقی رہنا صرف اس لئے ہے تاکہ انسان کا امتحان جاری رہے کہ کون حق کو اختیار کرتا ہے اور کون باطل کی پرستش کرتا ہے۔ بالآخر ایک دن آئے گا جب پروردگار حق کا ہتھوڑا باطل کے سر پر اس طرح ماریں گے کہ وہ باطل کا بھیجہ نکال کر رکھ دے گا اور آخری جملے میں فرمایا کہ تم آج جو کچھ کر رہے ہو اور کہہ رہے ہو اس وقت تمہیں اندازہ ہو گا کہ اس کے نتیجے میں کیسی تباہی تمہارا مقدر بنتی ہے۔

Marfat.com

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝۱۹ۚ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝۲۰

(اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی سے نہ سرکشی کرتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں۔ ۱۹) وہ شب و روز اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ اکتاتے نہیں۔ ۲۰)

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں مشرکینِ عرب کے مشرکانہ رویئے اور ان کے نظریۂ حیات پر تنقید کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر مشرکین کے نظریۂ حیات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر پروردگار اور کائنات کے بارے میں ایک ایسا نقطۂ نگاہ پیدا ہوتا ہے جس سے کائنات کی پُر از حکمت تخلیق اور اللہ تعالیٰ کی صفات بالخصوص اس کی صفتِ حاکمیت اور صفتِ عدالت کا تصور بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں انسانی زندگی کے بامقصد اور جوابدہ ہونے کے تصورات یکسر تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دونوں صفات کے حوالے سے کائنات کی تخلیق کا صحیح تصور، کائنات کے وجود کی صحیح توجیہ اور انسانی زندگی کا صحیح محمل پیش فرمایا۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں چند ایسے حقائق کو بیان کیا جا رہا ہے جن سے شرک کی جڑ کاٹنا بھی مقصود ہے اور انسان کا اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونے کے تصور کو واضح کرنا بھی پیشِ نظر ہے۔

شرک کی تردید

سب سے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی کہ تمام آسمانوں اور تمام زمینوں اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان میں سے ایک ایک مخلوق کا خالق، مالک اور حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو اس کے سوا کسی نے تخلیق نہیں کیا۔ اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا وہ اس کی ملکیت کا دعویٰ کرے۔ ان دونوں باتوں کے قبول کرنے کے بعد یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ ہی اس کائنات کا حاکمِ مطلق ہے، اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں آزادانہ تصرف کرے اور کسی اور کو اس کی مرضی کے بغیر کسی طرح کے تصرف کی بھی قطعاً آزادی نہیں۔ رہی وہ مخلوقات جو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں یعنی جو آسمانوں میں ہیں اور جن کی حیثیت کارکنانِ قضاء و قدر کی ہے یا جو حاملینِ عرش ہیں اور یا زمین میں وہ مقدس نفوس جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی اتاری اور کتابیں نازل کی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس کی بندگی سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ان میں فرشتے ہوں یا اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول، اس کی اطاعت میں سرمو کمی بیشی کرنا ان کے بس میں نہیں۔ البتہ! یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی فضائل سے نوازا ہے اور فرشتے تخلیقی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے احکام کو براہِ راست کائنات پر نافذ کرنا انہیں کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ان تمام فضائل اور صلاحیتوں، ذمہ داریوں اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی سے سرتابی تو کیا کریں گے وہ تو اس کی عبادت اور بندگی سے نہ کبھی تھکتے اور نہ کبھی سیر ہونے کا نام لیتے ہیں۔ جس طرح مرغن غذاؤں سے پیٹ بھر جانے کے باوجود کھانے کے لطف و لذت سے نیت بھرنے میں نہیں آتی اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ذوق بخشا ہے کہ وہ اس کی عبادت اور اس کے احکام کی بجا آوری میں اس سے بڑھ کر لطف و لذت محسوس کرتے ہیں جتنا ایک شخص پر تکلف کھانے کو کھاتے ہوئے لذت محسوس کرتا ہے۔ اہلِ عرب نے فرشتوں کی طرف خصوصیت سے بہت سی باتیں منسوب کر رکھی تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ممکن طریقے سے بیٹیوں کی طرح ان کی ناز برداریاں کرتا ہے اور ان کی ہر ضد کے سامنے اپنے اختیارات سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اس لئے اہلِ عرب کا خیال یہ تھا کہ اولاً تو قیامت کا تصور ہی محال ہے لیکن اگر قیامت آ ہی گئی تو اللہ تعالیٰ کی یہ بیٹیاں جن کو ہم اپنی عبادت اور

Marfat.com

بندگی سے خوش رکھتے ہیں وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچالیں گی اور اگر اللہ تعالیٰ غضبناک ہوا تو وہ ضد کر کے اپنے باپ سے ہمیں چھڑالیں گی۔ ان کے بارے میں اہلِ عرب کو توجہ دلاتے ہوئے بطورِ خاص ارشاد فرمایا گیا ہے کہ فرشتے جنہیں تم اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے ہو وہ تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے لرزاں اور ترساں رہتے ہیں اور تم نے جو بعض مشرکانہ باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر رکھی ہیں وہ ان باتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کرتے رہتے ہیں کیونکہ تسبیح کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان صفات سے پاک اور منزہ ٹھہرانا ہے جو اس کی شان اور عظمت کے لائق نہیں۔ وہ شب و روز اس کام میں مصروف رہتے ہیں اور کبھی ان میں اس کیلئے اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

(کیا انہوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لئے ہیں جو (زمین کو یا مردوں کو) زندہ اور شاداب کرتے ہیں۔ ۲۱)

مشرکین کے ایک واہمہ کا رد

اَنْشَرَ...... کا معنی ہے زندہ اٹھا کھڑا کرنا۔ اور اگر اس کا مفعول ارض ہو تو پھر اس کا معنی ہے، مردہ زمین کو زندہ کر دینا یعنی سرسبز و شاداب کر دینا۔

اہلِ عرب کے علم الاصنام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ یقیناً تمام کائنات کا خالق و مالک اور حاکم ہے۔ وہ رب العرش العظیم ہے۔ اس کا عرش سرچشمۂ اقتدار ہے اور وہ اس پر براجمان ہو کر تمام کائنات کی دیکھ بھال کرتا اور ان کیلئے احکام جاری کرتا ہے۔ لیکن زمین سے آسمان اور پھر اس کا عرشِ عظیم اس قدر دور ہے کہ آسمانوں کے ساتھ ساتھ زمینوں کی نگہداشت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے پروردگار زمینوں کا انتظام و انصرام دوسروں کے حوالے کر کے اہلِ زمین سے الگ تھلگ ہو گیا ہے اب اس کی حاکمیت کا تعلق صرف آسمانوں سے ہے، زمین سے نہیں۔ اسی تصور کے تحت اہلِ عرب نے زمین کے اِلٰہ الگ ٹھہرا لئے اور یہ عقیدہ بنا لیا کہ یہ وہ اِلٰہ ہیں جو زمین کا انتظام و انصرام چلاتے، اس کو سرسبز و شاداب کرتے اور اہلِ زمین کی ضروریات کی کفالت کرتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ اگر اس تصور کو قبول کر لیا جائے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کا خدا ایک ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ہزار انکار کے باوجود عملی طور پر اہلِ عرب زمین کے الگ خداؤں کو مانتے تھے۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾

(اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے، تو اللہ، عرش کا مالک، ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ ۲۲)

مشرکین کی ایک دلیل کا جواب اور توحید کا اثبات

سابقہ آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مشرکینِ عرب کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ آسمان کا اِلٰہ اور ہے اور زمین کا اِلٰہ اور۔ زمین چونکہ کائنات کا ایک دور دراز گوشہ ہے۔ آسمانوں کا اِلٰہ اتنے دور دراز گوشے پر نظر نہیں رکھ سکتا تو اس کا انتظام کیونکر کرے گا۔ اس لئے اس نے زمین دوسروں کے حوالے کر دی اور خود آسمانوں تک محدود ہو گیا۔ اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زمین پر رہنے والے رب العرش کی بندگی

Marfat.com

کرنے کی بجائے ان خداؤں اور الٰہوں کی بندگی کریں جو زمین کے انتظام وانصرام کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ نادانو! اگر زمین کا خدا کوئی اور ہوتا اور آسمان کا کوئی اور، قطع نظر اس کے کہ اِلٰہ یا خدا وہ کائنات کے کسی ایک حصے میں سمٹ کر نہیں رہتا کیونکہ اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ کائنات کے کسی دور دراز گوشے کا انتظام چلانا میری ہمت سے بڑھ کر ہے تو یہ کمزوری اور احتیاج ہے۔ اِلٰہ مطلق کیلئے ایسی کسی کمزوری کا اثبات اس کی الوہیت سے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ اگر وہ اِلٰہ ہے تو وہ ہر طرح کی کمزوری سے پاک ہے کیونکہ اِلٰہ وہ ہوتا ہے جو واجب الوجود ہو۔ جو اپنے موجود ہونے میں کسی خالق کا محتاج نہ ہو۔ جو تمام صفاتِ کمال سے متصف ہو اور جملہ نقائص وعیوب سے پاک ہو۔ جو خدا کائنات کے کسی گوشے کا انتظام چلانے کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ اِلٰہ کیسے ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ اس کی صفتِ کمال کے بھی خلاف ہے اور اس کی ذات کیلئے ایک نقص بھی ہے جبکہ وہ تمام نقائص سے پاک ہے۔ اور پھر وہ اِلٰہ کیسا کہ جو تمام کائنات کا خالق ہے لیکن کائنات کا کوئی ایک گوشہ اس کی کمزوری کی وجہ سے اس کی حاکمیت سے باہر ہے اور اس کی الوہیت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔

قطع نظر ان حقائق کے یہاں ایک اور آسان سی بات کہی گئی ہے کہ اگر کسی گھر کے دو سربراہ ہوں اور دونوں برابر اختیارات رکھتے ہوں تو وہ گھر دیر تک سلامت نہیں رہ سکتا۔ جس فوج کے دو کمانڈر انچیف ہوں وہ فوج آپس میں لڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کسی ملک اور کسی قوم نے کبھی آج تک یہ تصور نہیں کیا کہ ہم اپنے ملک کے دو حکمران بنالیں جو قوت وطاقت اور اختیار میں مساوی حیثیت کے مالک ہوں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اختیار واقتدار کی ثنویت ہمارے ملک کو تباہ کردے گی۔ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ کائنات جس کا خالق ایک ہے اس کے اِلٰہ ایک سے زیادہ ہوں کیونکہ اگر وہ برابر اختیارات کے مالک ہوئے تو کائنات باقی نہیں رہ سکتی اور اگر ان میں سے ایک برتر ہوا اور دوسرا کمتر یا اس کے ماتحت تو جو کمتر یا ماتحت ہو وہ اِلٰہ نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ زمین میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی فعلیت اور انفعالیت میں صرف زمین کے عناصر کی خدمات کارفرما نہیں بلکہ جابجا اس میں فضاء اور آسمان کے عناصر بھی شریک اور کارفرما ہوتے ہیں۔ زمین پر رہنے والوں کو رزق اس وقت ملتا ہے جب زمین کی قوتِ روئیدگی اپنا کام کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آسمان سے اس کی آبیاری کا سامان ہوتا ہے۔ سورج کی گرمی اس کے غلے اور پھلوں کو پکاتی ہے۔ چاند کی حلاوت ان میں نرمی، مٹھاس اور گداز پیدا کرتی ہے۔ زمین کی قوت اگر پودوں کو قد وقامت عطا کرتی ہے تو آسمان سے برسنے والی شبنم ان کا منہ دھلاتی اور ان میں خوشبو پیدا کرتی ہے۔ اگر کہیں زمین وآسمان کے خدا الگ الگ ہوتے تو زمین غلے کو اگاتی لیکن اس کی سیرابی کا کوئی انتظام نہ ہوتا۔ سورج اپنی گرمی کو روک لیتا جس سے غلے اور پھلوں کے پکنے کے امکانات ختم ہو جاتے۔ اسی طرح انسانی زندگی کی ہمہمی اور سرگرمی موسموں کی خوئے انقلاب کی محتاج ہے۔ یہ موسموں کا انقلاب جس طرح زمین کی گردش سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح سورج کی روشنی سے اس میں رنگ اور روپ آتا اور تبدیلی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر زمین کی گردش جاری رہتی لیکن آسمان اپنے کُرّوں اور اپنے عناصر کو زمین کی ہم آہنگی سے روک دیتا، تو یہاں کوئی چیز پیدا نہ ہوتی اور جس کے نتیجہ میں انسانی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ سوال صرف انسانی زندگی کا نہیں بلکہ زمین اور آسمان دونوں اپنی زندگی اور توانائی میں اس قدر ایک دوسرے کے محتاج ہیں کہ اگر دونوں کو یکسر ایک دوسرے سے لاتعلق کردیا جائے تو دونوں اپنے وجود کو کھو بیٹھیں۔ سردی اور گرمی، پانی اور آگ، ہوا اور مٹی۔ سورج کی گرمی سے پانی سے اٹھنے والے سحاب اور بادلوں میں کوندنے اور گرجنے والی بجلیاں، آسمان سے برستے ہوئے شہابِ ثاقب۔ ایسی ہی لاتعداد اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں جن کی آپس کی نسبت توافق کی نہیں تخالف کی ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ خداؤں کے زیرِ فرمان کردیا جائے تو نتیجہ

Marfat.com

اس کا تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک خدا کی جابر و قاہر ذات ہے جو بے پناہ قدرتوں کی مالک ہے اور جس کے علم سے کائنات کا کوئی گوشہ باہر نہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ جس کے تکوینی نظام میں بندھا ہوا ہے اس کے حکم میں یہ قوت ہے کہ وہ ان تمام متضاد اور متخالف عناصر کو ایک خدمت بجالانے اور ایک نتیجہ برآمد کرنے میں ایک دوسرے کی سازگاری پر مجبور کرتا ہے اور کسی میں یہ ہمت نہیں کہ وہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔ سورج کبھی چاند سے آگے نہیں بڑھ سکتا، رات کبھی دن سے سبقت نہیں کر سکتی، زمین کی گردش کو کوئی متاثر نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام مخلوقات اپنے اپنے محور و مدار میں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے طریقے کے مطابق حفظ و امان کے حصار میں زندہ ہیں۔ اگر کہیں دو خدا ہوتے تو ان تمام عناصر کا تضاد اور تخالف ایک دوسرے کو تباہ کر کے رکھ دیتا۔ بادل پانی کی بجائے زمین پر آگ برساتے، اس کی بے تحاشا بجلیاں زمین کے رہنے والوں پر بارش کی طرح برستیں، زمین کی گردش کمزور پڑ جانے کے باعث چالیس گھنٹے کا لمبا دن جون کے مہینے میں ہر چیز کو جلا کے رکھ دیتا، سمندروں کے کنارے ٹوٹ جاتے تمام زمین زیر آب آجاتی، پہاڑ لاوا اگلنے لگتے ہر چیز تباہ و برباد ہو جاتی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حاکمانہ اقتدار ہے جس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا، پھر اس کا تسویہ کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی اور پھر اپنا اپنا فرض انجام دینے کی ہدایت اور رہنمائی بخشی۔ بجائے اس کے کہ انسان اس پر اس کا شکر گزار ہوتا الٹا اس کیلئے شرک کے دلدل میں اتر کر نئے نئے شریک تجویز کرتا اور زندگی کے تباہی کے راستے کھولتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کس قدر عظیم ہے کہ وہ اس پر ناراض ہو کر عذاب برسانے کی بجائے صرف یہ کہنے پر اکتفا فرماتی ہے کہ پاک ہے اللہ جو عرشِ عظیم کا مالک ہے، ان تمام بے ہودہ باتوں سے جو اس کے بارے میں مشرک کہتے ہیں۔

لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾

(وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے پرسش نہیں کی جا سکتی اور ان تمام سے باز پرس کی جائے گی۔ ۲۳)

اللہ تعالیٰ کی عظمت

اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ وہ جو فیصلے فرماتا اور جو وہ حکم دیتا ہے کسی کی مجال نہیں کہ اس کے بارے میں سوال کر سکے۔ وہ جسے چاہتا ہے موت دیتا ہے، جس کا کاروبار چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، جس کا چاہتا ہے تخت چھین لیتا ہے، جہاں چاہتا ہے زلزلہ بپا کر دیتا ہے، جب چاہتا ہے دریاؤں کے بند کھول دیتا ہے، جب چاہتا ہے بادل بے روک ہو جاتے ہیں، وہ جہاں چاہتا ہے زمین انسانوں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا جب اشارہ ہوتا ہے تو موسم اپنی شدت سے مخلوقات کیلئے مصیبت بن جاتے ہیں۔ لیکن کسی کی مجال نہیں کہ اس سے سوال کر سکے کہ تو نے ایسا کیوں کیا۔ البتہ دنیا میں چاہے انسان ہوں یا جنات، ملائکہ ہوں یا حاملینِ عرش وہ جب چاہے گا ان کے ایک ایک عمل کا حساب لے گا۔ انبیائے کرام اور رسولانِ عظام اپنی تمام تر معصومیت کے باوجود راتوں کو اس کے سامنے کھڑے ہو کر روتے اور مناجات کرتے رہتے ہیں اور قیامت کے دن باوجود اس کے کہ ان کیلئے بلند درجات کا وعدہ ہو چکا ہے نفسی نفسی پکاریں گے۔ کاش! نادان انسان سوچے کہ جس پروردگار کی عظمت اس قدر ہمہ گیر ہے اس کے ساتھ کسی کو شریک کیونکر ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ

Marfat.com

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾

(کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، اے پیغمبر ان سے کہئے کہ اپنی دلیل پیش کرو، یہ قرآن جو نصیحت ہے ان لوگوں کیلئے جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے بلکہ ان میں سے اکثر حق سے بے خبر ہیں، اس لئے وہ اس سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ۲۴)

شرک کی تردید میں ایک نقلی دلیل

شرک کی تردید میں عقلی دلائل دینے کے بعد ایک نقلی دلیل پیش کی جارہی ہے۔ اور اس کا انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ ان کے جرم کو بار دگر ذکر فرمایا گیا ہے کہ باوجودیکہ عقل کی اپیل تو بالکل واضح ہے۔ لیکن ان مشرکین کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی اور اِلٰہ بنا رکھے ہیں۔ اس لئے بجائے اصرار کرنے کے ہم انہیں سے سوال کے انداز میں ایک نقلی دلیل پیش کررہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ قرآنِ کریم جس میں نہایت دیانت و امانت کے ساتھ گزشتہ انبیائے کرام کی تعلیم بھی موجود ہے اور اس امت کیلئے تا قیامت آخری سند بن کر نازل ہوا ہے۔ اس قرآنِ کریم کو دیکھ لو اور مزید یہ کہ اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابیں جو تمہارے ہاتھوں میں ہیں انہیں دیکھ لو پھر ہمیں بتاؤ کہ کیا ان کتابوں میں تم نے کہیں بھی توحید کیخلاف اور شرک کے اثبات میں کوئی ایک جملہ بھی پڑھا ہے۔ کہیں پروردگار نے کسی علاقے کی الوہیت کسی اور شخص کو تفویض کی ہے یا کسی کو ایسی صفات عطا کی ہیں جن سے الوہیت لازم آتی ہو۔ اگر کوئی ایسی چیز ہے تو اسے پیش کرو۔ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں سناٹا رہا۔ ہر طرح کی باتیں بنانے والے جواب دینے سے عاجز رہے، تو تب پروردگار نے خود فرمایا کہ جہاں تک اہلِ عرب کا تعلق ہے ان لوگوں کا شرک کے حق میں آستینیں چڑھانا اور توحید کی دعوت دینے والوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہونا اس لئے نہیں کہ ان کے پاس کوئی دلیل موجود ہے بلکہ اس لئے ہے کہ یہ لوگ حق اور صحیح بات سے بالکل بے خبر ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کا اصل مرض جہالت ہے لیکن یہ جہالت کو علم اور بے دانشی کو دانش سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس لئے نہ صرف اپنی بات پہ اڑے ہوئے ہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

(اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری ہی عبادت کرو۔ ۲۵)

تاریخ نبوت سے استشہاد

دلیل پیش کرنے سے عاجزی پر ان کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم دلیل کہاں سے لاؤ گے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی ہم نے کسی رسول کو مبعوث کیا اور اس پر کوئی کتاب اتاری تو ہمیشہ اس پر عقیدۂ توحید وحی کیا گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تم کوئی بھی سابقہ آسمانی کتاب اٹھا کے دیکھ لو اگرچہ اس میں ہمہ نوع اور ہمہ جہت قسم کی تحریف ہو چکی ہے لیکن تمہیں کہیں بھی واضح الفاظ میں شرک کی دعوت نظر

Marfat.com

نہیں آئے گی توحید کا درس تو جابجا نظر آئے گا لیکن شرک کا اثبات کہیں نہیں ہوگا۔ البتہ یہ انسانوں کی بدنصیبی ہے کہ انہوں نے اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو مانتے ہوئے بھی نہ جانے شرک کے راستے کہاں سے نکال لئے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾

(اور وہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن نے (اپنے لئے) اولاد بنالی ہے، وہ ان باتوں سے پاک ہے بلکہ وہ خدا کے مقرب بندے ہیں۔ ۲۶) اس سے بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ ۲۷)

اللہ تعالیٰ کے دربار میں فرشتوں کی حیثیت

سابقہ آیات میں پروردگار نے عقلی اور نقلی دلائل سے یہ بات ثابت کردی کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات اور حقوق میں واحد اور یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ لیکن تعجب ہے بعض قوموں پر کہ اس قدر واضح اور عقلاً اور نقلاً مسلمہ حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد ثابت کی۔ ولد کا معنی عام طور پر بیٹا کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں ولد کا لفظ مذکر، مونث اور واحد اور جمع سب پر بولا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ اولاد کیا ہے کیونکہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا تھا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنالیا اور مشرکین عرب نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھا۔ کوئی شخص ایسا کم عقل نہیں ہوتا کہ جو بیٹے کو باپ کے برابر قرار دے دے۔ اس لئے ان مشرک قوموں نے بھی درحقیقت بیٹوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہوئے اس سے برابری کا عقیدہ قائم نہیں کیا۔ البتہ! اس کی بعض صفات میں شریک بنا کر ان کی بندگی کی اور یہ امید باندھ لی کہ باپ کو چونکہ اپنی اولاد بے حد عزیز ہوتی ہے اور بیٹیاں تو پرایا دھن ہونے کی وجہ سے عموماً زیادہ شفقت کے قابل سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے ان سے امید کی جاسکتی ہے کہ قیامت کے دن اگر اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوا تو یہ ضرور اپنے باپ کو ہمارے حق میں راضی کرلے گی۔ اگر اس کا غضب بھڑکے گا تو یہ اس کی محبت کا واسطہ دے کر غضب کو رحمت میں تبدیل کرالے گی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ یہاں ولد سے فرشتے مراد ہوں کیونکہ عرب ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، ہم اگر یہاں انہیں خوش رکھیں گے تو وہ دنیا میں بھی ہمارے لئے رزق میں افزائش کا باعث بنیں گی اور قیامت کے دن اپنے باپ سے ضد کرکے بھی ہمیں بخشوالیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تردید فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد ہو۔ مخلوق کو اولاد کی خواہش اس لئے ہوتی ہے کہ ہر مخلوق پر کبھی نہ کبھی بڑھاپا آتا ہے اور کبھی نہ کبھی اسے دوسری احتیاجات لاحق ہوتی ہیں۔ بڑھاپے اور احتیاج کے وقت اسے شدید ضرورت ہوتی ہے کہ کاش اس کی اولاد ہوتی جو اس بڑھاپے اور احتیاج میں اسے سنبھالا دیتی۔ اللہ تعالیٰ حی اور قیوم ہے۔ اسے نہ بڑھاپا آئے گا اور نہ کبھی کوئی احتیاج لاحق ہوگی تو اسے اولاد بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے جنہیں اللہ تعالیٰ کی اولاد بنا رکھا ہے وہ اولاد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے معزز اور مقرب بندے ہیں۔ یعنی وہ بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجز اور اس کی بندگی بجالانے پر مجبور ہیں جس طرح تم ہو۔ البتہ تم میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب اور معزز ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں انہیں کرامت وشرافت کا مقام میسر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمام تر قرب کے باوجود ان کی

Marfat.com

حالت یہ ہے کہ کبھی وہ بات کرنے میں پہل نہیں کرتے۔ جب ان سے کوئی بات پوچھی جاتی ہے تو حدِ ادب میں اس کا جواب دیتے ہیں۔ کسی معاملے میں ان کی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ وہ ہر وہ خدمت بجالاتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے لرزاں و ترساں سرتاپا ادب کی تصویر بنے رہتے ہیں۔

تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمہاری ہر طرح کی سرکشی اور تمرد کے باوجود تمہاری بندگی کی وجہ سے وہ ضد کر کے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو تبدیل کرالیں گے۔ وہ تمہارے کرتوتوں کے باعث تمہیں سزا دینا چاہے گا اور فرشتے اپنے زور واثر یا نازوتدلل سے اللہ تعالیٰ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کردیں گے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر طرح کے قرب کے باوجود وہ کبھی پروردگار سے کسی بات میں پہل کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور اگر پروردگار کی جانب سے کوئی بات پوچھی جاتی ہے تو نہایت ادب اور عاجزی سے وہ جواب دینے کی جسارت کرتے ہیں۔ اپنی مرضی سے کسی کام کو سرانجام دینا ان کی سرشت اور فطرت کے خلاف ہے۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جس بات کا انہیں حکم دیا جائے وہ اس کی تعمیل کریں۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾

(اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کیلئے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ اللہ کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں۔ ۲۸)

شفاعت کون کرے گا؟

انسان دنیا میں اس طرح زندگی گزارتا ہے کہ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے گزرا ہوا زمانہ اور گزشتہ اعمال اس کا ماضی بنتے جاتے ہیں اور آنے والا زمانہ جو اس کا مستقبل ہے کبھی اس کو امیدیں دلاتا ہے اور کبھی اس کیلئے ڈراؤنا خواب بن جاتا ہے۔ اس کا حال ہر لمحہ ماضی بنتا جا رہا ہے اور ہر آنے والا لمحہ حال میں پہنچنے سے پہلے اس کا مستقبل ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے شناسا کے ''حال'' سے کسی حد تک واقف ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ماضی اس کے سامنے نہیں گزرا تو وہ اس سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اور مستقبل کے بارے میں نہ وہ اپنے بارے میں جانتا ہے اور نہ دوسرے کے بارے میں۔ تاوقتیکہ مستقبل حال سے گزرتا ہوا ماضی میں غروب نہیں ہوجاتا لیکن اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ اس کیلئے ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی تقسیم نہیں۔ جو گزر چکا وہ بھی اس کے سامنے ہے، جو گزر رہا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہے اور جو ابھی پردۂ اخفاء میں ہے وہ اس سے بھی پوری طرح آگاہ ہے۔ کیونکہ جس طرح وہ ماضی میں جھانک سکتا ہے اسی طرح وہ مستقبل کو بھی دیکھتا ہے۔ بنابریں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی فرشتہ یا کوئی اور شخص کسی سے متعلق اس کے علم میں اضافہ کر سکے۔ جو شخص کسی کے حال کو جانتا ہے وہ بھی اس کی گہرائی اور گیرائی کو نہیں جانتا۔ اور جہاں تک ماضی اور مستقبل کا تعلق ہے وہ اس کے احاطۂ علم سے بالکل خارج ہے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کے بارے میں کوئی فیصلہ فرمائے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ اس کے بارے میں جانتا ہوں۔ اس لئے جن قوتوں یا فرشتوں کے بارے میں مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ بھی کریں وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچالیں گے۔ آخر وہ کس بنیاد پر سمجھتے ہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے بالکل

Marfat.com

بے بسی کی تصویر ہیں اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو چیلنج نہیں کرسکتے اور وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں بے خبرِ محض ہیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے میں کوئی مشورہ کیسے دے سکتے اور اس کے علم میں اضافہ کیسے کرسکتے ہیں؟ ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک اعزاز ضرور رکھا ہے کہ وہ کسی کی شفاعت کریں۔ لیکن وہ شفاعت اس کیلئے کریں گے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں اور جس کیلئے شفاعت کرنے کی اجازت دیں۔ اس تمام احتیاط اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام عنایات کے باوجود ان کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ کہیں بے خبری میں بھی ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہو۔

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

(اور جو ان میں سے یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا میں اِلٰہ ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ ۲۹)

شرک اللہ تعالیٰ کے مقام سے جہالت کا نتیجہ ہے

اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور اپنے نام نہاد معبودوں کو ہر حالت میں اپنا شفیع سمجھنا یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات کے حقیقی مقام و مرتبہ سے جہالت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ جہالت دو طرح کی ہے۔ ایک جہالت تو وہ ہے جس کو علمی جہالت کہنا چاہئے یعنی اس عقیدے کا حامل سرے سے اللہ تعالیٰ کے مقام و مرتبہ سے ناواقف اور اس بارے میں انتہا درجہ جہالت کا مریض ہے۔ اور دوسری جہالت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقام و مرتبہ کو جاننے کے باوجود عملی استخفاف کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے مثلاً جب ایک شخص سے پوچھا جائے کہ اس کائنات کا خالق، مالک، رب، مدبر اور حاکمِ مطلق کون ہے؟ تو وہ فوراً جواب دے کہ اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے یا اس کے حقوق کے بارے میں اس کا طرزِ عمل دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو کہ وہ نام لیتے ہوئے بھی ہلکے پن کا اظہار کرتا ہے اور حقوق کی ادائیگی میں تساہل کا شکار ہی نہیں، انکار کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ اور اس کی شریعت کو اتنا وزن دینے کو بھی تیار نہیں جتنا ہماری زندگی میں وضعی قوانین کو حاصل ہے۔ تو یہ وہ استخفاف ہے جس کے نتیجے میں جانتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات کے بارے میں ہم نے عجیب و غریب تصورات بنا لئے ہیں۔ چنانچہ اس استخفاف کو ختم کرنے اور انسان کو جھنجھوڑنے کیلئے پروردگار بعض دفعہ ایسی بات ارشاد فرماتا ہے جو دلوں کو ہلا دینے والی ہوتی ہے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ جن قوتوں کے بارے میں تم نے شفاعتِ باطل کا عقیدہ بنا رکھا ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ شاید اللہ تعالیٰ ان قوتوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے، وہ جس طرح چاہیں اپنی بات اس سے منوا سکتے ہیں، تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ عظیم ذات ہے کہ اگر فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں اور انبیائے کرام جو اللہ تعالیٰ کے یہاں نہایت اعلیٰ مقام کے حامل ہیں اگر کہیں ان میں سے بھی کوئی خدا ہونے کا دعویٰ کردے (جو ظاہر ہے کہ بالکل ناممکن ہے) تو اللہ تعالیٰ ایسا دعویٰ کرنے والے کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو کافروں اور ظالموں کے ساتھ کرتا ہے۔ انہیں پکڑے گا اور جہنم میں پھینک دے گا کیونکہ انہوں نے بندگی کی بجائے خدائی کا دعویٰ کرکے اپنے ساتھ ظلم کیا۔ اور جو لوگ اس ظلم میں ان کے ساتھ شریک ہوئے ہیں وہ بھی اس ظلم کا شکار ہوئے۔ اس لئے ان کے اس جرم کی کم سے کم سزا یہی ہے کہ انہیں جہنم رسید کردیا جائے۔ اس سے تصور یہ دینا ہے کہ اس کی ذات کے بارے میں غلط تصور باندھنا یا اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا یا یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ ان کے سامنے بے بس ہے یہ ایسا جرم ہے کہ اگر ہمارے مقرب بندوں میں سے بھی کوئی اس جرم

Marfat.com

کا ارتکاب کرے تو ہم اسے بھی سخت سزا دیں گے۔ اس سے اندازہ کرلو کہ کل کو تمہارے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا
رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ
أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٠﴾ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ
بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣١﴾
وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا
مُعْرِضُونَ ﴿٣٢﴾ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٣٣﴾ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ
قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ﴿٣٤﴾ كُلُّ نَفْسٍ
ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا
تُرْجَعُونَ ﴿٣٥﴾ وَإِذَا رَآكَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا
هُزُوًا أَهَٰذَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ
هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٦﴾ خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۚ سَأُرِيكُمْ آيَاتِي
فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ﴿٣٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَنْ
وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٣٩﴾

Marfat.com

بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَ
لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ
فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٤١﴾ ع

رکوع: ۳۔ (کیا ان کفر کرنے والوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے
ان کو الگ الگ کر دیا اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا فرمائی۔ کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لاتے۔ ۳۰) اور ہم نے
زمین میں پہاڑ گاڑ دیئے کہ وہ ان کو لے کر لڑھک نہ جائے اور ہم نے ان میں کشادہ راہیں بنا دیں تاکہ یہ لوگ راستہ پا
سکیں۔ ۳۱) اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور وہ لوگ اس کی نشانیوں سے روگردانی کیے ہوئے ہیں۔ ۳۲)
اور وہی ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند بنائے، سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ ۳۳) اور ہم نے
آپ سے پہلے بھی کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں بخشی تو کیا اگر آپ انتقال کر جائیں تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے
ہیں۔ ۳۴) ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں اور آخر کار تم سب کو
ہماری طرف ہی لوٹ کے آنا ہے۔ ۳۵) اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو مذاق بنا
لیتے ہیں کہتے ہیں کیا یہی ہے وہ جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے (برائی سے) اور حال یہ ہے کہ وہ رحمٰن کے ذکر کے
بھی منکر ہیں۔ ۳۶) انسان کو جلدی کے خمیر سے پیدا کیا گیا ہے تو میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، سو تم
مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو۔ ۳۷) اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۳۸) کاش یہ کفر کرنے
والے جان لیتے اس وقت کو جب وہ روک نہ سکیں گے اپنے چہروں سے عذابِ نار کو، نہ اپنی پشتوں سے اور نہ ان کی کسی
طرف سے مدد کی جائے گی۔ ۳۹) بلکہ وہ اچانک ان پر آ دھمکے گی، سو انہیں بدحواس کر دے گی پھر وہ نہ اسے رد کر سکیں
گے اور نہ ہی انہیں مزید مہلت دی جائے گی۔ ۴۰) اور آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے
ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ۴۱)

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ
كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٠﴾

(کیا ان کفر کرنے والوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو الگ الگ
کر دیا اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا فرمائی۔ کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لاتے۔ ۳۰)

Marfat.com

توحید اور معاد پر آفاق اور مشاہدات کی شہادت

سابقہ آیات میں توحید اور معاد پر وہ دلیلیں قائم کی گئی ہیں جو عقل و فطرت اور صفاتِ الٰہی کے بدیہیات و مقتضیات پر مبنی تھیں۔اب آفاق کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے جو ہر روز انسان کے مشاہدے میں آتی ہیں۔کہنا یہ مقصود ہے کہ اس سورت کی آیت ۵ میں مشرکینِ مکہ نے مزید نشانیوں کا مطالبہ کیا تھا۔ان سے کہا جارہا ہے کہ نشانیاں تو تمہارے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ہیں۔اگر تم ان کھلی کھلی نشانیوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات،اس کی توحید اور قیامت کو ماننے سے انکار کرتے ہو تو تم مزید کسی نشانی کو دیکھ کر کیا کرو گے۔

آیتِ کریمہ میں رتق اور فتق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔رتق کے معنی ہیں یکجا ہونا،اکٹھا ہونا،ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا،متصل اور متلاصق ہونا اور بند ہونا۔اور فتق کے معنی پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔(تفصیل ان شاء اللہ حٰم السجدہ میں آئے گی)۔

مفسرین کے نزدیک اس کے دو مطلب مراد لئے جاسکتے ہیں۔ایک تو یہ کہ زمین و آسمان یعنی کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے کی طرح تھی۔یہ سب آپس میں ایک دوسرے سے پیوست اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس نے اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی زمین اور دوسرے اجرامِ فلکی الگ الگ دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے،پھر زمین موجودہ شکل میں کس طرح وجود میں آئی اور اجرامِ فلکی آہستہ آہستہ کس شکل میں متشکل ہوئے۔اس طرح کی تفصیلی بحثیں ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کے پیشِ نظر نہیں کیونکہ یہ کتابِ ہدایت ہے،کتابِ سائنس نہیں۔قرطبی نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور ضحاک اور عطاءؒ اور قتادہؒ سے جو کچھ نقل کیا ہے اس کا مفہوم اس کے قریب قریب ہے۔رہی یہ بات کہ سائنسدانوں کا یہ کہنا کہ ابتداء میں آفتاب ایک بھڑکتا ہوا شعلہ تھا۔اس کی حرکت بہت ہی تیز تھی۔آہستہ آہستہ اس کی حرکت کم ہوتی گئی اور وہ سکڑتا اور چھوٹا ہوتا گیا۔اس کے مادے میں گاڑھاپن آگیا اور حرکت کی تیزی کے سبب یا دوسرے کسی کُرّے کی کششِ ثقل کے باعث اس میں سے چند ٹکڑے ٹوٹ کر دور دور تک چلے گئے اور اسی کے گرد چکر لگانے لگے۔اس وقت تک کہا جاتا ہے کہ آفتاب سے گیارہ ٹکڑے ٹوٹے ہوئے ہیں جن سے ہمارا نظامِ شمسی بنا اور زمین بھی اسی میں سے ایک ہے۔اس میں اور قرآنِ کریم کے بیان میں اجمال و تفصیل کے فرق کے سوا اور کچھ نہیں۔

دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ لیا جاسکتا ہے کہ آیت میں رتق کے معنی بند اور فتق کے معنی کھولنے کے ہیں۔اس میں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ خزاں کے دنوں میں جب ہر طرف دھول اڑنی لگتی ہے،درختوں سے پتے جھڑ جاتے ہیں،بعض دفعہ دیر تک بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی شروع ہوجاتی ہے اور ہر طرف موت کی حکومت محسوس ہوتی ہے۔آسمان اہلِ زمین کیلئے اپنا سینہ بند کر لیتا ہے اور زمین کی قوتِ روئیدگی کا ایک ایک ریشہ سکڑ کر رہ جاتا ہے۔ایسے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت جوش میں آتی ہے۔وہ آسمان کا بند کھول دیتا ہے اور اس سے دھڑا دھڑ پانی برسنے لگتا ہے۔دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ایک ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ زمین کے بند بھی کھول دیئے جاتے ہیں وہ بھی اپنی نباتات کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔چند دنوں کے بعد دیکھو جہاں دھول اڑتی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی وہاں زندگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔بے آب و گیاہ صحرا میں مینڈک ٹرانے لگتے ہیں،زمین ہری بانات کی وردی پہن لیتی ہے،فضا پردہ رنگ میں محجوب ہوجاتی ہے اور رگِ سنگ میں بھی لہو کی گردش محسوس ہوتی ہے۔دیکھتے ہی دیکھتے یہ انقلاب آخر کس کی قدرت کا نتیجہ ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی اس دوسرے مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔تفسیر ابنِ کثیر میں ابن ابی حاتم کی سند سے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور ان سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی۔انہوں نے حضرت ابن عباسؓ

Marfat.com

کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس شیخ کے پاس جاؤ اور ان سے دریافت کرو اور وہ جو جواب دیں مجھے بھی اس کی اطلاع دو۔ یہ شخص حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ اس آیت میں رتقاً اور فتقنا سے کیا مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ پہلے آسمان بند تھے، بارش نہ برساتے تھے اور زمین بند تھی کہ اس میں نباتات نہیں اگتی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو آباد کیا تو آسمان کی بارش کھول دی اور زمین کا نشوونما۔ یہ شخص آیت کی تفسیر معلوم کر کے حضرت ابن عمرؓ کے پاس واپس گیا اور جو کچھ حضرت ابن عباسؓ سے سنا تھا وہ بیان کیا۔ تو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اب مجھے ثابت ہو گیا کہ واقعی ابن عباسؓ کو قرآن کا علم عطا کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے میں تفسیرِ قرآن کے بارے میں ابن عباسؓ کے بیانات کو ایک جرأت سمجھا کرتا تھا جو مجھے پسند نہ تھی۔ اب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علومِ قرآن کا خاص ذوق عطا فرمایا ہے۔ انہوں نے رتق وفتق کی تفسیر صحیح فرمائی ہے۔

جو لوگ توحید و معاد پر نشانیاں طلب کرتے ہیں ان کیلئے اس سے بڑھ کر اور نشانی کیا ہو سکتی ہے کہ جس پروردگار کے قبضۂ قدرت میں آسمان و زمین اس طرح محصور ہیں کہ وہ جب چاہتا ہے ان کے منہ باندھ دیتا ہے اور جب چاہتا کھول دیتا ہے اور پھر اسی بارش سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کیلئے ایک دن قیامت بپا کرنا اور زمین سے مردوں کو اٹھا کھڑا کرنا آخر کیا مشکل ہے۔؟

اسی طرح کیا یہ بات نہیں سمجھی جا سکتی کہ اگر آسمان کا خدا کوئی اور ہوتا اور زمین کا معبود اور ہوتا تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کی زندگی اور شادابی کیلئے اپنے پانی کے ذخیرے کا منہ کھولتا۔ اس کی بلا سے زمین اور اہلِ زمین تباہی و بربادی کی نذر ہو جاتے اور اگر اس نے پانی برسایا ہی تھا تو اگر زمین کا خدا کوئی اور ہوتا تو وہ زمین کی قوتِ روئیدگی کو آمادۂ عمل ہونے کی اجازت نہ دیتا۔ ان دونوں کا آپس میں متضاد اور متخالف ہونے کے باوجود زمین کی زندگی اور اہلِ زمین کی سیرابی کا انتظام کرنا کیا اس وجہ سے نہیں کہ ان دونوں کا معبود ایک ہے اور اسی معبود کا ارادہ ان دونوں پر حاوی ہے وہ جب چاہتا ہے یہاں خزاں طاری کر دیتا ہے اور جب چاہتا بہار کی ہوائیں چلا دیتا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ "ہم نے ہر زندہ چیز پانی سے پیدا کی۔" جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت نے زمین و آسمان میں اپنے رنگ دکھائے ہیں، اسی طرح اس کی قدرت کا ایک یہ بھی رنگ اور اظہار ہے کہ اس نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا فرمایا۔ یعنی پانی کو پروردگار نے سببِ زندگی اور اصلِ حیات بنایا اور اسی سے زندگی کا آغاز کیا۔ اور سورۂ نور میں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا یعنی اس کا مادۂ اصلی پانی ہے اور یا ہر جاندار کی بقا کا انحصار پانی پر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مادۂ منویہ مراد لیا جائے۔ تو اس سے بھی ہر جاندار کا وجود میں آنا مشاہد و معلوم ہے۔ جدید ماہرینِ علم الحیات کی تحقیق یہ ہے کہ ہر جاندار کی ترکیب میں عنصرِ اصلی پروٹو پلازم کا ہوتا ہے۔ اگر اسی کو مانا جائے تو اس جوہر میں بھی حصۂ غالب پانی کا ہی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں زندگی اور پانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مولانا عثمانی، فوائدِ عثمانی میں لکھتے ہیں (عموماً جاندار چیزیں جو ہم کو نظر آتی ہیں بالواسطہ و بلاواسطہ پانی سے بنائی گئیں، پانی ہی ان کا مادہ ہے۔ الّا کوئی ایسی مخلوق جس کی نسبت ثابت ہو جائے کہ ان کی پیدائش میں پانی کو دخل نہیں وہ مستثنیٰ ہوگی۔ للاکثر حکم الکل کے اعتبار سے یہ کلمہ صادق رہے گا)۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿٣١﴾

(اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیئے کہ وہ ان کو لے کر لڑھک نہ جائے اور ہم نے ان میں کشادہ راہیں بنا دیں تا کہ یہ لوگ راستہ پا سکیں۔ ۳۱)

Marfat.com

رَوَاسِیَ ...... پہاڑوں کی صفت کیلئے آتا ہے لیکن اب اپنی شہرت کے باعث موصوف کے قائم مقام ہوگیا۔اس کا معنی ہے بلند پہاڑ۔ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ ......میں اَنْ سے پہلے مَخَافَةَ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ایسا نہ ہو کہ وہ ان کو ساتھ لے کر لڑھک جائے۔ فِجَاجًا ، فَجّ کی جمع ہے۔دو پہاڑوں کے درمیان کے شگاف کو کہتے ہیں۔کشادہ راستے کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔مراد اس سے پہاڑوں کے درمیان درے ہیں۔

پہاڑوں کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اللہ تعالیٰ نے زمین کو بچھایا تو وہ حالتِ اضطراب میں ڈانواں ڈول تھی۔اللہ تعالیٰ نے اس پر بلند اور بھاری پہاڑ جمادیئے تاکہ اس کا توازن درست رہے اور کسی ایک طرف لڑھک کر کسی دوسرے کُرّے سے نہ جاٹکرائے،لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو حرکت سے روک دیا جائے بلکہ حرکت میں توازن پیدا کرنے کیلئے یہ انتظام فرمایا گیا۔چنانچہ زمین کی یہ حرکت اور گردش اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں سے ہے۔جب سے زمین کو بچھایا گیا آج تک اس کی حرکت میں کمی بیشی نہیں ہوئی ورنہ انسانوں کے سارے حساب غلط ہوجاتے۔آج تک اس کا توازن غلط نہیں ہوسکا ورنہ موسموں کا اختلاف۔اور بدلنا ناممکن ہوجاتا۔اور سردیوں کی طویل رات ہر چیز کو جمادیتی،اور گرمیوں کا طویل دن ہر چیز کو جلا دیتا اور انسانی زندگی ناممکن ہوجاتی۔

اللہ تعالیٰ کا دوسرا احسان یہ ہے کہ جس طرح اس نے پہاڑ جما کر زمین کی حرکت کو متوازن کیا اور انسانی زندگی کو محفوظ کردیا اسی طرح اس نے بلند سے بلند پہاڑ اس طرح نہیں جمائے کہ وہ قوموں اور ملکوں کے درمیان حدِ فاصل قرار پائیں اور ان کے درمیان کوئی راستہ نہ نکل سکے بلکہ اس نے پہاڑوں کے درمیان درے کھول دیئے اور ان میں اس بات کا امکان پیدا فرمادیا کہ انسان اپنی عقل سے کام لے کر یہاں کشادہ راستے بھی نکال سکتا ہے اور سہولت کے دیگر امکانات کو بھی وجود دے سکتا ہے۔آج تو انسان نے ڈائنامیٹ کے ذریعے پہاڑوں میں راستہ نکالنے اور سڑکیں بنانے کی قوت حاصل کرلی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ یہی قوت انسانوں کیلئے مسائل در مسائل پیدا کرتی چلی جارہی ہے۔لیکن ازمنۂ ماضیہ میں جب انسان ابھی اتنی ترقی نہیں کرسکا تھا تو اس وقت یہی قدرتی ذرائع دوسری قوموں اور ملکوں سے رابطہ کا ذریعہ تھے اور انسان نے ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھایا۔

لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ کے دو مطلب ہوسکتے ہیں۔ایک مطلب تو وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہم نے ان پہاڑوں کو پیدا کیا پھر زمین پر انہیں جمایا اور پھر ان میں راستے نکالے اور ان کے اندر عجیب و غریب دھاتیں رکھیں اور پانی کے چشمے رواں کیئے۔یہ سب کچھ اس لئے ہے تاکہ انسان ان میں غور کرے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت،عظمت اور حکمت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس طرح سے ان پہاڑوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کیلئے راستہ بنائے۔لیکن انسان کا عجیب حال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں سے عجیب و غریب نشانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔لیکن جو نشانیاں پہاڑوں کی صورت میں اس کے سامنے کھڑی ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتا۔تو ایسا انسان جو زمین و آسمان کی نشانیوں اور پہاڑوں کی حیرت انگیزیوں سے کوئی سبق نہیں سیکھتا تو اسے اگر کوئی اس کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا بھی دیا جائے تو وہ اس سے کیا ہدایت حاصل کرے گا۔ہدایت کیلئے تو عقل کی سلامتی،طبیعت کی آمادگی اور قلبی یکسوئی ضروری ہے جو ان لوگوں کو میسر نہیں۔اس لئے بجائے ہدایت حاصل کرنے کے معجزات کے مطالبے پر اکتفا ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾

(اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور وہ لوگ اس کی نشانیوں سے روگردانی کئے ہوئے ہیں۔ ۳۲)

آسمان کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اسی سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ معجزات طلب کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اس ناپیدا کنار سقفِ نیلگوں کو کیوں نہیں دیکھتے جس کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ آج تک انسانی پیمانے اسے ناپ نہیں سکے اور جس کی بلندی کا حال یہ ہے کہ انسان اسے دیکھتا ہے لیکن آج تک وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ یہ چھت کب بنائی گئی لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس کی تمام تر قدامت کے باوجود کہیں کہنگی کے اثرات نظر نہیں آتے۔ اس کی بناوٹ میں کسی معمولی خلل کی نشاندہی نہیں کی جاسکی۔ انسان کی ساری کاوشیں اس میں کسی شگاف کو آج تک دیکھنے سے عاجز ہیں۔ ایسی مضبوط چھت، جو ہماری حدِ نظر بلکہ حدِ تصور سے ماورا اور ہر طرح کے شگاف اور ہر قسم کی دراڑ سے محفوظ ہے۔ اس قابل نہیں کہ انسان اسے دیکھ کر اس کے خالق کی عظمت کا اعتراف کرے اور یہ سوچنے کی زحمت کرے کہ ہمارے سروں پر یہ تنی ہوئی چھت جس طرح ہر عیب سے مبرا معلوم ہوتی ہے کیا اس کا بنانے والا ہر طرح کی کمزوری، ہر قسم کے عیب اور ہر قسم کی شرکت سے منزہ نہیں ہوگا۔ قرآنِ کریم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○ (ق۔ ۶)

کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف توجہ نہیں کی؟ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور کس طرح اس کو زینت دی اور کہیں اس میں دراڑ اور کوئی شگاف نہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ○ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ○ (الملک: ۲۔۴)

وہ ذات جس نے پیدا کئے سات آسمان تہ بہ تہ، تم خدائے رحمٰن کی اس صنعت گری میں کوئی نقص نہیں پا سکتے، پس نگاہ دوڑاؤ، کیا تم کوئی خلل دیکھتے ہو؟ پھر دوبارہ نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ ناکام اور تھک ہار کر واپس آجائے گی لیکن وہ کوئی خلل نہ پا سکے گی۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

(اور وہی ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند بنائے، سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ ۳۳)

رات اور دن کی عنایات کی طرف اشارہ

اللہ تعالیٰ نے مزید کرم یہ فرمایا کہ رات اور دن کا تسلسل قائم فرمایا۔ دن کی ہمہ ہمی اور سرگرمی کیلئے سورج کا تنور جلایا اور اس سے ہر گھر کا صرف چولہا ہی نہیں جلا بلکہ انسانی زندگی کا ایک ایک چراغ روشن ہوا اور رات کو چاند سے منور فرمایا۔ دن کی روشنی انسانی سرگرمیوں کی ضامن

Marfat.com

ہے اور چاند کی چاندنی دلوں کیلئے ٹھنڈک کا باعث اور انسان کیلئے آرام وراحت کا پیغام ہے۔ دن کا تھکا ماندہ انسان رات کی آغوش میں آرام ڈھونڈتا ہے۔ اگر رات کا گہرا سناٹا اسے محیط رہتا تو وہ خوفزدگی کی کیفیت میں آرام کی بجائے دہشت کا شکار ہوجاتا اور اگر اسے کوئی ضرورت لاحق ہوتی تو رات کی تاریکی اسے کہیں آنے جانے کے قابل نہ چھوڑتی۔ رات کو ایک مدھم چراغ روشن کیا جو آرام وراحت میں خلل انداز ہونے کی بجائے تسکین کا پیغام اور ناگزیر ضرورتوں میں سہارے کا باعث ہے۔

کُلٌّ میں تنوین مضاف اِلَیہ کے حذف کی طرف اشارہ ہے۔ کُلُّھُمْ کے معنی میں ہے۔

فَلَکٌ دراصل ہر دائرے اور گول چیز کو کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے چرخے میں جو گول چمڑا لگا ہوتا ہے اس کو فَلْکَۃُ الْمِغْزَلُ کہتے ہیں۔ فارسی میں اسے چرخ اور گردوں کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے، اور یہاں اس سے مراد شمس وقمر کی وہ مداریں ہیں جن پر وہ حرکت کر رہے ہیں۔ الفاظِ قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں کہ یہ مداریں آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضا میں۔ حالیہ خلائی تحقیقات نے واضح کردیا ہے کہ یہ مداریں خلاء اور فضا میں آسمان کے بہت نیچے ہیں۔ آیت کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ تارے کھونٹیوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں۔ وہ خود انہیں لئے ہوئے گھوم رہا ہے بلکہ وہ کوئی سیال شے ہے یا فضا یا خلاء کی سی نوعیت کی چیز ہے جس میں ان تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر سیارہ اور ستارہ اپنے مدار میں حرکت کر رہا ہے لیکن کسی میں یہ مجال نہیں کہ وہ سرِ مو اپنے مدار سے منحرف ہوسکے۔ اگر ان میں سے کوئی سیارہ ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوجائے تو سارے نظامِ کائنات میں خلل واقع ہوجائے۔ اتنے عظیم کرّوں کا اپنے مدار میں سمٹ کر چلنا، کبھی اپنے راستے سے انحراف نہ کرنا اور کبھی کسی ادنیٰ تخلف اور توقف کو راستہ نہ دینا اس بات کی دلیل ہے کہ پوری کائنات حاکمِ کائنات کی محکوم اور اس کے ہاتھ میں مسخر ہے۔ ان میں باہمی نسبت چاہے اضداد کی کیوں نہ ہو لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہایت توافق اور کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنا اپنا فرض انجام دینے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں نہ صرف حاکمِ مطلق کی کارفرمائی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حاکم صرف ایک ہے اور اسی کی قوتِ قاہرہ کے ہاتھ میں ان کی باگ ہے۔ اب یہ کیسی حماقت ہے کہ لوگ ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے کسی اور نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

(اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ وَلَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے لے کر کَذٰلِکَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ تک کی تقریر شرک کی تردید میں ہے اور اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے لے کر فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ تک جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں توحید کیلئے ایجابی (Positive) دلائل دیئے گئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ نظامِ کائنات جو تمہارے سامنے ہے، کیا اس میں کہیں ایک اللہ رب العالمین کے سوا کسی اور کی بھی کوئی کاریگری تمہیں نظر آتی ہے؟ کیا یہ نظام ایک سے زیادہ خداؤں کی کارفرمائی میں چل سکتا تھا اور اس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا تھا؟ کیا اس حکیمانہ نظام کے متعلق کوئی صاحبِ عقل وخرد آدمی یہ تصور کرسکتا ہے کہ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے اور اس نے محض تفریح کیلئے چند گڑیاں بنائی ہیں جن سے کچھ مدت کھیل کر بس وہ یونہی ان کو خاک میں ملا دے گا؟ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور پھر بھی نبی کی بات ماننے سے انکار کئے جاتے ہو؟ تم کو نظر نہیں آتا کہ زمین وآسمان کی ایک ایک چیز اس نظریۂ توحید کی شہادت دے رہی ہے جو یہ نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے؟ ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے تم کہتے ہو

Marfat.com

کہ فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَۃٍ "یہ نبی کوئی نشانی لے کر آئے۔" کیا نبی کی دعوتِ توحید کے حق ہونے پر گواہی دینے کیلئے یہ نشانیاں کافی نہیں ہیں؟) (تفہیم القرآن)

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ الْخُلْدَ اَفَائِنْ مِّتَّ فَھُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾

(اور ہم نے آپؐ سے پہلے بھی کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں بخشی تو کیا اگر آپ انتقال کر جائیں تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ۳۴)

رسول کے بشر اور فانی ہونے پر اعتراض کرنے والوں کو جواب

اس سورت کے آغاز میں قرآنِ کریم نے قریش کے ان اعتراضات کا ذکر کیا اور جواب دیا ہے جو وہ اکثر آنحضرت ﷺ پر کیا کرتے تھے۔ آیت ۸ میں اشرافِ قریش نے عام لوگوں کو سمجھاتے ہوئے یہ کہا کہ تم جس شخص کی باتوں سے متاثر ہو رہے ہو وہ تو صرف تمہاری طرح کا ایک بشر ہے، پھر اس کا ایک خاص پیرائے میں جواب ارشاد فرمایا گیا، پھر اثباتِ توحید اور ردِ شرک پر دلائل دیئے گئے، اب پھر معترضین کے اسی رویئے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ البتہ یہاں بات ایک دوسرے پیرائے میں کہی گئی ہے کہ لوگو! تم جس شخص کی باتوں سے متاثر ہو کر اس کے قریب ہو رہے ہو، ذرا یہ تو سوچو کہ آخر اس میں ایسی کون سی خوبی ہے جو تمہیں اپیل کر رہی ہے۔ وہ نہ صرف تمہاری طرح ایک بشر ہے بلکہ عام لوگوں کی طرح اسے بھی ایک دن موت کا شکار ہونا ہے۔ کیا پروردگار ایک ایسے شخص کو انسانوں کی رہنمائی کیلئے مبعوث کر سکتا ہے جسے ہم سے بڑھ کر کوئی خصوصیت حاصل نہ ہو اور پھر وہ کوئی ابدی زندگی لے کر بھی نہ آیا ہو بلکہ چند سالوں کے بعد وہ بھی ہماری طرح فنا ہو جانے والا ہے پھر تم رہنمائی اور تعلیم کو کہاں تلاش کرو گے۔

ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس صورتحال میں اپنے لئے آسودگی کا ایک پہلو محسوس کرتے تھے، وہ یہ سوچ کر خوش ہوتے تھے کہ ہم جس شخص کی تعلیم و تبلیغ سے پریشان ہو رہے ہیں کہ اس کا اثر ہر گھر تک پہنچ چکا ہے۔ کہیں باپ مسلمان ہے اور کہیں بیٹا اور کہیں ماں دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور کہیں بیٹی۔ ہمارا قومی شیرازہ معرضِ خطر میں ہے۔ لیکن فی الجملہ ایک اطمینان کی بات بھی ہے کہ وہ ہمیشہ کی زندگی لے کر نہیں آیا، چند سالوں میں ہماری طرح موت کی نذر ہو جائے گا اور ہم اس مصیبت سے نجات پا جائیں گے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان باتوں کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم اگر اس بات کو قابلِ اعتراض سمجھتے ہو کہ یہ دعوائے نبوت کرنے والا شخص ابدی زندگی لے کر نہیں آیا تو کیا تم ابدی زندگی لے کر آئے ہو؟ اگر تم ہمیشہ رہنے والے ہوتے تو تم یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم ابدی زندگی رکھنے والے لوگ ایک فانی شخص کی رہنمائی کیوں قبول کریں۔ لیکن موجودہ صورت میں تو تمہیں اعتراض کا کوئی حق نہیں کیونکہ تم بھی فانی ہو اور نبوت کا مدعی بھی فانی ہے تو پھر اعتراض کی کیا بات ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ اس سے پہلے بھی انبیائے کرام اور رسولانِ عظام تشریف لا چکے ہیں۔ کیا تم کسی رسول کو آج دنیا میں موجود پاتے ہو جو ہمیشہ کی زندگی لے کر آیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت اور ابدی زندگی کے درمیان کوئی لزوم نہیں ورنہ آج تک آئے ہوئے تمام انبیائے کرام ہمارے سامنے موجود ہوتے۔

اور تمہارا اس بات پر خوشی کا اظہار کرنا کہ چند سالوں کے بعد یہ مدعی نبوت اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو جائے گا تو ہم اس ابتلا سے بچ جائیں

Marfat.com

گے حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ تم بھی ہمیشہ کی زندگی لے کر نہیں آئے، تمہیں زود یا بدیر موت کی آغوش میں جانا ہے تو پھر صرف پیغمبر کی موت پر بغلیں بجانے کا کیا معنی۔

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی ہے کہ آپ ان لوگوں کی باتوں سے اثر قبول نہ کریں، ہر شخص کو ایک دن دنیا سے جانا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ آپ تو اپنی عظیم خدمات اور بیش بہا کارناموں کے ساتھ اپنے اللہ سے ملیں گے اور وہاں عظیم مناصب اور عظیم درجات سے بہرہ ور ہوں گے، لیکن یہ لوگ جس صورتحال سے دوچار ہونے والے ہیں اس کا تصور بھی ہولناک ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

(ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزمارہے ہیں اور آخر کار تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ کے آنا ہے۔ ۳۵)

گزشتہ اعتراض کا جواب ایک دوسرے پہلو سے

اس آیتِ کریمہ میں متذکرہ بالا اعتراض کا جواب ایک دوسرے پہلو سے دیا گیا ہے۔ کفار کو جس طرح آنحضرت ﷺ کے بشر ہونے پر اعتراض تھا، اسی طرح وہ اس بات پر بھی معترض تھے کہ آپ اگر اللہ تعالیٰ کے رسول ہوتے تو کم از کم آپ کوئی رئیس آدمی ہوتے یا آپ کسی قبیلے کے سردار ہوتے۔ ایک تو آپ ہماری طرح بشر اور پھر اس کے ساتھ ساتھ مال و دولت اور سرداری سے تہی دامن، ایسی صورتحال میں یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت دی ہے۔ پروردگار نے نہایت اختصار سے اس کا جواب ارشاد فرمایا کہ جس طرح نبی کیلئے مافوق بشر ہونا ضروری نہیں، اسی طرح اس کا صاحبِ مال و جائیداد ہونا بھی ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول تو دنیا میں اس لئے آتے ہیں کہ وہ انسانوں کو اقدارِ انسانیت سے بہرہ ور کریں اور ان کے دل و دماغ کا اس طرح تزکیہ کریں کہ وہ تمام رزائلِ نفسانی اور مکائد شیطانی کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوسکیں اور ان کی زندگی ہر لحاظ سے انسانوں کیلئے رحمت اور بھلائی کا پیغام ہو۔ اس کام کیلئے امارت و غربت کی بحثیں بیکار ہیں۔ وہ جس طرح ایک امیر آدمی کو شکر کی ترغیب دیتے ہیں اسی طرح غریب آدمی کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ انسانیت کا مقام و مرتبہ بلند کرنے کیلئے لوگوں پر واضح کرتے ہیں کہ اس دنیا میں غربت و امارت، دکھ اور سکھ، رنج و راحت صرف امتحان کیلئے ہے جس سے وہ اپنے بندوں کا امتحان کرتا ہے۔ اس کا انسانیت سے کوئی رشتہ نہیں اور نہ اس سے کسی انسان کے چھوٹے اور بڑے ہونے کا تعلق ہے۔ میں تو صرف اس لئے آیا ہوں تاکہ تمہیں ایسی زندگی گزارنے کے قابل بنادوں جس سے تم کل اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہوسکو۔ اس لئے کہ تم سب کو بالآخر اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

(اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو مذاق بنالیتے ہیں کہتے ہیں کیا یہی ہے وہ جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے (برائی سے) اور حال یہ ہے کہ وہ رحمٰن کے ذکر کے بھی منکر ہیں۔ ۳۶)

Marfat.com

مخالفین کا شرافت سے گرا ہوا رویہ

آنحضرت ﷺ کی تبلیغ و دعوت کے جواب میں مشرکینِ قریش جو رویہ اپنائے ہوئے تھے اس کا ذکر گزشتہ آیات سے جاری ہے۔ اسی کے تسلسل میں یہ بات فرمائی جارہی ہے کہ ان بدبختوں کا حال یہ ہے کہ ان لوگوں نے آپ ؐ کی عزت و وجاہت کو اپنے لئے مباح کر لیا ہے۔ اعلانِ نبوت سے پہلے یہی لوگ ہر طرح سے آپ ؐ کا احترام بجالاتے تھے لیکن اب دین دشمنی نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ عام شرافت سے تہی دامن ہو کر جہاں بھی آپ کو دیکھتے ہیں آپ ؐ کو مذاق بنالیتے ہیں اور گز گز بھر کی لمبی زبانیں آپ ؐ کے بارے میں ہر وہ بات کہتی ہیں جو کسی بھی مخالف کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں۔ آپ ؐ کی ذات اور آپ ؐ کے کردار کے بارے میں ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ ان کا دل کا گواہی دیتا ہے کہ آپ ہر طرح کی اخلاقی یا انسانی کمزوری سے بہت بلند ہیں۔ اس لئے وہ آپ کو مذاق بناتے ہوئے بھی اپنے بغض کے اصلی سبب کو چھپا نہیں پاتے اور ایک دوسرے کو متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہی ہے وہ شخص جو تمہارے بتوں اور خداؤں کی مذمت کرتا ہے، ان کی بے بسی کا مذاق اڑاتا ہے اور تمہیں اس خدا کے سامنے جھکنے کی دعوت دیتا ہے جو قادرِ مطلق اور علیم وخبیر ہے۔

مٹی کی مورتوں سے اللہ سے بڑھ کر محبت بلکہ عصبیت

غور کیجئے! وہ آپ کے اصل جرم کو نمایاں کرتے ہوئے یہ نہیں کہتے کہ یہ ہمارے خداؤں کی مذمت کرتا ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ شخص ہے جو تمہارے خداؤں پر تنقید کرتا ہے۔ اس سے دراصل ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ عوامی نفسیات کو انگیخت کر کے ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ عام انسانوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ جن سے عقیدت کا تعلق قائم کر لیتے ہیں ان کے بارے میں خفیف سے خفیف تنقید کو بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ عقیدت کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی عقل اور اپنے احساس کو ان کے آستانے کی کنیز بنا دیا جائے اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ جس سے ہماری عقیدت کا رشتہ ہے وہ ہر طرح کی تنقید سے ماورا ہے۔ اشرافِ قریش ان کے اسی احساس کو بھڑکا کر آنحضرت ﷺ کی دشمنی میں اضافہ کرنے کی سعی نامشکور کرتے تھے اور ان کی اس روش نے ان کو اس حد تک اندھا کر دیا تھا کہ وہ اپنے نام نہاد خداؤں کے سامنے خدائے رحمٰن کی عظمت کو بھی بھول چکے تھے۔ یعنی ایک طرف تو ان کا حال یہ تھا کہ مٹی اور پتھر کی بنائی ہوئی مورتوں کے بارے میں وہ اس قدر حساس واقع ہوئے تھے کہ معمولی معمولی باتوں پر ان کی غیرت وحمیت بے قابو ہو جاتی تھی، لیکن دوسری طرف وہ خدائے رحمٰن جس کے خوانِ نعمت پر وہ پل رہے تھے اور جس کی رحمتوں کی برکت سے ان کی زندگی کے امکانات روشن تھے اس کا ذکر کرنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ جہاں کہیں ان کے بتوں پر تنقید کی جاتی یا انہیں راہِ راست کی تلقین کی جاتی تو بجائے اس پر غور کرنے کے خدائے رحمٰن کے ذکر سے نہ صرف ابا کرتے بلکہ نفرت کا اظہار کرتے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام سے تو واقف تھے لیکن رحمٰن سے ناواقفیت کا اظہار کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی کی عقیدت میں گرفتار ہو جاتا ہے چاہے اس کا یہ طرزِ عمل کتنا بھی غلط کیوں نہ ہو وہ اس کے مقابلے میں خدائے بزرگ و برتر کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ آپ اپنے گرد و پیش میں جھانک کر دیکھ لیجئے اہلِ مذہب کی لڑائیاں اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کے بارے میں ہوتی ہیں۔ جہاں کسی نے اس محبت کے غلو کی طرف اشارہ کیا اور شریعت کے اعتدال کو اختیار کرنے کی تلقین کی تو ایک لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور اس لڑائی میں بعض ستم ظریف پروردگار کا ذکر نہایت استخفاف کے انداز میں کرتے ہیں اور انہیں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ دوسروں

Marfat.com

سے عقیدت کا یہ معنی تو ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے عقیدت و محبت میں کمی آئے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

(انسان کو جلدی کے خمیر سے پیدا کیا گیا ہے تو میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، سو تم مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو۔ ۳۷) اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۳۸)

کسی چیز کو اس کے مقررہ وقت سے پہلے طلب کرنے کو عجلت کہتے ہیں۔ (روح البیان)

مشکل الفاظ کی تشریح

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ''انسان کو جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے۔'' یہ عربی زبان کا محاورہ ہے۔ جب کسی وصف کے بارے میں یہ کہنا ہو کہ وہ فلاں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے تو اس کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس وصف سے پیدا ہوا ہے۔ مثلاً کوئی شخص بہت غصیل ہے تو کہتے ہیں کہ خلق من غضب اور اگر کوئی شخص بہت کریم ہے تو کہیں گے خلق من کرم مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ وصف اس میں بہت زیادہ ہے۔ اردو زبان میں بھی جب کسی کے بارے میں یہ کہنا ہو کہ وہ طلاقتِ لسانی میں کمال رکھتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ حرفوں کا بنا ہوا ہے۔

عذاب کیلئے جلد بازی کا جواب

جلد بازی انسان کی کمزوریوں میں سے ہے۔ اس لئے عرب اسے ام الندامات کہتے ہیں اور قرآنِ کریم نے بعض جگہ اس پر گرفت بھی فرمائی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اچھے لوگوں کی جلد بازیاں اچھائی کے نتائج دیکھنے میں ہوتی ہیں اور برے لوگ برائی کے ظہور میں جلد باز ہوتے ہیں۔ اس کی شناعت میں متعلق بدل جانے سے کمی بیشی ہوتی ہے لیکن اصولی طور پر عجلت بجائے خود نامحمود سمجھی جاتی ہے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اشرافِ قریش کے اسی مکروہ طرزِ عمل کا ذکر جاری ہے جس کا تذکرہ ہم نے گزشتہ آیات میں پڑھا ہے۔ وہ اپنی جلد بازی کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ کہتے تھے کہ آپ ہمیں جس عذاب یا قیامت سے ڈراتے رہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ عذاب کسی وقت بھی آسکتا ہے تو آخر وہ عذاب آتا کیوں نہیں؟ ہمارے طرزِ عمل میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی، ہم تو اسی طرح دندناتے پھر رہے ہیں تو پھر عذاب میں تاخیر کا سبب کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ کہنا، ان کی کسی فکری کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اسی کمزوری کا اظہار ہے جو ناتربیت یافتہ لوگوں سے ہمیشہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ ہاتھوں پر سرسوں جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول ان کی ہدایت اور اصلاح کیلئے بھیجا ہے۔ اس کی شب و روز کوشش اس کے سوا کچھ نہیں کہ کسی طرح یہ لوگ ان بنیادی حقائق کو سمجھ جائیں اور قبول کرلیں جن پر ان کی دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا انحصار ہے۔ وہ اسی مقصد کیلئے ان کے ہاتھوں دکھ اٹھا رہا ہے، اذیتیں برداشت کر رہا ہے، ان کی بے روک زبانوں کے زخم سہ رہا ہے اور ساتھ ساتھ انہیں تنبیہ بھی کر رہا ہے کہ تم جس راستے پر بڑھتے چلے جا رہے ہو وہ تو تباہی کا راستہ ہے۔ اولاً تو دنیا ہی میں تمہارے اس رویئے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو سکتا ہے اور اگر پروردگار

Marfat.com

نے تمہاری ڈھیل میں اضافہ کئے رکھا تو اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ قیامت کے دن تمہیں سخت جوابدہی سے گزرنا ہوگا۔ تو مشرکینِ مکہ بجائے اس کے کہ اس تاخیر کو اپنے لئے رحمت سمجھیں اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ دیں وہ آنحضرت ﷺ کیلئے اسی تاخیر کو استہزاء کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں اور بار بار عذاب کا مطالبہ اس طرح کر رہے ہیں جس طرح قرض کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اگر تم عذاب کی کچھ نشانیاں ہی دیکھنے پر مصر ہو تو پھر تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا چند سالوں کی بات ہے کہ تمہارے سامنے چند نشانیوں کا ظہور ضرور ہوگا۔ چنانچہ قیامِ مکہ کے دور میں بارشوں کا روک دینا اور قحط سالی مسلط کر دینا یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی اور پھر ہجرت کے ایک سال بعد ہی جنگِ بدر میں قریش کی پہلی صف کا تہِ تیغ ہو جانا اور دوسری صف کا گرفتار ہو جانا اور اس طرح سے قریش کی قیادت کا خاتمہ بجائے خود اللہ تعالیٰ کی نشانیاں تھیں جسے ہر چشمِ بینا دیکھ سکتی تھی لیکن مشرکین کا رویہ وہی رہا جو اس سے پہلے تھا۔ وہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مطالبہ کرتے رہے جب تک فتح مکہ سے ان کی کمر توڑ نہیں دی گئی۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٣٩﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٤٠﴾

(کاش یہ کفر کرنے والے جان لیتے اس وقت کو جب وہ روک نہ سکیں گے اپنے چہروں سے عذابِ نار کو، نہ اپنی پشتوں سے اور نہ ان کی کسی طرف سے مدد کی جائے گی۔ ۳۹) بلکہ وہ اچانک ان پر آ دھمکے گی، سو انہیں بدحواس کر دے گی پھر وہ نہ اسے رد کر سکیں گے اور نہ ہی انہیں مزید مہلت دی جائے گی۔ ۴۰)

مخالفین کے رویئے پر اظہارِ حسرت

نہایت حسرت کے انداز میں فرمایا جا رہا ہے کہ ایک طرف انسان کی بےخبری ہے جو گمراہی تک جا پہنچی ہے اور دوسری طرف اس کی جسارت ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں سے نبرد آزما ہے۔ انسان کچھ نہیں جانتا کہ اس کا پروردگار اس سے کیا چاہتا ہے۔ وہ اگرچہ اپنے معاملات میں عقل و شعور سے بہرہ ور ہے لیکن زندگی کے اجتماعی معاملات، اخلاقی مسلمات، انسانی فطرت کے مقتضیات، عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کے اسرار اور اللہ تعالیٰ کی شریعت کی تفصیلات کو جاننے کیلئے اس کی عقل کافی نہیں۔ اس کیلئے وحیِ الٰہی کی ضرورت ہے۔ جس کے حامل بن کر اللہ تعالیٰ کے رسول تشریف لاتے ہیں۔ اب انسان کیلئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت کو قبول کرے، ان پر نازل کی جانے والی کتابوں کی رہنمائی کو زندگی کا رہنما بنائے۔ اور اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کے رسول کے اتباع کو اپنے اوپر لازم ٹھہرا لے۔ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اس رہنمائی کو قبول کرنے کی بجائے اپنی جہالت پر اصرار کرتا ہے اور جب پیغمبر اس کے طرزِ عمل کی پاداش میں پیدا ہونے والے خطرات کو اس کے سامنے ذکر کرتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے انکار کی صورت میں جو کچھ اس پر بیتنے والی ہے جب اسے اس سے آگاہ کیا جاتا ہے تو بجائے قبول کرنے کے اس سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس پوری صورتحال پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے بہ اندازِ حسرت فرمایا جا رہا ہے کہ کاش انکار کرنے والوں کو یہ معلوم ہوتا کہ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو انسان اس کے سامنے کس قدر بےبس ہوتا ہے آج تو یہ منہ پھاڑ پھاڑ کر نہ صرف اس کا مطالبہ کر رہے ہیں بلکہ پیغمبر کا مذاق اڑا رہے ہیں، لیکن جب وہ عذاب آئے گا اور

Marfat.com

اس سے جو آگ برسے گی اسے یہ اپنے جسم کے کسی حصے سے روک نہیں سکیں گے۔ وہ ان کے چہروں کو جلائے گی، ان کے پہلوؤں کو داغے گی۔ اور اس وقت یہ مدد کیلئے چیخیں گے اور ان لوگوں کا نام لے لے کر دہائی دیں گے جنہیں انہوں نے بزعم خود معبود بنا رکھا ہے، لیکن کوئی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔

انہیں اس بات کا بھی اندازہ نہیں کہ جب وہ عذاب آتا ہے تو وہ بتا کے نہیں آتا۔ اس سے پہلے ایسے آثار ظاہر نہیں ہوتے کہ آدمی اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر سکے۔ وہ اچانک آتا ہے اور انسانوں کو بدحواس کر دیتا ہے۔ تمام وسائل دھرے رہ جاتے ہیں، مدافعت کی ہر قوت دم توڑ جاتی ہے، لوگ رحم کیلئے فریاد کرتے ہیں لیکن مزید مہلت نہیں دی جاتی۔ کاش یہ لوگ آج اس کی شدت اور ہولناکی کا کچھ اندازہ کر لیں تو شاید ان کیلئے بہتر ہو۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾

(اور آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ۴۱)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مذاق اڑانے والوں کو تنبیہ بھی کی گئی ہے۔ تسلی کا مضمون یہ ہے کہ اے پیغمبر! آپ ان بدبختوں کی زبان درازیوں سے بدمزہ نہ ہوں۔ تبلیغ و دعوت کے راستے کی کچھ سنتیں ہیں جن میں ایک سنت یہ ہے کہ جس نے بھی انسانوں کی ہدایت اور اللہ تعالیٰ کا دین پہنچانے کیلئے تبلیغ و دعوت اور اصلاح کا کام کیا ہے اس کی قوم نے کبھی آرام سے اس دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ مدتوں تک اس نے اس دعوت کے راستے میں نہ صرف روڑے اٹکائے بلکہ داعی الی الحق کیلئے جینا دوبھر کر دیا۔ ہر طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں، زبان درازیوں سے دل زخمی کیے گئے اور دنیا کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو اس راستے پر چلنے والوں نے برداشت نہیں کیا۔ پہلے آنے والے رسول بھی آپ ہی کی طرح خونِ جگر پی پی کر قوم کی ہدایت کیلئے کوشاں رہے۔ انہوں نے بھی آپ ہی کی طرح قوم کی ایذا رسانیوں کے جواب میں ہمیشہ ہمدردی و خیر خواہی کا ثبوت دیا۔ ان کی گالیاں سن کر دعائیں دیتے رہے، لیکن ان کی قوموں نے ان کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جواب ہمیشہ بدخواہی اور دشمنی سے دیا۔ آپؐ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ تاریخ کا تسلسل ہے۔ یہی کچھ ہوتا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ یہ صورتحال ہمیشہ نہیں رہے گی ہر مشکل کے بعد آسانی ہوتی ہے۔ ہر رات کے بعد سحر طلوع ہوتی ہے۔ آپ کی مساعی جمیلہ کی سحر بھی طلوع ہونے والی ہے اور اس میں کچھ زیادہ دیر نہیں۔

مشرکین سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جس طرح یہ ایک تاریخی روایت ہے کہ ہر پیغمبر کی قوم نے اسے ستایا اور اس کی مخالفت کی انتہا کر دی۔ اسی طرح یہ بھی تاریخی روایت ہے کہ جب وہ قوم اپنی مخالفت اور اپنے انکار میں بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ وہ پیغمبر کی جان لینے کے منصوبے باندھنے

Marfat.com

لگی تو تب اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور وہ لوگ جو عذاب کا تمسخر اڑایا کرتے تھے ان میں سے ایک ایک شخص اس عذاب کی نذر ہوا اور اپنے انجام کو پہنچا۔ مکے کے لوگو! تم بھی اسی تاریخ کا حصہ ہو۔ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اللہ تعالیٰ کی یہ سنت حرکت میں آئے گی اور تم میں سے ایک ایک تمسخر کرنے والا اپنے انجام کو پہنچے گا۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ
عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ
دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا
يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ
الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ
اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْىِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ
الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ
عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ
الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ
اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا
حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً
وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ
مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ
اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۳ ۔ (اے پیغمبران سے پوچھئے رات اور دن خدائے رحمٰن کی پکڑ سے کون تمہاری حفاظت کر رہا ہے بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے ذکر سے روگردانی کر رہے ہیں۔ ۴۲) کیا ان کے ہمارے سوا اور خدا بھی ہیں، جو انہیں بچا لیں گے، وہ جھوٹے معبود تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ انہیں ہماری تائید میسر ہو گی۔ ۴۳) بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا حتیٰ کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل عرصہ گزر گیا، کیا وہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں تو کیا یہ لوگ غالب آ سکتے ہیں۔ ۴۴) اے پیغمبر کہہ دیجئے! میں تو تمہیں بس وحی کے ذریعے سے انذار کر رہا ہوں اور بہرے جب وہ خطرے سے آگاہ کئے جاتے ہیں تو پکار کو نہیں سنتے۔ ۴۵) اگر آپ کے رب کے عذاب کا کوئی جھونکا انہیں چھو گیا تو یہ چیخ اٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی، بیشک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۴۶) اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے تو کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی کا رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی عمل ہو گا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے اور ہم حساب لینے کیلئے کافی ہیں۔ ۴۷) ہم عطا کر چکے ہیں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیزگاروں کیلئے۔ ۴۸) جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور وہ قیامت سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ ۴۹) اور یہ بھی ایک بابرکت یاددہانی ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے تو کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو۔ ۵۰)

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾

(اے پیغمبران سے پوچھئے رات اور دن خدائے رحمٰن کی پکڑ سے کون تمہاری حفاظت کر رہا ہے بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے ذکر سے روگردانی کر رہے ہیں۔ ۴۲)

عذاب کا مطالبہ کرنے والوں سے ایک سوال

گزشتہ مضمون کے تسلسل میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دینے کا فیصلہ کر لے تو انہیں اس کے عذاب سے رات اور دن میں کون بچانے والا ہے۔ کیا انہوں نے اپنے بچاؤ کا کوئی سامان کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ بے خوف اور نڈر ہو کر بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ہمہ گیری کا عالم تو یہ ہے کہ اگر وہ عذاب بھیجنا چاہے تو رات اور دن میں کسی وقت بھی عذاب بھیج سکتا ہے۔ عناصرِ قدرت ہر وقت اس کے سامنے تعمیلِ حکم کیلئے دست بستہ تیار رہتے ہیں۔ وہ دن کی ہمہ ہمی میں بھی پکڑ سکتا ہے اور رات کو نیند کی حالت میں بھی تباہ کر سکتا ہے۔ جس کی قدرت کا یہ عالم ہے تم نے آخر اس سے بچاؤ کی کیا تدبیر کر رکھی ہے جو اس جرأت اور بے باکی سے تم عذاب کا مطالبہ کرتے ہو۔

آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچاؤ کی نہ کوئی تدبیر کر سکے ہو اور نہ کر سکتے ہو بلکہ تمہارا معاملہ اس سے بھی زیادہ دگرگوں اور قابلِ افسوس ہے کہ جس ربِ کریم کے ہاتھوں میں تمہاری زندگی اور اس کے امکانات ہیں اور جس

Marfat.com

کے رزق پر تم پل رہے ہو اور تمہاری زندگی کا ہر وسیلہ جس کی عنایت سے تمہیں میسر ہے تم اس کی یاد دہانی اور اس کی ہر طرح کی تنبیہ سے منہ پھیرے ہوئے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا رسول تمہیں بار بار اس کی طرف سے تنبیہ کر رہا ہے لیکن تمہیں بالکل پرواہ نہیں اور کائنات کا گوشہ گوشہ اور خود تمہاری اندرونی فطرت تمہیں اشارے کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے منہ نہ پھیرو۔ اس کی تنبیہات سے تغافل مت برتو۔ لیکن تمہارے اعراض اور لاپرواہی میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ایسی صورتحال میں اظہارِ افسوس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

گزشتہ سطور میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ من الرحمٰن سے من عذاب الرحمٰن مراد لیا جائے، لیکن اگر عذاب کو محذوف نہ مانا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تو بار بار اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو لیکن تم نے یہ کبھی سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ عذاب آئے یا نہ آئے تم تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہو۔ جس زمین پر تم چلتے ہو اگر اس زمین کو اللہ تعالیٰ حکم دے دے کہ تمہارا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دے بلکہ تم اس میں دھنستے چلے جاؤ تو تم کیا کر سکتے ہو۔ اگر وہ بارشوں کا برسنا بند کر دے تو تم قحط سالی میں مبتلا ہو کر بھوک کی نذر ہو جاؤ۔ اگر وہ زمین کی حرکت کو بدل دے تو گرمیوں کا طویل دن تمہیں جھلس ڈالے اور سردیوں کی طویل رات تمہارے چولہے ٹھنڈے کردے اور پانی تک کو جما کر تمہارے لئے زندگی ناممکن کر دے۔ فضائے آسمانی سے ہر رات برسنے والے کروڑوں شہاب اگر براہِ راست تمہارے سروں پر برسنے لگیں اور زمین سے ایک فاصلے پر تنا ہوا پردہ ہٹا لیا جائے جو انہیں روکتا ہے تو تمہاری زندگی کے باقی رہنے کے کیا امکانات ہیں۔ الغرض ہر لحہ انسان اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہے اور دنیا کی کوئی طاقت انسان کو اس کی گرفت سے آزاد نہیں کر سکتی۔ کبھی وہ اس کی رحمت کی گرفت میں ہوتا ہے اور کبھی آفت کی گرفت میں۔ کبھی راحتیں اس پر نثار ہوتی ہیں اور کبھی مشکلات اسے گھیر لیتی ہیں۔ وہ کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جس انسان کی احتیاج اور بے بسی کا یہ عالم ہے کس قدر دکھ کی بات ہے کہ وہ اس ذات سے منہ پھیرے ہوئے ہے جو ہر حال میں اس کی حفاظت کرتی اور اس پر احسان کرتی ہے۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾

(کیا ان کے ہمارے سوا اور خدا بھی ہیں، جو انہیں بچالیں گے، وہ جھوٹے معبود تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ انہیں ہماری تائید میسر ہو گی۔ ۴۳)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والا یقیناً انہیں کوئی نہیں لیکن ایک غلط فہمی ہے جو ہمیشہ انہیں سہارا دیتی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس لات و منات اور عزیٰ و ہبل کو ہم نے آج تک پکارا اور ان کی قربانیاں دی ہیں اور ہمیشہ ان کے نام کے چڑھاوے چڑھائے ہیں ان کے خیال میں یہ محض پتھر کی تراشیدہ مورتیاں نہیں بلکہ ان کے پیچھے زندہ شخصیتیں ہیں جن سے عقیدت کے باعث لوگوں نے ان کے مجسمے تراش لئے۔ اسی طرح برسوں ہم نے فرشتوں کو اپنا معبود بنا کر پوجا ہے اور ان سے استمداد کی ہے اور بعض ایسے قبیلے بھی تھے جو بعض جنات کو اپنا معبود سمجھتے تھے۔ زندگی بھر ان کی پوجا پاٹ صرف اسی لئے تو کی ہے کہ جس طرح انہوں نے ہمیشہ ہماری دنیا میں مدد کی اسی طرح وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی بچائیں گے۔ یہ وہ غلط فہمی ہے جو ہمیشہ اہلِ عرب کو اپنے کفر و شرک کے رویئے میں سہارا دیتی تھی۔ پروردگار ان کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ نادانو! جن پر تم نے تکیہ کر رکھا ہے یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اپنی کوئی مدد کر سکیں، تمہاری مدد کیا کریں گے۔ ہو

Marfat.com

سکتا ہے کہ وہ اس سوال کیلئے کٹہرے میں کھڑے کئے جائیں کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تمہارے مرنے کے بعد تمہاری پوجا کریں۔
البتہ! وہ ایک صورت میں کسی حد تک تمہاری مدد کر سکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ یہ بھی نہیں کر پائیں گے۔ وہ صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجازت دے دے کہ تم فلاں فلاں کی شفاعت کر سکتے ہو، ان کیلئے میری تائید ونصرت تمہیں حاصل ہے لیکن یہ اعزاز اللہ تعالیٰ صرف اپنے مقرب بندوں کو دے گا جنہوں نے دنیا کی اصلاح کیلئے کوششیں کیں۔ ان نام نہاد معبودوں کو نہیں دے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں کہ کوئی ذات کسی کے کام آسکے۔ علامہ پانی پتی" آیت کے اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں اس سے ہماری گزارش کی تائید ہوتی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ ولا یصحبھم منا نصر کما یصحب لمن یشفع عصاۃ المومنین من النبیین والملائکۃ والصالحین "یعنی انبیاء، ملائکہ اور اولیاء کرام جو گنا ہگار مومنوں کی شفاعت کریں گے انہیں تو تائیدِ الٰہی اور نصرتِ ربانی حاصل ہوگی، لیکن کفار کے جھوٹے خدا اس سے بھی محروم ہوں گے۔" (مظہری)

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۗ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

(بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا حتیٰ کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل عرصہ گزر گیا، کیا وہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں تو کیا یہ لوگ غالب آسکتے ہیں۔ ۴۴)

مخالفین کے انکار کا اصل سبب

نبی کریم ﷺ کی دلآویز شخصیت اور آپ ﷺ کی حکمت و دانش میں ڈوبی ہوئی فصاحت و بلاغت اور قرآنِ کریم کے محکم دلائل کے باوجود قریش اور دیگر اہلِ مکہ کا آپ ﷺ کی دعوت پر کان نہ دھرنا بلکہ مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دینا ایک ایسا سوال ہے کہ بعض دفعہ اس میں آدمی الجھ کر رہ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے نہایت حکمت اور انسانی فطرت کے حوالے سے اس کا جواب ارشاد فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ جب اس کے حالات دگرگوں ہوتے ہیں تو وہ مایوسی میں ڈوبنے لگتا ہے اور جب اسے مال و دولت فراوانی سے ملتا ہے اور زندگی کی راحتیں اسے میسر آتی ہیں تو وہ عموماً خود فراموشی اور خدا فراموشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب اس کی ضرورتیں اسے پریشان نہیں کرتیں بلکہ ہر چیز اسے فراوانی سے میسر آتی ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرا کوئی خدا نہیں اور جب اس کے شب و روز عیش و عشرت کی مستی میں گزرتے ہیں تو وہ اس احساس سے محروم ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے۔ اسی حالت پر جب اس پر ایک طویل مدت گزر جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ میرے آباؤ اجداد بھی دولت کی ریل پیل رکھتے تھے اور میں بھی سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا ہوں اور میرے اخلاف بھی اسی طرح دادِ عیش دیتے رہیں گے تو زندگی کی حقیقت، زندگی کے مقاصد، انسانی حقوق اور اقدارِ انسانیت اس کیلئے محض کتابی باتیں ہو کے رہ جاتی ہیں۔ وہ اس قدر برخود غلط ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی خواہشات کے سوا اور کوئی حقیقت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور ذات پر توجہ دینے کی زحمت نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اسے کوئی نصیحت کی بات سمجھانا چاہتا ہے تو وہ بجائے سمجھنے کے اس کا منہ نوچنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ جتنی بھی گمراہ

Marfat.com

قومیں گزری ہیں اور آج بھی جتنے گمراہ خاندان یا افراد موجود ہیں ان کی گمراہی کا یہی سب سے بڑا سبب ہے۔ ان کی دولت اور عیش وعشرت نے ان سے ان کی انسانیت چھین لی ہے۔ وہ انسانی سطح پر اتر کر کبھی سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ اس حقیقت کو مجسم شکل میں اگر آج بھی دیکھنا ہو تو اپنے جاگیرداروں اور طبقۂ امراء کے بیشتر لوگوں کو دیکھ لیا جائے اور یا ان لوگوں کو دیکھ لیا جائے جو ایک طویل عرصے سے اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ ان میں بعض خاندان تو ایسے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ حکمران پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس ملک کا مقدر ہماری حکمرانی سے وابستہ ہے۔ اور بعض طبقات ایسے ہیں جن میں یہ پندار پیدا ہو چکا ہے۔ یہی گمراہی قریش اور اشرافِ قریش کو لگی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر صحیح اور سچی بات کے قبول کرنے سے ان کے دل سخت ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کی امارت اور حکومت کی طوالت نے ان کو ہر صحیح بات سے محروم کر دیا تھا۔

ایک وارننگ

آیت کے دوسرے حصے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے سے یقیناً یہ لوگ ناکارہ ثابت ہوئے ہیں۔ انہیں اگر کوئی چیز راہِ راست پر لا سکتی ہے تو صرف یہ بات کہ اپنے مستقبل کے بارے میں خطرات محسوس کریں اور یہ سمجھ لیں کہ زمین ان کے پاؤں کے نیچے سے نکلنے والی ہے۔ چنانچہ اس طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ نبی کریم ﷺ کی جس دعوت کو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے آگے بڑھنے سے روک دیا ہے اور آپ کی ساری سرگرمیاں صرف آپ کی زندگی تک ہیں اس کے بعد یہ خود بخود دم توڑ جائیں گی۔ اسی دعوت کا اثر یہ ہے کہ یہ دعوت مکہ کے گردوپیش میں دور دور تک اپنے معاونین پیدا کر چکی ہے۔ مکے والے یقیناً اس کی طرف سے دل سخت کر چکے ہیں لیکن مکہ کے اردگرد دور دور تک کوئی قبیلہ ایسا نہیں جس میں اس دعوت کے اثرات نہ پہنچ چکے ہوں۔ حتیٰ کہ مدینہ منورہ آہستہ آہستہ اس دعوت کے زیر اثر آتا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ دین اور اس کی یہ دعوت آہستہ آہستہ سرزمینِ مکہ کی طرف اس کے گردوپیش کو فتح کرتی ہوئی بڑھتی جا رہی ہے۔ قوموں کی تاریخ میں چند سالوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ تم دیکھو گے کہ وہ وقت دور نہیں کہ تم تو اپنے تئیں آنحضرت ﷺ کو ہجرت پر مجبور کر دو گے لیکن ایک ہی سال بعد میدانِ بدر میں یہی کمزور اور نہتے لوگ تمہارا اَبھرکس نکال دیں گے۔ اور پھر چند ہی سال بعد وہ مکہ جس کی طاقت پر تمہیں ناز ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا اور تم میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کرنے سے منکر ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے سامنے ہاتھ باندھے زندگی کی امان کی درخواست کر رہے ہوں گے اور پھر اس سے ایک سال بعد اعلان کر دیا جائے گا کہ سرزمینِ عرب اسلام کا گہوارہ بن چکی ہے اب یہاں اس کے ماننے والے رہیں گے، انکار کرنے والے عرب کی سرزمین کو چھوڑ دیں اور یا قتل ہونے کیلئے تیار ہو جائیں۔ اس طرح سے حق ہر طرف سے زمین کو سمیٹتا ہوا فاتحانہ شان سے اللہ تعالیٰ کے گھر کی طرف بڑھے گا اور ہر قوت اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے گی۔

اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ "تو کیا یہ لوگ غالب آنے والے ہیں"۔ ہر چند کہ مکہ معظمہ میں اس آیتِ کریمہ کے نزول تک اسلام مظلوم تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلامی دعوت کے آگے بڑھنے کے امکانات سمٹتے جا رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جسے چشمِ بینا عطا کی تھی وہ دیکھ سکتا تھا کہ کس طرح اسلام کا دائرۂ اثر پھیل رہا ہے اور کس طرح ہر قبیلے میں اس کے اثرات وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ بنا بریں یہ تصور کرنا کس قدر حماقت تھی کہ اب اسلام کے بروئے کار آنے کے امکانات ختم ہو گئے ہیں اور حق و باطل کی اس کشمکش میں قریش پورے طور پر غالب آ کر رہیں گے کیونکہ اسلام کی دعوت صرف اہلِ مکہ کیلئے نہیں تھی بلکہ اس کی مخاطب بالعموم پوری دنیا تھی اور بالخصوص عرب تھے۔ مکے والے یقیناً بعض

Marfat.com

تحفظات کا شکار تھے لیکن گردو پیش میں اسلام کے اثرات جس طرح بڑھتے جارہے تھے اس کے پیش نظر قریش کے غلبے کے امکانات روز بروز ختم ہوتے جارہے تھے اور اسلامی غلبے کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے! میں تو تمہیں بس وحی کے ذریعے سے انذار کررہا ہوں اور بہرے جب وہ خطرے سے آگاہ کئے جاتے ہیں تو پکار کو نہیں سنتے۔ ۴۵)

ایک مزید تنبیہ

سابقہ آیتِ کریمہ میں قریش کو جو وارننگ دی گئی ہے اور ایک نشانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ اے پیغمبر ان پر یہ بات واضح کردیجئے کہ اسلام کے عمومی غلبے اور تمہاری شکست اور نامرادی کی جو پیشگوئی کی گئی ہے اس کو محض مفروضہ نہ سمجھو بلکہ یہ بات مجھ پر اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعے نازل کی گئی ہے اور تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی وحی ہر خطا سے پاک ہیں۔ اس لئے اس پیشگوئی کے بروئے کار آنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں لیکن تم جس طرح اپنی عادت کے مطابق اسے مذاق میں اڑا رہے ہو یہ بھی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں آنے والی نہ ہو کیونکہ مسلسل حق سے انکار کے باعث تمہاری عقلیں ماؤف ہوگئی ہیں۔ تمہیں بالکل سامنے کی بات بھی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے اور جب کسی کی عقل جواب دے جائے یا وہ عقل سے بے بہرہ ہوجائے تو پھر اس کی حیثیت کانوں سے بہرے جیسے شخص کی ہوتی ہے کہ اسے خطرے کے وقت ہزار پکارا جائے وہ کبھی اس پکار کو نہیں سنتا اور بالآخر خطرے کا شکار ہوکر رہتا ہے۔ میں بھی اپنی پیغمبرانہ فطرت کے مطابق تمہیں شب و روز خبردار کررہا ہوں لیکن تم بہروں کی طرح میری بات سن کے نہیں دیتے تو میں اس پر سوائے تأسف کے اظہار کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

(اگر آپ کے رب کے عذاب کا کوئی جھونکا انہیں چھو گیا تو یہ چیخ اٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی، بیشک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۴۶)

آج یہ ہر وارننگ کے جواب میں جس طرح مذاق اڑاتے اور منہ چڑاتے ہیں کاش انہیں عذاب کی حقیقت اور شدت کا کچھ بھی اندازہ ہوتا تو کبھی یہ ایسا رویہ اختیار نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب تو جڑ اکھاڑ دینے والی چیز ہے، اس کی شدت کا عالم تو یہ ہے کہ اگر اس کا معمولی جھونکا بھی انہیں چھو جائے تو ان کی ساری شیخی دھری رہ جائے۔ نَفْحَة میں تنوین تنکیر کیلئے ہے، یعنی عذاب کی لپیٹ میں آجانا تو یقیناً تصور کو بھی جلا دینے والا ہے۔ اگر اس کا معمولی جھونکا اور اس کی معمولی لپٹ بھی انہیں لگ جائے تو یہ چیختے پھریں اور جو باتیں آج انہیں سمجھ نہیں آرہیں ان کی زبانوں پر ان کے اعتراف کے سوا اور کچھ نہ ہو، یہ واویلا کرتے پھریں کہ ہائے ہماری بدبختی، آج جس مصیبت سے ہم دوچار ہورہے ہیں یہ بے سبب نہیں، ہم ہی اپنے اوپر ظلم توڑنے والے تھے۔ یعنی ہم بار بار اس کا مطالبہ کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے اور آج جبکہ اس کا ایک جھونکا ہم تک پہنچا ہے تو ہم ایک ایسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں جس کے ازالے کی کوئی صورت نہیں۔

Marfat.com

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

(اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے تو کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی کا رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے اور ہم حساب لینے کیلئے کافی ہیں۔ ۴۷)

مشکل الفاظ کی تشریح

اَلْمَوَازِیْنَ ...... میزان کی جمع ہے۔ القسط اس کی صفت ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ موصوف اور صفت میں واحد جمع میں مطابقت ہونی چاہیے، لیکن یہاں ایسا نہیں۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ القسط مصدر ہے۔ اور جب مصدر صفت واقع ہو تو وہ واحد اور جمع سب کی صفت واقع ہو سکتا ہے۔

مَوَازِیْنَ کے جمع لانے کی وجہ

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اَلْمَوَازِیْنَ کو جمع اس لئے لایا گیا ہے کہ قیامت میں وزنِ اعمال کیلئے بہت سی میزانیں استعمال کی جائیں گی۔ خواہ ہر شخص کیلئے الگ الگ میزان ہو یا خاص خاص اعمال کیلئے الگ الگ میزانیں ہوں مگر جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ میزان ایک ہی ہوگی، اس کو بصیغۂ جمع اس لئے لایا گیا ہے کہ وہ بہت سی میزانوں کا کام دے گی کیونکہ تمام مخلوقات کے اعمال کو یہی تولے گی، پھر اس میزان کی صفت بتائی گئی ہے کہ وہ صرف تولنے ہی کیلئے استعمال نہیں ہوگی بلکہ وہ صحیح تولنے اور عدل و انصاف میں ذرا کمی بیشی نہیں کرے گی۔

مستدرک حاکم میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز جو میزان وزنِ اعمال کیلئے رکھی جائے گی اتنی بڑی اور وسیع ہوگی کہ اس میں آسمان و زمین کو تولنا چاہیں تو وہ بھی اس میں سما جائیں۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی جناب میں گزارش کی کہ قیامت کے دن آپؐ میری شفاعت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا، میں ان شاء اللہ شفاعت کروں گا۔ میں نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ میں آپؐ کو کہاں تلاش کروں؟ فرمایا پہلے پل صراط پر مجھے ڈھونڈنا اور اگر وہاں ملاقات نہ ہوئی تو میزان کے پاس مجھے تلاش کرنا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر وہاں بھی شرفِ ملاقات نصیب نہ ہو۔ فرمایا پھر حوض کے پاس۔ میں ان تین مقامات میں سے کسی ایک پر ضرور ہوں گا۔ (ترمذی، بیہقی)

حاکم اور بیہقی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا قیامت کے روز بھی آپؐ اپنے اہل و عیال کو یاد رکھیں گے۔ فرمایا، قیامت میں تین مقام تو ایسے ہوں گے کہ ان میں کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ ایک وہ وقت جب میزانِ عدل کے سامنے وزنِ اعمال کیلئے حاضری ہوگی جب تک نتیجہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس کا پلہ نیکیوں کا بھاری ہوا یا ہلکا رہا، کسی کو کسی کی یاد نہ آئے گی اور دوسرا مقام وہ ہے جب نامہ ہائے اعمال دیئے جائیں گے، جب تک یہ متعین نہ ہو جائے کہ نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں آیا یا بائیں ہاتھ میں یا پشت کی طرف آیا۔ اور تیسرا مقام پل صراط سے گزرنے کا وقت ہے جب تک پار نہ ہو جائیں، کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ (مظہری)

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا یہاں كَانَ کا اسم محذوف ہے، یعنی یومِ حساب اور میزانِ اعمال کے وقت ہر

Marfat.com

انسان کے سب چھوٹے بڑے اور اچھے برے اعمال حاضر کئے جائیں گے۔ کسی شخص سے زیادتی نہیں ہوگی۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میرے بعض اعمال وزن نہیں کئے جاسکے ورنہ میں یقیناً نجات پاجاتا یا بہتر حالت میں ہوتا۔ یہی بات سورۂ لقمان میں ان الفاظ میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔

یٰبُنَیَّ اِنَّھَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَۃٍ اَوْفِی السَّمٰوٰتِ اَوْفِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِھَا اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ. (۱۶)

اے میرے بیٹے کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمان میں ہو یا زمین میں خدا اس کو موجود کردے گا، بیشک خدا بڑا ہی باریک بین اور بڑی ہی خبر رکھنے والا ہے۔

وزنِ اعمال کی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فرشتوں کے لکھے ہوئے اعمال نامے تولے جائیں جیسا کہ حدیث بطاقہ سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اعمال کو مجسم کرلیا جائے اور جواہر مستقلہ کی شکل دے دی جائے اور ان کا وزن کیا جائے۔ عام طور سے روایات اسی پر شاہد ہیں اور جمہور علماء نے اسی صورت کو اختیار کیا ہے۔

ترمذی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ! میرے دو غلام ہیں جو مجھے جھوٹا کہتے ہیں اور معاملات میں خیانت کرتے ہیں، اور میرے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان کے مقابلے میں، میں انہیں زبان سے بھی برا بھلا کہتا ہوں اور ہاتھ سے مارتا بھی ہوں تو میرا اور ان غلاموں کا انصاف کس طرح ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی نافرمانی اور خیانت اور سرکشی کو تولا جائے گا، پھر تمہارے سب وشتم اور مار پیٹ کو تولا جائے گا۔ اگر تمہاری سزا اور ان کا جرم برابر ہوا تو معاملہ برابر ہوجائے گا اور اگر تمہاری سزا ان کے جرم سے کم رہی تو وہ تمہارا احسان شمار ہوگا۔ اور اگر ان کے جرم سے بڑھ گئی تو جتنی تم نے زیادتی کی ہے اس کا تم سے انتقام لیا جائے گا۔ یہ شخص وہاں سے اٹھ کر الگ بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی۔ پھر آپ نے متذکرہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ اس نے عرض کیا کہ اب تو میرے لئے اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ میں ان کو آزاد کرکے اس حساب کے غم سے بے فکر ہوجاؤں۔ (قرطبی)

وَکَفٰی بِنَا حٰسِبِیْنَ ''اور ہم حساب کیلئے کافی ہیں۔'' مشرکین کا خیال تھا کہ اولاً تو قیامت کا وقوع عقل میں آنے والی بات نہیں۔ چلئے اگر اسے مان بھی لیا جائے تو یہ بات تو کسی طرح معقول نہیں کہ اربوں کھربوں مخلوقات کے بے شمار اعمال کا حساب کیا جائے گا۔ سب کے اعمال کہاں سے میسر آئیں گے۔ پھر ان کے نیک وبد کا حساب کون کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی کام کیلئے بھی ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں اور کوئی کام ایسا نہیں جو ہماری قدرت کی وسعت سے باہر ہو۔ تمہیں اطمینان رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر چیز اور ہر کام پر محیط ہے، اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس لئے تمام مخلوقات کے اعمال میں سے کوئی عمل مخفی نہیں رہے گا اور اعمال اپنی وسعت کے باوجود حساب کتاب سے باہر نہیں رہیں گے اور اس کیلئے تمہارے مزعومہ شرکاء کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، اللہ تعالیٰ تنہا اس کام کیلئے کافی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً وَّذِکْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَھُمْ مِّنَ السَّاعَۃِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

(ہم عطا کرچکے ہیں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیزگاروں کیلئے۔ ۴۸) جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور وہ قیامت سے لرزاں وترساں رہتے ہیں۔ ۴۹)

Marfat.com

گزشتہ انبیائے کرام سے استشہاد

یہاں سے متعدد انبیائے کرام کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے مشرکینِ مکہ نے جتنے اعتراضات کئے ان سب کا جواب دیا گیا اور مختلف اوقات میں جو انہوں نے نشانیاں مانگیں اس کے نتائج سے باخبر کیا گیا اور نبوت کے بارے میں جو انہوں نے غلط تصورات اپنا رکھے تھے ان کا ازالہ کیا گیا۔ اب یہاں سے چند انبیائے کرام کی زندگی کے حالات اور ان کی قوموں کی تاریخ بیان کی جارہی ہے تاکہ اعتراض کرنے والوں کو یہ اندازہ ہو سکے کہ نبی کریم ﷺ کی شخصیت سابقہ انبیائے کرام کی شخصیتوں سے مختلف نہیں۔ آپؐ کی دعوت بعینہ وہی ہے جو اس سے پہلے انبیائے کرام پیش کرتے رہے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ان کی دعوت اور ان کی شریعت ان کے اپنے حالات کے مطابق تھی اور نبی کریم ﷺ کی دعوت اس دین اور شریعت کیلئے ہے جس کا تعلق پوری نوعِ انسانی اور قیامت تک کے حالات سے ہے۔ یہ پہلی شریعتوں کی جامع بھی ہے اور آنے والے حالات کیلئے کامل بھی۔ لیکن پہلی دعوتوں اور شریعتوں کے حوالے سے اس میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے اور مزید یہ کہ قریش نے جس طرح نبی کریم ﷺ کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی ہے اور ان کا گمان یہ ہے کہ وہ مخالفت کے زور سے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو ناکام کر دیں گے۔ سابقہ انبیائے کرام کے حالات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قریش کا یہ رویہ آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی دعوت کے ساتھ کوئی نیا نہیں۔ ہر دور میں پیغمبروں کے ساتھ ان کی امتوں نے ایسا ہی معاملہ کیا ہے۔ لیکن ان کی تاریخ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک مدت تک ڈھیل دی گئی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کر لیں۔ لیکن جب انہوں نے اس ڈھیل سے فائدہ نہ اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے بھیجے جانے والے پیغمبر کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور انکار کرنے والی قوم کو عذاب کی نذر کر دیا۔ آج پھر وہی تاریخ دہرائی جارہی ہے تو سابقہ انبیائے کرام کی سرگزشتوں سے قریش کو سوچنے کا موقع دیا جارہا ہے کہ تم نے اگر پہلی امتوں جیسا رویہ جاری رکھا تو یاد رکھو تم بھی اس عذاب سے بچ نہیں سکو گے جس عذاب کا شکار پہلی امتیں ہوئی ہیں۔

تورات کی تین خصوصیات

سب سے پہلی بات جو پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کے مخاطب تمام لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جن اہلِ کتاب کے ساتھ تمہارا صدیوں کا واسطہ ہے اور آج وہ طریقے طریقے سے تمہیں نبی کریم ﷺ اور ان کے لائے ہوئے دین کیخلاف اکساتے رہتے ہیں اور انہیں کے سکھائے پڑھائے ہوئے سوالات اور اعتراضات تم نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کرتے رہتے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے ان کی طرف حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو نبی بنا کر بھیجا تھا اور ان پر ایک کتاب اتاری تھی جو آج بھی تورات کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اس کتاب کی باقی آسمانی کتابوں کی طرح تین خصوصیات تھیں۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ اسے فرقان بنایا گیا تھا، وہ حق و باطل، صحیح اور غلط میں فرق کرنے والی تھی۔ اس نے لوگوں کے سامنے خیر اور شر، حلال اور حرام اور حُسن اور قبح میں فرق کر کے واضح کر دیا تھا کہ یہ ہے وہ راستہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف جاتا ہے اور جس سے دنیوی اور اخروی کامیابیوں کی ضمانت ملتی ہے۔ جس طرح اندھیرے اور اجالے کے فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جس طرح ندی کے دو کنارے اکٹھے نہیں ہو سکتے اور جس طرح تاریخ کے دو باب باہم پیوست نہیں ہو سکتے، اسی طرح خیر اور شر، اچھائی اور برائی، جھوٹ اور سچ اور صحیح اور غلط میں بھی کوئی ابہام نہیں ہو سکتا۔ تورات نے ہر طرح کے ابہام کو دور کر کے خیر و شر کو الگ الگ اور نمایاں کر کے دکھا دیا۔ اسی لئے اس کو فرقان کا نام دیا گیا تھا، کیونکہ فرقان کا معنی

Marfat.com

ہے دو چیزوں میں فرق کرنے والا اور کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے والی کسوٹی۔

تورات کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ضیاء یعنی روشنی ہے وہ تمام فکری چیزوں کو اس طرح مبرہن اور نمایاں کر کے پیش کرتی ہے کہ صحیح اور غلط افکار میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا۔ وہ زندگی کی شاہراہ کو اس طرح روشن کر دیتی ہے کہ ذہنی واخلاقی اور فکری وعملی تاریکیوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

اور تیسری صفت اس کی یہ ہے کہ وہ اولاد آدم کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کے بعد سب سے پہلے یہی نصیحت فرمائی گئی تھی کہ زندگی گزارنے کیلئے ہدایت ورہنمائی تم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کی جائے گی۔ تمہیں اس کا اتباع کرنا ہے۔ اپنی طرف سے زندگی کے ضوابط اور آداب مقرر کرنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ تورات باقی آسمانی کتابوں کی طرح اسی بھولے ہوئے سبق کی یاد دہانی کیلئے نازل کی گئی تھی۔ البتہ! یہ ضرور ہے کہ اس کی ان خوبیوں سے فائدہ اٹھانے کیلئے متقی ہونا ضروری ہے۔ تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے، جس کا معنی ہے بچنا اور ڈرنا اور ہر ممکن احتیاطی تدابیر بروئے کار لانا۔ جس شخص کے اندر اچھائی اور برائی اور خیر اور شر اور حق اور باطل کی صحیح شناخت موجود نہیں تو اس سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ خیر کو قبول کرے گا اور شر کو قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ جب تک اس کے دل میں صحیح اور غلط میں امتیاز کا دیا روشن نہیں ہوتا اس وقت تک وہ کتاب اللہ کے فرقان ہونے کی صفت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کیلئے لازمی چیز یہ ہے کہ وہ بن دیکھے خدا پر یقین رکھتا ہو کہ وہ پوری کائنات کا خالق و مالک اور رب ہے۔ اس نے ہر ایک کو پیدا فرمایا اور پھر اس کی زندگی کے امکانات روشن کیے۔ وہ ہر مخلوق کی عہد بعہد بدلتی ہوئی ضرورتوں کو نہ صرف جانتا ہے بلکہ پورا بھی کرتا ہے۔ اسی نے انسان کو جسمانی ضرورتیں بھی بہم پہنچائی ہیں اور اس کی معنوی ضرورتوں کی کفالت بھی کی ہے۔ اس نے انسانوں کی ربوبیت کا سامان اس لئے تو نہیں کیا کہ وہ خودرو پودوں کی طرح زندگی گزاریں اور مل دل کر ختم ہو جائیں۔ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی پیہم نوازشات اور عقل وشعور کی بخشش اور وحی الٰہی کا نزول اسی لئے تو ہے کہ اسے یہ معلوم ہو کہ مجھے زندگی ایک خاص مقصد کیلئے دی گئی ہے اور اس مقصد کے حصول کیلئے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں اتار کر میری رہنمائی کی گئی ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں گزرے، میرے ایک ایک عمل کو محفوظ کیا جائے اور پھر ایک دن ایسا آئے جب اللہ تعالیٰ کے عدل کی کارفرمائی ہو اور اس کے نتیجے میں جزاء اور سزا کا ترتب ہو۔ چنانچہ وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس احساس وشعور کے تحت زندگی گزارتے ہیں اور ان کا کوئی لمحہ اس تصور سے خالی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسی ذات کی نگرانی میں ہیں جسے نہ کبھی نیند آتی ہے اور کبھی اونگھ آتی ہے اور جو ان کے ایک ایک عمل کو محفوظ کر رہا ہے اور پھر وہ ایک دن ایسا لائے گا جسے قیامت کہتے ہیں جب ان سے ایک ایک عمل کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔ اسی احساس کا نام تقویٰ ہے اور اس احساس کے حامل لوگ اپنے رب کی خشیت اور جوابدہی کے دن سے ہمیشہ لرزاں وترساں رہتے ہیں۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٥٠﴾

(اور یہ بھی ایک بابرکت یاددہانی ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے تو کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو۔ ۵۰)

قرآن بابرکت کتاب، اس کا انکار محرومی ہے

جس طرح ہم نے تورات اور دیگر آسمانی کتابوں کو اتارا تھا اسی طرح ہم نے قرآن کو بھی نازل کیا ہے۔ جس طرح سابقہ آسمانی

Marfat.com

کتابیں اپنے ساتھ برکتیں لے کر نازل ہوئی تھیں اسی طرح یہ کتاب بھی برکات وحسنات کا منبع ہے۔ جس گھر میں پڑھی جائے گی وہاں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے گا۔ جس دل میں اترے گی وہ دل روشن ہو جائے گا۔ جس ملک میں نافذ کی جائے گی اس ملک پر شب وروز رحمتیں اور برکتیں برسیں گی۔ اور تاریخ کے مختلف ادوار میں جب بھی قرآن کریم کو حقیقی معنوں میں اپنا رہنما بنایا گیا اور وہ جس مقصد کو لے کر آئی ہے مسلمانوں نے اسے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ برکتیں عطا فرمائیں جس کا تصور بھی آج شاید مشکل ہو۔ قریش کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ کیا تم ایسی بابرکت کتاب کو ماننے سے انکار کر رہے ہو۔ سوچ لو کہ پہلی معذب قوموں نے جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والی کتابوں اور مبعوث ہونے والے رسولوں کا انکار کیا تو وہ کس عبرتناک انجام کو پہنچیں۔ ان کی تاریخ تمہارے سامنے ہے، تم اپنے تجارتی اسفار میں ان کے کھنڈرات سے گزرتے ہو۔ تو کیا قرآنِ کریم کا انکار کر کے تم اس تباہی سے محفوظ رہو گے؟

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ
مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۚ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا
هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا
وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ
مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ
لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ
جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ
فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا
فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ؕ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى

Marfat.com

اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا
بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ
اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ
يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ
شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَ
اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا
اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۗ
وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۗ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً
يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ
وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا
وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۗ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿٧٤﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۗ اِنَّهٗ
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾

Marfat.com

رکوع: ۵۔ (اور اس سے پہلے ہم نے حضرت ابراہیم کو ان کی دانائی عطا فرمائی تھی اور ہم ان سے خوب باخبر تھے۔۵۱) یاد کرو! جب حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پوجا پاٹ پر تم جمے بیٹھے ہو۔۵۲) انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ ۵۳) آپ نے کہا کہ تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں مبتلا رہے ہو۔ ۵۴) انہوں نے پوچھا کہ تم ہمارے پاس کوئی سچی بات لے کر آئے ہو یا صرف دل لگی کر رہے ہو۔ ۵۵) (آپ نے فرمایا (دل لگی نہیں کر رہا) بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ ۵۶) اور اللہ کی قسم میں تمہارے ان بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا اس کے بعد کہ تم یہاں سے پیٹھ پھیرتے ہوئے چلے جاؤ گے۔ ۵۷) پس آپ نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا بجز ان کے بڑے بت کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ ۵۸) وہ بولے کہ جس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے بیشک وہ بڑا ہی ظالم ہے۔ ۵۹) (چند آدمیوں نے کہا) ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان کا ذکر (برائی سے) کیا کرتا ہے، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔ ۶۰) انہوں نے کہا کہ اس کو لوگوں کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ وہ بھی گواہ رہیں۔ ۶۱) انہوں نے پوچھا کہ اے ابراہیم، کیا یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کی ہے۔ ۶۲) حضرت ابراہیم نے جواب دیا بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہوگی، سو ان سے پوچھو، اگر یہ بولتے ہوں۔ ۶۳) (لاجواب ہو کر) اپنے دلوں میں غور کرنے لگے، پھر بولے بلاشبہ تم ہی ناحق پر ہو۔ ۶۴) (پھر وہ اوندھے ہو کر (اپنی سابقہ گمراہی کی طرف) پلٹ گئے۔ بولے کہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ ۶۵) آپ نے فرمایا کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ تمہیں کوئی ضرر پہنچا سکتی ہیں۔ ۶۶) تُف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ ۶۷) (سب یک زبان ہو کر بولے) جلا ڈالو اس کو اور مدد کرو اپنی خداؤں کی اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو۔ ۶۸) ہم نے حکم دیا، اے آگ! تو ابراہیم کیلئے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔ ۶۹) انہوں نے تو ابراہیم کو گزند پہنچانے کا ارادہ کیا لیکن ہم نے ان کو ناکام بنا دیا۔ ۷۰) اور ہم نے حضرت ابراہیم کو اور حضرت لوط کو نجات دی اس سرزمین کی طرف جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا تمام جہان والوں کیلئے۔ ۷۱) اور ہم نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسحاق عطا کئے اور مزید براں یعقوب دیئے اور ہم نے سب کو نیک بخت کیا۔ ۷۲) اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انہیں بھلائی کے کام اور نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت کی، اور وہ ہماری ہی بندگی کرنے والے تھے۔ ۷۳) ہم نے حضرت لوط کو قوتِ فیصلہ اور علم کی نعمت عطا فرمائی اور ہم نے انہیں اس بستی سے نجات دی جس بستی کے رہنے والے خباثت کا ارتکاب کرتے تھے، وہ لوگ تھے ہی نافرمان۔ ۷۴) اور ہم نے لوط کو خاص اپنی رحمت میں داخل کیا، بیشک وہ نیک بختوں میں سے تھے۔ ۷۵)

Marfat.com

وَلَقَدْ اٰتَیْنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾

(اور اس سے پہلے ہم نے حضرت ابراہیم کو ان کی دانائی عطا فرمائی تھی اور ہم ان سے خوب باخبر تھے۔ ۵۱)

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا تذکرہ گزشتہ سورت میں چونکہ تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے اس لئے اس کے مختصر ذکر پر اکتفا فرمایا۔ البتہ! یہ بات واضح کر دی کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام آنحضرت ﷺ کی طرح قوم کی اصلاح کیلئے تشریف لائے تھے اور ان کی رہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب نازل کی تھی جو اپنی صفات کے اعتبار سے فرقان، ضیاء اور ذکر کہلانے کی مستحق تھی۔ لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے ضروری تھا کہ اسے سننے اور قبول کرنے والے اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی خشیت پیدا کریں اور قیامت کے دن کی جوابدہی کا احساس زندہ رکھیں۔ اب نبی کریم ﷺ پر تورات ہی کی طرح قرآنِ کریم نازل کیا گیا ہے اور یہ تورات سے بھی بڑھ کر اپنے اندر وہ صفات رکھتا ہے جو قیامت تک آنے والے انسانوں کی ہدایت کیلئے ضروری ہیں۔ لیکن قریش کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح تورات سے استفادہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان اور خشیتِ الٰہی اور جوابدہی کے احساس کے بغیر ممکن نہیں، قرآن سے بھی استفادہ ان صفات کو پیدا کئے بغیر خارج از بحث ہے۔

تاریخ ہدایت اور حضرت ابراہیمؑ کا خاص مقام

اب یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تفصیل سے ذکر کیا جا رہا ہے کیونکہ نزولِ قرآن کے وقت بھی اور آج بھی تینوں بڑے مذاہب اسلام، عیسائیت اور یہودیت انہیں اپنا مقتداء سمجھتے ہیں اور اہلِ عرب بالخصوص انہیں کو اپنا جدِ امجد، مورثِ اعلیٰ اور حقیقی رہنما سمجھتے تھے۔ ان کے تذکرے کے آئینے میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ جس طرح شب و روز توحید کے فروغ اور شرک کے رد میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو وقف کر رہے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ایسا ہی کیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جو دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی تھی، نبی کریم ﷺ بھی وہی دعوت اہلِ مکہ کے سامنے پیش فرما رہے ہیں۔ آپؐ کی تمام تر مساعی اور اس راستے میں بیش بہا قربانیاں اور جان توڑ محنت بالکل اسی محنت کا عکس اور قربانیوں کا پرتو ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انجام دی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی اسی رُشد، ہدایت اور دانش سے نوازا ہے جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوازا گیا تھا۔

رُشد کا ترجمہ ہدایت بھی کیا گیا ہے، ہوش مندی اور دانش بھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے اپنے اندر جو مفہوم رکھتا ہے کسی زبان میں بھی شاید اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ جذبۂ بے پناہ جس نے نوعمری میں باطل سے لڑنے کا حوصلہ دیا پورے شہر میں اپنے مشن کے حوالے سے تنہا ہوتے ہوئے اپنے والد اور پوری قوم کو چیلنج کرنا اور اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنا اور اس راستے میں پیش آنے والی بڑی سے بڑی مشکل کو خاطر میں نہ لانا، ایک ایسا جذبہ ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح دعوتِ حق کو پیش کرنے میں جس حکمت و مصلحت کو پیشِ نظر رکھا گیا اور گفتگو میں جس طرح خوبصورت طنز کے ذریعے دماغوں کو جھنجھوڑا گیا اور جس طرح بالکل سامنے کے لیکن نہایت مؤثر دلائل کے ساتھ اپنے مخالفین کو آہستہ آہستہ ایسی سطح پر لایا گیا کہ دیکھنے والوں نے ان کی بے بسی اور جواب دینے سے معذوری علی رؤس الاشہاد اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اس دانش، استدلالی قوت اور جذبۂ بے پناہ اور غیر متزلزل حوصلہ کو پروردگار نے رُشد کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے اس کے

Marfat.com

معنی کا حق ادا ہو سکتا ہو۔

مزید ایک بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ ہم نے حضرت ابراہیم کو اتنے بڑے مقام و مرتبہ سے یونہی نہیں نوازدیا تھا بلکہ ہم جانتے تھے کہ ابراہیم میں یہ تمام صفات بتمام وکمال موجود ہیں اور انہوں نے قدم قدم پر اس کا ثبوت فراہم کیا تھا اور یہ صفات ہم نے خود مسلسل تربیت سے ان کے اندر پیدا کی تھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس کی کوئی بخشش بھی اندھی بانٹ نہیں ہوتی اور نبوت تو سب سے اعلیٰ اور نازک ذمہ داری ہے۔ اسے تو پروردگار اسی کو عطا کرتا ہے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا بار اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کے حوالے کرے۔''

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

(یاد کرو جب حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پوجا پاٹ پر تم جمے بیٹھے ہو۔ ۵۲)

اصنام پرستی کی مذمت

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس دانش و بصیرت، ہدایت اور حوصلہ مندی سے نوازا تھا، یہ اس کا اظہار ہے۔ ابھی آپ عنفوانِ شباب میں ہیں۔ جب نوجوانوں پر جوانی کے جذبوں اور خواہشات کی سحر کاریوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ جب وہ کسی سنجیدہ بات اور خواہشات کو حدود میں رکھنے والی کسی نصیحت کے سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کون کس کی پوجا کر رہا ہے، ان کے سامنے ایک ہی معبود ہوتا ہے کہ جس کا نام جوانی اور اس کے تقاضے ہیں۔ وہ صرف ایک راستے کو جانتے ہیں جس میں کچھ لوٹا جاتا اور کچھ لٹوایا جاتا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ جانے کس سانچے میں ڈھلے اور کن جذبوں سے نوازے گئے تھے کہ آپؑ اسی عمر میں وہ بات کہہ رہے ہیں جس میں قوم اور اقتدار کی طرف سے پیش آنے والی مشکلات کے سوا اور کوئی چیز ملنے والی نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بت گروں اور اقتدار کے مسند نشینوں میں ایک ملی بھگت کے نتیجے میں نمرود تختِ اقتدار پر براجمان ہے۔ بتوں کو مورتیاں کہنا اور اس طرح تحقیر آمیز انداز میں انہیں یاد کرنا اپنے آپ کو مصائب کے حوالے کر دینا ہے، لیکن وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے اپنے اس فرض کی انجام دہی کی فکر میں ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں فائز کیا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، حکمرانی کوئی اور کر رہا ہے۔ رزق اللہ تعالیٰ کا کھایا جا رہا ہے لیکن دل بتوں کی محبت سے سرشار ہیں۔ آپؑ نے سب سے پہلے اپنے باپ کے سامنے اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ آپ کا کوئی خالق بھی ہے اور رازق بھی۔ اسی نے آپ کو مہلتِ عمل دے رکھی ہے۔ عجیب بات ہے کہ رزق اس کا کھاتے ہو اور سر بتوں کے سامنے جھکاتے ہو۔ پھر بت خانے میں جا کر اور اس سے باہر مختلف تقریبات میں قوم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جنہیں تم خدا سمجھتے ہو وہ تمہارے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیاں ہیں۔ تمثال اس صورت کو کہتے ہیں جو ہاتھوں سے بنائی جائے چونکہ اس قوم میں مظاہرِ قدرت کی پوجا کرنے والے بھی تھے اور سیارہ پرست بھی اور کچھ لوگ ماضی میں گزرے ہوئے بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے اس لئے ان مورتیوں میں ستاروں کی شبیہیں بھی تھیں، گزشتہ بزرگوں کے مجسمے بھی تھے۔ اپنے ہاتھوں سے گھڑی ہوئی مورتیوں کے بارے میں وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ شانِ الوہیت کی مالک ہیں۔ چنانچہ انہیں مورتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحقیر کے انداز میں جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا کہ ان مورتیوں کی آخر حقیقت کیا ہے؟ تم جو شب و روز ان پر دھرنا جمائے بیٹھے ہو اور ہر وقت ان کی پوجا کرنے کی فکر میں رہتے ہو اور ان کے سامنے چڑھاوے چڑھاتے ہو، پتھر کی یہ مورتیاں جو نہ حرکت کرتی ہیں، نہ

Marfat.com

بولتی ہے نہ کھاتی ہیں اور تم ان کے سامنے مٹھائی کے تھال سجا کے رکھتے ہو، آخر یہ قصہ کیا ہے؟

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

(انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ ۵۳)

قوم کا حماقت آمیز جواب

جواب میں آپؑ کی قوم کے لوگوں نے وہی بات کہی جو ایسی حماقتوں کے حامی ہمیشہ کہا کرتے ہیں۔ جب ان سے دلیل کا جواب دلیل سے بن نہیں پاتا تو ان کے نزدیک سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم نے اسی پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگر ہم غلط ہیں تو ہمارے باپ دادا تو غلط نہیں ہو سکتے۔ قرآنِ کریم نے اور بھی بعض مواقع پر ان کی اس حماقت پر گرفت کی ہے۔ اور یہ اصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ دنیوی معاملات میں یہ جاننے کیلئے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ علم اور عقل سے پوچھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر دور کے اہلِ علم اور اصحابِ عقل ان معاملات میں جو کچھ کہتے ہیں اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح جس بات کا تعلق دین سے ہو اس میں ان لوگوں سے پوچھا جاتا ہے جو ہدایت یافتہ ہوں اور دین کو سمجھتے ہوں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ لوگ پہلے گزرے ہیں یا آج موجود ہیں۔ جس طرح آج اچھے لوگ بھی موجود ہیں اور برے بھی، اسی طرح جو لوگ گزر چکے اور آج انہیں آباؤاجداد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان میں بھی ہر طرح کے لوگ تھے۔ اس لئے ان کا آباؤاجداد ہونا کوئی دلیل نہیں۔ دلیل علم ہے، عقل ہے یا ہدایت۔ آج کے لوگ چند سالوں کے بعد آباؤاجداد میں شامل ہو جائیں گے۔ تو کیا ان لوگوں کے بارے میں یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کی جہالت اور ان کی بے دینی ان کی اولاد کیلئے سند بن جائے گی۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

(آپ نے کہا کہ تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں مبتلا رہے ہو۔ ۵۴)

بت پرستی صریح گمراہی ہے

بت پرستی ایک صریح گمراہی ہے۔ کوئی صاحبِ دانش آدمی اس کی تائید نہیں کر سکتا اور کسی اللہ تعالیٰ کے نبی نے کبھی اسے گوارا نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس کی مذمت کی۔ اس لئے جس طرح آج بت پرستی گمراہی ہے اسی طرح تمہارے آباؤاجداد کے زمانے میں بھی گمراہی تھی۔ آج تم اس گمراہی میں مبتلا ہو، ماضی میں وہ مبتلا رہ چکے ہیں۔ تمہیں ہوش و خرد اور ہدایت کی روشنی میں اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی اصلاح کرنی چاہئے نہ کہ آباؤاجداد کی گمراہیوں کو سند بنا لینا چاہئے۔

یہ کہنا کہ ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہمارے آباؤاجداد کیا کرتے تھے یہ صرف ایک دلیل نہیں بلکہ اس میں باپ دادا کی حمیت و عصبیت بھی شامل ہے۔ کوئی شخص یہ سننا پسند نہیں کرتا کہ میرے آباؤاجداد کو گمراہ کہا جائے۔ اس لئے جب اہلِ باطل اپنے آباؤاجداد کا حوالہ دیتے ہیں تو وہ درحقیقت لوگوں کو داعیِ حق کیخلاف اکساتے ہیں کہ یہ شخص کس قدر خطرناک ہے جو تمہارے آباؤاجداد کے خلاف باتیں کرتا اور ان کو گمراہ بتاتا ہے۔ چنانچہ اس انگیخت کے بعد لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہمیں کیا کہا جا رہا ہے، وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کہنے والا

Marfat.com

ہمارے آباؤاجداد کی توہین کر رہا ہے۔ اس لئے جاہل لوگوں کو ایسی کسی بات کی دعوت دینا جس کی زد ان کے آباؤاجداد پر پڑتی ہو، نہایت خطرناک ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت عزیمت کے ساتھ اس کام کو انجام دیا۔ آپؑ جانتے تھے کہ اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے، لیکن آپؑ نے ہر خطرے کا سامنا کرتے ہوئے نہایت بے خوفی کے ساتھ توحید کی دعوت ان کے سامنے پیش کی۔ وہ لوگ چونکہ ایسی باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی شخص علی الاعلان بے خوف وخطر ان کے بتوں پر تنقید کرے گا اس لئے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کو سن کر کہا:

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾

(انہوں نے پوچھا کہ تم ہمارے پاس کوئی سچی بات لے کر آئے ہو یا صرف دل لگی کر رہے ہو۔ ۵۵)

لوگوں نے یہ سمجھا کہ ابراہیم (علیہ السلام) جو کچھ کہہ رہے ہیں، یہ محض ہم سے دل لگی کر رہے ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بت پرستی کے ماحول میں بت پرستی کی مذمت کی جائے اور اسے صریح گمراہی قرار دیا جائے۔ اس لئے انہوں نے پلٹ کر ابراہیم علیہ السلام سے ان کی بات کی وضاحت چاہی۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِىْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾

(آپ نے فرمایا (دل لگی نہیں کر رہا) بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ ۵۶)

دعوتِ حق کی راہ میں ایک اور قدم

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا کہ پتھر اور مٹی کے بت تمہارے رب نہیں ہیں بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا وہ خدا ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں یہ بات محض زیبِ داستان کیلئے نہیں کہہ رہا بلکہ میں اس حقیقت پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں یعنی اس کی مجھے جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے چونکہ میں اس صداقت پر یقین رکھتا ہوں اس لئے میں ہر قیمت پر اس کی گواہی دوں گا۔ میری زبان بھی اس کی گواہی دے گی، میرا عمل بھی بولے گا۔ تم مجھے طاقت کے زور سے دبانے کی کوشش کرو گے تو میری بے خوفی اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کی گواہی دے گی۔ تم میری جان کے درپے ہو جاؤ گے تو میں اس کا اثر قبول کرنے کی بجائے اپنی جرأت واستقامت سے یہ ثابت کر دوں گا کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں، میں اسی لئے نمازی

Marfat.com

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾

(اور اللہ کی قسم میں تمہارے ان بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا اس کے بعد کہ تم یہاں سے پیٹھ پھیرتے ہوئے چلے جاؤ گے۔ ۵۷)

کَیْد...... خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں۔ یعنی مخالف کیخلاف اسے نقصان پہنچانے کیلئے اس طرح، تدام کرنا کہ وہ اس سے باخبر نہ ہو سکے۔ جوہری لکھتے ہیں کُلُّ شَیْءٍ تُعَالِجُهٗ اَنْتَ تَکِیْدُهٗ ۔ کسی چیز کے متعلق برا ارادہ کرنے کو بھی کید کہتے ہیں۔ کَادَ اَیْ اَرَادَهٗ بِسُوْءٍ (المنجد)۔

حضرت ابراہیمؑ کا اچھوتا اندازِ تبلیغ

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بت خانے کے اندر یا باہر لوگوں کو توحید کی تلقین اور بت پرستی پر نکیر فرما رہے تھے لیکن لوگ بتوں کی عصبیت میں اندھا ہونے کے باعث آپؑ کی بات قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ تب آپؑ نے اپنے دل میں یا دبی زبان میں یا کسی حد تک لوگوں کو سنا کر یہ بات کہی کہ میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایسی تدبیر کروں گا کہ جس سے تمہیں بتوں کی بے بضاعتی، ناطاقتی اور بے بسی کا اندازہ ہو جائے گا اور پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ کیا خدا ایسا بے بس اور ایسا گیا گزرا ہوتا ہے۔ میں تمہیں جس خدا کی طرف دعوت دے رہا ہوں وہ ساری کائنات کا خالق و مالک اور سب کا رزق رساں ہے اور تم اس کے مقابلے میں جن بتوں کی پوجا کر رہے ہو اور ان کو خدا سمجھتے ہو ان کی بے بسی کا وہ عالم ہے جو تمہارے سامنے ہے۔

اور یہ بھی فرمایا کہ میں یہ سب کچھ اس وقت کروں گا جب تم یہاں سے جا چکے ہو گے۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اب جبکہ میں بت خانے میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں جب تم پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر یہاں سے نکل جاؤ گے تو میں رات کے کسی حصے میں آ کر وہ کچھ کروں گا جسے یہاں ''کید'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور یا مطلب یہ ہے کہ عنقریب تمہارا ایک تہوار آنے والا ہے۔ تم اپنے بت خانے کے پجاریوں سمیت تہوار منانے کیلئے چلے جاؤ گے اور پھر شام کو کہیں لوٹ کے آؤ گے۔ تمہارا بت خانہ کسی مجاور اور کسی محافظ کے بغیر کھلا پڑا ہو گا تو میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تمہارے بت خانے میں جاؤں گا اور وہاں وہ کچھ کروں گا جو میں کرنا چاہتا ہوں۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

(پس آپ نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا بجز ان کے بڑے بت کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ ۵۸)

تہوار کا دن آیا، لوگ ہجوم در ہجوم شہر سے باہر تہوار منانے کیلئے نکل گئے۔ دن بھر تفریحی جھمیلوں میں مشغول رہے۔ وہاں نہ کوئی پجاری رہا اور نہ کوئی محافظ۔ خالی بت کدے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بغیر کسی مزاحمت کے داخل ہو گئے۔ ہاتھ میں ایک بڑا کلہاڑا تھا۔ بت کدے کے وسیع ہال میں ایک بڑا بت نصب تھا اور اس کے دونوں طرف ایک ترتیب سے چھوٹے بت رکھے ہوئے تھے اور سب کے سامنے چڑھاووں کی مٹھائی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی تدبیر کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی کا کان کاٹا، کسی کی ناک، کسی کی آنکھ پھوڑی اور کسی کا بازو توڑ ڈالا اور سب مٹھائیاں اٹھا کر بڑے بت کے سامنے ڈھیر کر دیں اور کلہاڑا اس کے کندھے پر رکھ دیا اور خود وہاں سے کھسک گئے۔ مقصود یہ تھا کہ جب بت خانے کے پجاری اور دوسرے عقیدت مند بتوں کی یہ تباہی اور توڑ پھوڑ دیکھیں گے تو اس کا فوری نتیجہ

Marfat.com

ایک تو یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں ایسے لوگ کہ جن کے دلوں کی روشنی بت پرستی نے بالکل بجھا نہیں دی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹیں اور سوچیں کہ ایسے بے بس اور ناکارہ ہمارے خدا تو نہیں ہوسکتے۔ خدا یقیناً وہ ہے جس نے ہمیں زندگی دی اور زندگی کے امکانات روشن کئے اور دوسرا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ ضمیر کا مرجع خدا کی بجائے خود حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں اور ان کی یہ ساری تدبیر صرف اس مقصد کیلئے ہو کہ جب اس شہر کے لوگ اور بت خانے کے مجاور اور متولی اپنے بتوں کا یہ انجام دیکھیں گے تو یقیناً تلاش اور تحقیق کے بعد وہ مجھ تک پہنچیں گے کیونکہ شہر بھر میں کوئی اور سرپھرا ایسا نہیں جس کی زبان سے کبھی بت پرستی کیخلاف ایک کلمہ بھی سرزد ہوا ہو۔ میرے خیالات سے جو لوگ واقف ہیں وہ یقیناً اس سیلاب کا رخ میری طرف پھیر دیں گے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے لوگوں کے سامنے علی رؤس الاشہاد اپنی بات کہنے کا موقع ملے۔ میں توحید کو دلائل سے ثابت کروں اور بت پرستی کے نقصانات اور اس کے بے عقل ہونے پر لوگوں کو متوجہ کروں اور جھنجھوڑوں۔

حیرانی کی بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جانتے تھے کہ میں اتنا بڑا اقدام کر رہا ہوں جسے نہ عوام برداشت کریں گے اور نہ حکمران طبقہ اسے برداشت کر سکے گا۔ یقیناً اس کے نتیجے میں، میں ناقابلِ بیان اذیتوں میں مبتلا کر دیا جاؤں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں دینی حمیت سے اس قدر مالا مال کیا تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں بڑے سے بڑے خطرے کو انگیخت کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنا اور باطل کو سرعام شکست دینا اس تدبیر کے سوا ممکن نہیں۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۹﴾

(وہ بولے کہ جس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے بیشک وہ بڑا ہی ظالم ہے۔ ۵۹)

سرِ شام جب پجاری واپس لوٹے اور انہوں نے بت کدے کی تباہی دیکھی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اصحابِ اقتدار کو بھی اطلاع ہوئی۔ سب موقع پر پہنچ گئے۔ سب کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے اتنا بڑا اقدام کیا ہے اور جس طرح اس ملک کے رہنے والوں کی غیرت کو چیلنج کیا ہے وہ یقیناً کوئی بہت ہی سرپھرا اور بڑا ظالم ہے۔ کیونکہ بقائمی ہوش وحواس اتنی بڑی کارروائی کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ایسی کارروائی وہی کر سکتا ہے جو اپنی ذات کا بھی دشمن ہے اور اپنی قوم کا بھی۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِیْمُ ﴿۶۰﴾

(چند آدمیوں نے کہا) ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان کا ذکر (برائی سے) کیا کرتا ہے، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔ ۶۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے ایسے لوگ جنہیں ان سے گفتگو کا موقع مل چکا تھا یا آپ ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کر چکے تھے وہ کسی حد تک آپؑ کے خیالات سے آگاہ تھے لیکن انہوں نے آپؑ کی باتوں کو کبھی سنجیدہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک سرپھرے نوجوان کی غیر ذمہ دارانہ باتیں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائیں گی۔ انہیں اس بات کا تو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ کبھی یہ نوجوان اتنی بڑی حرکت کر سکتا ہے۔ اب جو انہوں نے اپنے سامنے اس جسارت کا ارتکاب دیکھا تو معاً ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ کارستانی ابراہیم (علیہ السلام) ہی کی ہے۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ بتوں کا ذکر برائی سے کیا کرتا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی گفتگو میں برائی کا لفظ نہیں کہا یعنی وہ اپنے خداؤں کی حمایت ونصرت اور عقیدت ومحبت میں اس حد تک ڈوبے

Marfat.com

ہوئے تھے کہ وہ نقلِ کفر کو بھی کفر سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ذمہ داروں کو اطلاع دیتے ہوئے صرف یہ کہا کہ وہ ہمارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے۔ ہم اسے زیادہ نہیں جانتے اور نہ قوم میں اس کی شہرت ہے۔ اتنا ہمیں معلوم ہے کہ اسے ابراہیم (علیہ السلام) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾

(انہوں نے کہا کہ اس کو لوگوں کے سامنے پکڑ کر لاؤ تا کہ وہ بھی گواہ رہیں۔ ٦١)

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مقدمہ

قوم کے سربراہوں اور مذہبی پروہتوں نے حکم دیا کہ انہیں لوگوں کے سامنے گرفتار کر کے لاؤ تا کہ اس کے جرم کی تحقیق لوگوں کے سامنے کی جائے اور پھر اس کی سزا کو بھی تمام لوگ اپنی نگاہوں سے دیکھیں اور لوگوں کے سامنے جا کر گواہی دیں کہ وہ شخص جس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ جسارت کی تھی وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ ان نام نہاد خداؤں سے چونکہ سب لوگوں کا عقیدت و محبت اور بندگی کا رشتہ تھا تو جس نے ان کے ساتھ گستاخی کی تھی وہ پوری قوم کا مجرم تھا۔ اس لئے اربابِ حل و عقد نے یہ ضروری سمجھا کہ اس شخص کو پکڑ کر سامنے لایا جائے اور اس پر مقدمہ سب کے سامنے چلایا جائے اور پھر جو اس کو سزا ملے سب اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور دوسروں کے سامنے اس کی شہادت دیں کیونکہ شہود کا معنی دیکھنا بھی ہوتا ہے اور گواہی دینا بھی، تا کہ لوگوں کیلئے یہ سزا عبرت کا سامان بن جائے۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْــَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾

(انہوں نے پوچھا کہ اے ابراہیم، کیا یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کی ہے۔ ٦٢) حضرت ابراہیم نے جواب دیا بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہوگی، سو ان سے پوچھو، اگر یہ بولتے ہوں۔ ٦٣)

استفسار اور جواب

سوالوں کی نوعیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ سے سوال کرنے والے اربابِ اقتدار بھی تھے اور پیشوایانِ دین بھی۔ انہوں نے نہایت حیرت اور غصے میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا کہ ابراہیم ہمارے خداؤں کے ساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے؟ کیونکہ جس کے دل میں اپنے خداؤں کے ساتھ معمولی عقیدت بھی ہے وہ تو یہ حرکت نہیں کر سکتا اور تم بھی اسی قوم کے ایک فرد ہو، تم سے بھی یہ توقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن تمہارے بارے میں خبر دینے والوں نے یہ کہا ہے کہ شاید تم نے یہ حرکت کی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟ آپ بت کدے کا منظر دیکھ لیجئے، تمام چھوٹے چھوٹے بتوں کے جسم ٹوٹے پھوٹے بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے بڑا کندھے پر کلہاڑا رکھے اور ان کی ساری مٹھائیوں کو اپنے سامنے ڈھیر کئے بیٹھا ہے، آپ اسے کیوں نہیں پوچھتے؟ اور اگر ان سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہے تو جن بتوں کے اعضاء توڑے گئے ہیں ان سے پوچھ لیجئے وہ خود بتائیں گے کہ ان پر یہ قیامت کس نے برپا کی ہے، اگر وہ بول سکتے ہیں تو۔ آپ اس پوری کارروائی کو دیکھ لیجئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہیں بھی انکار نہیں کر رہے ہے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ وہ اپنی اس

Marfat.com

جسارت کے واسطے سے ان کے نام نہاد خداؤں کی بے بسی ان کے سامنے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جن بتوں کو تمہارے بت گروں نے تراشا ہے اور تمہارے مجسمہ سازوں نے ان کے مجسمے بنائے ہیں اور جن پر یہ قیامت کی گھڑی آئی ہے لیکن وہ اپنے دفاع میں ہاتھ تک نہیں ہلا سکے اور اب تمہیں اس مجرم کی تلاش ہے جس نے یہ سب کچھ کیا ہے تو وہ تمہیں یہ تک نہیں بتا سکتے کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا ہے۔ یعنی نہ ان کا وجود اپنا، نہ وہ اپنے دفاع پر قادر اور نہ وہ قوتِ گویائی سے بہرہ ور، تو کیا ایسے ہوتے ہیں خدا؟ اتنے گئے گزرے تو حشرات الارض تک نہیں ہوتے۔ کیڑے مکوڑے بھی اپنے مسلنے والوں کو ڈس لیتے ہیں اور چیونٹیاں بھی اپنے تحفظ کیلئے بلوں میں گھس جاتی ہیں، لیکن یہاں عجیب حال ہے کہ تم اپنی مشکلات میں جن کے سامنے دستِ سوال پھیلاتے ہو وہ تو اپنے جوگے بھی نہیں۔

توقع تھی وہ جن سے خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

ہم نے اپنی بساط کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مؤقف کا صحیح مجمل واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو اگر سامنے رکھا جائے تو سچ اور جھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے اور ایک حدیث سے استدلال بھی کیا جاتا ہے، ہم اس کی وضاحت کیلئے معارف القرآن کی تشریحات مستعار لیتے ہیں:

> یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو حضرت ابراہیم نے خود کیا تھا پھر اس سے انکار اور ان کے بڑے کی طرف منسوب کرنا بظاہر خلاف واقعہ ہے جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے۔ حضرت خلیل اللہ کی شان اس سے بالا و برتر ہے، اس کے جواب کیلئے حضرات مفسرین نے بہت سے احتمالات بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس کو خلاصہ تفسیر بیان القرآن میں اختیار کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور فرض کے تھا یعنی تم یہ کیوں نہیں فرض کر لیتے کہ یہ کام بڑے بت نے کیا ہوگا اور بطور فرض کے کوئی خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ میں داخل نہیں جیسے خود قرآن میں ہے ان **کان للرحمن ولد فانا اول العابدین** یعنی اگر اللہ رحمٰن کے کوئی لڑکا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والوں میں داخل ہوتا، لیکن بے غبار اور بے تاویل وہ توجیہ ہے جس کو بحر محیط، قرطبی، روح المعانی وغیرہ میں اختیار کیا گیا ہے کہ یہ اسناد مجازی ہے جو کام ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا اس کو بڑے بت کی طرف بطور اسناد مجازی کے منسوب کر دیا کیونکہ اس کام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آمادہ کرنے والا یہی بت تھا اور اس کی تخصیص شاید اس وجہ سے ہو کہ ان کی برادری اس بت کی تعظیم سب سے زیادہ کرتی تھی اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی چور کی سزا میں اس کا ہاتھ کاٹ دے اور پھر کہے کہ یہ میں نے نہیں کاٹا بلکہ تیرے عمل اور تیری کجروی نے ہاتھ کاٹا ہے کیونکہ ہاتھ کاٹنے کا سبب اس کا عمل ہے۔
>
> حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی طور پر بھی بتوں کے توڑنے کو بڑے بت کی طرف منسوب کیا تھا جیسا کہ روایات میں ہے کہ جس تبر یا کلہاڑے سے ان کے بت توڑے تھے یہ کلہاڑا بڑے بت کے مونڈھے پر یا اس کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا کہ دیکھنے والے کو یہ خیال پیدا ہو کہ اس نے ہی یہ کام کیا ہے اور قولاً بھی اس کی طرف منسوب فرمایا تو یہ ایک اسناد مجازی ہے جیسے عربی کا مشہور مقولہ **انبت الربیع البقلہ** اس کی معروف مثال ہے (یعنی موسم ربیع کی بارش نے کھیتی اگائی

Marfat.com

ہے) کہ اگرچہ اگانے والا درحقیقت حق تعالیٰ ہے مگر اس کو ایک ظاہری سبب کی طرف منسوب کردیا گیا ہے اور اس کو کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بڑے بت کی طرف اس فعل کو عملاً اور قولاً منسوب کردینا جھوٹ ہرگز نہیں۔ البتہ بہت سی مصالح دینیہ کیلئے یہ توریہ اختیار فرمایا۔ ان میں ایک مصلحت تو یہی تھی کہ دیکھنے والوں کو اس طرف توجہ ہو جائے کہ شاید اس بڑے بت کو اس پر غصہ آ گیا ہو کہ میرے ساتھ عبادت میں ان چھوٹے بتوں کو کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ خیال ان کے دلوں میں پیدا ہو تو توحید حق کا راستہ کھل جاتا ہے کہ جب ایک بڑا بت اپنے ساتھ چھوٹے بتوں کی شرکت گوارا نہیں کرتا تو رب العالمین ان پتھروں کی شرکت اپنے ساتھ کیسے گوارا کرے۔

دوسرے یہ کہ ان کو یہ خیال اس وقت پیدا ہونا قرین عقل ہے کہ جن کو ہم خدا اور مختار کل کہتے ہیں اگر یہ ایسے ہی ہوتے تو کوئی ان کے توڑنے پر کیسے قادر ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اگر اس فعل کو وہ بڑے بت کی طرف منسوب کردیں تو جو بت یہ کام کر سکے کہ دوسرے بتوں کو توڑ دے اس میں گویائی کی طاقت بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے فرمایا **فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ** خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول مذکور کو بلا تاویل کے اپنے ظاہر پر رکھ کر یہ کہا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کو بڑے بت کی طرف منسوب فرمایا اور یہ اسناد مجازی کے طور پر فرمایا تو اس میں کوئی جھوٹ اور خلاف واقعہ کا شبہ نہیں رہتا۔ صرف ایک قسم کا توریہ ہے۔

حدیث میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف تین جھوٹ منسوب کرنے کی حقیقت

ایک سوال اب یہ رہ جاتا ہے کہ صحیح احادیث میں خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے **ان ابراھیم علیہ السلام لم یکذب غیر ثلاث** (رواہ البخاری ومسلم) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بجز تین جگہوں کے پھر ان تینوں کی تفصیل اسی حدیث میں اس طرح بیان فرمائی کہ ان میں سے دو جھوٹ تو خالص اللہ تعالیٰ کیلئے بولے گئے ایک یہی جو اس آیت میں **بل فعله كبيرهم** فرمایا، دوسرا عید کے روز برادری سے یہ عذر کرنا کہ **انی سقیم**، میں بیمار ہوں اور تیسرا (اپنی زوجہ کی حفاظت کیلئے بولا گیا) وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک ایسی بستی پر گزر ہوا جہاں کا رئیس ظالم بدکار تھا۔ جب کسی شخص کے ساتھ اس کی بیوی کو دیکھتا تو بیوی کو پکڑ لیتا اور اس سے بدکاری کرتا، مگر یہ معاملہ اس صورت میں نہ کرتا تھا جبکہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے ساتھ یا بہن اپنے بھائی کے ساتھ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس بستی میں مع اہلیہ کے پہنچنے کی مخبری اس ظالم بدکار کے سامنے کردی گئی تو اس نے حضرت سارہ کو گرفتار کر کے بلوالیا، پکڑنے والوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ عورت رشتہ میں تم سے کیا تعلق رکھتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ظالم کے خوف سے بچنے کیلئے یہ فرمایا کہ یہ میری بہن ہے۔ (یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں تیسرے جھوٹ سے تعبیر کیا گیا ہے) مگر اس کے باوجود وہ پکڑ لئے گئے اور ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کو بھی بتلادیا کہ میں نے تم کو اپنی بہن کہا ہے تم بھی اس کے خلاف نہ کہنا اور وجہ یہ ہے کہ اسلامی رشتہ سے تم میری بہن ہو کیونکہ اس وقت اس زمین میں ہم دو ہی مسلمان ہیں اور اسلامی اخوت کا تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقابلے پر قدرت نہ تھی، اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح وزاری کیلئے نماز پڑھنا شروع کردی۔ حضرت سارہ اس

Marfat.com

کے پاس پہنچیں یہ ظالم بری نیت سے ان کی طرف بڑھا تو قدرت نے اس کو اپاہج و معذور کر دیا۔ اس پر اس نے حضرت سارہ سے درخواست کی کہ تم دعا کر دو کہ میری یہ معذوری دور ہو جاوے، میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا۔ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو صحیح سالم کر دیا مگر اس نے عہد شکنی کی اور پھر بری نیت سے ان پر ہاتھ ڈالنا چاہا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا۔ اسی طرح تین مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا تو اس نے حضرت سارہ کو واپس کر دیا۔ (یہ خلاصہ مضمون حدیث کا ہے) بہر حال اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ کی نسبت صراحۃً کی گئی ہے جو شان نبوت وعصمت کیخلاف ہے مگر اس کا جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے وہ یہ کہ دراصل ان میں سے ایک بھی حقیقی معنی میں جھوٹ نہ تھا یہ توریہ تھا جو ظلم سے بچنے کیلئے جائز و حلال ہوتا ہے وہ جھوٹ کے حکم میں نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل خود حدیث مذکور میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں اپنی بہن بتلایا ہے تم سے پوچھا جائے تو تم بھی مجھے بھائی بتلانا اور بہن کہنے کی وجہ بھی ان کو بتلا دی کہ ہم دونوں اسلامی برادری کے اعتبار سے بہن بھائی ہیں۔ اسی کا نام توریہ ہے کہ الفاظ ایسے بولے جائیں جن کے دو مفہوم ہو سکیں۔ سننے والا اس سے ایک مفہوم سمجھے اور بولنے والے کی نیت دوسرے مفہوم کی ہو اور ظلم سے بچنے کیلئے یہ تدبیر توریہ کی باتفاق فقہاء جائز ہے یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تقیہ میں صریح جھوٹ بولا جاتا ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے توریہ میں صریح جھوٹ نہیں ہوتا بلکہ جس معنی سے متکلم بول رہا ہے وہ بالکل صحیح اور سچ ہوتے ہیں جیسے اسلامی برادری کے لحاظ سے بھائی بہن ہونا، یہ وجہ تو خود حدیث مذکور کے الفاظ میں صراحۃً مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ درحقیقت کذب نہ تھا بلکہ ایک توریہ تھا، ٹھیک اسی طرح کی توجیہ پہلے دونوں کلاموں میں ہو سکتی ہے۔ بل فعله كبيرهم کی توجیہ ابھی اوپر لکھی گئی ہے کہ اس میں بطور اسناد مجازی اس فعل کو بڑے بت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی طرح انی سقیم کا لفظ ہے کیونکہ سقیم کا لفظ جس طرح ظاہری طور پر بیمار کے معنی میں آتا ہے اسی طرح رنجیدہ و غمگین اور مضمحل ہونے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے انی سقیم فرمایا تھا۔ مخاطبوں نے اس کو بیماری کے معنی میں سمجھا اور اسی حدیث میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ ان تین کذبات میں دو اللہ تعالیٰ کی ذات کیلئے تھے یہ خود قرینہ قویہ اس کا ہے کہ یہ کوئی گناہ کا کام نہ تھا ورنہ گناہ کا کام اللہ تعالیٰ کیلئے کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہو سکتا اور گناہ کا کام نہ ہونا جبھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ حقیقۃً کذب نہ ہو بلکہ ایسا کلام ہو جس کے دو معنی ہو سکتے ہوں، ایک کذب اور دوسرا صحیح ہو۔

حدیثِ کذبات ابراہیمؑ کو غلط قرار دینا جہالت ہے

مرزا قادیانی اور کچھ دوسرے مستشرقین سے مغلوب مسلمانوں نے اس حدیث کو باوجود صحیح السند ہونے کے اس لئے غلط اور باطل کہہ دیا کہ اس سے حضرت خلیل اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے اور سند کے سارے راویوں کو جھوٹا کہہ دینا اس سے بہتر ہے کہ خلیل اللہ کو جھوٹا قرار دیا جائے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے اور پھر اس سے ایک کلیہ قاعدہ یہ نکال لیا کہ جو حدیث قرآن کیخلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی قوی او صحیح اور معتبر اسانید سے ثابت ہو وہ غلط قرار دی جائے۔ یہ بات اپنی جگہ تو بالکل صحیح اور ساری امت کے نزدیک بطور فرض محال کے مسلم ہے مگر علماء امت نے تمام ذخیرۂ احادیث میں اپنی

Marfat.com

عمریں صرف کر کے ایک ایک حدیث کو چھان لیا ہے۔ جس حدیث کا ثبوت قوی اور صحیح اسانید سے ہوگیا ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہو سکتی کہ جس کو قرآن کیخلاف کہا جاسکے بلکہ وہ اپنی تمام کم فہمی یا کج فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو رد اور باطل کرنا چاہا اس کو قرآن سے ٹکرا دیا اور یہ کہہ کر فارغ ہو گئے کہ یہ حدیث خلاف قرآن ہونے کے سبب غیر معتبر ہے جیسا کہ اسی حدیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ الفاظ کذبات سے تو ریہ مراد ہونا خود حدیث کے اندر موجود ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ پھر حدیث میں توریہ کو کذبات کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا تو اس کی وجہ وہی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے کہ مقربانِ بارگاہ حق تعالیٰ کی ادنیٰ کمزوری اور محض رخصت اور جائز پر عمل کر لینا اور عزیمت کو چھوڑ دینا بھی قابلِ مواخذہ سمجھا جاتا ہے اور ایسی چیزوں پر قرآن میں حق تعالیٰ کا عتاب انبیاء کے بارے میں بکثرت منقول ہے۔ حدیث شفاعت جو مشہور و معروف ہے کہ محشر میں ساری مخلوق جمع ہو کر حساب جلد ہونے کے لئے انبیاء سے شفاعت کے طالب ہوں گے، آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء سے پہلے تک تمام انبیاء کے پاس پہنچیں گے۔ ہر پیغمبر اپنے کسی قصور اور کوتاہی کا ذکر کر کے شفاعت کی ہمت نہ کرے گا، آخر میں سب خاتم الانبیاء علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ اس شفاعتِ کبریٰ کیلئے کھڑے ہوں گے۔ اس حدیث میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ ان کلمات کو جو بطور توریہ کے کہے گئے تھے حقیقۃً کذب نہ تھے مگر پیغمبرانہ عزیمت کیخلاف تھے۔ اپنا قصور اور کوتاہی قرار دے کر عذر کر دیں گے، اسی کوتاہی کی طرف اشارہ کرنے کیلئے حدیث میں ان کو بلفظ کذبات تعبیر کر دیا گیا جس کا رسول اللہ ﷺ کو حق تھا اور آپ کی حدیث روایت کرنے اور بیان کرنے کی حد تک ہمیں بھی حق ہے مگر اپنی طرف سے کوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یوں کہے کہ انہوں نے جھوٹ بولا یہ جائز نہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے ساتھ سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں قرطبی اور بحر محیط کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن یا حدیث میں جو اس طرح کے الفاظ کسی پیغمبر کے بارے میں آئے ہیں ان کا ذکر بطور تلاوتِ قرآن یا تعلیمِ قرآن یا روایت حدیث کے تو کیا جاسکتا ہے خود اپنی طرف سے ان الفاظ کا کسی پیغمبر کی طرف منسوب کرنا بے ادبی ہے جو کسی کیلئے جائز نہیں۔

حدیثِ مذکور میں ایک اہم ہدایت اور اخلاصِ عمل کی باریکی کا بیان

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جن کذباتِ ثلثہ کا ذکر آیا ہے حدیث میں ان میں سے پہلے دو کے بارے میں تو یہ آیا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے تھے مگر تیسری بات جو حضرت سارہ کے بارے میں کہی گئی اس کو اللہ تعالیٰ کیلئے نہیں فرمایا حالانکہ بیوی کی آبرو کی حفاظت بھی عین دین ہے۔ اس پر تفسیر قرطبی میں قاضی ابوبکر بن عربی سے ایک بڑا نکتہ نقل کیا گیا ہے جس کے متعلق ابن عربی نے فرمایا کہ یہ صلحاء و اولیاء کی کمر توڑ دینے والی بات ہے وہ یہ کہ تیسری بات بھی اگرچہ کام دین ہی کا تھا مگر اس میں کچھ اپنا حظِ نفس بیوی کی عصمت اور حرم کی حفاظت کا بھی تھا، اتنی سی غرض دنیوی شامل ہو جانے کی بنا پر اس کو فی اللہ اور للہ کی فہرست سے الگ کر دیا گیا کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے الا للہ الدین الخالص، یہ معاملہ بیوی کی عصمت کی حفاظت کا اگر ہماری یا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو بلاشبہ اس کو بھی للہ فی اللہ میں شمار کیا جاتا مگر انبیاء علیہم السلام کی عظمتِ شان کا مقام سب سے بلند ہے ان کیلئے اتنا سا حظِ نفس شامل ہوں بھی

Marfat.com

اخلاص کامل کے منافی سمجھا گیا، واللہ اعلم وفقنااللہ للاخلاص فی کل عمل۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

(لاجواب ہوکر) اپنے دلوں میں غور کرنے لگے، پھر بولے بلاشبہ تم ہی ناحق پر ہو۔ ۶۴)

حقیقت کی جھلک

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس چونکا دینے والے طنز نے ان کے دماغ کے تاروں کو شدت سے ہلایا۔ بت پرستی کی عصبیت کے پردوں میں دراڑیں پڑیں۔ دل و دماغ میں بجلی سی کوندگئی۔ متنبہ ہوکے سوچنے لگے کہ یہ نوجوان غلط نہیں کہہ رہا۔ غضب خدا کا ہم نے جنہیں خدائی کے منصب پر بٹھا رکھا ہے وہ یہ بتانے کے قابل بھی نہیں ہیں کہ انہیں اس تباہی سے دوچار کس نے کیا ہے تو وہ ہماری قسمتیں بنانے میں کیا کردار ادا کرسکیں گے۔ ہم اب تک ان کی عقیدت ومحبت میں اندھے ہوکر جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ سراسر ظلم، جہالت اور نادانی تھی۔ ہم نے ہر اس شخص کو ظالم سمجھا جس نے بت پرستی پر تنقید کی اور ان پتھر کے مجسموں کو پتھر کہنے کی جسارت کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ پر ظلم کرتے رہے ہیں۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾

(پھر وہ اوندھے ہوکر (اپنی سابقہ گمراہی کی طرف) پلٹ گئے۔ بولے کہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ ۶۵)

مشکل الفاظ کی تشریح

نَـكَسَ ...... کا معنی کسی چیز کو اس طرح الٹ دینا ہے کہ اس کے پاؤں اوپر ہو جائیں اور سر نیچے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ شرم وخجالت کے مارے ان کے سر جھک گئے، یہ صحیح نہیں۔ اگر یہ کہنا ہوتا تو عبارت اس طرح ہونی چاہیے تھی نَكَسُوْ رُءُوْسُهُمْ لیکن یہاں نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ہے۔ اس کا معنی ہے کہ وہ اپنی مشرکانہ جہالت اور بتوں کی عبادت کی طرف پھر پلٹ گئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے یہی معنی مروی ہے۔ اَدْرَكَهُمُ الشِّقَاءُ فَعَادُوْا اِلٰى كُفْرِهِمْ ''یعنی انہیں ان کی بدبختی نے آلیا اور پھر وہ اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔''

عصبیت جاہلیت بہت بری بلا ہے۔ جس دل اور دماغ پر یہ پنجے گاڑ لیتی ہے اسے ہوش نہیں آنے دیتی اور اگر کبھی اس کی آنکھ کھلتی بھی ہے تو دوسرے ہی لمحے وہ آنکھ بند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بارہا ایسا تجربہ ہوا کہ برادری، پارٹی یا اپنے فرقے کی بعض کمزوریوں کا ادراک شروع ہوا لیکن پھر گروہی تعصبات اور پارٹی مفادات غالب آگئے۔ اقبال نے تو صرف حکمران کی ساحری کی بات کی ہے برسوں کے جمے ہوئے تعصبات کی ساحری بھی اس سے کم نہیں ہوتی۔

نیند سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

Marfat.com

زنجیریں نہ ٹوٹ سکیں

یہ لوگ بھی ایک لمحے کیلئے ہوش میں آئے لیکن دوسرے ہی لمحے نسلوں کے تعصبات ان پر غالب آ گئے اور پھر انہیں باتوں کی جگالی کرنے لگے۔ البتہ! کہنے کو کوئی بات میسر نہ تھی۔ دھیمے ہو کر بولے کہ تم جانتے ہو ہمارے خدا بولا نہیں کرتے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہیں یہ خدا، لیکن قوتِ گویائی سے محروم ہیں۔ جہالت بھی کس قدر تباہ کن شے ہے اور جاہلیت کا تعصب اس سے بھی بڑی مصیبت ہے۔ ان بتوں کو خدا بنا دیتا ہے جو بولنے سے بھی محروم ہیں۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾

(آپ نے فرمایا کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ تمہیں کوئی ضرر پہنچا سکتی ہیں۔ ٦٦)

حضرت ابراہیمؑ کا بھرپور وار

مشرکین کے اس اعتراف کے بعد کہ یہ بول نہیں سکتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک بھرپور وار کیا اور ایک ضرب کاری لگائی کہ نادانو! تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہو جو نہ تم کو نفع پہنچا سکیں اور نہ کوئی نقصان۔ کسی کی پرستش کرنا کوئی فیشن تو نہیں۔ یہ تو کسی کی عظمت کے سامنے اپنے آپ کو ڈھیر کر دینا۔ کسی کی قدرت کے سامنے اپنی عاجزی کا اعتراف کرنا، کسی کی بڑائی کے سامنے اپنی کمتری کا اقرار کرنا ہے۔ کسی احسن، انفع اور اکمل ذات کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا ہے اور تم اپنا یہ سرمایہ ان کے سامنے ڈھیر کر چکے ہو جو بولنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾

(تُف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ ٦٧)

اُفٍّ لَّكُمْ ...... اظہار بیزاری اور نہایت شدید نفرت و کراہت کا کلمہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ کوئی دلیل ان پر کارگر نہیں ہو رہی۔ اور اپنی جہالت اور گمراہی پر کوئی دلیل بھی ان کے پاس نہیں تو آپؑ نے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ تُف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر۔ ایسا لگتا ہے کہ تم عقل سے بالکل ہی پیدل ہو۔ اگر تم میں ذرا بھی عقل ہوتی تو تم اس بات کو ضرور سمجھ لیتے کہ پتھر کی مورتیاں بھی کیا پرستش کے قابل ہوتی ہیں۔ جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی حفاظت تو کیا کرتیں اپنی بپتا بھی کسی کو نہ سنا سکیں تو ایسی بیکار چیزیں کسی جگہ کا بوجھ تو ہو سکتی ہیں عزت و افتخار کے منصب کی اہل نہیں ہو سکتیں۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾

(سب یک زبان ہو کر بولے) جلا ڈالو اس کو اور مدد کرو اپنی خداؤں کی اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو۔ ٦٨)

Marfat.com

حضرت ابراہیمؑ کیلئے سزا کا اعلان

اہلِ باطل اور اربابِ اقتدار کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ جب وہ دلائل کی جنگ ہار جاتے ہیں تو پھر تشدد پر اتر آتے ہیں بالخصوص ان کا مذہبی طبقہ جب اپنی پیشوائی کو خطرے میں دیکھتا ہے تو پھر وہ برہنہ طاقت بن کر میدان میں آ جاتا ہے۔ یہاں چونکہ اقتدار اور مذہبی اجارہ دار ملی بھگت سے اس ملک پر حکومت کر رہے تھے، ان کیلئے یہ بات انتہائی تشویشناک تھی کہ ان کی سیادت و امارت اور تختِ اقتدار غیر اللہ کی پرستش کے جن تصورات پر قائم ہے اسے کوئی نقصان پہنچے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت میں جب انہوں نے ان بنیادی تصورات کی مخالفت دیکھی تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ ہمارے پاؤں تلے سے زمین ہلنے لگی ہے اور ایک نوجوان ہماری سیادت و امارت کو چیلنج کر رہا ہے۔ اب ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ اپنے تحفظ و بقاء کیلئے اس زبان کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیں جس سے وہ خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ سب بیک زبان چلا اٹھے اس شخص کو پکڑ واور اسے جلا دو اور اس طرح سے اپنے خداؤں کے بارے میں جو خطرات لاحق ہو رہے ہیں ان کا سدِ باب کر دو۔ چنانچہ حکم دے دیا گیا کہ آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن کر واور عام لوگوں کے سامنے اسے ایک مذہبی ضرورت اور اپنے مزعومہ مذہب کی بقاء کی جنگ کے طور پر پیش کرو۔ عوام تو ایسی باتوں سے دیوانگی کی حد تک برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر شخص نے اسے اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔ لکڑیوں کے گٹھے اٹھا کے لائے اور اس میدان میں ڈھیر کرتے چلے گئے جہاں الاؤ جلانا تھا۔ بالآخر لکڑیوں کے اس انبار کو آگ لگائی گئی۔ اس حد تک اس کے شعلے بھڑکے کہ اس کے قریب جانا ناممکن ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینکنے کیلئے منجنیق تیار کی گئی۔ جب یہ ساز وسامان ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس حال میں قید خانے سے نکالا گیا کہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ جب انہیں منجنیق میں رکھ کر پھینکا جانے لگا تو عالمِ بالا میں قیامت برپا ہو گئی۔ الٰہی! تیری اس بھری دنیا میں صرف ایک ابراہیم ہے جو تیرا نام لیتا ہے اور تیری توحید کا پرچم سربلند کرنا چاہتا ہے۔ کیا زمین میں اس کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ ایسا جرم ہے کہ اس کی پاداش میں اس کو جلا دینا چاہئے۔ یہی تو ایک شمع ہے جس نے کفر کی تاریکیوں میں روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ بجھ گئی تو تیرا نام لیوا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔ بارگاہِ ایزدی سے حکم ہوا کہ ملاءِ اعلیٰ کے رہنے والو! تمہیں ابراہیم کی مدد کرنے کی اجازت ہے۔ سب اپنی درخواست لے کر پہنچے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت استغنا سے کسی کی بھی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے کہ خلیل! میں ہر حکم کی تعمیل کیلئے حاضر ہوں، آپ چاہیں تو میں اس آتش کدے کو بجھا دوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ میرے حال سے واقف ہے یا نہیں؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا وہ تو سب سے واقف ہے۔ فرمایا پھر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ حضرت جبرائیلؑ نے درخواست کی کہ اپنے رب سے اپنے بچاؤ کی دعا کیجئے۔ اس پیکرِ تسلیم و رضا نے جواب دیا حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُہٗ بِحَالِیْ جب وہ میرے حال کو جانتا ہے تو مجھے درخواست کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کے ہر فیصلے کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ اقبال نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرزِ عمل کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی

یقیں اللہ مستی خود گزینی

Marfat.com

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾ وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ ﴿۷۰﴾

(ہم نے حکم دیا، اے آگ! تو ابراہیم کیلئے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔ ۶۹) انہوں نے تو ابراہیم کو گزند پہنچانے کا ارادہ کیا لیکن ہم نے ان کو ناکام بنادیا۔ ۷۰)

آگ حضرت ابراہیمؑ کیلئے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی

انہوں نے جیسے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے ذریعے آگ میں پھینکا، اللہ تعالیٰ نے دہکتے انگاروں اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کو حکم دیا، خبردار! میرے خلیل کا بال بیکا نہ ہو۔ اے آگ! ابراہیم کیلئے ٹھنڈی ہو جا، لیکن اتنی ٹھنڈی نہ ہو کہ اسے ٹھنڈک سے نقصان پہنچے۔ اس کیلئے سلامتی بن جا۔ قرآنِ کریم نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ آگ کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے سلامتی کا باعث بنی۔ لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ شعلے بجھ گئے، آگ ٹھنڈی ہوگئی اور آپؑ بتمام و کمال خیریت کے ساتھ آگ کے الاؤ سے نکل آئے۔ رہی یہ بات کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟ اس کا جاننا یقیناً اس شخص کیلئے مشکل ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور پیغمبر کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن جو شخص اس پر ایمان رکھتا ہے کہ اشیاء کے خواص واثرات تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ چاہے تو زہر کو تریاق بنادے اور چاہے تو تریاق کو زہر میں تبدیل کردے۔ اس کیلئے بحر قلزم کی موجوں کو روک دینا اور حضرت خلیل کے ہاتھ میں تیز چھری کا کند کر دینا کوئی مشکل نہیں۔ اس کا حکم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کی قدرت کے تصرفات کو چونکہ ہم دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہی تصرفات ہم پہلی دفعہ دیکھتے تو یقیناً ہماری حیرت ہمارے لئے پریشانی کا باعث ہو جاتی۔ آگ کا سلامتی بن جانا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوا اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

دشمن نے یہ چاہا تھا کہ ہم ابراہیم کو آگ میں جلا کر توحید کی اس آواز کو ہمیشہ کیلئے خاموش کردیں گے اور اس کے نتیجے میں بت پرستی اپنا آپ منوانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر کو ان پر الٹ دیا۔ آگ کا جو الاؤ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کو ناکام کرنے کیلئے جلایا تھا وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صداقت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعلان بن گیا۔

وَ نَجَّیْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾

(اور ہم نے حضرت ابراہیم کو اور حضرت لوط کو نجات دی اس سرزمین کی طرف جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا تمام جہان والوں کیلئے۔ ۷۱)

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

بت کدے کے پجاری، پروہت اور اربابِ اقتدار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے میں ناکامی سے کوئی سبق سیکھنے کی بجائے زخمی سانپ کی طرح پہلے سے بھی زیادہ زہر اگلنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کفر کی اتنی بڑی ناکامی اور حق کی اتنی بڑی فتح اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لوگ جبر واستبداد اور صدیوں کی عصبیت کی وجہ سے بولنے کی ہمت تو نہیں کریں گے لیکن ان کے احساس میں ایک شعلہ سا ضرور بھڑکے گا کہ اگر

Marfat.com

ابراہیم سچائی پر نہ ہوتے تو اتنا بڑا الاؤ ان کیلئے سلامتی نہ بنتا۔کوئی تعجب نہیں کہ یہی احساس کا شعلہ آنے والے دنوں میں بت پرستی کو بھسم کرنے کا باعث بن جائے۔ چنانچہ انہوں نے شہر میں ایسے حالات پیدا کر دیئے اور بادشاہ کو مجبور کر دیا کہ یہ نہایت خطرناک شخص ہے اسے ہر ممکن طریقے سے ختم کر دینا چاہئے۔ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ابراہیم کو ہجرت کا حکم دیا اور وہ حضرت لوط کو ساتھ لے کر اس سرزمین کی طرف ہجرت کر گئے جسے ہم نے برکت دے رکھی ہے۔بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بھائی تھے، نحور اور حاران۔ حضرت لوط علیہ السلام حاران کے بیٹے تھے۔(پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۶) سورۂ عنکبوت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو تذکرہ آیا ہے اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوط ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ملاحظہ ہو آیت ۲۶ اور پھر آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا۔ برکت والی سرزمین سے مراد شام اور کنعان کی سرزمین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زرخیزی اور شادابی عطا فرمائی ہے اور ساتھ ساتھ روحانی برکات سے بھی نوازا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد متعدد نبی وہاں مبعوث ہوئے۔اس سرزمین نے ان کے خیر و برکت سے فائدہ اٹھایا اور آج کتنے انبیائے کرام وہاں مدفون ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾

(اور ہم نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسحاق عطا کئے اور مزید براں یعقوب دیئے اور ہم نے سب کو نیک بخت کیا۔ ۷۲)

حضرت ابراہیمؑ پر افضال وعنایات کی بارش

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنے وطن سے ہجرت فرمائی اور توحید کی جس دعوت کو ان کے اپنے برداشت نہ کر پائے اسے لے کر کنعان میں پہنچے اور پھر نہ جانے کس کس ملک اور کس کس شہر میں اس امانت کا حق ادا کرنے کیلئے مسلسل سفر کی صعوبتیں اٹھاتے اور لوگوں کی مخالفتیں برداشت کرتے رہے اور اس سفر میں حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی آپؑ کے ساتھ نہ تھا۔اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر نہ صرف آپؑ کا وطن چھوٹا بلکہ اپنی قوم اور اپنے بھائی بند بھی چھوٹ گئے۔اور دنیا میں اپنے بھتیجے کے سوا کوئی اپنا نہ رہا۔اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی تنہائی کو محسوس فرمایا اور محض اپنے فضل و کرم سے آپؑ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسا عظیم فرزند عطا فرمایا۔اور جب حضرت اسماعیل کی بھی قربانی مانگ لی گئی اور آپؑ نے نہایت وفا شعاری اور حوصلہ مندی کے ساتھ بیٹے کی گردن پر بھی چھری پھیرنے میں تامل نہ کیا تو تب اس کے انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام جیسی نعمتیں عطا فرمائیں۔مقصود تو حضرت اسحاقؑ کو عطا کرنا تھا اور وہ اس عمر میں آپؑ کے گھر میں تولد ہوئے جبکہ آپؑ کی اہلیہ محترمہ بڑھاپے کا شکار ہو کر بانجھ ہو چکی تھی اور خود آپؑ بھی باپ بننے کی عمر سے گزر چکے تھے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بڑھاپے میں صرف بیٹا ہی عطا نہیں فرمایا بلکہ اس پر بھی مزید کرم فرماتے ہوئے حضرت یعقوب کا انعام بھی بخشا۔اس لئے اس کو نافلہ کے لفظ سے یاد فرمایا جس کا معنی ہوتا ہے،زائد۔اور شاید اس میں اطمینان اور خوشی کا یہ پہلو بھی تھا کہ ہم نے آپ کو اسماعیل کے بعد جو اسحاق جیسا بیٹا عطا فرمایا ہے تو آپ اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو لمبی عمر عطا فرمائے گا کیونکہ اس کیلئے ہم نے یعقوب کو بھی مقدر کر دیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عزیز و اقرباء سے دور ہو کر یقیناً تنہائی محسوس کرتے اور ملول رہتے ہوں گے۔اللہ تعالیٰ نے اس تنہائی کو باغ و بہار بنا دیا اور ان نابکار و ناہنجار عزیزوں کی صحبت سے محروم کر کے وہ اولاد عطا فرمائی جو صالحین اور اخیار میں سے تھے اور پھر ایسا نہیں کہ

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صرف صالح اولاد دی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر میں نبوت بھی رکھی۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کو بھی نبی بنایا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی نبوت عطا فرمائی اور پھر اس خاندان سے نبوت کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ صدیوں تک اسی خاندان سے نبی اٹھائے جاتے رہے تا آنکہ نبی کریم ﷺ پر نبوت اور رسالت ختم کر دی گئیں۔ اور آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری شاخ یعنی بنی اسماعیل میں سے اٹھائے گئے اور اس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خیر و اصلاح اور نبوت و رسالت کا سرچشمہ بنا دیا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝٧٣

(اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انہیں بھلائی کے کام اور نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت کی، اور وہ ہماری ہی بندگی کرنے والے تھے۔ ٧٣)

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا مزید کرم یہ ہوا کہ انہیں جو اولاد عطا فرمائی انہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا امام بنایا۔ مشرقِ وسطیٰ اور بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کے دین کی رہنمائی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کی قیادت و امامت انہیں لوگوں کے سپرد کی گئی۔ حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام اپنے دور میں اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والوں کے امام تھے اور ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل جیسی امت اٹھائی جس نے صدیوں تک اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کا فرض انجام دیا۔

یوں تو ہر پیغمبر ان لوگوں کیلئے امام ہوتا ہے جن کی طرف وہ مبعوث کیا جاتا ہے، لیکن ایسے پیغمبر بھی دنیا میں تشریف لائے ہیں جن پر ایک شخص بھی ایمان نہیں لایا، لیکن حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام وہ خوش بخت پیغمبر ہیں جن کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے امتیں اٹھائیں۔ جب تک یہ دنیا میں رہے اللہ تعالیٰ کے حکم اور توفیق سے بھلائیوں کو فروغ دیتے رہے۔ جسم و جان اور مال و دولت میں اللہ تعالیٰ سے وفاداری کے اظہار کی جامع ترین صورتیں نماز اور زکوٰۃ ہیں۔ اس لئے بطورِ خاص ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عظیم رسول نماز کا اہتمام کرتے اور نظامِ زکوٰۃ قائم کرتے رہے اور ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ان کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا ایک ایک شمہ اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت و اعانت اور سربلندی میں صرف ہوتا رہا ہے کیونکہ وہ از اول تا آخر اللہ تعالیٰ ہی کے عبادت گزار اور فرمانبردار تھے۔ نہ کسی اور کے سامنے انہوں نے سر جھکایا اور نہ کسی اور کیلئے اپنا مال و دولت صرف کیا۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝٧٤ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝٧٥

(ہم نے حضرت لوط کو قوتِ فیصلہ اور علم کی نعمت عطا فرمائی اور ہم نے انہیں اس بستی سے نجات دی جس بستی کے رہنے والے خبائث کا ارتکاب کرتے تھے، وہ لوگ تھے ہی نافرمان۔ ٧٤) اور ہم نے لوط کو خاص اپنی رحمت میں داخل کیا، بیشک وہ نیک بختوں میں سے تھے۔ ٧٥)

Marfat.com

حضرت لوط علیہ السلام پر عنایات

حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر سابقہ آیت کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے آیا تھا اور اب ان کا مستقل ذکر کیا جا رہا ہے لیکن نہایت اختصار کے ساتھ۔ کیونکہ اس سے پہلے کسی قدر تفصیل سے بعض مواقع پر ان کا ذکر آ چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کے امتی کی حیثیت سے ہجرت کرنے کی توفیق بخشی تھی، لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم اور علم سے نوازا، یعنی ان کو نبوت عطا فرمائی اور قوتِ فیصلہ سے مشرف فرمایا۔ اور انہیں ایک علاقے کی طرف مبعوث کیا جو بحر مردار کے قریب تھا اور بعض روایات کے مطابق وہ سات بستیوں یا شہروں پر پھیلا ہوا تھا اور ان میں بڑی بستی کا نام سدوم تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے برسوں تک ان کی اصلاح کیلئے کوششیں کیں لیکن وہ لوگ ایسے پاجی واقع ہوئے تھے کہ لواطت جیسے خلافِ فطرت فعل کے ایسے رسیا تھے کہ انہوں نے اس حوالے سے شرم و حیاء کا ہر ٹانکا توڑ ڈالا تھا۔ ممکن ہے اسی ام الذنوب کو یہاں خبائث سے تعبیر کیا گیا ہو کیونکہ یہ ایک ایسی برائی ہے جو اپنے ساتھ کئی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت خبیث کی نہیں خبائث کی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس خباثت کے ساتھ ساتھ ان کے اندر اور بھی بڑی بڑی برائیاں پائی جاتی تھیں جن میں قرآنِ کریم میں قطع سبیل کے نام سے ایک برائی کا ذکر فرمایا گیا ہے اور بعض روایات میں اور بھی برائیوں کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ گناہوں کی دلدل میں اس طرح دھنسے ہوئے تھے کہ انسانیت کی کوئی سی خوبی ان میں باقی نہیں رہی تھی۔ جب انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی اصلاح کی کاوشوں کو قبول کرنے کی بجائے سرکشی اور تمرد کا راستہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب بھیجا۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کو اس عذاب سے محفوظ فرمایا اور ان نابکار اور نافرمان لوگوں کی رفاقت سے نجات بخشی اور آپؑ کو اپنی رحمت میں داخل فرما دیا۔ اس سے مراد دنیا میں آپؑ کی نجات و فلاح بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آخرت میں جو آپؑ کو کامیابی ملنے والی ہے اس کی طرف اشارہ ہو۔

قرطبی نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ کو سات بستیوں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا، ان میں سے چھ بستیوں پر اللہ کا عذاب آیا اور ان کو تہ و بالا کر دیا گیا۔ البتہ ایک بستی کو بچا لیا گیا اور اس میں حضرت لوط علیہ السلام اور آپؑ کے متعلقین اور آپؑ پر ایمان لانے والوں کو سکونت کی سعادت بخشی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کو رحمت میں داخلے سے تعبیر کیا گیا ہو۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ
فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ
الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿٧٧﴾ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ
نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿٧٨﴾
فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ

Marfat.com

دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَعَلَّمْنٰهُ
صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْۚ فَهَلْ اَنْتُمْ
شٰكِرُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى
الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَاؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿٨١﴾ وَ
مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ
ذٰلِكَۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٨٢﴾ۙ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ
مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٨٣﴾ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا
مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً
مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ
وَذَا الْكِفْلِؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ۚۖ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَاؕ
اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ
اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ
سُبْحٰنَكَۖۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗۙ وَنَجَّيْنٰهُ
مِنَ الْغَمِّؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾ وَزَكَرِيَّاۤ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ
رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ
وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ

Marfat.com

فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾
وَالَّتِىْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا
وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا
رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع

رکوع: ۶۔ (اور حضرت نوح کو بھی ہم نے ہدایت بخشی، یاد کرو جب انہوں نے دُعا کی اس سے پہلے، تو ہم نے ان کی دُعا قبول کی پھر نجات دی ہم نے آپ کو اور آپ کے اہل کو عظیم مصیبت سے۔ ۷۶) اور ہم نے ان کی حمایت کی اس قوم کے مقابلہ میں جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا، بیشک وہ نہایت ہی برے لوگ تھے، پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔ ۷۷) اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان پر بھی ہم نے اپنا فضل کیا، یاد کرو جب وہ دونوں ایک کھیتی کے مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے جبکہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں شب میں جا پڑی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ ۷۸) سو ہم نے سمجھا دیا وہ معاملہ سلیمان (علیہ السلام) کو اور ہم نے ان سب کو بخشا تھا حکم اور حلم، اور ہم نے مسخر کر دیا تھا داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو، وہ سب ان کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے تھے اور یہ سب کچھ ہم ہی کرنے والے تھے۔ ۷۹) ہم نے انہیں تمہارے لئے ایک خاص جنگی لباس کی صنعت سکھائی تا کہ وہ تم کو جنگ میں محفوظ رکھے، تو کیا تم شکر ادا کرنے والے ہو۔ ۸۰) اور ہم نے سلیمان کیلئے تند و تیز ہوا کو مسخر کر دیا جو ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جسے ہم نے برکت دی ہے، اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔ ۸۱) اور شیاطین میں سے بھی ہم نے اس کیلئے مسخر کر دیئے تھے جو ان کیلئے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے اور ہم ہی ان کے نگہبان تھے۔ ۸۲) اور یاد کرو ایوب کو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے اور تو رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ ۸۳) تو ہم نے ان کی فریاد قبول فرمائی اور ہم نے ان کی تکلیف دور کر دی اور انہیں ان کے اہل و عیال بھی دیئے اور ان کے مانند ان کے ساتھ اور بھی، خاص اپنے فضل سے، اور عبادت گزاروں کی یاد دہانی کیلئے۔ ۸۴) اور یاد کرو اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل (علیہم السلام) کو، یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ ۸۵) اور ہم نے ان کو اپنی خاص رحمت میں داخل کیا، بیشک وہ نیکوکاروں میں سے تھے۔ ۸۶) اور یاد کرو مچھلی والے کو جبکہ وہ قوم سے برہم ہو کر چل کھڑا ہوا اور یہ خیال کیا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے، پھر اس نے تاریکیوں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بیشک میں ہی قصورواروں سے ہوں۔ ۸۷) پس ہم نے ان کی پکار کو قبول فرمالیا اور ہم نے انہیں غم سے نجات دے دی اور ہم اسی طرح اہلِ ایمان کو نجات دیتے ہیں۔ ۸۸) اور زکریا کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ اور تو بہترین وارث ہے۔ ۸۹) تو ہم نے اس کی دُعا

Marfat.com

قبول کی اور ہم نے اس کو یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کیلئے سازگار کر دیا، بیشک یہ لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والے اور امید و بیم میں ہمیں پکارنے والے اور ہمارے ہی سامنے عجز و نیاز کرنے والے تھے۔ ۹۰) اور یاد کرو اس پاکدامن بی بی کو جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا، تو ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا والوں کیلئے (اپنی قدرت کی) نشانی بنا دیا۔ ۹۱) یہ تمہاری امت، ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمہارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو۔ ۹۲) (اور انہوں نے اپنا دین پارہ پارہ کر ڈالا، ہر ایک کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔ ۹۳)

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿٧٦﴾

(اور حضرت نوح کو بھی ہم نے ہدایت بخشی، یاد کرو جب انہوں نے دُعا کی اس سے پہلے، تو ہم نے ان کی دُعا قبول کی پھر نجات دی ہم نے آپ کو اور آپ کے اہل کو عظیم مصیبت سے۔ ۷۶)

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ

جس طرح ہم نے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت لوط علیہم السلام کو اپنی ہدایت سے نوازا اور انہیں نبوت عطا فرمائی، اسی طرح ہم نے ان سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو بھی ہدایت دی تھی۔ ان کے ساتھ بھی ان کی قوم نے وہی کچھ سلوک کیا جیسے ہر نبی اور رسول کی قوم نے ہر نبی اور رسول کے ساتھ کیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جس قدر طویل مدت تک تبلیغ دعوت کا فرض انجام دیا اور آپؑ کی قوم نے بے پناہ مصائب سے آپؑ کو دوچار کئے رکھا۔ یہ آپؑ کی ایک ایسی انفرادیت ہے جس میں کوئی اور رسول آپؑ کا شریک و سہیم نہیں۔ کسی اور رسول کو ساڑھے نوسو سال تک اس کٹھنائی سے گزرنا نہیں پڑا۔ چند سالوں کی اذیتیں انسان کو ہلا کے رکھ دیتی ہیں۔ چہ جائیکہ نوصدیوں تک ایک داعی الی الحق دعوت کا فرض انجام دے اور اس کی پاداش میں گوناگوں مصائب کا شکار رہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو کس کینڈے سے پیدا کیا تھا اور صبر و استقامت کی کتنی بڑی مقدار آپؑ کو عطا کی تھی، لیکن جب اس قدر طویل مدت تک بھی آپؑ کی قوم کے دل نہ پسیجے اور انہوں نے آپؑ کی دعوت کو قبول کرنا تو دور کی بات ہے اپنے رویئے پر نظر ثانی کرنا بھی برداشت نہ کیا تو تب حضرت نوح علیہ السلام نے محسوس کیا کہ اتمام حجت میں کوئی کمی باقی نہیں رہ گئی۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہدایت اس قوم کی قسمت میں نہیں۔ چنانچہ آپؑ نے دُعا کا دامن اپنے رب کے سامنے پھیلا دیا۔ اور جس طرح اپنا دل اپنے رب کے سامنے کھول کے رکھا اس کا تفصیلی ذکر تو ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ نوح میں آئے گا یہاں ہم صرف اس سلسلہ کی آخری آیات کا ذکر کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ○ فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ○ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ○ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○

پس قوم نوحؑ کے لوگ اپنے جرموں کی پاداش میں غرق کر دیئے گئے اور آگ میں داخل کئے گئے اور وہ خدا کے مقابل میں اپنے لئے کوئی مددگار نہ پا سکے۔ اور نوحؑ نے دُعا کی کہ اے میرے رب! تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک کو بھی چلتا پھرتا نہ چھوڑ۔ اگر

Marfat.com

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝ (نوح: ۲۸.۲۵)

تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف نابکاروں اور ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔ اے میرے رب! میری اور میری والدین کی مغفرت فرما اور ان کی جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہو جائیں۔ اور تمام مومنین و مومنات کی اور ظالموں کیلئے صرف تباہی میں اضافہ کر۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ ...... اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دُعا کو قبول فرمایا اور آپؑ کی دُعا کے مطابق آپؑ کی قوم پر وہ عذاب بھیجا جس نے ان کی جڑ کاٹ کے رکھ دی اور ان کی تباہی اور بربادی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور آپؑ کے اہل کو کربِ عظیم سے نجات عطا فرمائی۔ اہل سے مراد آپؑ کے اہلِ خانہ بھی ہیں اور آپؑ پر ایمان لانے والے بھی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ آپؑ کے اہلِ خانہ میں سے بھی انہیں نجات عطا فرمائی جو آپؑ پر ایمان لا چکے تھے اور آپؑ کا وہ بیٹا جسے کنعان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس نے اپنے باپ پر ایمان نہ لا کر تباہی کو دعوت دی اور اس حد تک قوتِ ادراک سے محروم ہوا کہ یہ بھی نہ جان سکا کہ یہ کوئی بارش نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور اپنے پدرِ بزرگوار کی پیار بھری دعوت کے باوجود آپؑ کے ساتھ کشتی پر سوار ہونے سے انکار کر دیا اور یہ سمجھا کہ میں اپنے تومند جسم سے کام لے کر پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا تو یہ پانی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے پانی کی ایک موج اٹھی اور بیٹا باپ کی آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو اس میں ایمان کے سوا کوئی اور قوت بچانے والی نہیں ہوتی۔ جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی دستگیری کرتی ہے۔ چنانچہ اس عذاب سے اور اس کربِ عظیم سے جس میں صدیوں سے حضرت نوح علیہ السلام اور آپؑ پر ایمان لانے والے مبتلا تھے اس سے اللہ تعالیٰ نے نجات دے دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس کرب وبلا سے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والے کفارِ مکہ کے ہاتھوں دوچار کئے جا رہے تھے اسی اذیت رسانی میں حضرت نوح علیہ السلام اور آپؑ پر ایمان لانے والے مبتلا کئے گئے تھے اور صدیوں سے اس عذاب کو برداشت کر رہے تھے۔ قوم کی تباہی اور اس عذاب سے ان کی جان چھوٹی۔

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۷۷

(اور ہم نے ان کی حمایت کی اس قوم کے مقابلہ میں جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا، بیشک وہ نہایت ہی برے لوگ تھے، پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔ ۷۷)

حضرت نوح علیہ السلام کا انجام

معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح کی اذیت رسانیوں سے حضرت نوح علیہ السلام اور آپؑ پر ایمان لانے والے انتہائی ناگفتہ بہ حالت سے گزر رہے تھے۔ صدیوں تک قوم نے جنہیں اپنی ستم رانیوں کا نشانہ بنا رکھا تھا یقیناً ان کے کاروبار تباہ ہو چکے ہوں گے۔ جان و تن کا رشتہ قائم رکھنا ان کیلئے مشکل ہو رہا ہوگا۔ وہ اس قدر کمزور کئے جا چکے ہوں گے کہ وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی اذیتوں کی بھٹی سے نکلنے پر قادر نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضل و کرم سے ان کی نصرت فرمائی اور انہیں اس طرح ان کے چنگل سے نکالا جس کا تصور بھی دور دور تک مشکل تھا اور قومِ نوح نے چونکہ اپنے کفر و شرک اور بد اعمالیوں کے باعث فسق و فجور کو انتہا تک پہنچا دیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی زمین کو فساد سے بھر دیا تھا۔ اب

Marfat.com

ضرورت اس بات کی تھی کہ اس زمین کو ان کے شر و فساد سے پاک کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام اس طرح فرمایا کہ زمین کے سمندروں اور آسمان کے بادلوں کو حکم دیا چنانچہ ہر طرف سے پانی برسا اور زمین سے پانی ابلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ بھی پانی میں چھپ گئے اور حضرت نوح علیہ السلام کا سفینہ نجات کا سفینہ بن کر پانی کی سطح پر تیرتا ہوا جودی پہاڑ پر جا کر رک گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اصحاب ایمان کو ظالموں کے ظلم سے بچایا اور زمین کی مکمل تطہیر کا انتظام کیا اور اس قوم کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ان پر ظلم نہ تھا بلکہ انہوں نے اپنے فسق و فجور سے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر دیا تھا۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿٧٩﴾

(اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان پر بھی ہم نے اپنا فضل کیا، یاد کرو جب وہ دونوں ایک کھیتی کے مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے جبکہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں شب میں جا پڑی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ ۷۸) سو ہم نے سمجھا دیا وہ معاملہ سلیمان (علیہ السلام) کو اور ہم نے ان سب کو بخشا تھا حکم اور علم، اور ہم نے مسخر کر دیا تھا داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو، وہ سب ان کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے تھے اور یہ سب کچھ ہم ہی کرنے والے تھے۔ ۷۹)

مشکل الفاظ کی تشریح

دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ ...... دونوں منصوب ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں سے پہلے کوئی فعل محذوف ہے جس کے یہ مفعول ہیں۔ یہاں سخرنا یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف مانا جا سکتا ہے۔

نفش ...... کا معنی بکریوں یا مویشیوں کا رات کے وقت کسی فصل میں گھس جانا اور اسے اجاڑ دینا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک مقدمے کی طرف اشارہ

اس آیت کریمہ سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا ذکر شروع ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جن کمالات سے نوازا اور ان پر جو احسانات کئے ان میں سے چند ایک کا اجمالاً تذکرہ کیا گیا ہے۔ کمالات اور احسانات کا ذکر کرنے سے پہلے نہایت اختصار سے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے تمام کمالات اور فضائل کے باوجود اپنی طبیعت میں ایسی سلامتی رکھتے تھے کہ بیٹا اپنے فہم و فراست کو اللہ تعالیٰ کی عنایت اور امانت سمجھ کر اپنے جلیل القدر باپ کے سامنے نہایت احتیاط سے اظہار ضروری سمجھتا تھا اور باپ اپنے تمام کمالات کے باوصف نوخیز اور نوعمر بیٹے کی بات کو کما حقہ وزن دیتا تھا اور دونوں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے تھے۔ باپ خوش تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا سعادت مند بیٹا عطا فرمایا ہے اور بیٹا ہر وقت مستعد تھا کہ مجھے

Marfat.com

اپنے باپ کے فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کس طرح حصہ لے کر اپنے باپ کیلئے سہولت پیدا کرنا ہے۔

جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے نہ تو قرآنِ کریم میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اور نہ حدیثِ رسول ﷺ میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ البتہ! کتبِ تفسیر میں اس واقعہ کی جو تفصیل مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص کی بکریاں رات کے وقت کسی شخص کے کھیت میں گھس گئیں اور اسے پامال کر ڈالا۔ کھیت والا دادرسی کیلئے حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؑ نے بکریوں کے مالک کو بلایا، دونوں کے بیان لئے۔ بیان سن کر آپؑ اس نتیجے پر پہنچے کہ بکریوں کے مالک نے اپنی بکریوں کا ریوڑ سنبھالنے میں کوتاہی کی ہے اور کھیت والے کی فصل اجاڑ دی ہے۔ اب اس کا تاوان یہ ہے کہ بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں کیونکہ کھیت والے کا جتنا نقصان ہوا ہے بکریوں کی قیمت اندازاً اس کے لگ بھگ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جو نوعمری کی وجہ سے ابھی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے البتہ اپنے عظیم باپ کے پاس بیٹھ کر علم وحکمت سے استفادہ کرتے تھے۔ انہوں نے یہ فیصلہ سن کر کمسن ہونے کے باوجود اس سے اختلاف کیا اور نہایت ادب سے عرض کی کہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں اس کا ایک دوسرا حل تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ آپؑ نے یہ کہا کہ بکریاں عارضی طور پر کھیت والے کو دے دی جائیں، وہ ان کا دودھ پیئے اور دوسرے فوائد حاصل کرے اور بکریوں والے کو حکم دیا جائے کہ وہ اجڑے ہوئے کھیت میں محنت کرے اور نئے سرے سے فصل کاشت کرے اور جب وہ پروان چڑھ کر اپنی اصل حالت پر آ جائے تو کھیت والے کو اس کا کھیت دے دیا جائے اور بکریوں کے مالک کو اس کی بکریاں واپس کر دی جائیں۔ یہ فیصلہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام کو حد درجہ خوشی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے ایسا ہونہار فرزند عطا فرمایا ہے۔

پروردگار نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ سلیمان (علیہ السلام) نے جو کچھ کہا وہ ان کی اپنی فہم وفراست کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ ہماری عطاو بخشش تھی۔ حکم اور علم دونوں کو یکساں عطا کیا گیا تھا، یعنی دونوں باپ اور بیٹا بیک وقت پیغمبر بھی تھے اور حکمران بھی لیکن یہ ہماری دَین ہے کہ ہم حکمت عطا کرنے میں بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہم نے فہم وفراست میں حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا اپنے بیٹے کی بات کو نہایت خوشی سے قبول کرنا دراصل اس بات کا اظہار تھا کہ وہ فیصلہ کرنے میں حد درجہ محتاط واقع ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی انسان ہوتے ہیں، وہ جب کسی معاملے میں فیصلہ اجتہاد سے کرتے ہیں تو اس میں فروگزاشت کا امکان ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو غلطی پر باقی نہیں رہنے دیتا۔ وحی کے ذریعے اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ میرے بیٹے کو بھی چونکہ اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی ہے ممکن ہے اس کا فیصلہ وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہو اور اس کے ذریعے سے میری اجتہادی غلطی کی اصلاح مقصود ہو۔

اس فیصلے اور واقعہ کی تفصیل چونکہ قرآن وسنت میں مذکور نہیں اس لئے ہمارے فقہائے کرام نے اسے اپنے فیصلوں کی بنیاد نہیں بنایا۔ البتہ! ترمذی شریف میں ایک حدیث میں ایک صاحب کی شکایت بیان کی گئی ہے جسے کسی دوسرے صاحب کے جانور نے نقصان پہنچایا تھا اور یہ واقعہ چونکہ رات کے وقت پیش آیا تھا اس لئے نبی کریم ﷺ نے اپنا فیصلہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دن کے وقت بعض دفعہ مویشی کھلے ہوتے ہیں لیکن رات کے وقت حفاظت کیلئے باندھ کے رکھے جاتے ہیں۔ کسی جانور کا رات کے وقت نقصان پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مالک نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے اس لئے اس پر نقصان کا تاوان عائد کیا جانا چاہیے۔ امام شافعیؒ نے اس سے یہ سمجھا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فیصلہ چونکہ رات کے حوالے سے کیا ہے اس لئے رات کے وقت نقصان کے ازالے کیلئے مویشی کے مالک پر تاوان

Marfat.com

عائد کیا جائے گا، البتہ دن کو نہیں۔ لیکن امام حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تاوان کا تعلق رات یا دن سے نہیں بلکہ مالک کی تقصیر سے ہے وہ جس وقت بھی کوتاہی کرے اسے اس کی سزا ملنی چاہئے۔ یہ اتفاق ہے کہ واقعہ مذکورہ کا تعلق رات کے وقت سے ہے اور رات کو عام طور پر جانور باندھے جاتے ہیں لیکن اگر دن کے کسی وقت میں مالک کی کوتاہی سے کسی کو نقصان پہنچتا ہے تو جرمانہ اسے بھی ادا کرنا ہوگا۔

عدالتی فیصلوں کے بارے میں ہمارے اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ اگر عدالت کے دو فیصلے باہم متضاد ہوں لیکن فیصلہ دینے والے دونوں قاضی قضا کی صلاحیت رکھتے ہوں اور کوئی شخص بھی نیت میں خرابی نہ رکھتا ہو تو دونوں فیصلے متضاد ہونے کے باوجود بر سرِ حق سمجھے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں یقیناً دونوں میں سے ایک ہی صحیح ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کسی بھی مجتہد کو جس نے حُسنِ نیت اور محنت سے فیصلہ دیا ہو غلطی بتا کر شرمندہ نہیں فرمائے گا۔ البتہ! یہ ضرور ہے کہ تحکیم اور قضاء ایک نازک معاملہ ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے قاضی وہ ہیں جو فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اللہ تعالیٰ سے ڈر کر فیصلہ دیتے ہوں۔ یہ غلطی بھی کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ انہیں جنت عطا فرمائے گا اور دوسری قسم کے قاضی وہ ہیں جو سرے سے فیصلہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو صلاحیت سے تو بہرہ ور ہیں لیکن ان میں نہ حُسنِ نیت پایا جاتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کا خوف۔ یہ دونوں قسم کے قاضی جہنم میں جائیں گے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی درویشی

تسخیر کا معنی ہوتا ہے، کسی کو کسی کی خدمت میں لگا دینا یا اس کے تابع کر دینا۔ اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا، لیکن اس کے بعد مَعَهٗ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لہٗ کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کو حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح میں اس طرح ہمنوا بنا دیا گیا تھا کہ جیسے ہی آپؑ رات کے پچھلے پہر یا طلوعِ سحر کے وقت پہاڑوں کے دامن میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے اور اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب زبور کی تلاوت کرتے تو پہاڑ بھی آپؑ کے ساتھ تسبیح کرتے اور پرندے بھی جوق در جوق آپؑ کے گرد جمع ہو کر تسبیح میں مصروف ہو جاتے۔ آپؑ کو اس کیلئے حکم دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی بلکہ ان کی تسخیر اسی مقصد کیلئے کی گئی تھی کہ جیسے ہی وہ آپؑ کی آواز سنیں آپؑ کی ہمنوائی میں تسبیح کرنا شروع کر دیں۔

تسخیر کا مفہوم

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام چونکہ نہایت خوش الحان تھے۔ آپؑ کی نہایت سریلی اور بلند آواز میں بلا کی تاثیر تھی۔ اس لئے جیسے ہی آپؑ زبور کی تلاوت کرتے جو منظوم تھی تو پہاڑ آپؑ کے ساتھ گونجنے لگتے اور پرندے بھی مسحور ہو کر آپؑ کے گرد اترنے لگتے۔ پہاڑوں اور پرندوں کے مسخر کرنے کا یہی مفہوم ہے۔ اس مفہوم کے مراد لینے میں حرج تو کوئی نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات اور آپؑ کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے بطورِ خاص جس عمل کو تسخیر کا نام دیا ہے اور پھر مزید موکد اور مبرہن کرنے کیلئے یہ بھی فرمایا کہ یہ حیرت انگیز کمال حضرت داؤد علیہ السلام سے اس لئے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے کرنے والے ہم تھے اور ہمارے لئے تو کوئی چیز نہ ناممکن ہے نہ مشکل۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو تاثر اور جو کیفیت کسی دوسرے خوش آواز آدمی سے پیدا ہو سکتی ہے اور جو صرف اس کی خوبصورت آواز کی تاثیر کا نتیجہ ہوتی ہے یہ یقیناً اس سے زائد، منفرد اور ممتاز چیز تھی، ورنہ پروردگار اس

Marfat.com

اہتمام سے اس کا ذکر نہ فرماتے۔

اور دوسری بات یہ کہ اگر تسبیح سے مراد صرف پہاڑوں کا گونجنا اور پرندوں کا اتر آنا ہے تو یہ بھی آپ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم ہی میں فرمایا گیا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ''ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس تسبیح سے وہی نا قابلِ فہم تسبیح مراد لی جائے جو اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق کرتی ہے تو پھر اس آیتِ کریمہ میں جس تسبیح کا ذکر کیا گیا ہے اس کی کیا خصوصیت باقی رہے گی۔ ان تمام باتوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مصروف ہوتے تو بالکل انہیں الفاظ میں پہاڑ اور پرندے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے تھے جن الفاظ میں حضرت داؤد علیہ السلام کرتے تھے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ اس کے کرنے والے یعنی اس کی صلاحیت دینے والے ہم تھے۔ ہم جسے چاہیں بولنے کی صلاحیت دے دیں۔ جس طرح آنحضرت ﷺ کے معجزے سے مٹھی میں پتھر کے کنکروں نے کلمہ پڑھا اور پاس بیٹھنے والوں نے اپنے کانوں سے سنا۔ اسی طرح یہ پہاڑ اور پرندے بھی تسبیح کناں ہوتے تھے۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

(ہم نے انہیں تمہارے لئے ایک خاص جنگی لباس کی صنعت سکھائی تا کہ وہ تم کو جنگ میں محفوظ رکھے، تو کیا تم شکر ادا کرنے والے ہو۔ ۸۰)

حضرت داؤدؑ درویش بھی تھے اور شہسوار بھی

گزشتہ آیتِ کریمہ سے یہ تأثر ملتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہونے کی وجہ سے علم کے پیکر اور افتاء وقضاء کے شناور تھے۔ آپ کی بیشتر توجہ لوگوں کے معاملات حل کرنے اور ان کی زندگیوں کی اصلاح پر رہتی تھی اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ سوز و گداز بخشا تھا کہ آپ دن بھر علمی مصروفیات اور عدالتی معاملات میں مصروف رہتے لیکن رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح و تحمید میں وقت گزرتا تھا اور طلوعِ سحر کے وقت پہاڑوں کی طرف نکل جاتے اور وہاں زبور کی تلاوت اور ذکر اللہ کی تسبیح میں اس طرح کھو جاتے کہ پہاڑ اور پرندے بھی ان کی تسبیح میں ان کی ہمنوائی کرتے۔ ایسا لگتا تھا کہ حکمرانی کے ساتھ ساتھ ان کی زندگیوں پر درویشی کا غلبہ تھا۔ بس یوں کہنا چاہیے کہ آپ ایک درویش حکمران تھے لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کی داستانِ حیات کا ایک اور ورق الٹا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح آپ کو علم اور عبادت سے بے پناہ شغف تھا اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح آپ کی زندگی کا سب سے بڑا ہدف تھا اسی طرح آپ مردِ میدان بھی تھے۔ یوں کہنا چاہیے کہ آپ رات کے راہب اور دن کے شہسوار تھے۔ کوئی انہیں لوگوں کے معاملات کی طرف توجہ فرماتے ہوئے دیکھتا تو وہ سمجھتا کہ آپ ایک اچھے حکمران ہیں، لیکن جب ان کی عبادت کو دیکھتا تو آپ پر ایک درویش کا گمان ہوتا۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتا کہ آپ اسلحۂ جنگ کی تیاری میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں بلکہ آپ زرہ داؤدی کے موجد ہیں اور اسی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی معاصر قوموں پر غلبہ عطا فرمایا تھا تو وہ سمجھ جاتا کہ هُوَ رَاهِبٌ بِاللَّيْلِ وَفَارِسٌ بِالنَّهَارِ ''آپ رات کو درویش ہوتے ہیں اور دن کو شہسوار ہوتے ہیں۔'' ان کی ہمہ جہت شخصیت کا عالم یہ تھا کہ ان کی پرسوز دعاؤں اور مناجاتوں سے پہاڑوں کے دل موم ہو جاتے تھے اور ان کی دفاعی ایجادات اور فوجی قوت سے دشمنوں پر لرزہ طاری رہتا تھا۔

Marfat.com

حضرت داؤد علیہ السلام کے دور کے دفاعی اسلحہ میں زرہ کو چونکہ بے حد اہمیت حاصل تھی اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم اور علم سے نوازا تھا۔ اس لئے آپؑ پر ان بے پایاں نعمتوں کا حوالہ دے کر لوگوں سے سوال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں اس کے شکر کی بدولت ہیں تو کیا تم بھی اس طرح اللہ تعالیٰ کر شکر ادا کرنے کی کوشش کرو گے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت اور دیگر دفاعی صلاحیتیں اس لئے عطا کی گئی تھیں تا کہ تم جنگ کی ہولنا کیوں سے محفوظ رہو تو کیا تم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہو

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾

(اور ہم نے سلیمان کیلئے تند و تیز ہوا کو مسخر کر دیا جو ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جسے ہم نے برکت دی ہے، اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔ ۸۱)

حضرت سلیمان علیہ السلام پر انعامات

حضرت داؤد علیہ السلام پر انعامات کے ذکر کے بعد ان انعامات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر کئے گئے۔ ان پر پہلا انعام یہ ہوا کہ ہوا کو آپؑ کے تابع فرمان کر دیا گیا۔ اس آیتِ کریمہ میں تند و تیز ہوا کا ذکر ہے لیکن سورۂ ص میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ’’ پس ہم نے اس کیلئے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے بسہولت چلتی تھی، جدھر وہ جانا چاہتا۔‘‘ سورۂ سبا میں مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ’’اور سلیمان کیلئے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا صبح کو اور ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا شام کو۔‘‘ ان تینوں آیات کو گہری نظر سے دیکھنے سے جو تأثر ابھرتا ہے اس میں اگر ذہنی تحفظات کو دخل اندازی کا موقع نہ دیا جائے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے قابو میں دے دیا تھا، وہ آپؑ کے حکم کے مطابق چلتی اور خدمت بجا لاتی تھی۔ آپؑ کا ایک عظیم تخت تھا۔ آپؑ اپنے وزراء اور امراء کو ساتھ لے کر تخت پر سوار ہو جاتے اور ہوا کو حکم دیتے چنانچہ تند و تیز ہوا اس بھاری بھر کم تخت کو زمین سے اٹھاتی اور اوپر جا کر ہوا کی رفتار نرم ہو جاتی جس کی رفتار کا اندازہ یہ تھا کہ آپؑ جہاں اپنے فرائض کی ادائیگی کیلئے جانا چاہتے ہوا اس تخت کو لے کر چلتی۔ صبح کو آپؑ کا سفر ایک مہینے کی مسافت کا تھا اور شام کا سفر بھی اسی مسافت کا ہوتا۔ یعنی آپؑ سینکڑوں میل تک تخت پر سوار اڑتے رہتے اور اندازاً یہ سفر اتنا ہوتا جتنا اونٹوں پر ایک مہینے میں کیا جاتا اور شام کو پھر اسی رفتار سے واپس اپنے مستقر پر تشریف لے آتے۔ رہی یہ بات کہ یہ ہوا آپؑ کے تجارتی بیڑوں کو آپؑ کے حکم سے کھینچے لئے پھرتی جس کے نتیجے میں آپؑ کی بحری تجارت بہت دور تک پھیل گئی۔ ایک طرف عصیون جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحر احمر میں یمن اور دوسرے جنوبی و مشرقی ممالک کی طرف جاتے تھے۔ اور دوسری طرف بحر روم کی بندرگاہوں سے ان کا بیڑہ مغربی ممالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ اور آپؑ کے حکم سے جہازوں کے بادبان ہر طرح کی ہواؤں میں کھلے رہتے۔ چونکہ ہوا آپؑ کے حکم کی پابند تھی اس لئے وہ ہمیشہ بادِ موافق بن کر اپنا فرض انجام دیتی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعام کے مظاہر ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزے کو بادِ موافق کی کارکردگی تک منحصر کر دیا جائے۔ یقیناً ہواؤں کا یہ فیضان بھی جو آپؑ کے تجارتی اسفار میں

Marfat.com

معاون ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ کا انعام تھا اور جس طرح ہوا آپ کے تخت کو لے کر آپ کے حکم سے اڑتی تھی وہ بھی اللہ تعالیٰ کا انعام اور کرم تھا۔ ان دونوں میں کہیں بھی تضاد نہیں۔

اور آخر میں فرمایا کہ ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔ ہم نے حضرت سلیمان کو جن انعامات سے نوازا اور آپ کو تصرفات عطا کیے یہ اندھے کی بانٹ نہیں تھی بلکہ ہم جانتے تھے کہ حضرت سلیمان ان تمام صلاحیتوں اور انعامات سے بہرہ ور ہو کر بھی اپنی بندگی سے سر مو تجاوز نہیں کریں گے کیونکہ وہ صرف ایک حکمران ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی ہیں۔ وہ جس طرح عبادت میں اللہ تعالیٰ کے بندے ہوتے ہیں اسی طرح وہ تخت پر بیٹھ کر بھی اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ تمام انعامات کے باوجود کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتے کہ یہ ان کی ذاتی ذہانت کا نتیجہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے روز افزوں فضل و کرم کو اپنے لئے انعام سمجھ کر بیش از بیش اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ بندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میری ایک ایک بات، ایک ایک عمل اور ایک ایک ارادے سے واقف ہے۔ اگر میں کہیں بھی اپنی حدود سے تجاوز کروں گا تو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق کل کو مجھے اس کی جوابدہی کرنا پڑے گی اور یہی وہ احساس ہے جو بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

(اور شیاطین میں سے بھی ہم نے اس کیلئے مسخر کر دیئے تھے جو ان کیلئے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے اور ہم ہی ان کے نگہبان تھے۔ ۸۲)

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو کمالات بخشے اور جن نعمتوں سے نوازا ان میں سے ایک نعمت کا سابقہ آیت میں ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا۔ اب اس آیتِ کریمہ میں دوسری نعمت کا ذکر ہو رہا ہے کہ جنات بھی آپ کیلئے مسخر کر دیئے گئے تھے۔ قرآنِ کریم کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات آگ کے بنے ہوئے وہ اجسام لطیفہ ہیں جو عقل و شعور رکھتے ہیں اور انسان کی طرح احکامِ شرع کے مکلف ہیں۔ اس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان کر دیا تھا، لیکن ان میں سے جو جنات آپ پر ایمان نہیں لائے انہیں قرآنِ کریم شیاطین کے نام سے یاد کرتا ہے یعنی جنات کا لفظ تو مومن اور کافر دونوں پر بولا جاتا ہے لیکن غیر مومن اور غیر مسلم جنات کو شیاطین کہا گیا ہے۔ جو جنات مومن تھے وہ تو ایمان کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کو فرض سمجھتے تھے اس لئے انہیں مسخر کرنے کی بات نہیں کی گئی لیکن جو جنات آپ پر ایمان نہیں لائے انہیں بطورِ خاص آپ کی تسخیر میں دیا گیا۔ وہ اپنے تمام تر کفر اور سرکشی کے باوجود حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان بنائے گئے تھے وہ ایمان نہ رکھتے ہوئے بھی آپ کی اطاعت کرنے کے پابند تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ان کی طاقت کے اعتبار سے ان سے ایسے کام لیتے تھے جنہیں انسان انجام نہیں دے سکتے تھے۔ وہ سمندروں میں غوطے لگاتے اور سمندری دولت مونگے اور موتی وغیرہ آپ کیلئے فراہم کرتے تھے۔ اور سورۂ سبا میں فرمایا گیا ہے کہ وہ آپ کیلئے محرابیں اور شاندار مکانات اور مورتیں اور پتھر کے بڑے بڑے پیالے (جو حوض کی طرح کام دیں) تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی نہ

Marfat.com

جانے ان سے اور کیا کیا کام لئے جاتے تھے۔ لیکن وہ اپنی ہر طرح کی سرکشی کے باوجود آپؑ کے حکم سے سرتابی کرنے کی مجال نہیں رکھتے تھے اور نہ اس بات پر قادر تھے کہ آپؑ کو کوئی نقصان پہنچا سکیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ اس لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا وَكُنَّا لَهُمۡ حٰفِظِيۡنَ ''اور ہم ہی ان کے نگہبان تھے۔''

مشرکینِ عرب ان جنات کو عالم الغیب سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے استمداد بھی کرتے تھے اور ان کے نام کے چڑھاوے بھی چڑھاتے تھے لیکن سورۂ سبا میں اللہ تعالیٰ نے ان کی غلط فہمی دور کرنے کیلئے یہ بات واضح کردی کہ وہ جس طرح باقی رعایا کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے احکام کے پابند اور ان کے تابع فرمان تھے اسی طرح دوسری مخلوقات کی طرح غیب جاننے والے نہ تھے ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کی ان کو خبر تک نہ ہوتی اور وہ موت کے بعد بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو سامنے کھڑا محسوس کرکے برابر سخت سے سخت کام انجام دیتے رہتے۔

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ فَلَمَّا قَضَيۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَوۡتَ مَادَلَّهُمۡ عَلٰى مَوۡتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الۡاَرۡضِ تَاۡكُلُ مِنۡسَاَتَهٗ‌ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ الۡغَيۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِى الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ ''پھر جب ہم نے سلیمانؑ کو وفات دے دی تو ان جنوں کو اس کی موت پر مطلع کرنے والی کوئی چیز نہ تھی مگر زمین کا کیڑا (یعنی گھن) جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا پس جب وہ گر پڑا تو جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب دان ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں اتنی مدت تک مبتلا نہ رہتے۔''

قرآنِ کریم کی ان آیات کو پڑھ کر کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ قرآنِ کریم جن شیاطین کی بات کر رہا ہے وہ سرکش انسان تھے اور آس پاس کی قوموں سے فراہم کئے گئے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں ان کی اس تاویل کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ قصہ آیا ہے وہاں کا سیاق وسباق اور انداز بیان اس تاویل کو راہ دینے سے صاف انکار کرتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کیلئے عمارتیں بنانے والے اگر انسان ہی تھے تو آخر یہ ان کی ایسی کیا خصوصیت تھی جس کو اس شان سے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اہرام مصری سے لے کر نیویارک کی فلک شگاف عمارتوں تک کس چیز کو انسان نے نہیں بنایا ہے اور کس بادشاہ یا رئیس یا ملک التجار کیلئے وہ ''جن'' اور ''شیاطین'' فراہم نہیں ہوئے جو آپ حضرت سلیمان کیلئے فراہم کر رہے ہیں؟

آیت کی تشریح دوسری آیات کی روشنی میں

سورۂ سبا میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے: وَمِنَ الۡجِنِّ مَنۡ يَّعۡمَلُ بَيۡنَ يَدَيۡهِ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ‌ ؕ وَمَنۡ يَّزِغۡ مِنۡهُمۡ عَنۡ اَمۡرِنَا نُذِقۡهُ مِنۡ عَذَابِ السَّعِيۡرِ ۞ يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَتَمَاثِيۡلَ وَجِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ رّٰسِيٰتٍ ...... فَلَمَّا قَضَيۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَوۡتَ مَادَلَّهُمۡ عَلٰى مَوۡتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الۡاَرۡضِ تَاۡكُلُ مِنۡسَاَتَهٗ‌ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ الۡغَيۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِى الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ ۞ ''اور جنوں میں سے ایسے جن ہم نے اس کیلئے مسخر کردیئے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے اور جو کوئی ہمارے حکم سے ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھاتے۔ وہ اس کیلئے جیسے وہ چاہتا قصر اور مجسمے اور حوض

Marfat.com

جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے...... پھر جب ہم نے سلیمانؑ کو وفات دے دی تو ان جنوں کو اس کی موت پر مطلع کرنے والی کوئی چیز نہ تھی مگر زمین کا کیڑا (یعنی گھن) جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا پس جب وہ گر پڑا تو جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب دان ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں اتنی مدت تک مبتلا نہ رہتے۔ اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کیلئے مسخر ہوئے تھے اور جو ان کیلئے مختلف خدمات انجام دیتے تھے وہ جن تھے اور جن بھی وہ جن کے بارے میں مشرکین عرب کا یہ عقیدہ تھا اور جو خود اپنے بارے میں بھی یہ غلط فہمی رکھتے تھے کہ ان کو علم غیب حاصل ہے اب ہر شخص جو قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھے اور اس کو اپنے تعصبات اور پیشگی قائم کئے ہوئے نظریات کا تابع بنائے بغیر پڑھے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں قرآن مطلق ''شیطان'' اور ''جن'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے وہاں اس کی مراد کونسی مخلوق ہوتی ہے اور قرآن کی رو سے وہ کون سے جن ہیں جن کو مشرکین عرب عالم الغیب سمجھتے تھے۔ (تفہیم القرآن)

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٨٣﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿٨٤﴾

(اور یاد کرو ایوب کو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے اور تو رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔۸۳) تو ہم نے ان کی فریاد قبول فرمائی اور ہم نے ان کی تکلیف دور کر دی اور انہیں ان کے اہل و عیال بھی دیئے اور ان کے مانند ان کے ساتھ اور بھی، خاص اپنے فضل سے، اور عبادت گزاروں کی یاد دہانی کیلئے۔ ۸۴)

صبر کے حوالے سے حضرت ایوب علیہ السلام کا اسوہ

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے، پھر جو لوگ ان آزمائشوں میں سرخرو ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں مختلف مدارج سے نوازتا ہے اور ان کی ذات اور ان کے کردار کو آنے والی دنیا کیلئے نمونہ بنا دیتا ہے۔ مزید یہ بات کہ اس کی آزمائش کے رنگ جدا جدا ہیں۔ کبھی وہ نعمتیں دے کر آزماتا ہے اور کبھی تکلیفوں میں مبتلا کر کے اور نعمتیں چھین کر آزماتا ہے۔ گزشتہ آیات میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی دو شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکومت اور دولت دے کر آزمایا۔ وہ بجائے ناشکری کرنے اور عہدہ و منصب کے غرور میں مبتلا ہونے کے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے شکر کا رویہ اختیار کیا۔ ایک طرف عادلانہ حکومت کی اور خلقِ خدا کے حقوق ادا کئے اور دوسری طرف تخت و تاج کو فقر و درویشی کی علامت بنا دیا اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی زمین کو اس کے باغیوں سے پاک کرنے کیلئے جہاد و غزا کیلئے اپنی ذاتوں اور اپنے وسائل کو جھونک دیا۔ پروردگار نے انہیں شکر کے پیکر اور درویش حکمران کے طور پر انسانوں کیلئے نمونہ ٹھہرایا اور قیامت تک آنے والی انسانیت کا سرمایہ بنا دیا۔

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں ایک اور شخصیت کا ذکر کیا جا رہا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پہلے نعمتیں دے کر آزمایا اور پھر تکلیفوں میں مبتلا کر

Marfat.com

کے آزمایا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام شکر کے نمائندہ تھے۔ اور حضرت ایوب علیہ السلام کو صبر کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ انسانی زندگی کے دو ہی اہم عنوان ہیں، صبر اور شکر۔ کبھی انسان ایک میں ٹھوکر کھاتا ہے اور کبھی دوسرے میں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے انسانی اصلاح کیلئے ان دونوں پر بہت زور دیا ہے اور جابجا ایسی عظیم اور مقدس شخصیتوں کو ذکر فرمایا ہے جن کی زندگیاں ان دونوں کی تصویر تھیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی شخصیت، زمانہ، قومیت ہر چیز کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؑ کا زمانہ نویں صدی قبل مسیح یا اس سے پہلے کا ہے۔ آپؑ حضرت اسحاق علیہ السلام کے دوسرے بیٹے عیسو کی نسل سے تھے۔ حضرت وہب بن منبہ کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ سفرِ ایوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکِ عوض میں حضرت ایوب ایک نہایت کامل اور راست باز انسان تھے۔ اللہ نے انہیں بڑا خاندان اور بڑی دولت دے رکھی تھی۔ ان کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ اہلیہ محترمہ کا نام رحمت بتایا جاتا ہے جو حضرت یوسف کے فرزند افرائیم کی لختِ جگر تھیں۔ بڑی حسین وجمیل اور صحت مند تھیں۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل اور پانچ سو بار برداری کے گدھے ان کے پاس تھے۔ ان کے نوکر چاکر بھی بے شمار تھے۔ اہلِ مشرق میں اس درجہ کا مالدار کوئی اور نہ تھا۔ ان گوناگوں انعامات اور اس خدم وحشم کے باوجود آپؑ خدا کے نہایت شکر گزار اور فرمانبردار بندے تھے۔ ان کی نیکی پر شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو حسد ہوا۔ انہوں نے طعنہ دیا جس طرح کہ سفرِ ایوب میں ذکر کیا گیا ہے کہ (ایوب کی یہ خدا پرستی وراست بازی اس لئے ہوئی کہ خدا نے اسے ہر طرح کی خوشحالیاں دے رکھی ہیں، اگر یہ ان سے محروم ہو جائے تو پھر کبھی خدا کا شکر گزار نہ ہو)۔ چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کھیتیاں جل کر راکھ ہوگئیں، مال مویشی میں ایسی وباء پھوٹی کہ ایک بھی زندہ نہ رہا۔ آپؑ کے سارے بیٹے اور بیٹیاں اپنے بڑے بھائی کے یہاں مدعو تھے کہ مکان گرا اور سب لقمۂ اجل ہو گئے۔ آپؑ کے جسم میں آبلے نمودار ہو گئے، خارش کی وجہ سے انہیں کھجلایا تو انہوں نے ناسوروں کی شکل اختیار کرلی۔ ان میں چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگنے لگے، جسم سے پیپ بہنے لگی، لیکن حضرت ایوب علیہ السلام ہر حال میں صبر کی تصویر بنے رہے، حرفِ شکایت تک زبان پر نہ آیا۔ ساری دولت وحشمت غائب ہو گئی لیکن سفرِ ایوب کی روایت کے مطابق آپؑ کا یہ حال رہا کہ:

"وہ سجدے میں گر پڑا اور کہا میں اپنی ماں کے پیٹ سے برہنہ پیدا ہوا تھا اور برہنہ ہی دنیا سے جاؤں گا۔ خداوند نے مجھے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ اسی کے نام کیلئے ساری پاکیاں اور مبارکیاں ہوں۔"

جب جسم سارا آبلوں اور ناسوروں سے بھر گیا اور جسم سے پیپ بہنے لگی، سب نیاز مند اپنا سلسلۂ نیاز وعقیدت توڑ کر الگ ہو گئے، سب دوستوں نے نفرت سے آنکھیں پھیر لیں تب بھی آپؑ کے صبر اور شکر میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس ناقابلِ برداشت تکلیف اور ناگفتہ بہ محرومی کی حالت میں بھی حرفِ شکایت تو زبان پر کیا آتا کسی اور کے سامنے دستِ سوال تو کیا پھیلاتے صرف اتنا کہا اور وہ بھی اپنے اللہ سے۔ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ "کہ مجھے سخت تکلیف نے چھو یا ہے یعنی میں مبتلائے آزار ہوں اور تو ارحم الراحمین ہے۔" دعا کی بلاغت پر غور کیجئے کہ اپنے دکھ درد کا حوالہ تو دیا لیکن حرفِ مدعا زبان پر نہیں لائے، اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت پر چھوڑ دیا۔ جس طرح کوئی انتہائی خوددار آدمی جب کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتا اور پے درپے فاقے اس کیلئے ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں تو وہ کسی کریم النفس ہستی کے سامنے صرف اتنی بات کہہ کے رک جاتا ہے کہ "میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں۔" اس کے بعد اس کی خودداری اسے کچھ کہنے سے روک دیتی ہے۔

Marfat.com

اس دُعا میں بھی حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے دکھ کا ذکر کیا، لیکن مداویٰ مانگنے کی بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت کا حوالہ دے کر خاموش ہو گئے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو مقام رضا کہتے ہیں۔ جو شخص اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے وہ نہ تو اللہ تعالیٰ کے آستانے سے بے نیاز ہوتا ہے اور نہ اپنی زبان کو بے قابو ہونے دیتا ہے کہ کہیں بے صبری کا اظہار نہ ہو جائے۔ بس وہ یہ سمجھتا ہے کہ ؎

جس نے دیا ہے درد وہی چارہ گر بھی ہے
کہنی ہے چارہ گر سے ہی خود چارہ گر کی بات

چنانچہ اس دُعا کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ کھل گیا۔ سورۂ ص کے چوتھے رکوع میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام سے فرمایا اُرْکُضْ بِرِجْلِكَ، هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ''اپنا پاؤں مارو، یہ ٹھنڈا پانی موجود ہے، نہانے کو اور پینے کو۔'' حضرت ایوب علیہ السلام کے زمین پر پاؤں مارنے سے پانی کا چشمہ ابلنے لگا۔ آپؑ نے اس میں غسل کیا اور اس کا پانی پیا تو جسم کی ساری بیماریاں دھل گئیں۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی دعا قبول فرمائی۔ تمام تکالیف بھی دور فرما دیں جن میں وہ مبتلا تھے اور ان کے اہل و عیال اور ان کے خدم و حشم بھی از سرِ نو عطا فرمائے۔ حُسن و شباب پھر لوٹ آیا، اجڑا ہوا گھر آباد ہو گیا، مال و دولت کی فراوانی ہو گئی۔ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بچے بچیوں کو زندہ کر دیا گیا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس واقعہ کو اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ یہ قیامت تک آنے والے ان لوگوں کیلئے جو اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اپنا فریضہ اور سرمایہ سمجھتے ہیں یاددہانی کا کام دے۔ وہ جب بھی کبھی اس طرح کی صورتحال سے دوچار ہوں تو برے سے برے حالات میں بھی حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کو یاد کریں اور اس بات کا یقین اپنے اندر پیدا کریں کہ آج بھی پروردگار صبر اور شکر کرنے والوں کو نوازتا ہے اور ہر طرح کی نعمت سے بہرہ ور فرماتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم نے حضرت ایوب کے سیرت و کردار کو کس قدر اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا اور قیامت تک کیلئے آنے والے صاحبِ ایمان لوگوں کیلئے اسے اسوۂ حسنہ بنا دیا۔ لیکن بائیبل نے جو آپؑ کا نقشہ کھینچا ہے اسے ذکر کرنے کی بجائے میں تفہیم القرآن کا ایک نوٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

> اس قصے میں قرآن مجید حضرت ایوب علیہ السلام کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں اور پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کیلئے ایک نمونہ ہے لیکن دوسری طرف بائیبل کی سفرِ ایوبؑ پڑھیے تو وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسم شکایت اور اپنی مصیبت پر ہمہ تن فریاد بنا ہوا ہے۔ بار بار اس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں ''نابود ہو وہ دن جس میں، میں پیدا ہوا، میں رحم ہی میں کیوں نہ مر گیا، میں نے پیٹ سے نکلتے ہی کیوں نہ جان دے دی۔'' اور بار بار وہ خدا کے خلاف شکایتیں کرتا ہے کہ ''قادر مطلق کے تیر میرے اندر لگے ہوئے ہیں، میری روح انہی کے زہر کو پی رہی ہے، خدا کی ڈراونی باتیں میرے خلاف صف باندھے ہوئے ہیں۔'' ''اے بنی آدم کے ناظر! اگر میں نے گناہ کیا ہے تو تیرا کیا بگاڑتا ہوں؟ تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنایا ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ پر بوجھ ہوں؟ تو میرا گناہ کیوں نہیں معاف کرتا اور میری بدکاری کیوں نہیں دور کر دیتا؟'' میں خدا سے کہوں گا کہ

Marfat.com

مجھے ملزم نہ ٹھہرا، مجھے بتا کہ تو مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے اور اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز کو حقیر جانے اور شریروں کی مشورت کو روشن کرے؟'' اس کے تین دوست اسے آ کر تسلی دیتے ہیں اور اس کو صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتے ہیں مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ ان کی تلقین کے جواب میں پے در پے خدا پر الزام رکھے چلا جاتا ہے اور ان کے سمجھانے کے باوجود اصرار کرتا ہے کہ خدا کے اس فعل میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے، صرف ایک ظلم ہے جو مجھ جیسے ایک متقی و عبادت گزار آدمی پر کیا جا رہا ہے۔ وہ خدا کے اس انتظام پر سخت اعتراضات کرتا ہے کہ ایک طرف بدکار نوازے جاتے ہیں اور دوسری طرف نیکوکار ستائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی نیکیاں گناتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں اور پھر کہتا ہے کہ خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس قصور کی پاداش میں کیا گیا ہے۔ اس کی یہ زبان درازی اپنے خالق کے مقابلے میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آخر کار اس کے دوست اس کی باتوں کا جواب دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ چپ ہوتے ہیں تو ایک چوتھا آدمی جو ان کی باتیں خاموش سن رہا تھا بیچ میں دخل دیتا ہے اور حضرت ایوبؑ کو بے تحاشا اس بات پر ڈانٹتا ہے کہ ''اس نے خدا کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو راست ٹھہرایا۔'' اس کی تقریر ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں اللہ میاں خود بول پڑتے ہیں اور پھر ان کے اور حضرت ایوبؑ کے درمیان خوب دو بدو بحث ہوتی ہے۔ اس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اس صبر مجسم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کیلئے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصہ کچھ اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے۔ تینوں حصوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابتدائی حصہ کہتا ہے کہ حضرت ایوبؑ ایک نہایت راستباز، خدا ترس اور نیک شخص تھا اور اس کے ساتھ اتنا دولت مند کہ ''اہلِ مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا۔'' ایک روز خدا کے ہاں اس کے (یعنی خود اللہ میاں کے) بیٹے حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ شیطان بھی آیا۔ خدا نے اس محفل میں اپنے بندے ایوب پر فخر کا اظہار کیا۔ شیطان نے کہا آپ نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے اس کے بعد وہ شکر نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ ذرا اس کی نعمت چھین کر دیکھئے، وہ آپ کے منہ پر آپ کی ''تکفیر'' نہ کرے تو میرا نام شیطان نہیں۔ خدا نے کہا، اچھا، اس کا سب کچھ تیرے اختیار میں دیا جاتا ہے۔ البتہ اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچائیو۔ شیطان نے جا کر حضرت ایوبؑ کے تمام مال و دولت کا اور اس کے پورے خاندان کا صفایا کر دیا اور ایوب ہر چیز سے محروم ہو کر بالکل اکیلا رہ گیا مگر ایوب کی آنکھ پر میل نہ آیا۔ اس نے خدا کو سجدہ کیا اور کہا ''ننگا ہی میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو'' پھر ایک دن ویسی ہی محفل اللہ میاں کے ہاں جمی۔ ان کے بیٹے بھی آئے اور شیطان بھی حاضر ہوا۔ اللہ میاں نے شیطان کو جتایا کہ دیکھ لے، ایوب کیسا راستباز آدمی ثابت ہوا۔ شیطان نے کہا، جناب، ذرا اس کے جسم پر مصیبت ڈال کر دیکھئے وہ آپ کے منہ پر آپ کی ''تکفیر'' کرے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا، اچھا جا، اس کو تیرے اختیار میں دیا گیا، بس اس کی جان محفوظ رہے۔ چنانچہ شیطان واپس ہوا اور آ کر اس نے ''ایوب کو تلوے

Marfat.com

سے چاند تک دردناک پھوڑوں سے دکھ دیا۔'' اس کی بیوی نے اس سے کہا'' کیا تو اب بھی اپنی راستی پر قائم رہے گا؟ خدا کی تکفیر کر اور مرجا۔'' اس نے جواب دیا'' تو ان عورتوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سے سکھ پائیں اور دکھ نہ پائیں۔''

یہ ہے سفرِ ایوبؑ کے پہلے اور دوسرے باب کا خلاصہ، لیکن اس کے بعد تیسرے باب سے ایک دوسرا ہی مضمون شروع ہوتا ہے جو بیالیسویں باب تک ایوب کی بے صبری اور خدا کے خلاف شکایات و الزامات کی ایک مسلسل داستان ہے اور اس سے پوری طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایوب کے بارے میں خدا کا اندازہ غلط اور شیطان کا اندازہ صحیح تھا پھر بیالیسویں باب میں خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے خوب دوبدو بحث کر لینے کے بعد، صبر و شکر اور توکل کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ میاں کی ڈانٹ کھا کر، ایوب ان سے معافی مانگ لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے اس کی تکلیفیں دور کر دیتے ہیں اور جتنا کچھ پہلے اس کے پاس تھا اس سے دو چند دے دیتے ہیں۔ اس آخری حصے کو پڑھتے وقت آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایوب اور اللہ میاں دونوں شیطان کے چیلنج کے مقابلے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں اور پھر محض اپنی بات رکھنے کیلئے اللہ میاں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے معافی مانگنے پر مجبور کیا ہے اور اس کے معافی مانگتے ہی اسے قبول کر لیا ہے تا کہ شیطان کے سامنے ان کی ہیٹی نہ ہو۔

یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے نہ خود حضرت ایوب کا بلکہ یہ حضرت ایوب کے زمانے کا بھی نہیں ہے۔ ان کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصۂ ایوب کو بنیاد بنا کر ''یوسف زلیخا'' کی طرح ایک داستان لکھی ہے اور اس میں ایوب، الیفز تیمانی، سوخی بلدد، نعماتی صوفر، براکیل بوزی کا بیٹا الیہو، چند کیرکٹر ہیں جن کی زبان سے نظامِ کائنات کے متعلق دراصل وہ خود اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری اور اس کے زورِ بیان کی جس قدر جی چاہئے داد دے لیجئے۔ مگر کتب مقدسہ کے مجموعے میں ایک صحیفۂ آسمانی کی حیثیت سے اس کو جگہ دینے کے کوئی معنی نہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی سیرت سے اس کا بس اتنا ہی تعلق ہے جتنا ''یوسف زلیخا'' کا تعلق سیرت یوسفی سے ہے بلکہ شاید اتنا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے ابتدائی اور آخری حصے میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان میں صحیح تاریخ کا ایک عنصر پایا جاتا ہے اور وہ شاعر نے یا تو زبانی روایات سے لیا ہوگا جو اس کے زمانے میں مشہور ہوں گی یا پھر کسی صحیفے سے اخذ کیا ہوگا جواب ناپید ہے۔

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٦﴾

(اور یاد کرو اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل (علیہم السلام) کو، یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ ۸۵) اور ہم نے ان کو اپنی خاص رحمت میں داخل کیا، بیشک وہ نیکو کاروں میں سے تھے۔ ۸۶)

Marfat.com

یہ تینوں انبیائے کرام صبر کی تصویر ہیں

یہ تینوں انبیائے کرام بھی حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح دیگر خصائلِ حمیدہ کے ساتھ ساتھ صبر میں بطورِ خاص امتیاز رکھتے تھے۔ اس لئے حضرت ایوب علیہ السلام کے ذکر کے بعد ان کا ذکر کر کے فرمایا یہ سب صبر کرنے والوں یعنی مشکل سے مشکل حالات میں ثابت قدم رہنے والوں میں سے تھے۔ ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان کی زندگی کے حالات اور اپنی ذات کی قربانی کے حوالے سے ان کا کارنامہ صبر کی ہمیشہ رہنے والی ایک ایسی درخشاں مثال ہے اور جس سے امتِ مسلمہ کا ایک ایک فرد واقف ہے۔ جہاں تک حضرت ادریس علیہ السلام کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے بعض جگہ نہایت اہتمام کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے اور انہیں صدیق نبی کا خطاب دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مقام بہت بلند ہے لیکن ان کی زندگی کے حالات سے تاریخ بالکل خاموش ہے۔ وہ زمانہ قبل از تاریخ کی شخصیت ہیں نہ ہم اس دور کی تاریخ سے واقف ہیں اور نہ ان کی زبان سے۔ بحرِ مردار کے غاروں سے کچھ نوشتے ملے ہیں جن کے بارے میں بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ وہ صحیفے ہیں جو حضرت ادریس علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے، لیکن ان کی زبان چونکہ آج مردہ ہو چکی ہے اس لئے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تاوقتیکہ اسے ماہرین پڑھنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

جہاں تک حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ مفسرین کے اقوال میں بہت اضطراب پایا جاتا ہے۔ ان کے نام، ان کے زمانے اور جس علاقے میں وہ مبعوث ہوئے ہر چیز میں شدید اختلاف ہے۔ زیادہ تر لوگ انہیں حضرت حزقیل قرار دیتے ہیں، لیکن یہ بھی اسی شکل میں قابلِ اعتماد ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت حزقیل اس لقب سے ملقب تھے۔ قدیم صحیفوں میں ہمیں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ قرآنِ کریم نے دو جگہ ذکر فرما کر ان کے نام کو زندہ کر دیا ہے لیکن ان کے تفصیلی حالات ذکر نہیں فرمائے۔ ممکن ہے عربی لب ولہجہ میں ان کے نام بدل گئے ہوں یا قدیم صحیفوں میں جس طرح اور بعض چیزیں غائب ہو گئی ہیں، ان کا نام بھی غائب کر دیا گیا ہو۔ بہرصورت یہ بات تو یقینی ہے کہ جس طرح قرآنِ کریم نے ان کا ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اور صبر ان کا خصوصی اور امتیازی وصف تھا۔

وَذَاالنُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ ﴿۸۷﴾

(اور یاد کرو مچھلی والے کو جبکہ وہ قوم سے برہم ہو کر چل کھڑا ہوا اور یہ خیال کیا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے، پھر اس نے تاریکیوں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بیشک میں ہی قصورواروں سے ہوں۔ ۸۷)

حضرت یونس علیہ السلام کی سرگزشت

اس آیتِ کریمہ میں ذوالنون کے نام سے ایک اور پیغمبر کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ ہر طرح کی تکلیف اور مایوسی میں اگر کوئی ذات سہارا دینے والی اور کام آنے والی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تکلیفوں میں جس طرح عام آدمی مبتلا ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نبی بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ جس طرح عام آدمی اپنی مدد کیلئے اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے، انبیائے کرام بھی اپنی تمام تر قدر و منزلت کے باوجود

Marfat.com

اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی عظیم ہے کہ وہ جب گرفت کرنے پہ آتا ہے تو بڑے سے بڑے مقام ومرتبے والے کی بھی گرفت کرتا ہے۔

عربی زبان میں نون مچھلی کو کہتے ہیں، ذوالنون کا معنی ہے مچھلی والا۔ مراد اس سے حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ انہیں مچھلی والا اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ایک محدود عرصے تک مچھلی کے پیٹ میں رہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی فضل وکرم سے انہیں نجات بخشی۔ انہیں نام کی بجائے لقب سے پکارنا دراصل ایک قسم کے پیار کا اظہار ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام اہلِ نینوا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ نینوا موصل کے قریب ایک شہر تھا جس میں رہنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار کہی جاتی ہے۔ صحیفہ یونس میں اسی تعداد کا ذکر کیا گیا ہے اور قرآنِ کریم نے اسے مِـائَةَ اَلْفٍ اَوْیَـزِیْدُوْنَ سے تعبیر کیا ہے، یعنی ایک لاکھ اور چند۔ یہ دوسرے لفظوں میں صحیفہ یونس کی روایت کی تائید ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے ایک مدت تک اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا لیکن کسی نے ان کی بات سننا گوارا نہ کیا۔ آپ جیسے جیسے دعوت میں سرگرمی پیدا کرتے گئے ویسے ویسے ان کی مخالفت میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک وقت آگیا کہ آپ ان کے رویئے سے حد درجہ نالاں ہوگئے۔ آپ نے محسوس کیا کہ میں اس قدر طویل عرصے تک نہایت اخلاص اور پتہ خون کر دینے والی محنت کے ساتھ قوم کو سمجھا چکا ہوں اور انہوں نے کوئی اس کا اثر قبول نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قوم پر اتمامِ حجت ہو چکا۔ اگر ان میں قبولیت کا تھوڑا سا مادہ بھی ہوتا تو یہ ضرور اس دعوت کو قبول کرتے۔ مزید ان کے ساتھ سر کھپانا پتھروں سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں نے آج تک قبرستانوں میں اذانیں دی ہیں۔ انہیں دعوت دیتے ہوئے میرے بالوں کی سیاہی ڈھلنے لگی ہے لیکن ان پتھر دلوں میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے مزید یہاں ٹھہرنا اپنے دکھوں میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ آپ حمیتِ حق کے جذبے سے جس میں قوم کے رویئے نے برہمی کا عنصر بھی شامل کر دیا تھا ناراض ہو کر نینوا سے نکل گئے۔

جب کوئی قوم حق کی ناقدری میں بڑھتی چلی جاتی ہے تو دعوتِ الی اللہ کا فریضہ انجام دینے والوں میں قوم کی طرف سے مایوسی کا پیدا ہو جانا ایک فطری جذبہ ہے اور اس میں کسی نفسانیت کے شائبہ کی بجائے حمیتِ حق کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت حضرت یونس علیہ السلام قوم کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن اس جذبے کے غلبے کی وجہ سے ان کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نینوا میں رسول کی حیثیت سے مبعوث کئے گئے ہیں۔ آپ کی حیثیت ایک مورچے میں متعین سپاہی کی ہے۔ آپ کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر مورچہ نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کو کب تک اپنی قوم میں رہنا ہے اور کب وہاں سے ہجرت کرنا ہے اس کا فیصلہ آپ نہیں کریں گے بلکہ پروردگار کرے گا۔ انبیائے کرام کی یہ سنت رہی ہے کہ چاہے ان پر کیسی قیامت گزر جائے وہ کبھی اپنی قوم کو اذنِ الٰہی کے بغیر چھوڑ کر ہجرت نہیں کرتے۔ حضرت یونس علیہ السلام حمیتِ حق کے جوش میں انبیائے کرام کی اس سنت کی طرف توجہ نہیں دے سکے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ میں چونکہ ایک طویل عرصے تک بدترین حالات میں اپنے فرائض انجام دے چکا ہوں، میرے یہاں سے نکلنے پر اللہ تعالیٰ کوئی گرفت نہیں فرمائیں گے۔

حضرت یونس علیہ السلام اپنی بستی سے نکلے تو نئی منزل کی تلاش میں دریا کو عبور کرنے کیلئے ایک کشتی میں سوار ہوئے جو پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ کشتی کچھ سفر کرنے کے بعد ایک طوفان میں گھر گئی۔ جب طوفان ٹلتا نظر نہ آیا تو ملاحوں نے اس زمانے کے عام وہم کے مطابق یہ خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی میں غلام ہے جو اپنے مالک سے بھاگ آیا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ غلام کون ہے؟ اس کیلئے انہوں نے

Marfat.com

قرعہ اندازی کا فیصلہ کیا۔ قرعہ ڈالنے کیلئے انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام سے درخواست کی، کیونکہ آپؑ اپنی پیغمبرانہ وجاہت اور دلآویز شخصیت کے باعث سب میں ثقہ معلوم ہورہے تھے۔ قرعہ ڈالا گیا تو حضرت یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا۔ آپؑ سمجھ گئے کہ میں ہی بھاگا ہوا غلام ہوں جو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر بستی سے نکل آیا ہوں۔ آپؑ سمندر میں کود گئے۔ ایک بہت بڑی مچھلی اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلے ہی منہ کھولے کھڑی تھی، اس نے آپؑ کو نگل لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا کہ خبردار میرے پیغمبر کو کوئی نقصان نہ پہنچے، یونس تمہاری خوراک نہیں بلکہ ہم نے تیرے شکم کو اس کیلئے قیدخانہ بنایا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے جب دیکھا کہ میں نے مشکلات سے نکلنے کیلئے ایک کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے گہرے ظلمات میں ڈال دیا گیا۔ مچھلی کے پیٹ کی تاریکی، سمندر کے پانی کی تاریکی اور پھر اوپر بادلوں کی تاریکی۔ آپؑ جان گئے کہ یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ چنانچہ آپؑ کے دل سے وہ زندہ جاوید دُعا نکلی جس کیلئے آج بھی یہ ضمانت ہے کہ وہ اگر صدقِ دل سے مانگی جائے تو کبھی قبولیت سے محروم نہیں رہتی۔ اس دُعا میں آپؑ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور سبوحیت کا اقرار کیا اور اپنے آپ کو گنہگار اور قصوروار ٹھہرا کر نہایت بے بسی سے اپنے رب کو پکارا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور مچھلی نے ان کو ساحل کی ریت پر اگل دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے نڈھال جسم کو گرمی اور دھوپ کی تمازت سے بچانے کیلئے کدو یا اسی قسم کی کوئی بیل پہلے سے اگا رکھی تھی جس کے نیچے انہیں پناہ ملی۔ جب اس حادثہ سے اوسان بجا ہوئے اور جسم میں کچھ جان آئی تو ان کو پھر اہلِ نینوا کے پاس انذار کیلئے جانے کی ہدایت ہوئی۔

نینوا کے عام باشندے اس سے پہلے ہی حالات کے تیور دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو چکے تھے۔ وہ سب اللہ پر ایمان لائے۔ بادشاہ نے بھی شاہی لباس اتار کر ٹاٹ کا پیرہن پہن لیا اور باشندوں کے نام فرمان جاری کیا کہ ہر شخص اپنی بری راہ سے باز آجائے، روزہ رکھے، اللہ کے حضور زاری کرے اور توبہ وانابت کا سر جھکائے۔

آیتِ کریمہ کے بعض جملوں کے غلط ترجمے کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان جملوں کی وضاحت کردی جائے تاکہ یہ غلط فہمیاں دور ہوجائیں۔

بعض جملوں کی تشریح

اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا "جب وہ نکلے غضبناک ہو کر"، بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنے کام سے دلبرداشتہ اور غضبناک ہو کر ذمہ داری سے پہلو تہی کرتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے حالانکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کی غضبناکی اور ناراضگی کا سبب وہ آزردگی تھی جو انہیں قوم کے رویئے سے ہوئی۔ انہوں نے قوم کو راہِ راست پر لانے کیلئے سارے جتن کر ڈالے لیکن ان سنگدلوں میں کہیں نرمی پیدا نہ ہوئی۔ اس صورتحال نے ان کو آزردہ کیا جس سے جوشِ حمیت نے ان کے اندر غضبناکی پیدا کی۔ جس کا سبب قوم کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے دین کی ناقدری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ ...... بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ گمان کیا کہ ان کے اپنی قوم کو چھوڑ کر نکل جانے سے اللہ تعالیٰ کوئی گرفت نہیں فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا کہ میں کس حد تک یہاں محنت کر چکا ہوں اور قوم کے رویئے نے مجھے کس حد تک مایوس کیا ہے۔ اس پر اگر آپ غور کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ سراسر فطری جذبہ تھا جس میں کوئی قابلِ گرفت بات نہیں البتہ حضرت یونس کو جوشِ غیرت میں اس بات کی طرف توجہ نہیں ہوسکی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جس محاذ پر مامور کیا ہے وہ اس کے اذن اور اجازت کے بغیر اسے چھوڑ

Marfat.com

نہیں سکتے۔ یہ ایک ایسی اجتہادی فروگزاشت تھی جو کسی عام شخص سے ہوتی، وہ اپنی ذات میں کتنا بھی نیک ہوتا لیکن پیغمبر نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ اس پر کبھی گرفت نہ فرماتا۔ لیکن حضرات انبیائے علیہم السلام چونکہ تمام انسانیت کیلئے نمونہ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان سے کوئی ادنیٰ لغزش بھی صادر ہوتی ہے تو پروردگار اس کی اصلاح فرماتے ہیں تاکہ اصلاح و تربیت کا اعلیٰ نمونہ متاثر نہ ہونے پائے۔

حضرت یونس علیہ السلام نے جو دُعا کی، اسے عام طور پر آیتِ کریمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ امام احمد، امام ترمذی اور دیگر محدثین سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

”دَعوَةُ ذِی النُّونِ اِذَا دَعَارَبَّه وَهُوَ فِی بَطْنِ الْحُوتِ لَااِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِینَ، لَم یَدْعُ بِهَارَجُلٌ مُسْلِمٌ فِی شَیْیءٍ اِلَّااِسْتَجَابَ لَهُ.“

یعنی حضرت ذی النون کی وہ دُعا جو مچھلی کے شکم میں انہوں نے کی تھی جو مسلمان جس مشکل میں ان الفاظ سے دُعا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی دُعا قبول فرمائے گا۔ حاکم نے ایک اور ارشادِ نبوی اس طرح نقل کیا ہے۔

الااخبرکم بشیىء اذا نزل باحدمنکم کرب اوبلاء فدعا به الافرج الله عنه قیل بلی یارسول الله.

حضور نے اپنے صحابہ سے پوچھا کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتادوں کہ جب تمہیں کوئی غم اور مصیبت لاحق ہو اور تم اس سے بارگاہ الٰہی میں التجا کرو تو اللہ تعالیٰ تمہاری مشکل آسان فرمادے۔ صحابہ نے عرض کی اے اللہ کے رسول ضرور ارشاد فرمایئے تو حضورؐ نے یہی دُعا ارشاد فرمائی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما سے قضائے حاجات کیلئے نفل پڑھنا بیان فرمایا۔ ناظرین کے فائدہ کیلئے ان کی ترتیب بھی لکھی جاتی ہے۔

”مجھ کو میرے والد مرشد نے اجازت فرمائی ہے کہ انسان حاجاتِ مشکلہ کے برآنے کے واسطے چار رکعتیں پڑھے۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْن فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْن کو سوبار پڑھے۔ دوسری رکعت میں فاتحہ کے بعد رَبِّ اِنِّی مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْن۔ سوبار پڑھے۔ تیسری رکعت میں فاتحہ کے بعد وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ سوبار۔ چوتھی رکعت میں بعد فاتحہ کے قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل پھر سلام پھیر کر سوبار یہ کہے رب انی مغلوب فانتصر۔

شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؒ نے ارشاد فرمایا کہ یہ چاروں آیتیں اسمِ اعظم ہیں کہ ان کے وسیلے سے جو سوال کیا جائے اور جو دُعا کی جائے قبول ہوتی ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۸﴾

Marfat.com

(پس ہم نے ان کی پکار کو قبول فرمالیا اور ہم نے انہیں غم سے نجات دے دی اور ہم اسی طرح اہلِ ایمان کو نجات دیتے ہیں۔ ۸۸)

حضرت یونس علیہ السلام کی دُعا کی قبولیت

جب مچھلی کے پیٹ اور سمندر کے اندر ہزاروں ظلمات میں گھرے ہوئے حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے اللہ کو پکارا، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اس کی پکار کو قبولیت کا شرف بخشا۔ وہ زمین کے پاتال میں پہنچ چکا تھا جہاں کسی انسان کا شاید تصور بھی نہ پہنچ سکے، لیکن اللہ تعالیٰ ہر جگہ سنتا اور دستگیری فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت یونس علیہ السلام کی دستگیری کی گئی اور انہیں اس غم سے نجات دے دی جس سے ان کا جگر کٹتا جارہا تھا۔ یہ غم درحقیقت دہرا غم تھا۔ ایک غم اس بات کا کہ ایسے ہولناک اندھیروں سے میں کیونکر نجات پاسکوں گا۔ یہاں تو کوئی میری فریاد سننے والا نہیں۔ ایک ہی ہے جو ہر ایک کی اور ہر جگہ سنتا ہے۔ چنانچہ اسی کو اس نے پکارا۔ اور دوسرا غم یہ کہ میں جو اپنی قوم سے اذنِ الٰہی کے بغیر نکل آیا اور یہ خیال نہ کیا کہ میں فرض کی ادائیگی کے دوران اپنا محاذ نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے یہ سمجھا کہ میں ان پر اتمام حجت کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا دین پہنچانے اور سمجھانے بجھانے میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ اب اگر ان کی اذیت رسانیوں سے بچنے کیلئے انہیں چھوڑ کر چلا بھی جاؤں تو اس پر اللہ تعالیٰ گرفت نہیں فرمائے گا اور ممکن ہے کہ قوم میرے چلے جانے کے بعد اپنے رویئے پر نظر ثانی کرے۔ لیکن میری یہ سوچ ایک اجتہادی فروگزاشت تھی جس کی وجہ سے یہ سرزنش ہوئی ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے اس قبر سے مجھے نجات بھی دے دی تو جو فروگزاشت مجھ سے ہو چکی ہے جو میرا حقیقی غم ہے کیا اللہ تعالیٰ اسے بھی معاف فرمائے گا یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے یونس کو ہر طرح کے غم سے نجات دے دی۔ مچھلی کے پیٹ سے بھی باہر آ گئے اور جب اپنی قوم میں دوبارہ گئے تو ساری قوم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئی۔

آیت کے آخری جملے میں ارشاد فرمایا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی سرگزشت سنانا محض زیبِ داستان کیلئے نہیں اور نہ اس سے مقصود داستان سرائی ہے بلکہ اس سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کو اطمینان دلانا ہے کہ حالات چاہے آپ کیلئے کیسے ہی ناماعد کیوں نہ ہوں اور اسلامی دعوت کیلئے لوگوں نے آگے بڑھنے میں کیسی بھی مشکلات کھڑی کر دی ہوں آپ اس سے نہ گھبرائیں۔ آپ کے سر پر اس ذات کا سایہ ہے جو ہر طرح کے حالات سے نجات دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب انہیں تاریکیوں سے کامیابی کی سحر طلوع ہوگی اور اسلامی انقلاب برپا ہو جائے گا۔

قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو یہ پیغام دینا ہے کہ مشکلات کی تاریکیوں سے نکالنا اور مایوس کن حالات سے امید کا چراغ روشن کرنا یہ صرف حضرت یونس علیہ السلام کیلئے خاص نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہر دور کے مسلمانوں کیلئے ہے جب بھی مسلمان عہد وفا نبھانے میں کمی نہ کریں اور اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے راستے میں قربان کرنے کیلئے تیار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ انہیں بھی اسی طرح مشکلات سے نجات دے گا اور کامیابیوں سے ہمکنار کرے گا۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾

(اور زکریا کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ اور تو بہترین وارث ہے۔ ۸۹)

Marfat.com

حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا کی قبولیت

حضرت زکریا علیہ السلام کی سرگزشت تفصیل سے سورۂ مریم میں گزر چکی ہے۔ انہوں نے بھی نہایت مایوس کن حالات میں اللہ تعالیٰ سے اولاد کیلئے دُعا کی تھی جبکہ آپؑ کی عمر باپ بننے کی عمر سے گزر چکی تھی۔ سر ملنے لگا تھا اور بیوی بانجھ ہو چکی تھی۔ آپؑ تیزی سے آخری منزل کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن فکر اس بات کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے دین کا جو چراغ جلائے رکھنے کی مجھے توفیق دی ہے میرے اعزا و اقرباء سب نااہل اور دین سے بیگانہ ہیں۔ ان میں کوئی ایک بھی اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں اور میرا اپنا کوئی بیٹا نہیں جس سے میں اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی امید کرسکوں۔ الٰہی تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ اپنے خاص فضل و کرم سے مجھے تنہا نہ چھوڑ اور مجھے بیٹا عطا فرما۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تیرے دین کا کام میری ذات یا میری اولاد کا محتاج نہیں۔ تو اپنے دین کا خود بہترین وارث ہے لیکن میں تو یہ دُعا اس لئے کر رہا ہوں کہ تیرے دین کی خدمت کی جو سعادت میرے خاندان کو حاصل رہی ہے اس سے یہ خاندان محروم نہ ہو جائے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝۹۰

(تو ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور ہم نے اس کو یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کیلئے سازگار کر دیا، بیشک یہ لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والے اور امید و بیم میں ہمیں پکارنے والے اور ہمارے ہی سامنے عجز و نیاز کرنے والے تھے۔ ۹۰)

حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا کا مقصد

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے زکریا کی دُعا کو قبول فرمایا، انہوں نے چونکہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کیلئے وارث مانگا تھا یعنی ایسا بیٹا جو میراثِ یعقوب کا حق ادا کر سکے۔ چنانچہ ہم نے انہیں یحییٰ جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ اور سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں ہم نے ان کی شخصیت کے بارے میں بطورِ خاص اس بات کو نمایاں کیا ہے کہ حضرت یحییٰ نے زندگی بھر نہ ایسی غذا کھائی جو عام طور پر کھائی جاتی ہے، نہ کوئی سلا ہوا کپڑا پہنا۔ جنگلی شہد ان کی خوراک رہا اور ایک پرانا کمبل درمیان میں پھاڑ کر ان کا ملبوس بن جاتا اور ان کی زندگی کی مصروفیات میں اللہ تعالیٰ کے دین کیلئے تگ و دو کے سوا کسی اور مصروفیت کا گزر تک نہ ہو سکا۔

اور قبولیتِ دُعا میں اس بات کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ محترمہ بانجھ ہو چکی تھیں یعنی اولاد پیدا کرنے کی عمر سے گزر چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دُعا کو قبول فرماتے ہوئے آپؑ کی زوجہ محترمہ کو استقرارِ حمل اور وضعِ حمل کے قابل بنا دیا اور شاید یہ بھی مراد ہو کہ ان کی صحت اس قابل بنا دی کہ وہ سہولت سے بچے کی تربیت کر سکیں۔

آیت کے دوسرے حصے میں اِنَّهُمْ کی ضمیر کا مرجع یا تو حضرت زکریا علیہ السلام سے وابستہ لوگ ہیں۔ ان میں کچھ اعزا بھی ہو سکتے ہیں اور کچھ آپؑ کے شاگرد جو اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کیلئے وقف کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ ایسے تھے کہ جو نہ صرف نیکوکار تھے بلکہ نیکی کی طرف ان کا میلان سبقت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ان کے اندر تنافسِ دنیا نہیں بلکہ دین اور

Marfat.com

بھلائی کیلئے تنافس کا جذبہ غالب تھا اور وہ ہر حال میں امید ہو یا خوف، اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے تھے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے لو لگانے والے اللہ تعالیٰ کے سامنے سرافگندہ اور اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرنے والے تھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اِنَّھُمْ کی ضمیر کا مرجع متذکرہ بالا انبیائے کرام کو ٹھہرایا جائے۔ اور پھر آگے جو صفات بیان ہوئی ہیں انہیں ان کا موصوف قرار دیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں مفہوم بیک وقت مراد لئے جائیں۔

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْھَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰھَا وَابْنَھَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۱﴾

(اور یاد کرو اس پاکدامن بی بی کو جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا، تو ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا والوں کیلئے (اپنی قدرت کی) نشانی بنا دیا۔ 91)

حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ

ان عظیم شخصیتوں کا ذکر ہو رہا ہے جنہوں نے ہر طرح کے ناموافق حالات میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا اور پھر اسی کو پکارا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر اور استقامت کی لاج رکھی اور ان کی دُعاؤں کو قبول فرماتے ہوئے ان کو کامیابیوں سے نوازا۔ انہیں میں سے حضرت مریم علیہا السلام بھی ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے اظہار اور اپنی ایک نشانی دکھانے کیلئے بہت بڑے امتحان میں ڈالا۔ نہایت نیک نام خاندان کی دختر نیک اختر ہوتے ہوئے کنوارپن میں انہیں بچے کی ماں بننے کی آزمائش میں مبتلا کیا۔ انہوں نے ہر طرح کے حالات میں جس طرح اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کی اور جس طرح اس عظیم ابتلا سے نہایت استقامت اور صبر کے ساتھ گزریں، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے احسانات سے نوازا۔

توالد و تناسل کیلئے اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ نر اور مادہ کے اتصال سے سے توالد کا سلسلہ چلتا ہے اور انسانوں میں بھی اسی طرح نوعِ انسانی کا قافلہ چلتا رہا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ دنیا کو یہ دکھایا جائے کو نوعِ انسانی کا یہ قافلہ اپنے آپ محوِ سفر نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا قانون ہے جس کے نتیجے میں یہ قافلہ چل رہا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اس قانون کو توڑ کر بغیر مرد اور عورت کے اتصال کے بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اپنی اس قدرت کے اظہار کیلئے حضرت مریم علیہا السلام کا انتخاب ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اظہار میں تو کوئی دشواری نہ تھی لیکن حضرت مریم علیہا السلام کیلئے اس ابتلا سے گزرنا ہزاروں مشکلات سے گزرنا تھا۔ خاندان کی نیک نامی کو بٹہ لگاتا تھا، اپنی ذات اور اپنی شرم و حیاء کو لمبی زبانوں کی سولی پر لٹکاتا تھا لیکن حضرت مریم علیہا السلام نے یہ سب کچھ برداشت کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس نشانی کے اظہار اور استقرارِ حمل کیلئے جو طریقہ اختیار کیا وہ نفخِ روح تھا۔ اس سے سینٹ پال اور دوسرے گمراہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش نفخِ خداوندی سے ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؑ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات چونکہ ازلی اور ابدی ہیں، اس لئے آپؑ بھی ازلی اور ابدی ہیں۔ اور مزید براں یہ کہ صفات چونکہ موصوف کا حصہ ہوتی ہیں اور اس سے منفک نہیں ہو سکتیں۔ بنابریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی خداوند ذوالجلال سے الگ نہیں بلکہ اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ چنانچہ اسی گمراہی کے ازالے کیلئے پروردگار نے فرمایا۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ''بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرت آدم کی مثال کی طرح ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو ماں اور باپ دونوں کے بغیر صرف کلمۂ کن سے پیدا کیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بغیر

Marfat.com

باپ کے کلمۂ کن سے پیدا کیا گیا ہے اور مزید یہ بات کہ پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ''پس جب میں اسے پورا بنالوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا''۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی روح کے نفخ سے پیدا کیا۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اپنی روح کے نفخ سے پیدا کیا۔ لیکن آج تک کبھی کسی شخص نے یہ نہیں کہا کہ آدم خدا ہیں، خدا کے بیٹے ہیں یا خدائی میں شریک ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ معمول کے طریقۂ تخلیق کی بجائے جب اللہ تعالیٰ کسی کو براہِ راست اپنے حکم سے وجود میں لاکر زندگی بخشتا ہے تو اس کو اپنی روح سے پھونکنے کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے اور اس روح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف غالباً اس وجہ سے کی گئی ہے کہ اس کا پھونکا جانا معجزے کی غیر معمولی شان رکھتا ہے۔ لیکن بر خود غلط لوگوں نے اس کو اپنی خانہ ساز تعبیروں سے کچھ سے کچھ بنا کے رکھ دیا۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾

(یہ تمہاری امت، ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمہارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو۔ ۹۲)

خلاصۂ بحث

اس آیت کریمہ میں تمام انسانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ تم نے مذکورہ آیات میں جو مختلف انبیائے کرام کا تذکرہ پڑھا ہے اس سے ممکن ہے تمہیں یہ غلط فہمی ہو کہ ان میں سے ہر پیغمبر اپنی الگ امت کا بانی رہا ہے اور ہر پیغمبر نے اپنی امت کو ایک الگ دین سکھایا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے اختلاف کا سبب درحقیقت مختلف انبیائے کرام ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ جو دنیا میں مذاہب کے نام پر الگ الگ گروہ بنے ہیں اس کے بنانے والے گمراہ لوگ تھے۔ تمام انبیائے کرام ایک ہی دین کے داعی بن کر آئے تھے۔ سب نے توحید کی دعوت دی، سب نے آخرت میں جوابدہی سے خبردار کیا، سب نے اللہ تعالیٰ ہی کے احکام پہنچائے اور اسی کی نازل کردہ شریعت پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ان کے عقائد اور اصول میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ بعض جزوی احکام میں اختلاف تھا جو حالات کے اختلاف کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ آج بھی جو پیغمبر تشریف لائے ہیں یہ وہی دعوت پیش کر رہے ہیں جو تمام انبیائے کرام کی دعوت تھی اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ میں تمہارا رب ہوں اس لئے تم صرف میری عبادت کرو، یعنی میرے احکام پر چلو، میرے سامنے سر جھکاؤ، مجھ سے امیدیں باندھو اور مجھ ہی سے خوف کھاؤ اور زندگی کے ہر معاملے میں میری ہی شریعت کے فیصلے قبول کرو۔

بعض اہلِ علم نے امت کا معنی دین کیا ہے۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بات ایک ہی ہے کہ تمہارا دین ایک ہی دین ہے اور اس کی بنیاد وحدتِ رب اور وحدتِ اب پر ہے۔ مجھے ایک مانو، میری توحید کو دستور العمل بناؤ اور میری ہی عبادت کرو۔

وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ۗ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾

(اور انہوں نے اپنا دین پارہ پارہ کر ڈالا، ہر ایک کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔ ۹۳)

Marfat.com

دین میں اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ

مختلف مذاہب اور مختلف گروہ لوگوں کے باہمی بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔ لوگوں نے دین میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں اور ہر گروہ نے اپنی خواہشات کو دین میں داخل کر دیا۔ اس طرح سے دین کو پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی تشریف آوری کے بعد نوعِ انسانی کیلئے از سرِ نو ایک بنیاد فراہم کر دی گئی ہے۔ دین کو کامل کر دیا گیا ہے، تمام شریعتوں کو جامع اور کامل شکل میں ایک شریعت کی صورت میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اسے قبول کر کے اپنی متاعِ گم گشتہ کو حاصل کیا جا سکتا ہے اور اگر آج بھی مخالفت کرنے والے اس نعمت کی قدر کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ انہیں بہر صورت ہمارے پاس آنا ہے۔ پھر انہیں ایک ایک بات کا جواب دینا پڑے گا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ
وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾
حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ
يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا
ظٰلِمِيْنَ ﴿٩٧﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۗ
اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿٩٨﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۗ وَ
كُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٩٩﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾
لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ
خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۗ
هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ

Marfat.com

كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا
عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ
الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِیْ
هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ؕ ﴿۱۰۶﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ
فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى
سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ
يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ
اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ
رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى
مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

رکوع: ۶۔ (پس جو شخص نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو اس کے کام کی ناقدری نہیں ہوگی اور ہم اس کیلئے (اس کے اعمال کو) لکھنے والے ہیں۔ ۹۴) اور ناممکن ہے اس بستی پر جسے ہم نے ہلاک کر دیا ہو، وہ پھر پلٹ سکے۔ ۹۵) یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نیچے اترنے لگیں گے۔۹۶) اور قریب آ گیا ہے سچا وعدہ تو یکایک ان لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا،

Marfat.com

وہ پکاریں گے، ہائے ہماری بدبختی ہم اس سے غفلت میں پڑے رہے بلکہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔۹۷) بیشک تم اور تمہارے وہ معبود جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو جہنم کا ایندھن بنو گے، تم لازماً اس میں داخل ہو کر رہو گے۔ ۹۸) اگر یہ لوگ معبود ہوتے تو وہ جہنم میں داخل نہ ہوتے اور (جھوٹے خدا اور ان کے پجاری) سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۹۹) ان کیلئے اس میں (شدت عذاب سے) چلانا ہوگا اور وہ اس میں اور کچھ نہ سن سکیں گے۔۱۰۰) بیشک جن کیلئے اچھے انجام کا ہماری جانب سے وعدہ ہو چکا ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ ۱۰۱) وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے وہ ان (نعمتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۰۲) اس دن ان کو بڑی گھبراہٹ کا غم لاحق نہ ہوگا اور فرشتے ان کا خیر مقدم کریں گے (کہیں گے) یہ ہے آپ کا وہ دن جس کا آپ لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ۱۰۳) اس دن کا خیال کرو جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق کو لپیٹتے ہیں، جس طرح ہم نے پہلی دفعہ خلقت کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کا اعادہ کریں گے، یہ ہمارے ذمہ ایک حتمی وعدہ ہے، بیشک ہم یہ کر کے رہیں گے۔ ۱۰۴) ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔ ۱۰۵) بیشک اس قرآن میں ہمارے عبادت گزار بندوں کیلئے بڑی آگاہی ہے۔۱۰۶) اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کیلئے سراپا رحمت بنا کے بھیجا۔ ۱۰۷) کہہ دیجئے کہ میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم اپنے کو اسی کے حوالہ کرتے ہو ۱۰۸) اگر وہ پھر بھی روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے تم سب کو یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے، اب میں یہ نہیں جانتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ۱۰۹) بیشک وہ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم اپنے دل میں چھپاتے ہو۔ ۱۱۰) اور مجھے نہیں معلوم، شاید یہ (مہلت) تمہارے لئے ایک آزمائش اور فائدہ اٹھا لینے کی ایک مہلت ہو۔ ۱۱۱) آنحضرتؐ نے عرض کی، اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور ہمارا رب رحمٰن ہی ہے جس سے مدد کی درخواست ہے ان باتوں کے مقابلے میں جو تم بیان کرتے ہو۔ ۱۱۲)

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

(پس جو شخص نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو اس کے کام کی ناقدری نہیں ہوگی اور ہم اس کیلئے (اس کے اعمال کو) لکھنے والے ہیں۔ ۹۴)

بہت بڑی بشارت

گزشتہ امتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیائے کرام اور رسولانِ گرامی تشریف لاتے رہے اور مختلف ادوار میں انسانوں کی اصلاح کیلئے مقدور بھر مساعی انجام دیتے رہے، لیکن نزولِ قرآن کے وقت دنیا کا یہ حال ہے کہ اہلِ دنیا نے انسانی شیرازہ بندی اور اللہ تعالیٰ کے دین کی وحدت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے ہر دردمند دل محسوس کرتا ہے کہ شاید اس دنیا کا مقدر اب کبھی نہیں بدلے گا

Marfat.com

اور تباہی اس کیلئے لکھ دی گئی ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس ناگفتہ بہ حالت میں بھی امید کا ایک چراغ روشن کیا گیا ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ انسانوں نے اگرچہ اپنی قسمت بگاڑنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے اپنی رحمت سے انسان کو محروم نہیں فرمایا کیونکہ انسان وقتی اور کمزور جذبات کا شکار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس طرح کے تمام جذبات سے پاک اور ماورا ہے۔ انسان سرکشی اور تمرد کا راستہ اختیار کرتا ہے لیکن اس کی ذات اسے ہمیشہ ڈھیل دیتی رہتی ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا جارہا ہے کہ آج بھی جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ضروریاتِ دین کا یقین پیدا کرے اور اس کی شریعت کے مطابق اپنے اعمال کی اصلاح کرے اور پھر ہر عمل کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد بنائے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایسے شخص کی مساعی کو کبھی رد نہیں کیا جائے گا۔ اس کی کوشش کی کبھی ناقدری نہیں ہوگی، اس کے ہر عمل کو قبولیت کے ترازو میں تولا جائے گا، وہ دنیا میں بھی اپنے اعمال کا پھل کھائے گا اور قیامت کے دن بھی اس کے اعمال محفوظ اور مکتوب حالت میں اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے جائیں گے اور انہیں کے مطابق اس کے ساتھ جزاء اور سزا کا معاملہ ہوگا۔

اس آیت کا پیغام ایسا حوصلہ افزاء اور روح کو سرشار کرنے والا ہے کہ جس نے نہ جانے کتنی مرجھائی ہوئی امیدوں کو از سرِ نو زندگی بخشی اور تباہی کے کنارے کھڑے انسان کو ایک روشن راستہ دکھایا اور مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انتہائی رحمت کا سلوک فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ ایمان و اخلاص کی روشنی میں کیے ہوئے اعمال اللہ تعالیٰ کو اس قدر محبوب ہیں کہ وہ انہیں نہ صرف محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ اس کو محفوظ کرنے کے اسباب بھی فراہم کرتا ہے اور اس کے کارکنان اس کے ایک ایک قول اور فعل کو کتابت کی صورت میں محفوظ کر دیتے ہیں۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾

(اور ناممکن ہے اس بستی پر جسے ہم نے ہلاک کر دیا ہو، وہ پھر پلٹ سکے۔ ۹۵)

یہاں حرام کا معنی ممنوع ہے۔ قال الراغب الحرام الممنوع.

ایک وارننگ

سابقہ آیتِ کریمہ میں جس طرح نوعِ انسانی کیلئے امید کا ایک چراغ جلایا گیا اسی طرح نوعِ انسانی کیلئے اس چراغ کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے ایک وارننگ بھی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اپنی جگہ لیکن انسانوں کو یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا قانون اس قدر بے لچک ہے کہ جب کوئی قوم اپنے وقت کے پیغمبر پر ایمان نہیں لاتی اور اس کی طرف آنے والی کتاب کو وظیفۂ عمل نہیں بناتی بلکہ مخالفت پر کمربستہ ہو جاتی ہے اور مخالفت میں بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اس ہدایت کے چراغ کو ہمیشہ کیلئے گل کرنے کے منصوبے باندھنے لگتی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آتی ہے تو اس کا عذاب اس کی محرومی اور تباہی کا پیغام بن کر نازل ہوتا ہے اور اس قوم کی جڑ مار دی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی بات کی طرف توجہ دلانے کیلئے فرمایا گیا ہے کہ اس طرح کی جس بستی پر بھی ہمارا عذاب نازل ہو چکا ہے اس کے بارے میں یہ بات حتمی ہے کہ ان معذب قوموں میں سے کوئی قوم دوبارہ سر نہیں اٹھا سکتی اور ان کی نشاۃ ثانیہ اور حیاتِ نو کا تصور بھی ممکن نہیں۔

اور اس کا بھی کوئی امکان نہیں کہ دوبارہ انہیں وجود سے بہرہ ور کیا جائے گا اور نئی زندگی دے کر دوبارہ اس دارالامتحان میں بھیج دیا

Marfat.com

جائے گا۔اب تو انہیں صرف قیامت کو اپنے کرتوتوں کا جواب دینا ہے۔

جس طرح کوئی معذب قوم دوبارہ زندہ نہیں کی جاتی، اسی طرح اگر کسی قوم کی مسلسل سرکشی اور تمرد کی وجہ سے ہدایت سے محرومی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے تو پھر اسے توبہ اور انابت الی اللہ کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کے رسول کی ہزار کوششوں کے باوجود بھی وہ قوم کبھی ہدایت سے نوازی نہیں جاتی۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بیان کردہ ان تمام مفاہیم کا امکان موجود ہے اور قریشِ مکہ کو اس آیت کے واسطے سے آئینہ دکھانا مقصود ہے تا کہ وہ اچھی طرح اس آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر کوئی سا فیصلہ کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾

(یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نیچے اترنے لگیں گے۔ ۹۶)

''حدب'' اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔اس کی جمع ''حداب'' ہے۔ ''ینسلون'' نسلان الذئب سے ماخوذ ہے، بھیڑیئے کی سرعت رفتار کو کہتے ہیں۔

یاجوج وماجوج سے مراد

یاجوج اور ماجوج کے متعلق تفصیلی بحث سورۂ کہف میں گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ کہف آیت ۹۴۔لیکن وہاں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین جب ایشیا کے شمال مشرقی علاقے میں پہنچے ہیں تو وہاں پہاڑوں کے دامن میں رہنے والوں نے شکایت کی تھی کہ وقتاً فوقتاً یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہو کر تباہی مچا دیتے ہیں۔ چونکہ وہ ان پہاڑوں کے پیچھے رہتے ہیں اور مختلف قبائل کی صورت میں کھلے آسمان کے نیچے فطری زندگی گزار رہے ہیں۔ان کی کثرتِ تعداد اور خوف وخطر سے بے نیاز طبیعت کے باعث متمدن ممالک ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔آپ ہمارے اور ان کے درمیان پہاڑوں کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیجئے تا کہ وہ ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ ذوالقرنین ان کے راستے میں ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دی اور اس طرح سے اس وقت کی متمدن دنیا کو ان کی یلغار سے محفوظ کر دیا۔

بیشتر مؤرخین کا خیال ہے کہ یاجوج و ماجوج سے مراد روس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری، منگولی، ھن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ بائبل کی کتاب پیدائش (باب ۱۰) میں ان کو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے۔حزقی ایل کے صحیفے (باب ۳۸۔۳۹) میں ان کا علاقہ روس اور توبل (موجودہ توبالسک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی مؤرخ یوسیفوس ان سے مراد سیتھین قوم لیتا ہے جس کا علاقہ بحر اسود کے شمال اور مشرق میں واقع تھا۔ جیرم کے بیان کے مطابق ماجوج کا کیشیا کے شمال میں، بحر خزر کے قریب آباد تھے۔لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جن یاجوج و ماجوج کا ذکر ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ انہیں یاجوج و ماجوج کی اولاد ہیں یا یہ کوئی اور قوم ہیں جنہیں کسی خاص مناسبت کے باعث یاجوج وماجوج کہا گیا ہے۔ان کا ظہور قربِ قیامت میں ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کا مشہور ارشاد جسے مسلم نے حذیفہ بن اسید الغفاریؓ کی روایت سے نقل کیا ہے، اس میں بھی یاجوج ماجوج کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اس حدیث میں بیان کردہ تمام نشانیوں کا تعلق قربِ قیامت سے ہے۔آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ دھواں، دجال، دابۃ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع،

Marfat.com

حضرت عیسیٰ ابن مریم کا نزول، یاجوج وماجوج کی یورش اور تین بڑے خسوف ایک مشرق میں، دوسرا مغرب اور تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی۔

ان کا صحیح تعین تو مشکل ہے، اسی وجہ سے مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ نے فوائد القرآن میں جو کچھ لکھا ہے ہم اس کو نقل کر رہے ہیں۔ وہ بالکل ایک مختلف بات کی طرف ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔

ایک تحقیق

یاجوج وماجوج کون ہیں؟ کس ملک میں رہتے ہیں؟ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی سد (آہنی دیوار) کہاں ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے متعلق مفسرین ومورخین کے اقوال مختلف رہے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے (واللہ اعلم) کہ یاجوج وماجوج کی قوم عام انسانوں اور جنات کے درمیان ایک برزخی مخلوق ہے اور جیسا کہ کعب احبار نے فرمایا اور نووی نے فتاویٰ میں جمہور علماء سے نقل کیا ہے ان کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے آدم پر منتہی ہوتا ہے مگر ماں کی طرف سے حوا تک نہیں پہنچتا گویا وہ عام آدمیوں کے محض باپ شریک بھائی ہوئے۔ کیا عجب ہے کہ دجال اکبر جسے تمیم داری نے کسی جزیرہ میں مقید دیکھا تھا اسی قوم کا ہو، جب حضرت مسیح علیہ السلام جو محض ایک آدم زاد خاتون (مریم صدیقہ) کے بطن سے بتوسط نفخۂ ملکیہ پیدا ہوئے نزول من السماء کے بعد دجال کو ہلاک کر دیں گے۔ اس وقت یہ قوم یاجوج وماجوج دنیا پر خروج کرے گی اور آخر کار حضرت مسیح کی دعا سے غیر معمولی موت مرے گی۔ اس وقت یہ قوم کہاں ہے؟ اور ذوالقرنین کی دیوار آہنی کس جگہ واقع ہے؟ سو جو شخص ان سب اوصاف کو پیش نظر رکھے گا جن کا ثبوت اس قوم اور دیوار آہنی کے متعلق قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں ملتا ہے اس کو کہنا پڑے گا کہ جن قوموں، ملکوں اور دیواروں کا لوگوں نے رائے سے پتہ بتا دیا ہے یہ مجموعۂ اوصاف ایک میں بھی پایا نہیں جاتا۔ لہٰذا وہ خیالات صحیح معلوم نہیں ہوتے اور احادیث صحیحہ کا انکار یا نصوص کی تاویلات بعیدہ دین کے خلاف ہے۔ رہا مخالفین کا یہ شبہ کہ ہم نے تمام زمین کو چھان ڈالا مگر کہیں اس کا پتہ نہیں ملا اور اسی شبہ کے جواب کیلئے ہمارے مخالفین نے پتہ بتلانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا صحیح جواب وہی ہے جو علامہ آلوسی بغدادی نے دیا ہے کہ ہم کو اس کا موقع معلوم نہیں، اور ممکن ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان بڑے بڑے سمندر حائل ہوں، اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہم تمام خشکی اور تری پر محیط ہو چکے ہیں واجب التسلیم نہیں۔ عقلاً جائز ہے کہ جس طرح اب سے پانچ سو برس پہلے ہم کو چوتھے براعظم (امریکہ) کے وجود کا پتہ نہ تھا اب بھی کوئی پانچواں براعظم ایسا موجود ہو جہاں تک ہم رسائی نہ حاصل کر سکے ہوں اور تھوڑے دنوں بعد ہم وہاں تک یا وہ لوگ ہم تک پہنچ سکیں۔ سمندر کی دیوار اعظم جو آسٹریلیا کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے آج کل برطانوی سائنسدان ڈاکٹر سی ایم ینگ کے زیر ہدایت اس کی تحقیقات جاری ہیں۔ یہ دیوار ہزار میل سے زیادہ لمبی اور بعض بعض مقامات پر بارہ بارہ میل تک چوڑی اور ہزار فٹ اونچی ہے جس پر بے شمار مخلوق بستی ہے جو مہم اس کام کیلئے روانہ ہوئی تھی حال میں اس نے اپنی یک سالہ تحقیق ختم کی ہے، جس سے سمندر کے عجیب وغریب اسرار منکشف ہوتے ہیں اور انسان کو حیرت واستعجاب کی ایک نئی دنیا معلوم ہو

Marfat.com

رہی ہے، پھر کیسے دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ہم کو خشکی وتری کی تمام مخلوق کے مکمل انکشافات حاصل ہو چکے ہیں؟ بہرحال مخبر صادق نے جس کا صدق دلائل قطعیہ سے ثابت ہے جب اس دیوار کی مع اس کے اوصاف کے خبر دی تو ہم پر واجب ہے کہ ہم اس کی تصدیق کریں اور ان واقعات کے منتظر رہیں جو مشرکین ومنکرین کے علی الرغم پیش آ کر رہیں گے۔ (حاشیہ قرآن بر ترجمہ شیخ محمود حسن، مطبوعہ مملکۃ عربیہ سعودیہ)

یاجوج وماجوج کا ظہور قربِ قیامت کی علامت ہے

یاجوج وماجوج کوئی بھی ہوں، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ قربِ قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت یاجوج وماجوج کا ظہور بھی ہے۔ قربِ قیامت میں یہ لوگ اپنی پناہ گاہوں سے اتنی بڑی تعداد میں اور اس سرعتِ رفتار کے ساتھ نکلیں گے کہ ساری دنیا فساد سے بھر جائے گی اور وہ اس طرح دنیا پر ٹوٹ پڑیں گے جیسے کوئی شکاری درندہ یکا یک پنجرے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس وقت دنیا کی کیا صورت ہوگی، بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہ چیز متشابہات میں سے ہے اور متشابہات کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ اس وقت قیامت کا وقت انتہائی قریب آ لگا ہوگا۔ یہ قریشِ مکہ اور ان جیسے دوسرے لوگ جو آنحضرت ﷺ اور قرآن کے پیش کردہ دلائل سے مطمئن ہونے والے نہیں، ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب قیامت ان کے سر پر آ کھڑی ہوگی، یہ اس وقت ایمان لانے کی کوشش کریں گے لیکن اس وقت ایمان لانا ان کے کسی کام نہیں آئے گا۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٩٧﴾

(اور قریب آ گیا ہے سچا وعدہ تو یکایک ان لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا، وہ پکاریں گے، ہائے ہماری بدبختی ہم اس سے غفلت میں پڑے رہے بلکہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ٩٧)

قیامت سر پر کھڑی ہے

نبی کریم ﷺ جب قریش کو قیامت کے دن کی جوابدہی سے ڈراتے تھے اور انہیں زندگی کے معاملات میں سنجیدہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے تو وہ قیامت کو بہت دور کی بات سمجھتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ اولاً تو قیامت کا وقوع ہی عقل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ یہ محض ایک ڈراوا ہے جس سے ہمیں اس لئے ڈرایا جاتا ہے تا کہ ہم خوفزدہ ہو کر ان پر ایمان لے آئیں۔ اگر فرض کریں کہ قیامت کا آنا واقعی یقینی ہے تو تب بھی یہ بات تو کسی طرح قرینِ قیاس نہیں کہ قیامت اتنی جلدی آنے والی ہے کہ ہم اپنی زندگی کے پرعیش شب وروز کو اس تصور سے مکدر کر لیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا "وہ اس کو بہت دور خیال کر رہے ہیں لیکن ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔" انسان کی کوتاہی فکر یہ ہے کہ وہ کبھی اس بات پر غور نہیں کرتا کہ غور وفکر اور اندازوں کے پیمانے میرے اور پروردگار کے یکساں نہیں۔ میں جب اپنے پیمانوں سے ناپتا ہوں تو مجھے قیامت بہت دور دکھائی دیتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ایام کے اعتبار سے تو وہ بالکل سر پر کھڑی

Marfat.com

ہے۔انسان کوفکراس بات کی ہونی چاہئے کہ قیامت اگر اچانک آدھمکی تو میں کس حال میں ہوں گا۔اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار نے ارشادفرمایا:

فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا...... کہ آج جبکہ انہیں قیامت کے آنے کا یقین پیدا نہیں ہورہا لیکن جب قیامت آئے گی اور وہ اچانک آئے گی تو اس وقت ان کا حال یہ ہوگا کہ ان کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے،ان کی آنکھیں ایسی ہو جائیں گی جیسے اوپر کہیں ٹنگی گئی ہوں۔نہایت دہشت زدگی کے عالم میں حیرانی کی تصویر بنے فضاء کو تک رہے ہوں گے۔کیونکہ انسان جب کسی ہولناک چیز کو اچانک دیکھتا ہے تو اس کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور وہ دہشت زدہ ہوکر فضاء میں دیکھتا ہی چلا جاتا ہے۔

یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ...... زبانیں تو ان کی بند ہو چکی ہوں گی لیکن ان کی زبانِ حال گویا ہوگی۔ نہایت تأسف اور حسرت سے کہیں گے،ہائے ہماری بدبختی۔ایک ایسی حقیقت جس کی خبر ہر نبی دیتا رہا اور ہمیشہ عقل نے اس کا تقاضا کیا،اور اخلاق اپنی صداقت کیلئے اس سے تائید مانگتے رہے،لیکن ہم اس کا انکار کرتے رہے۔ہمیں یہ سامنے کی حقیقت ایسے لگی جیسے پہاڑ پیچھے کوئی حقیقت چھپی ہو۔ہماری غفلت نے ہمیں سامنے کی حقیقتوں سے بھی محروم کردیا۔

انسان کی اصل کوتاہی

انسان کی عجیب کمزوری یہ ہے کہ جب اس کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں تو وہ سامنے کی چیزوں کو دیکھنے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔انسان کا دل جو قدرت نے ایک مصفا اور مجلا آئینہ بنایا ہے وہ اپنی آب وتاب کھو دیتا ہے۔اسی غفلت نے ہمیں یہ برے دن دکھائے۔کاش!ہم نے کبھی غفلت کے پردے کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی ہوتی۔پھر آگے بڑھ کر وہ یہ کہیں گے کہ ہماری بدنصیبی کا سفر یہیں ختم نہیں ہوتا،کیونکہ ہمیں غفلت سے جگانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے۔نبی آخرالزماں ﷺ نے ہمیں بیدار کرنے کیلئے زندگی کا ہر دکھ برداشت کیا لیکن ہم چونکہ ظلم کا راستہ اختیار کر چکے تھے اس لئے بجائے اللہ تعالیٰ کے نبی کی تنبیہات کو سمجھنے کے اس کا مذاق اڑاتے رہے۔غفلت سے بیدار کرنے والے بعض دفعہ بیدار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن جو شخص خودکشی کا ارادہ کر لیتا ہے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ہم نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا اور خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔آج ہمیں اس کا احساس ہوا ہے تو اب اس کا وقت گزر چکا ہے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾

(بیشک تم اور تمہارے وہ معبود جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو جہنم کا ایندھن بنو گے،تم لازماً اس میں داخل ہوکر رہو گے۔ ۹۸)

تمہارا اعتراف کام نہیں آئے گا

آج تم اپنی قسمت کا ماتم کرتے ہو اور اعتراف کرتے ہو کہ ہم غفلت میں پڑے رہے،اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر نے ہر چند کوشش کی لیکن ہم نے آنکھیں کھولنا گوارا نہیں بلکہ ہم ظلم کے راستے پر چل نکلے۔پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارا یہ اعتراف اور یہ واویلا قیامت میں کسی کام نہیں آئے گا۔تمہارا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہیں بھی جہنم میں پھینکا جائے گا اور تمہارے ان معبودوں کو بھی جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا تھا اور جن کی تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ عبادت کرتے ہو۔ ماتعبدون میں ''ما'' اس بات کا قرینہ ہے کہ

Marfat.com

اس سے مراد ان کے اصنام واحجار ہیں، مشرکین جن کی پوجا کرتے تھے۔ ''ما'' کا استعمال چونکہ بے جان چیزوں کیلئے ہوتا ہے اس لئے اس سے مراد وہ جاندار قوتیں نہیں ہوسکتیں جن کی مشرکین بتوں کے علاوہ پوجا کرتے تھے۔ ان کا ذکر قرآنِ کریم نے بعض دوسرے مواقع پر کیا ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ جن پتھروں کے خداؤں کو تم نے اپنا معبود سمجھا جب تمہیں جہنم میں ڈالا جائے گا تو تمہارے ساتھ انہیں بھی جہنم میں پھینکا جائے گا اور وہ بھی تمہاری طرح جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اس وقت تمہیں شدید احساس ہوگا کہ جنہیں ہم اپنا معبود سمجھ کر پوجتے رہے اور یہ یقین کرتے رہے کہ قیامت کے دن یہ ہمارے سفارشی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کیلئے یہ ہماری شفاعت کریں گے اور آج ان کا حال یہ ہے کہ یہ ہمارے ساتھ جہنم میں جل رہے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ اس آیت پر عبداللہ بن الزبعری نے اعتراض کیا کہ تم یہ کہتے ہو کہ مشرکین کے معبود بھی ان کے ساتھ جہنم میں ڈالے جائیں گے، تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ حضرت مسیح اور حضرت عزیر اور ملائکہ بھی جہنم میں جائیں گے کیونکہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو ابن اللہ ٹھہرایا اور ان کی پوجا کی اور یہود نے حضرت عزیر کو معبود سمجھا اور مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے رہے اور ان سے مرادیں مانگتے رہے۔ تو کیا یہ بھی اپنے پوجا کرنے والوں کے ساتھ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، نَعَمْ كُلُّ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّعْبَدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَهُوَ مَعَ مَنْ عَبَدَهٗ ''ہاں ہر وہ شخص جس نے پسند کیا کہ اللہ تعالیٰ کی بجائے اس کی بندگی کی جائے، وہ جہنم کے عذاب میں ان کے ساتھ ہوگا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین کے ساتھ جہنم میں وہ شخص ڈالا جائے گا جس نے انہیں اپنی بندگی کی تعلیم دی ہو اور جو اپنی بندگی پر خوش ہوتا رہا ہو۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے عمر بھر خلقِ خدا کو بندگیٔ رب کی ترغیب دی لیکن دنیا سے چلے جانے کے بعد لوگوں نے انہیں ہی معبود بنا لیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے نبی اور ولی۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسروں کے جرم میں وہ کیسے ماخوذ ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر علیہما السلام اپنی قوموں کو اللہ تعالیٰ کی توحید سکھاتے اور اس کی بندگی کی تعلیم دیتے رہے، بعد میں لوگوں نے کیا روش اختیار کی، اس کی ان پر کیا ذمہ داری۔ اسی طرح ملائکہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں اور ہر وقت اس کے احکام کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں، انہیں کیا خبر اور ان کی کیا ذمہ داری کہ لوگ ان کے بارے میں کس گمراہی میں مبتلا ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے اہلِ دنیا سے اپنی بندگی کروائی اور طاغوت بن کر زندگی گزاری اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے مقابلے میں لوگوں پر اپنا قانون نافذ کیا، وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں سخت جوابدہی سے گزریں گے۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾

(اگر یہ لوگ معبود ہوتے تو وہ جہنم میں داخل نہ ہوتے اور (جھوٹے خدا اور ان کے پجاری) سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ 99)

ایک واضح اور بے ساختہ دلیل

گزشتہ آیتِ کریمہ میں جو کچھ فرمایا گیا، یہ اس سے متنزع ہونے والی وہ فطری دلیل ہے جسے مشرکین کے سامنے پیش کرنا اصل مقصد ہے کہ جن بتوں کو تم نے خدا بنا رکھا ہے اور ان کی پوجا پاٹ کرتے، ان کے سامنے چڑھاوے پیش کرتے ہو۔ اگر یہ واقعی خدا ہوتے اور ان کی پوجا کرنا جائز ہوتا تو کیا وہ جہنم کا ایندھن بنتے اور انہیں واقعی پروردگار جہنم میں پھینک دیتا۔ کیا سچے معبودوں اور خداؤں کا یہ انجام ہوتا ہے۔ یہ ایک بے ساختہ دلیل ہے کہ ان کا معبود ہونا تو دور کی بات ہے وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ کسی حوالے سے ان کا تذکرہ کیا جائے کیونکہ جس کے بارے میں علم ہو جائے کہ وہ کل کو جہنم کا ایندھن بننے والا ہے، اس سے تو ہزار دفعہ پناہ مانگی جاتی ہے نہ کہ اس کی پوجا پاٹ کی جاتی ہے۔

Marfat.com

مشرکین کی اس روش کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ یہ اپنے معبودوں سمیت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہے گی۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ هُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾

(ان کیلئے اس میں (شدت عذاب سے) چلانا ہوگا اور وہ اس میں اور کچھ نہ سن سکیں گے۔ ١٠٠)

زَفِيْرٌ کا معنی شدتِ عذاب سے چیخنا اور چلانا ہے اور یا زَفِيْرٌ اس پھنکار کو کہتے ہیں جو سخت گرمی اور محنت اور تکان کے باعث آدمی کے منہ سے لمبے سانس کی صورت میں نکلتا ہے۔

کفار کی چیخ و پکار

جو لوگ اپنے شرک کے باعث جہنم میں پھینکے جائیں گے، جہنم کے عذاب کی شدت کے باعث ان کے منہ سے چیخیں نکلیں گی، وہ انتہائی تکلیف میں چلائیں گے اور مدد کیلئے پکاریں گے اور ان پر تکلیف کی شدت کا اس حد تک غلبہ ہوگا کہ ایک دوسرے کی چیخ و پکار بھی انہیں سنائی نہیں دے گی۔ آدمی کیلئے جب کوئی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ عموماً تکلیف کے احساس کے علاوہ باقی ہر طرح کے احساس سے محروم ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے جملے میں ''ھم'' ضمیر کا مرجع بتوں کے پجاری ہیں اور دوسرے جملے میں ان کے اصنام واحجار۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ مشرکین انتہائی تکلیف میں اپنے نام نہاد معبودوں کو پکاریں گے اور وہ جہنم میں ان کے ساتھ ہی ہوں گے۔ لیکن ان ٹھس پتھروں کو کچھ خبر نہیں ہوگی کہ جو زندگی بھر ہماری پوجا کرتے رہے ہیں، آج وہ ہمیں اپنی مدد کیلئے پکار رہے ہیں۔ اس میں ممکن ہے ذہن میں انتشارِ ضمیر کا خلجان پیدا ہو، لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ انتشارِ ضمیر اس صورت میں کلام کا عیب ہے جب مرجع میں التباس کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر یہ اندیشہ نہ ہو بلکہ مرجع کے تعین کیلئے واضح قرینہ موجود ہو تو پھر انتشارِ ضمیر بجائے عیب ہونے کے ایجاز کے پہلو سے کلام کا حُسن بن جاتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىٓ ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٢﴾

(بیشک جن کیلئے اچھے انجام کا ہماری جانب سے وعدہ ہو چکا ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ ١٠١) وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے وہ ان (نعمتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے۔ ١٠٢)

ایک اعتراض کا جواب

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ جب سابقہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی (تو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں) ابن الزبعری نے کہا کہ اگر شرک کی وجہ سے معبود جہنم میں جائیں گے تو جہاں ہمارے معبود یعنی پتھر کے بت جائیں گے وہاں حضرت مسیح، حضرت عزیر اور ملائکہ بھی جائیں گے، کیونکہ ان کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے اچھے انجام کا فیصلہ پہلے ہو چکا

Marfat.com

ہے۔ یعنی انبیائے کرام معصوم پیدا ہوتے ہیں ان کو کسی غلطی پر اللہ تعالیٰ باقی نہیں رہنے دیتا اور قیامت کے دن وہ نہ صرف نجات سے بہرہ ور ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مرتبہ و مقام بھی بہت بلند ہوگا۔ اس لئے یہ کہنا کہ وہ جہنم میں جائیں گے اس سے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے وہ تو جہنم سے انتہائی دور رکھے جائیں گے اور جہنم میں عذاب کے باعث جو چیخ و پکار ہوگی اور خود جہنم کے بھڑکنے کی وجہ سے جو آوازیں پیدا ہوں گی ان میں سے کسی آواز کی آہٹ بھی ان تک نہیں پہنچنے دی جائے گی۔

ایک حیرت انگیز اعزاز

اس آیتِ کریمہ میں مزید فرمایا گیا ہے کہ جن خوش نصیب لوگوں کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا انہیں ایسے عیش و آرام سے نوازا اور ایسی نعمتوں سے بہرہ ور کیا جائے گا جس کا تصور بھی کسی دوسرے کیلئے ممکن نہیں۔

دنیا میں ہفت اقلیم کا بادشاہ بھی ان نعمتوں کا تصور نہیں کرسکتا جو اہلِ جنت کو حاصل ہوں گی۔ ان میں سب سے بڑی نعمت جس کا دنیا میں وجود بھی معدوم ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ جنت اپنے لئے جس عیش و آرام اور جس تنعم کی خواہش کریں گے وہ فوراً انہیں میسر آجائے گا۔ وہاں کوئی ناممکن چیز ناممکن نہیں ہوگی۔ دنیا میں بڑے سے بڑا بادشاہ بھی ہزاروں ایسی نعمتوں سے محروم رہتا ہے جس کی وہ خواہش کرتا ہے۔ ہر صاحبِ اقتدار کی خواہش اس سے مختلف نہیں ہوتی کہ اس کے اقتدار کو کبھی زوال نہ آئے اور ہر بادشاہ ایک ملک کے بعد دوسرے ملک کی فکر میں ہوتا ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا حکمران بھی تکدرات سے محفوظ نہیں ہوتا، اور بڑے سے بڑا عہدہ و منصب اور مال و دولت رکھنے والا ہزاروں ارمان لے کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے لیکن جنت میں نہ کسی تکدر کی گنجائش ہوگی نہ کوئی ارمان اپنی تعبیر سے محروم رہے گا۔

یہ صحیح ہے کہ وہاں کی ابدی زندگی کبھی فنا کا شکار نہیں ہوگی اور ہمارے شاعر نے اسے بھی ایک پابندی قرار دیا اور یہ کہا:

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پروردگار نے اس بات کی خوشخبری دی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ضمانت دی ہے کہ اہلِ جنت، جنت کے قیام سے نہ کبھی آزردہ ہوں گے اور نہ اکتائیں گے اور انہیں کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں ہوگا کہ یہاں سے نکل کر کہیں اور بھی جایا جاسکتا ہے۔ انسان تغیر پسند اور متلون واقع ہوا ہے۔ میدانی علاقوں کے رہنے والے پہاڑوں میں جانا پسند کرتے ہیں اور پہاڑوں کے باسی میدانی علاقوں میں آنا خوشی کا باعث سمجھتے ہیں کیونکہ دونوں علاقوں کی خوشیاں یکجا نہیں ہوسکتیں۔ لیکن جنت میں چونکہ سب خوشیاں میسر ہوں گی اس لئے پروردگار نے فرمایا: لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ......

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

(اس دن ان کو بڑی گھبراہٹ کا غم لاحق نہ ہوگا اور فرشتے ان کا خیر مقدم کریں گے (کہیں گے) یہ ہے آپ کا وہ دن جس کا آپ لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ۱۰۳)

Marfat.com

فزع اکبر سے کیا مراد ہے؟

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ فزع اکبر سے مراد صور کا نفخۂ ثانیہ ہے جس سے سب مردے زندہ ہوکر انصاف کیلئے اٹھ کھڑے ہوں گے بعض حضرات نے نفخۂ اولی کو فزع اکبر قرار دیا ہے۔ ابنِ عربی کا قول یہ ہے کہ نفخہ تین ہوں گے۔ پہلا نفخہ، نفخۂ فزع ہوگا جس سے ساری دنیا کے لوگ گھبرا اٹھیں گے، اسی کو یہاں فزع اکبر کہا گیا ہے۔ آیت ۹۷ میں فرمایا گیا ہے کہ آج یہ لوگ بڑی ڈھٹائی سے قیامت کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن جب وہ دن اچانک آدھمکے گا تو ان کا حال یہ ہوگا کہ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ہولناک دن فزع اکبر سے شروع ہوگا۔ یعنی اس دن کا آغاز ایک ایسے نفخہ سے ہوگا جس سے عظیم گھبراہٹ طاری ہوجائے گی اور ساری دنیا کے لوگ گھبرا اٹھیں گے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اربوں کھربوں مخلوق جس گھبراہٹ کا شکار ہوگی یقیناً اس کے اسباب بے پناہ ہوں گے اور عام ہولناکی اور دہشت پورے ماحول پر چھا چکی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے فضل وکرم کا کیا کہنا کہ اس حال میں بھی اس کے صاحبِ ایمان بندوں پر یہ گھبراہٹ اثر نہیں کرے گی بلکہ اس کے برعکس منظر یہ ہوگا کہ بیشتر لوگ گھبراہٹ کا شکار ہوکر عجیب ناگفتہ بہ حالت میں مبتلا ہوں گے لیکن صاحبِ ایمان لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ آج کے دن کی عام کیفیت کیا ہے وہ نہایت پرسکون حالت میں اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور میدانِ حشر کی طرف رواں دواں ہوجائیں گے اور فرشتے خوش آمدید کہنے کیلئے ان کے راستے میں موجود ہوں گے وہ ایک ایک کا نہایت احترام کے ساتھ استقبال کریں گے، نہایت حوصلہ افزاء کلمات کہیں گے اور انہیں بشارت دیں گے کہ دنیا میں جن ابدی کامرانیوں کو آپ کو مژدہ سنایا جاتا رہا آج انہیں کامرانیوں کے حصول کا مبارک دن ہے اور یہی وہ امید افزاء دن ہے جس کا انبیاء کے واسطے سے آپ سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

يَوْمَ نَطْوِى السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٠٤﴾

(اس دن کا خیال کرو جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق کو لپیٹتے ہیں، جس طرح ہم نے پہلی دفعہ خلقت کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کا اعادہ کریں گے، یہ ہمارے ذمہ ایک حتمی وعدہ ہے۔ بیشک ہم یہ کرکے رہیں گے۔ ۱۰۴)

مشکل الفاظ کی تشریح

سِجِلّ...... اس دفتر یا طومار یا فائل کو کہتے ہیں جس میں لکھے ہوئے اوراق محفوظ کرلئے جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے اس کا ترجمہ صحیفہ منقول ہے۔ کُتُب ...... یہاں اوراقِ نوشتہ کے معنی میں ہے۔

روزِ قیامت کی ہولناکی

روزِ قیامت کی ہیبت اور ہولناکی کو ذہنوں میں مزید پیوست کرنے کیلئے ارشاد فرمایا کہ اس دن ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں

Marfat.com

گے جس طرح اوراقِ نوشتہ کسی فائل میں لپیٹ کر محفوظ کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا ایک ایک ورق الٹ دیا جائے گا۔ اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ میدانِ حشر قائم ہونے سے پہلے نئے سرے سے کائنات کی بساط بچھے گی۔ اب آسمان بھی نئے ہوں گے، زمین بھی نئی ہوگی اور اس کائنات کے فرامین ونوامیس بھی نئے ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ پہلی کائنات کی بساط لپیٹ کر نئی کائنات کو وجود کیسے دے دیا جائے گا؟ اس کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جو ذہن اس بات کو قبول کرتا ہے کہ کائنات اور اس میں بسنے والی ایک ایک مخلوق اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئی ہے اس کیلئے یہ بات جاننا کیا مشکل ہے کہ کسی چیز کا پہلی مرتبہ بنانے والا اسے دوسری مرتبہ پہلی مرتبہ سے زیادہ آسان طریقے سے بنالیتا ہے۔ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ کا یہاں یہی مفہوم ہے۔

وَعْدًا عَلَيْنَا ...... قیامت کا دن لانا ہمارے ذمہ ہے کیونکہ ہم اس کا وعدہ کر چکے ہیں۔ ہم نے انسانوں کو عقل اور شعور دے کر اور انبیائے کرام اور کتبِ الٰہیہ کے ذریعے ہم جن وانس سے یہ وعدہ کر چکے ہیں کہ اگر تم نے ہمارے نازل کردہ احکام وہدایات کے مطابق زندگی گزاری تو ہم تمہیں بہتر سے بہتر جزاء سے نوازیں گے۔ اور جن لوگوں نے ہمارے احکام وہدایات سے انکار کیا اور سرکشی کی روش اختیار کی انہیں ہم بدترین سزادیں گے۔ جن لوگوں نے اس امتحان کو قبول کر لیا ان کے حوالے سے ہمارے وعدے کے مطابق یہ بات ہم پر لازم ٹھہری کہ ہم قیامت کا دن ضرور لائیں۔ مزید براں! اللہ تعالیٰ نے یہ بھی وعدہ فرمایا تھا کہ اگر تم نے میری ہدایت کے مطابق زندگی گزاری تو ہم تمہیں دنیا میں بھی کامیابیوں سے نوازیں گے اور آخرت میں بھی کسی غم واندوہ سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ اب اگر ہم قیامت کو برپا نہیں کرتے تو ہم اپنے وعدوں کا ایفا نہیں کر سکتے۔ اگر دنیا میں نیکی اور بدی برابر ٹھہرے، اچھائی اور بُرائی ایک مول بکنے لگے، محنت کرنے والا اور بدمحنت ایک ترازو میں تولے جائیں، خودغرض اور قربانی وایثار کے پیکر ایک ہی طرح کے نتائج سے بہرہ ور ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں۔ ایک ایسا کارخانہ ہے جس کی کوئی پیداوار نہیں، ایک ایسی کائنات ہے جس میں کہیں کوئی حکمت نہیں جبکہ اس کائنات کا خالق ومالک علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔ اس کے ہر عمل کے پیچھے حکمت ودانش کارفرما ہے۔

اس کائنات کے صحیح محمل کا تعین اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہاں کے رہنے والوں میں ہر شخص اس امید پر کام کرے کہ یہ زندگی حقیقی زندگی نہیں بلکہ حقیقی زندگی کی تیاری کا ایک مرحلہ ہے۔ یہ دارالجزاء نہیں بلکہ دارالعمل ہے۔ یہاں کا ہر شخص اپنی زندگی کا ایک مقصد رکھتا ہے اور اسی مقصد کے حوالے سے قیامت کا آنا ضروری ہے تاکہ وہاں اس کیلئے جزاء وسزا کا فیصلہ ہو سکے۔ یہاں کے مظالم، ہوسکتا ہے کہ کبھی سزا سے نہ گزر سکیں لیکن ایک دن ضرور آئے گا جبکہ ہر ظالم کو اس کے ظلم کی سزا ملے گی اور وہ اس سے بچ نہیں سکے گا۔

اس کائنات کا اصل حُسن اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا اظہار ہے اور صفتِ عدل کا اظہار دنیا میں کماحقہ ممکن نہیں۔ یہاں کے دکھوں کا مداوا دنیا میں کسی حد تک تو ہوسکتا ہے لیکن عدل کے تمام تر تقاضوں کو بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔ اس لئے اس کائنات کے وجود کی توجیہ، انسان کو دیا ہوا فہم وشعور اور نازل کردہ آسمانی نوشتوں کا دنیا سے متعلق تصور اور انبیائے کرام کی دعوت کا موضوع ان میں سے ہر چیز اپنے محمل سے بیگانہ اور حقیقی مفہوم سے ناآشنا ہو جائے گی اگر قیامت برپا نہ کی جائے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ قیامت کا لانا ہم پر لازم ہے اور ہم ایسا ضرور کریں گے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

(ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔ ۱۰۵)

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے زبور میں اپنا یہ فیصلہ لکھ دیا اور اب پھر اس کا اعادہ کر رہے ہیں کہ زمین کے وارث اللہ تعالیٰ نے نیک بندے ہوں گے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زمین سے مراد وہ زمین ہے جس پر ہم رہ رہے ہیں اور اس زمین پر جو لوگ بھی حکومت قائم کر لیتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ جو بالعموم برسر اقتدار رہتے ہیں انہیں کو حق ہے کہ وہ اس زمین کے وارث ہوں۔ اور وہ اپنی جن قوتوں سے بہرہ ور ہو کر زمین کی حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اسی صلاحیت کا حاصل کرنا صالحیت ہے جو صلاحیت کا ہم معنی ہے اور یہی لوگ صالحین کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک دنیا میں جتنی حکومتیں گزری ہیں اور جن لوگوں نے زمین کے بڑے حصے پر کبھی بھی اقتدار حاصل کیا ہے یہی لوگ تھے جن کو صالح قرار دیا گیا ہے اور انہیں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین کا وارث بنایا گیا تھا۔ اس مفہوم کو قبول کر لینے کے بعد پہلی جو بات تسلیم کرنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ فرعون اور نمرود، شداد اور ہامان، ہٹلر اور مسولینی، لینن اور سٹالن علی ہذا القیاس ہماری قریب یا بعید تاریخ میں جتنے بھی بڑے بڑے حکمران گزرے ہیں چاہے وہ پرلے درجے کے کافر اور مشرک ہوں، چاہے وہ چنگیز خاں جیسے ظالم ہوں یا جدید دنیا کے بش جیسے لوگ ہوں ان کا کفر اور شرک، ان کا ظلم اور نفاق، ان کی بداخلاقی اور بے حیائی، ان میں سے بعض حکمرانوں کا خدا سے انکار یہ سب بیکار باتیں ہیں، اصل بات دیکھنے کی صرف یہ ہے کہ ان میں دنیا کے کسی حصے پر اقتدار چھین لینے اور قبضہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے یا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین کے وارث ہیں۔

دوسری بات یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا کہ ماضی میں کتنے عظیم رسول گزرے ہیں جنہیں کسی نہ کسی حکمران کی اصلاح اور ہدایت کیلئے بھیجا گیا اور اگر وہ ہدایت قبول نہیں کرتے تو پھر ان سے اقتدار چھین کر اللہ تعالیٰ کی زمین کے اوپر رہنے والوں کو آزادی سے اللہ تعالیٰ کا دین قبول کرنے کا موقع دیا گیا۔ نہایت اختصار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے اقتدار سے ٹکرائے اور بالآخر فرعون کو تباہ کر دیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود اور اس کی قوم کی ہدایت کیلئے اٹھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو شکست دی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ یمن کو ہدایت کا راستہ دکھایا۔ غرضیکہ دنیا میں آنے والا کوئی رسول بھی پہلے سے تختِ اقتدار پر متمکن حکمرانوں کی حکمرانی کو پختہ کرنے اور سندِ جواز دینے کیلئے نہیں آیا بلکہ ان کا تختہ الٹ کر اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے دین کو نافذ کرنے کیلئے مبعوث ہوا۔ اگر آج کے دانشوروں کا متذکرہ بالا تصور قبول کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پیغمبروں کی دعوت غلط تھی اور ظالم حکمرانوں سے ان کا تصادم سراسر فساد پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان بھی اس بے ہودہ تصور کو قبول نہیں کر سکتا۔

رہی یہ بات کہ اس آیتِ کریمہ کا صحیح مفہوم کیا ہے اس کیلئے ہم نے معارف القرآن کا ایک نوٹ اور پھر تدبرِ قرآن کا ایک نوٹ نقل کیا ہے تاکہ ان سے استفادہ کیا جاسکے۔

ذکر اور زبور کی وضاحت:

لفظ زبور، زُبُرٌ کی جمع ہے، جس کے معنی کتاب کے ہیں اور زبور اس خاص کتاب کا نام بھی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اس جگہ زبور سے کیا مراد ہے اس میں اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ ذکر سے مراد آیت میں تورات ہے اور زبور سے مراد وہ سب کتابیں ہیں جو تورات کے بعد نازل ہوئیں۔ انجیل، زبور، داؤد اور قرآن (اخرجہ ابن جریر) یہی تفسیر ضحاک سے بھی منقول ہے اور ابن زید نے فرمایا کہ ذکر سے مراد

Marfat.com

لوحِ محفوظ ہے اور زبور سے مراد تمام کتابیں جو انبیائے علیہم السلام پر نازل ہوئی ہیں۔ زجاج نے اسی کو اختیار کیا۔

(روح المعانی)

الارض سے کیا مراد ہے؟

الارض...... اس جگہ ارض سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک ارضِ جنت ہے۔ ابن جریر نے ابن عباسؓ سے یہ تفسیر نقل کی ہے اور یہی تفسیر مجاہد، ابنِ جبیر، عکرمہ، سدی اور ابوالعالیہ سے بھی منقول ہے۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ قرآن کی دوسری آیت میں جو یہ فرمایا کہ اس ارض کے وارث صالحین ہوں گے یہ بھی اسی کا قرینہ ہے کہ ارض سے جنت مراد ہو۔ دنیا کی زمین کے وارث تو مؤمنین کافر بھی ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ یہاں صالحین کا وارثِ ارض ہونا ذکر قیامت کے بعد آیا ہے اور قیامت کے بعد جنت کی زمین کے سوا کوئی دوسری زمین نہیں اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس ارض سے مراد عام ارض ہے۔ دنیا کی زمین بھی اور جنت کی زمین بھی۔ جنت کی زمین کے تو تنہا وارث صالحین ہونا ظاہر ہے۔ دنیا کی پوری زمین کے وارث ہونا بھی ایک وقت میں مؤمنین صالحین کیلئے موعود ہے جس کی خبر قرآن کریم کی متعدد آیات میں دی گئی ہے۔ ایک آیت میں ہے، **ان الارض للہ یورثھا من یّشآء من عبادہٖ والعاقبۃ للمتقین** ، ایک دوسری آیت میں ہے **وعداللّٰہ الّذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض الاٰیۃ**، تیسری ایک آیت میں **انّا لننصر رسلنا والّذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدّنیا و یوم یقوم الاشھاد** ،مؤمنین صالحین کا دنیا کے معظم معمورہ پر قابض اور وارث ہونا ایک مرتبہ دنیا پہلے مشاہدہ کر چکی ہے اور زمانہ دراز تک یہ صورت قائم رہی اور پھر حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانے میں ہونے والی ہے۔

(روح المعانی وابن کثیر) (ماخوذ از معارف القرآن)

اس آیت میں زبور کا حوالہ ہے۔ زبور میں یہ بات یوں تو جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ زمین کے وارث خدا کے نیک بندے ہی ہوں گے لیکن باب ۳۷ تو پورے کا پورا گویا صرف اسی ایک حقیقت کی وضاحت کیلئے مخصوص ہے۔ اس وجہ سے ہم یہ پورا باب یہاں نقل کرتے ہیں تا کہ قرآن کے حوالہ کی صحت وصداقت بھی واضح ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ زمین کی وراثت سے یہاں کس زمین کی وراثت مراد ہے۔ نیز مِنْ 'بَعْدِ الذِّکْرِ کا صحیح مفہوم بھی متعین ہو سکے کہ ''ذکر'' سے یہاں کس چیز کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے ہم زبور سے حضرت داؤدؑ کا مزمور نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اس کی ان باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جو آیت زیر بحث کی وضاحت کیلئے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

''تو بدکرداروں کے سبب سے بیزار نہ ہو۔
اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر۔
کیونکہ وہ گھاس کی طرح جلد کاٹ ڈالے جائیں گے۔
اور سبزہ کی طرح مرجھا جائیں گے۔
خداوند پر توکل کر اور نیکی کر۔

Marfat.com

ملک میں آبادرہ اوراس کی وفاداری سے پرورش پا۔
خداوند میں مسرور رہ۔
اور وہ تیرے دل کی مرادیں پوری کرے گا۔
اپنی راہ خداوند پر چھوڑ دے۔
اوراس پر توکل کر۔ وہی سب کچھ کرے گا۔
وہ تیری راست بازی کو نور کی طرح،
اور تیرے حق کو دوپہر کی طرح روشن کرے گا۔
خداوند میں مطمئن رہ اور صبر سے اس کی آس رکھ۔
اس آدمی کے سبب سے جو اپنی راہ میں کامیاب ہوتا۔
اور برے منصوبوں کو انجام دیتا ہے بیزار نہ ہو۔
قہر سے باز آ اور غضب کو چھوڑ دے۔
کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے۔
لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔
کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔
تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا۔
لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے۔
شریر راست باز کے خلاف بندش باندھتا ہے۔
اوراس پر دانت پیستا ہے۔
خداونداس پر ہنسے گا۔
کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کا دن آتا ہے۔
شریروں نے تلوار نکالی اور کمان کھینچی ہے۔
تاکہ غریب اور محتاج کو گرادیں۔
اور راست رو کو قتل کریں۔
ان کی تلوار ان ہی کے دل کو چھیدے گی۔
اوران کی کمانیں توڑی جائیں گی۔
صادق کا تھوڑا سا مال۔
بہت سے شریروں کی دولت سے بہتر ہے۔

Marfat.com

کیونکہ شریروں کے باز و توڑے جائیں گے۔
لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے۔
کامل لوگوں کے ایام کو خدا جانتا ہے۔
ان کی میراث ہمیشہ کیلئے ہوگی۔
وہ آفت کے وقت شرمندہ نہ ہوں گے۔
اور کال کے دنوں میں آسودہ رہیں گے۔
لیکن شریر ہلاک ہوں گے۔
خداوند کے دشمن چراگاہوں کی سرسبزی کی مانند ہوں گے۔
وہ فنا ہو جائیں گے۔ وہ دھوئیں کی طرح جاتے رہیں گے۔
شریر قرض لیتا ہے اور ادا نہیں کرتا۔
لیکن صادق رحم کرتا ہے اور دیتا ہے۔
کیونکہ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے۔
اور جن پر وہ لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔
انسان کی روشیں خداوند کریم کی طرف سے قائم ہیں۔
اور وہ اس کی راہ سے خوش ہے۔
اگر وہ گر بھی جائے تو پڑا نہ رہے گا۔
کیونکہ خداوند اسے اپنے ہاتھ سے سنبھالتا ہے۔
میں جوان تھا اور اب بوڑھا ہوں۔
تو بھی میں نے صادق کو بے کس۔
اور اس کی اولاد کو ٹکڑے مانگتے نہیں دیکھا۔
وہ دن بھر رحم کرتا ہے اور قرض دیتا ہے۔
اور اس کی اولاد کو برکت ملتی ہے۔
بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر۔
اور ہمیشہ تک آباد رہ۔
کیونکہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے،
اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا۔
وہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہیں۔

Marfat.com

پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔
صادق زمین کے وارث ہوں گے۔
اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔
صادق کے منہ سے دانائی نکلتی ہے۔
اور اس کی زبان سے انصاف کی باتیں۔
اس کے خدا کی شریعت اس کے دل میں ہے۔
وہ اپنی روش میں پھسلے گا نہیں۔
شریر صادق کی تاک میں رہتا ہے۔
اور اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔
خداوند اسے اس کے ہاتھ میں نہیں چھوڑے گا۔
اور جب اس کی عدالت ہو تو اسے مجرم نہ ٹھہرائے گا۔
خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ۔
اور وہ تجھے سرفراز کر کے زمین کے وارث بنائے گا۔

ہمارے نزدیک زبور کے اسی مزمور کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ اس مزمور پر غور کیجئے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اس کی نوعیت ایک ترکیب بند کی ہے جس میں پہلے موعظت و نصیحت کی باتیں آتی ہیں پھر بار بار ایک ترجیع یا ٹیپ کے بند کی طرح یہ بات آتی ہے کہ زمین اور ملک کے وارث خدا کے نیک اور متقی بندے ہوں گے۔ یہ اسلوب کلام قرآن کی سورۂ رحمٰن کے اسلوب سے مشابہ ہے جس میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ، کی ترجیع ہے۔ خط کشیدہ فقروں پر نگاہ ڈالئے تو یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ یہاں صالحین و متقین کیلئے زمین کی جس وراثت کا ذکر ہے اس کے ساتھ یہ بشارت بھی ہے کہ یہ وراثت ابدی ہوگی مثلاً فرمایا ہے "ان کی میراث ہمیشہ کیلئے ہوگی۔" دوسری جگہ ہے "اور ہمیشہ تک آباد رہ" تیسری جگہ ہے "وہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہیں" چوتھی جگہ نہایت واضح الفاظ میں ہے "اور صادق زمین کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔"

ظاہر ہے کہ یہ ابدی وراثت کی بشارت اس زمین سے متعلق نہیں ہے جس پر ہم اور آپ آباد ہیں۔ اس کی نہ تو کوئی چیز ابدی ہے اور نہ اس کی وراثت صالحین و متقین کیلئے مخصوص ہے بلکہ یہ زمین اور اس کی ہر چیز فانی ہے اور اس میں نیکوں اور بدوں دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک مدت تک کیلئے یکساں مہلت بخشی ہے جس کے بعد یہ آسمان و زمین دونوں فنا ہو جائیں گے اور نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ایک جہانِ نو پیدا ہوگا جس کی ابدی وراثت صالحین و متقین کو حاصل ہوگی اور اہلِ باطل جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔

بعینہٖ یہی بات قرآن سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ اوپر کی آیت ۱۰۴ میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن اس آسمان

Marfat.com

کی بساط لپیٹ کر رکھ دے گا۔ سورۂ ابراہیم آیت ۴۸ میں آسمان وزمین دونوں سے متعلق یہ تصریح ہے کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (اس دن کو نگاہ میں رکھو جن دن زمین دوسری زمین سے اور آسمان دوسرے آسمان سے بدل دیئے جائیں گے) اس بدلے ہوئے آسمان وزمین کے اندر بلاشبہ یہ قانون ہوگا کہ ان کی ابدی وراثت و بادشاہی صرف صالحین کو حاصل ہوگی۔ نافرمانوں کیلئے اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ یہ بات صرف زبور اور قرآن ہی سے نہیں بلکہ تمام آسمانی صحیفوں اور تمام نبیوں اور رسولوں کی تعلیم سے ثابت ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن نے آیت زیر بحث میں زبور کے حوالہ سے واضح فرمایا ہے۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اترے ہوئے نغمات الٰہی کا مجموعہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جیسا کہ اسی سورہ میں بیان ہوا ہے، نبی بھی تھے اور اس زمین کے ایک جلیل القدر بادشاہ بھی۔ ایک بادشاہ کی زبان ہی سے یہ اعلان سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا کہ زمین کے حقیقی اور آخری وارث صرف اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہی ہوں گے جب ایک صاحب جبروت بادشاہ اس حقیقت کی منادی کر گیا ہے تو کسی دوسرے کیلئے اس میں مجالِ سخن کہاں باقی رہی!!

اس وضاحت کے بعد اب آیت زیر بحث کے اجزاء پر غور کیجئے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ۔ اور زبور کے باب ۳۷ کے حوالہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قرآن نے یہاں زبور کی جس تعلیم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس کے ایک مستقل باب میں نہایت تفصیل کے ساتھ، نہایت مؤثر انداز میں بیان ہوئی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ اسلوب بیان یہ اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل بات ترجیع وتکرار کے ساتھ اس طرح کہی گئی ہے کہ ہر بار اصل بات سے پہلے حکمت وموعظت کی نہایت اعلیٰ باتوں کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اسی چیز کی طرف قرآن نے من بعد الذکر کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس اشارے کی اہمیت یہ ہے کہ درحقیقت یہی نصیحتیں ہیں جن پر عمل زمین کی ابدی بادشاہی کا ضامن ہے۔

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ یہ وہ اصل بات ہے جس کیلئے قرآن نے زبور کا حوالہ دیا ہے۔ زبور کے حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ یہاں زمین سے مراد اس جہانِ نو کی زمین ہے جو قیامت کے بعد وجود میں آئے گی اور جس کے مالک ووارث بلاشرکت غیرے صرف اللہ کے نیکوکار بندے ہوں گے۔ (ماخوذ از تدبر قرآن)

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝١٠٦

(بیشک اس قرآن میں ہمارے عبادت گزار بندوں کیلئے بڑی آگاہی ہے۔ ۱۰۶)

لَبَلٰغًا ...... اس لفظ کی تنکیر تفخیم شان کیلئے ہے۔ ''بلاغ'' کفایت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور منادیِ عام اور بشارتِ عام پر بھی بولا جاتا ہے۔

بلاغ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے اور بندہ بن کر رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں انہیں یہ معلوم ہونا

Marfat.com

چاہئے کہ یہ قرآنِ کریم جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے یہ بندگی کے تمام اصول وضوابط اور تمام آداب کا احاطہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ زندگی کی کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کا جواب قرآنِ کریم میں موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بے حد والا قدر، بالا قامت اور تمام کائنات کی محسن و مربی ہے۔ جو شخص اس کی بندگی کا حق ادا کرنا چاہتا ہے اس کیلئے نہ عقل کفایت کر سکتی ہے اور نہ انسانوں کا تجربہ۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اس مشکل کی عقدہ کشائی خود پروردگار فرمائے۔ چنانچہ اس نے اپنی عظیم کتاب بھیج کر انسان کی تمام ضرورتوں اور اس کے دل و دماغ کی تمام نزاکتوں کا لحاظ فرمایا اور ایک ایسا متوازن ضابطۂ حیات عنایت فرمایا ہے جس کی باریکیوں کو سمجھنا انسان کیلئے آسان نہیں۔ چہ جائیکہ وہ اس سے بہتر ضابطۂ حیات تجویز کر سکے۔ یہ ہر لحاظ سے کافی وشافی ہے۔

دوسرا مفہوم اس آیت کریمہ کا یہ ہوسکتا ہے کہ گزشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کہ زمین کے وارث صرف اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور عبادت گزار بندوں کیلئے ایسا اعلانِ بشارت ہے کہ جس کیلئے انسان کو اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہئے اور جسے بھی یہ آرزو ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی بڑا مقام حاصل کر سکوں اسے اس راستے میں قسمت آزمائی کرنی چاہئے اور اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس حیاتِ چندروزہ کے بکھیڑوں میں الجھ کر میں آخرت میں ہمیشہ رہنے والی بادشاہت اور سعادت کو ضائع نہیں کر سکتا۔ اس لئے مجھے اپنا ایک ایک لمحہ اور مال و دولت میں سے ایک ایک دھیلا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کی بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے صرف کرنا چاہئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٧﴾

(اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کیلئے سراپا رحمت بنا کے بھیجا۔ ۱۰۷)

رحمت کی وضاحت

انسان کیلئے سب سے بڑی رحمت وہ ضابطۂ حیات ہے جس پر عمل کرنے کے نتیجے میں یہ دنیا بھی جنت بن جائے اور آخرت میں ہمیشہ کی زندگی میں سرخروئی کا باعث بنے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ایک تو اس وجہ سے اہلِ دنیا کیلئے رحمت ہے کہ دنیا والوں کو آپ کے واسطے سے وہ پیغام سرمدی ملا ہے جو یہاں بھی اور وہاں بھی کامیابی و کامرانی اور اللہ تعالیٰ کے تقرب کی ضمانت ہے اور مزید یہ کہ یہ پیغام نوعِ انسانی تک پہنچانے کیلئے اللہ تعالیٰ کے رسول نے جس شفقت، رأفت، رحمت و محبت اور ہمدردی و جاں نثاری اور ایثار و قربانی کا ثبوت دیا ہے وہ بجائے خود رحمت کا ذریعہ بھی ہے اور رحمت کا اسوہ بھی ہے۔ آپؐ ہی کی ہدایت کے طفیل ایک باپ شفقت کا پیکر بنا، بیٹا ادب اور فرمانبرداری کی تصویر بنا، ماں اپنی اولاد کیلئے سرتاپا ایثار ہوگئی، بچوں نے ان کے قدموں میں اپنی جنت کی بہار دیکھی۔ اس تعلق کے پھلنے پھولنے سے معاشرے کی پہلی اینٹ رکھی گئی جس میں صرف چند افراد کی زندگی ہی دکھائی نہیں دیتی بلکہ شفقت، محبت، ایثار و قربانی اور ایک دوسرے کیلئے جینے اور مرنے کا اسلوب بھی دکھائی دیتا ہے۔ ایسی اینٹوں سے جب اسلامی معاشرہ پروان چڑھتا ہے تو خاندان وجود میں آتا ہے۔ اور ایسے ہی چند خاندان اسلامی معاشرے کو وجود بخشتے ہیں اور اسلامی ریاست کی ریڑھ کی ہڈی بن جاتے ہیں۔ اسی میں ہمسائیگی کا شعور پیدا ہوتا ہے، آدابِ جوار کا سبق ملتا ہے، ہر گھر دوسرے گھر کا محافظ بن جاتا ہے، افراد فرائض اور حقوق سے بہرہ ور ہو کر زندگی کی آسودگی کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی زمین پر ایک خاندان، پھر اسلامی معاشرہ اور پھر اسلامی ریاست وجود میں آتی ہے جو اپنے طور اطوار اور

Marfat.com

اپنے اہداف کے حوالے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رحمت کا سایہ ہوتی ہے اور تمام روئے زمین پر ایسی ہی ریاستوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نفاذ انسان کا حقیقی مقصدِ زندگی ہے اور اسی مقصد کی بجا آوری سے زمین انسانوں کیلئے آتش فشاں پہاڑ کی مانند بننے کی بجائے ایسی صورت اختیار کر جاتی ہے کہ جس میں محبت و رأفت اور ہمدردی و جاں نثاری کے پھول کھلتے ہیں۔ ہر شخص دوسرے کے دکھ میں شریک اور اپنی دولت تقسیم کرنے والا بن جاتا ہے۔ لوگ دوسروں سے کچھ حاصل کر کے نہیں بلکہ دوسروں پر نچھاور کر کے قلبی خوشی حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ زمین پر جب ایسی انسانی زندگی برگ و بار پیدا کرتی ہے جس کا ہدف صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی ہوتا ہے تو وہ زندگی اس رحمت کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جسے یہاں رحمت اللعالمین کہا گیا ہے کیونکہ اس میں صرف انسانوں ہی کا بھلا نہیں ہوتا بلکہ حیوانوں کے حقوق کی بھی پاسداری ہوتی ہے۔ آبادیاں اپنے جلو میں انسانی دکھ نہیں، سکھ اور راحت رکھتی ہیں، سڑکوں اور شاہراہوں کو حقوق ملتے ہیں، نباتات اور جمادات تک اپنے حقیقی تصور کے ساتھ زمین کی زینت بنتے ہیں۔ جیسے جیسے یہ رحمت روئے زمین پر پھیلتی جاتی ہے ویسے ویسے اس کا سایہ گھنا ہوتا جاتا ہے۔ سب سے پہلے عرب اس سائے میں آئے تو ان کی زندگی کے دکھ سمٹ گئے۔ پھر وہ اس شمع کو لے کر چار دانگِ عالم میں پھیل گئے تو دنیا نے اس کو تسلیم کیا کہ اس سے پہلے روئے زمین پر کبھی ایسے انسان پیدا نہیں ہوئے جو اپنے ساتھ رحمت کا پیغام ہی نہیں، رحمت کی ضمانت بھی رکھتے ہیں۔ آج بدنصیبی سے مسلمان اپنی ڈگر سے ہٹ گئے ہیں، لیکن جہاں تہاں بھی کہیں روشنی نظر آتی یا زندگی آسودہ دکھائی دیتی ہے تو وہ صرف اس رحمت کا فیض ہے جسے رحمت اللعالمین کہا گیا ہے۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

قُلۡ اِنَّمَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

(کہہ دیجئے کہ میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، تو کیا تم اپنے کو اسی کے حوالہ کرتے ہو۔ ۱۰۸)

رحمت کی بنیاد وحدتِ الوہیت ہے

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو اہلِ جہاں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور اس رحمتِ دو عالم کو حکم دیا ہے کہ آپ ان لوگوں کو خبردار کر دیں کہ اگر تم میری رحمت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں کیونکہ جب تک تم وحدتِ الٰہ پر یقین نہیں لاتے اس وقت تک تمہارے نظریات میں نہ فکری وحدت پیدا ہوسکتی ہے اور نہ تمہاری زندگی میں یکسانی پیدا ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدت کو چھوڑ کر نہ جانے تم کس کس آستانے پر جھکو گے۔ اپنی زندگی کے اصول و ضوابط کیلئے نہ جانے تم کہاں کہاں کی دریوزہ گری کرو گے اور تم زندگی کے آخری رہنما کو تسلیم کرنے کی بجائے نہ جانے کس کس کو رہنما بناؤ گے اور کس کس کو اپنا آئیڈیل ٹھہراؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام یہ ہے کہ وہ جس طرح اپنی ذات میں واحد اور یکتا ہے، اسی طرح اپنی صفات اور اپنے حقوق میں بھی وحدہ لاشریک ہے۔ اسی کو غیر مشروط اطاعت کا حق پہنچتا ہے اور وہی حق رکھتا ہے کہ انسانوں کو دستور، آئین، قانون اور رہنمائی کی تمام تفاصیل مہیا کرے۔ چونکہ مجرد تعلیم اور رہنمائی انسان پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ زندگی میں تبدیلی زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح دیئے سے دیا جلتا ہے، اسی طرح نبی کی صورت میں جو

Marfat.com

سراجِ منیر روشن ہوا ہے اس کی ضیاء سے زندگی کی تمام تاریکیاں دور کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ اس سیّد دو عالم نے اللہ تعالیٰ کی وحدت کے بنیادی تصور کو راسخ کرتے ہوئے اپنی شخصیت اور اپنے عمل کے زور سے ایک ایک گرہ کو کھولا اور اس راستے کی تمام مشکلات کو دور کر دیا۔

سچ کہا کسی نے ۔

نثار سیدِ کونین پر مرے ماں باپ
سبق دیا بھی تو کیا لا الہ الا اللہ

اس بنیادی سبق دینے کے بعد آپؐ کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں سے پوچھئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ضابطۂ حیات اور اس ضابطے کی وضاحت کرنے والی زندگی۔ کے اپنے آپ کو سپرد کرتے ہو یا نہیں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری شخصیت، تمہارے خاندان، تمہارے معاشرے اور تمہاری ریاست کی تمام تاریکیاں روشنی میں بدل جائیں تو پھر تمہیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر ادارہ اور ہر نظم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہوگا اور آنحضرت ﷺ کی سنت کا اپنے آپ کو پابند کرنا ہوگا کیونکہ یہی وہ رویہ ہے جس سے تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہو، اسی کے نمائندہ بن کر نبی کریم ﷺ تشریف لائے ہیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

(اگر وہ پھر بھی روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے تم سب کو یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے، اب میں یہ نہیں جانتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ۱۰۹)

فیصلہ کن تنبیہ

اگر آپؐ کے اس واضح انذار اور آپؐ کی اس تنبیہ کے بعد بھی یہ لوگ اپنے اعراض کی روش نہ بدلیں بلکہ اس پر جمے رہیں تو آپؐ ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے ایک طویل عرصے تک تمہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ مجھ پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی اترتی ہے میں نے بغیر کسی تفریق کے بلاکم وکاست تم تک پہنچائی ہے اور میں نے بار بار یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو کوئی بعید نہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو جائے۔ اب اگر تم اپنا رویہ بدلنے کی بجائے بار بار مجھ سے یہ پوچھتے ہو کہ وہ عذاب کب آئے گا، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں تو وحیِ الٰہی کا پابند ہوں، اسی کے حکم سے میں تمہیں بار بار تنبیہ کر رہا ہوں۔ اب رہی یہ بات کہ اس عذاب کے آنے کا وقت کون سا ہے؟ وہ قریب ہے یا بعید ہے؟ تو میں اسے نہیں جانتا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ عذاب میں تقدیم وتاخیر ہو سکتی ہے لیکن اس کے قطعی اور حتمی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

(بیشک وہ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم اپنے دل میں چھپاتے ہو۔ ۱۱۰)

مشرکینِ مکہ بار بار آپؐ سے کبھی عذاب کا مطالبہ کرتے اور کبھی قیامت کی بحث چھیڑتے کہ اگر اس قیامت کو آنا ہی ہے تو وہ اب تک آ کیوں نہیں پائی، آخر اس کا جہاز کہاں لنگر انداز ہو گیا ہے۔ وہ اس طرح کے سوالات کرتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ عذاب

Marfat.com

یا قیامت کی تاخیر کے باعث ہم آج تک نعمتِ ایمان سے محروم ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ وہ واقعی ہمارے سر پر پہنچ گئے ہیں تو ہم ضرور ایمان لے آتے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہارے مطالبے کی حقیقت کیا ہے؟ اور تم اس طرح کی باتیں کن تحفظات کے تحت کر رہے ہو؟ اور تمہارے ارادے اور خفیہ منصوبوں میں کیا محرکات کارفرما ہیں؟ ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں۔ جو بات تم الفاظ کا جامہ پہنا کر کہتے ہو یا بلند آہنگی سے کہتے ہو، ان میں سے ہر بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ تم اگر کسی بات کو چھپاتے ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم سے نہیں چھپ سکتی، وہ تمہارے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔

وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ﴿۱۱۱﴾

(اور مجھے نہیں معلوم، شاید یہ (مہلت) تمہارے لئے ایک آزمائش اور فائدہ اٹھا لینے کی ایک مہلت ہو۔ ۱۱۱)

یہ جو عذاب میں تاخیر ہو رہی ہے، میں اس کا سبب نہیں جانتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمتوں کے بارے میں جب تک کسی بات کا علم اپنے پیغمبر کو نہیں دیتا تو پیغمبر خود سے نہیں جان سکتا۔ اس لئے میں اس تاخیر کے بھید سے واقف نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ تمہارے لئے ایک آزمائش ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی اللہ تعالیٰ تمہیں کھانے بلسنے کی مہلت دینا چاہتا ہو۔ اگر یہ آزمائش ہے تو تمہیں اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو بدلنے اور بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو شکر کا رویہ اختیار کر کے اپنے انجام کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

(آنحضرت ؐ نے عرض کی، اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور ہمارا رب رحمٰن ہی ہے جس سے مدد کی درخواست ہے ان باتوں کے مقابلے میں جو تم بیان کرتے ہو۔ ۱۱۲)

آنحضرت ﷺ کی دُعا

قَالَ...... دعا کے معنی میں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے پروردگار سے دُعا فرمائی کہ میری طرف سے تبلیغ و دعوت میں کوئی کمی نہیں اور مخالفین کی ستم رانیاں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اگر ان پر اتمامِ حجت ہو چکا ہے تو میری دُعا ہے کہ آپ ان مخالفین اور ہمارے درمیان فیصلہ فرما دیجئے۔ دنیا کی نگاہیں حق و باطل کی اس کشمکش کے نتیجے پر لگی ہوئی ہیں۔ الٰہی! تو ایسا فیصلہ فرما جس سے حق کا حق ہونا واضح ہو جائے اور باطل کا باطل ہونا مبرہن ہو جائے اور پھر کفار کو سنا کر یہ بات کہی جا رہی ہے کہ ہم اپنے رب سے فیصلے کے اس لئے متمنی ہیں کہ وہی خدائے رحمٰن ہے جو اپنے بندوں کے حالات جانتا بھی ہے اور مہربانی بھی فرماتا ہے۔ ہم تمہاری طرح کسی اور آستانے پر جھکنا نہیں جانتے، ہمارے لئے وہی ایک آستانہ ہے۔ اس لئے جو کچھ تم ہماری مخالفت میں کہتے ہو، ہم اس کیلئے بھی اللہ سے مدد کے طالب اور خواستگار ہیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاس

سُوْرَةُ الْحَجّ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْحَجِّ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔

اس سورت کا نام ''الحج'' چوتھے رکوع کی دوسری آیت وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ سے ماخوذ ہے اور مزید یہ بات بھی کہ اس سورت میں حج کے اعلانِ عام اور اس سے متعلقہ چند احکام کا ذکر ہے۔

اس سورت میں ۱۰ رکوع، ۷۸ آیتیں، ۱۲۹۱ کلمات اور ۵۰۷۵ حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔

علمائے تفسیر میں زمانۂ نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کے باعث بعض نے اسے مکی قرار دیا ہے اور بعض نے مدنی۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت میں مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات ملی جلی ہیں، یعنی ایسی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں جو مکی سورتوں کا طرۂ امتیاز ہے اور ایسی خصوصیات بھی موجود ہیں جو مدنی سورتوں کا خاصہ ہے۔

سورت کی ابتدائی تقریباً ۲۴ آیات کا اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ آیات مکے میں نازل ہوئیں اور اس میں بھی کوئی تعجب نہیں کہ یہ مکی زندگی کے آخری دور میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہوں اور اس کے بعد آیت نمبر ۲۵ سے یک لخت مضمون کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اندازِ بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر سورت تک کی آیات مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہوں گی اور اس بات کا امکان ہے کہ یہ ہجرت کے پہلے ہی سال ذوالحج میں نازل ہوئی ہوں۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ سورت اپنے مزاج و مطالب کے اعتبار سے مکی ہے، اس کی صرف چار آیات ۳۸ تا ۴۱ ہجرت کے بعد نازل ہوئیں جن میں مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ اگر وہ حج کیلئے جائیں اور کفارِ قریش ان کو بزور روکنے کی کوشش کریں تو ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں تلوار اٹھائیں، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا۔ لیکن جمہور علماء کے نزدیک صرف چار آیات ہی نہیں مزید آیات پر بھی مدنی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں وَقَالَ الْجُمْهُوْرُ السُّوْرَةُ مُخْتَلَطَةٌ مِنْهَا مَكِّيٌّ وَمِنْهَا مَدَنِيٌّ وَهٰذَا هُوَ الْاَصَحُّ ''یعنی جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ سورت مکی آیات اور مدنی آیات کا مجموعہ ہے۔ اور جمہور کا قول ہی صحیح ہے اور علامہ آلوسی نے بھی اسی کو درست ٹھہرایا ہے۔

Marfat.com

مضامین :-

1- اشرافِ قریش اور مشرکینِ مکہ سے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بامقصد زندگی دے کر پیدا کیا ہے۔ اس مقصد کی تعلیم و تبلیغ ہر دور میں انبیائے کرام کے ذریعے ہوتی رہی ہے اور آج اسی مقصد کیلئے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا ہے۔ یہ چند روزہ زندگی مزے اڑانے کیلئے نہیں، آنے والی زندگی کیلئے تیاری کا موقع ہے۔ اس دنیا کو ہمیشہ باقی نہیں رہنا، ایک دن ایسا آئے گا جب تمام جن وانس موت کے گھاٹ اتر جائیں گے اور پوری کائنات تباہ کر دی جائے گی اور پھر ایک دن ایسا آئے گا جب کائنات کی بساط ازسرِنو بچھائی جائے گی۔ جن وانس کو زندہ کیا جائے گا، محشر بپا ہوگا، اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی اور ہر شخص اپنی زندگی میں کئے ہوئے اعمال کا حساب دینے کیلئے اس عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یوں تو قریش اور مشرکین کو اس پورے پراسس ہی میں شبہ تھا لیکن جس چیز کو وہ ان تمام حقائق کی بنیاد سمجھتے تھے وہ دوبارہ جی اٹھنے کا تصور تھا جسے قیامت یا آخرت کہتے ہیں۔ اہلِ عرب کو قیامت سے بالکلیہ انکار نہیں تھا، البتہ! وہ اس کے وقوع کو خلافِ عقل اور ناممکن سمجھتے تھے۔ اس لئے قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی دعوت نے سب سے زیادہ زور قیامت اور آخرت کے وقوع اور فکر پر دیا ہے کیونکہ جب تک دل میں اس بات کا یقین پیدا نہیں ہوجاتا کہ ہمارا ہر عمل اور ہمارے دل کی ہر کیفیت اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور ہمارا ہر لمحہ محفوظ کیا جارہا ہے اور قیامت کے دن ہم سے ہمارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ ہمارے دماغ کی خیانتیں بھی پکڑی جائیں گی، برے ارادے بھی زیرِ بحث آئیں گے اور اعمال بھی میزان میں تولے جائیں گے اس وقت تک انسان میں اصلاح اور تبدیلی کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ اس سورت میں بھی سب سے پہلے قیامت کی ہولناکی کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کے وقوع پر عقلی دلائل قائم کئے گئے ہیں۔ انسان کی خلقت اور اس کی اپنی ذات اور زمین کے خشک اور بے آب و گیاہ ہوجانے کے بعد ازسرِنو سرسبز و شاداب ہوجانے سے استدلال کیا گیا ہے اور ان لوگوں کو بالخصوص خبردار کیا گیا ہے جو قیامت کے بارے میں شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں اور آفاق و انفس کی نشانیوں سے کوئی سبق سیکھنے کی زحمت نہیں کرتے۔

2- اللہ تعالیٰ کی توحید اور قیامت کے تصور کو جس چیز سے سب سے زیادہ نقصان پہنچ رہا تھا وہ اہلِ عرب کا شرک پر اصرار تھا۔ وہ یہ بات سمجھنے کیلئے تیار نہیں تھے کہ خدائے حی و قیوم کی ذات تنہا ساری کائنات کا نظام چلاسکتی ہے۔ وہ بلاشبہ کائنات کی خالق و مالک ہے۔ اس کا ایک عرشِ عظیم ہے جس پر وہ فائز ہے، لیکن کائنات کے ایک ایک گوشے سے باخبر رہنا اور اس ناپیدا کنار کائنات کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی مخلوقات کی ضرورتوں کو مہیا کرنا اور درجہ بدرجہ اور نوع بنوع حاجات و ضروریات کو جاننا اور تقسیم کرنا ایک ذات کیلئے کس طرح ممکن ہوسکتا ہے۔ اس لئے اس نے مخلوقات کی سہولت کیلئے بہت ساری قوتوں کو اپنے اختیارات میں شریک کر رکھا ہے۔ ان قوتوں میں ماضی کی شخصیتوں کے مجسمے اور بت بھی ہیں۔ بعض علاقوں میں براجمان جنات بھی ہیں اور بعض دیوتاؤں کے اوتار بھی ہیں۔ اسی طرح بعض مظاہرِ قدرت بھی ہیں جنہیں بعض اختیارات بخشے گئے ہیں۔ جب تک ان تمام قوتوں کو درجہ بدرجہ اپنی پوجاپاٹ اور قربانیوں سے خوش نہیں رکھا جائے گا اور براہِ راست ان سے مدد نہیں مانگی جائے گی اس وقت تک ہماری زندگی کی مشکلات دور ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ چنانچہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ان باطل عقائد کی نہ صرف تردید کی ہے بلکہ انہیں سراسر جہالت کی پیداوار قرار دے کر ان کے سامنے علم و فکر کی روشنی کے بعض دریچے کھولے ہیں۔

3- ان لوگوں پر تنقید کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں، اسلام کا نام لیتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا رسول سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنے آپ کو مومن اور مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کا اسلام سے تعلق کا حال یہ ہے کہ جب تک انہیں اسلام کے حوالے سے آرام وراحت اور عیش ومسرت نصیب ہے تو وہ اسلام کے جانثار اور اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں لیکن جہاں انہیں ایمان واسلام کی راہ میں اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کے حوالے سے کوئی مصیبت برداشت کرنا پڑتی ہے یا کچھ سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں تو وہ اسلام سے دامن کش ہو کر بہت دور جا کھڑے ہوتے ہیں۔ انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ کفر اور شرک میں عاقبت برباد ہوتی ہے لیکن بعض دفعہ دنیا کے فوائد مل جاتے ہیں اور اسلام سے وفاداری دنیا وعقبیٰ دونوں میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ لیکن یہ منافقانہ طرزِ عمل کہ فوائد ملیں تو اللہ تعالیٰ کی بندگی کیلئے حاضر ہیں اور اگر مصائب سے واسطہ پڑے تو نہ خدا، خدا رہے اور نہ بندہ، بندہ رہے۔ یہ وہ طرزِ عمل ہے جس سے دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور آخرت بھی برباد ہو جاتی ہے اور یہی حقیقت میں سب سے بڑی ناکامی ہے۔

4- مشرکین کو انذار اور خبردار کرنے کے بعد مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ مخالفین آپ کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں۔ آپ کی قربانیاں بھی اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ہیں اور مخالفین کی تمام تدبیریں بھی اس کے علم میں ہیں۔ کسی کا کوئی قول وفعل اس سے مخفی نہیں۔ بالآخر ایک دن سب کا معاملہ خدا کے حضور میں پیش ہوگا۔ ایک طرف مسلمان ہوں گے جنہیں صرف مسلمان ہونے کی سزا دی جاتی رہی ہے اور دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنی بدعتوں سے اللہ تعالیٰ کے دین کو بگاڑا، پھر اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ مسلمان اعلیٰ مدارج پر فائز ہوں گے اور شرک اور کفر پر جان دینے والے جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔

5- بیت اللہ کے مقصدِ تعمیر اور ملتِ ابراہیمی کے حوالے سے مشرکین کو آئینہ دکھایا گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو اس گھر کا متولی اور سرپرست سمجھتے ہو لیکن حال یہ ہے کہ وہ گھر جسے اللہ تعالیٰ کی توحید کا مرکز بنایا گیا تھا تم نے اسے بت پرستی کا تیرتھ بنا دیا ہے جہاں کبھی صرف خدائے واحد کی عبادت ہوتی تھی اور اسی کا طواف کیا جاتا تھا لیکن آج اسے شرک اور بت پرستی کا مرکز بنا دیا گیا ہے اور اس پر بھی مزید ستم یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو وراثتِ ابراہیمی کے وارث سمجھتے ہو اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے اور شرک کی ہر آلودگی سے اپنا دامن بچایا ہے اور وہ صحیح معنی میں ملتِ ابراہیمی کے پیروکار ہیں ان پر تم نے زندگی دشوار کر دی ہے انہیں ان کے گھروں سے نکالنے پر تلے ہوئے ہو۔

6- آیت ۳۸ سے ۴۱ تک چار آیتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نزول ہجرت کے جلدی بعد ہوا ہوگا جبکہ مسلمان مدینہ کی جائے پناہ مل جانے کے بعد ایک منظم جماعت کی صورت اختیار کر گئے تھے اور ان کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ہمیں ظالموں نے اللہ تعالیٰ کے گھر سے ایسا دور کیا ہے کہ وہ کسی قیمت پر ہمیں وہاں جانے کی اجازت دینے کیلئے تیار نہیں۔ یہ کیسی اندھیر نگری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ گھر جسے اس کی توحید کا مرکز بنایا گیا تھا اس پر بت پرستوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور وہ توحید کے نام لیواؤں کو وہاں برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کبھی ہمیں ہمت عطا فرمائے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے گھر میں حج کیلئے جائیں تو کفار یقیناً ہمیں وہاں داخلے سے روکیں گے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے کیونکہ ایک طرف اشہرِ حرم اور حرم کی حرمت کی پاسداری وہاں لڑائی کی اجازت نہیں دیتی۔ اور دوسری طرف اگر مشرکین ہمیں وہاں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں تو لڑائی کے بغیر چارہ نہیں ہوگا تو ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان آیتوں میں مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ اگر اس طرح کی کسی جنگ کی نوبت آئے تو تم بھی جنگ کرو۔ یہ جنگ اشہرِ حرم یا حرم کی حرمت کے منافی نہیں بلکہ یہ بیت اللہ کی تطہیر کیلئے ایک مقدس جہاد ہے اور اگر تمہیں قوت حاصل ہو تو بیت اللہ کو اس کے غاصب قابضوں سے آزاد کرانا تمہارا فریضہ

Marfat.com

ہے پھر اسی سلسلے کی مزید ہدایات سے بھی مسلمانوں کو نوازا گیا اور مسلمانوں کی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے حوالے سے ان کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا گیا۔

7- سورت کے آخر میں مسلمانوں کی اصل حیثیت یہ کہہ کر واضح کی گئی ہے کہ تمہیں مسلم کا نام دیا گیا ہے اور تمہارا اصل کام یہ ہے کہ تم دنیا میں شہادت علی الناس کے مقام پر کھڑے کئے گئے ہو۔ اب تمہارا طرزِ عمل ایسا ہونا چاہئے کہ تمہارے اقوال و اعمال اور طور و اطوار سے اسلام کی کرنیں پھوٹتی ہوئی دکھائی دیں اور لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ کے مسلم کہلانے والے کس طرح کی سیرت و کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ رہی دشمنوں کی طرف سے مخالفت تو اس کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا مولا ہے اور جس کا مولا اللہ تعالیٰ ہو، اسے کسی بھی قوت سے خوفزدہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ١٠	سُوْرَةُ الْحَجِّ مَدَنِيَّةٌ	اٰيَاتُهَا ٧٨

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِيْمٌ ﴿١﴾
يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ
كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ
بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴿٢﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ
فِی اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴿٣﴾ كُتِبَ عَلَيْهِ
اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿٤﴾
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ
مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ
مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا
نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا
يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ
اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ
بَهِيْجٍ ﴿٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْیِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ

Marfat.com

عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ﴿۶﴾ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا ۙ
وَاَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ
فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۙ﴿۸﴾ ثَانِیَ عِطْفِهٖ
لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّنُذِیْقُهٗ
یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۹﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰكَ وَ
اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۱۰﴾ ع

رکوع: ۱۔ (اے لوگو! اپنے پروردگار کے غضب سے بچو، بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔۱) جس روز تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔ ۲) اور لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی علم کے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ ۳) جس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے کہ جو اسے دوست بنائے گا تو وہ اسے گمراہ کر کے رہے گا اور اس کی رہنمائی وہ عذابِ دوزخ کی طرف کرے گا۔ ۴) اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اٹھنے کے باب میں شبہ میں ہو تو (ذرا اس امر میں غور کرو) کہ ہم نے ہی تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر منی کے قطرے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کے ٹکڑے سے کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص، (ایسا ہم نے اس لئے کیا) تا کہ تم پر اپنی قدرت وحکمت اچھی طرح واضح کر دیں اور ہم رحموں میں ٹھہرا دیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مدت معین کیلئے، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں، پھر ایک وقت دیتے ہیں تا کہ تم اپنے شباب کو پہنچ جاؤ اور تم میں سے کچھ پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچتے ہیں تا کہ وہ کچھ نہ جانیں ہر چیز کو جاننے کے بعد اور تم زمین کو بالکل خشک دیکھتے ہو، تو جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ یکا یک پھبک اٹھتی اور ابھرتی ہے اور طرح طرح کی خوشنما چیزیں اگاتی ہے۔ ۵) یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اللہ ہی پروردگار حقیقی ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۶) اور بیشک قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ ان سب کو ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ ۷) اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے اللہ کے بارے میں بحث

Marfat.com

کرتے ہیں۔ ۸)(تکبر سے) گردن مروڑے ہوئے تا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے برگشتہ کریں، ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور ہم قیامت کے دن انہیں آگ کا عذاب چکھائیں گے۔ ۹) اور اسے بتایا جائے گا کہ) یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ ۱۰)

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝۱

(اے لوگو! اپنے پروردگار کے غضب سے بچو، بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔ ۱)

نسخۂ اصلاح

پروردگار نے انسان کے اعمال واخلاق کی اصلاح کیلئے جو نسخہ تجویز فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے دل ودماغ میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو تمہارا خالق و مالک اور حاکمِ حقیقی ہے۔ اس نے تمہیں دنیا میں ایک مقصد کیلئے پیدا فرمایا ہے۔ اس مقصد کے شعور کو تازہ رکھنے کیلئے ہر دور میں اس نے اپنے نبی اور رسول بھیجے ہیں اور اس مقصد کی وضاحت کیلئے کتابیں اتاری ہیں اور عملی زندگی پر انطباق کیلئے اپنے رسول کی زندگی کو اسوۂ حسنہ و کاملہ ٹھہرایا ہے۔ کتاب اور صاحبِ کتاب دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کے اس قانون کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کے مطابق زندگی گزارنا کامیابی کی ضمانت ہے اور جس کی مخالفت دنیا و آخرت کی ناکامی اور ہلاکت ہے۔

اپنے ہر پیغمبر کی معرفت اس نے اہلِ دنیا پر یہ بات واضح کی کہ تم ہمارے دیئے ہوئے نظامِ زندگی کے مطابق زندگی گزارتے ہو یا اس کی مخالفت کرتے ہو، اس کا پورا ریکارڈ ہمارے فرشتے تیار رکھیں گے اور اس میں تمہارا کوئی عمل چھوٹنے نہیں پائے گا۔ ایک دن ایسا آئے گا جب ہم اس ریکارڈ کی بنیاد پر تم سے جواب طلب کریں گے۔ تم اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینے کے پابند ٹھہرو گے۔ اسی جوابدہی پر تمہاری جزاء اور سزا کا دارومدار ہوگا۔ قیامت کا یہ تصور جیسے جیسے پختہ ہوتا جاتا ہے، ویسے ویسے انسان کی زندگی میں ہر آلودگی کی تطہیر ہوتی جاتی ہے۔ وہ جب بھی کسی دماغی خیانت کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے یہ خیال دامن گیر ہو جاتا ہے کہ میرا خدا میری اس خیانت سے واقف ہے کیونکہ اس کا علم مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ جب کبھی وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے خلاف دل میں منصوبے باندھتا ہے تو اگر قیامت کا یقین اس کے دل کے کسی گوشے میں موجود ہے تو وہ فوراً اسے روکتا ہے کہ تم شاید سمجھتے ہو کہ تمہاری اس منصوبہ بندی سے کوئی واقف نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل کی حالت کو بھی جانتا ہے۔ اسی طرح کبھی اس کا قدم اسلامی شریعت کی حدود سے آگے نکلنے لگتا ہے تو قیامت کا یقین اسے آ پکڑتا ہے کہ تم بھول گئے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہو۔ صحرا میں کوئی پتا گرتا ہے تو وہ اسے جانتا ہے، زمین میں کوئی دانہ پھوٹتا ہے یا کلی چٹکتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے، سمندر کی تاریکیوں میں کوئی مچھلی حرکت کرتی ہے تو وہ اس کی آواز سنتا ہے۔ اسی طرح تمہارا ہر عمل بھی اس کی نگاہوں میں ہے۔ اور تمہارے کندھوں پر بیٹھنے والے دو معزز فرشتے برابر تمہارا روزنامچہ مرتب کر رہے ہیں۔ جس طرح ایک چور چوکیدار کی موجودگی میں نقب لگانے کی جرأت نہیں کرتا، ایک کلرک، ہیڈ کلرک کے ہوتے ہوئے، ایک دفتر کے کارکنان سپرنٹنڈنٹ کی موجودگی میں اور ایک سیکشن میں کام کرنے والے سیکشن افسر کے ہوتے ہوئے غلط کام کرنے کی جرأت نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دیکھنے والی نگاہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ تو جس شخص کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ میں اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہوں، اس کے علم کے حصار میں ہوں، فرشتوں کے جھرمٹ میں ہوں اور میرے

Marfat.com

کندھوں پر بیٹھنے والے میری ہر حرکت کو ضبطِ تحریر میں لا رہے ہیں تو وہ دیوانہ ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ ہوش و حواس میں وہ گناہ کا ارتکاب نہیں کر سکتا، کسی خیانت کی جرأت نہیں کر سکتا اور کسی بدکرداری کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔

قیامت کے زلزلے کی تصویر

اصلاح کے اس بنیادی حوالے کے باعث اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا کہ لوگو! اپنے رب سے ڈرو، اس کی قوت بے پناہ اور اس کی قدرت احاطۂ تصور سے ماورا ہے۔ اس کا علم ہر غلطی سے پاک اور اس کے کارکنان ہر تساہل سے محفوظ ہیں۔ تمہاری زندگی کا ایک ایک عمل اس کی عدالت میں محفوظ ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ جس دن جوابدہی کا وہ دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جو گزرے گی وہ تو بعد کی بات ہے لیکن اس سے پہلے اس دن کا اعلان تین مرحلوں میں ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی طویل حدیث میں ان مراحل کو تین نفخوں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت اسرافیل تین مرتبہ صور پھونکیں گے۔ پہلی دفعہ صور پھونکنے کو نفخۃ الفزع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کی ہمہ گیر تباہی سے پہلے اس طرح کی صورتحال پیدا کر دی جائے گی جس سے ہر شخص اور ہر مخلوق پر گھبراہٹ طاری ہوگی اور اسے یہاں زلزلۂ عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ زلزلہ کی تعبیر بھی اس دن کی ہولناکی کو پوری طرح واضح نہیں کر سکتی۔ البتہ! ہمارے فہم کے قریب کرنے کیلئے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے کیونکہ ہر ملک کے رہنے والے اور ہر نسل سے تعلق رکھنے والے زلزلے کی تباہیوں سے واقف ہیں۔ زلزلہ کیا ہے، ہر پستی کا بلندی میں بدل جانا اور ہر بلندی کا پستی میں ڈوب جانا۔ پہاڑوں کا اپنی جگہ چھوڑ دینا، سمندروں میں نئے جزیروں کا نکل آنا، پرانے جزیروں کا غائب ہو جانا اور بعض دفعہ مکمل شہروں کا چشمِ زدن میں نابود ہو جانا۔ غالباً 1935ء کے زلزلۂ کوئٹہ میں 51 ہزار انسان لقمۂ اجل بنے۔ جاپان میں 1924ء میں 16 لاکھ انسان اچانک موت کا شکار ہو گئے۔ 2004ء میں پاکستان میں آنے والا زلزلہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ انسانی جانوں کی ہلاکت کا باعث بنا۔ کئی شہر زمین بوس ہو گئے۔ بعض جگہ جھیلیں نکل آئیں اور پہاڑوں نے اپنی جگہ بدل لی۔ بعض زلزلوں سے پہاڑ پھٹ جاتے ہیں اور ان سے ابلتے ہوئے لاوے کا ایک دریا بہہ نکلتا ہے اور انسان ان حادثات کے مقابلے میں اس قدر بے بس ہے کہ وہ آج تک انہیں روکنے کی کوئی سبیل نہیں سوچ سکا۔ علمائے زمین شناس کا نظریہ یہ ہے کہ آج سے لاکھوں سال پہلے جب زمین سورج سے الگ ہوئی تھی تو اس کا درجۂ حرارت سورج کے برابر تھا۔ یہ حرارت آج بھی بطنِ زمین میں موجود ہے اور لاوے کا درجۂ حرارت وہی ہے جو آغاز میں زمین کا تھا یعنی 12 ہزار فارن ہائٹ۔ اب اگر کسی زلزلے سے سارا لاوا باہر آ جائے تو سطح زمین ایک کھولتے ہوئے جہنم میں بدل جائے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ زمین کی تباہی کیلئے اس کو پیدا کرنے والے نے کس قدر امکانات پیدا کر رکھے ہیں اور جہاں تک فضاء، خلاء اور آسمانوں کا تعلق ہے اس کی تباہی کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں آنے والی نہ ہو۔ خلاء میں کروڑوں بلین ستارے حیرت انگیز رفتار سے محوِ پرواز ہیں۔ ان میں سے بعض زمین سے دس گنا اور بعض ایک کروڑ گنا بڑے ہیں۔ ان کا نظامِ پرواز اتنا مکمل ہے کہ آج تک کوئی ستارہ دوسرے سے متصادم نہیں ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ طاقت جس نے ان ستاروں کو بنایا اور پھر ان کی راہیں متعین کیں اس بات پر قادر نہیں کہ انہیں باہم ٹکرا دے اور سب کچھ تباہ کر دے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ گرم آفتاب ہے جس کی گرمی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب سائنسدانوں نے اندازہ لگانا شروع کر دیا ہے کہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور یہ بات بھی سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ پورا نظامِ کائنات کششِ ثقل کے ستون پر قائم ہے اور یہ کششِ ثقل بھی روز بروز مدھم پڑتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایک

Marfat.com

دن آئے گا کہ تمام کُرّے ایک دوسرے کے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔ اور ممکن ہے کہ یہی وہ زلزلہ ہو جس سے قیامت کا آغاز ہو۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پہلی مرتبہ جب صور پھونکا جائے گا تو زمین جھٹکے کھانے لگے گی اور جس طرح کشتی سمندر میں ہچکولے کھاتی ہے اور چاروں طرف سے موجیں اسے تھپیڑے مارتی ہیں اور یا جس طرح کوئی لٹکی ہوئی قندیل آندھی میں حرکت کرتی ہے، یہی حال اس وقت زمین کا ہوگا، اغلب یہ ہے کہ زمین کا یہ حال اس وقت ہوگا جبکہ زمین یکا یک الٹی پھرنی شروع ہو جائے گی اور سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔ یہی بات قدیم مفسرین میں سے علقمہ اور شعبی نے بیان کی ہے کہ یَکُوْنُ ذٰلِکَ عِنْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا. اور زمین کی آبادی پر کیا گزرے گی قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ سورۃ الزلزال میں ارشاد فرمایا گیا ہے اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ ''جبکہ زمین پوری کی پوری ہلا دی جائے گی اور وہ اپنے پیٹ کے بوجھ نکال پھینکے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے۔''

سورة الحاقة میں فرمایا گیا: فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ''اور جب صور میں ایک پھونک ماردی جائے گی اور زمین اور پہاڑ اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں توڑ دیئے جائیں گے تو وہ واقعۂ عظیم پیش آجائے گا۔''

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲

(جس روز تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔ ۲)

قیامت کی ہولناکی کی مزید وضاحت

سابقہ آیت میں جس دن کو زلزلہ قرار دیا گیا ہے یہ اسی کی ہولناکی کی تصویر ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت پہلے نفخہ کے وقت ہوگی جبکہ گھبراہٹ کا عالم یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے بچے کو دودھ پلانا بھول جائے گی۔ ماں کی مامتا سب سے زوردار جذبہ ہے اور یہ جذبہ بچے سے محبت کا دوسرا نام ہے۔ ماں سب کچھ بھول سکتی ہے لیکن اپنے بچے کو نہیں بھول سکتی لیکن اس دن کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ ماں اپنے بچے کو بھی بھول جائے گی۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ آیتِ کریمہ میں مرضع کی بجائے مرضعۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مرضع تو دودھ پلانے والی عورت کو کہتے ہیں لیکن مرضعۃ اس وقت بولتے ہیں جبکہ ماں بالفعل اپنے بچے کو دودھ پلانے میں مصروف ہو اور بچہ ماں کا پستان منہ میں لئے ہوئے ہو۔ اس دن کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ ماں دودھ پلانے میں مصروف ہونے کے باوجود اس دن کی ہولناکی کے باعث بچے کو بھی بھول جائے گی اور دودھ پلانے کو بھی بھول جائے گی۔ لوگ دیوانوں کی طرح بھاگے پھریں گے۔ ہر شخص نشے میں مدہوش محسوس ہوگا۔ ایسا لگے گا جیسے اس نے نشہ آور چیز پی لی ہو حالانکہ وہ کسی نشے میں نہیں ہوگا بلکہ اس دن کی ہولناکی نے اسے حواس باختہ کر دیا ہوگا۔

Marfat.com

ہمارے مفسرین نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں جس زلزلۂ قیامت کا ذکر ہے اور جس ہولناکی کی تصویر کشی کی گئی ہے کیا اس کا تعلق قیامت کے قائم ہونے اور لوگوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد سے ہے یا اس سے پہلے۔ قرآنِ کریم کے سیاق و سباق اور بعض دوسری آیات سے جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق نفخۂ فزع سے ہے جو قیامت قائم ہونے سے پہلے ہو گا اور جسے قیامت کی آخری علامت سمجھا جاتا ہے لیکن بعض حضرات نے بعض دوسری احادیث سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ زلزلہ حشر ونشر اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی منافات نہیں۔ قیامت سے پہلے زلزلہ آنا آیتِ قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اور حشر ونشر کے بعد ہونا اس حدیث سے ثابت ہے جو حدیثِ آدم علیہ السلام کے نام سے معروف ہے۔ البتہ اس پر اشکال یہ ہے کہ حشر ونشر اور قیامت قائم ہونے کے بعد یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کوئی عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہو یا کوئی حاملہ حمل ڈال دے تو اس اشکال کی توجیہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت اس دنیا میں حالتِ حمل میں مری، قیامت کے روز اسی حالت میں اس کا حشر ہوگا اور جو دودھ پلانے کے زمانے میں مرگئی، وہ اسی طرح بچے کے ساتھ اٹھائی جائے گی۔ (کما ذکرہ القرطبی)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

(اور لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی علم کے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ ۳) جس کے مقدر میں لکھا جاچکا ہے کہ جو اس کے دوست بنائے گا تو وہ اسے گمراہ کر کے رہے گا اور اس کی رہنمائی وہ عذابِ دوزخ کی طرف کرے گا۔ ۴)

آنحضرت ﷺ کی دعوت کے جواب میں بغیر علم کے حجت بازی

نبی کریم ﷺ جب اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف لوگوں کو بلاتے اور انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کو خبردار کرتے کہ تم نے اگر اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تابع نہ کیا اور مسلسل خواہشِ نفس کی پیروی میں لگے رہے تو پھر سوچ لو کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دے سکو گے کیونکہ تم ہزار انکار کرو لیکن تمہارے انکار سے حقیقت نہیں بدل سکتی، تم بہرصورت اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے بندے ہو، تمہارا ایک آقا ہے جسے تم خدا کہتے ہو۔ اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ تم سے اپنے احکام کی اطاعت کروائے اور یہ بات بھی اسے زیب دیتی ہے کہ وہ ایک دن ایسا لائے جس میں تمہاری زندگی بھر کے اعمال کا تم سے مواخذہ کرے، تو آنحضرت ﷺ کی اس فہمائش اور انداز جواب میں عام لوگوں کا رویہ تو یہ ہوتا کہ وہ بات سنتے اور اپنی راہ لیتے، اور کبھی ایسا ہوتا کہ انہیں اپنے کام و دہن کی لذت اور پیٹ کا جہنم بھرنے کی فکر میں اس کا بھی ہوش نہ رہتا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو اطمینان سے سننے کی زحمت کرتے۔ البتہ ان میں کچھ ایسے سرپھرے بھی تھے جو اس دعوت کے اثرات کو روکنے کیلئے آنحضرت ﷺ سے بغیر کسی علم اور دلیل کے بحث کرتے۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی بحث اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہوتی تھی۔ اس سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو وہ لوگ مانتے تھے البتہ اس کی صفات کے بارے میں انہوں نے مشرکانہ تصورات اختیار کر رکھے تھے، وہ اس کی صفتِ قدرت کا غلط تصور رکھتے تھے اور یا اس میں دوسری قوتوں کو شریک سمجھتے تھے

Marfat.com

شاید اس غلط تصور کا نتیجہ تھا کہ وہ قیامت کے ممکن الوقوع ہونے کے بارے میں شک وشبہ کا شکار تھے۔ نضر بن حارث ایسے ہی جھگڑالو لوگوں کا سرغنہ تھا، وہ ہمیشہ اس طرح کی بحثوں میں پیش پیش رہتا۔ مردوں کی بوسیدہ ہڈیاں ہاتھوں میں لے کر وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور کہتا کہ محمد (ﷺ) یہ کہتے ہیں کہ جب قیامت کا دن آئے گا تو ان بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ تم خود سوچو کیا کبھی ایسی از کار رفتہ اور بوسیدہ ہڈیاں بھی دوبارہ زندہ ہو سکتی ہیں۔ اس طرح سے وہ وقتی طور پر لوگوں میں آنحضرت ﷺ کی دعوت کے اثرات کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا تھا اور کم عقل اور غیر سنجیدہ لوگ اس کی باتوں پر داد دیتے تھے، لیکن ان باتوں کے پیچھے کوئی علم تھا نہ دلیل، عقل وفطرت کی ہدایت تھی نہ کسی آسمانی کتاب کی کوئی سند۔

شیطان کی پیروی

اس بحث میں انہیں اگر کسی کی رہنمائی میسر تھی تو وہ اس راندۂ درگاہ اور دھتکارے ہوئے سرکش شیطان کی تھی جس نے اسی مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ سے دو باتوں کی مہلت طلب کی تھی۔ ایک تو یہ کہ اسے قیامت تک کیلئے زندگی عطا کر دے اور دوسری یہ بات کہ مجھے اس کا موقع دے کہ میں اولادِ آدم کو گمراہ کر سکوں۔ چنانچہ وہ اپنی مہلت کے مطابق پہلے دن سے آج تک اپنے کام میں مصروف ہے اور اس کیلئے اس نے جنوں اور انسانوں میں سے مفید مطلب لوگ تیار کر رکھے ہیں جو اس کے سکھائے ہوئے طریقوں کے مطابق اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دیتے ہوئے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اس کے گمراہ کرنے سے وہ لوگ گمراہ ہوں گے جنہوں نے اس سے دوستی اور محبت کا رشتہ استوار کر رکھا ہوگا۔ وہ بے شک اس کی ذات سے پیار نہ کرتے ہوں لیکن اگر وہ اس کے مقاصد، اس کے طریق کار اور اس کے طرزِ عمل کو پسند کرتے ہیں تو یہ چیز اس کی دوستی کیلئے کافی ہے۔ ایسے لوگوں کیلئے قدرت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وہی اس کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے اور اس کی پیروی کریں گے۔ رہے وہ لوگ جو شیطان سے نفرت کرتے اور اس پر لعنت بھیجتے ہیں اور حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ وہ قرآن وسنت سے اپنا رشتہ استوار رکھیں اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے ہیں کہ وہ شیطان کے وسوسوں سے انہیں محفوظ رکھے۔ تو شیطان اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود انہیں کبھی گمراہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ''بیشک میرے بندے، تیرا ان پر غلبہ نہیں ہو سکے گا۔''

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ⑤

(اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اٹھنے کے باب میں شبہ میں ہو تو (ذرا اس امر میں غور کرو) کہ ہم نے ہی تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر منی کے قطرے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کے ٹکڑے سے کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص،

Marfat.com

(ایسا ہم نے اس لئے کیا) تا کہ تم پر اپنی قدرت وحکمت اچھی طرح واضح کردیں اور ہم رحموں میں ٹھہرا دیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مدت معین کیلئے، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں، پھر ایک وقت دیتے ہیں تا کہ تم اپنے شباب کو پہنچ جاؤ اور تم میں سے کچھ پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچتے ہیں تا کہ وہ کچھ نہ جانیں ہر چیز کو جاننے کے بعد، اور تم زمین کو بالکل خشک دیکھتے ہو، تو جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ یکا یک پھبک اٹھتی اور اپچتی ہے اور طرح طرح کی خوشنما چیزیں اگاتی ہے۔ ۵)

قیامت پر انسان کی اپنی ذات سے استشہاد

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ قیامت کے بارے میں مشرکینِ عرب کی روش صریح انکار کی نہ تھی۔ البتہ وہ اس کے وقوع کے بارے میں اشتباہات کا شکار تھے۔ ان کی عقل اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھی کہ اربوں کھربوں مخلوق اور ساری کائنات یک لخت تباہ کی جاسکتی ہے اور پھر اچانک ایک صور پھونکنے سے تمام مخلوقات زندہ بھی کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے وہ بار بار قیامت کے حوالے سے اپنے شک وشبہ کا اظہار کرتے۔ قرآنِ کریم نے اپنی بات کو ٹھیک اسی جگہ سے شروع کیا ہے جہاں پانی مر رہا تھا کہ اے لوگو! تمہیں اگر اس بات میں شبہ ہے کہ قیامت آئے گی یا نہیں، اور تمہارے خیال میں یہ بات عقل سے بہت بعید ہے کہ کبھی سب کچھ تباہ ہو جائے اور پھر سب کچھ زندہ ہو جائے اور پھر ایک ایسی عدالت قائم ہو جس میں انسانوں کے زندگی بھر کئے ہوئے اعمال حساب کیلئے پیش کئے جائیں۔ تو ہم تمہیں سمجھانے کیلئے خود تمہاری اپنی ذات کی طرف تمہیں توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت اور قیامت کے وقوع پر بیشمار دلائل موجود ہیں لیکن ہم سب کو چھوڑ کر تمہاری اپنی ذات کو دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ تم اپنے بارے میں غور کرو کہ تم پر عدم طاری تھا یعنی تم کچھ نہیں تھے، ہم نے تمہیں وجود بخشا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی مخلوق کو عدم سے وجود میں لے آنا اللہ تعالیٰ کی تخلیقی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں اور اس پر بھی طرہ یہ کہ جن مادوں سے یا جس چیز سے انسانوں کی تخلیق کی گئی ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی ذات میں زندہ نہیں۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک زندہ مخلوق کو بے جان چیزوں سے پیدا کیا جائے۔ اس لئے فرمایا کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آدم جو ابوالبشر ہیں ان کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو نطفے سے پیدا کیا گیا اور یہ مادہ منویہ جن غذاؤں سے بنتا ہے وہ سب زمین سے اگتی ہیں اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے کیا گیا ہے جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا گیا وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝ (آیت ۷۔۸) ''انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ایک ست سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔''

نطفہ سے انسان کی تخلیق بجائے خود حیرت انگیز ہے

مزید غور کیجئے کہ میاں بیوی کے اتصال سے مرد کا نطفہ عورت کے رحم میں منتقل ہوتا ہے۔ اس میں عجیب بات یہ ہے کہ ایک مرد سے ایک وقت میں جتنا نطفہ خارج ہوتا ہے اس کے اندر کئی کروڑ تخم پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک بیضۂ انثیٰ سے مل کر انسان بن جانے کی

Marfat.com

صلاحیت رکھتا ہے مگر مرد وعورت دونوں اس بات کی نہ خبر رکھتے ہیں اور نہ اختیار رکھتے ہیں کہ ان میں سے کون سا تخم بیضۂ انثیٰ سے ملنے کا موقع پا سکے گا۔ یہ اس حکیم وقدیر ذات کا فیصلہ ہے جو اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ ان سب کو چھانٹ کر کسی ایک کو کسی خاص وقت میں بیضۂ انثیٰ سے ملنے کا موقع دیتا ہے اور اس طرح سے استقرارِ حمل کا مرحلہ طے ہوتا ہے۔ پھر استقرار کے وقت مرد کے تخم اور عورت کے بیضی خلیے کے ملنے سے جو چیز ابتدا بنتی ہے وہ اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ خوردبین کے بغیر دیکھی نہیں جا سکتی تو پھر یہ چھوٹی سی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے آہستہ آہستہ خون کی پھٹکی میں تبدیل ہوتی ہے۔ عَلَقَةٌ خون کی پھٹکی کو بھی کہتے ہیں اور چھوٹے جاندار کیڑے کو بھی۔ یہ کیڑا جب خون اور جنین کی صورت اختیار کرتا ہے اور اس کے اندر زندگی کی نمود پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ خون کا لوتھڑا مُضْغَةٌ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ مُضْغَةٌ شروع شروع میں نامکمل شکل میں ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ شکل بننے لگتی ہے اور نین نقش اپنا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

لِنُبَيِّنَ لَكُمْ ...... تاکہ تم پر اپنی قدرت وحکمت اچھی طرح واضح کر دیں یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت اس بات کی محتاج نہ تھی کہ وہ انسانی تخلیق کیلئے ایک پراسس تجویز کرتی۔ پہلے مادۂ منویہ وجود میں آتا، پھر استقرارِ حمل کی نوبت آتی، پھر اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹکی میں تبدیل کیا جاتا، پھر وہ ایک گوشت کا لوتھڑا بنتا اور اس میں بچے کے نین نقش اور شکل کا ڈیزائن تیار کیا جاتا۔ یہ صرف یہ بتانے کیلئے ہے کہ جو پروردگار شکمِ مادر میں ایک بے جان مادے کو اتنی تبدیلیوں سے گزار کر نہ صرف انسان کو وجود دینے پر قادر ہے بلکہ اسے ایک ایسی مخلوق کی صورت میں منصۂ شہود پر لاتا ہے کہ ساری دنیا کی ہمہ ہمی اور رونق اسی کے دم قدم سے ہے۔ اس نے زمین کے سینے کو تخلیقات سے بھر دیا ہے اور فضاؤں میں اس کی ایجادات اڑتی پھرتی ہیں۔ جو پروردگار یہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے کیا وہ انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں۔

سورۂ مومنون میں بعینہٖ یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے کہ آخر میں وہ بات بھی کہہ دی گئی ہے جس پر انسان کی خلقت کے یہ تمام مراحل شہادت دے رہے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۗ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

(المومنين. ۲۳: ۱۲.۱۶)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک قرار کی جگہ میں رکھا، پھر ہم نے پانی کی بوند کو جنین کی شکل دی، پھر جنین کو ایک لوتھڑا بنایا، پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا، پھر اس کو ایک بالکل ہی مختلف مخلوق کی شکل میں متشکل کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا! پھر اس کے بعد تم لازماً مرو گے، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

Marfat.com

سلسلۂ کلام کی طرف رجوع

وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَانَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ''اور ہم رحموں میں ٹھہرادیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مدت متعین کیلئے، پھر ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں''۔ابھی سلسلۂ کلام ناتمام تھا کہ اچانک مخاطبوں کو جھنجھوڑنے کیلئے لِنُبَيِّنَ لَكُمْ لایا گیا۔اب پھر اسی سلسلۂ کلام کو لیا جارہا ہے۔ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ مادۂ منویہ کے شکمِ مادر میں استقرار پکڑنے کے بعد اور پھر عَلَقَةً اور مُضْغَةً کی تبدیلیوں سے ہمکنار ہونے کے بعد ہم ایک معین مدت تک اسے ماں کے پیٹ میں ٹھہراتے ہیں اور پھر کم وبیش 9 ماہ کے بعد اس بچے کو جس کا آغاز ایک گندے پانی سے ہوا تھا نہایت خوبصورت شکل میں ماں کی آغوش میں لاتے ہیں۔اس خوبصورت اور من موہنے بچے کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اس کی تخلیق گندے پانی کے ایک قطرے سے ہوئی ہے۔مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ بچہ جب شکمِ مادر سے باہر آتا ہے تو وہ نہایت بے بسی کی تصویر ہوتا ہے۔بیشتر مخلوقات کے بچے پیدائش کے چند گھنٹوں بعد اپنی ماں کے ساتھ چلنے پھرنے اور کھانے پینے لگتے ہیں لیکن انسان کا بچہ کئی مہینوں تک اپنے ماں باپ کو پہچانتا تک نہیں۔ماں اگر اسے اٹھا کر اپنے سینے سے نہ لگائے اور دودھ اس کے منہ میں نہ نچوڑے تو وہ کبھی نہیں جان سکتا کہ میری خوراک کہاں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی دستگیری کا کیا کہنا کہ یہ بچہ جو ہر طرح کی پہچان سے عاری ہے جس کے حواسِ خمسہ نے ابھی کام کرنا شروع نہیں کیا، جو شعور کی منزل سے ابھی بہت دور ہے لیکن نہ جانے اسے ماں کے پستان سے دودھ پینا کون سکھاتا ہے؟ اور بھوک لگنے پر اسے رونے کی تعلیم کس نے دی ہے؟ اور اپنی خوبصورت مسکراہٹوں کے ساتھ اس نے دوسروں کا دل موہنا کس سے سیکھا ہے؟ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماں کے دودھ یا پتلے دودھ کے سوا کوئی غذا نہیں کھاسکتا۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ماں کے دودھ میں مائیت کم ہوتی جاتی ہے اور دھنیت بڑھتی جاتی ہے، حواس اپنا کام شروع کردیتے ہیں، معدہ ثقیل چیز کھانے اور ہضم کرنے کے قابل ہوتا جارہا ہے۔بچہ اب چیزوں کو پہچاننے لگا ہے۔جب تک معدہ کمزور تھا تو ماں کے دودھ میں پانی غالب تھا۔اب معدہ مضبوط ہوگیا ہے تو ماں کا دودھ بھی گاڑھا ہوتا جارہا ہے۔مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا وہ کون ہے جس نے شکمِ مادر میں بچے کی حفاظت کی؟ پھر وہ دنیا میں آیا تو اس کی درجہ بدرجہ اور عہد بعہد تبدیلیوں کے مطابق کس نے غذا مہیا کی؟ اور سب سے حیرانی کی بات یہ ہے کہ بچہ ابھی دنیا میں آنہیں پاتا کہ ماں کی باہیں پہلے اس کیلئے پھیل چکی ہوتی ہیں اور باپ کے کندھے اسے اٹھانے کیلئے بیتاب ہوتے ہیں۔دل میں یہ محبت کے چراغ کون جلاتا ہے؟ اور اسی محبت کے سائے میں بچہ بچپن اور لڑکپن کی منزلیں طے کرتا ہوا جوانی اور رشد کی عمر کو پہنچ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوجاتا ہے۔

جوانی کی عمر جسمانی طاقت وصلاحیت، ارادوں کی پختگی، دماغ کی رعنائی اور ولولوں اور امنگوں کی عمر ہوتی ہے جس میں جسم کی شریانوں میں خون کی بجائے پارہ دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اپنی طاقت اور صلاحیت سے فریب خوردہ ہوکر بعض دفعہ انسان اپنے بارے میں عجیب وغریب غلط فہمیوں کا شکار ہونے لگتا ہے، لیکن قدرت اپنا کام مسلسل کرتی رہتی ہے۔اسی نے اس کو جوانی کی رعنائیاں دی تھیں اب وہی آہستہ آہستہ اس کے جسم کی توانائیوں اور دل ودماغ کی رعنائیوں کو زوال آشنا کرکے یہ سوچنے کا موقع مہیا کرتی ہے کہ اپنے اس خدا کو کبھی نہ بھولنا جس نے تمہیں جوانی کے مراحل تک پہنچایا۔اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا۔وہی ذات تمہارا سہارا ہے اب آہستہ آہستہ تم بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہو اور وہ دن دور نہیں جب وہ تمہیں ارذل العمر تک پہنچادے گا۔اب تمہیں بالکل مختلف صورتحال سے دوچار ہونا پڑے گا۔وہ ذات جس کی عنایات سے تم نہ جانے کیا سے کیا ہوگئے، اب وہی ذات تمہیں زوال کے راستے پر لے جارہی ہے اور تم بڑھاپے میں اس حال

Marfat.com

کو پہنچ جاتے ہو کہ سب کچھ جاننے کے بعد کچھ نہ جاننے کی تصویر بن جاتے ہو۔ جن شریانوں میں کبھی پارہ دوڑتا تھا اب وہاں خون کی گردش بھی رک رک کے چلتی ہے، جس سینے میں حوصلوں کی فصل تیار ہوتی تھی اب وہاں کمزوری اور بعض دفعہ مایوسی ڈیرہ جما کے بیٹھ جاتی ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا ہے تا کہ ان تبدیلیوں کے آئینہ میں ہر شخص دیکھ سکے کہ جو ذات اتنی بڑی تبدیلیاں پیدا کر سکتی ہے اس کیلئے قیامت برپا کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا کوئی قابلِ تعجب بات نہیں۔

بارش سے قیامت پر دلیل

اسی آیتِ کریمہ میں دوسری مثال یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اولاً تو تم اپنی ذات میں غور کرو تو قدم قدم پر قیامت کو دیکھ سکتے ہو لیکن اگر باہر بھی دیکھنا چاہو تو کون سی نگاہ ایسی ہے جس نے برسات کا موسم نہیں دیکھا۔ بعض دفعہ طویل عرصے تک بارش برسنے کا نام نہیں لیتی اور عرب میں تو خاص طور پر خشک سالی قحط سالی کی صورت اختیار کر جاتی تھی۔ میلوں تک گھاس کی پتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جوہڑوں کا پانی خشک ہونے کے باعث خانہ بدوشوں کے قافلے رواں دواں نظر آتے تھے۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی دکھائی دیتی تھی کہ اچانک اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی، بادل جھوم کے آئے، بارش برسی۔ وہ زمین جس میں بادِ سموم چلتی اور ہر طرف دھول اڑتی دکھائی دیتی تھی وہاں دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ایک ہو جاتا ہے اور مردہ زمین میں زندگی کے آثار پھوٹنے لگتے ہیں۔ رات کو مینڈکوں کی آوازیں زندگی کا اعلان کرتی ہیں اور چند ہی دنوں میں زمین مخملی لباس پہن لیتی ہے۔ جدھر دیکھو زندگی انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے۔ رگِ سنگ میں بھی لہو کی گردش دکھائی دینے لگتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو ذات مردہ زمین کو زندگی سے بہرہ ور کر سکتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف زندگی کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں اس کیلئے انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور قیامت برپا کرنے میں کیا چیز حائل ہو سکتی ہے؟

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۶﴾ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾

(یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اللہ ہی پروردگارِ حقیقی ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۶) اور بے شک قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں، اور اللہ ان سب کو ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا، جو قبروں میں ہیں۔ ۷)

خلاصہ بحث

گزشتہ آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ بیان کردہ حقیقتوں کی تعداد پانچ ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1- اللہ ہی حق ہے۔ 2- وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ 3- وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ 4- قیامت یقیناً آنے والی ہے۔

5- اللہ تعالیٰ ضرور ان سب لوگوں کو زندہ کر کے اٹھائے گا جو قیامت کے بپا ہونے تک مر چکے ہوں گے۔

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ان پانچوں باتوں کے اثبات کیلئے نہایت زوردار دلائل دیئے گئے ہیں۔ ہم نے اگرچہ اس آیت کے مفہوم

Marfat.com

کی وضاحت میں ان دلائل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے تاہم ان پانچ باتوں میں سے ایک ایک کا تذکرہ کر کے جس طرح سے سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمۃ نے وضاحت کی ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے۔ چنانچہ ہم اس وضاحت کو نقل کر رہے ہیں۔

اللہ ہی حق ہے

پورے نظام کائنات کو چھوڑ کر آدمی صرف اپنی ہی پیدائش پر غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک ایک انسان کی ہستی میں اللہ کی حقیقی اور واقعی تدبیر ہر وقت بالفعل کارفرما ہے اور ہر ایک کے وجود اور نشوونما کا ایک ایک مرحلہ اس کے ارادی فیصلے پر ہی طے ہوتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون پر ہو رہا ہے جس کو ایک اندھی بہری بے علم و بے ارادہ فطرت چلا رہی ہے۔ لیکن وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انہیں نظر آئے گا کہ ایک ایک فردِ انسانی جس طرح وجود میں آتا ہے اور پھر جس طرح وہ وجود کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اس میں ایک حکیم و قادرِ مطلق ہستی کا ارادی فیصلہ کس شان سے کام کر رہا ہے۔ آدمی جو غذا کھاتا ہے اس میں کہیں انسانی تخم موجود نہیں ہوتا، نہ اس میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جو نفسِ انسانی کے خواص پیدا کرتی ہو۔ یہ غذا جسم میں جا کر کہیں بال، کہیں گوشت اور کہیں ہڈی بنتی ہے، اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر یہی اس نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے اندر انسان بننے کی استعداد رکھنے والے تخم موجود ہوتے ہیں۔ ان تخموں کی کثرت کا حال یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد سے جتنا نطفہ جاری ہوتا ہے اس کے اندر کئی کروڑ تخم پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک بیضۂ انثیٰ سے مل کر انسان بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر یہ کس حکیم و قدیر اور حاکمِ مطلق کا فیصلہ ہے جو ان بے شمار امیدواروں میں سے کسی ایک کو کسی خاص وقت پر چھانٹ کر بیضۂ انثیٰ سے ملنے کا موقع دیتا ہے اور اس طرح استقرارِ حمل رونما ہوتا ہے۔ پھر استقرار کے وقت مرد کے تخم اور عورت کے بیضی خلیے (Egg Cell) کے ملنے سے جو چیز ابتداً بنتی ہے وہ اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ خوردبین کے بغیر نہیں دیکھی جا سکتی۔ یہ حقیر سی چیز 9 مہینے اور چند روز میں رحم کے اندر پرورش پا کر جن بے شمار مرحلوں سے گزرتی ہوئی ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل اختیار کرتی ہے ان میں سے ہر مرحلے پر غور کرو تو تمہارا دل گواہی دے گا کہ یہاں ہر آن ایک حکیم فعال کا ارادی فیصلہ کام کرتا رہا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کسے تکمیل کو پہنچانا ہے اور کسے خون کے لوتھڑے یا گوشت کی بوٹی یا ناتمام بچے کی شکل میں ساقط کر دینا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو زندہ نکالنا ہے اور کس کو مردہ۔ کس کو معمول کے انسان کی صورت و ہیئت میں نکالنا ہے اور کسے ان گنت غیر معمولی صورتوں میں سے کوئی صورت دے دینی ہے۔ کس کو صحیح و سالم نکالنا ہے اور کسے اندھا، بہرا، گونگا یا ٹنڈا اور لنجا بنا کر پھینک دینا ہے۔ کس کو خوبصورت بنانا ہے اور کس کو بدصورت۔ کس کو مرد بنانا ہے اور کس کو عورت۔ کس کو اعلیٰ درجے کی قوتیں اور صلاحیتیں دے کر بھیجنا ہے اور کس کو کودن اور کند ذہن پیدا کرنا ہے۔ یہ تخلیق و تشکیل کا عمل جو ہر روز کروڑوں عورتوں کے رحموں میں ہو رہا ہے، اس کے دوران میں کسی وقت کسی مرحلے پر بھی ایک خدا کے سوا دنیا کی کوئی طاقت ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتی بلکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس پیٹ میں کیا چیز بن رہی ہے اور کیا بن کر نکلنے والی ہے حالانکہ انسانی آبادیوں میں قسمت کے کم از کم 90 فیصدی فیصلے انہی مراحل میں ہو جاتے ہیں اور یہیں افراد ہی کے نہیں، قوموں کے بلکہ پوری نوع انسانی کے مستقبل کی شکل بنائی اور بگاڑی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو بچے دنیا میں آتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ فیصلہ کون کرتا ہے کہ کسے زندگی کا پہلا سانس لیتے ہی ختم ہو جانا ہے، کسے بڑھ کر جوان ہونا ہے اور کس کو قیامت کے بورئیے سمیٹنے ہیں؟ یہاں بھی ایک غالب ارادہ کارفرما نظر آتا ہے اور غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی کارفرمائی کسی عالمگیر تدبیر و حکمت پر مبنی ہے جس کے مطابق وہ افراد ہی کی نہیں، قوموں اور ملکوں کی قسمت کے بھی فیصلے کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کسی کو اس امر میں شک ہے کہ اللہ ''حق'' ہے اور صرف اللہ ہی ''حق'' ہے تو بے شک وہ

Marfat.com

عقل کا اندھا ہے۔

وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے

دوسری بات جو پیش کردہ آثار سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ''اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔'' لوگوں کو تو یہ سن کر اچنبھا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت مردوں کو زندہ کرے گا، مگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انہیں نظر آئے کہ وہ تو ہر وقت مردے جلا رہا ہے۔ جن مادوں سے آپ کا جسم بنا ہے اور جن غذاؤں سے وہ پرورش پاتا ہے ان کا تجزیہ کر کے دیکھ لیجئے۔ کوئلہ، لوہا، چونا، کچھ نمکیات، کچھ ہوائیں اور ایسی ہی چند چیزیں اور ہیں۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی حیات اور نفسِ انسانی کے خواص موجود نہیں ہیں مگر انہی مردہ، بے جان مادوں کو جمع کر کے آپ کو جیتا جاگتا وجود بنا دیا گیا ہے۔ پھر انہی مادوں کی غذا آپ کے جسم میں جاتی ہے اور وہاں اس سے مردوں میں وہ تخم اور عورتوں میں وہ بیضی خلیے بنتے ہیں جن کے ملنے سے آپ ہی جیسے جیتے جاگتے انسان روز بن بن کر نکل رہے ہیں۔ اس کے بعد ذرا اپنے گردو پیش کی زمین پر نظر ڈالئے، بے شمار مختلف چیزوں کے بیج تھے جن کو ہواؤں اور پرندوں نے جگہ جگہ پھیلا دیا تھا اور بے شمار مختلف چیزوں کی جڑیں تھیں جو جگہ جگہ پیوند خاک ہوئی تھیں۔ ان میں کہیں بھی بناتی زندگی کا کوئی ظہور موجود نہ تھا۔ آپ کے گردو پیش کی سوکھی زمین ان لاکھوں مردوں کی قبر بنی ہوئی تھی مگر جونہی کہ پانی کا ایک چھینٹا پڑا، ہر طرف زندگی لہلہانے لگی، ہر مردہ جڑ اپنی قبر سے جی اٹھی اور ہر بے جان بیج ایک زندہ پودے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ احیائے اموات کا عمل ہر برسات میں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے

تیسری چیز جو ان مشاہدات سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ''اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' ساری کائنات کو چھوڑ کر صرف اپنی اسی زمین کو لے لیجئے اور زمین کے بھی تمام حقائق وواقعات کو چھوڑ کر صرف انسان اور نباتات ہی کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لیجئے۔ یہاں اس کی قدرت کے جو کرشمے آپ کو نظر آتے ہیں کیا انہیں دیکھ کر کوئی صاحب عقل آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اللہ بس وہی کچھ کر سکتا ہے جو آج ہم اسے کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور کل اگر وہ کچھ اور کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا؟ اللہ تو خیر بہت بلند و برتر ہستی ہے انسان کے متعلق پچھلی صدی تک لوگوں کے یہ اندازے تھے کہ یہ صرف زمین ہی پر چلنے والی گاڑیاں بنا سکتا ہے۔ ہوا پر اڑنے والی گاڑیاں بنانا اس کی قدرت میں نہیں ہے مگر آج کے ہوائی جہازوں نے بتا دیا کہ انسان کے ''امکانات'' کی حدیں تجویز کرنے میں ان کے اندازے کتنے غلط تھے۔ اب اگر کوئی شخص اللہ کیلئے اس کے صرف آج کے کام دیکھ کر امکانات کی کچھ حدیں تجویز کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کے سوا وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ تو وہ صرف اپنے ہی ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے، اللہ کی قدرت بہرحال اس کی باندھی ہوئی حدوں میں بند نہیں ہو سکتی۔

قیامت آ کر رہے گی

چوتھی اور پانچویں بات یعنی یہ کہ ''قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی'' اور یہ کہ ''اللہ ضرور ان سب لوگوں کو زندہ کر کے اٹھائے گا جو مر چکے ہیں'' ان تین مقدمات کا عقلی نتیجہ ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ اللہ کے کاموں کو اس قدرت کے پہلو سے دیکھئے تو دل گواہی دے گا کہ وہ جب چاہے قیامت برپا کر سکتا ہے اور جب چاہے ان سب مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر سکتا ہے جن کو پہلے وہ عدم سے وجود میں لایا تھا اور اگر اس

Marfat.com

کے کاموں کو اس کی حکمت کے پہلو سے دیکھئے تو عقل شہادت دے گی کہ یہ دونوں کام بھی وہ ضرور کر کے رہے گا کیونکہ ان کے بغیر حکمت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور ایک حکیم سے یہ بعید ہے کہ وہ ان تقاضوں کو پورا نہ کرے۔ جو محدود سی حکمت و دانائی انسان کو حاصل ہے اس کا یہ نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی اپنا مال یا جائیداد یا کاروبار جس کے سپرد بھی کرتا ہے۔ اس سے کسی نہ کسی وقت حساب ضرور لیتا ہے۔ گویا امانت اور محاسبے کے درمیان ایک لازمی عقلی رابطہ ہے جس کو انسان کی محدود حکمت بھی کسی حال میں نظر انداز نہیں کرتی۔ پھر اسی حکمت کی بنا پر آدمی ارادی اور غیر ارادی افعال کے درمیان فرق کرتا ہے۔ ارادی افعال کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری کا تصور وابستہ کرتا ہے، افعال میں نیک اور بد کی تمیز کرتا ہے، اچھے افعال کا نتیجہ تحسین اور انعام کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے اور برے افعال پر سزا کا تقاضا کرتا ہے حتیٰ کہ خود ایک نظام عدالت اس غرض کیلئے وجود میں لاتا ہے۔ یہ حکمت جس خالق نے انسان میں پیدا کی ہے کیا باور کیا جاسکتا ہے کہ وہ خود اس حکمت سے عاری ہوگا؟ کیا مانا جاسکتا ہے کہ اپنی اتنی بڑی دنیا اتنے سروسامان اور اس قدر اختیارات کے ساتھ انسان کے سپرد کر کے وہ بھول گیا ہے۔ اس کا حساب وہ کبھی نہ لے گا؟ کیا کسی صحیح الدماغ آدمی کی عقل یہ گواہی دے سکتی ہے کہ انسان کے جو برے اعمال سزا سے بچ نکلے ہیں یا جن برائیوں کی متناسب سزا اسے نہیں مل سکی ہے ان کی باز پرس کیلئے کبھی عدالت قائم نہ ہوگی اور جو بھلائیاں اپنے منصفانہ انعام سے محروم رہ گئی ہیں وہ ہمیشہ محروم ہی رہیں گی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو قیامت اور زندگی بعد موت خدائے حکیم کی حکمت کا ایک لازمی تقاضا ہے جس کا پورا ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا سراسر بعید از عقل ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝٨ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝٩

(اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ ۸) (تکبر سے) گردن مروڑے ہوئے تا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے برگشتہ کریں، ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور ہم قیامت کے دن انہیں آگ کا عذاب چکھائیں گے۔ ۹)

مجادلین بے عقل اور امی محض تھے

اس آیت کا پہلا حصہ آیت تین میں گزر چکا ہے۔ یہ آیت اسی آیت کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کے مخالفین اور مجادلین ایسے نہیں تھے جو قرآنِ کریم کے بیان کردہ دلائل کا علم یا عقل سے جواب دے سکتے اور نہ ان کے پاس کسی آسمانی کتاب کی سند موجود تھی۔ وہ امی محض ہونے کی وجہ سے ہر طرح کے علم اور ہر طرح کی کتاب ہدایت سے بے بہرہ تھے اور جہاں تک عقل کا تعلق تھا اسے انہوں نے اپنے جذبات کی نذر کر دیا تھا۔ اس لئے ان کی بحث اور جھگڑے کی بنیاد کوئی علمی حوالہ یا عقل کا کوئی مسلمہ اصول نہیں تھا بلکہ ان کی سب سے بڑی دلیل صرف یہ تھی کہ چونکہ ہم نے اپنے آباؤاجداد کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہوئے اور قیامت کا انکار کرتے ہوئے دیکھا یا سنا ہے تو ظاہر ہے کہ ہم ان کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتے، وہ ہماری عقیدت کا مرجع ہیں اور ہماری قومی شیرازہ بندی کا سب سے مضبوط بندھن ہیں۔ جو بات ان کے خیالات اور ان کے طرزِ عمل کے خلاف ہوگی اسے ہم کسی طور برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم نے سورۂ لقمان میں خود اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے۔ ارشاد فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى

Marfat.com

وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ○ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا "اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر کسی علم بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو کہتے ہیں ہم اسی طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔"

آباء پرستی عصبیت اور تکبر پیدا کرتی ہے

یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے پاس قرآنِ کریم کے دلائل کا آباء پرستی کے سوا کوئی جواب نہ تھا اور انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب وہ دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دے سکتا اور اس کے نظریاتی سرمائے میں آباؤ اجداد کی محبت اور عقیدت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تو پھر وہ اپنے آباء کی عصبیت میں اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ دلیل کا مقابلہ ان کی عصبیت سے کرتا ہے۔ اور وہ بات بات پر برہم ہو کر مرنے مارنے پر اتر آتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اگر میں نے ان کی دلیل کو قبول کر لیا تو میرے وہ تمام عقائد جو آباؤ اجداد سے ورثے میں ملے ہیں غلط ثابت ہو جائیں گے، اور یہ چیز میں گوارہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس کے رویئے میں برہمی کے ساتھ ساتھ تکبر شامل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ کہاں ہم اور ہمارے آباؤ اجداد اور کہاں تم بھوکے ننگے لوگ، تم ہمیں سمجھانے نکلے ہو اور ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتے ہو، ہم اسے کسی طور بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس بات کی بھی تائید کی ہے۔ ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰھُمْ اِنْ فِیْ صُدُوْرِھِمْ اِلَّا کِبْرٌ مَّا ھُمْ بِبَالِغِیْہِ "بیشک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں بغیر کسی دلیل کے، جو ان کے پاس آئی ہو، کٹ حجتی کرتے ہیں، ان کے دلوں میں صرف غرور ہے جس میں ان کو کامیابی حاصل ہونے والی نہیں ہے۔"

چنانچہ اسی کیفیت کو پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ثَانِیَ عِطْفِہٖ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا معنی ہوتا ہے غرور و نخوت سے اپنی گردن کو مروڑنا۔ امام قرطبی اس کا مفہوم بیان کرتے ہیں۔ تلوی عنقہ مرحًا و تضرمًا.

اشرافِ قریش کے انکار اور تکبر کا مقصد ایک تو یہ ہے کہ وہ آباؤ اجداد کی عصبیت کو آنحضرت ﷺ کی دعوت کے سامنے ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ اگر وہ جذبات سے ہٹ کر عقل سے کام لینے کی کوشش کرتے اور آنحضرت ﷺ کی بات کو سننے کی زحمت کرتے تو بہت ممکن تھا کہ وہ ہدایت یاب ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے آباء کی عصبیت اور عقیدت کو اتنی مضبوطی سے اپنے سامنے رکھا کہ کوئی نصیحت اور کوئی عقل کی بات ان تک پہنچنے نہیں پاتی تھی اور پھر یہ عصبیت جب کمزوری کا خطرہ محسوس کرتی ہے تو پھر یہ غصے میں بھڑک اٹھتی ہے اور کبر و غرور کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اشرافِ قریش بھی ایسی ہی صورتحال سے گزر رہے تھے اور دوسرا مقصد جو ان کے پیشِ نظر تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنی رائے پر مضبوطی سے قائم رہ کر دوسروں کو یہ تأثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اگر ہمارا نقطۂ نگاہ غلط ہوتا تو ہم ضرور اس میں کمی بیشی کرنے کی کوشش کرتے لیکن ہم جب کسی بات کو بھی قبول کر کے نہیں دے رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے عقیدے میں بالکل راست اور برسرِ حق ہیں۔ اس طرح سے وہ بظاہر اپنی استقامت اور مضبوط روی سے لوگوں کو گمراہی پر قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

استکبار کی سزا رسوائی اور عذابِ نار ہے

آیت کے آخری حصے میں فرمایا گیا ہے کہ مشرکین نے چونکہ قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کے مقابلے میں کبر و غرور کا رویہ اختیار کیا ہے اور اپنی جہالت کے مقابلے میں وحی الٰہی کو بھی خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں، تو ان کے اس رویئے کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں

Marfat.com

ہوسکتی کہ ان کو دنیا میں ذلت سے دوچار کردیا جائے۔ چنانچہ مکہ جو عرب کا مرکزِ اعصاب تھا اور جسے طاقت اور قوت کا سرچشمہ اور مرکز سمجھا جاتا تھا اور قریش کو پورے عرب میں عقیدت اور محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ جنگِ بدر میں ان کی پہلی صف تہ تیغ ہوگئی اور دوسری صف گرفتار ہوکر ذلت کا شکار ہوگئی اور پھر آٹھ ہجری میں ان متکبرین نے ہاتھ باندھ کر آنحضرت ﷺ سے جان کی امان مانگی اور ان کی اکثریت قسمت کی دھنی نکلی کہ اسلام کی آغوش میں آگئی۔ چند سر پھرے تھے جو ملک چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

مزید فرمایا کہ یہ چونکہ حق کے مقابلے میں استکبار کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور اسلامی دعوت اور اس کی کامیابیوں کی صورت میں ان کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے اور نفرت کا دل میں ایک الاؤ جلتا رہتا تھا۔ اس لئے قیامت کے دن اس کی سزا یہ دی جائے گی کہ ان کو نارِ جہنم سے جلایا جائے گا۔ یعنی جس طرح وہ دنیا میں حق کے خلاف غصہ اور نفرت اور حسد سے جلتے رہے اس کی پاداش میں وہ آخرت میں جلنے کا عذاب برداشت کریں گے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۟﴿۱۰﴾

(اور اسے بتایا جائے گا کہ) یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ ۱۰)

آخرت کا عذاب کرتوتوں کا نتیجہ ہے

اس آیتِ کریمہ میں یہ تصور کارفرما ہے کہ آخرت میں ہر شخص کو جس صورتحال سے دوچار ہونا پڑے گا وہ اچانک پیدا نہیں ہوگی بلکہ وہ نتیجہ ہوگا ان اعمال اور کرتوتوں کا جو اس نے دنیا میں کئے ہوں گے۔ یہ دنیا ایک کھیتی ہے یہاں آدمی جو کچھ کرتا ہے وہ بیج کی مانند اس میں بویا جاتا ہے۔ بعض اعمال تو ایسے ہوتے ہیں جس کی فصل دنیا میں ہی لہلہانے لگتی ہے اور ان اعمال کا کرنے والا دنیا میں اس کا پھل دیکھ لیتا ہے۔ لیکن بیشتر اعمال فصل کی صورت میں آخرت میں ظاہر ہوں گے۔ جس نے یہاں دنیا میں تکبر اور غرور کا تخم بویا ہوگا وہ قیامت کے دن رسوائی کی فصل کاٹے گا اور اگر اس نے حق کے خلاف غصہ اور نفرت کی پرورش کی ہوگی تو اس کے حاصل کے طور پر قیامت کے دن اسے جلایا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ عمل کی مدت محدود تھی لیکن سزا غیر محدود صورت میں ملی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اعمال کی مدت محدود معلوم ہوتی ہے وہ برگ و بار لانے میں محدود نہیں ہوتے اور ان کے نتائج صدیوں تک پھیلنے کی وجہ سے قیامت میں لامحدود ہوجائیں گی۔ چینیوں کی مشہور کہاوت ہے کہ جو شخص ہوا کاشت کرتا ہے وہ آندھی کی فصل کاٹتا ہے کیونکہ جب اس کے کٹنے کا وقت آئے گا تو وہ اپنے اثرات و نتائج میں آندھی کی شکل اختیار کرچکا ہوگا۔ ٹھیک کہا کسی نے

ہوا کی تخم ریزی سے فصل آندھی کی کاٹو گے

دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ یہاں مبالغے پر نفی وارد ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے۔ یعنی اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ ہر شخص کا عمل اپنے ٹھیک انجام کو پہنچے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم آج اس کے اثرات و نتائج کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ لیکن صدیاں گزرنے سے نہ جانے اس کے اثرات و نتائج کہاں تک پہنچیں۔ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے اور اس کے مطابق سلوک کرے گا۔

Marfat.com

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ
اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ
فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ
الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿١١﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا
لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٢﴾ ۚ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ
اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿١٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ
يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿١٤﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ
اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى
السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿١٥﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ ۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى
وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿١٧﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ
اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ
وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ

Marfat.com

مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ
فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝١٨ ۩ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ
اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ
نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝١٩ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ
بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝٢٠ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝٢١ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا
اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ
الْحَرِيْقِ ۝٢٢

رکوع: ۲۔ (اورلوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں، پس اگر کوئی انہیں کوئی فائدہ پہنچے تب تو وہ اس سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش پیش آ گئی تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتے ہیں، انہوں نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی، یہی تو کھلا ہوا خسارہ ہے۔ ۱۱) یہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں، جو نہ ضرر پہنچا سکتی ہیں اور نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں، یہی بڑی دور کی گمراہی ہے۔ ۱۲) وہ ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جن کا ضرر ان کے نفع سے زیادہ قریب ہے، بہت برا ہے ان کا مولیٰ اور برے ہیں ان کے ساتھی۔ ۱۳) بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کئے، ایسے باغوں میں جن کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہوں گی، بیشک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۱۴) جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ وہ آسمان تک ایک رسی تانے، پھر اسے کاٹ ڈالے (پھر اپنے معاملہ کا فیصلہ کر ڈالے) پھر دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس کے غم کو دور کرنے والی بنتی ہے۔ ۱۵) اور ہم نے اسی طرح اس قرآن کو نازل کیا ہے۔ واضح دلائل کی صورت میں بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدائت دیتا ہے۔ ۱۶) جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صائبین اور نصاریٰ اور مجوس اور جنہوں نے شرک کیا۔ بے شک اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۱۷) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج چاند ستارے پہاڑ درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان، اور بہت سے ایسے ہیں جن پر اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کر دے ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں۔ اللہ

Marfat.com

ہی کرتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے۔ ۱۸) یہ دو فریق ہیں جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لئے آگ کے لباس تراشے جائیں گے۔ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔۱۹) اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے سب گل جائے گا اور کھالیں بھی۔۲۰ اور ان کی سرکوبی کیلئے لوہے کے گرز ہوں گے۔۲۱) جب جب وہ اس کے کسی عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کا عذاب۔ ۲۲)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُاللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾

(اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں، پس اگر کوئی انہیں کوئی فائدہ پہنچے تب تو وہ اس سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش پیش آگئی تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتے ہیں، انہوں نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی، یہی تو کھلا ہوا خسارہ ہے۔ ۱۱)

ہر چیز کے کنارے اور دہانے کو حرف کہتے ہیں۔ حَرْفُ كُلِّ شَيْءٍ طَرْفُهٗ وَشَفِيْرُهٗ وَحَدُّهٗ (قرطبی)

دشمنانِ دین کی دشمنی کا ایک رنگ اور ایمانی زندگی کا ایک پہلو

اس سے پہلے اسلام کے معاندین کا مشرکین کے نام سے ذکر کیا گیا ہے جس سے ہمارے سامنے ایک تصویر ابھرتی ہے کہ ایک دور کے لوگ ہیں جو اپنی زندگی کی باگ ڈور، خواہشاتِ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں دے چکے ہیں۔ان کی زندگی کا مقصد دنیوی عیش وعشرت اور مال ومتاع سے فائدہ اٹھانا ہے۔ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کوئی قانون حاکم نہیں۔فطری سادگی اور چند وضعی مراسم اور قبائلی مفادات سے جنم لینے والی ایک تہذیب ان کے معاشرے کی صورت گری کرتی ہے۔خواہشاتِ نفس بے روک ہونے کی وجہ سے اخلاقیات کا وجود بہت حد تک ناپید ہو چکا ہے۔دنیا کے قیام کو حاصلِ زندگی سمجھنے کی وجہ سے اسی دنیا کی خوشیوں اور غموں کے حصول کو صلاحیتوں اور توانائیوں کیلئے چیلنج بنا دیا گیا ہے جس سے ایک نہ ختم ہونے والا تصادم مختلف قبائل میں پیدا ہو چکا ہے۔نتیجتاً زندگی غیر محفوظ ہو کر رہ گئی ہے۔

اس تباہ کن صورتحال کو بدلنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور وہ اپنے آخری رسول کو مبعوث کرتا ہے۔اس پر اپنی آخری کتاب اتارتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا آخری رسول اُن لوگوں کی ناگفتہ بہ حالت کو بدلنے کیلئے ان کے سامنے وہ نسخۂ شفا پیش کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر نازل کیا ہے۔ان کی ایک ایک کمزوری اور ایک ایک گمراہی کو کھول کھول کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے اور انہیں بتلاتا ہے کہ تم نے زندگی گزارنے کا جو طریقہ اپنا رکھا ہے وہ سراسر تباہی اور ہلاکت ہے۔ پورا جزیرۂ عرب تمہارے اس رویئے کے باعث جہنم بن چکا ہے۔ تمہارے باہمی رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔زندگی کے حقیقی مقاصد سے بے بہرہ ہو کر تم نے اپنے لئے وہ مقاصد متعین کر لئے ہیں جن سے حیوانیت پیدا ہوتی ہے اور انسانیت دم توڑ جاتی ہے اور اخلاق تباہ ہو جاتے ہیں۔تم آہستہ آہستہ اس صورتحال کی طرف بڑھ رہے ہو جو تباہ ہونے والی قوموں کی ہوتی ہے لیکن اس بگڑی ہوئی قوم نے ہمدردی اور خیر خواہی کی اس آواز کو قبول کرنے کی بجائے پہلے اس کی مخالفت کی اور جب دیکھا

Marfat.com

کہ تبلیغ ودعوت کا سلسلہ مخالفت سے رکنے کی بجائے اور تیز ہو گیا ہے تو پھر وہ معاندت پر اتر آئے اور اس کیلئے انہوں نے ہر رشتہ توڑ ڈالا، شرافت کی ہر قدر پامال کر دی۔ چشمِ تصور سے دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک طرف ہمدردی اور خیر خواہی اور نہایت فکر مندی کے ساتھ ان ڈوبنے والوں اور تباہ ہونے والوں کو بچانے کی ہر ممکن تدابیر ہو رہی ہیں اور دوسری طرف ہمدردی اور خیر خواہی کی اس آواز کو ہر طریقے سے خاموش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ دو گروہوں کی الگ الگ شناخت، الگ الگ چلن، الگ الگ طور اطوار اور الگ الگ سیرت و کردار نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں کہ اچانک ان ہی میں سے ایک تیسرا گروہ بھی کہیں کہیں دکھائی دینے لگا ہے۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ مکے میں رہنے والے بالخصوص اور باقی جزیرۂ عرب کے رہنے والے بالعموم زندگی گزارنے کا جو طریقہ اختیار کر چکے ہیں وہ یقیناً تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور جو لوگ انہیں سمجھانے بجھانے اور اس طریقے کو چھوڑ کر ایک اور طریقہ اپنانے کی دعوت دے رہے ہیں وہ یقیناً حُسنِ کردار کے مالک، گہری ہمدردی رکھنے والے، مقاصدِ زندگی کا واضح تصور دینے والے اور ایک ایسی پاکیزہ دعوت کو پیش کرنے والے ہیں جس کے نتیجے میں ہر چیز کے تبدیل ہو جانے کا امکان ہے۔ یہ جزیرۂ عرب جو نفرت و وحشت کا جہنم بن چکا ہے اور جہاں دشمنی اور عداوت کے بگولے اٹھتے دکھائی دے رہے ہیں اور ہر طرف بداخلاقی اور گمراہی کی ایک بادِ سموم چل رہی ہے اگر اس صورتحال کو بدلا نہ گیا تو یقیناً وہ ہلاکت اور بربادی دور نہیں جس سے اصلاح ودعوت کا کام کرنے والے برابر ہمیں آگاہ کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ یہ دعوت واصلاح کے داعی جو دعوت لے کے اٹھے ہیں اس میں خواہشاتِ نفس کی پیروی کا کوئی امکان نہیں۔ وہ ایک روکھی پھیکی زندگی ہے جو ایک بڑے مقصد کے حصول کیلئے گزاری جاتی ہے اور جس کیلئے قدم قدم پر قربانی وایثار کے تقاضے ہیں۔ اب اگر ہم ان کی دعوت قبول کر کے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ بھی وہی قیامت گزرے گی جس کا سامنا یہ لوگ کر رہے ہیں اور اگر ہم دعوت کو قبول کرنے سے بالکل انکار کر دیتے ہیں تو پھر اسی جہنم میں رہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑے ہیں، دعوت کو قبول کرتے ہیں تو حقائق کی تلخیاں اور مخالفین کی اذیتیں اپنی طرف بڑھتی ہوئی محسوس کرتے ہیں، اور اگر قبول نہیں کرتے ہیں تو جو ضمیر میں تھوڑی سی روشنی پیدا ہوئی ہے وہ ملامت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اسی میں عافیت محسوس کرتے ہیں کہ اس نئی اٹھتی ہوئی اسلامی دعوت کو قبول تو کریں لیکن اس تصادم کے دریا میں اترنے سے اجتناب کریں۔ کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھیں کہ اس تصادم کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اس تصور کے سائے میں آگے بڑھتے ہیں کہ اگر ان کے اپنے مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور کسی بڑی قربانی کا تقاضا پیدا نہیں ہوتا تو انہیں اسلام اور اس کی تمام خوبیوں کا اقرار ہے اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس شمع کو اٹھانے میں انہیں کوئی پس و پیش نہیں۔ لیکن اگر انہیں اپنے مفادات کی قربانی دینا پڑتی ہے اور زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی رونما کرنا ضروری ہو جاتا ہے تو وہ واپس وہیں پلٹ جاتے ہیں جہاں سے وہ چلے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی حقیقی مقصد نہیں بلکہ وہ بندۂ درہم و دینار ہیں۔ ان کی زندگی کا اصل ہدف آرام وراحت کا حصول، جلبِ منفعت اور بیش از بیش مفادات کا حاصل کرنا ہے۔ انہیں آنحضرت ﷺ کے دیئے ہوئے شعور اور پاکیزہ سیرت و کردار سے انکار نہیں لیکن اس کیلئے اپنے آرام وراحت کو تج دینا اور سب کچھ اس کے راستے میں قربان کر دینا انتہائی تکلیف دہ فیصلہ ہے جو ان کیلئے قابلِ قبول نہیں۔ انہیں پھولوں سے محبت ہے لیکن پھول تک پہنچنے کیلئے کانٹوں کا تصور بھی ان کیلئے تکلیف دہ ہے۔ وہ سچ کو عزیز رکھتے ہیں لیکن اگر اس کی قیمت ادا کرنی پڑے تو پھر جھوٹ کے ساتھ گزارہ کرنے سے انہیں کوئی عار نہیں۔ اسلام اگر انہیں اس بات کی ضمانت دے سکے کہ ان کے مفادات پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی تو وہ اسلام کو قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن اگر اسلام اس کی ضمانت نہیں دیتا بلکہ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ زندگی کا ہر تعلق اور ہر

Marfat.com

وابستگی آزمائش کے مراحل سے گزرتی ہے، کوئی محبت اس وقت تک قابلِ اعتماد نہیں ہوتی جب تک وہ آزمائش میں اتر کر اپنا سچا ہونا ثابت نہیں کرتی۔

محبت کے مقدر میں کہاں آرام ہے اے ہمدم
کہیں شعلہ، کہیں بجلی، کہیں سیماب ہوتی ہے

جبکہ محبت محض ایک فرد کا دوسرے فرد سے تعلق کا نام ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام جو زندگی کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر تبدیلی کا داعی ہے کسی آزمائش میں ڈالے بغیر اسلامی وابستگی کا اعتبار کر لے جبکہ اسلام ہر طرح کے تعلق کو توڑ کر اللہ تعالیٰ سے وابستگی کی دعوت ہے جس میں دل و دماغ سے غیر اللہ سے تمام رشتے کاٹنے پڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے وفاداری کے مقابلے میں تمام وفاداریوں سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کی بالادستی کے مقابلے میں تمام قوانین کو جھٹکنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت کے سامنے ہر طرح کی اطاعت سے انکار کرنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کے رسول سے محبت و اطاعت کا رشتہ جوڑ کر ان کی ذات کو نمونے کے طور پر اس طرح دل و دماغ میں بسانا اور زندگی کے طور اطوار میں رہنما بنانا پڑتا ہے کہ اس کے سامنے تمام حوالوں سے تسلیم کردہ ہیروز کی محبت کو دل سے نکالنا اور ان کی زندگی کے نمونوں کو زندگی کے تمام شعبوں سے بے دخل کرنا ناگزیر ہے۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر تبدیلی ہے جو عقیدے سے لے کر معاشرت، معیشت، سیاست، اصولِ حکمرانی، طریقِ حکومت، تصوراتِ ریاست اور آدابِ انسانیت غرضیکہ کے تمام انفرادی اور اجتماعی دوائر پر چھائی ہوئی ہے۔ اس میں نہ کسی دوسری وابستگی کا گزر ہوتا ہے، نہ کسی دوسری وفاداری کا تصور پایا جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی سروری کے سوا ہر سروری اور سرداری شرک ہے۔ بقول اقبال:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اور زندگی کی رہنمائی اور نمونے کیلئے صرف ایک ذاتِ عزیز ہے جس کی ہمہ گیری اور گہرائی کا عالم یہ ہے کہ:

وہ دانائے سُبُل ختم الرُسُل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

یہ کردار آج بھی موجود ہے

لیکن اُس دور کا منافق جو تحفظات کے ساتھ اسلام کے راستے پر چلنے کیلئے تیار ہے لیکن کسی قسم کے ایثار اور قربانی کیلئے تیار نہیں۔ یہ وہ صورتحال ہے جسے ہم آج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج کے دانشور یا ابنائے زمانہ اسلام کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرتے، انہیں نبی کریم ﷺ کی ذات سے بھی انکار نہیں۔ وہ قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے سے انکاری نہیں، لیکن یہ بات انہیں کسی طور گوارا نہیں کہ وہ اسلام کو ایک ایسے دین کے طور پر قبول کریں جس میں کسی اور رہنمائی کیلئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ وہ قرآنِ کریم کو ایک ایسے قانون کے طور پر ماننے کیلئے تیار نہیں جو معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب و تمدن، غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی دینے پر مصر ہو۔ وہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا

Marfat.com

رسول ماننے سے انکار نہیں کرتے، لیکن انہیں اس بات میں تأمل ہے کہ وہ انہیں دانائے سُبل سمجھیں اور مولائے کل مانیں جن کی ذات سے ثقافت پھوٹے، جن کی معاشرتی رہنمائی سے تہذیب جنم لے اور جن کی شریعت سے تمدن کو رہنمائی ملے اور جن پر نازل ہونے والی کتاب عدالتوں میں قانون بن کر فیصلے دے۔ ٹھیک کہا کسی شاعر نے:

یاراں عجب اندازِ دو رنگی دارند
مصحف بہ بغل دینِ فرنگی دارند

اسلام نے دو عملی اور دورنگی کو نہ عہدِ نبوت میں قبول کیا تھا اور نہ آج قبول کرنے کو تیار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت جس طرح ہر قسم کے شرکت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے اسی طرح اس کے مصطفیٰ کی شخصیت ہر دوسری شخصیت کو ماننے سے ابا کرتی ہے اور اس کا دیا ہوا ضابطۂ حیات ہر دوسرے ضابطۂ حیات کی دریوزہ گری سے انکار کرتا ہے۔ اس کا نازل کردہ آئین اور قانون ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت آخری قانون ہے اور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی آخری اسوۂ کاملہ ہے جس میں کسی پیوند کی کوئی گنجائش نہیں۔ جس طرح اس پر نازل ہونے والی کتاب ہر طرح کے شک وشبہ سے ماورا ایک محفوظ کتاب ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کی زندگی کے حالات قانونی اور اخلاقی رہنمائی کے طور پر بالکل محفوظ حالت میں ہیں اور ان کی زندگی کا روزنامچہ آج بھی اس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہے جس سے ہم اپنی شب وروز کی زندگی میں مکمل طور پر رہنمائی لے سکتے ہیں۔

دورِ نبوت میں جن لوگوں نے منافقت کی روش اختیار کی اور اسلام کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ان کی دنیا بھی تباہ ہوئی اور آخرت بھی تباہ ہوگئی۔

کتبِ تفسیر میں اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے یہ واقعہ لکھا گیا ہے کہ ایک یہودی مسلمان ہوا۔ اتفاق سے کچھ عرصہ بعد اس کی بینائی جاتی رہی، پھر اس کا زبردست مالی نقصان ہوگیا، اس کا ایک لڑکا تھا وہ بھی مرگیا۔ اس نے ان مصائب کو اسلام کی نحوست جانا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا اقلنی ''کہ میں نے جو آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی مجھے اس سے آزاد کردیجئے۔'' آپؐ نے ارشاد فرمایا ان الاسلام لایقال ''یعنی اسلام کی بیعت واپس نہیں لی جاسکتی۔'' کہنے لگا کہ مجھے اس دین سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ میں اندھا ہوگیا، مال برباد ہوا، بیٹا مرگیا۔ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا یا یھودی ان الاسلام یسبک الرجال کما یسبک النار خبث الحدید والذھب والفضۃ ''اے یہودی! اسلام اس طرح مردوں کو گلاتا ہے جس طرح آگ لوہے اور سونے اور چاندی کے میل کچیل کو صاف کرتی ہے۔''

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو آدمی منفعت کے کاروبار اور مال ودولت کی محبت اور مفادات کی ہوس سے آزاد نہیں ہوتا۔ اسلام اس کے دل میں نہیں اترتا۔ وہ اسلام کو ایک کاروبار سمجھتا ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی خاطر سب کچھ چھوڑ دینے کا نام ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

لیکن جو شخص اس تصور کو قبول کئے بغیر اسلام کے دائرے میں آتا ہے اسے جب آزمائش کی بھٹی میں ڈالا جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور اسلام سے بدگمان ہو کر آخرت تو تباہ کرتا ہے، دنیا بھی تباہ کرلیتا ہے، اسی کو آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی گئی۔

Marfat.com

اور یہی وہ سب سے بڑی ناکامی ہے جسے خسرانِ مبین قرار دیا گیا ہے۔

يَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾

(یہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں، جو نہ ضرر پہنچا سکتی ہیں اور نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں، یہی بڑی دور کی گمراہی ہے۔ ۱۲)

مشرکین کا رویہ اور دعا کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ کا تعلق چونکہ گزشتہ آیت کریمہ سے ہے، اس میں ان لوگوں پر تنقید کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں لیکن ایک کنارے پر کھڑے ہو کر، ان کی زندگی کا اصل ہدف مفادات اور منافع کا حصول ہے۔ وہ کسی ایسے مقصد کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں جس کی انہیں قیمت ادا کرنی پڑے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں ان کے مفادات محفوظ ہونے کی بجائے انہیں مصائب کا سامنا کرنے کی دعوت دی جارہی ہے تو وہ ایسے اسلام سے کان پر ہاتھ دھرتے اور دور بھاگ نکلتے ہیں۔ اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ اسلام کے قبول کرنے سے ہماری زندگی کا ہر رنگ پھیکا ہو جائے گا اور ہمیں اللہ تعالیٰ سے جو امیدیں اور آرزوئیں ہیں ان میں سے کسی کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کو چھوڑ کر اور آستانے تلاش کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کے اسی رویئے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اب وہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے لوگوں کو پکارتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پکار عبادت کے معنی میں ہے کیونکہ یہ آیت گزشتہ آیت کے مضمون کا تسلسل ہے اور عبادت میں جس طرح بندگی اور اطاعت شامل ہے اسی طرح دُعا، استغاثہ، فریاد اور استمداد بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے کے بعد حیرانی کی بات ہے کہ یہ ان آستانوں پر سر جھکاتے اور ان قوتوں سے فریاد کرتے ہیں جو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان دے سکتی ہیں۔ اگر تو اس سے بت مراد لئے جائیں تو پھر اگرچہ معنی زیادہ واضح ہو جاتا ہے لیکن اس میں بھی ایک بات کا دھیان رکھنا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ جن لوگوں نے بت پرستی کا ارتکاب کیا ہے ان کے پیشِ نظر یہ کبھی نہیں رہا کہ یہ پتھر کے اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بت غیر معمولی قدرتوں کے مالک ہیں یہ ہماری ہر بگڑی بنا سکتے اور ہماری زندگیاں سنوار سکتے ہیں بلکہ ان کے ذہن میں ان زندہ شخصیتوں کا تصور ہوتا ہے جن کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کی یاد میں یہ مجسمے اور یہ بت تراشے گئے ہیں۔ وہ طاقت اور قدرت کا مالک ان شخصیتوں کو سمجھتے ہیں اور جن کے بارے میں ان کا گمان یہ ہے کہ مرنے کے بعد اللہ والوں میں زیادہ قوتیں آجاتی ہیں۔ جو کام وہ اپنی زندگی میں نہیں کر سکتے وہ موت کے بعد کر سکتے ہیں۔ وہ لوگوں کی دُعائیں سنتے اور ان کی فریادوں کو پورا کرتے ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مرنے والے دنیا سے چلے گئے اور ان کے نام پر یہ گھڑے ہوئے بت اپنے اندر کوئی قدرت نہیں رکھتے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مشرکین نے جس طرح بتوں کو خدا کا شریک بنایا ہے اسی طرح فرشتوں کو، دیوتاؤں کو اور بعض قوتوں کے اوتاروں کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے۔ اور کتنی ایسی طاغوتی قوتیں ہیں جن کے اقتدار اور اختیار کے سامنے مشرکین نے نہ صرف سر جھکائے ہیں بلکہ اپنا مال و دولت اور اپنی صلاحیتوں کا سرمایہ ان کے اقتدار کو مضبوط کرنے کیلئے صرف کیا ہے۔ وہ اپنی خدائی کا صور پھونکتے ہیں تو یہ ان کی خدائی کو غذا فراہم کرتے ہیں جبکہ وہ جانتے ہیں کہ حقیقت میں وہ نہ نافع ہیں اور نہ ضار ہیں۔ نفع و ضرر کی حقیقی قوت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان کو نافع اور ضار سمجھ کر ان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ کس قدر دور کی گمراہی

Marfat.com

ہے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے نہیں جھکتا وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اسے خالق و مالک وہ بھی تسلیم کرتا ہے اور اسے بھی اس کی بے پناہ قوتوں کا اعتراف ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جن کے سامنے استمداد کیلئے ہاتھ پھیلایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کی مدد نہیں کرسکتے۔ اس کے باوجود جب وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جبکہ وہ یقینی سہارا ہے اس کے سامنے سر جھکاتا اور ہاتھ پھیلاتا ہے جو نفع اور نقصان کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی حماقت اور کتنی دور کی گمراہی ہے۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

(وہ ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جن کا ضرر ان کے نفع سے زیادہ قریب ہے، بہت برا ہے ان کا مولیٰ اور برے ہیں ان کے ساتھی۔ ۱۳)

مشرکین کی حماقت

گزشتہ آیت میں فرمایا کہ مشرکین کی انتہائی گمراہی ملاحظہ ہو کہ یہ ان چیزوں کو پکارتے ہیں جو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان دے سکتی ہیں اور ان کیلئے جس پروردگار کو چھوڑا ہے وہ نہ صرف نفع وضرر پر قادر ہے بلکہ اس کی قدرتیں بے پناہ ہیں۔ پیش نظر آیت کریمہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے کہ کسی ایسی ذات کو پکارنا جو نفع وضرر پر قادر نہ ہو یقیناً حماقت ہے لیکن ایسی ذات کو پکارنا جس کی ضرر رسانی نفع رسانی کی قوت سے بڑھی ہوئی ہو، اسے کم سے کم الفاظ میں حماقت در حماقت کہا جانا چاہئے۔ بعض بزرگوں نے اس آیت کے مفہوم کو اس طرح واضح کیا ہے کہ غیر اللہ سے نفع کی امید تو زیادہ سے زیادہ موہوم کہی جاسکتی ہے، لیکن ان کے پوجنے کا جو ضرر ہے وہ قطعی اور یقینی ہے۔ موہوم امید کے برآنے کا سوال تو بعد میں دیکھا جائے گا نقصان تو ابھی ہاتھوں ہاتھ پہنچ گیا۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسری قوتوں کو پکارنے کے نتیجے میں جہنم کی سزا سنائی جائے گی تو مشرکین پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدنصیبی ہم نے جن کے سہارے پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑا اور جن کی امید پر شرک کا راستہ اختیار کیا وہ آج ہمارے کیا کام آتے ان کی بدنصیبی کا حال تو یہ ہے کہ ہماری طرح وہ بھی جہنم کا ایندھن بنائے جارہے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی:

توقع تھی وہ جن سے خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

قرآن کریم کہتا ہے کہ کسی ایک کی بات نہیں بلکہ مولیٰ اور عشیر دونوں ہی ایک سے ایک بڑھ کر نابکار ثابت ہوئے۔ مولیٰ سے مراد وہ شرکاء وشفعاء ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا مرجع اور کارساز بنایا گیا اور عشیر سے مراد وہ مشرکین ہیں جنہوں نے ان کو مرجع وکارساز بنایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

(بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کئے، ایسے باغوں میں جن کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہوں گی، بیشک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۱۴)

Marfat.com

مخلصین کا انجام

اللہ تعالیٰ سے مایوس ہوکر دوسروں کو پکارنے والوں کے انجام کے ذکر کے بعد اب ان لوگوں کا انجام بیان کیا جارہا ہے جنہوں نے نہایت ناگفتہ بہ حالات اور مخالفت اور معاندت کے طوفانوں میں اللہ تعالیٰ سے امید ٹوٹنے نہیں دی۔ وہ ٹھیک اس راستے پر چلتے رہے جس کی رہنمائی انہیں ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی طرف سے ملتی رہی۔ انہیں بڑی سے بڑی آزمائش پیش آئی، لیکن اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور اس پر بھروسے میں کبھی کمی نہ آئی۔ ان کے اس یقین میں کبھی کمزوری نہ آسکی کہ ہماری زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اس راستے میں سب کچھ قربان کردینا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہوں گی۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا کہ یقیناً اس وقت مسلمان نہایت زبوں حالی سے گزر رہے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے راستے بظاہر بند ہوتے دکھائی دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کا راستہ بند کرنے والا کوئی نہیں۔ مکے والے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف چاہے کیسی ہی تدبیریں کریں وہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی تدبیر پر غالب نہیں آسکتے۔ وہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ وہ یقیناً اپنے پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والوں کی مدد فرمائے گا اور انہیں ہر حال میں سرخرو کرے گا۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾

(جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہئے کہ وہ آسمان تک ایک رسی تانے، پھر اسے کاٹ ڈالے (پھر اپنے معاملہ کا فیصلہ کرڈالے) پھر دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس کے غم کو دور کرنے والی بنتی ہے۔ ۱۵)

اس آیت کے مفہوم میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے تو ہم خود کچھ کہنے کی بجائے تین مفسرین کی بیان کردہ تفسیر کو نقل کررہے ہیں جن کی ہمارے نزدیک ایک اہمیت ہے۔ ان میں سے جسے بھی اختیار کرلیا جائے انشاء اللہ غلط نہیں ہوگا۔

ضمیر مفعول کا مرجع

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ میں ضمیر کا مرجع " مَنْ " ہے۔ جن لوگوں نے اس کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو مانا ہے ان کی رائے سیاق و سباقِ کلام سے بالکل بے جوڑ ہے۔ آیت میں اشارہ انہیں دودلوں اور منافقوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ اگر انہیں کوئی آزمائش پیش آجاتی ہے تو خدا سے مایوس و بدگمان ہوکر دوسرے کو مولیٰ و مرجع بنا بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پیش آمدہ مشکل سے خدا ان کو نہیں نکالے گا یا نہیں نکال سکتا۔

Marfat.com

مدّ سبب کا مفہوم

فَلْیَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآء آسمان میں رسی تاننا آخری اور انتہائی تدبیر کو دیکھنے کیلئے اسی طرح کا ایک استعارہ ہے جس طرح ہماری زبان میں تھگلی لگانے کا استعارہ ہے۔ سورۂ انعام میں بھی آسمان میں تھگلی لگانے کا استعارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے:

وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْسُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ (انعام: ۳۵)

اور اگر ان لوگوں کا اعراض تم پر ایسا ہی شاق گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگا کر ان کیلئے کوئی نشانی لاسکو تو لا دو! اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر مجتمع کر دیتا تو تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو!

زہیر اور اعشیٰ نے بھی انتہائی اور آخری جدوجہد کے مفہوم کیلئے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ زہیر کا مصرع ہے:

ولو نال اسباب السماء بسُلّم

اسی طرح اعشیٰ کہتا ہے:

ورقیت اسباب السماء بسُلّم

قطع کا مفہوم :

ثُمَّ لْیَقْطَعْ۔ ''قطع'' کے معنی ابومسلم نے قطع مسافت کے لئے ہیں یعنی وہ آسمان میں رسی تانے اور آسمان میں چڑھ جائے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی قطع وحی کے۔لئے ہیں یعنی جس کو یہ گمان ہو کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا وہ آسمان میں چڑھ کر سلسلۂ وحی کو قطع کردے۔ اکثر لوگوں نے اس کے معنی پھانسی لگانے یا گلا گھونٹ لینے کے لئے ہیں یعنی وہ چھت میں رسی لٹکا کر اپنے آپ کو پھانسی لگالے۔ ان تاویلوں میں جو قباحت ہے اس سے قطع نظر، لفظ ''قطع'' کا جو مفہوم ان حضرات نے لیا ہے وہی محلِ نظر ہے۔ وحی کو منقطع کردینے یا پھانسی لگا لینے کے معنی کے لئے تو اس لفظ کا استعمال بالکل ہی ناموزوں ہے۔ عربیت کا ذوق اس سے اِبا کرتا ہے۔ کسی مفہوم کے لئے معروف ومتداول الفاظ کے ہوتے ہوئے کسی ناموزوں لفظ کا استعمال قرآن کی فصاحت و بلاغت کے بالکل منافی ہے۔ قطع مسافت کے مفہوم کیلئے اگرچہ اس لفظ کو ناموزوں نہیں قرار دیا جاسکتا اس لئے کہ قطع وادی، وغیرہ کے محاورات عربی میں معروف ہیں لیکن یہاں اس لفظ کا استعمال اس مفہوم کیلئے بالکل ناموزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آسمان کی طرف رسی تاننے کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ فَلْیَتَصَعَّدْ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہے۔ یقطع اس کے ساتھ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تمام اقوال ضعیف ہیں۔ البتہ! عزم و جزم کے ساتھ کسی معاملہ کا فیصل کرنے کے مفہوم کیلئے یہ لفظ اعلیٰ عربی میں معروف ہے۔ اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے۔ مثلاً سورۂ نمل میں ہے:

قَالَتْ یٰٓاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْٓ اَمْرِیْ ۚ مَا کُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰی تَشْهَدُوْنِ (نمل: ۳۲)

ملکۂ سبا نے کہا کہ اے درباریو! میرے معاملے میں آپ لوگ اپنی رائے دیں۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک

Marfat.com

آپ لوگ موجود ہو کر مشورہ نہ دیں۔

اللہ سے مایوسی و بدگمانی کا انجام

اجزائے آیت کی تشریح کے بعد اب آیت کے مفہوم پر غور کیجئے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو بد بخت و نامراد اللہ سے مایوس و بدگمان ہوتا ہے کہ وہ اس کی مدد نہیں کرے گا اور اس بدگمانی میں مبتلا ہو کر دوسروں کو اپنا مولیٰ و مرجع بناتا ہے وہ جو چاہے کر دیکھے، وہ آسمان میں تھگلی لگائے اور اپنا پورا زور لگا کر اپنے معاملہ کا فیصلہ اور غم اور پریشانی کو اگر دور کر سکتا ہے تو دور کر لے۔ مطلب یہ کہ خدا کو ایسے لاخیروں سے کوئی بحث نہیں۔ وہ جہاں چاہیں آوارہ گردی کریں اور جس جوہڑ سے چاہیں اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کریں۔لیکن یاد رکھیں کہ انسانی فطرت کے اندر جو پیاس ہے وہ ہر جوہڑ کے پانی سے نہیں بجھ سکتی۔وہ صرف ایمان کے حوضِ کوثر ہی سے بجھتی ہے اور اس کے اندر جو خلا ہے وہ ہر اینٹ پتھر سے نہیں بھرا جاسکتا، اس کو اگر بھرا جاسکتا ہے تو صرف اللہ واحد کی یاد ہی سے بھرا جاسکتا ہے۔سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔اس آیت سے متعلق بعض مزید سوالات جو پیدا ہوں گے وہ اس سے صاف ہو جائیں گے۔یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا سے مایوسی و بدگمانی شرک کے بہت بڑے عوامل میں سے ہے۔اس حقیقت کی وضاحت ہم اپنی کتاب حقیقتِ شرک میں کر چکے ہیں۔انسان جب خدا سے کٹتا ہے تو وہ بہرحال اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈنے کی سعی کرتا ہے لیکن حقیقی سہارا چونکہ خدا اور صرف خدا ہی ہے اس وجہ سے وہ چاہے آسمان ہی پر چڑھ جائے اس کی ساری سعی لاحاصل ہی رہتی ہے۔

اس آیت میں فی الاخرۃ کا لفظ بھی قابل غور ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں اللہ ہی یار و رونا صر ہے اسی طرح آخرۃ میں بھی اللہ ہی یار و رونا صر ہے۔اگر کوئی اللہ کے رحم یا انصاف سے بدگمان ہو کر کسی اور کو اپنا یار و رونا صر بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اللہ کے مقابل میں اس کے کام آئیں گے تو وہ یہ بھی کر دیکھے۔اس کے اس وہم کی حقیقت بھی قیامت کے دن اس پر آشکارہ ہو جائے گی۔(تدبر قرآن)

سلسلۂ تقریر کو نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ گمان کرنے والا شخص وہی ہے جو کنارے پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے۔ جب تک حالات اچھے رہتے ہیں مطمئن رہتا ہے اور جب کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے، یا کسی ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جو اسے ناگوار ہے تو اللہ سے پھر جاتا ہے اور ایک ایک آستانے پر ماتھا رگڑنے لگتا ہے۔اس شخص کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ قضائے الٰہی پر راضی نہیں ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ قسمت کے بناؤ اور بگاڑ کے سر رشتے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے مایوس ہو کر دوسرے آستانوں سے امیدیں وابستہ کرتا ہے۔اس بنا پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس شخص کے یہ خیالات ہوں وہ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لے حتیٰ کہ اگر آسمان کو پھاڑ کر تھگلی لگا سکتا ہو تو یہ بھی کر کے دیکھ لے کہ آیا اس کی کوئی تدبیر تقدیر الٰہی کے کسی ایسے فیصلے کو بدل سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے۔ آسمان پر پہنچنے اور شگاف دینے سے مراد ہے وہ بڑی سے بڑی کوشش جس کا انسان تصور کر سکتا ہو۔ان الفاظ کا کوئی لفظی مفہوم مراد نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن)

مَنْ کَانَ یَظُنُّ، حاصل یہ ہے کہ اسلام کا راستہ روکنے والے معاند جو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اس کے دین کی مدد نہ کرے ان کو سمجھنا چاہئے کہ یہ تو جبھی ہو سکتا ہے جبکہ معاذ اللہ آنحضرت ﷺ سے منصب نبوت سلب ہو جائے اور آپؐ پر وحی آنا منقطع ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو نبوت و رسالت سپرد فرماتا ہے اور اس کو وحی الٰہی سے نوازتا ہے اسکی مدد تو دنیا و آخرت میں کرنے کا اس کی طرف

Marfat.com

سے پختہ عہد ہے اور عقلاً بھی اس کے خلاف نہ ہونا چاہئے تو جو شخص آپ کی اور آپ کے دین کی ترقی کو روکنا چاہتا ہے اس کو اگر اس کے قبضہ میں ہو تو ایسی تدبیر کرنا چاہئے کہ یہ منصب نبوت سلب ہو جائے اور وحی الٰہی منقطع ہو جائے۔ اس مضمون کو ایک فرض محال کے عنوان سے اس طرح تعبیر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے وحی کو منقطع کرنے کا کام کرنا چاہتا ہے تو کسی طرح آسمان پر پہنچے وہاں جا کر اس سلسلہ وحی کو ختم کر دے اور ظاہر ہے کہ نہ کسی کا اس طرح آسمان پر جانا ممکن، نہ اللہ تعالیٰ سے قطع وحی کو کہنا ممکن، تو پھر جب تدبیر کوئی کارگر نہیں تو اسلام و ایمان کیخلاف غیظ و غضب کا کیا نتیجہ؟ یہ تفسیر بعینہٖ درمنثور میں ابن زید سے روایت کی گئی ہے اور میرے نزدیک یہ سب سے بہتر اور صاف تفسیر ہے۔

(بیان القرآن مع تسہیل)

قرطبی نے اسی تفسیر کو ابو جعفر نحاس سے نقل کر کے فرمایا کہ یہ سب سے احسن تفسیر ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی اس تفسیر کو نقل کیا ہے اور بعض حضرات نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ سماء سے مراد اپنے مکان کی چھت ہے اور مراد آیت کی یہ ہے کہ اگر کسی معاند جاہل کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اس کے دین کی مدد نہ کرے اور وہ اسلام کے خلاف غیظ و غضب لئے ہوئے ہے تو سمجھ لے کہ اس کی یہ مراد تو کبھی پوری نہ ہوگی۔ اس احمقانہ غیض و غضب کا تو علاج یہی ہے کہ چھت میں رسی ڈال کر پھانسی لے لے اور مر جائے۔ (مظہری وغیرہ)

(معارف القرآن)

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾

(اور ہم نے اسی طرح اس قرآن کو نازل کیا ہے۔ واضح دلائل کی صورت میں بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدائت دیتا ہے۔ ۱۶)

دلائل کب بے اثر ہوتے ہیں؟

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین کو آنحضرت ﷺ کی دعوت پر اس قدر غصہ اور رنج تھا کہ وہ یہ سوچتے تھے کہ کاش! کوئی ایسی صورت ممکن ہو کہ ہم نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کا سلسلہ منقطع کر دیں۔ ایسی صورت میں آنحضرت ﷺ کی دعوت کا سلسلہ خود بخود رک جائے گا اور آیت کے الفاظ میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ وہ اللہ کی ذاتِ کریم سے بھی انتہائی نالاں اور آزردہ تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہم اس دعوت کو روکنے کیلئے جو کچھ کرتے ہیں اس میں ہمیں کہیں کامیابی نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری بالکل مدد کرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ اس پس منظر میں جب کہ مشرکین اللہ سے بھی ناراض ہیں اور آنحضرت ﷺ کی دعوت پر وہ غیض و غضب میں جلے جا رہے ہیں ان سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ انسان کی سرشت یہ ہے کہ جب اس سے کوئی بھلے کی بات کہی جائے تو وہ اسے سمجھنے کیلئے دلیل کا خواہش مند ہوتا ہے اور اگر اسے دلائل سے مطمئن کر دیا جائے تو پھر اپنی سرشت کے تقاضا کے مطابق ہے اس بات کو قبول کر لیتا ہے۔ البتہ! جب کوئی شخص کسی اچھی سے اچھی بات کے حوالے سے بھی تحفظات کا شکار ہو جاتا ہے یا اس کے منفی جذبات اس کے خلاف کام کرنے لگتے ہیں تو دلائل بھی بے اثر ہو جاتے ہیں۔ مشرکین کا اصل مسئلہ یہی ہے۔ قرآنِ کریم پروردگار نے واضح دلائل کے ساتھ اتارا ہے۔ وہ کوئی بات بھی بلا دلیل نہیں کرتا اور دلائل میں ہر طرح کے دلائل سے کام لیتا ہے۔ کبھی دلائل آفاق پیش کرتا ہے اور کبھی دلائل انفس کبھی انسانی فطرت کو آواز دیتا ہے اور کبھی دلوں کے دروازوں پر دستک دیتا ہے۔ لیکن جب انسان اپنے منفی جذبات کے تحت ہر دروازہ بند کر لیتا ہے۔ تو اس کے سمع و قبول کے امکانات

Marfat.com

محدود ہو جاتے ہیں۔

سنت اللہ کا بیان

آیت کے دوسرے حصے میں ہدایت وضلالت سے متعلق سنت اللہ کو بیان کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی عنایت انسانوں کیلئے ہدایت کو آسان بنانے کی خاطر دلائل میں کوئی کمی نہیں رہنے دیتی۔ سمجھانے بجھانے کے تمام امکانات سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن فیصلہ اللہ کی سنت کے مطابق اس بات پر ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ نے جس جوہر عقل سے نوازا ہے اور دل دماغ کی جو رعنائیاں عطا فرمائی ہیں انسان ان سے کہاں تک کام لیتا ہے۔ اگر وہ ان خداداد صلاحیتوں سے کام لیتا ہے، اللہ سے توفیق مانگتا ہے تو یقیناً اس کیلئے قبولیت کے دروازے کھل جاتے ہیں لیکن اگر وہ گروہی عصبیت کا شکار ہو کر منفی جذبات کے تحت بات کو سننا بھی پسند نہیں کرتا تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت دینا کبھی پسند نہیں کرتا۔ اللہ کی ذات انتہائی غیور ہے اور اس کا دین نہایت قدر و قیمت کا حامل ہے۔ یہ ایسے شخص کو کبھی عطا نہیں ہوتا جو اس کیلئے اپنے دل میں خواہش نہیں رکھتا۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتی وجاہت آپ کا بے عیب کردار، آپ کی انسانوں کیلئے انتہائی ہمدردی اور خیر خواہی اور قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت اور اس کا معجزانہ انداز بھی اس کی ہدایت کا باعث نہیں بنتا۔ جس طرح ہدایت کی قبولیت کیلئے دلائل اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ انسانی ماحول اور انسانی فطرت اپنا کام کرتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اللہ کی توفیق اس میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ جو شخص اللہ سے توفیق نہیں مانگتا اور اس کے رویے میں طلب صادق پیدا نہیں ہوتی وہ کبھی بھی ہدایت سے نوازا نہیں جاتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿١٧﴾

(جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابئین اور نصاریٰ اور مجوس اور جنہوں نے شرک کیا۔ بے شک اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ١٧)

اسلام کے مخالف گروہ

گزشتہ آیات میں ہم نے محسوس کیا ہے کہ حق و باطل میں ایک کشمکش برپا ہے جس میں اہلِ حق اپنی مساعیِ جلیلہ استقامت اور اخلاص کا پوری طرح ثبوت دے رہے ہیں اور مخالفین برہنہ مخالفت اور بے روک اذیت رسانی پر اتر آئے ہیں۔ تلخیاں عروج پر ہیں۔ مومن سخت امتحان سے گزر رہے ہیں اور کافر مخالفت میں کھولتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں اور جانبین میں جو قوتیں اپنے اپنے راستے پر چل رہی ہیں ان میں ایک طرف صاحبِ ایمان ہیں اور دوسری طرف کافر اور مشرک ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ اگرچہ اس کشمکش کے دو ہی فریق ہیں، مومن اور مشرک۔ لیکن دنیا میں اسلام کے دشمن اور بھی ہیں۔ جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ ان سب کی ہمدردیاں کسی نہ کسی رنگ میں مشرکین کے ساتھ ہیں۔ ان میں یہود تو کھلم کھلا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں بلکہ انہی کے سکھانے پڑھانے پر قریش مختلف سوالات آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی دعوت کے مقابل براہِ راست دو گروہ ہیں اور باقی تین گروہ جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ پس پردہ انہیں سپورٹ کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں مسلمان اور مومن ہیں جو ہر حملہ

Marfat.com

برداشت کررہے ہیں۔اسی لئے اس آیتِ کریمہ میں مشرکین اور یہود کا ذکر تو فعل کی شکل میں ہوا ہے اور صابی، نصاریٰ اور مجوس کا ذکر اسم کی شکل میں ہوا ہے۔اس کی وجہ ظاہر ہے کہ فعل کے اندر ایک قسم کی سرگرمی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔جبکہ اسم بالعموم صرف علامتِ امتیاز کا فائدہ دیا کرتا ہے۔آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کے علاوہ جن مخالف گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ان کی تفصیل اگرچہ سورۃ البقرۃ میں گزر چکی ہے تاہم جہاں تک یہود کا تعلق ہے ان کا نام اور ان کی سرگرمیاں مسلمانوں سے ڈھکی چھپی نہیں۔اسی طرح نصاریٰ یعنی عیسائیوں سے بھی امتِ مسلمہ واقف ہے۔البتہ! صائبین جنہیں عام طور پر صابی کہا جاتا ہے آنحضرت ﷺ کے دور میں ان کے ایک سے زیادہ گروہ پائے جاتے تھے۔ان میں جو گروہ سب سے مشہور تھا وہ بالائی عراق (یعنی الجزیرۃ) کے علاقہ میں اچھی خاصی تعداد میں پایا جاتا تھا۔یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کا پیروکار بتاتے تھے۔ان کے مذہب کی خاص علامت نماز تھی۔یہی وجہ ہے کہ قریش نے جب مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ انہیں صابی کہنے لگے۔

مجوس بھی آنحضرت ﷺ کے زمانے میں پائے جاتے تھے۔وہ آگ کی پوجا کرتے تھے اور تاریکی اور روشنی کے دو خدا مانتے تھے۔اپنے آپ کو زردشت کے پیروکار بتاتے تھے۔ان کا کہنا یہ تھا کہ زردشت پر اللہ کی کتاب نازل ہوئی تھی۔لیکن مرورِ ایام سے وہ مٹ گئی۔اب ان کے پاس چند ہدایات کے سوا کچھ نہ تھا۔وہ اپنے پیغمبر کے حوالے سے یہ بات کہتے تھے کہ ان پر جو کتاب اتری تھی اس میں یہ آیت موجود تھی کہ میں نے دین کو مکمل نہیں کیا میرے بعد ایک نبی آئے گا جس پر دین مکمل کیا جائے گا۔ان کے مذہب اور اخلاق کو مزدک کی گمراہیوں نے بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔حتیٰ کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔

وَالَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا...... سے مراد بالعموم عرب کے رہنے والے اور بالخصوص مکہ کے رہنے والے تھے۔یوں تو جو گروہ یا جو شخص بھی شرک میں مبتلا ہو اس کے لئے یہ تعبیر اختیار کی جاسکتی اور اسے مشرک کہا جاسکتا ہے۔لیکن یہاں دوسرے گروہوں کے مقابلے میں مشرکین کو ایک گروہ کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ شرک صرف گمراہی نہیں انسانیت کے لئے عیب بھی ہے۔اسی وجہ سے باقی گروہ جن کا قرآنِ کریم نے ذکر کیا ہے اگرچہ اپنے اندر شرک کی کئی صورتیں رکھتے تھے۔لیکن وہ مشرک کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔یہ خصوصیت صرف اہلِ عرب کی تھی کہ جس طرح وہ فخر کے ساتھ اپنے اپنے کو امی کہتے تھے اسی طرح مشرک بھی کہلاتے تھے۔

صاحبِ ایمان لوگوں کے مقابلے میں تمام مخالف اور مفسد گروہوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ مشرکین کی طرح چاہے براہِ راست اسلام کی مخالفت کریں یا پس پردہ رہ کر مخالف قوتوں کو سپورٹ (Support) کریں لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ جہاں تک علمی پیرائے میں سمجھانے بجھانے کا تعلق ہے اس میں کوئی کمی باقی نہیں رہی بلکہ اب تو بات اتمامِ حجت تک پہنچ گئی ہے۔اسی طرح اس دعوت کے نتیجے میں انسان کے جس سیرت و کردار کی تعمیر ہوئی ہے اس نے بھی حق و باطل خیر و شر اور صحیح اور غلط کا فیصلہ کر دیا ہے۔بایں ہمہ! مخالفین اپنی مخالفت سے رکتے نظر نہیں آتے اور کسی بھی صحیح بات کو وزن دینے کیلئے تیار نہیں۔اس لئے انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ حق و باطل کی یہ کشمکش یہیں ختم ہونے والی نہیں یہاں اگر مخالفین کے رویے پر اللہ کا عذاب نہ آیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا اس کشمکش کا اصل فیصلہ قیامت کو ہوگا۔آج کے مخالف اور دشمن قیامت کے دن اپنے انجام کو اپنی نظروں سے دیکھیں گے۔اور جن اہلِ حق کو آج وہ حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں وہ ان کے سامنے عزت و افتخار سے نوازے جائیں گے اور آج کی کشمکش کا قیامت کے دن فیصلہ اللہ کیلئے کچھ مشکل نہیں کیونکہ وہ ہر چیز سے واقف اور آگاہ ہے اور اپنے علم کے مطابق دونوں گروہوں میں فیصلہ کرے گا۔

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۱۸

(کیاتم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج چاند ستارے پہاڑ درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان، اور بہت سے ایسے ہیں جن پر اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کر دے ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں۔ اللہ ہی کرتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے۔ ۱۸)

کائنات کی ہر چیز اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے

حق وباطل کی کشمکش میں اصل فریق مخالف مشرکین ہیں۔ ان میں اور مسلمانوں میں اصل بنائے نزاع عقیدۂ توحید ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کی ذات میں کسی نہ کسی کو شریک کرتے ہین۔ لیکن بیشتر مشرکین ایسے ہین جو اللہ کی صفات میں شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور انہیں غلط فہمی یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ذات وہ چاہے کیسی ہی عظیم کیوں نہ ہو ساری کائنات کا نظام چلائے اور مخلوقات کے ایک ایک فرد کی ضرورتوں کو جانے اور انہیں پورا کرے۔ جس طرح دنیا میں ایک ملک کا حکمران تختِ سلطنت پر بیٹھ کر اپنے ماتحتوں کے واسطے سے حکومت کرتا ہے اور میں اپنی حاکمیت کے حق میں درجہ بدرجہ مختلف ماتحت قوتوں کو شامل کر لیتا ہے اور وہ اس کی طرف سے تفویض کردہ فرائض اس کے دیئے ہوئے اختیار سے انجام دیتے ہیں۔ یہی حال اللہ کی سلطنت کا بھی ہے۔ وہ تختِ کبریائی پر فائز ہے۔ لیکن حکومت کے بعض اختیارات اس نے مختلف قوتوں کو سونپ رکھے ہیں۔ اس لئے جب تک ان قوتوں سے استمداد نہ کی جائے اور انہیں خوش کرنے کیلئے بندگی کے آداب بجا نہ لائے جائیں اور ان کے نام پر چڑھاوے نہ چڑھائے جائیں اس وقت تک انسانوں کی ضروریات کا مداوا کیسے ہوسکتا ہے؟ پروردگار ان کی گمراہیوں کے جواب میں نہایت سادہ اور مشاہداتی دلیل پیش کر رہا ہے اور جن وانس کے مشاہدے کو دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرمارہا ہے کہ جس قدر کائناتی قوتیں ہیں ان میں سورج ہے، چاند ہے، ستارے ہیں، پہاڑ ہیں، درخت ہیں اور چارپائے ہیں اور اسی طرح زمین وآسمان کی ایسی مخلوقات بھی ہیں جنہیں ہم کماحقہٗ نہیں جانتے۔ یہ سب اللہ کی عظمت اور اس کی حاکمیت کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اپنے فرائض انجام دینے میں مکمل طور پر اس کے اطاعت گزار ہیں۔ سورج اپنے طلوع وغروب میں، روشنی بکھیرنے میں، اہلِ زمین کو گرمی مہیا کرنے میں، سمندر سے بخارات کو اٹھانے میں اور پھلوں کے پکانے میں کبھی کسی تامل یا سستی کا شکار نہیں ہوا۔ چاند اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کبھی کسی تساہل سے دوچار نہیں ہوا۔ ستاروں نے ٹمٹمانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں کاملِ اطاعت کے ساتھ سرگرداں اور ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ پہاڑ اپنے فرض کی ادائیگی کیلئے استادہ ہیں۔ انہوں نے زمین کی طنابیں کھینچ رکھی ہیں۔ اللہ کے حکم کے مطابق زمین کو متوازن رکھا ہے اس مخفی سرمائے کو محفوظ رکھتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی سعی وکاوش کیلئے چیلنج بنایا ہے۔ درخت اللہ کے تکوینی قانون کے تحت اپنا فرض انجام دے رہے ہیں۔ سایہ دار درخت سایہ دے رہا ہے۔ اور پھل دار پھل مہیا کرتا ہے۔ سوکھ کر انسانوں کی ضرورت کیلئے چولہوں کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اور خدمات جو انسان ان سے طلب کرتا ہے کبھی انکار نہیں کرتے۔ اس طرح سے کائنات کی ایک ایک

Marfat.com

مخلوق چاہے وہ اپنی ذات میں چھوٹی ہے یا بڑی اللہ کے تکوینی نظام میں بندھی ہوئی اور اطاعت کے رشتے سے وابستہ ہے۔

انسانوں نے اپنی کوتاہی فکر سے آفتاب کو حجم اور قوت میں بڑا دیکھ کر ہمیشہ اس کی پوجا کی ہے۔نجانے کس کس کو اس کا دیوتا بنایا ہے اور کیسے کیسے اوتار فرض کیے ہیں اور قوموں کی قومیں اس کی عظمت کے سامنے سجدہ ریز ہوتی رہی ہیں۔لیکن ہر شخص بچشم سر دیکھ سکتا ہے کہ سورج خود اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ وہ شب و روز اپنے رب کے سامنے قیام رکوع اور سجدے میں رہتا ہے۔طلوع کے وقت وہ سجدے سے سر اٹھاتا ہے، دوپہر تک وہ قیام میں رہتا ہے۔زوال کے بعد وہ رکوع میں جھک جاتا ہے اور غروب کے وقت وہ سجدے میں گر جاتا ہے اور رات بھر اسی سجدے کی حالت میں رہتا ہے۔باقی مظاہرِ قدرت بھی اسی طرح اس کے سامنے کبھی قیام کی حالت میں کبھی رکوع کی حالت میں اور کبھی سجدے کی حالت میں بندگی بجالاتے ہیں۔حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ ہر وقت قیام رکوع اور سجود میں رہتا ہے اور پھر اس کی فطرت پر ایسی توحید غالب ہے کہ یہ ہمیشہ آفتاب کی مخالف سمت میں رہتا ہے۔اگر سورج مشرق کی سمت میں ہے تو سایہ مغرب کی جانب پھیلتا ہے اور اگر سورج مغرب کی جانب ہے تو ہر چیز کا سایہ مشرق کی طرف پھیلتا ہے۔وہ اپنے وجود سے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ...... بہت سے لوگ بھی ایسے ہیں جو باقی کائنات کی طرح اللہ ہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔اسی کی غیر مشروط اطاعت کرتے ہیں اسی سے ڈرتے اور اسی سے امیدیں باندھتے ہیں۔ان کی فطرت مظاہر کائنات کی فطرت کی طرح صحیح اور مستقیم ہے۔لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو تمام کائنات کے برعکس توحید کے راستے پر چلنے کی بجائے شرک کے راستے پر چلتے ہیں۔اللہ نے ان کو ایک عظمت دی ہے کہ وہ انسان ہونے کی حیثیت سے اشرف المخلوقات ہی نہیں بلکہ تمام عناصرِ قدرت کے مخدوم ومتبوع ہیں۔تمام عناصرِ قدرت شب و روز ان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ان کا سر اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتا۔لیکن اس کے باوجود وہ غیر اللہ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔متبوع بننے کی بجائے عناصرِ قدرت کی بندگی بجالاتے ہیں۔انہیں اللہ تعالیٰ نے عظیم شرف سے نوازا تھا لیکن انہوں نے اپنی شامتِ اعمال سے اپنے آپ کو ذلت کے گڑھے میں گرالیا۔ذوق نے ٹھیک کہا

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی اپنی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

ایسے شخص نے اللہ کی دی ہوئی کرامت وعزت کو ٹھکرا کر شرک کی ذلت اور اہانت کو قبول کیا۔تو وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے گر گیا۔جیسے ہی عظمتوں اور شرافتوں کے منبع سے اس کا رشتہ ٹوٹا وہ قعرِ مذلت میں اترتا چلا گیا۔اللہ کی ہر مخلوق کی ایک قدر ومنزلت ہے کیونکہ وہ اللہ کی بندگی میں کبھی کسی کو شریک نہیں کرتا لیکن جو شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے جبکہ اسے اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے تو وہ چونکہ خود اپنے آپ کو ہر طرح کی عزت سے محروم کر لیتا ہے اس لئے قرآنِ کریم نے اسے شر البریہ قرار دیا ہے۔اور پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ جس شخص کو اللہ ذلیل کردے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں کیونکہ عزتیں اسی کی بارگاہ سے نصیب ہوتی ہیں اور وہ بارگاہ ایسی غیور ہے کہ وہاں کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں اس بارگاہ کا مالک جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔

هَٰذَانِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ يُصَبُّ

Marfat.com

مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُبِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ
مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۙ وَذُوْقُوْا عَذَابَ
الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾

(یہ دوفریق ہیں جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لئے آگ کے لباس تراشے جائیں گے۔ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔۱۹ اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے سب گل جائے گا اور کھالیں بھی۔۲۰ اور ان کی سرکوبی کیلئے لوہے کے گرز ہوں گے۔۲۱ جب جب وہ اس کے کسی عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کا عذاب۔۲۲)

اسلام کے متحارب گروہوں کا انجام

گزشتہ آیات میں ہم نے حق و باطل کی کشمکش کا جو منظر دیکھا ہے اس میں اگر چہ کرداروں کی تعداد دو سے زیادہ ہے لیکن حقیقت میں دو ہی فریق ہیں جن کے درمیان یہ لڑائی جاری ہے۔ایک طرف اہل حق کا بلند حوصلہ لیکن بے وسیلہ گروہ ہے۔جسے مسلسل اذیتوں اور مصیبتوں کا نشانہ بنایا جارہا ہے اور دوسری طرف مشرکین کا گروہ ہے جنہیں کسی طور توحید گوارہ نہیں۔جو شرک کی حمائت میں آستینیں چڑھائے ہوئے مرنے مارنے پر تلا ہوا ہے۔یہود ہر لحاظ سے ان کی مدد کیلئے سرگرم ہیں نصاریٰ صابی اور مجوس پس پردہ رہ کر مشرکین کیلئے کلمہ تحسین کہتے اور ہر طرح کی اخلاقی مدد مہیا کرتے ہیں کیونکہ ان کا اور مشرکین کا مضمون واحد ہے۔یہ تعداد میں اگر چہ زیادہ ہیں۔لیکن الکفر ملة واحدة کے مصداق ایک ہی بے سایہ شجر کی شاخیں ہیں۔ان کی ہر بات اور ان کا ہر عمل کفر اور شرک کی خدمت کیلئے وقف ہے اور مسلمانوں کی تمام مساعی اور تمام تر استقامت صرف اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے ہے۔اس لحاظ سے یہ تصادم دو گروہوں میں ہے چاہے ان کے نام کچھ بھی ہوں اور ان کی تعداد کتنی ہو۔ہر دور میں یہ نام بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے لیکن ان کی تمام تر کشمکش اور تمام تر لڑائی حق و باطل کے درمیان ہی ہو گی۔آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی اس کا عنوان یہی تھا اور آج جبکہ مسلمان کا خون ارزاں ہو گیا ہے اور ہر جگہ سے دھواں اٹھ رہا ہے تب بھی اس کا عنوان یہی ہے۔اقبال نے ٹھیک کہا تھا ۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی قوتِ اسداللّٰہی وہی مرجبی وہی عنتری

اللہ تعالیٰ مخالف گروہ کو انجام کی آگاہی دینے کیلئے فرمارہا ہے کہ قیامت کے دن انہیں آگ کا لباس پہنایا جائے گا کیونکہ دنیا میں یہ حق کی مخالفت کے جوش میں نفرت غصہ حسد اور انتقام کی جس آگ میں جلتے رہے ہیں ان کیلئے آگ کا لباس ہی مناسب ہے۔اسی طرح ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا جس سے ان کی کھالیں بھی جلیں گی اور ان کے تمام اندرونی احشاء بھسم ہو جائیں گی اور یہی سزا ان کے لئے سزاوار بھی ہے کیونکہ وہ ہمیشہ اسلام دشمنی کی آگ میں کھولتے رہے ہیں۔

جہنم کے جو داروغے ان کی نگرانی کیلئے مسلط کئے جائیں گے ان کے ہاتھوں میں لوہے کے بڑے بڑے گرز ہوں گے جب یہ جہنم کے عذاب سے گھبرا کر کسی دوسری آفت کی پناہ میں جانا چاہیں گے تو وہ انہیں گرز مار مار کر واپس اسی جگہ لوٹا دیں گے۔اور ان سے کہا جائے گا کہ

Marfat.com

اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو جہنم کی آگ سے جلنے کا مزہ چکھو۔ یہی وہ عذاب ہے جس سے دنیا میں تمہیں ڈرایا جاتا تھا۔ لیکن تم نے کبھی بات سننے کی بھی زحمت نہ کی بلکہ جس نے تمہیں نہایت خیر خواہی سے اس انجام سے بچانا چاہا تم نے زندگی بھر اسے چین نہیں لینے دیا۔ تو جس عذاب کی خاطر تم نے یہ رویہ اختیار کیا تو اب تم اس سے بھاگنا کیوں چاہتے ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ
ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ
مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ
لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ
بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾ ع

رکوع: ۳۔ بے شک ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے ندیاں رواں ہیں انہیں وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے اور اس میں ان کا پہناوا ریشم ہوگا۔۲۳) اور ان کی راہنمائی پاکیزہ قول کی طرف کی گئی ہوگی اور خدائے حمید کی راہ کی طرف۔ ۲۴) بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں جسے ہم نے (بلاامتیاز) سب لوگوں کیلئے یکساں بنایا ہے۔ خواہ وہ اس کے شہری ہوں یا آفاقی۔ (تو انہوں نے بہت زیادتی کی ہے) اور جو اس میں کسی بے دینی کسی شرک کے ارتکاب کا ارادہ کرے تو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔ ۲۵)

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ

Marfat.com

الْقَوْلِ ۖ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

(بے شک ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے ندیاں رواں ہیں انہیں وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے اور اس میں ان کا پہناوا ریشم ہوگا۔۲۳ اور ان کی راہنمائی پاکیزہ قول کی طرف کی گئی ہوگی اور خدائے حمید کی راہ کی طرف۔ ۲۴)

اہلِ حق کا انجام

گزشتہ آیات میں ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جنہوں نے حق کو قبول کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنی امکانی حد تک ہر طرح کی مخالفت اور معاندت سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اپنا ذاتی اثر و رسوخ اپنے قبیلے کے وسائل، اپنے ہم خیال لوگوں کی عصبیت ہر چیز کو اس راستے میں جھونک ڈالا۔ اب اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جنہوں نے ایسے بدنصیب اور برہنہ مخالفین کی مخالفت کا سامنا کیا۔ ان کی اذیتوں کو اللہ کے راستے میں آزمائش جانا۔ جسم و جان پر گزرنے والی ہر مصیبت کو نہایت صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا۔ چنانچہ اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ اپنا سب کچھ اللہ کے راستے میں نچھاور کر دیا تو ہم بھی انہیں ان کے ایمان و عمل کے بدلے میں ایسے محلات اور باغات عطا کریں گے جن کے نیچے سے ندیاں بہتی ہوں گی اور انہیں بادشاہوں کی طرح سونے چاندی اور موتیوں کے کنگن اور زیورات پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ریشم سے تیار کیا جائے گا اور آیت میں اس کیلئے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف لباس ہی نہیں ان کے تمام دوسرے لوازم بھی ریشم کے ہوں گے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ اہلِ جنت کو جو لباس پہنایا جائے گا اس سے تو نسوانیت جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور اس کی نعمتیں نادیدہ جہاں کی باتیں ہیں۔ جس کی حقیقت کو جاننا آج ہمارے لئے ممکن نہیں۔ یہ وہ متشابہات ہیں جن پر یقین کرنا لازم ہے لیکن اس کی حقیقت پر اصرار کرنا ذہنی کجی اور روح کا فساد ہے۔ اس سے ہمیں فی الجملہ یہ تصور ملتا ہے کہ جس طرح جنت میں ہر نعمت بے مثال ہوگی اسی طرح اہلِ جنت کو پہنایا جانے والا لباس بھی اپنی خوبصورتی اور بیش قیمت ہونے میں بے نظیر ہوگا۔ البتہ کنگنوں اور ہاروں سے یہ محسوس کرنا کہ اس سے نسوانیت مترشح ہوتی ہے یہ تاریخ سے ناواقفیت اور جمالیاتی ذوق کی کمی کی علامت ہے۔ ہر زمانے میں احساسات بدلتے رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں ثقافتی مظاہر بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ ہماری قریبی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دورِ ملوکیت میں بادشاہ زیورات پہنتے تھے۔ کسریٰ کے کنگنوں سے تو تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ مغلیہ خاندان کے اکثر بادشاہ زیور اور ہار پہنتے تھے اور ہندوستانی ریاستوں کے راجے اور مہاراجے اپنے شاہی لباس کا اسے لازمہ سمجھتے تھے۔

عرب چونکہ مصری اور ایرانی تمدن سے متاثر اور آگاہ تھے اور ان کے ہمسائے میں ریاستوں کے نواب بھی عیش و تنعم کے ان مظاہر کو اپنے ٹھاٹھ باٹھ کا لازمی حصہ گردانتے تھے۔ اس لئے عربوں کو یہ بات بتانے کیلئے کہ تمہیں قیامت میں ایسی زندگی ملنے والی ہے جس میں ایک ایک نعمت بادشاہوں کیلئے قابلِ رشک ہوگی اور وہاں کا زیورات سے آراستہ لباس دنیا کے حکمرانوں کیلئے بجائے خود ندرت کی حیرت انگیز مثال ہوگا۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی حقیقی صورت کیا ہوگی لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی خوبصورتی اور ندرت میں بے نظیر ہی نہیں ہوگا بلکہ ہمارے تصورات سے بھی ماورا ہوگا۔

Marfat.com

وَھُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ بعض اہل علم کے نزدیک قول سے مراد کلمہ طیبہ ہے۔ جو ہمارے ایمان کی بنیاد اور اصلاح کا نسخہ ہے۔ اسی سے زندگی میں تبدیلی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ بیج ہے جس سے شجرہ طیبہ نکلتا اور بار آور ہوتا ہے اور ایک مومن کی زندگی اسی پر استوار ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی قیامت کے دن اس راستے پر چلے گا جس سے اسے اللہ کا قرب حاصل ہوگا اور جنت کا گھر میسر آئے گا۔

ایک رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جن مقبول بندوں کو ایمان وعمل کی دولت سے نوازے گا آخرت میں ان کا انجام یہ ہوگا کہ جب وہ اپنے ایمان وعمل کے سلسلے میں جنت کی بیش بہا نعمتیں پائیں گے تو بے ساختہ ان کی زبان پر پاکیزہ قول یعنی کلمۂ حمد وشکر جاری ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم نے سورۃ الزمر میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ ''وہ کہیں گے تعریف ہے اس اللہ کی جس نے ہم سے اپنے کئے ہوئے وعدے پورے کئے۔'' اور سورۃ الفاطر میں مزید تفصیل سے ارشاد فرمایا: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَکُوْرُ ۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَۃِ مِنْ فَضْلِہٖ ۔ ''اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔ بے شک ہمارا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا اور پذیرائی فرمانے والا ہے۔ جس نے اپنے فضل سے ہمیں قرار کی منزل میں اتارا۔''

وَھُدُوْٓا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ سے مراد اسی دار المقامۃ کی شاہراہ ہے جس کی طرف متذکرہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍ م بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۵﴾

(بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس مسجدِ حرام سے روکتے ہیں جسے ہم نے (بلا امتیاز) سب لوگوں کیلئے یکساں بنایا ہے۔ خواہ وہ اس کے شہری ہوں یا آفاقی۔ (تو انہوں نے بہت زیادتی کی ہے) اور جو اس میں کسی بے دینی کسی شرک کے ارتکاب کا ارادہ کرے تو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔ ۲۵)

آیت کے ترجمے کی آسانی کیلئے صرف ایک بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ ان الذین سے والباد تک مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ جو فقد ظلموا ظلما کثیرا یا اس کے ہم معنی ہو سکتی ہے۔

''عاکف'' ، ''مقیم'' کے معنی میں ہے۔ مراد ہے ''مکہ کا رہنے والا''۔ اور باد کا معنی ''پردیسی یا صحرا سے آنے والا'' ہے۔ مراد اس سے ''آفاقی'' ہے۔ حرم کے باشندوں کیلئے عاکف کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور باہر سے آنے والوں کو الباد کہا جاتا ہے۔

روئے سخن قریش کی طرف اور ان کے جرائم

گزشتہ آیات میں حق وباطل کی کشمکش کے سلسلے میں ہم نے قریشِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان آویزش کا ذکر پڑھا ہے۔ جس میں قریش نے ظلم کے ہر ہتھیار کو مسلمانوں کی تباہی کا ذریعہ بنا رکھا تھا اور مسلمان سرتا پا صبر اور استقامت کی تصویر بنے اس تشویش ناک صورتحال کا سامنا کر رہے تھے۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں قریشِ مکہ کا ایک اور ظلم یا اس کی ایک اور صورت بیان کی جارہی ہے کہ قریش صرف ظلم سے مسلمانوں کی دعوت کو ختم کرنے یا مسلمانوں کو تباہ کرنے ہی کے درپے نہیں تھے بلکہ انہوں نے ظلم کا ایک اور رنگ یہ اختیار کیا تھا کہ وہ مسجدِ حرام

Marfat.com

جسے اللہ نے سب کیلئے یکساں حقوق کے ساتھ بنایا ہے اور جس میں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں اور جس میں آنے والا ہر شخص ہر طرح کے حقوق میں قریش کے برابر رکھا گیا ہے۔ قریش کو یہ حق تو ضرور ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی تولیت کا فرض انجام دیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے وارث کی حیثیت سے بیت اللہ کا متولی سمجھتے ہیں۔ متولی ہونے کی حیثیت سے ان کا یہ فرض ہے کہ آنے والوں کیلئے بیت اللہ میں عبادات کی تمام ممکن صورتوں کو مہیا رکھیں۔ اللہ کے گھر کو ہر طرح کی آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ جو طواف کرنا چاہے طواف کا راستہ اس کیلئے کھلا ہو، جو عمرہ ادا کرنا چاہے عمرے کے افعال کی ادائیگی کیلئے اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور جو حج کرنا چاہے اس کیلئے تمام امکانات ہر وقت موجود رہیں۔ لیکن انہیں اس بات کا حق نہیں دیا گیا کہ وہ بیت اللہ پر اجارہ داری قائم کرلیں بیت اللہ اور حرم کو اپنی ملکیت بنالیں جسے چاہیں اسے یہاں آنے دیں۔ لیکن قریش نے مسلمانوں پر اذیت رسانیوں کے ساتھ ساتھ ایک یہ طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ وہ انہیں صرف اللہ کے راستے یعنی دین قبول کرنے سے ہی نہیں روکتے بلکہ وہ اللہ کے گھر اور حرم کی حدود میں آنے سے بھی مسلمانوں کو روکتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے اس سے یہ بات سمجھی ہے کہ یہ آیات ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہوں گی کیونکہ ہجرت کے بعد مسلمانوں پر بیت اللہ کے راستے بند کیے۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے ہجرت کر جانے کے بعد عمرے کے ارادے سے مکہ معظمہ گئے اور پرانے دوستانہ تعلقات کے پیشِ نظر امیہ بن خلف کے مہمان ٹھہرے وہ صبح انہیں ساتھ لے کر بیت اللہ کا طواف کرانے کیلئے لایا۔ سامنے ابوجہل آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے قریب آکر امیہ سے پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا تم نہیں جانتے یہ سعد ہے تو ابوجہل نے غضبناک ہو کر کہا کہ تم ہمارے بھگوڑوں کو پناہ دیتے ہو اور پھر یہاں عمرے کے ارادے سے آتے ہو۔ واللہ اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ حضرت سعد نے جواب میں فرمایا کہ اگر تم نے مکہ میں ہمارا داخلہ بند کیا تو ہم تم پر وہ چیز بند کر دیں گے جو تم پر اس سے زیادہ سخت ہے۔ یعنی ملکِ شام کی تجارت۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر مسجدِ حرام میں داخلے کی پابندی ہجرت کے بعد لگائی گئی ہے۔ تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ آیات ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ لیکن بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں پر بیت اللہ میں داخلے کی پابندی مکہ ہی میں لگادی گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ بیت اللہ کے صحن میں بالعموم نماز ادا کرتے تھے اور اسی نماز کے دوران سجدے کی حالت میں آپ پر اوجھ ڈالی گئی اور آپ کے گلے میں کپڑا ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح دیگر صحابہ کرام بھی صحنِ حرم میں نماز ادا کرتے تھے۔ البتہ! خانہ کعبہ میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عثمان بن طلحہ کلید بردارِ کعبہ سے آپ نے خانہ کعبہ کے اندر جانے کیلئے چابی طلب کی تو اس نے سختی سے انکار کر دیا لیکن آیتِ کریمہ میں خانہ کعبہ کے اندر جانے پر پابندی کا ذکر نہیں بلکہ مسجدِ حرام کے اندر جانے کی پابندی کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ مسلمانوں پر مسجدِ حرام کے اندر جانے کی پابندی نہیں تھی اگرچہ وہ ظالم مسلمانوں کو مسجدِ حرام سے پکڑ کر اذیتوں کا نشانہ بناتے تھے۔

قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں قریش کے اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے حرم کے رہنے والے اور باہر سے آنے والوں کیلئے یکساں طور پر اللہ کے گھر اور مسجدِ حرام کو عبادت کا مرکز بنایا ہے۔ سب کو یہاں طواف اعتکاف اور نماز کی اجازت ہے۔ لیکن قریش نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حرمِ الٰہی کے ٹھیکہ دار اور اجارہ دار بن بیٹھے ہیں۔ حالانکہ متولی ہونے کی حیثیت سے ان کا کام بیت اللہ کی خدمت بجالانا ہے کسی طرح کا ظلم اور اجارہ داری قائم کرنے کا انہیں کوئی حق نہیں۔ اسی سے اہلِ علم نے یہ بات سمجھی

Marfat.com

ہے کہ مسجدِ حرام پر کسی خاندان یا کسی مخصوص حکومت کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔اس میں عرب وعجم اور شرق وغرب کے مسلمانوں کے حقوق یکساں ہیں۔اسی طرح مسلمانوں پر یکساں طور پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کے گھر کی حفاظت کا انتظام کریں۔اگر خدانخواستہ اس گھر کیلئے کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو تمام عالمِ اسلام کو وہاں اپنی فوجیں بھیجنے کا حق حاصل ہے۔حرم کی حکومت دوسرے علاقے کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر نہیں روک سکتی کہ یہ ہمارا داخلی مسئلہ ہے۔

حرم اور مسجدِ حرام کی انہیں خصوصیات کے باعث فقہاء میں یہ بحث چل نکلی ہے کہ حرم مکہ اور اس کی زمین پر بنے ہوئے مکانات کسی کی ملکیت ہو سکتے ہیں یا نہیں اور کیا کوئی اپنا مکان بیچ سکتا ہے یا نہیں۔اپنے مکان کا کرایہ حاجیوں سے وصول کر سکتا ہے یا نہیں۔جو اہلِ علم حرم کی سرزمین پر بنے ہوئے مکانات کو وقف قرار دیتے ہیں ظاہر ہے وہ ایسی کسی اجازت دینے کے قائل نہیں۔اس پر مولانا مودودی نے ایک تفصیلی نوٹ لکھا ہے،ہم افادۂ عام کیلئے اسے نقل کئے دیتے ہیں۔

یہاں فقہی نقطہ نظر سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں جن کے بارے میں فقہائے اسلام کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔

مسجدِ حرام سے کیا مراد ہے؟

اول یہ کہ مسجدِ حرام سے مراد کیا ہے؟ آیا صرف مسجد یا پورا حرم مکہ؟

دوم یہ کہ اس میں عاکف (رہنے والے) اور باد (باہر سے آنے والے) کے حقوق برابر ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسجد ہے نہ کہ پورا حرم،جیسا کہ قرآن کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔اور اس میں حقوق کے مساوی ہونے سے مراد عبادت کے حق میں مساوات ہے جیسا کہ نبی ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ **یابنی عبد مناف من ولی منکم من امور الناس شیئا فلا یمنعن احدا طاف بھذا البیت او صلی ایۃ ساعۃ شاء من لیل او نھار** ۔''اے اولاد عبد مناف! تم میں سے جو کوئی لوگوں کے معاملات پر کسی اقتدار کا مالک ہو اسے چاہئے کہ کسی شخص کو رات اور دن کے کسی وقت میں بھی خانہ کعبہ کا طواف کرنے یا نماز پڑھنے سے منع نہ کرے''۔اس رائے کے حامی کہتے ہیں کہ مسجدِ حرام سے پورا حرم مراد لینا اور پھر وہاں جملہ حیثیات سے مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر قرار دینا غلط ہے کیونکہ مکہ کے مکانات اور زمینوں پر لوگوں کے حقوقِ ملکیت و وراثت اور حقوق بیع و اجارہ اسلام سے پہلے قائم تھے اور اسلام کے بعد بھی قائم رہے حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صفوان بن امیہ کا مکان مکہ میں جیل کی تعمیر کے لئے چار ہزار درہم میں خریدا گیا۔لہٰذا یہ مساوات صرف عبادت ہی کے معاملہ میں ہے نہ کہ کسی اور چیز میں۔یہ امام شافعی اور ان کے ہم خیال اصحاب کا قول ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مسجدِ حرام سے مراد پورا حرم مکہ ہے۔اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ خود اس آیت میں جس چیز پر مشرکین مکہ کو ملامت کی گئی ہے وہ مسلمانوں کے حج میں مانع ہونا ہے اور ان کے اس فعل کو یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ وہاں سب کے حقوق برابر ہیں۔اب یہ ظاہر ہے کہ حج صرف مسجد ہی میں نہیں ہوتا بلکہ صفا اور مروہ سے لے کر منیٰ،مزدلفہ،عرفات، سب مناسک حج کے مقامات ہیں۔پھر قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر مسجد حرام بول کر پورا حرم مراد لیا گیا

Marfat.com

ہے۔مثلاً فرمایا: والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عنداللہ ''مسجد حرام سے روکنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک ماہِ حرام میں جنگ کرنے سے بڑا گناہ ہے'' البقرۃ آیت ۲۱۷۔ظاہر ہے کہ یہاں مسجد سے نماز پڑھنے والوں کو نکالنا نہیں بلکہ مکہ سے مسلمان باشندوں کو نکالنا مراد ہے۔دوسری جگہ فرمایا: ذلک لمن لم یکن اھلہ حاضری المسجد الحرام ''یہ رعایت اس کیلئے ہے جس کے گھر والے مسجدِ حرام کے رہنے والے نہ ہوں۔البقرۃ آیت ۱۹۶۔یہاں بھی مسجدِ حرام سے مراد پورا حرمِ مکہ ہے نہ کہ محض مسجد۔لہذا مسجدِ حرام میں مساوات کو صرف مسجد میں مساوات تک محدود نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ یہ حرمِ مکہ میں مساوات ہے۔

پھر یہ گروہ کہتا ہے کہ یہ مساوات صرف عبادت اور تعظیم وحرمت ہی میں نہیں ہے بلکہ حرم مکہ میں تمام حقوق کے اعتبار سے ہے۔یہ سرزمین اللہ کی طرف سے وقف عام ہے لہٰذا اس پر اور اس کی عبادت پر کسی کے حقوق ملکیت نہیں ہیں۔ہر شخص ہر جگہ ٹھہر سکتا ہے کوئی کسی کو نہیں روک سکتا اور نہ کسی بیٹھے ہوئے کو اٹھا سکتا ہے۔اس کے ثبوت میں یہ لوگ بکثرت احادیث اور آثار پیش کرتے ہیں۔مثلاً

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مکہ مناخ لانباع رباعھا ولا تؤا جر بیوتھا، ''مکہ مسافروں کے اترنے کی جگہ ہے،نہ اس میں زمینیں بیچی جائیں اور نہ اس کے مکان کرائے پر چڑھائے جائیں''۔

ابراہیم نخعی کی مرسل روایت کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مکہ حرمھا اللہ لا یحل بیع رباعھا ولا اجارۃ بیوتھا۔'' مکہ کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے۔اس کی زمین کو بیچنا اور اس کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا حلال نہیں ہے۔''(واضح رہے کہ ابراہیم نخعی کی مرسلات حدیث مربوع کے حکم میں ہیں کیونکہ ان کا یہ قاعدہ مشہور ومعروف ہے کہ جب وہ مرسل روایت کرتے ہیں تو دراصل عبداللہ بن مسعود کے واسطے سے روایت کرتے ہیں) مجاہد نے بھی تقریباً انہی الفاظ میں ایک روایت نقل کی ہے۔

علقمہ بن نصلہ کی روایت کہ ''رسول اللہ ﷺ در ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مکے کی زمینیں سوائب (افتادہ زمینیں یا شاملات) سمجھی جاتی تھیں۔جس کو ضرورت ہوتی وہ رہتا تھا اور جب ضرورت نہ رہتی دوسرے کو ٹھہرا دیتا تھا۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا تھا کہ حج کے زمانے میں مکے کا کوئی شخص اپنا دروازہ بند نہ کرے بلکہ مجاہد کی روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ مکہ کو اپنے مکانات کے صحن کھلے چھوڑ دینے کا حکم دے رکھا تھا اور وہ ان پر دروازے لگانے سے منع کرتے تھے تاکہ آنے والا جہاں چاہے ٹھہرے۔یہی روایت عطا کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ صرف سہیل بن عمرو کو فاروقِ اعظم نے صحن کے دروازے لگانے کی اجازت دی تھی کیونکہ ان کو تجارتی کاروبار کے سلسلے میں اپنے اونٹ وہاں بند کرنے ہوتے تھے۔

Marfat.com

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول کہ جو شخص مکہ کے مکانات کا کرایہ وصول کرتا ہے وہ اپنا پیٹ آگ سے بھرتا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول کہ اللہ نے پورے حرم کو مسجد بنا دیا ہے جہاں سب کے حقوق برابر ہیں۔ مکہ والوں کو باہر والوں سے کرایہ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کا فرمان امیر مکہ کے نام کہ مکہ کے مکانات پر کرایہ نہ لیا جائے کیونکہ یہ حرام ہے۔
ان روایات کی بنا پر بکثرت تابعین اس طرف گئے ہیں اور فقہا میں سے امام مالک، امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راھویہ کی بھی یہی رائے ہے کہ اراضی مکہ کی بیع اور کم از کم موسم حج میں مکہ کے مکانوں کا کرایہ جائز نہیں۔ البتہ! بیشتر فقہاء نے مکہ کے مکانات پر لوگوں کی ملکیت تسلیم کی ہے اور ان کی بحیثیت عمارت، نہ کہ بحیثیت زمین بیع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

یہی مسلک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور سنت خلفاء راشدین سے قریب تر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے مسلمانوں پر حج اس لئے فرض نہیں کیا ہے کہ یہ اہلِ مکہ کے لئے آمدنی کا ذریعہ بنے اور جو مسلمان احساسِ فرض سے مجبور ہو کر وہاں جائیں، انہیں وہاں کے مالکانِ زمین اور مالکانِ مکانات خوب کرائے وصول کر کر کے لوٹیں۔ وہ ایک وقفِ عام ہے تمام اہلِ ایمان کیلئے۔ اس کی زمین کسی کی ملک نہیں ہے۔ ہر زائر کو حق ہے کہ جہاں جگہ پائے ٹھہر جائے۔

(تفہیم القرآن)

اللہ کے گھر کی عظمت

وَمَنۡ يُّرِدۡ فِيۡهِ بِاِلۡحَادٍۢ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ اس میں پروردگار نے اپنے گھر کی عظمت کو بیان فرمایا ہے۔ یہ گھر اتنا عظیم ہے کہ اس گھر میں کسی طرح کی کج روی اور کسی طرح کے ظلم کی کوئی گنجائش نہیں۔ شریعت نے جن امور کو گناہ قرار دیا ہے۔ ان کا ارتکاب ہر جگہ گناہ ہے۔ لیکن اگر وہی گناہ کے کام حرم کی حدود میں یا مسجدِ حرام میں کیے جائیں تو ایک جرم دو جرموں کی صورت اختیار کر جاتا ہے ایک گناہ کا ارتکاب اور دوسرا مسجدِ حرام کی حرمت کو پامال کرنا۔ یہ دونوں جرم مل کر اس گناہ کے کرنے والے کو عذابِ الیم کا مستحق قرار دے دیتے ہیں۔
اس گھر کی عظمت کا عالم یہ ہے کہ وہاں کے قدرتی درختوں کا کاٹا نہیں جاسکتا وہاں کی خودرو گھاس اکھاڑی نہیں جاسکتی وہاں کے پرندوں اور دوسرے جانوروں کا شکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ شکار کی غرض سے انہیں باہر بھگایا جاسکتا ہے۔ صرف موذی جانور مارے جاسکتے ہیں۔ وہاں کی کوئی گری پڑی چیز بھی اٹھانا ممنوع ہے۔ اس سے بڑھ کر عظمت اور کیا ہوگی کہ کوئی شخص احرام باندھے بغیر حرم کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بجز ان لوگوں کے جو بار بار اپنی ڈیوٹی انجام دینے کیلئے آنے پر مجبور ہیں۔
اللہ کے گھر کی عظمت کے سامنے اللہ نے اپنے بندوں کو اس طرح بے بس بنایا ہے کہ اگر کسی کے باپ کا قاتل بھی حدودِ حرم میں پناہ لے لے تو اس کے گریبان پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا جب تک وہ خود حدودِ حرم سے باہر نہ نکلے اسے سزا نہیں دی جاسکتی۔
مسلمانوں کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ کبھی بھی حرم میں جنگ نہیں کر سکتے۔ ابتدائے آفرینش سے اللہ نے اسے اپنی حرمت سے حرام

Marfat.com

ٹھہرایا ہے۔کوئی شخص جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے یہ حلال نہیں کہ یہاں خون بہائے۔آنحضرت ﷺ کیلئے ایک ساعت کی حد تک اس گھر کو حلال کیا گیا تھا۔پھر اس کی حرمت بحال کردی گئی جو قیامت تک قائم رہے گی۔

ایک صورت یہ ہے کہ یہاں ظلم الحاد سے بدل واقع ہوا ہے اور قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پر ظلم کو شرک کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں الحاد سے مراد شرک ہے اور اس کے گناہِ عظیم ہونے بلکہ بغاوت قرار دیئے جانے میں کوئی شبہ نہیں۔جو شخص یا جو قوم اللہ کے گھر میں شرک کی اجازت دے گی یا اس کو فروغ دے گی جس طرح قریش نے اللہ کے گھر کو توحید کا مرکز بنانے کی بجائے بت پرستی کا مرکز بنادیا تھا اور تین سو ساٹھ بت لاکر صحنِ کعبہ میں نصب کردیئے گئے تھے۔یہ ایک ایسا الحاد اور کج روی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے عذابِ الیم کی خبر دی ہے۔اس میں ایک طرح سے قریش کو وارننگ دی گئی ہے کہ تم اپنے کرتوتوں کے باعث اب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کئے جاؤ گے اور دوسری طرف مسلمانوں کی غیرت کو انگیخت کیا گیا ہے کہ قریشِ مکہ نے چونکہ اللہ کے گھر کی عظمت کو پامال کردیا ہے اور ان مقاصد کو تباہ کرکے رکھ دیا گیا ہے جن کیلئے بیت اللہ کو بنایا گیا تھا اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم بیت اللہ کی اصل حیثیت اور عظمت کو بحال کرو۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيمَ مَكَانَ
الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَ
الْقَآئِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿٢٦﴾ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ
رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾
لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ أَيَّامٍ مَّعْلُومٰتٍ
عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا
الْبَآئِسَ الْفَقِيرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ
وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلٰى
عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ

Marfat.com

الزُّوْرِ ﴿٣٠﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ
فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ
مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿٣١﴾ ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ
تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿٣٢﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ
مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٣٣﴾

رکوع: ۴۔ اور یاد کرو جبکہ ہم نے ابراہیم کیلئے ٹھکانا بنایا بیت اللہ کی جگہ کو اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں قیام کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کیلئے پاک رکھنا۔ ۲۶) اور لوگوں میں حج کا اعلان کرو وہ تمہارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی۔ جو آئیں گی دور دراز گہرے پہاڑی راستوں سے۔ ۲۷) تاکہ لوگ اپنے فائدہ کی جگہوں پر پہنچیں اور نام لیں اللہ کا چند جانے پہچانے دنوں میں ان جانوروں پر جو اللہ نے انہیں بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ ۲۸) پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت عتیق کا طواف کریں۔ ۲۹) ان امور کو یاد رکھو! اور جو شخص اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے رب کے نزدیک اس کے لئے بہتر ہے۔ اور تمہارے لئے چوپائے حلال ٹھہرائے گئے ہیں بجز ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنا دیئے گئے ہیں۔ تو بتوں کی گندگی سے پرہیز کرو اور جھوٹی بات سے بچو۔ ۳۰) اللہ ہی کی طرف یکسو رہو۔ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔ ۳۱) حقیقت یہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا احترام کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔ ۳۲) تمہارے لئے مویشیوں میں طرح طرح کے فوائد ہیں ایک معین مدت تک، پھر ان کے قربان کرنے کا مقام بیت عتیق کے پاس ہے۔ ۳۳)

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ
وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿٢٦﴾

(اور یاد کرو جبکہ ہم نے ابراہیم کیلئے ٹھکانا بنایا بیت اللہ کی جگہ کو اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں قیام کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کیلئے پاک رکھنا۔ ۲۶)

Marfat.com

حضرت ابراہیم اور بیت اللہ کی تاریخ

اس آیتِ کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیت اللہ کی تاریخ کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ اس آیت میں غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کا مسکن بنایا تھا اور اس میں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کے اصل مقاصد کیا تھے؟

بوأنا کا مصدر "تبویه" ہے۔ اس کے معنی "ٹکانے ٹھہرانے، آباد کرنے اور بسانے" کے ہیں۔ لیکن تفسیر مظہری کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس کا معنی "مقرر کرنا" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی تعمیر کیلئے خود اس جگہ کا تعین فرمایا تھا اور اسی مقصد کیلئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا اسے مسکن بنایا تھا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ بَوَّأنَا کا معنی "ٹھکانا دینا" ہے۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بیت اللہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا ٹھکانا دیا۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام پہلے سے اس علاقے کے رہنے والے نہ تھے۔ آپ کی رہائش ملکِ شام میں تھی۔ لیکن بیت اللہ کا نشان پہلے سے یہاں موجود تھا چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کی خبر دی گئی اور یہاں ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا تا کہ آپ اس گھر کو از سرِ نو تعمیر کریں جو دنیا کی نگاہوں سے مستور ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بیت اللہ کو سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ طوفانِ نوح کی تباہی میں اسے اٹھالیا گیا۔ لیکن اس کی بنیادیں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان بنیادوں کی خبر دی گئی جنہیں ریت کے ایک ٹیلے نے چھپا رکھا تھا۔ آپ نے کھدائی کر کے ان بنیادوں کو نکالا اور پھر اس پر اللہ کے گھر کی تعمیر کی اور آپ خود اس گھر کے متولی مقرر ہوئے اور اس گھر کو پوری دنیا کی ہدایت کیلئے مرکزِ توحید بنایا گیا۔ لیکن یہ نہایت شرم کی بات ہے کہ اتنی بڑی حقیقت کو یہود نے چھپانے کیلئے اپنی کتاب میں تحریف کر ڈالی۔ مکہ کا نام بدلا گیا۔ صفا اور مروہ کے تلفظ تبدیل کئے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری تاریخ بدل ڈالی گئی اور اپنے تئیں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ذبیح اللہ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام نہیں بلکہ حضرتِ اسحاق علیہ السلام ہیں۔ ان کی قربانی ملکِ شام میں ہوئی تھی منیٰ یعنی مکہ معظمہ کے دامن میں نہیں ہوئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے اہلِ علم پیدا کئے جنہوں نے یہود کی تحریفات کا پردہ چاک کیا اور تورات ہی سے ثابت کیا کہ یہود کے دجل و تلبیس کا یہ کاروبار اپنی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

تعمیر بیت اللہ کے مقاصد

دوسری بات جو اس آیتِ کریمہ میں کہی گئی ہے وہ ان مقاصد کا تعین ہے جن کیلئے بیت اللہ کی تعمیر کی گئی تھی۔ ان میں پہلا مقصد یہ تھا کہ یہ گھر اللہ کی عبادت کا ایسا مرکز ہونا چاہیے جس میں کسی طرح کے شرک کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس میں آنے والے اللہ ہی کے سامنے قیام کریں، اسی کے سامنے رکوع کریں، اسی کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور اسی سے لو لگانے کیلئے اعتکاف کریں۔ ایسی نماز جس میں قیام، رکوع اور سجود صرف اللہ کیلئے ہو اور بیت اللہ کا ایسا طواف اور ایسی زیارت جس میں صرف اللہ کی یاد ہی کیلئے اعتکاف کیا جائے۔ یہ ایسی عبادات ہیں جس کے نتیجے میں شرک کی ہر آلودگی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ لیکن قریش نے جو اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی کا حامل اور حضرت خلیل اللہ کی دینی وراثت کا وارث کہتے ہیں، اس گھر کے مقاصد کو ایسا پامال کیا ہے کہ وہ گھر جو کبھی توحید کا مرکز تھا، اسے تین سو پینسٹھ بتوں کی آماجگاہ بنا کر بتکدہ کی صورت دے دی۔ ان بتوں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، بتوں کو سجدے کئے جاتے ہیں، ان سے مرادیں مانگی جاتی ہیں، انہیں اللہ کی صفات

Marfat.com

میں شریک سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح سے بیت اللہ توحید کا مرکز نہیں ایک تیرتھ بن کر رہ گیا ہے حالانکہ ان کا اصل کام یہ تھا کہ وہ بیت اللہ میں آنے والوں کیلئے جہاں صفائی ستھرائی کا کام کرتے، ہر طرح کی گندگی سے اسے صاف ستھرا رکھتے، وہاں کا ماحول اتنا معطر رکھتے کہ لوگ جب تک یہاں ٹھہرتے انہیں ماحول کا تکدر کبھی پریشان نہ کرتا۔ وہیں یہ بھی ان کیلئے ضروری تھا کہ یہاں شرک کی آلودگی پیدا ہونے نہ دیتے۔ لیکن انہوں نے ہر وہ کام کیا جس سے اس گھر کی پاکیزگی پر حرف آیا اور اس گھر کی تعمیر کے مقاصد کو نقصان پہنچا۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾

(اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو وہ تمہارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی۔ جو آئیں گی دور دراز گہرے پہاڑی راستوں سے۔ ۲۷)

مشکل الفاظ کا معنی۔ رجال راجل کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں پیادہ چلنے والے۔

ضامر اس اونٹ یا اونٹنی یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو طول سفر کی وجہ سے لاغر ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

فج "پہاڑوں کے درمیانی راستہ" کو کہتے ہیں۔ "درے" پر بھی بولا جاتا ہے۔ "عمیق" اس کی صفت ہے۔ پہاڑی راستے چونکہ تنگ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ کثرت آمد و رفت کے باعث گہرے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہاں "عمیق" "گہرے" کے معنی میں لایا گیا ہے۔ "عمیق" کا دوسرا معنی "دور" بھی ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر کی زیارت کرنے والے دور دراز پہاڑی راستوں سے آئیں گے۔

حضرت ابراہیم کو منادی کا حکم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کے حوالے سے یہ دوسری ہدایت دی گئی ہے۔ بیت اللہ کی تعمیر جب مکمل ہو گئی تو پھر حکم ہوا کہ لوگوں میں اس کی منادی کر دو کہ وہ اس گھر کی زیارت اور طواف کیلئے آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حیرت کی تصویر بن کر کہا کہ پروردگار! ان پہاڑوں میں میری آواز کون سنے گا؟ یہاں تو دور دور تک کوئی آبادی نہیں؟ پروردگار نے فرمایا کہ تمہارا کام منادی کرنا ہے لوگوں تک اسے پہنچانا یہ ہمارا کام ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابو قبیس پہاڑ پر چڑھ کر اعلان کیا کہ لوگو! اللہ کا گھر تعمیر ہو چکا اب تمہیں اس کے حج، عمرہ اور طواف کرنے کیلئے آنا چاہئے، میں تمہیں اس کی دعوت دیتا ہوں۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز ساری دنیا میں پہنچا دی اور صرف اس وقت کے زندہ انسانوں تک ہی نہیں بلکہ جو انسان آئندہ قیامت تک پیدا ہونے والے تھے بطور معجزہ ان سب تک یہ آواز پہنچا دی گئی اور جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے حج کرنا لکھ دیا ہے ان میں سے ہر ایک نے اس آواز کے جواب میں "لبیک اللھم لبیک" کہا۔ یعنی حاضر ہونے کا اقرار کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حج کے تلبیہ کی اصل بنیاد یہی ندائے ابراہیمی کا جواب ہے۔ (قرطبی و مظہری)

اس آیت کریمہ میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو اس گھر کے حج کیلئے بلائیں وہ ہر تنگ و تاریک اور دور دراز گوشے سے پہاڑی دروں اور پامال راستوں سے گزرتے ہوئے آئیں گے۔ ان کی منزل کی دوری ان کی سواریوں کو لاغر کر دے گی۔ لیکن ان کے حوصلوں کو شکست

Marfat.com

نہیں دے سکے گی۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ ہمیشہ اسی طرح لاغر سواریوں پر اور تنگ راستوں سے گزر کر آئیں گے بلکہ اس میں تصور یہ دینا ہے کہ مکہ کی سرزمین میں بظاہر کوئی ایسی کشش نہیں کہ لوگ کشاں کشاں یہاں پہنچیں۔نہ وہاں ایسی کوئی سیر گاہیں ہیں اور نہ قدرتی مناظر جن کی خاطر لوگ کھنچے چلے آئیں۔سبزے سے تہی دامن سیاہ رنگ کے پہاڑ اللہ کے نہایت سادہ سے گھر کو گھیرے کھڑے ہیں اور وہ سیاہ قبا پہنے ناز و نیاز کی تصویر بنے لوگوں کی آرزوؤں کا مرکز بنا ہوا ہے۔اس کے موسم اور اس کی فضا میں بھی ایسی کوئی اپیل نہیں کہ لوگ وہاں پہنچنے کیلئے طبیعت میں امنگ اٹھتی ہوئی محسوس کریں۔لیکن اس کے باوجود اس گھر میں اللہ نے کوئی ایسی کشش ایسی اپنائیت اور ایسی دلوں کو کھینچ لینے والی کیفیت رکھی ہے کہ بظاہر اسباب وہاں دلچسپی کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔لیکن اس کے باوجود دل ہیں کہ کھنچے چلے جارہے ہیں۔نگاہیں ہیں کہ اس کے دیدار سے سیر ہونے میں نہیں آتیں۔جو ایک دفعہ جاتا ہے وہ بار بار جانے کی کوشش کرتا ہے۔یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو اس وقت بھی موجود تھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا اعلان کیا تھا اور آج جبکہ مادہ پرستی اور اتباع ہوائے انسان کی ترجیحات اور اذواق بدل ڈالے ہیں۔لیکن اللہ کے گھر کی کشش اور اس کے بلاوے میں کوئی کمی نہیں آئی۔لوگوں کی وارفتگی وہی ہے وہاں حاضر ہونیوالے عشاق روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔مکہ کا دامن اپنی تمام وسعتوں سمیت اس گھر کے عشاق کو سمیٹنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔لیکن لوگوں کے جذبہ شوق میں کوئی کمی نہیں آتی۔ریاض خیر آبادی نے ٹھیک ہی کہا تھا ۔

کوئی بات تو ہے آخر مے کدے میں ضرور
جو دور دور سے مے خوار آ کے پیتے ہیں

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾

(تا کہ لوگ اپنے فائدہ کی جگہوں پر پہنچیں اور نام لیں اللہ کا چند جانے پہچانے دنوں میں ان جانوروں پر جو اللہ نے انہیں بخشے ہیں۔پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ ۲۸)

حج کی دنیوی برکات

اس آیتِ کریمہ میں حج کے لئے بیت اللہ میں حاضری کو لوگوں کیلئے نفع آور قرار دیا ہے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حج میں ان کی حاضری مکہ معظمہ میں انہیں ایسی جگہوں پر پہنچا دیتی تھی جہاں ان کیلئے فائدے رکھے گئے ہیں۔یہ فوائد دو طرح کے ہیں۔ایک تو دینی اور روحانی فائدے ہیں جو وہاں جانے والے کو نصیب ہوتے ہیں۔اللہ کے گھر کا طواف ایک ایسی نعمت ہے جو اس جگہ کے علاوہ کہیں میسر نہیں آسکتی۔وہاں کی نمازیں ایک لاکھ گنا اجر و ثواب رکھتی ہیں۔وہاں کی ہر نیکی اور ہر عمل اپنے اندر خیر و برکت کا ایک وسیع خزانہ رکھتا ہے اور مزید یہ بات بھی کہ جب ایک شخص اللہ کے گھر کے سامنے ملتزم سے چمٹ کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اس کی روح کی تمام آلودگیاں دھل جاتی ہیں۔اس کے نفس کی چوریاں خود بخود زباں تک آتی اور بخشش طلب کرتی ہیں۔دل و دماغ ایسے سرمدی کیف سے لذت اندوز ہوتے ہیں جس سے فکری ژولیدگی بھی ختم ہوتی ہے اور فکری نارسائی کو بھی اپنا محمل مل جاتا ہے۔انسان اس طرح دھلا ہوا وہاں

Marfat.com

سے نکلتا ہے جس طرح کپڑا بھٹی سے صاف ہو کر باہر آتا ہے۔ بیت اللہ میں حاضری سے اصل مقصود انہیں فوائد اور برکات کا حصول ہے۔
اسلام میں چونکہ رہبانیت نہیں وہ اسلام کو کسی خاص دائرے میں محدود نہیں کرتا۔ اس کی دنیوی ضرورتیں بھی اسلامی طریقے سے پوری ہوتی ہیں اور اس کی اخروی ضرورتیں بھی دنیا کے صحیح استعمال سے وابستہ ہیں۔ اس لئے اس نے حج کے مناسک سے فارغ ہو کر اکتساب مال کے جائز ذرائع کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔
اسلام سے پہلے اللہ کے گھر کی حاضری عربوں کے لئے دنیوی خیر و برکت کی کلید بن گئی تھی۔ پورا جزیرۂ عرب نفرتوں کا جہنم بن چکا تھا۔ اشہر حرم کے علاوہ کسی اور مہینے میں تجارتی قافلوں کا آنا جانا آسان نہ تھا۔ یہ حرمت والے مہینے ذیقعد، ذی الحج اور محرم تو مسلسل تھے لیکن ایک ان سے ہٹا ہوا ''رجب'' کا مہینہ بھی ان میں شامل تھا۔ چنانچہ عرب رجب میں عمرے کیلئے نکلتے تھے اور باقی تین حرمت والے مہینوں میں وہ حج کی غرض سے سفر کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے تجارتی قافلے بھی انہیں مہینوں میں آتے جاتے تھے اور کوئی ان کیلئے روک نہ تھی اور جب وہ حج یا عمرے کیلئے مکہ معظمہ آتے تھے تو ان کے ساتھ تجارت کا بھی وسیع سامان ہوتا تھا۔ چنانچہ ایامِ حج سے پہلے اور ان کے بعد بھی مالِ تجارت سے بازار سج جاتے تھے۔ پورے عرب سے مختلف قسم کا مال مکہ کے بازاروں میں پہنچتا تھا اور مکہ کی مصنوعات حج سے واپس جانے والوں کے ذریعے ہر قبیلے اور ہر بستی میں پہنچ جاتی تھیں اس طرح اللہ تعالیٰ نے عربوں کی گزر بسر کا ایک محفوظ ذریعہ پیدا کر دیا تھا اور مکہ والوں کیلئے بھی سال بھر کی ضروریات کا سامان ہو جاتا تھا اور یہ سب کچھ چونکہ بیت اللہ کے طفیل انہیں مل رہا تھا۔ اس لئے فرمایا کہ عربوں کو چاہیے کہ وہ مکہ معظمہ میں پہنچ کر اپنی نفع والی جگہوں کو دیکھیں۔

حج کی مخفی برکات

علاوہ ازیں کچھ اور بھی فوائد ایسے ہیں جو اہلِ نظر کو نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حج کے سفر میں ایک بڑی رقم خرچ آتی ہے اور کم آمدنی والے لوگ عمر بھر تھوڑی تھوڑی بچا کر جمع کرتے رہتے ہیں۔ تب حج کا سر و سامان کرتے ہیں۔ لیکن یہ آج تک کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی شخص جس نے حج اور عمرہ کیلئے عمر بھر کی پونجی صرف کر ڈالی ہو اور وہ اس وجہ سے محتاج ہو گیا ہو اور اسے فقر و فاقہ نے آگھیرا ہو جبکہ اتنی بڑی رقم کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرنے کے باعث بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور بعض دفعہ فاقوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے بلکہ اس کے برعکس یہ دیکھا گیا ہے کہ جو شخص عمرہ یا حج کر کے آتا ہے اگر اس نے واقعی یہ سب کچھ اخلاص کے ساتھ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں اضافہ فرما دیتا ہے۔

جانوروں کی قربانی اظہارِ شکر ہے

مزید فرمایا گیا ہے کہ حج پر جانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں جانوروں کی شکل میں نعمت عطا فرمائی ہے، اس کا شکر ادا کرو۔ جس طرح دل و دماغ کی رعنائیوں کا شکر ایمان سے ادا ہوتا ہے اور اعضاء و جوارح کی توانائیوں کا شکر نماز سے ادا ہوتا ہے، اور جسم کی داخلی نعمتوں کا شکر روزے سے ادا ہوتا ہے اور مال و دولت کی فراوانی کا شکر زکوٰۃ کی صورت میں ادا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو چارپائے اور مویشی انسانوں کو عطا فرمائے ہیں ان کا شکر یہ ہے کہ انہیں اللہ کے راستے میں قربان کیا جائے۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال آئے کہ جو لوگ جانوروں کے ریوڑ پالتے ہیں یا ان کا کاروبار ان سے متعلق ہے یا پہلے زمانے میں انسانوں کی گزر بسر کا یہ بہت بڑا

Marfat.com

ذریعہ تھا ان کیلئے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن آج کا انسان جو صنعتی دور میں داخل ہو چکا ہے یا انتظامیہ کا کل پرزہ بن کر زندگی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اس کا جانوروں سے کیا تعلق؟ لیکن یہ محض قلتِ فکر کا نتیجہ ہے جس طرح جانور پالنے والے کا جانور سے تعلق ہے اسی طرح اس کے خریدنے والوں، گوشت کھانے والوں اور ان کے متعلقات سے فائدہ اٹھانے والوں کا بھی ایک تعلق ہے۔ اسی لئے سب کو حکم دیا گیا کہ حج کے متعین دنوں میں اللہ کے عطا کئے ہوئے جانوروں پر اس کا شکرادا کریں۔ متعین یا جانے پہچانے دنوں سے مراد، دس، گیارہ، بارہ ذوالحج کے تین دن ہیں اور ان پر شکرادا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جانور اللہ نے عطا کئے ہیں تو اسی کے نام پر اور اسی کی رضا کیلئے انہیں ذبح کرنا چاہئے۔

ہر حیوان کی جان انسانوں کی جان کی طرح اللہ کی بیش بہا نعمت ہے۔ اسے کسی اور کے نام پر کسی بھی جانور سے چھینا نہیں جاسکتا کیونکہ اس پر سراسر اللہ کا حق ثابت ہے۔ اس لئے اللہ کی ذات نے اس پر قفل لگا دیا ہے اور اس کی چابی اپنے نام کو ٹھہرایا ہے۔ جب بھی اس کے نام سے یہ تالا کھولا جائے گا تو اس جانور کا گوشت کھانا حلال بھی ہوگا اور اظہارِ شکر کی ایک صورت بھی، اور اگر کسی اور کے نام پر اس کو ذبح کیا جائے گا تو یہ اللہ کے حق کو چیلنج کرنے کے مترادف ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جانور حرام ہو جائے گا۔

مشرکین کی غلط فہمی کا ازالہ

مشرکین کا خیال یہ تھا کہ اللہ کے نام پر جو قربانی دی جاتی ہے، اس کا گوشت قربانی دینے والے کیلئے حرام ہے۔ اس قربانی کا گوشت اس کا خون اللہ کے سامنے پیش کیا جانا چاہئے چنانچہ وہ اپنی قربانیوں کا گوشت بیت اللہ کے دروازے کے سامنے ڈھیر کر دیتے اور جانور کا خون بیت اللہ کی دیواروں پر اچھالتے۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے جانوروں کے گوشت اور خون کا خواہش مند نہیں وہ تو صرف تمہارے دلوں کے تقویٰ اور اخلاص کو دیکھتا ہے اس لئے تمہیں اجازت ہے کہ تم اپنی قربانی کا جانور خود بھی کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔

آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے جانور میں تین حصے کئے جاسکتے ہیں ایک اہلِ خانہ کا دوسرا اعزہ و احباب کا اور تیسرا غریبوں اور حاجت مندوں کا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قربانی کرنے والے کیلئے قربانی کے جانور کا گوشت کھانا ممنوع نہیں بلکہ پسندیدہ ہے۔ البتہ! قربانی کی ایک قسم وہ ہے جو کسی جرم کی سزا کے طور پر کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی نے حرم شریف کے اندر شکار مار دیا تو اس پر اس کی جزا میں کسی جانور کی قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جو کام احرام کی حالت میں ممنوع ہیں اگر کسی نے ان میں سے کوئی کام کرلیا تو اس پر بھی جانور ذبح کرنا لازم ہو جاتا ہے جس کو فقہا کی اصطلاح میں دمِ جنایت کہا جاتا ہے۔ ایسی قربانی کا گوشت کھانا قربانی دینے والے کیلئے جائز نہیں۔ یہ صرف فقرا اور مساکین کا حق ہے۔ کسی مالدار کو کھلایا نہیں جاسکتا۔

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٢٩﴾

(پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت عتیق کا طواف کریں۔ ۲۹)

تفث کے معنی ''میل کچیل'' کے ہیں۔ اور قضی کا معنی ہے اَزَالَ یعنی ''میل کچیل دور کرنا''۔

حج کے آخری مناسک

آٹھ ذوالحج کو منیٰ میں پانچ نمازوں کی ادائیگی اور شب بسری، نو ذوالحج کو عرفات کا وقوف اور پھر مزدلفہ میں رات کا قیام اور دس تاریخ

Marfat.com

کو قربانی دینے کے بعد حج کے مناسک ادا کرنے والے کو احرام کھولنے کی اجازت مل جاتی ہے۔گزشتہ دو دنوں کی بھاگ دوڑ اور مناسکِ حج کی ادائیگی کی مصروفیت میں احرام کی چادریں گندی ہو جاتی ہیں، جسم پر میل جم جاتا ہے، بال گرد آلود ہو جاتے ہیں۔مناسکِ حج کی ادائیگی کے دوران تو ضروری تھا کہ حاجی دیوانہ صفت ہر طرح کے تکلفات سے دوران تمام جگہوں میں اللہ کی یاد اور حج کے احکام کی ادائیگی میں اس طرح مصروف رہتا کہ اسے بندگی کے سوا کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ ہوتا۔لیکن اب جبکہ حج کے اکثر مناسک ادا ہو گئے اور قربانی بھی دے دی گئی تو اب مناسب ہے کہ وہ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور عام معمول کی زندگی اختیار کرے۔لیکن اس کے طرزِ عمل سے اب بھی یہ اظہار ہونا چاہئے کہ اس کی دیوانگی بھی اللہ کیلئے ہے اور اس کی فرزانگی بھی اللہ کی خاطر ہے۔پہلے اس کی خستہ حالی اور پراگندہ بالی اللہ کو پسند تھی اب اس کا صاف ستھرا لباس اور نہایا دھویا جسم اللہ کو مطلوب ہے۔اب معمول کا لباس پہن کر اسے بیت عتیق کے طواف کیلئے نکلنا چاہئے اور اس طواف سے مراد طوافِ زیارت ہے جو حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔

افعالِ حج کی جو ترتیب قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے، امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک تو اس کی پابندی واجب ہے اور اس کے خلاف کرنے والے پر ایک دَمِ جنایت لازم آتا ہے۔البتہ! امام شافعی کے نزدیک سنت ہے۔البتہ! ان کے نزدیک بھی اس کے خلاف کرنے سے ثواب میں کمی ہوتی ہے مگر دَم لازم نہیں ہوتا۔حضرت عبد اللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ **من قدم شیئا من نسکه او اخره فلیهرق دماً رواه ابن شیبة موقوفاً وهو حکم المرفوع** (مظھری) ''جس شخص نے افعالِ حج میں سے کسی کو مقدم یا مؤخر کر دیا اس پر لازم ہے کہ ایک دَم دے۔''

نذر کا مفہوم

وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ ''اور وہ اپنی نذریں پوری کریں''۔نذور، نذر کی جمع ہے۔جس کو اردو میں ''منت'' کہا جاتا ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو کام شرع میں کسی شخص پر واجب نہیں تھا وہ اگر زبان سے یہ نذر کر لے اور منت مان لے کہ میں یہ کام کروں گا تو یہ ''نذر'' ہو جاتی ہے اور اگر ایسا کام کرنا شرعاً گناہ نہ ہو تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر وہ کام گناہ ہو تو پھر اس کا پورا کرنا نہ صرف یہ کہ جائز نہیں بلکہ اس کے خلاف کرنا ضروری ہے۔البتہ! اس صورت میں چونکہ نذر ٹوٹ جائے گی تو اس کا کفارہ دینا لازم ہوگا۔

یہ بھی یاد رہے کہ صرف دل میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرنے سے نذر نہیں ہوتی۔جب تک زبان سے الفاظ ادا نہ کئے جائیں۔حضرت عبد اللہ ابنِ عباس نے تو اس نذر سے قربانی ہی مراد لی ہے۔لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے عام نذریں مراد ہیں۔بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ایامِ حج عام ایام کی نسبت زیادہ بابرکت اور زیادہ تقویٰ کے حامل ہیں اور اس میں اعمالِ خیر کے اجر و ثواب کا تناسب بہت بڑھ جاتا ہے۔تو وہ احرام سے فارغ ہو کر بعض مزید نیکیوں کیلئے نذر مان لیتے ہیں۔تو ایسی نذروں کا پورا کیا جانا ضروری ہے۔

وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ.....وہ بیت عتیق کا طواف کریں۔اس سے طوافِ زیارت مراد ہے۔یہ چونکہ ارکانِ حج میں سے آخری رکن ہے۔اس کی ادائیگی کے بعد احرام کی پابندیاں مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہیں۔قربانی کے بعد حاجی احرام کھول دیتا ہے اور وہ ہر جائز کام کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے لیکن اپنی بیوی سے مباشرت نہیں کر سکتا۔اس کی اجازت طوافِ زیارت کے بعد ہوتی ہے۔اس طواف کے بعد حج مکمل ہو جاتا ہے۔اب صرف جمرات پر رمی کرنی ہے اور پھر روانگی سے پہلے طوافِ وداع کرنا ہے۔

Marfat.com

بیتِ عتیق

آیت میں "بیت عتیق" کہا گیا ہے۔اس کا ایک معنی ہے "قدیم"۔اس معنی کے حوالے سے اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی تمام عبادت گاہوں میں یہ سب سے پرانی عبادت گاہ اور پرانا معبد ہے کیونکہ دنیا میں اللہ کا دوسرا گھر بیت المقدس یا مسجدِ اقصیٰ کے نام سے معروف ہے اور سب اہلِ علم جانتے ہیں کہ وہ اس گھر کی تعمیر سے صدیوں بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔بقول حالی ؎

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل سے مشیت نے تھا جس کو تاکا
کہ اُبلے کا یاں سے وہ چشمہ ھدیٰ کا

"عتیق" کا دوسرا معنی "آزاد" ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کا گھر ایسا ہے جس پر کبھی دشمنانِ خدا غالب نہیں آسکیں گے۔ بیت المقدس بھی اللہ کا گھر ہے،لیکن وہاں کی تاریخ نے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں۔کتنی دفعہ وہ گھر مکمل طور پر تباہ کیا گیا ہے اور ہیکلِ سلیمانی جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔بختِ نصر کی تباہی کے بعد اگرچہ اسے ازسرِنو بنایا گیا تھا،لیکن دوسری تباہی کے بعد جو رومیوں کے ہاتھوں ہوئی پھر دوبارہ تعمیر نہ ہوسکا۔لیکن اللہ کا یہ گھر (اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھے) آج تک کبھی دشمنوں کے ہاتھوں مسمار نہیں ہوا۔جب کبھی اسے گرایا گیا تو دوبارہ بنانے کیلئے گرایا گیا اور جب ایک دفعہ ابرہہ نے بہت بڑی قوت ساتھ لے کر اسے مٹا دینے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے ذریعے اسے مٹا دیا۔اب اگرچہ حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے گھر کی ہمیشہ حفاظت کرے گا۔

ذٰلِکَ ۗ وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰہِ فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ ؕ وَاُحِلَّتْ لَکُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰہِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ ؕ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُہُ الطَّیْرُ اَوْ تَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ ﴿۳۱﴾

(ان امور کو یاد رکھو!اور جو شخص اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے رب کے نزدیک اس کے لئے بہتر ہے۔اور تمہارے لئے چوپائے حلال ٹھہرائے گئے ہیں بجز ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنا دیئے گئے ہیں۔تو بتوں کی گندگی سے پرہیز کرو اور جھوٹی بات سے بچو۔ ۳۰) اللہ ہی کی طرف یکسو رہو۔کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔ ۳۱)

ذلک اس کی متعدد تراکیب کی گئی ہیں۔لیکن ان میں سب سے آسان اور واضح یہ ہے کہ یہ فعل محذوف کا مفعول ہے۔تقدیرِ کلام

Marfat.com

یوں ہوگی۔ احفظ ذلک، وذلک اشارة الی ما سبق من الاحکام (مظھری)

حج اور مناسکِ حج اور بیت اللہ کے سلسلے میں ابراہیم علیہ السلام کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ یہاں ختم ہوگئیں۔اس لئے انہیں اچھی طرح سمجھ لو اور محفوظ کرلو۔اب اس کے بعد جو ہدایات دی جارہی ہیں یہ ان لوگوں کیلئے ہیں جو اپنے آپ کو بیت اللہ کا متولی سمجھتے ہیں لیکن اس امانت کی ذمہ داریوں سے بالکل غافل ہیں۔

تمام حرماتِ الٰہی کے احترام کی ہدایت

پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کو حرمت عطا فرمائی ہے۔جن کا احترام اور جن کی حیثیت کا اہتمام ضروری ہے۔ان میں حرم ہے، مسجدِ حرام ہے، اشھرِ حرم ہیں۔ھدی اور قلائد وغیرہ ہیں۔ان تمام چیزوں کی حرمت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واسطے سے انسانوں کو سکھائی گئی تھی۔لیکن آج جو لوگ بیت اللہ کی تولیت پر مسلط ہیں اور اپنے آپ کو تمام اہلِ عرب کیلئے رہنما سمجھتے ہیں انہوں نے ان تمام چیزوں کی حرمت پامال کر کے رکھ دی ہے۔حرم اور مسجدِ حرام پر تمام انسانوں کا یکساں حق رکھا گیا تھا لیکن انہوں نے غاصبانہ قبضہ جما کر اپنا یہ حق سمجھ لیا ہے ہم جسے چاہیں یہاں آنے دیں اور جسے چاہیں روک دیں۔یہ سراسر ظلم ہے۔اسی طرح اشھرِ حرم میں (نسی کا قاعدہ ایجاد کر کے ان کی حیثیت ختم کر کے رکھ دی ہے۔اللہ نے انہیں قمری مہینوں میں شمار کیا تھا انہوں نے انہیں شمسی مہینوں میں شامل کر دیا ہے۔ان مہینوں سے لوگوں کی دینی مصلحتیں وابستہ تھیں۔انہوں نے ان مہینوں کو تجارت سے وابستہ کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنالیا ہے۔یہی حال باقی حرمات کا بھی ہے۔اس لیے یہاں حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کیلئے بہتر یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کریں اور انہیں اپنے مفادات کا وسیلہ نہ بنائیں۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قریش اور اہلِ عرب کیلئے تمام چوپایوں کو حلال کیا تھا۔لیکن قریش نے اپنی خانہ ساز شریعت میں اپنے بتوں کے تعلق سے بہت سے جانوروں کو حرام کر رکھا ہے۔سورۃ الانعام کی آیات ۱۳۶ سے ۱۵۳ تک آیات میں اس کی تفصیل موجود ہے۔تحریم و تحلیل کے حوالے سے سورۃ الانعام میں ان کی دراز دستیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ تم نے اپنے بتوں کے تعلق کے حوالے سے شرک کی جو گندگیاں اپنے اوپر لاد رکھی ہیں انتہائی ضروری ہے کہ انہیں اتار پھینکو اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان سے اجتناب کرو اور مزید فرمایا کہ تمہاری جسارتوں کا عالم یہ ہے کہ تم اپنے طور پر تحریم و تحلیل کا کاروبار کرتے ہو لیکن اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہو۔یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جو سب جھوٹوں سے زیادہ شنیع اور قابلِ نفرت ہے۔اس سے توبہ کرو۔

جس طرح شرک نے تمہارے اعتقادات بگاڑے ہیں اسی طرح اللہ کی حرمتوں کو بھی تم نے شرک کے حوالے سے پامال کیا ہے۔جب تک تم شرک کی ان زنجیروں کو نہیں توڑو گے اور ہر طرف سے کٹ کر اللہ کے ایک آستانے کے ہو کر نہیں رہ جاؤ گے، اس وقت تک تمہاری زندگیوں میں اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔اللہ کی توحید ایک ماءِ صافی ہے جس میں شرک کی آلودگی قابلِ برداشت نہیں۔اپنے اعتقادات کی درستی اور زندگی کو صحیح رخ پر ڈالنے کیلئے ضروری ہے کہ تم کامل یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑو، نہ اس کی ذات میں کسی کو شریک بناؤ، نہ اس کی صفات میں۔جس طرح اس کی ذات واجب الوجود ہے اسی طرح اس کی صفات قدیم اور ذاتی ہیں۔باقی جہاں کہیں بھی کوئی خوبی یا کمال ہے کسی کا اپنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا فرمایا ہوا ہے۔وجود، علم، اختیار، سمع و بصر غرضیکہ جو کچھ اور جتنا کچھ کسی کے پاس ہے وہ بخششِ خداوندی ہے۔جب اس کے سوا ہر چیز اپنی تمام صفاتِ کمال حتیٰ کہ اپنے وجود میں بھی اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے تو وہ اس کی شریک کیسے

Marfat.com

ہوسکتی ہے؟

اس قدر واضح حقائق کے بعد بھی اگر کوئی بد بخت اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، تو وہ اپنے لئے تباہی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے نیچے پھینک دیا جائے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کے بچنے کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ! یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی شیطان کے ہتھے چڑھ جائے۔ وہ ایک بے لنگر کا جہاز ہے جو ہر چٹان سے ٹکرا سکتا ہے اور کٹا ہوا پتنگ ہے جس کو ہوا جہاں چاہے اڑا لے جاسکتی ہے۔ توحید زمین پر بسنے والی انسان نام کی حقیر سی مخلوق کو رفعتوں کے آسمان پر بٹھا دیتی ہے۔ ہر طرح کی سرافرازی اس کے گھر کی لونڈی بن جاتی ہے۔ لیکن جب وہ شرک کرتا ہے تو وہ آسمان کی بلندیوں سے گر جاتا ہے پھر یا تو راستے ہی میں شیطان اس کو اچک لیتے ہیں اور یا وہ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر کر اس قدر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے کہ ہوا اسے کسی بھی دور جگہ لے جا کر پھینک سکتی ہے۔

ذٰلِکَ ۗ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾

(حقیقت یہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا احترام کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔ ۳۲)

شعائر کا مفہوم اوران کے احترام کی شرط

شعائر ...... شعیرۃ بروزن فعیلۃ کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے وہ علامت جس سے کسی چیز کی پہچان ہوسکے۔ امام ابن جریر لفظ شعائر کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' وشعائر التی جعلھا امارات بین الحق والباطل '' '' یعنی جن چیزوں سے حق اور باطل کی شناخت ہوسکے ان کو شعائر اللہ کہتے ہیں''۔ قرآنِ کریم نے صفا و مروہ کو شعائر اللہ قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں پہاڑیاں حضرتِ ہاجرہ کی داستانِ ایثار کی علامت ہیں۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان اور ان کے گردوپیش میں ملتِ ابراہیمی کے حقائق پھیلے ہوئے ہیں۔ یہیں تربیت کی وہ تاریخ بھی ہے جس نے حضرتِ اسماعیل کو آدابِ فرزندی سے بہرہ ور کیا۔ یہیں مقامِ ابراہیم بھی ہے، یہیں بیت اللہ اور حرم میں پھیلے ہوئے اور آثار ہیں یہ سب اللہ کے شعائر ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اسلام کے حقائق کی شناخت وابستہ ہے۔ ان سب کا احترام اس لئے ضروری ہے کہ جن عظیم حقائق کی یہ علامتیں ہیں انہیں ان کی وجہ سے جلا ملتی ہے۔ البتہ! اس احترام کے حوالے سے ایک بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ کہ چونکہ ان شعائر کا تعلق اسلام کے بنیادی حقائق سے ہے اس لئے ان کا احترام صرف الفاظ کی حد تک وہ نتائج پیدا نہیں کرتا جو اس سے مطلوب ہیں۔ اس لئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ شعائر اللہ کا احترام دل و دماغ کی ہم آہنگی سے بجالایا جائے۔ ان کی صحیح تعظیم کا حق اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب ان کا احترام دل سے اٹھے اور اس کے نتیجے میں وہ حقیقت دل میں اتر جائے جس کی انہیں شناخت بنایا گیا ہے۔

لَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ مَحِلُّھَاۤ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴿۳۳﴾

(تمہارے لئے مویشیوں میں طرح طرح کے فوائد ہیں ایک معین مدت تک، پھر ان کے قربان کرنے کا مقام بیت عتیق کے پاس ہے۔ ۳۳)

Marfat.com

ھدی سے متعلق ضروری ہدایات

گزشتہ سے پیوستہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مویشیوں کا بطورِ نعمت ذکر فرمایا ہے جن کا عطا فرمانے والا صرف اللہ ہے۔ انسان اپنی ضروریات کے مطابق ان کا گوشت بھی کھاتا ہے، دودھ بھی پیتا ہے اور ان کی اون اور کھال سے نفع بھی اٹھاتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، وہ اس لئے عطا فرمائی ہیں تاکہ انسان ان سے نفع اٹھائے اور پھر ان پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوا کہ نعمتیں تو فائدہ اٹھانے کیلئے ہی عطا کی گئی ہیں۔ ان ہی میں مویشی اور چوپائے بھی ہیں۔ لیکن یہی مویشی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ھدی بنائے کا حکم دیا ہے اور اپنی رضا کی خاطر قربان کرنے کا ارشاد فرمایا ہے۔ تو کیا جب کوئی جانور ھدی کے طور پر اللہ کے گھر کی طرف لے جایا جا رہا ہو تو کیا اس سے بھی باقی مویشیوں کی طرح فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں؟ مثلاً اس سے بار برداری کا کام لیا جاسکتا ہے؟ اس پر سواری کی جاسکتی ہے؟ اگر وہ دودھ دینے والا جانور ہے تو کیا اس کا دودھ دوہا جاسکتا ہے؟ اور کیا اس سے اون حاصل کیا جاسکتا ہے؟ کیونکہ جب کسی جانور کو ھدی بنا دیا جاتا ہے تو وہ شعائر اللہ میں شامل ہو جاتا ہے، جس کا احترام کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ تو کیا اس سے خدمت لینا احترام کے منافی نہیں ہوگا؟ اس میں اہلِ علم کی دو رائے ہوگئیں۔ حضرت ابنِ عباس، قتادہ، مجاہد، ضحاک اور عطا خراسانی رحمۃ اللہ علیہم کی رائے یہ ہے کہ "الی اجل مسمیً" سے مراد یہ ہے کہ جب تک کسی جانور کو قربانی کیلئے نامزد نہ کر دیا جائے اور ھدی سے موسوم نہ کر دیا جائے اس وقت تک اس سے فوائد اٹھانے کی اجازت ہے۔ لیکن جب اسے ھدی بنا دیا جائے تو پھر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ لیکن دوسرے مفسرین جن میں عروہ بن زبیر اور عطا بن ابی رباح شامل ہیں ان کے نزدیک وقتِ مقررہ سے مراد قربانی کا وقت ہے۔ یعنی جب تک جانور کے ذبح کیے جانے کا وقت نہ آئے اس وقت تک جانور سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ان دونوں آراء کے بین بین ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک کسی جانور کو ھدی کیلئے نامزد نہیں کیا جاتا اس وقت تک تو اس سے کام لینے میں کسی کو اختلاف ہی نہیں لیکن جب کسی جانور کو ھدی سے موسوم کر دیا جاتا ہے اب اس میں خصوصی احترام کا ایک سبب پیدا ہو جاتا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے ذاتی منفعت بالکل نہ لی جائے۔ البتہ! بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ سفر میں اس سے فائدہ حاصل کرنے کی مجبوری پیدا ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں وہ فائدہ حاصل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے جو احادیث آئی ہیں وہ اسے ضرورت پر ہی محمول کرتے ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اونٹ کی مہار تھامے پیدل چلا جا رہا ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔ آپ نے فرمایا: اس پر سوار ہو جا۔ اس نے عرض کیا کہ یہ ھدی کا جانور ہے۔ آپ نے زور دے کر فرمایا ارے! سوار ہو جا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے سفر کی ضرورت تقاضا کرتی ہے کہ تجھے اس پر سوار ہو جانا چاہئے۔ ایسی صورت میں اس سے سواری کی خدمت لینے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

"محلھا": کا معنی ہے۔ منحرھا یعنی "اس کے ذبح کرنے کی جگہ"۔

"الی البیت العتیق" کائنٌ کے متعلق ہوکر محلھا کا حال ہے۔ یعنی جو جانور حج کے موقعہ پر ھدی کے طور پر اپنے ساتھ لے جایا جاتا ہے اس کے ذبح کرنے کی جگہ "بیت العتیق" ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قربانی کعبہ میں یا مسجدِ حرام میں کی جائے۔ لیکن ہم نے قرآن کریم میں دیکھا ہے کہ کعبہ یا بیت اللہ یا مسجدِ حرام بول کر بالعموم حرم مکہ مراد لیا جاتا ہے۔ یہاں بھی بیت العتیق سے مراد "حرم" ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ھدی کے جانور کی قربانی حرم شریف میں لے جا کر کی جائے گی۔ منیٰ بھی چونکہ حرم ہی کا ایک حصہ ہے

Marfat.com

اس لئے اب انتظامی سہولت کے تحت تمام قربانیاں منیٰ میں کی جاتی ہیں۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا
اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ
وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ
وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي
الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم
مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ ۖ
فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ
كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٣٦﴾ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا
وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ
لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّ اللَّهَ
يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿٣٨﴾ ع

رکوع: ۵۔ (اور ہم نے ہر امت کیلئے قربانی مقرر کی ہے تا کہ اللہ نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں ان پر وہ اللہ کا نام لیں۔ پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ تو اسی کے آگے سر جھکاؤ۔ اور اے پیغمبر! بشارت دے دیجئے عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو۔ ۳۴) جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور ان کو جو مصیبت پہنچتی ہے اس پر صبر کرنے والے ہیں۔ اور نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۳۵) اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ٹھہرایا ہے۔ تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے۔ پس ان پر اللہ کا نام لو ان کو صف بستہ کر کے۔ پس جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور کھلاؤ قناعت کرنے والے فقیر کو اور سوال کرنے والے کو۔ اسی طرح ہم نے فرمانبردار بنادیا ہے ان جانوروں کو تمہارے لئے تا کہ تم شکر ادا کرو۔ ۳۶) ہرگز نہیں پہنچتے اللہ کو ان کے گوشت اور

Marfat.com

نہ ان کے خون، البتہ! اسے تمہارا التقویٰ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تا کہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی، اس کی ہدایت بخشی پر۔ اور خوب کاروں کو خوشخبری سنا دیجئے۔ ۳۷) بے شک اللہ مدافعت کرے گا ان لوگوں کی جو ایمان لائے۔ اللہ ہرگز بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔ ۳۸)

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ الْاَنْعَامِ ۗ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصّٰبِرِينَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾

(اور ہم نے ہر امت کیلئے قربانی مقرر کی ہے تا کہ اللہ نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں ان پر وہ اللہ کا نام لیں۔ پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ تو اسی کے آگے سر جھکاؤ۔ اور اے پیغمبر! بشارت دے دیجئے عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو۔ ۳۴) جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور ان کو جو مصیبت پہنچتی ہے اس پر صبر کرنے والے ہیں۔ اور نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۳۵)

قربانی کی قدامت اس کی اہمیت کی دلیل ہے

قربانی کا ذکر اگرچہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے لیکن پیش نظر آیتِ کریمہ میں یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ قربانی کا حکم صرف اس آخری امت کو نہیں دیا جا رہا بلکہ یہ ایک ایسا حکم ہے جس سے ہر امت گراں بار رہی ہے۔ یعنی اصلاحِ عقائد اور فکری سلامتی کیلئے باقی احکام کے ساتھ ساتھ قربانی بھی نہایت مؤثر عامل کے طور پر پہلی امتوں کی شریعتوں میں بھی موجود رہی ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تورات میں بھی اور قرآنِ کریم میں بھی حضرتِ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی قربانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ قربانی کا حکم ہر امت کو دیا گیا ہے۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ اللہ نے انہیں جو چوپائے بخشے ہیں ان پر اظہارِ شکر کیلئے ضروری ہے کہ اللہ ہی کے نام پر انہیں ذبح کیا جائے۔ اگر ان کو ذبح کرتے ہوئے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا یا اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے انہیں منسوب کر دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چوپایوں کا پیدا کرنے والا اور انسانوں کو عطا کرنے والا صرف اللہ نہیں بلکہ اور بھی شرکاء اس کے ساتھ شامل ہیں۔ جبکہ ہر وہ شخص جس کے دماغ میں عقل ہے کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتا کہ مخلوقات کی تخلیق میں اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں قربانی کیلئے ''منسک'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ نسک کا معنی مجاہد نے یہ کیا ہے ''الذبح و اراقة الدم'' یعنی ''ذبح کرنا اور خون بہانا''۔ جب کوئی شخص ذبح کرتا ہے تو کہا جاتا ہے ''نَسَكَ يَنْسُكُ نَسْكاً'' اور جو جانور ذبح کیا جائے اس کو نسیکہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع ''نُسُک'' ہے۔ اس حکم کی عمومیت کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف حج پر دی جانے

Marfat.com

والی قربانی نہیں بلکہ تمام وہ قربانیاں اس میں شامل ہیں، جو پوری امت میں دی جاتی ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کے دس سالہ قیام میں ہر سال قربانی دی۔ ازواجِ مطہرات بقدرِ ہمت قربانی دیتی رہیں۔ صحابہ کرام کو نہ صرف قربانی دینے کا حکم دیا گیا بلکہ اس کے مسائل بھی بیان کیے گئے اور یہ بھی بتایا گیا کہ قربانی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ جس نے پہلے قربانی دے دی اس کی قربانی ادا نہیں ہوئی اور چودہ صدیوں میں اس حکم کی تعمیل میں کبھی انقطاع نہیں ہوا۔ یہ حکم امت میں تعامل کے طور پر زندہ رہا۔

تیسری چیز اس آیتِ کریمہ میں یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ جس طرح تمہارا خالق ایک ہے اور تمہارے جانوروں کا خالق ایک ہے اسی طرح تمہارا اللہ بھی ایک ہے۔ اس کے سوا نہ کسی کو تحلیل و تحریم کا حق ہے اور نہ اس کی عطا کردہ نعمتوں میں کوئی اور دخیل ہو سکتا ہے۔ جس طرح نماز صرف اسی کی پڑھی جا سکتی ہے اور روزہ صرف اسی کا رکھا جا سکتا ہے اسی طرح قربانی بھی صرف اسی کی دی جا سکتی ہے۔ اس میں بھی کسی دوسرے کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ پس پوری یکسوئی آمادگی اور خوش دلی کے ساتھ اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو کیونکہ ہر عبادت کی اصل روح سب کچھ اللہ کے حوالے کر دینا اور قربان کر دینا ہے۔ جو شخص اپنا سب کچھ اللہ پر قربان کر دیتا ہے اور وہ اللہ کی بندگی کی خاطر ہر چیز سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کا حقیقی تعلق اللہ کے ساتھ قائم ہوتا ہے چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ..... ''اور مخبتین کو بشارت دے دو''۔ پست اور نشیبی زمین کو عربی زبان میں ''الخبت'' کہتے ہیں۔ اسی سے ''اخبات'' ہے۔ جس کا معنی ''فروتنی، تذلل اور تواضع کا اظہار'' ہے۔ اسلام کی اصل روح اخبات ہی ہے یعنی اسلام کی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ ایک مسلم کا دل اپنے رب کے سامنے اس طرح جھک جائے کہ جس میں سوائے عاجزی اور فروتنی کے اور کچھ نہ ہو۔ اس عاجزی اور فروتنی سے جو صفات جنم لیتی ہیں، قرآنِ کریم نے نہایت فصاحت و بلاغت سے ان کا ذکر فرما دیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ ایسی عاجزی والے وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور اس کی کتاب کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں۔ یہ تصور ہی ان کے کپکپا دینے کیلئے کافی ہے کہ یہ اس ذات کا کلام اور اس کے احکام ہیں جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ جس کے ایک حکم سے ہر چیز میں زندگی پیدا ہوتی اور اس کے ایک حکم سے موت طاری ہو سکتی ہے۔ وہ چاہے تو سمندر پایاب ہو جائیں اور اس کے ایک اشارے سے سورج بے نور ہو جائے، اور اس کے راستے پر چلنے والے اس اخلاص سے اس کے دین کی سربلندی کیلئے کام کرتے ہیں کہ بڑی سے بڑی رکاوٹ اور بڑے سے بڑا حادثہ ان کے حوصلوں کو شکست نہیں دے سکتا۔ ہر آنے والی مصیبت کا وہ صبر سے سامنا کرتے اور نہایت ہمت سے اسے برداشت کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جس نے سب کچھ عطا کیا ہے اسے یقیناً یہ استحقاق حاصل ہے کہ سب کچھ اس کی خوشنودی کیلئے جھونک دیا جائے۔ وہ اسی کی یاد اور اسی سے کیے ہوئے عہد کے ایفا کیلئے ہمیشہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ جس طرح صبر سے مصائب کا سامنا کرتے ہیں اسی طرح وہ ہر طرح کے حالات میں اللہ ہی سے مدد کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ان کا قیام اور ان کا رکوع و سجود اسی کی ذات کیلئے وقف ہوتا ہے اور زندگی کی نعمتوں میں جو کچھ انہیں ملتا ہے وہ اسے اللہ کی امانت سمجھتے ہیں اور اسی کے راستے میں انہیں خرچ کر دینے کو امانت کی ادائیگی سمجھتے ہیں۔ اللہ کے سامنے ایسا عجز جس میں ہر چیز پر اس کی مہر لگ جائے اور اس کے ساتھ ایسا مضبوط تعلق جو نماز کی تصویر بن جائے اور اس کے دین کی سربلندی کیلئے ایسی تگ و دو کہ صبر اس کا ہتھیار بن جائے اور مال و دولت کا ایسا انفاق جو قربانی کا عنوان بن جائے یہی درحقیقت قربانی کی حقیقی روح اور اس کی مشروعیت کا حقیقی مقصد ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا

Marfat.com

صَوَآفَّ ۚ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٣٦﴾

(اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ٹھہرایا ہے۔ تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے۔ پس ان پر اللہ کا نام لو ان کو صف بستہ کر کے۔ پس جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور کھلاؤ قناعت کرنے والے فقیر کو اور سوال کرنے والے کو۔ اسی طرح ہم نے فرمانبردار بنادیا ہے ان جانوروں کو تمہارے لئے تاکہ تم شکر ادا کرو۔ ۳۶)

بُدن کی تحقیق

بُدْنٌ اور بُدُنٌ بُدْنَةٌ کی جمع ہے۔ جس طرح "ثُمْرٌ اور ثُمُرٌ" ثَمَرَةٌ کی جمع ہے۔ یہ لفظ اونٹوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بعض اہلِ لغت کا خیال ہے کہ بــدانة سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی ہے "موٹا تازہ ہونا"۔ نیز علما کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس کا اطلاق صرف اونٹ پر ہوتا ہے یا گائے پر بھی ہوتا ہے۔ امامِ شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا مصداق صرف اونٹ ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اونٹ اور گائے دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ امام صاحب کے نزدیک ان دونوں کی قربانی سات آدمیوں کی طرف سے جائز ہے اور آپ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے جسے مسلم نے بھی روایت کیا ہے اور ترمذی نے بھی، استدلال کرتے ہیں۔ البتہ! پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں چونکہ اونٹوں کے ذبح کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اس لئے یہاں بُدن سے مراد صرف اونٹ ہیں۔

اونٹوں کی قربانی کے بطورِ خاص ذکر کا سبب

اوپر آیت نمبر ۲۸ میں ان تمام چوپایوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی قربانی مشروع ہے۔ اس کے بعد اونٹوں کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ اونٹ بھی بھیمة الانعام میں شامل ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اونٹوں کی قربانی کا بطورِ خاص ذکر شاید اس لئے فرمایا گیا ہے کیونکہ یہود نے اس کے خلاف خاصہ پراپیگنڈہ کیا تھا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی کا وارث کہتے ہیں جبکہ ملتِ ابراہیمی میں اونٹ کا گوشت حلال نہیں بلکہ تمام انبیائے بنی اسرائیل نے اونٹ کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں یہود کے اس الزام کا جواب دیا گیا ہے اور یہود سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو حرام قرار دیا تھا ان کے پاس اس کی کوئی سند ہو تو پیش کریں۔

قربانی کا ایک اصول

اونٹ کی قربانی کے حوالے سے قرآنِ کریم نے ایک اصول کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اصول یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک اُس جانور کی قربانی سب سے زیادہ پسندیدہ قرار دی گئی ہے اور اُس چیز کا انفاق سب سے زیادہ قابلِ ترجیح ٹھہرایا گیا ہے جو قربانی دینے والے کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو۔ اس اصول کے تحت اونٹ کی قربانی سب سے زیادہ اللہ کے ہاں تقرب کا ذریعہ ہے کیونکہ اونٹ ایک ایسا جانور ہے

Marfat.com

جس میں عربوں کیلئے بھلائی کے متعدد پہلو ہیں۔ اہلِ عرب کے تجارتی قافلے صحرا سے گزر کر دوسرے ملکوں میں پہنچتے ہیں اور بعض دفعہ صحرا میں پانی تک نصیب نہیں ہوتا۔ اونٹ واحد جانور ہے جو کئی دنوں تک بھوک اور پیاس برداشت کرسکتا ہے۔ پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے وفا کا مادہ اس قدر رکھا ہے کہ اپنی جسامت اور قوت کے باوجود سفر کی صعوبتیں اٹھاتا ہے لیکن مالک سے بغاوت نہیں کرتا۔ وہ نہ صرف ہر طرح کی بار برداری کی تکلیف برداشت کرتا ہے بلکہ ایفا کا یہ پیکر اپنے مالک کی اطاعت سے کبھی سر نہیں ہلاتا۔ اپنے جسمانی ڈیل ڈول اور طاقت کے باوجود خاموشی سے اپنے ذبح کرنے والے کو دیکھتا رہتا ہے۔ اس کا گھٹنا باندھ دیا جاتا ہے، اٹھنے اور بھاگنے کا نام نہیں لیتا، نہایت اطاعت کے ساتھ جان دے دیتا ہے۔ پھر اس کے گوشت، پوست اور بالوں سے عرب کس قدر فائدہ اٹھاتے ہیں یہ عام جانی پہچانی بات ہے۔ ایسا منفعت بخش جانور جو اہلِ عرب کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور ان کی تجارتی سرگرمیوں کا بیشتر انحصار اسی پر ہے۔ اللہ کی خوشنودی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے محبوب جانور کو اس کے نام پر قربان کیا جائے۔

اونٹ کو ذبح کرنے کا طریقہ

حکم دیا گیا ہے کہ تم ان اونٹوں پر اللہ کا نام لو یعنی اللہ کے نام سے ان کو ذبح کرو اور پھر اس کا طریقہ سکھایا گیا ہے کہ ان کو قبلہ رو صف بستہ کھڑا کر کے ان کو ذبح یا نحر کرو۔ عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اونٹ کا اگلا بایاں گھٹنا باندھ دیتے تھے اور پھر زور سے اس کے حلقوم میں نیزہ مارا جاتا تھا۔ جس سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑتا اور خون نچڑ جانے کے بعد اونٹ اپنے پہلو پر گر جاتا اور جب ٹھنڈا اور ساکت ہو جاتا تو تب اس کی کھال اتاری جاتی اور گوشت کاٹا جاتا۔ یہ صف بستہ کھڑا کرنا نماز میں قیام کے مشابہ ہے اور ان کا پہلو پر گرنا یہ اللہ کے حضور ان کا سجدہ ہے۔ اس طرح سے ان کی قربانی اللہ کی بندگی اور اس کے سامنے عاجزی کی سب سے مکمل تصویر ہے۔

بعض اہلِ لغت کا خیال ہے جس میں "صاحب قاموس" نمایاں ہیں۔ صوآف اس اونٹ کو کہتے ہیں، جس کا بایاں ہاتھ باندھ دیا جائے اور وہ اپنے دونوں پاؤں اور دائیں ہاتھ کے سہارے کھڑا ہو۔ نبی کریم ﷺ نے ذبح کرنے کا یہی طریقہ ارشاد فرمایا ہے۔ اس طرح اس کے حلقوم میں نیزہ مارا جاتا ہے اور اس سے خون کا فوارہ بہہ نکلتا ہے۔ آنحضرت ﷺ جب کسی بھی جانور کو ذبح فرماتے تھے تو یہ کلمات پڑھا کرتے تھے:

انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض علی ملة ابراهیم حنیفا وما انا من المشرکین۔ ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین، لا شریک له وبذلک امرت وانا من المسلمین۔ اللهم منک ولک بسم الله الله اکبر اور بعض احادیث میں صرف اتنے الفاظ ہیں۔ بسم الله الله اکبر اللهم منک ولک

یہود کا خیال یہ تھا کہ قربانی کا گوشت کھانا قربانی دینے والے کیلئے جائز نہیں۔ اس لئے بطور خاص یہاں فرمایا گیا کہ تم اپنی قربانیوں کا گوشت کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ ان میں ترجیح کے لائق یہ لوگ ہیں جن کے لئے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔

القانع.... اس فقیر کو کہتے ہیں جو گھر میں بیٹھا رہے اور کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرے۔ یعنی ایک ایسا ضرورت مند جو سفید پوش اور خوددار ہو۔ اور

Marfat.com

المعتر اس فقیر کو کہتے ہیں جو ضرورت مند ہو لیکن ضرورت سے مجبور ہو کر سوال بھی کرے۔

اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قربانی کے جانور کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کرنا سنت ہے۔

ا:۔غریبوں کیلئے ۲:۔ اعزہ واحباب کیلئے ۳:۔اپنے لئے

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اونٹ ہو یا باقی جانوران کو ہم نے اپنی حفاظت کیلئے سینگ بھی دے رکھے ہیں یا بعض دوسری مدافعت کی چیزیں بھی اوران میں توانائی اور ہمت بھی ہے، جس سے وہ بھاگ کر اپنی جان بچا سکتے ہیں۔لیکن یہ اللہ کا کرم اوراس کی شان ہے کہ وہ انسان کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اور اللہ کے نام پر قربان ہو جاتے ہیں اور انسان کی منفعت کیلئے اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔اللہ کے ایسے احسانات کا کیا یہ تقاضا نہیں ہونا چاہئے کہ انسان اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کے سامنے قربانیاں پیش کرے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

(ہرگز نہیں پہنچتے اللہ کو ان کے گوشت اور نہ ان کے خون، البتہ!اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی ،اس کی ہدایت بخشی پر۔اور خوب کاروں کو خوشخبری سنا دیجئے۔۳۷)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیتِ کریمہ میں کفار کے ایک غلط عمل کی تردید کی گئی ہے جو سراسر ایک غلط فہمی پر مبنی تھا۔ان کا خیال یہ تھا کہ ہم جب قربانیاں دیتے ہیں تو ان قربانیوں کا خون اور ان کا گوشت اللہ کے حضور پیش کرنا ضروری ہے اور اسی کے نتیجے میں ہماری قربانی قبول ہوتی اور اس کا اجرو ثواب ملتا ہے۔چنانچہ جب وہ کسی جانور کو قربان کرتے تو اس کا گوشت کعبہ کے سامنے ڈھیر کر دیتے یا اپنے بتوں کے سامنے رکھ دیتے اور اس کا خون دیواروں پر اچھالتے، ملتے اور لتھیڑتے۔چنانچہ ان کے اس طرزِ عمل کو غلط ٹھہراتے ہوئے فرمایا کہ قربانیوں کا گوشت اور خون اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچتا کیونکہ اسے ان کی ضرورت نہیں۔قربانی کا گوشت تمہاری ضرورت ہے اس لئے تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے۔اللہ کو جو چیز پہنچتی ہے وہ تمہارے دلوں کا تقویٰ ہے، وہ تمہارے دلوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے۔اگر تمہارے دلوں میں اخلاص ہے اور صحیح معنی میں جذبۂ قربانی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے اور اس کا اجر و ثواب عنایت کرتا ہے۔اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان اللہ لا ینظر الی صورکم ولاالی الوانکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم۔''اللہ تعالیٰ تمہاری صورتیں اور تمہارے رنگ نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دل اور اعمال دیکھتا ہے''۔اور اسی پر جزا اور سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

گزشتہ آیتِ کریمہ میں قربانی کا مقصد اوراس کی غرض یہ بیان کی گئی تھی کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان چھوٹے بڑے جانوروں کو جو اپنی جسمانی قوت اور صلاحیتوں کے اعتبار سے تم سے کہیں طاقتور ہیں۔وہ اگر سرکشی پر آجائیں تو تمہارے لئے ان پر قابو پانا آسان نہیں لیکن یہ کس قدر اللہ کا فضل واحسان ہے کہ اس نے یہ جانور تمہارے قبضے میں دے دیئے اور تمہارے لئے مسخر کر دیئے ہیں۔اونٹ جیسے بڑے ڈیل ڈول کا

Marfat.com

جانور بھی اس طرح مسخر کردیا گیا ہے کہ ایک بچہ بھی اس کی مہار پکڑ کر چلتا ہے تو وہ خاموشی سے پیچھے چلتا چلا جاتا ہے۔ قربانی اس لئے لازم کی گئی ہے تاکہ تم اللہ کی اس نعمت پر شکر کا اظہار کرو۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ایک دوسری علت اور غرض بیان فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس ذات نے ان جانوروں کو تمہارے تابع فرمان بنایا اور تمہارے لئے مسخر کیا ہے وہ درحقیقت ان جانوروں کا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی۔ اور وہ اس قدر طاقتور ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا طاقتور بھی چاہے اس کا تعلق کسی بھی مخلوق سے ہو اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ اس نے اونٹ، گائے، بھینسا، مینڈھا اور اسی طرح دوسرے جانوروں کو بڑی طاقتیں عنایت کی ہیں، لیکن یہ سب اس کی قدرت کے سامنے بے بس ہیں۔ اس نے ان کی زمام اور مہار انسانوں کے ہاتھ میں دی ہے کہ وہ جب چاہیں ان پر سامان لادیں، جب چاہیں انہیں طویل سفر پر روانہ کردیں اور جب اور جتنی چاہیں انہیں غذا مہیا کریں۔ وہ کبھی ان کے سامنے سر نہیں اٹھاتے اور جب چاہیں ان کے گلے پر چھری رکھ دیں وہ کبھی اس سے انکار نہیں کرتے۔ اس سے ہمیں یہ سبق دینا مقصود ہے کہ ان جانوروں کو تابع فرمان دیکھ کر اپنی ملکیت نہ سمجھ لینا، ان کا مالک اللہ ہے۔ بڑائی صرف اسی کو زیب دیتی ہے، تمہیں اسی کی بڑائی کے سامنے سر جھکانا ہے اور اسی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی بندگی بجالانی ہے اور پوری زندگی کو اس کے احکام کے تابع کرنا ہے۔ یہی ہماری بندگی کا تقاضا ہے اور یہی اس آیت کا سبق ہے۔ آخر میں فرمایا کہ "اے پیغمبر! محسنین کو بشارت سنا دیجئے"۔ محسنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہر کام کو جذبۂ احسان سے کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اس طرح اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں جس طرح اطاعت کرنے کا حق ہے اور اپنے جذبۂ اخلاص کی اس طرح نگرانی کرتے ہیں کہ اس میں کسی آلودگی کا سایہ بھی پڑنے نہیں دیتے اور وہ اللہ کے راستے میں قربانی دیتے ہیں تو یہ کہتے ہوئے دیتے ہیں: اَللّٰھُمَّ لَکَ وَمِنْکَ "اے اللہ! یہ قربانی صرف تیرے لئے ہے اس میں کوئی اور شریک نہیں اور ہمیں اعتراف ہے کہ یہ تیری ہی عطا کردہ ہے ہم تیری ہی عطا کو اپنی بندگی اور اخلاص کے جذبے میں لپیٹ کر تیرے حضور پیش کرتے ہیں"۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝۳۸

(بے شک اللہ مدافعت کرے گا ان لوگوں کی جو ایمان لائے۔ اللہ ہرگز بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔ ۳۸)

یُدٰفِعُ کا مفہوم

امام راغب اصفہانی "یدافع" کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر "دفع" کا صلہ "الی" ہو تو اس کا معنی "کسی کو کوئی چیز دینا ہوتا" ہے اور اگر اس کا صلہ "عن" ہو تو اس میں "حمایت اور نصرت" کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ منجد میں بھی اسی کے قریب مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں صلہ چونکہ "عن" آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا "کفار کے مقابلے میں جب اہلِ ایمان سینہ سپر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ان کے شاملِ حال ہوگی اور وہ ان کا دفاع فرمائے گا"۔

مظلوم مسلمانوں کو بشارت

جمہور مفسرین کا خیال یہ ہے کہ "آیت نمبر ۳۸ سے ۴۱" تک چار آیتیں ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں۔ البتہ! دیگر

Marfat.com

اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ آیت نمبر ۲۵ سے مدنی آیات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ۳۸ سے ۴۱ تک چار آیات کے مدنی ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ اور جہاں تک دوسری رائے کا تعلق ہے اس کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آیت نمبر ۲۵ میں قریش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ اور مسجدِ حرام سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں جبکہ مسجدِ حرام پر کسی کی اجارہ داری نہیں وہ بڑے ہی ظالم لوگ ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو دردناک عذاب چکھائے گا۔ اس آیت میں صاف طور پر مسلمانوں کو مسجدِ حرام سے روکے جانے کا ذکر فرمایا گیا ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ جب تک مسلمان مکہ معظمہ میں رہے ہیں مسجدِ حرام میں آنے اور بیت اللہ کا طواف کرنے کے حوالے سے ان پر کوئی پابندی نہیں تھی یہ الگ بات ہے کہ بعض دفعہ مسجدِ حرام میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے بدسلوکی بھی کی گئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسجدِ حرام میں مکمل طور پر مسلمانوں کے داخلے پر پابندی ہجرت کے بعد لگی ہے۔ اور قریش نے علی الاعلان یہ بات کہی کہ مسلمان اب اللہ کے گھر کے قریب نہیں آسکتے۔ اس لئے اگر یہ بات کہی جائے کہ اس قرینے کے باعث آیت نمبر ۲۵ سے مدنی آیات شروع ہو جاتی ہیں تو اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ لیکن جو لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ صرف آیت نمبر ۳۸ سے ۴۱ تک کی آیات مدنی ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں پر مسجدِ حرام پر داخلے پر پابندی نہیں تھی لیکن انہیں وہ آزادی بھی حاصل نہیں تھی جو باقی اہلِ مکہ کو تھی اور جہاں تک بیت اللہ میں داخل ہونے کا تعلق ہے تو عثمان بن طلحہ نے آنحضرت ﷺ کیلئے اس کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا تھا۔ تو اگر مسجدِ حرام سے بیت اللہ مراد لیا جائے تو پھر تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

آیت نمبر ۲۵ سے جو بعد کی آیات ہیں ان میں بیت اللہ اور مسجدِ حرام کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور مسلمانوں کے ذہنوں کو آہستہ آہستہ تیار کیا گیا ہے کہ بیت اللہ ملتِ ابراہیمی کی وراثت اور توحید کا مرکز بنایا گیا تھا۔ لیکن قریش نے اسے بتکدے میں تبدیل کر دیا اور اس کی تمام روایات کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ بیت اللہ کی حیثیت کو ازسرِ نو بحال کیا جائے اور شرک کی جو آلودگی اور غلاظت وہاں بکھیر دی گئی ہے بیت اللہ اور مسجدِ حرام کو اس سے پاک کیا جائے۔ چنانچہ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو ایک مرکز میسر آیا اور مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے اصحابِ ایمان ایک جگہ جمع ہوئے اور بطور ایک امت کے ان کی شیرازہ بندی ہوئی تو بظاہر مختصر سہی لیکن ایک مضبوط اجتماعیت کی شکل پیدا ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ ہجرت کے بعد پہلی دفعہ حج کا موسم آیا تو مسلمانوں پر یہ بات بہت شاق گزری کہ وہ حج کی نعمت سے محروم کر دیئے گئے ہیں اور ان پر زیارتِ حرم کا راستہ زبردستی بند کر دیا گیا ہے۔ اس احساس نے ان کے وہ زخم بھی تازہ کر دیئے جو مکی زندگی کے تیرہ سالوں میں انہوں نے مسلسل برداشت کئے تھے اور اب ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی قریش ان کو چین سے بیٹھنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وطن چھوٹ چکا تھا، خونی رشتے ٹوٹ چکے تھے، نئی صورتحال سے واسطہ تھا، لیکن قریش کی خون آشامی اور اذیت رسانی کی شدت میں کوئی کمی نہیں آرہی تھی۔

مسلمان انہیں احساسات کے تحت شدید تاثر کی کیفیت میں تھے کہ پیشِ نظر آیاتِ کریمہ نازل ہوئیں۔ جس نے مسلمانوں کے زخموں پر مرہم بھی رکھا اور ساتھ ہی ان کے جذبے کو جلا بھی بخشی کہ مسلمانوں کی اب یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کے گھر کو ان ظالموں سے نجات دلائیں جنہوں نے ملتِ ابراہیمی کی امانت میں خیانت کی ہے اور اللہ کی بندگی کے اس مرکز کو کفر اور شرک سے بھر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ تسلی بھی دی ہے کہ ہرچند کہ مسلمان اس وقت نہایت کمزور اور حالات کے نرغے میں ہیں، افرادی قوت نہایت کم اور مالی معاملات نہایت ابتر ہیں۔ اسلحہ کے حصول کیلئے ذرائع مفقود ہیں۔ تاہم اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی مدافعت فرمائے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے

Marfat.com

پاؤں پر اٹھنا ہوگا۔ اللہ کے بھروسے پر کفر اور شرک سے پنجہ لڑانا ہوگا۔ اللہ کے باغیوں کے مضبوط جتھوں کو یہ پیغام دینا ہوگا کہ ان کا حساب اب قریب آرہا ہے کیونکہ اللہ کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ اس کا گھر ان لوگوں کی تحویل میں رہے جو اس کے اہل نہیں اور وہ لوگ اس گھر میں داخل نہ ہو سکیں جن کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعائیں مانگی تھیں۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ
لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا
رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ
وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ الَّذِينَ
إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿٤١﴾ وَإِن
يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودُ ﴿٤٢﴾ وَ
قَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ﴿٤٣﴾ وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ ۖ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ
فَأَمْلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٤﴾ فَكَأَيِّن
مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا
وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ﴿٤٥﴾ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ
فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ
فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي

Marfat.com

الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ
وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَاَيِّنْ
مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ
الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾

رکوع: ۶۔ (اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔اس سبب سے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ ۳۹) جو لوگ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس جرم میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر دیئے جاتے۔اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کریں گے۔بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ ۴۰) یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔اور اللہ تعالیٰ کیلئے ہے سارے کاموں کا انجام۔ ۴۱) اور اگر یہ کفار آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو تعجب کی بات نہیں) پس جھٹلایا تھا ان سے پہلے قومِ نوح اور عاد اور ثمود۔ ۴۲) اور قومِ ابراہیم، قومِ لوط۔ ۴۳) اور مدین کے لوگوں نے بھی۔اور موسیٰ کی بھی تکذیب کی گئی۔تو میں نے ان کافروں کو کچھ ڈھیل دی (جب وہ باز نہ آئے) تو پھر میں نے انہیں پکڑ لیا تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار۔ ۴۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر ڈالا اس حال میں کہ وہ ظالم تھیں پس وہ اب اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں اور کتنے ناکارہ کنویں اور کتنے پختہ محل ہیں جو ویران پڑے ہیں۔ ۴۵) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ (ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ (حق کو) سمجھتے۔یا ان کے کان ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سنتے۔حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔ ۴۶) اور یہ لوگ آپ سے عذاب کیلئے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور بیشک ایک دن آپ کے رب کے نزدیک ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے جس حساب سے تم گنتی کرتے ہو۔ ۴۷) اور کتنی بستیاں تھیں جن کو ان کے ظلم کے باوجود میں نے ڈھیل دی۔پھر میں نے انہیں پکڑ لیا۔اور میری ہی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ ۴۸)

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ

Marfat.com

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ
مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

(اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ اس سبب سے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ ۳۹) جو لوگ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس جرم میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر دیئے جاتے۔ اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ ۴۰)

مسلمانوں کو جہاد کی اجازت

نبی کریم ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر جب اپنی قوم کو اللہ کی توحید کی دعوت دی اور انہیں یاد دلایا کہ تمہیں اللہ نے اس زمین پر ایک خاص مقصد کیلئے پیدا فرمایا ہے اور تمہاری اس زمین پر ایک خاص حیثیت ہے اور اس حیثیت کے مطابق تم ذمہ داریاں ادا کرنے کے پابند ٹھہرائے گئے ہو۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب تمہاری مقصدی اور منصبی ذمہ داریوں کے حوالے سے تم سے جواب طلب کیا جائے گا۔ زندگی جیسی قیمتی نعمت سے فائدہ اٹھانے کے حوالے سے ایک ایک لمحے کا حساب ہوگا اور تمہیں جو ضابطۂ حیات عطا کیا گیا ہے اس کے ایک ایک حکم پر عمل کے حوالے سے نامۂ عمل دیکھا جائے گا۔ اہلِ مکہ نے جیسے ہی آنحضرت ﷺ کی اس طرح کی باتیں سنیں اور ان کی دعوت کا جائزہ لیا تو چند سعید لوگوں کے سوا باقی لوگوں نے بجائے اسے قبول کرنے کے اپنے لئے اسے دشمنی کا پیغام سمجھا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ تم اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی اولاد اور ملتِ ابراہیم کا وارث سمجھتے ہو جبکہ اس کی بنیاد توحید تھی اور اللہ کا یہ گھر اسی توحید کا مرکز بنایا گیا تھا اور یہیں سے ایک امتِ مسلمہ کے اٹھائے جانے اور آخری رسول کے مبعوث کیے جانے کی دعائیں کی گئی تھیں۔ لیکن تم نے اس پوری تاریخ کو بدل کر شرک کی بنا ڈالی ہے۔ توحید کے مرکز کو تیرتھ یاترا میں تبدیل کر دیا ہے۔ جہاں صرف اللہ کی عبادت ہوتی تھی وہاں تم نے بت پرستی کو رواج دیا ہے۔ تم نے نہ صرف ابراہیم کے نام کو بٹہ لگایا بلکہ ملتِ ابراہیم کے پرخچے اڑا دیئے۔ تو وہ بجائے اس کے کہ اپنے جرائم کو سمجھتے اور اپنی غلطیوں کا ادراک کرتے انہوں نے اسے اپنے اور اپنے آباؤ اجداد پر ایک الزام سمجھا اور وہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی دشمنی پر تل گئے اور رفتہ رفتہ ان کی یہ دشمنی شرافت کی تمام حدود سے نکل گئی۔ قرابت داری کو بھول گئے، قبائل کے آداب کو بھی نظر انداز کر دیا اور اس حد تک مسلمانوں پر مشقِ ستم کی کہ ظلم اور بربریت کا کوئی ایسا زخم نہیں جو مسلمانوں کو نہ لگایا گیا ہو۔ دہکتے انگاروں پر اسلام کے جانثاروں کو لٹایا گیا، تپتی ہوئی چٹانوں پر ننگے جسموں کو گھسیٹا گیا، آگ کی دھونی دی گئی، تلواروں اور تیغوں کے زخم لگائے گئے۔ ابوجہل جیسے بدقماش انسان نے ایک مومنہ کے اندامِ نہانی میں نیزہ مار کر اسے قتل کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کے قتل کے منصوبے باندھے جانے لگے۔ مسلمانوں نے روز روز کی اس اذیت رسانی سے نجات حاصل کرنے اور آزادی سے اللہ کا نام لینے کیلئے مکہ سے ہجرت کی تو مکہ کے ظالموں نے مدینہ منورہ میں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ چراگاہوں پر شب خون مارے جانے لگے، جو جانور ہاتھ آتے انہیں لے اڑتے اور اکا دکا محافظوں کو قتل کر کے بھاگ جاتے۔

مسلمان مسلسل مکہ معظمہ میں تیرہ سالوں تک ان قیامتوں کا سامنا کرتے رہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت پر صبر کی تصویر بنے اللہ کی

Marfat.com

رضا کو دیکھتے رہے۔ اب جبکہ ہجرت کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو ایک مرکز عطا فرمایا اور مسلمانوں کی ایک تنظیمی ہیئت وجود میں آئی تو مسلمانوں میں بیت اللہ سے محرومی کا ایک شدید احساس پیدا ہونے لگا اور قریش کے مظالم کے خلاف ردعمل نے ایک اضطراب کی شکل اختیار کر لی اور دلوں میں یہ بات مچلنے لگی کہ کاش! اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں قتال کی اجازت ہوتی تو ہم اللہ تعالیٰ کے گھر کو واگزار کراتے اور ظالموں سے ظلم کا انتقام لیتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان احساسات کی قدر فرمائی اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی، امیر کی اطاعت اور مرکزِ اسلام جیسی بنیادی ضرورتوں کے پورا ہو جانے کے بعد قتال کی اجازت دے دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیشِ نظر آیت کریمہ میں صرف اجازت دی گئی ہے تاکہ مسلمان اس کیلئے تیاری کی فکر کریں اور اس بات کا اطمینان رکھیں کہ اجازت مل جانے کے بعد عملی طور پر قتال کا حکم اب بہت دور نہیں۔ بعض اہلِ علم کی تحقیق کے مطابق یہ آیتِ کریمہ ذی الحج ایک ہجری میں نازل ہوئی اور قتال کا حکم جنگِ بدر سے کچھ پہلے رجب یا شعبان دو ہجری میں نازل ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پہلے صرف اجازت دی گئی تاکہ طبیعتوں کا اضطراب ختم ہو اور ولولوں کی دنیا آباد ہونے لگے اسی طرح جب قتال کا حکم آیا تو پہلے صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی اور ارشاد فرمایا: **وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ** ”تم اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں“۔ پھر حکم آیا: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ** ”تم پر قتال فرض کر دیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہارے لئے ناپسندیدہ ہے“ اور فتح مکہ کے بعد حکم نازل ہوا **وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ** ”اور انہیں قتل کرو جہاں بھی انہیں پاؤ“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملی نقطہ نگاہ سے جیسے جیسے ضرورت پیدا ہوتی گئی ویسے ویسے جنگ کے حکم میں بھی وسعت آتی گئی ہے اور اب جبکہ تکمیلِ دین ہو چکی اور جہاد و قتال کے تمام احکام سامنے آگئے تو اب یہ بحثیں بے کار ہیں کہ جنگ دفاعی ہونی چاہئے یا اقدامی؟ اسلام نے کیا ایک کی اجازت دی ہے یا دونوں کی؟ جو شخص بھی کھلے دل و دماغ سے قرآنِ کریم کو پڑھے گا اسے صاف نظر آئے گا کہ حالات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کفر کی طاقت توڑنے اور کبھی ظالم کا ہاتھ روکنے کیلئے ہر طرح کی جنگ کی اجازت دی ہے۔

اجازت کا سبب

یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت کیوں دی ہے۔ مسلمان اپنی جان اور ایمان بچا کر اور سب کچھ اس کے راستے میں قربان کر کے اپنے وطن اور اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ لیکن ان ظالموں نے مدینہ میں بھی ان کو آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ بار بار حملے کرتے، چراگاہیں لوٹتے، اکا دکا لوگوں کو قتل کرتے، اور ساتھ ہی ساتھ مدینہ کے سربرآوردہ لوگوں کو اکساتے کہ یہ مسلمان ہمارے بھگوڑے ہیں انہیں مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم تمہارے خلاف بھی طاقت استعمال کریں گے۔ عبداللہ بن ابی کو نہایت تہدید آمیز خط لکھا گیا۔ کعب بن اشرف کے ساتھ سازش کا تانا بانا بنا گیا۔ چنانچہ انہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی ہے جن سے کفارِ مکہ لڑائی کرنا چاہتے ہیں اور آرام سے بیٹھنے نہیں دیتے اور جنہیں برسوں تک ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔

مسلمان اگرچہ نبی کریم ﷺ کی قیادت میں نہایت تیزی سے ایک امت کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ انہیں نہایت بے دار مغز اور صالح قیادت میسر تھی۔ مدینہ کی بستی ان کے لئے ایک مرکز کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ مسلمانوں کا ایک ایک فرد اپنے اندر حیات افروز اولوالعزمیوں سے معمور دنیا آباد کر چکا تھا۔ ان میں سے ہر شخص اپنے تئیں ایک انجمن تھا۔ وہ نفع و ضرر کے پرانے پیمانوں سے رشتہ توڑ چکے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا کامل اتباع اور اللہ پر بھروسہ اور اعتماد ان کی زندگی کا عنوان بن چکا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ بہر حال جنگ کی

Marfat.com

تباہ کاریوں کا سامنا کرنے کی بظاہر ہمت نہیں رکھتے تھے۔ مدینہ ایک قصبہ سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے وسائل نہایت محدود تھے۔ مسلمانوں کی افرادی قوت کسی بڑے طوفان کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ ان کے معاشی ذرائع اس قابل نہ تھے کہ وہ کسی جنگ کا بوجھ اٹھا سکتے۔ قریش مکہ شائد ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر دلیر ہوئے جا رہے تھے۔ پروردگار نے اس پوری صورتحال کو ایک جملے کے ساتھ الٹ ڈالا کہ قریش اور دشمنوں کی نگاہ میں صرف مسلمانوں کی ظاہری حالت ہے اور وہ انہیں کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی دشمنی اور ایذا رسانی کو وسعت دیتے جا رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ مسلمان تو خدائی فوجدار ہیں۔ وہ بتوں سے تعلق توڑ چکے، قبیلوں سے منہ موڑ چکے، اور بڑی سے بڑی قوت کو پاؤں کی ٹھوکر سے اچھال چکے، اور ایک نئی زندگی کے پیامبر بن کر اٹھے ہیں۔ اس لئے ان کی پشت پر دنیا کی بے شک کوئی قوت نہیں لیکن وہ جس کے نام اور جس کے پیغام کیلئے سب کچھ قربان کر چکے ہیں وہ ان کی پشت پر ہے اور اس نے یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ ہم مسلمانوں کی مدافعت کریں گے۔ اس میں مسلمانوں کو حد درجہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ تمہیں دشمن کی قوت سے اثر قبول کرنے کی ضرورت نہیں اللہ کی قوت تمہارے ساتھ ہے اور دشمن کو وارننگ دی گئی ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہاری لڑائی مسلمانوں سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے خدا سے ہے اور ان کا خدا ان کی مدد کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تم ساری دنیا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لو تو اللہ کی قدرت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہو۔

آیت کے آغاز میں فرمایا گیا ہے کہ جن لوگوں کو جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اب تک ظلم کیا گیا ہے اور وہ اس ظلم کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنی جان اور ایمان بچانے کیلئے اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکلے ہیں۔ اب دوسری آیت میں مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑا ظلم برداشت کر لیتا ہے لیکن وہ حتی الامکان اپنا گھر چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ گھر انسان کی عزت کی علامت اور اس کی حفاظت کا حصار ہے۔ اس کے چھن جانے کے بعد آدمی کی کوئی پناہ گاہ نہیں رہتی۔ کوئی اس کا حوالہ نہیں رہتا۔ کسی کے گھر چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کیلئے زندہ رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام کا اپنے گھروں اور وطن کو چھوڑنا ایسے ہی تمام مصائب کا نتیجہ تھا اور ایسے ہی بے پناہ مظالم تھے جس نے مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کیا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان سے وطن چھڑا لیا گیا، گھر چھین لیا گیا، لیکن ان کا کوئی قصور نہیں بتایا گیا کیونکہ وہ اپنے معاملات اور سیرت و کردار میں ان لوگوں سے ہزار ہا درجہ بہتر تھے، ان کا قصور اگر کوئی تھا تو صرف یہ کہ انہوں نے شرک کی تمام آلودگیوں سے منہ پھیر کر اور شرک کے ہر آستانے سے سر اٹھا کر صرف اللہ کو اپنا رب قرار دیا تھا۔

خونے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

قریش خوب جانتے تھے کہ ربنا اللہ کہنے کا مطلب کیا ہے۔ اللہ کی ربوبیت کا یقین اللہ کے سوا ہر پرستش اور ہر اطاعت سے انسان کو آزاد کر دیتا ہے۔ اللہ کی ربوبیت کے فیضان میں چونکہ کوئی تخصیص نہیں اس کے سورج کی روشنی جس طرح محلات میں پہنچتی ہے اسی طرح غریب کے جھونپڑے کو بھی منور کرتی ہے، تو اس کی ربوبیت کا یقین رکھنے والا انسانوں میں ہر طرح کی تقسیم اور ہر طرح کے تفاوت سے بغاوت کر دیتا ہے۔ اس لئے قریش خوب سمجھتے تھے کہ یہ بظاہر درویش صفت لوگ اپنے اندر کیسے طوفانوں کی طاقت رکھتے ہیں اور کس قدر بے پناہ تبدیلیوں کا پیغام بن کر اٹھے ہیں۔

Marfat.com

جہاد کی حکمت

وَلَوْ لَادَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ آیتِ کریمہ کے اس حصے میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کی نہایت زریں حکمت بیان کی ہے اور اسی میں مسلمانوں کو قتال کی جو اجازت دی گئی ہے اس کی وجہ بھی ذکر کی گئی ہے۔ انسانی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حق و باطل اور خیر و شر کی آویزش ہمیشہ انسانوں میں جاری رہی ہے۔ پہلے انسان حضرتِ آدم کو اللہ نے خیر کا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا اور ان کے ساتھ ہی ابلیس خیر کی قوتوں کو ناکام کرنے اور شر کی تخم ریزی کیلئے زمین پر اترا تھا۔ ہر دور میں نبی آتے رہے اور خیر کی قوت کی نمائندگی اور اس کے احیاء کیلئے کوششیں کرتے رہے اور ابلیس نے ہمیشہ اپنے منفی کردار کے ذریعے نبوت کی کوششوں کو ناکام کرنے کیلئے ہر طرح کے حربوں سے کام لیا۔ برائی کے بڑے بڑے گروہ وجود میں آئے اور بعض دفعہ تخت و تاج کی قوتیں اس کیلئے استعمال ہوتی رہیں۔ جنہوں نے اپنی حکومت اور وسائل سے کام لے کر برائی کی قوتوں کو سرافراز کیا اور نیکی کیلئے جینا مشکل کر دیا۔ خیر و شر کے اس امتیاز کو دیکھتے ہوئے بعض کمزور طبیعتوں نے رہبانیت اور ترکِ دنیا کا راستہ اختیار کیا اور اس طرح سے خیر کی قوتوں کو مزید کمزور کر دیا۔ چنانچہ اللہ کی زمین کو فساد سے بچانے اور انسانیت کو تباہی سے محفوظ کرنے کیلئے اللہ نے مختلف ادوار میں اپنے پیغمبروں کے ذریعے جہاد و قتال کا حکم دیا تاکہ ایسی شیطانی قوتوں کو جو بڑے بڑے دھڑوں کی صورت میں منظم ہو چکی ہیں اور بعض جگہ تخت پر متمکن ہو کر اپنے وسائل کو برائی کے پھیلانے اور نیکی کو ختم کرنے میں بروئے کار لا رہی ہیں، سرنگوں کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم حق و باطل کی اس کشمکش کو حرب و ضرب کی قوت میں ڈھلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس میں اگر ایک طرف ہمیں فرعون اور نمرود اور ہامان اور شداد برائی کے نمائندوں کے طور پر نظر آتے ہیں تو دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ حضرتِ طالوت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کو خیر کے نمائندوں کی صورت میں خیر اور نیکی کو سربلند کرتے اور بدی کی قوتوں کو سرنگوں کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہی حق و باطل کی آویزش ہے جو مختلف ناموں سے ہمیشہ جاری رہی اور اسی نے مدینہ منورہ میں جہاد و قتال کی نئی تاریخ رقم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن اپنی حقیقت میں یہ کوئی نئی بات نہیں بقول اقبال ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی قوتِ اسداللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

یہی جہاد و قتال کی وہ قوت ہے جس نے ہمیشہ خیر اور نیکی کے مراکز اور عبادت گاہوں کا تحفظ کیا ہے۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح نیک لوگوں کے ذریعے برائی کی قوتوں کی سرکوبی نہ کرتا تو دنیا میں کوئی خانقاہ، کوئی عبادت گاہ اور کوئی مسجد باقی نہ رہتی۔

عبادت گاہوں کیلئے جو الفاظ قرآنِ کریم نے استعمال کئے ہیں ان کی وضاحت بہت ضروری ہے۔

الفاظ کی وضاحت

صَوَامِعُ : صَوْمِعَةٌ کی جمع ہے۔ صَوْمِعَةٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جو بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی آبادی سے دور کسی خاموش گوشے میں واقع ہو، جہاں راہب اور سنیاسی اور تارک الدنیا فقیر رہتے ہیں اور عبادت کیلئے خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ ''خانقاہ'' کر دیا جاتا ہے اور یہ موزوں بھی معلوم ہوتا ہے۔

بِیَعٌ : بِیعَةٌ کی جمع ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ دونوں کی عبادت گاہوں کیلئے آتا ہے۔ لیکن آگے یہودیوں کی عبادت گاہ کیلئے الگ لفظ

Marfat.com

آرہا ہے۔اس لئے قرینہ دلالت کررہا ہے کہ یہاں اس سے مراد صرف نصاریٰ کی عبادت گاہ ہے۔ جسے ''گرجا'' کہا جاتا ہے۔نصاریٰ میں چونکہ رہبانیت کے نظام کی وجہ سے خانقاہوں اور گرجوں دونوں کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے شاید اس لئے سب سے پہلے ان دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

صَلَوَات: صَلَاۃ کی جمع ہے۔یہ لفظ یہود کے کنیسوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔یہودیوں کے یہاں اس کا نام ''صلوتا'' تھا۔جو آرامی زبان کا لفظ ہے۔بعید نہیں کہ انگریزی لفظ ''Salute'' اور ''Salutation'' اسی سے نکل کر لاطینی میں اور پھر انگریزی میں پہنچا ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ حق وباطل کی یہ کشمکش جو عبادت گاہوں اور گلی کوچوں سے نکل کر بار بار رزم و بزم کے میدان گرم کرتی رہی ہے اور تاریخ اس کی مکمل شہادت دیتی ہے۔البتہ! جس دور میں کسی بھی واجب الاحترام پیغمبر کی دعوت کے نتیجے میں کوئی قابلِ ذکر امت وجود میں نہ آسکی تو وہاں تو بات دعوت سے آگے نہ بڑھ سکی۔لیکن جب بھی دعوت نے ایک نئی امت پیدا کی ہے تو پھر کفر کے ساتھ پنجہ آزمائی ضرور ہوئی۔ اس لئے اقبال نے کہا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

لیکن عیسائیت نے چونکہ پٹڑی سے اترنے کے بعد رہبانیت کو اپنی منزل بنالیا تو بجائے اس کے کہ عیسائی قوم کے دانشور اپنی اس کمزوری کو سمجھتے اور قوموں کے مزاج کی صحیح تشخیص کرتے ان کے نام نہاد مستشرقین نے یہ کہنا شروع کردیا کہ حضرت محمد ﷺ کی زندگی مکہ میں تو ایک پیغمبر کی زندگی تھی لیکن مدینہ میں آکر ایک حکمران کی زندگی بن گئی۔وہ درویشی اور مسکینی کو پیغمبر کی زندگی سمجھتے ہیں۔لیکن جب خیر، طاقت کی صورت اختیار کرتی ہے تو وہاں انہیں حکمرانی نظر آتی ہے۔اقبال نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے ٹھیک کہا ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
فقیری ہے آئینہ دارِ نذیری

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے، کہ اللہ مسلمانوں کی مدد کرے گا کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جو اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔یعنی جو اس کے دین کی سربلندی کیلئے ہر طرح کی قربانی دیتا ہے۔ضرورت پڑے تو میدانِ جنگ میں خون دیتا اور سر کٹواتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔اب چونکہ مسلمان اللہ کے دین کی سربلندی اور اللہ کے گھر کی عظمت کو بحال کرنے کیلئے سردھڑ کی بازی لگارہے ہیں۔تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ ان کی مدد نہ کرے اور لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمان بے شک کمزور صحیح لیکن اللہ قوت والا ہے، غالب ہے۔اس کی

Marfat.com

تائید ونصرت کے بعد مسلمان بھی اس دھرتی کی غالب قوت بن جائیں گے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

(یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کیلئے ہے سارے کاموں کا انجام۔ ۴۱)

مسلمانوں کیلئے اقتدار کی پیش گوئی

گزشتہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جن کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور جنہیں جہاد وقتال کی اجازت دی گئی ہے اور جو لوگ سالہا سال تک محض اللہ کے دین کی خاطر بے پناہ مصائب برداشت کرتے رہے اور اب انہوں نے محض اللہ کے دین کیلئے اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی ہے۔ وہ لوگ اس قابل ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں زمین پر یعنی سرزمینِ مکہ اور سرزمینِ عرب پر اقتدار عطا فرمائے۔ یہ ایک طرح کی پیش گوئی ہے کہ اب میدانِ حرب وضرب گرم ہونے والا ہے اور وہ لوگ جو آج تک مکہ میں درویشی اور مسکینی کی زندگی گزارتے رہے اور جنہوں نے مسلسل دکھ اٹھائے ہیں اب وہ میدانوں میں شہسواروں کی صورت نکلنے والے ہیں اور چند ہی سالوں میں جزیرۂ عرب کی حکومت اللہ تعالیٰ ان کے حوالے کرنے والا ہے۔ جیسے ہی اللہ تعالیٰ انہیں اقتدار عطا فرمائے گا تو وہ قریش کی طرح غاصب اور اجارہ دار بن کر حرم کے مقاصد کو پامال نہیں کریں گے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن مقاصد کیلئے اللہ کا گھر بنایا اور اپنی ذریت کو وہاں ٹھہرایا تھا وہ ان تمام مقاصد کو وہاں زندہ کریں گے جن میں سب سے پہلا مقصد اللہ کے گھر میں اللہ ہی کی نماز کو قائم کرنا ہے۔ نماز اللہ کی بندگی کی وہ مجموعی شکل وصورت ہے جس سے ایک فقیر سے لے کر حکمران تک زندگی کا رویہ وجود میں آتا ہے اور جس سے وہ پالیسی جنم لیتی ہے۔ جو اس نئی بننے والی حکومت کی صورت میں وجود میں آنے والی ہے۔ اسی طرح وہ نظامِ زکوٰۃ کو قائم کریں گے جو ان کی تمام معاشی پالیسیوں کا نماز ہوگا۔ وہ مسندِ حکومت پر بیٹھ کر اللہ کی یاد سے بھی غافل نہیں ہوں گے اور ان کی حکومت کے خزانے ذاتی آرام وآسائش اور عیش وعشرت میں صرف ہونے کی بجائے غریبوں اور مسکینوں کی ضروریات کو پورا کرنے پر خرچ ہوں گے۔ ان کا اختیار واقتدار نیکی اور خیر کو پھیلانے کیلئے اس طرح صرف ہوگا کہ جہاں جہاں ان کے قدم پہنچیں گے وہیں وہیں نیکی اور تقویٰ کے چمنستان لہلہانے لگیں گے۔ ان کی قوت اللہ کے دین کی قوت ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برائی اور ابلیسیت کی تمام شکلیں معدوم ہو جائیں گی۔ منکرات خود اپنی موت مر جائیں گے۔ شریعت کی خلاف ورزی ناممکن ہو جائے گی گناہ کا بیج مار دیا جائے گا۔

آخری جملے میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تم اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہو۔ یہ یقیناً اضطراب محسوس کر رہے ہو لیکن تمہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ ہر چیز کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جو کرنا چاہتا ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ تمہاری کوششیں بھی پھل ہو کر رہیں گی اور اللہ کی تائید ونصرت سے غلبۂ دین کا یہ کام تمہارے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے گا۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ

Marfat.com

لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ
كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾

(اور اگر یہ کفار آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو تعجب کی بات نہیں) پس جھٹلایا تھا ان سے پہلے قومِ نوح اور عاد اور ثمود۔ (۴۲)
اور قومِ ابراہیم، قومِ لوط۔ (۴۳) اور مدین کے لوگوں نے بھی۔ اور موسیٰ کی بھی تکذیب کی گئی۔ تو میں نے ان کافروں کو
کچھ ڈھیل دی (جب وہ باز نہ آئے) تو پھر میں نے انہیں پکڑ لیا تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار۔ (۴۴)

آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی تاریخ کی روشنی میں

اہلِ حق اور اہلِ باطل کی کشمکش کا ذکر جاری ہے اور آنحضرت ﷺ کے ہم عصر لوگوں میں اہلِ باطل کی نمائندگی چونکہ قریش کر رہے تھے تو ان کے جرائم کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روک دیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے مقامی اور اجنبی اور تمام لوگوں کے کیلئے اللہ کے گھر کو مرکزِ توحید بنایا تھا عبادت کے لئے سب پر دروازے کھولے گئے تھے اور سب کے حقوق اس میں برابر تھے چنانچہ ان کے اس جرم کے حوالے سے بیت اللہ کی تاریخ بیان کرنے کی تقریب پیدا ہوئی تو قرآنِ کریم نے اس کی مختصر تاریخ بیان کرنا ضروری سمجھا۔ پھر اسی مناسبت سے مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلاتے ہوئے انہیں جہاد کی اجازت دی گئی۔ یہ اگرچہ چار آیات مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن مضمون کے ساتھ مطابقت کی وجہ سے انہیں اس سورت میں شامل فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ان آیات کی تکمیل کے بعد پھر اسی مضمون کو لیا جا رہا ہے کہ اس میں اہلِ باطل کے نمائندہ کے طور پر قریش پیش پیش تھے اور وہ نہایت سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں کی مخالفت کر رہے تھے اور آئے دن ان کے بڑھتے ہوئے مظالم سے مسلمان سخت پریشان تھے۔ ان کی اذیتیں چونکہ ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ اس لئے مسلمانوں کی زبانوں پر اللہ کی تائید اور نزول کیلئے بار بار دعائیں مچل مچل جاتی تھیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں براہِ راست آنحضرت ﷺ کو خطاب فرما کر تسلی دی گئی ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ اور مسلمان انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں مبتلا کر دیئے گئے ہیں۔ اسلام سے وابستہ لوگوں کیلئے یہ انتہائی تکلیف دہ صورتحال ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حق و باطل کی کشمکش ہمیشہ انہیں راہوں سے گزری ہے۔ جب بھی اللہ کی طرف سے کوئی نبی یا رسول دعوت لے کر آیا اس کی قوم نے ہمیشہ اس کی تکذیب کی۔ تاریخ آپ کے سامنے ہے جھٹلانے والی قوموں کے کھنڈرات ان راستوں میں بکھرے ہوئے ہیں جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے گزر کر جاتے ہیں۔ ان کھنڈرات کا ایک ایک ذرہ اس حقیقت کو نمایاں کر رہا ہے کہ اہلِ حق ہمیشہ ستائے گئے ہیں اور اہلِ باطل نے دعوت الی اللہ کے جواب میں ہمیشہ بہیمیت اور درندگی کا ثبوت دیا ہے۔ قومِ نوح، قومِ ثمود، قومِ عاد، قومِ ابراہیم، قومِ لوط اور اہلِ مدین، ان میں سے کون سی قوم ہے جس نے اس تاریخ کو نہیں دھرایا؟ کفر ہمیشہ اللہ کے دین کی دعوت پر بھڑکتا رہا اور اہلِ کفر نے طاقت کے زور سے سچائی اور بندگی کی اس آواز کو ہمیشہ دبانا چاہا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تکذیب کی روش پر فوراً گرفت نہیں فرمائی جس طرح اہلِ کفر کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ حق کی تکذیب کرتے رہے ہیں۔ اس طرح اللہ کی بھی سنت رہی ہے کہ وہ ان تکذیب کرنے والوں کو پکڑنے اور سزا دینے میں جلدی نہیں کیا کرتا۔ وہ ان کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ اپنی روش پر غور کریں اور اگر سنبھلنا چاہیں تو سنبھل جائیں۔ لیکن جب ڈھیل کا وقت گزر جاتا ہے اور اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں کہ وہ وقت کب اختتام پذیر ہوتا ہے، تو پھر اللہ کی پکڑ آ جاتی ہے۔ اس حقیقت کی تائید کیلئے سب سے آخر میں موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ کا حوالہ دیا

Marfat.com

گیا ہے۔ غالباً یہ حوالہ آخر میں اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ قریش یہود سے تعلق کی وجہ سے سب سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ سے واقف تھے اور مزید یہ بات بھی کہ موسیٰ علیہ السلام ہی سب سے پہلے صاحبِ شریعت نبی کے طور پر مبعوث کئے گئے تھے اور آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ انہیں کے حالات سے آگاہ تھے۔ اس لئے نہایت بے ساختہ انداز میں توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ دیکھو تکذیب تو موسیٰ علیہ السلام کی بھی کی گئی ہے اور ان کیلئے مجہول کا صیغہ شاید اس لئے استعمال کیا گیا کہ ان کی تکذیب ان کی قوم نے نہیں بلکہ فرعون اور اس کی قوم نے کی تھی جو قبطی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق فرعونیوں کو بھی ڈھیل دی لیکن جب وہ بھی اپنی روش سے باز نہ آئے تو پھر اللہ کی گرفت آئی اور انہیں عبرت کا نمونہ بنا دیا گیا۔

نَکِیْر: اصل میں نکیری ہے۔ ''ر'' کا کسرہ ''ی'' کے گرنے کا قرینہ ہے۔ نکیر کا معنی عام طور پر انکار کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اہلِ لغت کا خیال ہے کہ نکیر مجرد انکار کو نہیں کہتے بلکہ اس انکار کو کہتے ہیں جس کے ساتھ غیرت، نفرت، اور بیزاری کی شدت پائی جاتی ہو۔ بعض اہلِ لغت نے اس کا ترجمہ عقوبت یا عذاب بھی کیا ہے۔ لیکن وہ بھی عام عذاب کو اس کا مصداق نہیں سمجھتے بلکہ اس سے ایسا عذاب مراد لیتے ہیں جو معذب شخص یا معذب قوم کا حلیہ بگاڑ دے۔

فَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا وَھِیَ ظَالِمَۃٌ فَھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَۃٍ وَّقَصْرٍ مَّشِیْدٍ ﴿۴۵﴾

(اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر ڈالا اس حال میں کہ وہ ظالم تھیں پس وہ اب اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں اور کتنے ناکارہ کنویں اور کتنے پختہ محل ہیں جو ویران پڑے ہیں۔ ۴۵)

مشکل الفاظ کی تشریح

فَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ: یہ مبتدا اور مرفوع ہے۔ اور یا فعل محذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور ''اھلکنا'' اس فعل کا مفسر ہے۔ فَھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ''ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں''۔ یہ صورتحال کی تصویر ہے۔ بڑی عمارتوں کے گرنے کا آغاز عموماً ان کی چھتوں سے ہوتا ہے۔ متروک و مہجور ہو جانے کے بعد پہلے ان کی چھتیں بوسیدہ ہو کر گرتی ہیں پھر دیواریں ان کے اوپر گر جاتی ہیں۔ اسی طرح اللہ کا عذاب زلزلے کی صورت میں آتا ہے تو پہلے چھتیں گرا کرتی ہیں پھر دیواریں ان پر ڈھے جاتی ہیں۔

وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَۃٍ: بے کار کنواں۔ جس سے لوگوں نے پانی نکالنا بند کر دیا ہو۔ عرب میں چونکہ پانی کی کمیابی تھی اس لئے کسی چشمے یا کنویں پر بستی بن جایا کرتی تھی۔ اس لئے عموماً لوگ کنویں اور بستی کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ جب کسی قبیلے کا نام لینا ہوتا تو فلاں قبیلے کا کنواں کہہ کر نام لیا کرتے تھے اور جب یہ کہا جاتا کہ فلاں کے کنویں اجڑ گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ بستی اجڑ گئی ہے۔

قَصْرٍ مَّشِیْدٍ: مضبوط اور شاندار محل۔ جو عمارت چونے سے چنی گئی اور چونے سے پلستر کی گئی ہو اسے ''مشید'' کہتے تھے۔ جس طرح آیت میں بئرٍ کے بعد معطلہ کی صفت آئی ہے اسی طرح یہاں بھی کسی نہ کسی صفت کو محذوف ماننا پڑے گا۔

Marfat.com

متذکرہ حقیقت کی تائید

سابقہ آیاتِ کریمہ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جن قوموں اور جن بستیوں کے رہنے والوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو انہیں ایک وقت کیلئے مہلت تو دی گئی لیکن جب انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر وہ عذاب کا شکار ہو گئے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی کی تائید کی گئی ہے اور کسی بستی کا نام لئے بغیر علی الاطلاق اہلِ عرب سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جانتے ہو کہ کتنی بستیاں ہیں جن کو تکذیبِ رسل کے باعث ہم ہلاک کر چکے ہیں، تم ان کے کھنڈرات سے گزرتے ہو۔ تمہارے قافلے وہاں سے گزرتے ہیں۔ ان بستیوں کی تاریخ سے تم کسی نہ کسی حد تک واقف ہو۔ ان کے بستیوں کے آثار کے طور پر بعض جگہ محلات کھڑے ہیں جو سونے پڑے ہیں۔ وہاں کسی مکین کا نشان نہیں ملتا۔ کتنے کنویں ہیں جن پر کبھی لوگ آتے جاتے ہوں گے اب وہ معطل اور بے کار پڑے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک چیز تمہارے لئے نصیحت اور عبرت کا سامان ہے۔ تم چاہو تو اس سے نصیحت حاصل کر سکتے ہو۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

(کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ (ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ (حق کو) سمجھتے۔ یا ان کے کان ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سنتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔ ۴۶)

عبرت پذیری سے گریز کا انجام

اللہ تعالیٰ نے جن بستیوں اور جن قوموں کو تکذیبِ رسل کے نتیجے میں ہلاک کیا وہ تو یقیناً اپنے برے انجام کو پہنچ گئیں اور موت کی خاموشی نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ لیکن وہ اپنی تباہی اور بربادی کے آثار اپنے پیچھے چھوڑ گئیں۔ ان کے محلات کے کھنڈرات، ان کی اجڑی ہوئی بستیاں، ان کے بے کار اور بے آباد کنویں، اپنی داستان سنانے کیلئے آج بھی باقی ہیں۔ اور انہیں اس لئے باقی رکھا گیا ہے کہ یہاں سے گزرنے والے تجارتی قافلے وہ ان بستیوں کی تباہی اور بربادی کو دیکھ کر کبھی سوچنے کی زحمت گوارا کریں اور وہ اسباق و دروس جو ان میں سے ایک ایک پتھر پر کندہ ہیں اور وہ ہزاروں عبرتیں جو ایک ایک کھنڈر کے نیچے دفن ہیں۔ اور وہ بے شمار نصیحتیں جو آج بھی ان کی فضاؤں میں بولتی اور تیرتی ہوئی سنائی اور دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں سے گزرنے والے شائد کبھی ان کی طرف دھیان دے سکیں اور یہ سوچنے کی زحمت کر سکیں کہ آخر ان قوموں پر یہ تباہی کیوں آئی؟ یہ لوگ اپنے دنیوی معاملات، اپنے مادی وسائل، اور اپنے نفع و ضرر کے پیمانوں میں ہر طرح خود کفیل اور اتارو تھے۔ اپنی ضرورتوں کو سمجھتے اور انفرادی اور اجتماعی سطح پر انہیں بروئے کار لانے میں نہایت فعال ثابت ہوئے تھے۔ اس کے باوجود ان پر اتنی بڑی افتاد پڑی تو اس کا سبب آخر اس کے سوا اور کیا تھا کہ انہوں نے جسمانی اور مادی ضرورتوں کی بجا آوری کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں۔ لیکن اخلاقی توانائی، ذہنی شائستگی، قلبی اطمینان، اور روحانی بالیدگی کیلئے ان کے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ اخلاقیات کی تباہی کے باعث انسانی قدریں رفتہ رفتہ اپنے انجام کو پہنچ رہی تھیں۔ لیکن انہیں کسی بات کا ملال نہ تھا کیونکہ مسلسل مادے کی مصروفیت، شکم پروری، اور اتباعِ ہوا

Marfat.com

نے ان کے پیٹ کی بھوک، سفلی جذبات، خودغرضی اور ہوسِ زر میں تو خوب اضافہ کیا تھا لیکن انسان کی مقصدی اور معنوی ضرورتوں کو اس قدر پسِ پشت ڈال دیا تھا کہ وہ کالعدم ہو کر رہ گئیں۔ بصیرت کا نور بجھ گیا۔ دلوں کے گھروندے تاریک ہو گئے۔

قوموں کا اصل حادثہ یہ ہے کہ جب وہ ایسے علم ودانش کو جو صرف معدے کی خدمت انجام دیتا ہے، اپنی زندگی کی روشنی بنا لیتی ہیں تو پھر ضمیر اور دلوں کی موت واقع ہو جاتی ہے حالانکہ تباہ شدہ بستیوں میں مخفی عبرتوں کو اس لئے نمایاں کیا جاتا ہے تاکہ دلوں میں روشنی پیدا ہو۔ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی اپنا کام کرنے لگے۔ لیکن جب ان عبرتوں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی بلکہ تباہ شدہ بستیوں میں بھی کلچر تلاش کیا جاتا ہے اور ہزاروں سال پرانی تہذیب کے آثار ڈھونڈنے پر ساری توجہ صرف کی جاتی ہے تو پھر اللہ کے رسولوں کی تعلیم اور اللہ کی نازل کردہ کتابوں کا اعجاز بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں سوال آئے کہ قرآنِ کریم فہم وبصیرت کو دلوں کی طرف منسوب کر رہا ہے حالانکہ یہ دماغوں کا عمل ہے۔ اس سلسلے میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو یہ اسلوب سائنسی اسلوب نہیں بلکہ ادبی اسلوب ہے۔ قرآنِ کریم نصیحت کی کتاب ہے سائنس کی نہیں اور جہاں تک ادب اور نصیحت کا تعلق ہے ہر دور میں اس میں معتبر حوالہ دلوں ہی کا رہا ہے دماغوں کا نہیں۔ اقبال اپنی قوم کا مصلح ہے۔ اس نے انسانی اصلاح کیلئے ہمیشہ دلوں کی بیداری پر زور دیا ہے اور دلوں میں نور پیدا کرنے کی بات کی ہے حالانکہ وہ خود جانتا تھا کہ سائنس اس بارے میں کیا کہتی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری
دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

مزید کہتا ہے ؎

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اور دوسری بات یہ ہے کہ اب تو اربابِ سائنس بھی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ دل صرف خون کو پمپ کرنے کی مشین نہیں بلکہ اس کے اندر احساسات کی دنیا بھی آباد ہے۔ یہ خوشی اور غم کو محسوس کرتا ہے، حسن وقبح کا اصل معیار قدرت نے اسی کے اندر رکھا ہے اور یہیں سے دماغ کو روشنی اور آنکھ کو بصیرت ملتی ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾

(اور یہ لوگ آپ سے عذاب کیلئے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور بیشک ایک دن آپ کے رب کے نزدیک ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے جس حساب سے تم گنتی کرتے ہو۔ ۴۷)

Marfat.com

ایک مغالطے کا ازالہ

مخالفت کرنے والے آنحضرت ﷺ سے بار بار مطالبہ کرتے کہ آپ ہمیں جس عذاب سے ڈراتے ہیں اسے لے کیوں نہیں آتے؟ اگر ہمارے اعمال اس قابل ہیں کہ ہم پر عذاب کا کوڑا برسنا چاہئے تو پھر دیر کس بات کی ہے؟ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کی باتیں ایک ڈراوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ ہم عذاب سے ڈر کر آپ کی بات مان لیں اور آپ پر ایمان لے آئیں۔ ان باتوں کے جواب میں پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ یہ لوگ آپ سے عذاب مانگنے میں جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب کوئی قوم تکذیبِ رسول میں حد سے آگے بڑھ جاتی ہے تو اسے انجام سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے۔ معذب قوموں کے کھنڈرات جگہ جگہ اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ لیکن تم جس غلط فہمی کا شکار ہو وہ یہ ہے کہ تم نے اعمال کی کھیتی کو بھی عام کھیتیوں پر قیاس کر رکھا ہے کہ ادھر بوئی اور ادھر کاٹ لی جبکہ قومیں اپنے عروج و زوال کا سفر دنوں اور مہینوں میں طے نہیں کرتیں بلکہ اس کیلئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ انسان اپنے محدود پیمانوں سے جب ناپتا ہے تو اسے چند سالوں کی مدت یا مہلت بہت طویل معلوم ہوتی ہے لیکن اسے یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کا ایک دن اس دنیا کے دنوں کے حساب سے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے سیکنڈ اور منٹ انسانوں کی دنیا کے برسوں سے بھی طویل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اس کی اپنی تقویم کے مطابق ہوتے ہیں۔ انسانی تقویم میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ لیکن اللہ کے یہاں منٹوں اور گھنٹوں کی بات ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کسی قوم کو سنبھلنے کیلئے کس قدر مہلت ملنی چاہئے۔ اس اسلوب کو سامنے رکھتے ہوئے انسانوں کو ہمیشہ اللہ کے فیصلوں کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ قریش بھی اگر اس اسلوب کے مطابق نزولِ عذاب کی تاخیر کا جائزہ لیں تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو سکتا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَىَّ الْمَصِيْرُ ﴿٤٨﴾

(اور کتنی بستیاں تھیں جن کو ان کے ظلم کے باوجود میں نے ڈھیل دی۔ پھر میں نے انہیں پکڑ لیا۔ اور میری ہی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ ۴۸)

قریش کو وارننگ

اس آیتِ کریمہ میں خبر تو بعض بستیوں کے بارے میں دی جا رہی ہے لیکن روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ انہیں سنا کر یہ بات کہی جا رہی ہے کہ تم پہلی قوم نہیں ہو اور نہ پہلی بستی ہو جس کی طرف اللہ کا رسول آیا ہے اور وہ ان کے انکار اور تمرد کے باعث انہیں عذاب سے ڈرا رہا ہے اور وہ محض اسے ڈراوا سمجھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کتنی بستیاں اس صورتحال سے دوچار ہو چکی ہیں۔ انہوں نے اللہ کے دین کی تکذیب اور اس کے رسول کی دعوت سے انتہا درجہ انکار کے باوجود ایک عرصہ دراز تک انہیں مہلت دی گئی۔ وہ بجائے اس کے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ان کے انکار اور تمرد اور ایذا رسانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ لیکن پھر جب یہ مہلتِ عمل ختم ہوگئی تو اللہ نے انہیں پکڑ لیا اور پھر ان پر وہ عذاب آیا جس نے ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ مکہ کے رہنے والو! اگر تم نے اپنے طرزِ عمل کو بدلنے کی کوشش نہ کی تو اندیشہ ہے کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو جس سے معذب قومیں دوچار ہو چکی ہیں اور اگر اللہ کی کسی مصلحت کے تحت

Marfat.com

دنیا میں تم پر عذاب نہ آئے تو یہ مت سمجھ لینا کہ تم بچ نکلے ہو تمہیں قیامت کے دن بہر حال میرے پاس آنا ہے کیونکہ میری ہی طرف ہر پیدا ہونے والے کو لوٹنا اور اپنے انجام سے دوچار ہونا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ
كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ
اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى
الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ لِّيَجْعَلَ
مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ
قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ
قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾
وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ
النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

Marfat.com

رکوع: ۷۔ (کہہ دیجئے (اے پیغمبر)! اے لوگو! میں تو تمہارے لئے بس ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ۴۹) سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کیلئے مغفرت بھی ہے اور عزت والی روزی بھی۔ ۵۰) اور جو لوگ کوشش کرتے رہے ہماری آیتوں (کی تردید) میں اس خیال سے کہ وہ ہمیں ہرا دیں گے وہی دوزخ والے ہیں۔ ۵۱) ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا (یا اللہ کا حکم پڑھ کر سنایا) تو شیطان نے اس کی راہ میں اڑنگے (شکوک) ڈالے۔ پس اللہ مٹا دیتا ہے جو شیطان دخل اندازی کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بہت دانا ہے۔ ۵۲) یہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ذریعے ڈالے ہوئے وسوسوں کو ان لوگوں کیلئے فتنہ بنائے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں۔ اور بے شک ظالم لوگ مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ ۵۳) نیز اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ وہ لوگ جنہیں علم بخشا گیا ہے اچھی طرح جان لیں کہ یہی آپ کے رب کی جانب سے حق ہے تاکہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کیلئے ان کے دل جھک جائیں اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائے گا۔ ۵۴) اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اس کی طرف سے ہمیشہ شک میں رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آ جائے یا ان پر ایک منحوس دن کا عذاب آ جائے۔ ۵۵) حکمرانی اور سارا اختیار اس دن اللہ ہی کو حاصل ہوگا وہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا تو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔ ۵۶) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہوگا۔ ۵۷)

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۴۹

(کہہ دیجئے (اے پیغمبر)! اے لوگو! میں تو تمہارے لئے بس ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ۴۹)

آنحضرت ﷺ کی حیثیت

مشرکینِ مکہ کے سابقہ انکار اور تغافل کے باعث قرآنِ کریم نے آنحضرت ﷺ کی اصل حیثیت کو واضح فرمایا ہے۔ قریشِ مکہ اور دیگر مشرکین چونکہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھے، اس لئے انہیں آنحضرت ﷺ کی حیثیت کو سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ آپ چونکہ اللہ کے دیئے ہوئے نورِ نبوت سے دیکھ رہے تھے کہ قریش کا کفر اور شرک پر اصرار انہیں بہت برے انجام کی طرف لے جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ اللہ کے عذاب کا نزول بھی ہو سکتا ہے ورنہ قیامت کے بعد جہنم کی ہولناک سزا تو یقینی ہے۔ آپ نہایت ہمدردی اور غمگساری کے باعث انہیں بار بار تنبیہ کرتے اور جب وہ تنبیہ سے بھی اثر قبول نہ کرتے تو پھر انہیں اللہ کی طرف سے آنے والے عذاب سے ڈراتے۔ لیکن قریش اور دیگر مخالفین اپنے عناد اور مخالفت میں اس حد تک اندھے ہو چکے تھے کہ بجائے آپ کی دعوت پر غور کرنے کے مخالفت اور ایذا رسانی میں تیزی پیدا کر دیتے اور عذاب سے ڈرنے کی بجائے بار بار اس کا مطالبہ کرتے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو حکم

Marfat.com

یا جا رہا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اپنی حیثیت واضح کر دیں اور اس وضاحت کیلئے آپ کو جو تعبیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اہلِ عرب کے اسلوب کے عین مطابق ہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی بستی کے رہنے والے یہ محسوس کرتے کہ دشمن کی طرف سے انہیں شب خون کا اندیشہ ہے یا سفر میں ان کا قافلہ جہاں کہیں پڑاؤ ڈالتا، تو کسی قریبی قبیلے کی طرف سے حملے کے اندیشہ سے وہ یہ انتظام کرتے کہ کسی بھی بلند ٹیلے پر ایک یا چند آدمیوں کو نگران مقرر کرتے تا کہ اگر کسی طرف سے وہ کسی خطرے کو محسوس کریں تو فوراً اپنی قوم کو اطلاع دیں۔ چنانچہ ایسے مقرر کردہ نگران کا طریقہ یہ ہوتا کہ جیسے ہی وہ کسی خطرے کو دیکھتا یا کسی حملے کی بو سونگھتا تو اپنے کپڑے پھاڑ کر بالکل برہنہ ہو جاتا اور لوگوں کو حملے کے دفاع کیلئے پکارنا شروع کر دیتا چونکہ ایسا شخص بالکل برہنہ ہو کر ایسا کرتا تھا اس لئے اسے ''نذیرِ عریان'' کہا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو بھی اسی تعبیر کے ذریعے اپنی حیثیت واضح کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن عریان کا لفظ چونکہ غیر مہذب اور ناشائستہ لفظ تھا جسے قرآنِ کریم کی متانت اور آنحضرت ﷺ کی شائستگی کسی طور برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس لئے عریان کو مبین سے بدل دیا گیا۔ لیکن حیثیت کو واضح کرنے کیلئے اس سے بہتر تعبیر شاید اور کوئی ممکن نہ تھی۔ جس طرح قوم کا حقیقی خیر خواہ جس کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر دشمن سے اپنی قوم کی حفاظت کرے اور اگر کوئی خطرہ محسوس کرے تو جان پر کھیل کر اپنی قوم کو اس کی اطلاع دے۔ اسی طرح ایک نبی اور رسول بھی اللہ کی طرف سے ایسے ہی احساس اور ایسی ہی ذمہ داری کے ساتھ مبعوث کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس پر وحی اترتی ہے اور اسے نورِ نبوت و رسالت سے سرفراز کیا جاتا ہے اس لئے جو کچھ وہ دیکھتا اور جانتا ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ پھر اس کے دل میں خلقِ خدا کو عذابِ الٰہی سے بچانے کیلئے جس درجہ کی ہمدردی اور غمگساری ہوتی ہے اس کا گزر بھی کسی اور کے دل میں ممکن نہیں۔

آغازِ نبوت میں بھی آنحضرت ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر نبوت کا اعلان کرنے سے پہلے اپنی اسی حیثیت کو واضح فرمایا تھا۔ آپ نے سب سے پہلے اپنی قوم سے استفسار کیا کہ میں تمہاری نگاہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ کیونکہ جھوٹا شخص اللہ کا نبی نہیں ہو سکتا۔ جب ساری قوم نے آپ کے سچا ہونے کی شہادت دی تب آپ نے فرمایا کہ دیکھو! میں ایک بلند جگہ پر کھڑا ہوں تمہیں بھی دیکھ رہا ہوں اور پہاڑی کے پیچھے کے حالات بھی میرے سامنے ہیں۔ اس کے پیچھے اگر کوئی خطرہ مخفی ہے تو میں اسے دیکھ سکتا ہوں تم نہیں دیکھ سکتے۔ تو کیا تم میری بات پر اعتماد کرو گے؟ میں تم سے اگر یہ کہوں۔

کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر
کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے

اس طرح آپ نے ایک مثال سے اپنی حیثیت کو واضح کیا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی اپنی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ میں تمہارے خطرناک انجام کو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن تم بے خوف ہو کر اس کی طرف بڑھ رہے ہو۔ میں تمہیں اس کی ہولناکی سے بچانا چاہتا ہوں۔ لیکن تم میری ہمدردی اور غمگساری کا مذاق اڑاتے ہو۔ شب و روز میری بے ساختہ دعوت اصلاحِ احوال کیلئے، ہمت سے بڑھ کر مساعی، گالیوں کے جواب میں ہمدردی سے بھرپور نصیحتیں، وحشیانہ اذیتوں کے جواب میں صبر اور عفو و درگزر ان میں سے ایک ایک بات میری حیثیت کو واضح کرنے کیلئے کافی ہے۔ جس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ میں تمہارے لئے عذاب لے کر نہیں آیا بلکہ عذاب سے بچانے کیلئے نذیرِ مبین بن کر آیا ہوں۔ میں دنیوی اور اخروی نقصانات سے تمہیں بچانے کیلئے انذار کر رہا ہوں۔

Marfat.com

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۵۰

(سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کیلئے مغفرت بھی ہے اور عزت والی روزی بھی۔ ۵۰)

ایک کوتاہ فہمی کا ازالہ

آنحضرت ﷺ کی حیثیت نذیرِ مبین کے طور پر بیان کرنے کے بعد ان لوگوں پر انعام کا ذکر کیا جارہا ہے جو ایمان اور عملِ صالح کی دولت سے مشرف ہیں حالانکہ نذیرِ مبین کی حیثیت سے انعام کی بجائے انذار کے کسی پہلو کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا یہ ہماری کوتاہ فہمی ہے ورنہ یہ انعام بھی انذار ہی کا ایک حصہ ہے کیونکہ انذار کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس بات سے کسی کو روکنا مقصود ہو اس کا مخالف پہلو جو اپنے اندر اپیل اور کشش رکھتا ہو اسے ذکر کیا جائے تاکہ اسے محسوس ہو کہ اگر میں نے اپنا طرزِ عمل نہ بدلا تو میں زندگی کے اس حسن سے محروم رہوں گا، جو میرے طرزِ عمل کے مخالف پہلو میں موجود ہے۔ اس طرح سے اس کے قلب ونظر کو ایک ٹھوکر سی لگتی ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میں اپنے مستقبل کی جن بہاروں کو اپنے اندر معمولی سی تبدیلی پیدا کر کے حاصل کر سکتا ہوں۔ میں نے اسے یکسر کیوں چھوڑ رکھا ہے؟

مغفرت اور رزقِ کریم کا مفہوم

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جن لوگوں کے لئے مغفرت اور رزقِ کریم کی نوید سنائی جارہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی اکثریت طبقۂ غربا سے تعلق رکھنے کے باعث ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جنہیں اشرافِ قریش کبھی اپنی مجلسوں میں جگہ دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھنا اور ان کی بات سننا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب وہ اس حال میں ان کے سامنے سے گزرتے کہ کسی کا جوتا ٹوٹا ہوا ہوتا اور کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے تو وہ ان پر پھبتیاں کستے اور مذاق اڑاتے ہوئے کہتے کہ ماشاءاللہ یہ وہ لوگ ہیں جو قیصر وکسریٰ پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ایسے ہی لوگوں کیلئے اس انعام کا ذکر کیا جارہا ہے۔ جس کی قدر وقیمت اور وسعت احاطۂ تصور میں سما نہیں سکتی۔ چنانچہ جب اس طرح کی آیات اشرافِ قریش کے سامنے پڑھی جاتی تھیں انہیں ایک آگ لگ جاتی تھی اور ان کے نخوت اور تکبر کے احساس پر ایک چوٹ لگتی تھی اور اس طرح سے ان کے اندر کی دنیا میں ایک حشر برپا ہو جاتا تھا کہ اگر واقعی ایسا ہو گیا جیسا قرآنِ کریم کہہ رہا ہے تو پھر ان کے سامنے ہماری کیا حیثیت ہوگی۔ چنانچہ اس تصور سے احساس کا ایک شعلہ سا پھوٹتا جو ان کیلئے انذار کا حکم رکھتا تھا۔ شائد اسی لئے انذار کے حوالے سے سب سے پہلے صاحبِ ایمان لوگوں پر جو انعامات ہونے والے ہیں ان کا ذکر کرنا ضروری سمجھا گیا۔

قرآنِ کریم نے جہاں کہیں بھی ایمان کا ذکر کیا ہے۔ جو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان ہے تو ساتھ ہی عملِ صالح کا ذکر ضرور فرمایا۔ اس سے یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ ایمان ایک بیج ہے جس سے اعمالِ صالحہ کی فصل وجود میں آتی ہے یا ایک درخت ہے جس سے اعمالِ صالحہ کے شگوفے پھوٹتے اور اسلامی زندگی کے رسیلے پھل لگتے ہیں۔ لیکن جس ایمان سے کوئی عمل ظہور پذیر نہیں ہوتا اور اس سے اسلامی زندگی کا کوئی شگوفہ نہیں پھوٹتا اور حقوق وفرائض کے احساس کی ٹھنڈی چھاؤں وجود میں نہیں آتی اس ایمان کی حقیقت اور اصلیت میں یقیناً کوئی خرابی ہے۔ اندیشہ ہے کہ ایسا ایمان اللہ کے یہاں مغفرت کا باعث نہیں بن سکے گا۔ جبکہ مغفرت وہ چابی ہے جس سے جنت کے دروازے کھلتے

Marfat.com

ہیں اور فوز و فلاح کا وہ وثیقہ ہے جو جنت میں داخلے کا باعث بن سکتا ہے۔

جن خوش نصیب لوگوں کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں گے انہیں رزقِ کریم سے نوازا جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رزقِ کریم جنت اور جنت کی نعمتوں کی ایک جامع تعبیر ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اہلِ جنت کو ایسی نعمتوں سے نوازا جائے گا جنہیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔ ایسی صدائیں آویزۂ گوش بنیں گی جنہیں کسی کان نے نہیں سنا۔ انبساط اور اہتزار کی وہ دولت نصیب ہوگی جس کا کسی دل میں کبھی گزر نہیں ہوا۔ ایسی تمام نعمتیں جنہیں بیان کرنے کیلئے الفاظ کا دامن تنگ ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے رزقِ کریم کی ایک جامع تعبیر اختیار کی ہے۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٥١﴾

(اور جو لوگ کوشش کرتے رہے ہماری آیتوں (کی تردید) میں اس خیال سے کہ وہ ہمیں ہرا دیں گے وہی دوزخ والے ہیں۔ ۵۱)

معاندین کو مکمل انذار

قریش اور اہلِ مکہ کو مکمل طور پر انذار کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ بھی شب و روز اس کام میں مصروف ہیں کہ وہ اللہ کے دین کی دعوت کو آگے بڑھنے سے روک دیں اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں انہیں اس حد تک ہراساں کر دیں کہ وہ اسلام چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں اور آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے سامنے اللہ کا دین پیش کرنے کیلئے نکلیں تو قدم قدم پر ان کا تعاقب کریں اور ہر شخص کے ذہن میں ان کے بارے میں بدگمانی پیدا کریں اور جب وہ لوگوں کو قرآنِ کریم پڑھ کر سنائیں تو شور مچا دیں تاکہ لوگ قرآنِ کریم کی آواز سننے نہ پائیں اور ان کے پیشِ نظر مقصد صرف یہ ہو کہ وہ اللہ کے دین کی تبلیغ و دعوت کو ناکام کر دیں اور لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ اب اس دعوت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں کیونکہ یہ ہر طرف سے مخالفت کے طوفان میں اس طرح گھر گئی ہے جس سے اس کے بچ نکلنے کے امکانات بہت ہی محدود ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو انذار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو جہنم میں پھینکے جائیں گے۔ یہاں ان کی سرمستیاں ان کی سوچ کی راہ میں حائل ہو گئی ہیں اور وہ اپنے انجام سے متعلق بالکل بے خبر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اے کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ جہنم کی آگ ان کے انتظار میں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٥٢﴾

(ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا (یا اللہ کا حکم پڑھ کر سنایا) تو شیطان نے اس کی راہ میں اڑنگے (شکوک) ڈالے۔ پس اللہ مٹا دیتا ہے جو شیطان دخل اندازی کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بہت دانا ہے۔ ۵۲)

Marfat.com

سعی فی المعاجزۃ کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کو تسلی

گذشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سعی فی المعاجزۃ کا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی قریش اور دیگر اہلِ مکہ کی جانب سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو روکنے کیلئے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا جارہا ہے اور غلط فہمیوں کی جو فصل تیار کی جارہی ہے اور ایمان لانے والوں کو ایمان سے روکنے کیلئے جو مہلک زخم لگائے جارہے ہیں۔ جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو اس حد تک عاجز کردیں کہ وہ اسلام کی دعوت و تبلیغ سے گریز کرنا شروع کردیں یا کم از کم ان میں جو بے پناہ ایمان کا جذبہ دکھائی دیتا ہے، اور جس طرح سے وہ ہر بڑی سے بڑی تکلیف کے سامنے استقامت دکھاتے ہیں اس میں دراڑیں پڑ جائیں۔ اس پوری صورتحال کو سعی فی المعاجزہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معاندین کی ایسی وحشیانہ اور حد درجہ مخالفانہ کارروائیوں سے جو کچھ مسلمانوں پر گزر رہی تھی اور جس طرح تبلیغی کوششیں آگے بڑھنے کیلئے ہر راستے کو مسدود پا رہی تھیں آنحضرت ﷺ یقیناً اس پر پریشان تھے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے ان میں سے کوئی بات بھی نئی نہیں۔ جب بھی ہم نے انسانوں کی اصلاح کیلئے اپنا کوئی نبی یا رسول بھیجا ہے تو شیطانی قوتوں نے کبھی بھی اس کی دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا۔ نہ صرف قدم قدم پر روڑے اٹکائے ہیں بلکہ ہر سیدھی سادی بات اور وحیِ الٰہی کی دل میں اتر جانے والی ہر ہدایت کو غلط فہمیوں کی نذر کیا ہے۔ ایسے ایسے الزامات لگائے اور اتہامات باندھے ہیں کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں ہر طرف اٹھتی ہوئی بدگمانیوں کی دھول نے دماغوں کو مسموم کرکے رکھ دیا ہے۔

تمنّٰی اور امنیۃ کا مفہوم

آیتِ کریمہ میں ''تَمَنّٰی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ صاحبِ اقرب الموارد کے نزدیک اس کے معنی ہیں کسی چیز کی خواہش، ارمان، تمنا یا حوصلہ کرنا۔ یا کسی مقصد کیلئے اپیل یا استمالت کرنا۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت میں آنے والا لفظ ''امنیّۃ'' کا مفہوم ہوگا، خواہش، ارمان، تمنا، حوصلہ اور اپیل۔

صاحبِ لسان کے نزدیک ''تمنّٰی'' کا معنی قرأت کرنا اور پڑھ کر سنانا ہے۔ اور ''امنیۃ'' متلو کے معنی میں ہوگا۔

میری ناقص رائے میں ان دونوں معنی کے لحاظ سے مطلوب، مفہوم، اور مراد میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مفہوم یہ ہے کہ جب بھی کسی پیغمبر نے ان لوگوں کی اصلاح کیلئے جن کی طرف انہیں مبعوث کیا گیا ہے کوئی خواہش کی ہے۔ کوئی تمنا باندھی ہے، کوئی منصوبہ بنایا ہے اور کسی چیز کو ہدف بنا کر شب و روز اس کیلئے سعی کی ہے اور اس بات سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ پیغمبر کی سعی اور کاوش، تمنا اور ارمان اللہ کے دین کے غلبے اور لوگوں کو اللہ کے آستانے پر جھکانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں کو ایمان کی دولت سے بہرہ ور کرنے اور حسنِ عمل کا شوق پیدا کرنے اور اللہ کی رضا کی طلب کو مقصود بنانے کیلئے منصوبے باندھتے اور اسے بروئے کار لانے کیلئے شب و روز محنت و کاوش کرتے ہیں۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے مفہوم اور مراد یہ ہے کہ جب بھی کسی پیغمبر نے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت اور اس کی شریعت کے احکام اور اس کے دین کی اساسی باتوں سے متعلق نازل ہونے والی وحی لوگوں کو پڑھ کر سنائی ہے تو مخالفین نے اس خیال سے غلط فہمیوں کا غبار اڑایا کہ وحیِ الٰہی کو اگر توجہ سے سن لیا گیا اور سنجیدگی سے اس کی طرف دھیان دیا گیا تو یہ ممکن نہیں کہ لوگ اس کے اثرات کو قبول نہ کریں۔ چنانچہ

Marfat.com

دونوں صورتوں میں شیطان نے ہر نبی اور رسول کی تبلیغی مساعی کو ناکام کرنے کیلئے راستے میں مشکلات پیدا کیں اور نازل ہونے والی وحی کے بارے میں غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا ایک طوفان اٹھا دیا۔ آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ کفر کی ہر دور میں یہی ریت رہی ہے اور اہلِ حق کو ہمیشہ ان مشکلات سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ اس لئے آپ ان باتوں سے دل گرفتہ نہ ہوں۔

آنحضرت ﷺ کو تبلیغ ودعوت کے سلسلے میں دونوں طرح کے موانع سے واسطہ پڑا آپ کے بارے میں غلط فہمیوں کا طوفان بھی اٹھایا گیا۔ کبھی آپ کی بشریت کو زیرِ بحث لایا گیا، کبھی آپ کی غربت کو مذاق کا نشانہ بنایا گیا، کبھی آپ پر ایمان لانے والوں کی زبوں حالی کا تمسخر اڑایا گیا۔ کبھی آپ کے لئے گھر سے باہر کی دنیا اس حد تک مخدوش کردی گئی کہ آپ کو تین سال تک شعبِ ابی طالب میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ آپ تبلیغ ودعوت کے سلسلے میں نئے میدان کی تلاش میں طائف تشریف لے گئے تو اہلِ مکہ کے اٹھائے ہوئے سوالوں نے وہاں بھی آپ کا تعاقب کیا اور شاید اہلِ مکہ کے ایماء پر ان لوگوں نے شرافت کی تمام قدروں اور قرابت کی تمام نزاکتوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ آپ وہاں سے واپس تشریف لائے تو ایک کافر لیکن وضع دار سردار کی پناہ کے بغیر مکے مین داخل نہ ہو سکے۔

جہاں تک آپ پر نازل ہونے والی کتاب اور اس کے ارشادات کا تعلق ہے جب بھی آپ نے لوگوں کے سامنے انہیں پڑھ کر سنایا تو اشرارِ قریش نے اس میں قسم قسم کے سوالات اٹھائے۔ غلط فہمیاں پیدا کیں اور سیدھے سادے احکام کو الجھانے کی کوشش کی۔ قرآنِ کریم نے کفار کی اس روش کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اٹھائے ہوئے سوالوں میں سے ایک مثال بھی ذکر فرمائی۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ○ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ○

(۳۱-۳۳)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے دشمن بنائے اور اطمینان رکھو، تمہارا رب رہنمائی اور مدد کیلئے کافی ہے۔ اور یہ کافر اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اس شخص پر یہ قرآن آخر بیک دفعہ کیوں نہیں نازل کر دیا گیا! ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ اس بارِ گراں کے لئے تمہارے دل کو اس کے ذریعہ سے اچھی طرح مضبوط کر دیں اور ہم نے اس کو اہتمام کے ساتھ بالتدریج اتارا اور یہ جو شگوفہ بھی چھوڑیں گے تو ہم اس کے جواب میں حق کو واضح اور اس کی بہترین توجیہ کر دیں گے۔

اسی طرح سورۃ الانعام میں ارشاد فرمایا گیا ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ (اسی طرح ہم نے ہر نبی کیلئے سرکش انسانوں اور جنوں کو دشمن بنا دیا اور وہ لوگوں کو دھوکہ دی

Marfat.com

کیلئے ایسی باتیں سکھاتے ہیں جو بظاہر بڑی دلکش ہوتی ہیں)

اور ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ (شیطان اپنے چیلوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتے ہیں تا کہ وہ تمہارے ساتھ بحث مباحثہ شروع کر دیں۔)

ان آیاتِ کریمہ میں غور فرمائیے! ایک تو حق کے مخالفین کے رویے کو ذکر کیا گیا ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں آئی اور یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ جن وانس کے شیاطین ہمیشہ اہلِ کفر کی مدد کرتے رہے ہیں۔ جس طرح ان کا آپس میں رابطہ رہا ہے اور باہمی مشاورت سے وہ جس طرح حق کی مخالفت کرتے رہے ہیں اسی طرح وہ حق اور اہلِ حق کے بارے میں ہر طرح کی غلط فہمی اور الجھاؤ میں ڈالنے والے سوالات کا طومار بھی باندھتے رہے ہیں۔ پھر اس کی ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ پر قرآنِ پاک کا نزول ہو رہا تھا کبھی ایک سورۃ، کبھی ایک رکوع اور کبھی چند آیتیں اور آپ ہر نازل ہونے والی وحی کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے تو شیاطین نے کفار کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تم لوگوں کو یہ بات سمجھاؤ کہ اگر قرآنِ کریم اللہ کی طرف سے نازل ہو رہا ہوتا تو اس کیلئے کیا مشکل تھی کہ وہ ایک ہی دفعہ پورا قرآنِ کریم نازل کر دیتا۔ آخر اس نے تورات اور انجیل بھی تو یکبارگی نازل کی تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) کسی کی مدد سے جتنی آیات تیار کر لیتے ہیں وہ لوگوں کو پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔ اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ قرآن کی آیتیں ہیں جو مجھ پر اللہ نے نازل کی ہیں۔ ایک مخالف یا خالی الذہن کیلئے اس طرح کا اعتراض قرآنِ کریم اور آپ کی نبوت کے حوالے سے بدگمانی پیدا کرنے کیلئے کافی تھا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ احکام کا نزول شروع ہوا تو ہر حکم کے بارے میں کفار نے عجیب وغریب سوالات اٹھائے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی "حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ" "تم پر مردار حرام کئے گئے"۔ تو مشرکین نے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور لوگوں سے کہنے لگے کہ ذرا غور کیجئے کہ جس جانور کو یہ لوگ خود مارتے یعنی ذبح کرتے ہیں وہ تو ان کے نزدیک حلال ہے اور جسے اللہ نے مارا ہے اسے یہ حرام اور پلید سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جب سود کی حرمت نازل ہوئی تو انہیں پھر سوال اٹھانے کا موقع ملا کہ بیع ہو یا سود، دونوں سے مقصود نفع حاصل کرنا ہے۔ عجیب بات ہے کہ نفع حاصل کرنے کیلئے بیع حلال ہے اور سود حرام ہے۔ آخر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے جب یہ کہا کہ تم بھی اور وہ بھی جن کی تم پوجا کرتے ہو جہنم کا ایندھن بنو گے۔ تو ان کے ذہین لوگوں نے بات اڑائی کہ دنیا میں جن کی پوجا کی گئی ہے ان میں حضرت مسیح اور حضرت عزیر علیہم السلام بھی ہیں۔ حضرت مسیح کو عیسائیوں نے اللہ کا بیٹا قرار دیا اور یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ٹھہرایا۔ تو کیا یہ دونوں مقدس نفوس لوگوں کے پوجا کرنے کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے؟ مختصر یہ کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو ناکام کرنے کیلئے انہوں نے دونوں طرح کا رویہ اختیار کیا مخالفت اور معاندت سے مشکلات بھی پیدا کیں اور علمی اور سرسری اشتباہات بھی اٹھائے۔ اعتراضات بھی کئے اور غلط فہمیوں کا غبار بھی اڑایا۔

اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے کہ شیاطینِ جن وانس کا تو ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے اس لئے وہ آپ کے ساتھ بھی یہی کچھ کر رہے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی بھی ایک سنت ہے کہ شیطانی قوتیں اللہ کے دین کی دعوت کو ناکام کرنے کیلئے جو کچھ کرتی ہیں اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات اور اپنے احکام کو مستحکم کر دیتا ہے۔ اشتباہات کی وضاحت کرتا ہے۔ اعتراضات کا جواب دیتا ہے۔ متشابہات کو محکمات کی مدد سے آسان کرتا اور واضح کرتا ہے۔ اپنی حکمتِ کاملہ اور دلائل قاہرہ سے شک وارتیاب کے کانٹوں کو صاف کر دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ آنحضرت ﷺ کی شخصیت کی دلآویزی اور قرآنِ کریم کی فصاحت وبلاغت اور معجز بیانی اور آنحضرت ﷺ سے ظہور پذیر ہونے والے معجزات اور وحشیانہ ایذاؤں کے مقابلے میں بے پناہ استقامت آہستہ آہستہ دیکھنے والوں کے دلوں

Marfat.com

کے بند دروازوں کو کھول دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت حق وباطل کے تصادم میں حق کی مؤید ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اہلِ باطل شکست و نامرادی سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ جو کچھ ہوتا ہے یہ سب کچھ اللہ کے علم وحکمت پر مبنی ہے۔ اہلِ حق کا اثاثہ وہ اعتماد ہے جو اللہ کے علم وحکمت پر ہوتا ہے۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۙ﴿۵۳﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

(یہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ذریعے ڈالے ہوئے وسوسوں کو ان لوگوں کیلئے فتنہ بنائے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں۔ اور بے شک ظالم لوگ مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ ۵۳)
نیز اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ وہ لوگ جنہیں علم بخشا گیا ہے اچھی طرح جان لیں کہ یہی آپ کے رب کی جانب سے حق ہے تاکہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کیلئے ان کے دل جھک جائیں اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائے گا۔ ۵۴)

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر حق کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو شیطان اپنے لاؤلشکر سمیت اس دعوت کو ناکام کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ لوگوں کے دلوں میں مختلف قسم کے اعتراضات پیدا کر کے فتنہ انگیزی کا سامان کرتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ صورتحال از خود پیدا نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسانوں کی ہدایت کیلئے نبوت ورسالت کا سلسلہ چلایا ہے اسی طرح شیطانی قوتوں کو بھی حق کا راستہ روکنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے وہ انسانوں کو ایک آزمائش میں ڈالے اور پھر یہ دیکھے کہ اس آزمائش میں کون پورا اترتا ہے؟ ایک طرف اللہ کا رسول اس پر اترنے والی کتاب، اور اس کی تبلیغ و دعوت اپنا کام کرتی ہے اور دوسری طرف جن وانس سے تعلق رکھنے والے شیاطین شیطانی اثرات سے متأثر ہو کر اپنا کام کرتے ہیں۔ پیغمبر جن لوگوں کی طرف مبعوث ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں عقل شعور اور امتیاز کی دولت دے کر فیصلہ کرنے کا موقع دیتا ہے کہ دونوں طرف کی کاوشوں کو دیکھو اور پھر حق کو قبول کرنے کا فیصلہ کرو۔ چنانچہ اس آزمائش میں وہ لوگ ناکام ہو جاتے ہیں جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہوتا ہے یا مسلسل حق کی مخالفت کی وجہ سے ان کے دل سخت ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان سخت دلوں کے حوالے سے قریش اور یہود کے کٹر معاندین کی طرف اشارہ ہو جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں ایک اتحاد قائم کر چکے تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کی مخالفت کے باعث ان کی فوراً گرفت نہیں فرماتا اس کا رسول مسلسل تبلیغ ودعوت سے انہیں حق کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ان میں جو لوگ ظلم کی راہ پر چل نکلتے ہیں وہ اتنا دور نکل جاتے ہیں کہ ان کی واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔
اور دوسری آیت میں یہ فرمایا گیا کہ جن لوگوں کو علم آشنا بنایا گیا ہے وہ جہالت سے دل لگانے کی بجائے علمِ الٰہی سے دل لگاتے ہیں۔

Marfat.com

اور پیغمبر کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ حق و باطل کی اس کشمکش میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وحیِ الٰہی کا نور اور پیغمبر کا بے عیب کردار اور پھر صاحبِ ایمان لوگوں کی اس پر استقامت ایک ایسی روشنی ہے جس سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔چنانچہ وہ اس حق پر ایمان لاتے ہیں اور اگر پہلے سے ایمان لا چکے ہیں تو ان کے ایمان میں پختگی آجاتی ہے اور ان کے دلوں میں سختی کی بجائے نرمی اور عاجزی پیدا ہو جاتی ہے۔جب یہ لوگ عاجزانہ اللہ کی طرف بڑھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنی طرف بڑھنے والوں کی دستگیری فرماتا ہے وہ اصحابِ کہف کی صورت میں چند نوجوان ہی کیوں نہ ہوں جب وہ حالات کے بالکل برعکس اللہ کی توحید کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتے ہیں اور ان کے دل کو مضبوط کر دیتے ہیں اور انہیں حوصلہ مندی کی اس دولت سے بہرہ ور کر دیتے ہیں جس کے بعد دلوں میں کمزوری کبھی داخل نہیں ہوتی بلکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کا وہ اس طرح ہاتھ تھامتے ہیں کہ انہیں منزلِ مقصود تک پہنچا کر چھوڑتے ہیں۔صراطِ مستقیم سے مراد وہ منزل ہے جو ایمان کی انتہا ہے اور ہدایت سے مراد ایصال الی المطلوب ہے جو دنیا میں یقین و ایمان کا آخری مرحلہ ہے اور جس کا نتیجہ آخرت میں جنت ہے۔

یہ ہے ان آیات کا وہ مفہوم جو احقر نے اس کے سیاق و سباق اور ائمہ تفسیر کی نگارشات اور اہلِ لغت کی مدد سے سمجھا ہے۔اس کو سامنے رکھتے ہوئے نہ کسی شانِ نزول کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ اس روایت کا سہارا لینا پڑتا ہے جس کی حیثیت القاءِ شیطانی کے سوا کچھ نہیں اور جسے ہمارے ائمہ تفسیر کی اکثریت نے رد کر دیا ہے۔البتہ! ان آیات کا ایک مفہوم مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے فوائد القرآن میں سپردِ قلم کیا ہے جو ہر قاری کی توجہ کے لائق ہے میں اسے یہاں نقل کر رہا ہوں۔

> احقر کے نزدیک بہترین اور سہل ترین تفسیر وہ ہے جس کی مختصر اصل سلف کے منقول ہے یعنی تمنی کو بمعنی قرأت وتلاوت یا تحدیث کے اور ''امنیة'' کو بمعنی متلو حدیث کے لیا جائے۔مطلب یہ ہے کہ قدیم سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کوئی نبی یا رسول کوئی بات بیان کرتا یا اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے تو شیطان اس بیان کی ہوئی بات یا آیت میں طرح طرح کے شبہات ڈال دیتا ہے۔یعنی بعض باتوں کے متعلق بہت لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے شکوک وشبہات پیدا کر دیتا ہے۔مثلاً نبی نے آیت ''حُرِّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ'' الخ پڑھ کر سنائی،شیطان نے شبہ ڈالا کہ دیکھو اپنا مارا ہوا تو حلال اور اللہ کا مارا ہوا حرام کہتے ہیں۔یا آپ نے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ پڑھا۔اس نے شبہ ڈالا کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں حضرت مسیح وعزیر اور ملائکۃ اللہ بھی شامل ہیں۔یا آپ نے حضرت مسیح کے متعلق پڑھا كَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ شیطان نے سمجھایا کہ اس سے حضرتِ مسیح کی ابنیت والوہیت ثابت ہوتی ہے۔اس القائے شیطانی کے ابطال ورد میں پیغمبر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی وہ آیات سناتے ہیں جو بالکل صاف اور محکم ہوں اور ایسی پکی باتیں بتلاتے ہیں جن کو سن کر شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہ رہے۔گویا متشابہات کی ظاہری سطح کو لے کر شیطان جو اغوا کرتا ہے آیاتِ محکمات اس کی جڑ کاٹ دیتی ہیں۔جنہیں سن کر تمام شکوک وشبہات ایک دم کافور ہو جاتے ہیں۔یہ دو قسم کی آیتیں کیوں اتاری جاتی ہیں؟ شیطان کو اتنی وسوسہ اندازی اور تصرف کا موقعہ کیوں دیا جاتا ہے؟ اور آیات کا جو احکام بعد کو کیا جاتا ہے ابتدا ہی سے کیوں نہیں کیا جاتا؟ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کی غیر محدود علم وحکمت سے ناشی ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو علماً وعملاً دار امتحان بنایا ہے،چنانچہ اس قسم کی کارروائی میں بندوں کی جانچ ہے

Marfat.com

کہ کون شخص اپنے دل کی بیماری یا سختی کی وجہ سے پادر ہوا شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور کون سمجھ دار آدمی اپنے علم وتحقیق کی حکمت سے ایمان واخبات کے مقامِ بلند پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی نیک نیتی اور ایمانداری سے سمجھنا چاہے تو اللہ تعالیٰ دستگیری فرما کر اس کو سیدھی راہ پر قائم فرما دیتے ہیں۔ رہے منکرین ومتشککین ان کو قیامت تک اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا ہر چہ گیرد علتی علت شود

ہماری اس تقریر میں دور تک کئی آیتوں کا مطلب بیان ہوگیا۔ سمجھ دار آدمی اس کے اجزا کو آیات کے اجزا پر بے تکلف منطبق کرسکتا ہے۔ یہ آیات جیسا کہ ہم نے سورۃ آلِ عمران کے شروع میں بیان کیا تھا هُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ اٰیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ سے بہت مشابہ ہیں۔ چنانچہ اِلَّآاِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ میں متشابہات کا اور ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ میں محکمات کا ذکر ہوا۔ اور لِیَجْعَلَ مَایُلْقِی الشَّیْطٰنُ فِتْنَةً میں زائغین کی دو قسمیں مذکور ہوئیں۔ جن میں اَلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کا کام ابتغاء تاویل اور اَلْقَاسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ کی غرض ابتغاء فتنہ ہے۔ آگے لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الخ کو آیۃ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ الخ کی جگہ سمجھو اور وہاں جو دعا رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَاِذْهَدَیْتَنَا سے کی تھی یہاں اس کی اجابت کا ذکر اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ میں کیا گیا ہے۔ اور رَبَّنَا اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ کے مناسب وَلَایَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ اِلٰی قَوْلِهٖ یَحْکُمُ بَیْنَهُمْ ہوئی (تنبیہ) آیت حاضرہ کے تحت میں مفسرین نے جو قصہ ''غرانیق'' کا ذکر کیا ہے اس پر بحث کا یہاں موقع نہیں۔ شاید سورۃ النجم میں کچھ لکھنے کی نوبت آئے۔ ہم نے شرح صحیح مسلم میں بہت بسط سے اس پر کلام کیا ہے۔ بہر حال آیت کا مطلب سلف کی تفسیر کے موافق بالکل صاف ہے گویا یہ تفصیل اس کی ہوئی جو اوپر وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ میں ابطال آیات اللہ کی سعی کا ذکر تھا۔

وَلَایَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْیَاْتِیَهُمْ عَذَابُ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴿۵۵﴾

(اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اس کی طرف سے ہمیشہ شک میں رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آجائے یا ان پر ایک منحوس دن کا عذاب آجائے۔ ۵۵)

آنحضرت ﷺ کیلئے مزید تسلی

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو مزید تسلی دی گئی ہے کہ آپ اشرافِ قریش یعنی ان بڑے بڑے کافروں کے بارے میں جو شب وروز آپ کی مخالفت اور معاندت میں مشغول رہتے ہیں اور آپ کی کوئی نصیحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتی، پریشان اور دل گرفتہ نہ ہوں۔ نصیحت حاصل کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ آدمی نصیحت کی ضرورت محسوس کرے۔ سنجیدگی سے بات کو سنے اور کم از کم اتنی بات کو قبول کرلے کہ جو کچھ پیغمبر کی طرف سے کہا جا رہا ہے عین ممکن ہے کہ وہ حق اور سچ ہو اور ہماری دنیا اور عقبیٰ کا دارومدار اس کے قبول کرنے پر ہو۔ اس صورت میں

Marfat.com

امید کی جاسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہمدردی اور غمگساری میں ڈوبی ہوئی نصیحتیں اور ان کی ہدایت کیلئے انتہائی اضطراب ان کی طبیعتوں پر اثرانداز ہوسکے۔لیکن وہ جب تک اس معمولی بات کو بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے اور ان کی غیر سنجیدگی کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے عذاب اور قیامت کو بھی مذاق سمجھ رکھا ہے تو ایسے لوگ کبھی حق کے قریب نہیں آسکتے۔ان پر آپ ہزار محنت کریں وہ اپنے شک وارتیاب کی دنیا سے کبھی باہر نہیں نکلیں گے۔وہ اپنے کفر وشرک پر اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک اچانک قیامت نہیں آدھمکتی اور یا اللہ کی طرف سے عذاب نہیں آجاتا۔عذاب کی ہولناکی یا قیامت کی ناقابلِ بیان کیفیت کو دیکھ کر وہ یقیناً واویلا کریں گے کہ ہائے ہماری شامت اور بدنصیبی کہ ہم نے آنحضرت ﷺ کی دعوت پر کان دھرنے کی زحمت نہ کی وہ جو کچھ کہتے تھے بالکل صحیح تھا آج اس کی صداقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس وقت کا اعتراف ان کے کسی کام نہیں آئے گا کیونکہ عذاب تباہی کا فیصلہ بن کر آتا ہے اور قیامت دارالجزا ہے جو عمل کے ہر امکان کو ختم کردیتی ہے۔

عقیم کا مفہوم

عذاب کی شدت اور گیرائی کو واضح کرنے کیلئے، جس دن عذاب آئے گا، اس دن کی صفت ''عقیم'' لائی گئی ہے۔عقیم اس کو کہتے ہیں جو اولاد کے قابل نہ ہو اور وہ دن جس کے بعد رات نہ آئے اور نہ اس کے بعد کوئی نیا دن طلوع ہو تو اس کو بھی اس لحاظ سے ''عقیم'' کہتے ہیں۔ جب کسی قوم پر تباہی نازل ہوتی ہے تو اس کی زندگی کا وہ ایسا دن ہوتا ہے جس کے بعد نہ اس کیلئے کوئی رات آتی ہے اور نہ دن طلوع ہوتا ہے۔نہ اسے توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور نہ اس کا ایمان کام آتا ہے۔گویا اسے ہر خیر سے محروم کردیا جاتا ہے۔اس لحاظ سے اس کی زندگی عقیم ہوکر رہ جاتی ہے۔اس لئے ضحاک نے کہا ''عذاب یوم لالیلة له وهو یوم القیامة'' ضحاک اور بعض دیگر مفسرین کے نزدیک اس سے قیامت کا دن مراد ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی رات نہیں آئے گی۔لیکن جس قوم پر عذاب آتا ہے اس کا وہ دن بھی عقیم ہوتا ہے۔جس میں عذاب نازل ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد اس قوم پر کوئی رات نہیں آتی اور وہ قوم اس لحاظ سے عقیم ہوتی ہے کہ اس سے کسی نئے عمل کا ظہور نہیں ہوتا اور وہ کسی کارِ خیر کو انجام نہیں دے سکتی۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

(حکمرانی اور سارا اختیار اس دن اللہ ہی کو حاصل ہوگا وہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا تو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔ ۵۶) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہوگا۔ ۵۷)

کفار کیلئے وعید اور مسلمانوں کو تسلی

اس آیتِ کریمہ میں روئے سخن اشرارِ قریش کی طرف ہے وہ شب روز قیامت کا مطالبہ اس خیال سے کررہے ہیں کہ اولاً تو قیامت کے آنے کا امکان کوئی نہیں اور اگر ایسا ہو ہی گیا تو پھر ہمارے وہ شرکاء جنہیں ہم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے وہ ہماری شفاعت کریں گے اور اللہ

Marfat.com

کے عذاب سے ہمیں بچالیں گے۔ان سے کہا جارہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قیامت کے دن مکمل طور پر اختیار اور حکمرانی اللہ کیلئے ہوگی۔ دنیا کے بڑے سے بڑے شہنشاہ اور ڈکٹیٹرز اس روز دم نہیں مار سکیں گے۔جو لوگ یہاں اپنے آپ کو جہاں پناہ کہلاتے تھے انہیں وہاں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی اور جنہیں جہانگیر اور عالمگیر ہونے کا دعویٰ تھا وہ اپنے پسینے میں ڈوبے ہوئے نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے۔

حقیقت میں تو آج بھی ساری کائنات پر اللہ ہی کی حکومت ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین پر بسنے والوں کو بہت کچھ رخصتیں دے رکھی ہیں یہ دنیا جس طرح ایک مومن کا گہوارہ ہے اسی طرح کافر کی بھی پناہ گاہ ہے۔لیکن قیامت کے دن ہر طرح کا اقتدار اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔پوچھا جائے گا: لِمَنِ الْمُلْکُ الیوم آج کس کی حکومت ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا جائے گا: لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّار "ایک اللہ کے لئے جو قہار ہے" اس روز کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔جنہیں اللہ کا شریک بنایا گیا ہے وہ شریک بنانے والوں سے برأت کا اظہار کریں گے۔وہ دن انصاف کا دن ہوگا۔ایمان وعمل کا سکہ چلے گا۔جو لوگ انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں بھی اللہ کے رسول پر ایمان لائے اور جنہوں نے ہر طرح کی ایذارسانیوں میں عملِ صالح کی دولت کمائی، وہ نعمتوں کے باغات میں ٹھہرائے جائیں گے۔جہاں انہیں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے ان کی خواہش کا سفر ختم ہو جائے گا اللہ کی نعمتوں کا سرمایہ ختم ہونے میں نہیں آئے گا۔کفر اور شرک اپنے بدترین انجام سے دوچار ہوگا، آج قریش کے بڑے لوگ جو بدترین استکبار کا شکار ہیں اور اپنے آپ کو خدا اور رسول کے پیش کردہ حق سے بالاتر سمجھتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کی غربت کا مذاق اڑاتے ہیں انہیں قیامت کے روز ایسے عذاب کا شکار ہونا پڑے گا جو انہیں رسوا کر کے رکھ دے گا کیونکہ ان کے کفر اور شرک کی سزا انہیں عذاب کی شکل میں ملے گی۔لیکن ان کے استکبار کا صلہ رسوائی کی صورت میں ان کا مقدر بنے گا۔جس تعذیب میں توہین وتذلیل شامل ہو جائے اس کی سنگینی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا
لَیَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۵۸﴾
لَیُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا یَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ ﴿۵۹﴾
ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِیَ عَلَیْهِ
لَیَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ
الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ
بَصِیْرٌ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ

Marfat.com

دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ
اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۡ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿٦٣﴾ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ
وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٦٤﴾

رکوع: ۸۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کر دیئے گئے یا طبعی طور پر فوت ہوئے تو اللہ ان کو اپنے رزقِ حسن سے نوازے گا اور بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ ۵۸) وہ انہیں ایسی جگہ داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے بڑا بردبار ہے۔ ۵۹) یہ بات یاد رکھو! اور جس نے ویسا ہی بدلہ دیا جیسا کہ اس کے ساتھ کیا گیا ہے پھر اس پر زیادتی کی گئی تو اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا، بے شک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا بہت بخشنے والا ہے۔ ۶۰) یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن میں رات کو داخل کرتا ہے اور بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۶۱) اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے اور جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں وہ سراسر باطل ہیں اور بے شک اللہ ہی ہے جو سب سے بلند اور سب سے بڑا ہے۔ ۶۲) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں سے پانی برساتا ہے تو زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا ہی باریک بین اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۶۳) اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور بے شک اللہ ہی ہے جو بے نیاز اور سزاوارِ حمد ہے۔ ۶۴)

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٥٨﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿٥٩﴾

(اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کر دیئے گئے یا طبعی طور پر فوت ہوئے تو اللہ ان کو اپنے رزقِ حسن سے نوازے گا اور بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ ۵۸) وہ انہیں ایسی جگہ داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے بڑا بردبار ہے۔ ۵۹)

راہِ ہجرت میں اول قدم بھی منزل کا حکم رکھتا ہے

مکہ میں مسلمان جن اندوہناک حالات سے گزر رہے تھے اس کے پیشِ نظر آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مسلمانوں کو اجازت دے دی تھی کہ تم اپنے ایمان اور جان کی سلامتی کیلئے اگر ہجرت کر سکتے ہو تو ہجرت کر جاؤ چنانچہ اسی اجازت کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے

Marfat.com

بہت بڑی تعداد میں حبشہ کی طرف ہجرت کی اسی طرح مختلف قبائل اور مختلف علاقوں میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کسی کو اسلام قبول کرنے کی ہمت دیتا تھا تو وہاں کی سرزمین اسے برداشت کرنے سے انکار کر دیتی تھی اور ان کے اپنی بھائی بند جو کل تک ان کے دست وبازو اور ہمدرد وغمگسار تھے ایمان لانے کے بعد ان کے لئے بدترین دشمن ثابت ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ بھی اپنی جان اور ایمان کی سلامتی کیلئے کسی نہ کسی طرف ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ ہجرت کوئی آسان کام نہ تھا اپنا وطن، اپنا گھر، اپنے اعزہ واقربا اور اس سرزمین کو چھوڑنا جہاں زندگی کی بیشتر بہاریں گزری ہوں زندگی کا سب سے مشکل کام تھا۔ اور مزید یہ بات بھی کہ کوئی ایسی جائے پناہ بھی نہ تھی جہاں ہجرت کرنے والے یہ سوچ کر جاتے کہ وہاں زندگی کی ساری سہولتیں میسر ہوں گی کچھ خبر نہیں کہ وہاں کیسے حالات سے واسطہ پڑے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بات حقیقت بنتی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کیلئے ایک ایسے مرکز کی تلاش جہاں وہ اسلامی زندگی گزار سکیں اور اس مرکز کی طرف ہجرت تاکہ امت کی شیرازہ بندی ہو سکے، ایک ناگزیر اسلامی اور ایمانی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کی حوصلہ افزائی اور اجر وثواب کے حوالے سے اس آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور یا آئندہ کریں گے اور پھر اس بات کا بھی امکان ہے کہ دشمنانِ دین انہیں راستے ہی میں قتل کر دیں اور یا وہ سفر کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے طبعی موت سے دوچار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کا ان کے لئے وعدہ ہے کہ وہ انہیں رزقِ حسن سے نوازیں گے جہاں تک اللہ کے راستے میں قتل ہو جانے کا تعلق ہے وہ تو یقیناً شہادت ہے اور شہید کیلئے اللہ نے بے پایاں انعامات رکھے ہیں۔ لیکن ہجرت کے سفر کی عظمت کا کیا کہنا کہ اس میں آنے والی طبعی موت کو بھی شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے وطن سے ہجرت کا ارادہ کر کے نکلتا ہے چاہے وہ دارالہجرت نہ پہنچ سکے، راستے ہی میں اسے موت آجائے یا وطن سے نکلتے ہی اللہ کو پیارا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے ہی قدم کو منزل قرار دیتے ہوئے اسے ان تمام انعامات سے نوازے گا جو دارالہجرت تک پہنچنے والوں کو عطا فرمائی جائیں گی۔

رزقِ حسن سے مراد؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رزقِ حسن سے مراد وہ برزخی رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سورہ آلِ عمران میں شہدا کے حوالے سے ذکر فرمایا ہے۔ **بل احیاء عند ربھم یرزقون** ’’کہ اللہ کے راستے میں شہید ہونے والے مردہ نہیں زندہ ہیں اور وہ اپنے رب کے پاس رزق دیئے جا رہے ہیں‘‘۔ صاحبِ روح المعانی نے بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرمایا: (**والمراد به عندالبعض مایکون للشهداء فی البرزخ من الرزق**) برزخ میں دیئے جانے والے اس رزق کو رزقِ حسن کہہ کر درحقیقت ان بے پایاں انعامات کو ایک جامع تعبیر دی گئی ہے، جس کا ذکر بعض احادیث میں کیا گیا ہے۔

مہاجرین کیلئے عظیم بشارت

اور پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں ایسی جگہ داخل فرمائے گا جسے دیکھ کر وہ نہال ہو جائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے اس سے مراد جنت ہے، چونکہ اس میں انہیں وہ نعمتیں ملیں گی جنہیں نہ آج تک کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان نے اس کا تصور کیا۔ ہجرت کرنے والوں نے چونکہ اللہ کی خاطر اپنا گھر اور وطن چھوڑا تھا اللہ نے اس کے صلے میں ان کو وہ گھر عطا فرمایا جسے ’’جنت‘‘ کہا گیا ہے۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں پروردگار نے اپنی دو صفات کا ذکر فرمایا ’’علیم اور حلیم‘‘۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی خاطر

Marfat.com

دشمنانِ دین کے ہاتھوں جو اذیتیں جھیل رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ آپ کی قربانیوں کو بھی دیکھتا ہے اور ادائے حق کی ستم رانیوں کو بھی جانتا ہے۔ آپ کا ایک ایک زخم اور ایک ایک صعوبت بے پناہ اجر وثواب میں تولی جائے گی اور دشمن رسوا کن عذاب کا شکار ہوگا۔

حلیم کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تمہاری تکلیفوں کو دیکھتے ہوئے ہونا تو یہ چاہئے کہ ان بدبختوں کو فوراً عذاب کی نذر کر دیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے حلم اور بردباری کی وجہ سے انہیں مہلت دے رہا ہے اور تمہارے لئے زیادہ سے زیادہ اجر وثواب کا استحقاق پیدا کر رہا ہے چونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب لوگوں کو ان مصائب پر جو اللہ کے راستے میں پیش آئے اجر وثواب ملے گا تو ہر شخص تمنا کرے گا کہ کاش! اللہ کی خاطر میری کھال قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی اور میں آج اس کا اجر وثواب پاتا۔ البتہ! دشمنانِ دین اس بات کو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلتِ عمل اصلاحِ احوال کیلئے ہے اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر یاد رکھو اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۞٦٠

(یہ بات یاد رکھو! اور جس نے ویسا ہی بدلہ دیا جیسا کہ اس کے ساتھ کیا گیا ہے پھر اس پر زیادتی کی گئی تو اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا، بے شک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا بہت بخشنے والا ہے۔ ٦٠)

ایک اہم اعلان

ذٰلِكَ: پورے جملے کا قائم مقام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے اسے اچھی طرح سمجھ لو اور پلے باندھ لو۔ یہاں بھی اسی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اس سے پہلے کی آیتوں میں مہاجرین فی سبیل اللہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی نوازشات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ گویا یہ تأثر دیا گیا ہے کہ جنہیں تم لوگ نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو اور انہیں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے باعث اس قدر اذیت دے رہے ہو کہ ان کا اپنے وطن میں رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اپنے ایمان اور جان ومال کی حفاظت کیلئے ہجرت کر جائیں۔ وہ تمہاری نگاہوں میں چاہے کیسے ہی بے یار ومددگار ہوں لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی بارگاہ میں وہی بار پانے کے قابل ہیں اور اللہ کی عنایات اور نوازشات انہیں پر نچھاور ہوتی ہیں۔ ان کے اس مقام ومرتبہ اور اللہ کے یہاں ان کے تقرب کو جان لینے کے بعد تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تم نے ان پر جو بے شمار مصائب توڑے ہیں اور انہیں نہایت گہرے زخم لگائے ہیں اگر ہجرت کے سفر کے بعد کہیں ان کے زخم ٹیس دینے لگیں اور انہوں نے تم سے مظالم کے انتقام کے سلسلے میں کوئی اقدام کر ڈالا اور وہ اقدام بالکل اسی سطح پر رہا جس سطح کے تم نے انہیں دکھ پہنچائے تھے تو اللہ ان سے جواب طلبی نہیں کریں گے کیونکہ انتقام لینا ان کا حق ہے۔ لیکن تم نے یہ دیکھ کر کہ یہ گرے پڑے لوگ ہمارے منہ آنے کی جرأت کرنے لگے ہیں اور ہمیں سے پنجہ لڑانے کی جسارت کر رہے ہیں۔ تو انہیں ہم ایسی مار ماریں اور ایسی سزا دیں کہ دوبارہ اس جسارت کا نام لینے کی بھی جرأت نہ کریں۔ تو یاد رکھو! وہ بے یار ومددگار لوگ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی پشت پر ہے، تم اچھی طرح یہ بات سن لو وہ ان کی ضرور بالضرور مدد کرے گا۔

Marfat.com

بعض اہلِ علم کا خیال ہے اور یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ ہجرت کے وقت نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد مسلمان ہجرت کر کے جب مدینہ منورہ پہنچ گئے تو اسی بشارت کو آیت نمبر ۳۹ اور ۴۰ میں مزید کھول دیا گیا بلکہ پروردگار نے آیت نمبر ۳۹ میں ان کی مدافعت کرنے کو اپنی ذمہ داری بنا لیا۔ چنانچہ بعد کے حالات اس بات کے شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی افرادی قوت اور اسلحی صلاحیت کم ہونے کے باوجود ہر میدان میں ان کی مدد فرمائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سالوں میں پورا جزیرۂ عرب اسلام کی آغوش میں آگیا۔

ایک اسلوب

وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ: ''اور جس نے ویسا ہی بدلہ دیا جیسا اس کے ساتھ کیا گیا''۔ اس میں ملتے جلتے الفاظ صنعتِ تجانس اور مماثلت کے اسلوب پر ہیں اور یہ اسلوب عربی زبان میں عام ہے۔ جسے قرآنِ کریم نے کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا حالانکہ برائی کا بدلہ برائی نہیں ہوتا بلکہ انصاف ہوتا ہے۔ لیکن یہاں مماثلت کے اسلوب سے کام لیا گیا ہے جیسے عرب شاعر کہتا ہے۔ دِنّا ھُم کَمَا دَانُوا

عفو غفور کے حوالے سے ایک اہم ہدایت

اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ: ''بے شک اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بہت بخشنے والا ہے''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو کسی حد تک انتقام لینے کی اجازت دے کر یہ نوید سنائی جا رہی ہے کہ اگر کہیں تم سے کوئی کمی بیشی بھی ہوگئی تو اللہ درگزر کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تصور بھی دیا جا رہا ہے کہ اب جبکہ ہجرت کے بعد تم ایک مضبوط امت بن کر اٹھو گے تو ممکن ہے کہ قریش کے مظالم کی یاد تمہیں کسی عاجلانہ اقدام پر اکسانے کی کوشش کرے۔ تو بہتر یہ ہے کہ تم ایسے کسی بھی اقدام سے گریز کرو اگرچہ تمہیں اس کا حق ہے کیونکہ تم پر بہت ظلم کئے گئے ہیں لیکن ابھی مناسب وقت نہیں آیا جب وہ موزوں وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں خود اس کا حکم دے گا ابھی تمہارے لئے عفو و درگزر کی پالیسی اختیار کرنا بہتر ہے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تم اگر اپنے انتقام میں کسی کو ایسی سزا دے ڈالو جو انصاف کے مطابق ہو تو تمہیں اس کی اجازت ہے لیکن چونکہ تمہارا پروردگار نہایت درگزر کرنے والا اور بخشنے والا ہے وہ قریش اور دیگر مشرکین کے تمرد اور سرکشی کے باعث ان پر عذاب نازل نہیں فرماتا بلکہ انہیں مہلتِ عمل دے رہا ہے اس کے ''عفو'' ہونے کا یہ تقاضا ہے کہ وہ مجرموں کو زیادہ سے زیادہ مہلت دے۔ تمہارے اخلاق میں بھی اللہ کی صفات کا عکس ہونا چاہئے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم انتقام لینے کی بجائے عفو و درگزر کو اپنا طرزِ عمل بناؤ۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾

(یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن میں رات کو داخل کرتا ہے اور بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۶۱)

Marfat.com

وعدۂ نصرت پر اللہ کی قدرت سے استشہاد

ممکن ہے مشرکین کو اللہ تعالیٰ کی نصرت کے اس وعدے پر یقین نہ ہو کیونکہ وہ اپنے تئیں اپنے مشرکانہ تصور کے باعث اللہ تعالیٰ کو ایک لاتعلق اور بے کار وجود تصور کرتے تھے۔ جو اپنے تمام اختیارات اپنے شرکاء کے سپرد کرنے کے بعد کائنات سے دور کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے اور مسلمانوں کیلئے اپنی نصرت وتائید کے وعدے کو مستحکم کرنے کیلئے ارشاد فرمارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات سے کہیں دور لاتعلق ہو کر نہیں بیٹھا بلکہ وہی اس کائنات کا متصرفِ حقیقی ہے۔ وہ ہر روز دن کے بعد رات کو لاتا ہے اور رات کے بعد دن کو طلوع کرتا ہے۔ اسی کی قدرت سے کبھی دن طویل ہوتے ہیں اور کبھی راتیں دراز ہو جاتی ہیں۔ یعنی وہ جب چاہتا ہے دن کا ایک حصہ رات میں شامل کر دیتا ہے یا رات کا ایک حصہ دن میں شامل کر دیتا ہے۔ تو جس ذاتِ عزیز کے تصرفات کا یہ حال ہے اس کے حوالے سے مسلمانوں کی نصرت وتائید کے باب میں اگر کسی کو شبہ ہے تو اسے اپنی سادگی کا علاج کرنا چاہئے۔

مزید فرمایا کہ اللہ "سمیع" بھی ہے "بصیر" بھی۔ یعنی وہ سب کچھ سن بھی رہا ہے اور دیکھ بھی رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ متصرفِ حقیقی بھی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جن لوگوں نے اس زمین پر فساد برپا کر رکھا ہے انہیں کھلی چھٹی دے دے۔ اور جو لوگ محض اللہ کی دین کی سربلندی اور اس فساد کو ختم کرنے کیلئے شب وروز جان کھپا رہے ہیں اور مفسدین کے مظالم برداشت کر رہے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ کوئی مدد نہ فرمائے۔

مزید اس طرف بھی اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ جس پروردگار کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ کائنات کی گردش اس کے حکم کی پابند ہے اور وہ ہر رات کے بعد دن کا اجالا ضرور لاتا ہے۔ تو اس کی قدرت سے کیا یہ بعید ہے کہ وہ کفر وشرک کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے سے اسلام کی صبح کو طلوع کر دے اور اس تاریکی کو دور کرنے کیلئے ایمان کی شمع کو فروزاں کر دے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾

(اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے اور جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں وہ سراسر باطل ہیں اور بے شک اللہ ہی ہے جو سب سے بلند اور سب سے بڑا ہے۔ ٦٢)

وعدۂ نصرت کی ایک اور دلیل

مسلمانوں کی نصرت وتائید کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے وہی کارفرمائے حقیقی ہے۔ اس کا دین حق ہے اور اس کی عبادت کرنا حق ہے اور جو لوگ اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے اور پوجتے ہیں وہ سب بے حقیقت محض وہم کی ایجاد یکسر فریب اور دھوکہ ہے۔ ان کا مذہب بھی انسانی اوہام وخرافات کا نتیجہ ہے۔ تو مسلمان چونکہ حق سے وابستہ حق کے پجاری اور حق کے ماننے والے ہیں اس لئے حق کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ پتھر اور مٹی کی مورتوں کو پوجنے والوں کے مقابلے میں اہلِ حق کو تائید ونصرت سے نوازے۔ اور اس کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہیں اس لئے کہ وہ سب سے بالا وبرتر اور سب سے بڑا ہے۔

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾

(کیاتم دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی ہے جوآسمانوں سے پانی برساتا ہےتوزمین سرسبزوشاداب ہوجاتی ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ بڑاہی باریک بیں اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۶۳)

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں جب مسلمانوں کی نصرت وتائید کا وعدہ فرمایا تو کفار نے اسے ایک مذاق سمجھا کیونکہ وہ مسلمانوں کے ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے دوردور تک اس کی امید نہ رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکتی ہے۔ پروردگار نے ان کے اس تصورِ استبعاد کو غلط ثابت کرنے کے لئے اپنی بعض صفات کا ذکر فرمایا۔جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جس پروردگار کی قدرتوں کا عالم یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں متصرفِ حقیقی ہے اس کے ادنیٰ اشارے سے وجود وعدم کا فیصلہ ہوتا ہے۔لیل والنہار کی گردش اس کے حکم کی پابند ہیں۔ایسی صفات والے پروردگار کیلئے مایوس کن حالات میں بھی مسلمانوں کی مدد کرنا کیا مشکل ہے؟پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی مضمون کومزید آگے بڑھایا۔ عرب بارش کی کمیابی اوراس کے نتیجے میں ہونے والی قحط سالی سے خوب واقف تھے۔بعض دفعہ ان کے لئے پانی جیسی ناگزیر نعمت کمیاب جنس کی صورت اختیار کرجاتی تھی۔خانہ بدوش پانی کی تلاش میں ریوڑوں کو ہانکتے ہوئے مارے مارے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔وہ آسمان کی طرف باربارنظریں اٹھاتے لیکن کہیں کوئی لکۂ ابر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ہرطرف دھول اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی اور آسمان پرغبار چھایا ہوانظرآتا۔جب مایوسی گہری ہونے لگتی تواچانک تیز ہوائیں چلتیں وہ نہ جانے کہاں سے بادلوں کو ہانکتی ہوئی لاتیں اور فضا میں بادلوں کو چادروں کی طرح بچھا دیتیں۔دیکھتے ہی دیکھتے بارش برسنے لگتی۔جل تھل ایک ہوجاتا اور زیادہ دن نہیں گزرتے کہ ہرطرف سبزہ کی بانات بچھ جاتی۔یہ وہ منظر ہے جسے زمین پر بسنے والے چاہے وہ عرب ہوں یا عجم ہمیشہ سے دیکھتے چلے آئے ہیں۔اس حیران کن منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ جو پروردگار خشک سالی کو برسات سے اور جھلستے ہوئے صحرا کو سبزے کے مخملی فرش میں تبدیل کرسکتا ہے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ مسلمانوں کی محدود افرادی قوت اورنہایت ناگفتہ بہ حالت کواس طرح تبدیل کرے کہ وہ عرب کی غالب قوت بن اٹھیں اور جس طرح چند دنوں میں زمین سرسبز ہوجاتی ہے اسی طرح ان کی دعوتی اور تبلیغی کاوشوں سے انسانوں کی بنجر زمینیں ایمان کی ہریاول سے لہلہانے لگیں اور عربوں کا نفرتوں سے ابلتاہوامعاشرہ حسنِ اخلاق کے کوثر وتسنیم میں تبدیل ہوجائے۔

لطیف کا مفہوم

اِنَّ اللّٰـهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ''بے شک اللہ لطیف اور خبیر ہے''۔ لطیف کا معنی ہے ''دقیقہ رس اور باریک بیں''۔یعنی وہ غیرمحسوس طریقوں سے اپنے ارادے پورے کرنے والا ہے۔وہ اپنی تدبیروں کو اس طرح بروئے کار لاتا ہے کہ کسی کو اس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا اور پھر مزید قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ خبیر بھی ہے۔جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا یا حکم دیتا ہے۔تو اس کا مالہ وما علیہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ ماضی بھی اس کے سامنے بے نقاب ہوتا ہے اور مستقبل بھی آئینہ ہوتا ہے۔اہلِ مکہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ تم بظاہر اسلامی دعوت کو ناکام ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہو اور تم محسوس کرتے ہو کہ نبی کریم ﷺ کا قافلہ دعوت ایک بندگلی میں محدود ہوکررہ گیا ہے۔لیکن اس قافلے کی باگ ڈور اور اس تبلیغ ودعوت کا سررشتہ جس کے ہاتھ میں ہے اس کی دقیقہ رسی اور باریک بینی کو تم نہیں جانتے۔اس نے جب آذر کے گھر حضرت ابراہیم

Marfat.com

علیہ السلام کو پیدا کیا تھا تو نبوت کے بعد ان کے حالات کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا تھا کہ وہ تین چوتھائی دنیا کا پیشوا ثابت ہوگا۔ جب خوردبین ایجاد ہوئی تھی اس وقت کون تصور کرسکتا تھا کہ یہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم تک نوبت پہنچائے گی۔ دنیا کے ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کی ابتدا انتہائی حوصلہ شکن تھی لیکن اس کی انتہا نہایت حیرت انگیز ثابت ہوئی۔ یہ سب اللہ کے منصوبے ہیں جن کے انجام کے بارے میں انسان کچھ نہیں جانتا جب تک وہ تکمیل کو نہ پہنچ جائیں۔ عمائدینِ قریش مسلمانوں کی بے سروسامانی اور اہلِ مکہ کی ناقدری کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی گمان کریں لیکن جس طرح بارش کے چند چھینٹے جھلسی ہوئی زمین کو سرسبز و شاداب چمن میں تبدیل کردیتے ہیں اسی طرح وہ وقت دور نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت کی گھٹائیں مکہ اور گردوپیش کی پتھریلی زمین پر اس طرح برسیں کہ کفروشرک کی تپش سے تپتی ہوئی سلیں اسلام کا فرحت افزا پیغام بن جائیں۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۶۴﴾

(اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور بے شک اللہ ہی ہے جو بے نیاز اور سزاوارِ حمد ہے۔ ۶۴)

قریش کو تنبیہ

سابقہ مضمون کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کی ملکیت اور اس کے اختیار میں ہے۔ اس نے جن وانس کو فی الجملہ آزادی دے رکھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ شعور و عقل بھی، تاکہ وہ آزادانہ مرضی اور شعور و عقل سے کام لے کر حق و باطل میں سے کسی ایک راستے پر چلنے کا فیصلہ کرے۔ لیکن انسان کو اس آزادی کی نعمت سے متمتع ہوتے ہوئے یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اسے اللہ نے جن نعمتوں سے گراں بار کیا ہے اس کے بارے میں کبھی اس سے بازپرس نہیں ہوگی۔ دنیا کو کوئی حکیم اور دانشور اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ انسان جیسی عقیل و فہیم اور بے شمار صلاحیتوں سے مالامال مخلوق کو اس طرح بے مقصد پیدا کیا گیا ہوگا کہ وہ من مرضی کی زندگی گزار کر دنیا سے چلی جائے جس طرح خودرو پودے مل دل کر ختم ہوجاتے ہیں اور اسے کسی جواب دہی سے واسطہ نہ پڑے۔ انسان جس ذات کی ملکیت میں ہے اور جس کا اختیار جس پر حاوی ہے ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ اپنے اختیار کو بروئے کار لا کر انسانوں سے جواب طلب کرے گا۔ مزید فرمایا کہ احتیاج سے پاک اور بے نیاز ذات صرف اللہ کی ہے۔ انسان تو قدم قدم پر اللہ کا محتاج ہے۔ اس لئے وہ اپنی احتیاجات کو پورا کرتے ہوئے اگر نیازمندی کا رویہ اختیار نہیں کرتا تو اسے اس کا جواب دینا ہوگا۔ ممکن ہے کسی کو یہ خیال آئے کہ پروردگار اپنے آپ کو منوانے اور انسانوں کو اپنے آگے جھکانے پر شائد اس لئے اصرار کرتا ہے کہ اسے اپنی حمد و ثنا پسند ہے اور وہ اس کا خواہش مند رہتا ہے کہ لوگ اس کی حمد و ثنا میں رطب اللسان رہیں۔ اس خیال کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ جس طرح بے نیاز ہے اسی طرح سزاوارِ حمد و ثنا اور ستودہ صفات بھی ہے۔ وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا
فِى الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ
اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾ وَهُوَ الَّذِىْۤ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ
فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾
اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾
اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ فِىْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷۰﴾ وَيَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ
بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ
اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِىْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ
يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ
مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ
الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۹۔ کیاتم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ تمہارے لئے مسخر کررکھا ہے جوزمین میں ہے اوراس نے کشتی کو بھی مسخر کررکھا ہے وہ چلتی ہے سمندر میں اسی کے حکم سے اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا وہ زمین پر گر پڑے مگر یہ کہ اس کے حکم سے۔ بے شک اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور بڑا ہی رحیم ہے۔ ۶۵) اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی عطا کی پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۶) ہم نے ہرامت کیلئے ایک طریقِ عبادت مقرر کردیا جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں۔ تو اس معاملے میں وہ آپ سے جھگڑا نہ کریں۔ آپ انہیں اپنے رب کی طرف بلاتے رہیں بے شک آپ اپنے رب کی طرف سے سیدھے راستے پر ہیں۔ ۶۷) اور اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ ۶۸) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا ان امور کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ ۶۹) کیاتم نہیں جانتے کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اللہ اس کو جانتا ہے یہ سب چیزیں ایک رجسٹر میں محفوظ ہیں۔ بے شک یہ اللہ کیلئے نہایت آسان ہے۔ ۷۰) اور یہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ ان کے بارے میں ان کو کوئی علم ہی ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۷۱) جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو آپ ان کے چہروں پر جنہوں نے کفر کیا، ناگواری کو پہچان سکتے ہیں۔ گویا یہ ان لوگوں پر حملہ کردیں گے جو ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ ان سے کہیے کہ کیا میں تمہیں اس سے بڑھ کرنا گوار چیز کی خبر نہ دوں؟ وہ ہے دوزخ کی آگ۔ اس کا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ کررکھا ہے جنہوں نے کفر کیا اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ۷۲)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَالْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ ؕ وَ یُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۵﴾

(کیاتم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ تمہارے لئے مسخر کررکھا ہے جو زمین میں ہے اوراس نے کشتی کو بھی مسخر کررکھا ہے وہ چلتی ہے سمندر میں اسی کے حکم سے اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا وہ زمین پر گر پڑے مگر یہ کہ اس کے حکم سے۔ بے شک اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور بڑا ہی رحیم ہے۔ ۶۵)

اللہ کی قدرت اوراس کی رحمت سے استدلال کرتے ہوئے قریش کو وارننگ

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکومت کو اس طرح بیان فرمایا ہے جس سے مخالفین کو یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس قدر ہمہ گیر ہے اوراس کی حکومت اس طرح ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی قوم کو

Marfat.com

پکڑنا چاہے تو اس کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ کسی بڑی سے بڑی حکومت کا تختہ الٹنا چاہے تو اس کیلئے معمولی بات ہے۔ اسی طرح مخالفین کے تمام تر وسائل کی موجودگی میں اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد کرنا چاہے جبکہ وہ نہایت بے بسی کی تصویر ہیں۔ نہ ان کے پاس افرادی قوت زیادہ ہے اور نہ انہیں دشمن کے مقابلے میں وسائل کی فراوانی میسر ہے۔ تو اس کیلئے ان کی بے بسی اور ناتوانی کے باوجود ان کی مدد کرنا اور دوسروں پر انہیں غالب کر دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ قریش اور دوسری مخالف قوتوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ جس طرح اللہ کی قدرتوں کے سامنے بے بس ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احسانات سے بھی گراں بار ہیں۔ اگر پروردگار ان کے لئے زندگی میں یہ وسائل فراہم نہ کرے اور ان پر اپنی نعمتوں کی بارش نہ کرے تو وہ ایک دن کیلئے بھی زندہ نہ رہ سکیں۔ لیکن بجائے ان نعمتوں کا احسان مند ہونے کے ان کی حماقت کا عالم یہ ہے کہ وہ ان نعمتوں اور آسانیوں کے بل بوتے پر اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ جن نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہیں، وہ سب اللہ کی دین ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کو متحضر رکھنا بڑا ضروری ہے کہ تم نے اللہ کی عطا کردہ جن نعمتوں پر فخر اور تکبر شروع کر رکھا ہے اور دوسروں پر تم اسی حوالے سے اپنی دولت و امارت کا رعب جماتے ہو۔ کیا تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کے وجود اور زندگی کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی ہر مخلوق اس کے احکام کی پابند ہے۔ زمین کے اندر اور زمین کے اوپر جو کچھ ہے اس کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ! اس نے ان تمام قوتوں کو ہماری خدمت میں لگا رکھا ہے۔ تسخیر کا یہ معنی نہیں کہ یہ سب چیزیں اصلاً ہماری تابع فرمان ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ ہی کے احکام کی پابند ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سی قوتوں کو اللہ نے انسانوں کی خدمت اور افادیت کیلئے حکم دے رکھا ہے۔ زمین اور زمین کی قوتِ روئیدگی اللہ ہی کے قبضے میں ہے اور اسی کی ملک ہے۔ لیکن اس نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ زمین ہمارا بوجھ اٹھائے اس کی قوتِ روئیدگی ہمارے لئے سبزہ اگائے اور ہمارے لئے غلے کا سامان کرے۔ درختوں کی صورت میں سایہ مہیا کرے اور رسیلے پھلوں سے ہمارے کام و دہن کی لذت کا سامان کرے۔ لیکن ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے والوں کو یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ جو ان کا حقیقی مالک ہے اور یہ قوتیں جس کے قبضے میں ہیں وہ جب چاہے ان کی طنابیں کھینچ سکتا ہے۔ انسانوں کے سامنے انہیں بغاوت پر آمادہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی تفہیم کیلئے اس کے بعد کشتی کا ذکر فرمایا گیا کہ کشتی کو دیکھو کس طرح حیرت انگیز طور پر تمہاری خدمت رسانی کیلئے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی تیرتی ہے۔ جو اس پر لاد دیتے ہو وہ اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار نہیں کرتی۔ تمہاری تجارت اور تمہاری سفر کا یہ بہت بڑا ذریعہ ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کشتی کو انسان کی خدمت رسانی سے انکار کا حکم دے دے تو چشمِ زدن میں سب کچھ برباد ہو کر رہ جائے۔ اسی طرح ہم پر آسمان کی چھت تانی گئی ہے۔ ایک ایسی عجیب چھت جس کے اور چھور کا کوئی اندازہ نہیں۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ محض اللہ کے حکم سے بے ستون کھڑی ہے۔ اس کے نیچے بے شمار کرے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ وہ محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہے اور اس کے قانونِ تسخیر نے اسے انسانوں کی خدمت میں لگا رکھا ہے اور اگر کبھی اللہ نہ کرے اس آسمان کا کوئی حصہ زمین پر گر پڑے تو زمین کی ہر چیز تباہ ہو جائے۔ اسی طرح آسمان کے نیچے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیسا رنگا رنگ جہان آباد ہے اور کچھ نہیں تو سائنس نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ بے شمار شہابِ ثاقب زمین کی طرف آتے ہیں اور جن میں بعض کا وزن ٹنوں میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ زمین تک پہنچ نہیں پاتے بلکہ راستے میں جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت سے اہلِ زمین کی حفاظت کیلئے ایک ایسا پردہ تان رکھا ہے جس سے کوئی چیز آگے نہیں گزر سکتی۔ لیکن اس کی قدرت سے یہ بات ہرگز بعید نہیں کہ اگر وہ اسی پردے کا ایک گوشہ ذرا سا سرکا دے تو زمین پر زندگی ناممکن ہو کر رہ جائے۔ جس پروردگار کی قدرت و حکومت کے ساتھ ساتھ الطاف و عنایات کا

Marfat.com

یہ حال ہو اور انسان انہیں عنایات کے باعث زندگی کا سانس لے رہا ہو تو کیا اس کا انکار کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو شریک کرنا اور اس کے رسول کو اذیت پہنچانا کس قدر شرم کی بات ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے آخری جملے میں انہیں حقائق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف بھی ہے اور رحیم بھی۔ اگر اس کی رأفت اور رحمت نہ ہوتی تو وہ کبھی قریش اور ایسے دوسرے متمردین کو مہلتِ عمل نہ دیتا اور جس طرح یہ لوگ بار بار عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں عذاب کی نذر کر دیتا۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾

(اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی عطا کی پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ٦٦)

انسان کے کردار کی بنیادی خرابی

اس آیتِ کریمہ میں دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ایک تو یہ بات کہ گزشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ احسانات کا ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی بتلایا ہے کہ اس کی الطاف و عنایات صرف اس لئے ہیں کہ وہ رؤف و رحیم ہے۔ یہ بات بجائے خود شرم دلانے کیلئے کافی ہے کہ قریش اور دوسرے مشرکین مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں وہ تو اس قابل ہے کہ ان پر عذاب کا کوڑا برسے اور ان کی ڈھٹائی کا حال یہ ہے کہ وہ بجائے اپنی حرکتوں پر نادم ہونے کے بار بار پیغمبر سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ رحمت کا سلوک فرماتے ہوئے انہیں مہلتِ عمل بھی دے رہے ہیں اور نعمتوں سے بھی نواز رہے ہیں کیونکہ یہی ان کی رأفت و رحمت کا تقاضا ہے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی تم پر بے شمار عنایات ہیں۔ لیکن اس سے بھی بڑی اس کی عنایت یہ ہے کہ اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ اگر زمین پر بے شمار نعمتوں کی حکمرانی ہوتی لیکن ان سے محظوظ ہونے والا کوئی نہ ہوتا تو اس کا کیا فائدہ ہوتا؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنا مزید احسان جتلاتے ہوئے فرمایا کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی تاکہ تم ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ کا شکر بجا لاؤ۔

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ تم عذاب میں تاخیر کے باعث اللہ کے رسول کے مقابلے میں اور دلیر ہوتے جا رہے ہو اور یہ سمجھ رہے ہو کہ اگر اللہ کا عذاب آنا ہوتا تو آج تک آ چکا ہوتا۔ چنانچہ ان کی اس کوتاہ فہمی پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ جس اللہ نے بے شمار نعمتوں سے محظوظ ہونے کیلئے تمہیں زندگی بخشی ہے اور پھر وہی اللہ طبعی زندگی کے اختتام پر تمہیں موت دیتا ہے وہی ایک دن تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ جس طرح تمہیں اس نے پہلی دفعہ زندہ کیا تو اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی اسی طرح جب وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا، تاکہ تمہاری زندگی کا حساب لیا جائے تو اس وقت بھی اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کیونکہ اس کیلئے دوبارہ زندہ کرنا پہلی دفعہ زندہ کرنے سے زیادہ مشکل نہیں۔ اس میں کہنا یہ ہے کہ تم فرض کرو اگر عذاب سے بچ بھی گئے تو قیامت بہر حال آ کر رہے گی۔ قیامت میں سب کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور قیامت کا عذاب دنیا کے عذاب سے کہیں شدید ہوگا۔

Marfat.com

آیت کے آخر میں فرمایا کہ قریش اور دیگر مشرکین کے رویے اور اللہ کے دین کے مقابلے میں تمرد اور سرکشی کا باعث اصل میں یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے۔ یہاں انسان سے مراد قریش ہی ہیں کیونکہ روئے سخن انہیں کی طرف ہے۔ البتہ! ان کا نام لیے بغیر ایک عام لفظ سے ان کا ذکر اظہارِ نفرت کیلئے کیا۔ یعنی اللہ کی نگاہ میں وہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا نام لیا جائے۔ ناشکرا ہونا چونکہ ان کی بنیادی بیماری ہے اس لئے بڑی سے بڑی نعمت سے وہ متمتع ہو رہے ہیں لیکن منعمِ حقیقی کا شکر بجالانے کی انہیں توفیق نہیں ملتی۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾

(ہم نے ہر امت کیلئے ایک طریقِ عبادت مقرر کر دیا جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں۔ تو اس معاملے میں وہ آپ سے جھگڑا نہ کریں۔ آپ انہیں اپنے رب کی طرف بلاتے رہیں بے شک آپ اپنے رب کی طرف سے سیدھے راستے پر ہیں۔ ۶۷)

قریش اور یہود کے اعتراضات

اس آیتِ کریمہ میں ہر امت کیلئے ایک منسک کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہی مضمون انہیں الفاظ کے ساتھ اسی سورۃ کی آیت نمبر ۳۴ میں گزر چکا ہے۔ لیکن دونوں منسک کے معنی میں اختلاف ہے۔ آیت نمبر ۳۴ میں منسک کا معنی قربانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں یہ حکم "واؤ" کے ساتھ آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مستقل حکم نہیں بلکہ احکامِ حج ہی کے سلسلے کا ایک حکم ہے اور وہ ظاہر ہے قربانی ہی ہو سکتا ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ آیت نمبر ۳۴ میں منسک کے بعد جانوروں پر اللہ کے ذکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جانوروں پر اللہ کا ذکر قربانی کے تصور سے ہی میل کھاتا ہے۔ لیکن یہاں بغیر "واوٴ عاطفہ" کے یہ حکم آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک مستقل حکم ہے، سابقہ احکام کا حصہ نہیں۔ ویسے بھی منسک کا حقیقی معنی قربانی نہیں بلکہ عبادت یا طریقِ عبادت ہے۔ آیت نمبر ۳۴ میں ایک قرینے کی وجہ سے قربانی اس سے مراد لی گئی ہے۔ لیکن یہاں یہ اپنے اصل معنی یعنی طریقِ عبادت میں استعمال کیا گیا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا کہ تمہیں دعویٰ یہ ہے کہ تم ملتِ ابراہیمی کو ماننے والے ہو اور تمہارے پیغمبر پر وحی اترتی ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو تم بعض ایسے جانوروں کا گوشت کیوں کھاتے ہو جنہیں سابقہ شریعتوں میں حرام کیا گیا ہے۔ اور مزید یہ بات کہ جو جانور تم اپنے ہاتھوں سے ذبح کرتے (مارتے) ہو اسے حلال سمجھتے ہو اور جسے اللہ مار دیتا ہے اسے حرام اور پلید کہتے ہو۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کا اصولی جواب عنایت فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جہاں تک مشرکین کی خانہ ساز شریعت کا تعلق ہے وہ تو اس قابل نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے البتہ! اگر اہلِ کتاب قریش کو بعض حوالوں سے اکساتے ہیں کہ ہماری شریعت میں یہ یہ جانور حرام تھے اور اسلام نے انہیں حلال کر دیا ہے تو ان سے یہ کہا گیا ہے کہ تم اچھی طرح اس بات کو جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول بھیجا تو اس پر نئی شریعت اتاری اور نئی کتاب نازل کی۔ نئی شریعت میں سابقہ شریعت کی کچھ باتوں کو باقی رکھا جاتا تھا اور جہاں زمانے کے تقاضے کے مطابق تبدیلی کی ضرورت ہوتی تھی وہاں نیا حکم نازل کر دیا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر امت کو یہ بات

Marfat.com

سمجھائی جاتی تھی اگر کسی رسول کی شریعت میں سابقہ شریعت کے کسی حکم سے مختلف حکم ملتا ہے تو اس میں انکار کی کوئی بات نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو یقیناً اس کا حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو سابقہ شریعت کو علیٰ حالہا قائم رکھے اور چاہے تو کچھ نئے احکام دے دے اور بعض احکام کو منسوخ کر دے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو شخص رسول پر اور اس کی کتاب پر ایمان نہیں لاتا اس کے لئے اس پر نازل ہونے والی شریعت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ چونکہ اس کی ایک ایک بات کو ناقابلِ قبول سمجھتا ہے اس لئے اس کی شریعت کے ہر حکم کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور اس کا یہ رویہ قابلِ فہم ہے۔ لیکن اس کا یہ بحث کرنا کہ فلاں شریعت میں ایسا تھا تم اس سے مختلف بات کیوں کہہ رہے؟ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اگر اس حوالے سے آپ سے بحث کرتے ہیں تو انہیں ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے اور آپ انہیں ایسا کرنے کا موقع نہ دیں کیونکہ وہ ایک ایسی حرکت کر رہے ہیں کہ نہ دنیا کا کوئی قانون اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہمارے مذہب کی تاریخ اس کو جائز رکھتی ہے۔ کسی بھی ملک میں اگر نیا آئین مرتب کیا جاتا ہے اور پہلے سے اگر کوئی آئین موجود تھا اور اسے قوم کے نمائندے اگر منسوخ کر دیتے ہیں تو کوئی شخص ان نمائندوں پر یہ قدغن عائد نہیں کر سکتا کہ آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ اصل اختیار پارلیمنٹ کو ہے۔ اس نے جب پہلا آئین بنایا تو اس کا بھی اسے اختیار حاصل تھا اور اب اگر اس نے نیا آئین بنایا ہے تو اسے اس کا بھی اختیار حاصل ہے اور اگر وہ نیا آئین بنانے کی بجائے سابقہ آئین میں کچھ ترامیم منظور کرتی ہے تو اسے اس کا بھی حق پہنچتا ہے۔ کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہی بات اس آیت میں آنحضرت ﷺ سے کہی جا رہی ہے کہ اللہ نے آپ پر جو احکام نازل کئے ہیں یعنی اپنی بندگی کا جو طریقہ آپ کو عطا کیا ہے آپ لوگوں کو اس کی دعوت دیں۔ آپ نہایت دل جمعی سے اس پر قائم رہیں۔ ان لوگوں کا علاج یہ نہیں کہ ان سے احکام میں بحث کی جائے بلکہ آپ انہیں اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق پر ایمان لائیں۔ جب وہ اسے تسلیم کر لیں گے تو پھر انہیں بات سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ اس بنیادی بات اور اللہ کے حکم کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر آپ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیں۔ آپ اللہ کے فضل سے سیدھی راہ پر ہیں تو سیدھی راہ پر چلنے والے کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے کہ دوسرے غلط راستے پر جا رہے ہیں۔

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾

(اور اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ ۶۸) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا ان امور کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ ۶۹)

تفویض کا حکم

آنحضرت ﷺ کی پہلو تہی کے باوجود وہ لوگ احکام کے حوالے سے بحث و جدال کرنے سے باز نہیں آتے اور آپ کو اس میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ ان سے بحث میں الجھ کر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آپ ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس میں کوئی معقولیت ہوتی تو میں تمہیں اس کا ضرور جواب دیتا۔ لیکن تمہاری باتوں کے پیچھے

Marfat.com

چونکہ مخصوص محرکات ہیں جسے اللہ خوب جانتا ہے اس لئے میں یہ معاملات اللہ پر چھوڑتا ہوں۔ وہ قیامت کے دن ایک ایک بات کا فیصلہ فرمائے گا۔ اور اس دن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔ فی ھذہ الایة ادب حسن علمه الله عباده فی الرد علی من جادل تعنتاً ومراء اَن لا یجاب ولا یناظر ویدفع بھاذا القول الذی علمه الله نبیه ﷺ ''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بڑا عمدہ ادب سکھایا ہے کہ جو شخص محض تعصب اور جھگڑا کرنے کے شوق میں تم سے مناظرہ کرنا چاہے اسے کوئی جواب نہ دو اور نہ اس کے ساتھ مناظرہ کرو اس کی تمام غوغا آرائیوں کے جواب میں صرف یہ بات کہہ دو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم پیغمبر کو سکھائی ہے''۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷۰﴾

(کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اللہ اس کو جانتا ہے یہ سب چیزیں ایک رجسٹر میں محفوظ ہیں۔ بے شک یہ اللہ کیلئے نہایت آسان ہے۔ ۷۰)

قریش پر عتاب

اس آیتِ کریمہ میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ سے ہو رہا ہے لیکن حقیقت میں اس کا روئے سخن قریش کی طرف ہے اور اس کے ایک ایک لفظ سے عتاب جھلک رہا ہے۔ قریش اور دیگر مشرکین سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم جو کچھ نبی کریم ﷺ مسلمانوں اور دعوتِ اسلامی کے ساتھ کر رہے ہو اور جس طرح اس کے خلاف منصوبہ بندیاں کرتے ہو تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ان میں سے ایک ایک بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے وہ تمہارے اعمال کو بھی جانتا ہے اور تمہاری نیتوں اور تمہارے عزائم سے بھی واقف ہے۔ اور مزید یہ بات بھی یاد رکھو کہ تمہارے ہر عمل اور ہر سازش کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے رجسٹر یا ایسے دفتر میں محفوظ کر رکھا ہے جسے قیامت کے دن تم خود پڑھ سکو گے۔ اس کا ایک ایک لفظ تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم قیامت اور سزا کے بارے میں جن باتوں کو ہوائی باتیں سمجھتے تھے وہ حقیقت بن کر تمہارے سامنے موجود ہیں اور اس رجسٹر میں تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس طرح محفوظ ہوگا کہ تم اسے دیکھتے ہوئے چیخ اٹھو گے کہ مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا ''یہ رجسٹر کیسا ہے، جس میں کوئی بات چھوٹنے نہیں پائی، نہ چھوٹی نہ بڑی۔ اس نے ہر بات کو شمار کر رکھا ہے''۔ تم آج یہ محسوس کرتے ہو کہ تمہارا ایک ایک عمل کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے اور قیامت کے دن ان میں سے ہر بات کا کس طرح حساب لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر ان میں سے کوئی بات مشکل نہیں بلکہ بہت آسان ہے اس کی بے پناہ اور لا انتہا قوتوں کا اگر تمہیں ذرا بھی ادراک ہوتا تو تم کبھی ان کوتاہیوں کا شکار نہ ہوتے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾

(اور یہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ ان کے بارے

Marfat.com

میں ان کو کوئی علم ہی ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۷۱)

مشرکین کے مصنوعی سہارے بیکار ثابت ہوں گے

مشرکین کو جن تصورات نے غیر معمولی طور پر بگاڑا اور جن نام نہاد سہاروں نے انہیں اپنی عاقبت سے بیگانہ کر دیا ان میں سے ایک غلط تصور یہ تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم جن قوتوں کی پرستش کرتے ہیں چاہے پتھر کے تراشیدہ بت ہوں جو کبھی زندہ شخصیتوں کی صورت میں لوگوں کے دلوں میں آباد تھے۔ یا وہ جنات ہوں جنہیں بعض دفعہ وہ اپنے اسفار اور صحرائی قیام میں مدد کیلئے پکارتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس صحرا اور اس کے قریب پہاڑوں اور ٹیلوں پر ان کا قبضہ ہے اور ان کی پرستش کے بغیر کوئی یہاں خیریت سے نہیں گزر سکتا۔ اسی طرح وہ فرشتوں کو بھی اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور ان کے سامنے پرستش کی مختلف صورتیں اختیار کرتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اولاً تو قیامت کے آنے کا امکان نہیں اور اگر ایسا ہوا تو اللہ کی بیٹیاں ہمیں اللہ کے غضب سے بچالیں گی۔ ان نام نہاد اور مصنوعی سہاروں اور غلط تصورات پر تنقید کرتے ہوئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے سوا جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں یعنی ان کی پوجا پاٹ کرتے ہیں، ان سے استمداد کرتے ہیں اور ان کے حوالے سے بعض گمراہیوں کا ارتکاب بھی کرتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ہمیں اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اور ہماری ان گمراہیوں کی کوئی نہ کوئی سند ضرور ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں صاف فرمایا گیا ہے کہ ان غلط تصورات اور گمراہیوں پر مشتمل مصنوعی سہاروں کی کوئی سند نہیں۔ ان کے دعووں کی کوئی حقیقت نہیں۔ کسی پیغمبر کی معرفت اللہ نے ایسا کوئی پروانہ جاری نہیں کیا اور مزید حیران کن بات یہ ہے کہ وحیِ الٰہی کے علاوہ علم کے اور جتنے ذرائع ممکن ہیں ان میں سے کسی ذریعۂ علم کے حوالے سے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان گمراہیوں کی کوئی حقیقت ہے اور ان کے آباؤ اجداد نے کبھی ان چیزوں کو علمی حوالوں سے قبول کیا ہے۔ یہ تو سراسر شیطانی وساوس اور گمراہ کن قوتوں کی ملی بھگت سے ایسی چیزوں کو وجود ملا ہے۔ اور ان کے واسطے سے بعض حکمرانوں نے اپنے لئے حکومت کا جواز پیدا کیا اور بعض معبدوں کے پروہتوں کو اپنا کاروبار چلانے کا موقع ملا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایسی بے اصل گمراہ کن باتوں کو اللہ کے حوالے سے لوگوں میں عام کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود پر بھی ظلم کرتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی ظلم کا نشانہ بناتا ہے۔ ایسے ظالموں کا اللہ کے غضب سے بچانے کیلئے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ یہ ان کی سراسر حماقت ہے کہ بعض مفروضہ قوتوں کو یہ اپنا سہارا سمجھتے ہیں، جب یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوں گے تو کوئی انہیں بچانے والا نہیں ہوگا۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ یَكَادُوْنَ یَسْطُوْنَ بِالَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۷۲﴾

(جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو آپ ان کے چہروں پر جنہوں نے کفر کیا، ناگواری کو پہچان سکتے ہیں۔ گویا یہ ان لوگوں پر حملہ کر دیں گے جو ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ ان سے کہئے کہ کیا میں تمہیں اس سے بڑھ کر ناگوار چیز کی خبر نہ دوں؟ وہ ہے دوزخ کی آگ۔ اس کا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ کر رکھا ہے جنہوں نے کفر

Marfat.com

کیا۔ اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ (72)

اہلِ کفر کا کفر پر اصرار اور اسلام پر برہمی

اس آیتِ کریمہ سے چند باتوں کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ ایک تو یہ کہ آنحضرت ﷺ کے ہم عصر لوگ قرآنِ کریم کی بے پناہ تاثیر سے خوف زدہ تھے۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ قرآنِ پاک جس زبان میں نازل ہوا ہے اور وہ جس بلند سطح سے خطاب کرتا ہے اور اس کے خوبصورت الفاظ جس طرح حیران کن ترکیب سے گزر کر انگوٹھی میں لگے ہیروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور جس کے محاورات، تلمیحات اور روزمرے جس طرح کلام کو ایک شان وشکوہ عطا کرتے ہیں اور جس کی فصاحت و بلاغت اپنے اندر ایک معجز بیانی کی شان رکھتی ہے اور جس کا اسلوب بہ یک وقت شیریں بھی ہے اور پرشکوہ بھی۔ اور جس میں پیش کیے جانے والا نظامِ زندگی اپنے اندر ایک آئین، قانون، ادب، نصیحت، اور خطابت کی بہ یک وقت شان رکھتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سننے والے اس کے سحر میں ڈوب جاتے ہیں۔ اہلِ عرب اپنے اندر ہزاروں کمزوریاں رکھتے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ الفاظ کے جوہری اور کلام کے تیور شناس تھے۔ انہوں نے آج تک اپنے خطباء کے حیرت انگیز خطبے اور اپنے شعراء کے دلوں کو موہ لینے والے اشعار سنے تھے۔ لیکن قرآنِ کریم صرف خطبات کا مجموعہ تھا اور نہ اس کی زبان شعر کی زبان تھی۔ بایں ہمہ! وہ اپنی شیرینی اور تاثیر میں سب سے نرالا اور سب سے بالا اور بلند تھا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت آپ کا اثر میں ڈوبا ہوا لہجہ، آپ کا بے عیب کردار، اور آپ کا بے خوف اندازِ بیان، قرآنِ کریم سے مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر دیتا تھا کہ جس کے اثرات سے بے نیاز رہنا سننے والوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ شروع شروع میں تو انہوں نے یہ کیا کہ اوباشوں کو اس کام پر لگا دیا کہ جب اور جہاں بھی نبی کریم ﷺ قرآن پڑھیں تو تم شور مچاؤ تا کہ تم اس کی تاثیر پر غالب آجاؤ۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ قرآنِ کریم کے اعجاز کے سامنے اپنی بے بسی محسوس کرتے ہوئے اشتعال کا شکار ہونے لگے۔ کیونکہ علمی طور پر بے مایہ اور دلیل سے خالی چھوٹے آدمی کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ جب وہ ایک سچی بات کا جواب نہیں دے پاتا تو وہ بات کہنے والے کا منہ نوچنے پر تیار ہو جاتا ہے چنانچہ اب وہ اسی کمزوری کا شکار تھے۔ جیسے ہی ان کے سامنے قرآنِ کریم پڑھا جاتا ان کے چہرے بگڑنے لگتے، ان کے چہروں کی ناگواری اور تکدر کو ہر دیکھنے والا محسوس کرتا تھا۔ پھر ان کی یہ بیزاری اشتعال میں ڈھل جاتی ان کی کیفیت یہ ہوتی کہ ابھی قرآنِ کریم پڑھنے والوں پر پل پڑیں گے اور حملہ کر دیں گے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کے پاس علم اور دعوت کے حوالے سے سب سے بڑا ہتھیار خود قرآنِ کریم اور اس کی دعوت ہے۔ ہم نے کفر اور گمراہی کے مقابلے میں یوں تو عرصے سے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور ہماری ترجیحات بدل گئی ہیں لیکن جو لوگ ابھی تک کفر کے مقابلے کا تصور رکھتے ہیں ان کے یہاں بھی مقابلے کیلئے مختلف چیزیں اختیار کر لی گئی ہیں۔ جن کا قرآنِ کریم سے نام کے تعلق کے سوا کوئی تعلق نہیں۔

دوسری بات اس آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ کفر وشرک اور گمراہی کے حاملین اپنے خیالات اور اعتقادات میں ایسے بے لچک ہوتے ہیں کہ وہ ان کے مقابلے میں قرآنِ کریم یا اس پر مبنی لٹریچر کو کبھی برداشت کرنے کے تیار نہیں ہوتے۔ وہ یوں تو رواداری، اور وسعتِ نظر کا بہت ڈھنڈورا پیٹیں گے اور قرآنِ کریم کی فکر کے لوگوں پر ہمیشہ طعن توڑیں گے۔ کہ یہ لوگ بہت چھوٹے ظرف کے لوگ ہوتے ہیں اپنے خیالات سے مختلف بات سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ لیکن عملی طور پر ان کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ساری دنیا کو رواداری کا درس دیں گے۔ لیکن خود بچیوں کے سروں پر سکارف تک بھی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ جمہوری حقوق کی بات کریں گے لیکن جہاں کہیں

Marfat.com

قرآنِ کریم سے تعلق رکھنے والے جمہوری طریقے سے برسرِ اقتدار آئیں گے تو انہیں تسلیم کرنے سے انکار کردیں گے۔ انہیں شرم وحیا کی ہر بات بری لگے گی لیکن بے حیائی پر ان کی استقامت دیکھ کر آدمی حیرت زدہ رہ جائے گا۔ اگر کوئی آدمی ان کے سامنے بے حیا بننا گوارا نہ کرے تو وہ اسے غیر مہذب قرار دیں گے۔ اور خود بے حیائی پر غیر معمولی اصرار ان کے نزدیک تہذیب کا زیور کہلائے گا۔ اصل بیماری وہی ہے کہ قرآنِ کریم اور اس کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی کے بارے میں وہ جب بھی کسی بات کو سنتے ہیں تو ان کے چہرے بگڑ جاتے ہیں۔ تو وہ ایسے لوگوں کا منہ نوچنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں جن کا رشتہ قرآنِ کریم سے ہے۔ پروردگار طنز کے انداز میں انہیں ان کی اصل منزل کی خبر دے رہا ہے کہ اگر تمہیں جلنا بھننا ہی عزیز ہے تو تم قرآنِ کریم سن کر ہی کیوں جلو۔ ہم تمہیں اس سے بہتر جلانے والی چیز کی خبر دیتے ہیں وہ ہے جہنم کی آگ۔ اگر جلنا ہی ہے تو جہنم کی آگ تمہارے انتظار میں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کیلئے جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے لیکن کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس قدر برا ٹھکانہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ
الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا
لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ
الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ
النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ
مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ السجدة وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ
اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا

Marfat.com

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ ع

رکوع: ۹۔ اے لوگو! ایک مثال بیان کی جارہی ہے پس اسے غور سے سنو۔ بے شک تم اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ اگر چہ اس کام کیلئے وہ سب جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس مکھی سے اسے بچا بھی نہیں سکتے۔ کتنا بے بس ہے ایسا طالب اور کتنا بے بس ہے ایسا مطلوب۔ ۷۳) انہوں نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسے اس کی قدر پہچاننے کا حق تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور اور سب پر غالب ہے۔ ۷۴) اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی (رسول چنتا ہے)۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ ۷۵) وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات لوٹتے ہیں۔ ۷۶) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۷۷) اور اللہ کی راہ میں سر توڑ کوشش کرو جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چن لیا ہے (حق کی پاسبانی اور اشاعت کیلئے) اور دین کے معاملے میں اس نے تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ اپنے باپ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے (اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام مسلم ہے) تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے دامنِ رحمت کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مدد فرمانے والا۔ ۷۸)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾

(اے لوگو! ایک مثال بیان کی جارہی ہے پس اسے غور سے سنو۔ بے شک تم اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ اگر چہ اس کام کیلئے وہ سب جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس مکھی سے اسے بچا بھی نہیں سکتے۔ کتنا بے بس ہے ایسا طالب اور کتنا بے بس ہے ایسا مطلوب۔ ۷۳)

Marfat.com

مشرکین کے شرکاء کی حقیقت

اس سے پہلے فرمایا گیا ہے کہ مشرکین جن قوتوں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں اس کے لئے ان کے پاس نہ کوئی نقلی دلیل ہے اور نہ عقلی۔ محض شیطانی وساوس، آباؤ اجداد کی تقلید اور توہمات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں ان کی اسی بے علمی اور بے عقلی پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم تمہارے سامنے ایک مثال پیش کرتے ہیں جس سے ان مشرکین کی حماقت کا بھی اندازہ ہو جائے گا اور جنہیں انہوں نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے ان معبودوں کی بے حقیقتی بھی واضح ہو جائے گی۔ اور ساتھ ہی ساتھ انہیں شرمندہ اور زچ کرنے کیلئے فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے نام نہاد معبودوں پر تنقید کی وجہ سے جس برہمی کا شکار ہو اور تم جس طرح سے مرنے مارنے پر تل جاتے ہو تمہارے چہرے بگڑ جاتے اور بھویں تن جاتی ہیں۔ ہم تمہیں ایک مثال کے ذریعے ان کی بے بسی واضح کرتے ہیں تا کہ تم اپنے رویے پر غور کرنے کی کوشش کرو۔

تمثیل یہ بیان کی گئی ہے کہ تم جن دیوی دیوتاؤں کو پکارتے ہو اور جن بتوں کو تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے ان کی بے بسی کا عالم تو یہ ہے کہ مخلوقات میں سب حقیر مخلوق مکھی ہے۔ لیکن ان کی بے بسی اور ناطاقتی کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مکھی پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں۔ بلکہ ان کی بے بسی کا حال تو اس سے بھی بدتر ہے کہ مکھی تو وہ کیا پیدا کریں گے چاہے دنیا بھر کے شرکا جمع ہو کر بھی اس کیلئے کوشش کر دیکھیں۔ انہیں تو اگر یہ کہا جائے کہ تم یہ چیزیں جو چڑھاوے کے طور پر تمہارے سامنے پیش کی گئی ہیں انہیں مکھیوں سے بچانے کی کوشش کرو تو وہ کسی مکھی سے اپنا حلوہ نہیں چھین سکتے۔ حتیٰ کہ کسی مکھی کو اڑا نہیں سکتے۔ تو کیا معبود ایسے ہوتے ہیں؟

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ: "طالب بھی کمزور اور مطلوب بھی کمزور"۔ ایک حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کسی کو معبود ماننا کوئی فیشن نہیں بلکہ انسان کی کمزوری ہے۔ وہ جب کسی معاملے میں اپنی بے بسی محسوس کرتا ہے مثلاً رزق کی تنگی یا نہ ختم ہونے والی بیماری یا اور اسی قسم کے حوادث تو پھر وہ کسی ایسی ذات کو مدد کیلئے پکارتا ہے جس کے بارے میں اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ ذات بڑی قوتوں کی مالک ہے۔ وہ یقیناً میری بے بسی میں میری مدد کر سکتی ہے۔ میں جب اسے مدد کیلئے پکاروں گا تو اس کی مدد کرنے کے نتیجے میں ان مصائب سے بچ جاؤں گا۔ لیکن کیسے تعجب کی بات ہے کہ ان مشرکین نے ان قوتوں کو اپنا معبود بنایا ہے جو ان سے بھی بڑھ کر عاجز اور بے بس ہیں۔ انسان اپنی ذات میں بہت بڑی قوت رکھتا ہے اس نے کیسی کیسی حیرت انگیز ایجادات کی ہیں۔ لیکن انہیں میں سے عقیدے کے کمزور لوگ ان فرضی قوتوں کے سامنے جھکتے ہیں جو مکھی پیدا کرنا تو دور کی بات ہے اپنے چہرے سے مکھی ہانک سکنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔

مَاقَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٧٤﴾

(انہوں نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسے اس کی قدر پہچاننے کا حق تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور اور سب پر غالب ہے۔ ۷۴)

ان مشرکین نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی۔ اگر انہیں ذرا بھی اس کی عظمت اور قدرت کا اندازہ ہوتا تو وہ کبھی کسی مخلوق کو اس کا شریک کرنے کی جسارت نہ کرتے۔ چہ جائیکہ ایسی چیزوں کو اللہ کا شریک بنا دیا جائے جو مکھی اڑانے پر بھی قادر نہ ہوں۔ ان کے بتوں اور دیوی دیوتاؤں کی بے بسی اور کمزوری تو ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اس سے بھی بڑھ حقیقت یہ ہے کہ اللہ قوی ہے یعنی اس کی قوتوں کا کوئی مثیل نہیں اور وہ عزیز ہے یعنی سب پر غالب ہے۔ زمین اور آسمان کی تمام مخلوقات اس کے قبضے میں ہیں اور اس کے سامنے

Marfat.com

عاجز ہیں۔وہ جوارادہ فرماتا ہےاس کو پورا کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہےاور کسی کو مجال نہیں کہ کوئی اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾

(اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی (رسول چنتا ہے)۔بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ ۷۵)

فرشتوں کی حیثیت

اس آیتِ کریمہ میں بعض مشرک قوموں کی مشرکانہ گمراہیوں پر نکیر کی گئی ہے۔مشرکینِ عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جو ہمیں اللہ کے عذاب سے بچاتی ہیں۔اور دنیا میں ہمارے لئے خیر و برکت کا باعث ہیں۔اور یہود و نصاریٰ حضرتِ عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا سمجھتے تھے اور اپنی مصیبتوں میں مدد کیلئے انہیں پکارتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے دونوں پر نکیر کرتے ہوئے فرمایا کہ فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور انسان بھی۔ان دونوں میں سے کسی میں بھی الوہی خصوصیات نہیں ہیں۔دونوں باقی مخلوقات کی طرح اللہ کے سامنے عاجز اور بے بس ہیں۔البتہ! دونوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے جس کو چاہتا ہے پیغامبری کے لئے چن لیتا ہے۔ اور یہ بات انڈرسٹڈ (UnderStood) ہے کہ جب چاہتا ہے کسی اور خدمت کے لئے چن لیتا ہے۔لیکن پیغامبری کی خدمت چونکہ سب سے اہم ہے اس لئے صرف اس کا ذکر فرمایا۔حضرت جبرئیل علیہ السلام ہمیشہ اللہ کا پیغام اور کلام لے کر اس کے نبیوں اور رسولوں پر اترتے رہے ہیں۔اسی طرح انسانوں میں سے بھی وہ جسے چاہتا ہے اپنی پیغامبری کیلئے چن لیتا ہے۔یعنی نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کر دیتا ہے۔اور اس طرح سے وہ دنیا کی اصلاح کی خدمت پر مقرر کئے جاتے ہیں۔یہ ان کا ایسا اعزاز ہے جس سے بڑھ کر کسی مخلوق کیلئے کوئی اور اعزاز نہیں ہو سکتا۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہیں اللہ کی ذات، صفات یا حقوق میں شریک کر دیا جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ''بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے''۔یعنی مخلوقات کی ضروریات کو وہ ذات پورا کر سکتی ہے جو ہر ایک کی اور ہر وقت سننے کی طاقت رکھتی ہو۔اسی طرح کوئی مخلوق بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو۔یہ شان چونکہ اللہ کے سوا کسی اور کی نہیں تو وہ اللہ کی شریک کیسے ہو سکتی ہے؟ یا اللہ اسے شریک کیوں بنائے گا؟

اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جن فرشتوں کو مشرکینِ عرب قوت و طاقت کا سرچشمہ سمجھ کر پوجتے اور پکارتے ہیں وہ بھی ہر وقت اللہ کی نگاہوں میں ہیں۔اللہ چونکہ سمیع ہے اس لئے وہ ان کی ہر بات کو سنتا ہے۔اور وہ چونکہ بصیر ہے وہ سب اس کی نگاہوں میں ہیں اور وہ ہر وقت ان کی نگرانی کرتا ہے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾

(وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات لوٹتے ہیں۔۷۶)

Marfat.com

اللہ کے علم اور قدرت کی وسعت

مشرکین کی گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم جیسی بھی زندگی گزاریں فرشتے اللہ سے سفارش کر کے ہمیں چھڑالیں گے۔ اس لئے وہ اپنے سب معاملات میں فرشتوں ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ یعنی ان سے مدد طلب کرتے تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ فرشتوں کے سامنے ہے جسے وہ کسی حد تک دیکھ سکتے ہیں۔ اللہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے جو ان کی حدود سے ماورا ہے اللہ اسے بھی جانتا ہے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ انسانوں کے تمام معاملات فرشتوں کے سامنے نہیں اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں اس لئے جو بھی فیصلہ ہوتا ہے وہ اللہ کی بارگاہ سے ہوتا ہے۔ اس میں کسی مخلوق کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ تو چونکہ اللہ کا علم سب پر حاوی ہے تو کوئی مخلوق فرشتوں سمیت اس کے علم میں اضافہ نہیں کرسکتی اور چونکہ ہر معاملہ اللہ کے سامنے پیش ہوتا ہے اس لئے کسی معاملے میں کوئی مخلوق دخل اندازی نہیں کرسکتی بلکہ خود فرشتوں کے معاملات بھی اللہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ جو ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں اس کی رپورٹ اللہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ السجدۃ ۷۷

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلائی کے کام کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ ۷۷)

امتِ مسلمہ کا منصب

پیشِ نظر آیات خاتمہ سورۃ کی آیات ہیں۔ اس سے پہلے مشرکینِ مکہ کی بداعمالیوں اور حدود پامالیوں کے حوالے سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اللہ نے اپنا گھر ان کی تولیت میں دیا تھا کیونکہ یہ اپنے عظیم باپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذمہ داریوں کے وارث تھے لیکن انہوں نے اس کا حق ادا کرنا تو دور کی بات ہے اللہ کے گھر کی عظیم حیثیت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ اسے اللہ نے توحید کا مرکز بنایا تھا حضرتِ ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے وہاں سے ایک امتِ مسلمہ کے اٹھائے جانے کی دعائیں کی تھیں۔ لیکن انہوں نے تین سو ساٹھ بتوں کا اسے مرکز بنا دیا۔ توحید کا وہ مرکز شرک کی آماجگاہ بن گیا۔ اگرچہ انہوں نے حجاج کی خدمت کی اور اللہ کے گھر کے احترام کو باقی رکھنے کیلئے مقدور بھر کوششیں کیں۔ لیکن اس کی اصل حیثیت اور اس گھر کی تعمیر کے مقاصد کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اسی کو پروردگار نے ان کی خیانت اور کفرانِ نعمت قرار دیا ہے۔ اور یہ فرمایا کہ ان کی ان حرکتوں کی وجہ سے اب ہم انہیں بیت اللہ کی تولیت کے عظیم منصب سے معزول کر رہے ہیں اور اب یہ ذمہ داری اس نوزائیدہ امت کو سونپی جارہی ہے جو اس گھر کی عظمت کو سمجھتی اور اس کی تعمیر کے مقاصد کو پہچانتی ہے۔

مطلوبہ صفات کی تیاری کی ہدایت

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں مسلمانوں سے براہِ راست خطاب فرما کر انہیں اس عظیم ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے اپنے اندر جن صفات کا پیدا کرنا ضروری ہے ان کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ رکوع کرو اور سجدہ کرو۔ سجدہ کرو چونکہ امر کا صیغہ ہے

Marfat.com

اس لئے اس سے امامِ شافعی اور بعض دوسرے جلیل القدر علماء نے یہ سمجھا کہ یہ آیتِ سجدہ ہے اور اس آیت کے پڑھنے والے کیلئے سجدہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اور اس سے انہوں نے ایک تو ''اسجدوا'' کے لفظ سے استدلال کیا اور دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ حضرت عقبہ بن عامر کی روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا اس سورۃ کو اللہ نے دو سجدوں سے فضیلت عطا فرمائی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: ہاں۔ تو اس کا مطلب واضح ہے کہ یہ آیت سجدے کی آیت ہے۔ اور تیسری دلیل ان کی یہ ہے کہ ابنِ ماجہ کی روایت میں حضرت عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو سورۃ حج میں دو سجدے سکھائے تھے۔

اس کے جواب میں احناف کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت آیتِ سجدہ نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں صرف سجدے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ رکوع کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اور جہاں یہ دونوں حکم اکٹھے آتے ہیں اس کا مطلب نماز ہوتا ہے کیونکہ دونوں کا وقوع نماز ہی میں ہو سکتا ہے۔ اور جہاں تک احادیث کا تعلق ہے احناف کے نزدیک ان میں سے کسی حدیث کی سند پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی اور جہاں تک اقوالِ صحابہ کا تعلق ہے انہوں نے حضرت عبداللہ ابنِ عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ سورۃ حج میں دو سجدے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلا سجدہ لازمی ہے اور دوسرا سجدہ تعلیمی ہے۔

نماز کا حکم

اس امت کو اس مقصد پر فائز کرتے ہوئے پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ تم رکوع و سجود کرو یعنی نماز پڑھو۔ اور ہم اس سے پہلے بھی آیت نمبر ۴۱ میں پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کی جنہیں وہ اقتدار دینا چاہتا ہے پہلی صفت یہ بیان کرتا ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ نماز درحقیقت صرف ایک عبادت نہیں بلکہ اس عبادت میں وہ تمام حقائق جمع کر دیئے گئے ہیں جس کے نتیجے میں اسلامی زندگی وجود میں آتی ہے۔ دنیا کی امامت و سیادت کا منصب اپنے اندر بڑی نزاکت رکھتا ہے جہاں یہ ذمہ داری ہے وہاں خلافت کی صورت میں اقتدار کا راستہ بھی ہے اور اقتدار ایک ایسی نازک ذمہ داری اور ایک ایسی کٹھن آزمائش ہے کہ جس شخص کی سیرت و کردار میں معمولی سی بھی خرابی موجود ہو وہ کبھی بھی اقتدار کی ذمہ داریوں کو باحسن طریق ادا نہیں کر سکتا اور پھر اسلامی اقتدار کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ درحقیقت اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کو قائم کرنا ہے۔ نیکیوں کو فروغ دینا اور برائیوں کو ختم کرنا ہے۔ ایسی ذمہ داری صرف وہ شخص یا وہ قوم ادا کر سکتی ہے جو اپنے آپ کو اللہ کی چاکر سمجھتی ہو۔ اس کی فکر اور اس کی قوتِ عمل پر اللہ کی حاکمیت کی چھاپ لگی ہو اور نماز اس راستے پر چلنے کی وہ روشنی مہیا کرتی ہے جس کے بعد ذمہ داری کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔ آدمی جب ہاتھ اٹھا کر نیت باندھتا ہے تو وہ ساری دنیا سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور نیت باندھ کر جب وہ اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہے تو اللہ سے عہدِ وفا باندھتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ میرا قیام میرا رکوع اور میرا سجود صرف تیرے لیے اور تیرے دین کی سربلندی کیلئے ہو گا۔ اقتدار آدمی میں خواہشات کو ابھارتا، دل و دماغ میں رعونت اور تکبر کا خناس پیدا کرتا اور اپنے مفادات کو ترجیح دینے کا راستہ دکھاتا ہے اور نماز ان تمام چیزوں سے صرف اللہ کے لئے دستبرداری کا پیغام دیتی ہے۔ ایک طرف تو وہ دنیا کی ہر طاقت سے سر اٹھانے کی تعلیم دیتی اور ہر آستانے کو پاؤں کی ٹھوکروں پر اچھالنے کی ترغیب دیتی ہے اور دوسری طرف اللہ کیلئے عجز و نیاز پیدا کرتی اور سب کچھ اس کے راستے میں قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

Marfat.com

اللہ کی اطاعت

اس کے بعد فرمایا: وَاعْبُدُوْا رَبَّکُم ۔ یہاں عبادت اطاعت کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں جس طرح نماز اللہ کیلئے ہی پڑھنی ہے، اسی کیلئے سر جھکانا ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں اسی کا طاعت کرنی ہے۔ اللہ سے تمہارے تعلق کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ وہ مسجد کی فضا تک محدود ہو کر رہ جائے۔ بلکہ تم اپنے رب کی عبادت کے ساتھ ساتھ اطاعت کے بھی پابند ٹھہرائے گئے ہو۔ جس طرح تمہارا قیام رکوع اور سجود صرف اسی کیلئے ہے اسی طرح تمہاری زندگی کا ہر شعبہ اسی کے علم کی روشنی میں منور ہونا چاہئے۔ آئین اور قانون تمہارے لئے وہی قابلِ قبول ہے جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ تمہاری معاشرت، معیشت، سیاست اور حکومت کی ترجیحات وہی ہیں جو اللہ کے دین نے تمہارے لئے مقرر کردی ہیں۔

خلقِ خدا کی خدمت

وَافْعَلُوا الْخَیْرَ: "اور بھلائی کے کام کرو"۔ اس حکم نے پہلے دونوں احکام کے ساتھ مل کر زندگی کے تمام دوائر کو مکمل کر دیا۔ جس طرح عبادت اللہ کی اور اطاعت بھی اسی کی، اسی طرح خدمت تمام نوعِ انسانی کی۔ بھلائی کے کام اپنے اندر بہت وسعت رکھتے ہیں اور ان کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو چونکہ امامت وسیادت دینے کا فیصلہ کرلیا ہے تو جس طرح ان کی توجہ اور خدمت کے مستحق مسلمان ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی ہیں جو اگرچہ دائرۂ اسلام میں داخل نہیں لیکن مسلمانوں کی مملکت میں رہنے کے باعث ہر طرح کی بھلائی کے مستحق ہیں بلکہ اسلام تو ان لوگوں کے ساتھ بھی بھلائی کا حکم دیتا ہے جو مملکتِ اسلامیہ کے باسی نہ ہوں۔ ان کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو ان تک اللہ کے دین کی دعوت پہنچانا اور اگر وہ کسی ابتلا میں مبتلا ہوں تو ان کی مدد کرنا اس حکم میں شامل ہے۔ مکہ معظمہ میں جب قحط پھیلا، باوجود اس کے کہ اہلِ مکہ مسلمانوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ لیکن جب انہوں نے آنحضرت ﷺ سے بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کی مدد کی درخواست کی تو آنحضرت ﷺ نے امکانی حد تک ان کی مدد فرمائی اور انہیں بھوک کی اذیت سے بچایا۔ آخر میں فرمایا کہ اگر تم ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی کوشش کرو تو اس بات کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دنیوی اور اخروی فوز و فلاح سے نوازے۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾

(اور اللہ کی راہ میں سرتوڑ کوشش کرو جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چن لیا ہے (حق کی پاسبانی اور اشاعت کیلئے) اور دین کے معاملے میں اس نے تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ اپنے باپ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو اسی نے

Marfat.com

تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے (اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام مسلم ہے) تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوۃ ادا کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے دامنِ رحمت کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مدد فرمانے والا ہے۔ (۷۸)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ان باتوں کا حکم دیا گیا جو امامت وسیادت کیلئے بنیادی صفات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ امتِ مسلمہ کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اگر امامت کا فرض انجام دینا ہے تو متذکرہ بالا صفات اپنے اندر پیدا کرنا ازبس ضروری ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ ان صفات کی تیاری کے بعد تمہیں جو اصل کام کرنا ہے وہ اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے سرتوڑ کوشش کرنی ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ کے آغاز میں صرف جہاد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ حَقَّ جِهَادِهٖ کی قید لگائی گئی ہے۔ یعنی اللہ کے کلمے کی سربلندی کیلئے ایسی جدوجہد درکار ہے جس میں نہ کسی تساہل کا دخل ہو، نہ کسی تحفظِ ذہنی کا، نہ اس میں مصلحت راستہ روکے، نہ حالات کا دباؤ دامن گیر ہوسکے۔

جہاد کا مفہوم اور اس کی اقسام

اس جہدِ مسلسل کے حوالے سے جب ہم غور کرتے ہیں اور اہلِ لغت سے جہاد کا معنی معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت حد تک اس کی وسعت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ علامہ راغب لفظِ جہاد کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **الجهاد والمجاهدة استفراغ الوسع فی مدافعة العدو** ''یعنی دشمن کا مقابلہ کرنے میں اپنی ہر امکانی قوت صرف کردینے کو جہاد اور مجاہدہ کہتے ہیں''۔

مزید فرماتے ہیں کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ **مجاهدة العدو الظاهر** (ظاہری دشمن سے جہاد) ۲۔ **مجاهدة الشيطان** (شیطان سے جہاد)

۳۔ **مجاهدة النفس** اور (اپنے نفس کے خلاف جہاد)۔

اس آیت میں تینوں قسم کے جہاد شامل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد ہر ایسی انتہائی کوشش کا نام ہے۔ جس میں اللہ کے کلمے کی سربلندی کے راستے میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو ختم کرنا پیشِ نظر ہو۔ سرسری نگاہ میں محسوس ہوتا ہے کہ جو قوتیں اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں ان کی طاقت کو توڑنا اور انہیں مغلوب کرنا جہاد کا مقصد ہے۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس جہاد اور مجاہدے کا اولین ہدف آدمی کا اپنا نفسِ امارہ ہے۔ جو ہر وقت اللہ سے بغاوت کرنے کیلئے زور لگاتا رہتا ہے اور آدمی کو ایمان واطاعت کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب تک اس کو مسخر نہ کیا جائے باہر کا کوئی مجاہدہ اعلائے کلمۃ الحق کا سبب نہیں بن سکتا بلکہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ بعض دفعہ باہر کے دشمن کو زیر کرلیا جاتا ہے۔ لیکن اپنی خواہشات اور مفادات کی ہوس خود مجاہد کو زیر کرلیتی ہے۔ جان پر کھیل کو جو بازی جیتی جاتی ہے اسے بڑی آسانی سے ہار دیا جاتا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **جاهدوا اهواء کم کما تجاهدون اعداء کم** ''اپنے ظاہری دشمنوں سے تم جس طرح جہاد کرتے ہو اسی طرح اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف بھی جہاد کرو'' بلکہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے ایک جنگ سے واپس آنے والے غازیوں سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **قدمتم خير مقدم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر** ''تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آگئے ہو''۔ عرض کیا گیا وہ بڑا جہاد کیا ہے؟ فرمایا: **مجاهدة العبد هواه** ''آدمی کی خود اپنی خواہشِ نفس کے خلاف جدوجہد''۔

Marfat.com

جہاد کے حکم کا سبب

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسی سرتوڑ کوشش کرنے کا حکم کیوں دیا جارہا ہے؟ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:
هُوَاجْتَبٰكُمْ ''اس نے تمہیں چن لیا ہے''۔یعنی تمہیں کلمہ حق کی سربلندی کیلئے انتہائی جدوجہد کرنے کا حکم اس لئے دیا جارہا ہے کہ اللہ نے تمہیں اس عظیم مقصد کیلئے انتخاب کرلیا ہے۔قریش اور یہود اس منصب سے معزول کردیئے گئے اوران کی جگہ تمہیں یہ اعزاز بخشا جارہا ہے۔ دیکھنا!اس عظیم منصب کی لاج رکھنا اوراس منصب کی ذمہ داریوں کو پورے عزم وجزم کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرنا۔

دین میں حرج نہ ہونے کا مفہوم

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ''اللہ نے تمہیں جس دین کی سربلندی کیلئے علم اٹھانے کا حکم دیا ہے اور جس عظیم منصب کا بار تم پر ڈالا جارہا ہے اس کے بارے میں تمہیں اطمینان رکھنا چاہیئے کہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے تم کوئی مشکل محسوس نہیں کروگے۔ جس طرح یہود نے اپنے دین میں خانہ ساز احکام کا اضافہ کرکے اپنے لئے مشکلات پیدا کی تھیں اللہ تعالیٰ نے اس دین کوان مشکلات سے محفوظ رکھا ہے۔اس دین میں ایسی کوئی بات نہیں جس کو قبول کرنے کے بعد تمہاری مادی،علمی اور روحانی ترقی کی راہیں مسدود ہوجائیں۔صحابہ کرام کو براہِ راست اس منصب کیلئے چنا گیا تھا۔چنانچہ انہوں نے اس منصب کی جس طرح ذمہ داریاں ادا کیں اوراس کی نزاکتوں کو جس طرح ملحوظ رکھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ان کے لئے فتوحات کے دروازے نہیں کھولے بلکہ انہوں نے اس دین کے حوالے سے دنیا کو علم آشنا بنایا۔تہذیب اور تمدن کی بنیادیں فراہم کیں۔ایک ایسا آئین دیا جس نے انسانوں کو زندگی کے ہر مرحلے میں آسانیاں مہیا کیں۔عدالتوں کا ایسا نظام دیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے انصاف کا چلن عام ہوگیا۔لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارا آج کا تعلیم یافتہ نوجوان دین کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ترکی نے اپنی نادانی کی وجہ سے صرف ان بدگمانیوں کے باعث یا سازش کا شکار ہوکر اپنے ہاتھوں خلافت تار تار کردی اور عالمِ اسلام کو کوچہ سیاست میں بے یار ومددگار چھوڑ دیا۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ''جس دین کی حفاظت،نصرت اور علم برداری اور جس گھر کی تولیت تمہارے سپرد کی جارہی ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ یہ کوئی نیا دین ہے بلکہ یہ وہی چیز ہے جسے تم ملتِ ابراہیم کے نام سے یاد کرتے ہو اور آج تک اس کی عظمت کے گیت گاتے ہو۔ یوں تو ہر نبی کی ملت اسی دین کی عکاس رہی کیونکہ ہر دور میں دین کی بنیادوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوئی۔مرورِ زمانہ سے انسانوں کی ضروریات بدلیں تو آنے والی شریعت میں نئے احکام کی ضرورت پیش آئی۔لیکن جن بنیادی صداقتوں پر دین کی بنیاد اٹھائی گئی تھی۔اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔یہاں باقی انبیاءِ کرام کا ذکر چھوڑ کر صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اہلِ عرب انہیں کی ملت سے واقف تھے اور قریش اپنے آپ کو ان کی اولاد سمجھتے تھے اور مزید یہ بات بھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ تمام قابلِ ذکر مذاہب سے پہلا کا زمانہ ہے۔یہودیت کا آغاز حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے ہوا اور عیسائیت کا حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام سے۔رہے مشرکینِ عرب تو انہیں بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کے ہاں بت پرستی کا رواج عمرو بن لحی سے شروع ہوا۔جو بنی خزاعہ کا سردار تھا اور موآب کے علاقہ سے ''ہبل'' نامی بت لے کرآیا تھا اوراس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ چھ سو سال پہلے کا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ یہودی،عیسائی،صابی اور اہلِ عرب تمام حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو آج بھی اپنا مقتدا تسلیم کرتے ہیں۔اس لئے جب ان کی ملت کا ذکر کیا گیا جو ان ملتوں میں سے

Marfat.com

کسی ملت کے پیرو نہ تھے تو لامحالہ وہی ملت اصل ملتِ حق ہے اور نبی کریم ﷺ اسی ملت کو زندہ کرنے اور اسی کو زیادہ جامع حیثیت سے پیش کرنے کیلئے تشریف لائے ہیں۔

ممکن ہے ملتِ ابراہیمی کے ذکر سے اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو کہ مسلمانوں کو کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لئے جس جہاد کا حکم دیا جارہا ہے اس کا عملی نمونہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ انہوں نے جس طرح قدم قدم پر صرف اللہ کی رضا کے حصول اور اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے قربانیاں دیں، یہ درحقیقت وہ ملتِ ابراہیمی ہے جس کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی جارہی ہے۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام اس سے پہلے مسلمان رکھا تھا۔ یعنی جب انہوں نے اللہ کا گھر تعمیر کیا اور پھر یہ دعا مانگی کہ یا اللہ ہماری اولاد میں سے ایک امتِ مسلمہ اٹھانا اور مزید یہ کہ ان کی طرف اپنا آخری رسول بھیجنا۔ اس طرح سے انہوں نے آخری امت کو امتِ مسلمہ کا نام دیا تھا اور یہ بھی اس میں اشارہ موجود ہے کہ یہی دین درحقیقت ملتِ ابراہیمی ہے۔ جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔

امتِ مسلمہ کے وجود کا مقصد

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ: یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے امتِ مسلمہ کو چنا گیا ہے اور اسی مضمون کو سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۴۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے اور وہاں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں اسی مقصد کو مزید تاکید کے ساتھ بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس منصب پر فائز کیا گیا تھا۔ بعد میں بنی اسرائیل اس منصب پر فائز ہوئے اور اسی منصب کا ایک حصہ یعنی اللہ کے گھر کی تولیت قریش کو ملا۔ لیکن دونوں نے جس طرح نااہل ہونے کا ثبوت دیا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اب انہیں معزول کر کے مسلمانوں کو امامت و سیادت کے اس منصب پر فائز کیا جارہا ہے اور انہیں بتایا جارہا ہے کہ اب قیامت تک تمہارا کام یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے شہادت حق کے اس عظیم فریضہ کو زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر انتہائی امانت و دیانت کے ساتھ اس طرح ادا کیا کہ اس کے مبہمات کو کھولا، اس کے مجملات کو واضح کیا، اس کے احکام کو عملی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا۔ ملی زندگی کے ناگزیر شعبوں کو عملی شکل دی۔ ریاست و حکومت کی تشکیل فرمائی۔ اس کو ایک نظام عطا کیا۔ اخلاقی، قانونی، تہذیبی، تمدنی، حتی کہ حربی اداروں کو بھی اس طرح منظم کیا کہ قیامت تک کیلئے اسلام کے بنیادی احکام کو عملی شکل میں متشکل فرما کر تمام اجتماعی ضرورتوں کے حوالے سے شہادتِ حق کا پیکر بنا دیا اور پھر یہی فریضہ امت کے حوالے کر کے انہیں اس کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

آخر میں پھر اقامتِ صلوٰۃ اور اہتمام زکوٰۃ کا حکم دیا کیونکہ ان دونوں کے بغیر شہادتِ حق کی ذمہ داری ادا کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ پورے دین کی عمارت ان دونوں ستونوں پر قائم ہے۔ امت کا مقتدر طبقہ اگر خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے اور وہ اپنے مالیاتی نظام کو زکوٰۃ کی پاکیزگی کا پابند نہیں کرتا تو شہادتِ حق کا فریضہ ادا ہونا تو دور کی بات ہے اس کا تصور بھی گدلا کر رہ جائے گا۔

مزید فرمایا کہ شہادتِ حق کی ادائیگی کیلئے یہ ضروری ہے کہ اللہ کو یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو کیونکہ حالات کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی مختلف تبدیلیوں سے آشنا ہوگی۔ بیرونی اثرات اپنا کام کریں گے۔ کمزور طبیعتیں ان کا سہارا لے کر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو مسموم کرنے کی کوشش کریں گی۔ ان کا مقابلہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اللہ پر توکل میں کمی نہ آنے پائے اور اللہ کی رسی یعنی اس کے دین کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ پھر امید کی جاسکتی ہے کہ امتِ مسلمہ اپنے فرض کی ادائیگی میں بہانے تلاش کرنے کی بجائے عزم و جزم کے

Marfat.com

ساتھ اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کیلئے کمر بستہ ہونے کی کوشش کرے گی۔ لیکن اگر اس کے تصورات میں کہیں کمزوری لاحق ہوگئی اور اس نے اللہ کی بجائے دوسرے سہاروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تو پھر معاملہ مخدوش ہو کر رہ جائے گا۔ اس لئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ اس بات کا یقین دلوں سے نکلنے نہ پائے کہ اللہ ہی بہترین کارساز اور وہی بہترین مددگار ہے۔ اگر اس کی کارسازی ہمیں میسر ہے اور اس کی پشت پناہی ہمیں حاصل ہے تو پھر دنیا ہزار کوشش کے باوجود ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور اگر ایسا نہیں تو پھر ہم ساری کوششوں کے بعد بھی منزلِ مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

الم يان للذين امنوا ان تخشع قلوبهم

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کیلئے ...

هدى للناس

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(جلد: ۷)

(سُوْرَةُ الْكَهْفِ) ...... تا ...... (سُوْرَةُ ...)

مؤلف

مولانا محمد اکرم ...

Marfat.com